منتخب التواریخ

جلد اول

مؤلف

ملّا عبدالقادر بدایونی

مترجم

ڈاکٹر علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

منتخب التواریخ

جلد اول

مؤلف

ملّا عبدالقادر بدایونی

مترجم

ڈاکٹر علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2008
تعداد : 550
قیمت : 335/- روپے (سیٹ 890/- روپے)
سلسلہ مطبوعات : 1296

Muntakhabut Tawareekh, Vol.I

ISBN : 81-7587-232-2
81-7587-234-9(set)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔ میل: urducoun@ndf vsnl net in، ویب سائٹ: www.urducouncil nic in
طابع: گیتا آفسیٹ پرنٹرس، سی۔ 90، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز۔ I، نئی دہلی۔ 110 020

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔

وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر علی جاوید
ڈائریکٹر

فہرست

عرض مترجم xix
حمد و نعت 1
علم تاریخ 5
سبب تالیف کتاب 7

غزنوی عہد حکومت

سلطان ناصر الدین سبکتگین سے خسرو ملک تک 11

غوری عہد حکومت

سلطان معز الدین محمد سام المعروف بہ سلطان شہاب الدین محمد غوری 41

خلجی خاندان — خلجی حکمران

سلطان جلال الدین بن یغرش خلجی 97
شہر نو کی تعمیر 98
سیدی مولہ درویش 100

سیدی مولہ کی شہادت 101
نومسلم مغل 102
علاء الدین کی مہم پسندی 103
دکن کی فتح 104
سلطان جلال الدین کا قتل 106
قدر خان کی تخت نشینی 108
دہلی پر قبضہ 108
عہد جلال الدین کے شعرا 109
سلطان علاء الدین خلجی 110
ملتان کی مہم 111
مغلوں کا پہلا حملہ 112
مغلوں کا دوسرا حملہ 112
مغلوں کا تیسرا حملہ 113
مغلوں کا چوتھا حملہ 113
مغلوں کا پانچواں حملہ 114
شراب کی ممانعت 114
علاء الدین کی خام خیالی 115
گجرات پر فوج کشی 116
رنتھمبور کا معرکہ 117
چتوڑ کی فتح 118
شاہزادہ کی وفات 118
حاجی مولا کی بغاوت 120
مالوہ پر حملہ 120

دکن پر ملک کافور کا حملہ 121
وارنگل کا گھیرا 121
علاء الدین کا انتقال 122
امیر خسرو اور امیر حسن 124
سلطان شہاب الدین خلجی 140
سلطان قطب الدین خلجی 141
خضر خان کا قتل 142
دیوگیر پر حملہ 142
سلطان قطب الدین کی بداعمالی 143
حسام الدین کی سرکشی 144
دکن پر خسرو خان کا حملہ 145
آخری حیرت انگیز رات 146
ناصر الدین خسرو خان 147
ہندوؤں کا غلبہ 148
غازی الملک کا حملہ 149
خسرو خان کی شکست 150

تغلق خاندان

سلطان غیاث الدین تغلق شاہ 152
الغ خان کی فوجی مہم 153
تغلق کی وفات 154
ہنوز دلی دور است 155
سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ 155
دارالخلافہ کا تبدیل کیا جانا 156

مغلوں کا حملہ 157
دہلی کی ویرانی 158
ہمالیہ پہاڑ کی مہم 159
بنگال کا پہلا سلطان 160
دکن کی بغاوت 161
کھوکھروں کی بغاوت 161
دہلی کی جانب واپسی 162
دکن کے باغی 163
صدہ کے امرا کی سرکشی 164
دولت آباد پر حملہ 165
حسن کانگو بہمنی 166
محمد تغلق کی غلطیاں 167
خونی شاہ 168
شیخ زادہ جام کی حق گوئی 169
ٹھٹھہ پر چڑھائی 169
محمد تغلق کی وفات 170
سلطان فیروز شاہ تغلق 186
حضرت چراغ دہلیؒ 186
مغلوں کی بغاوت 187
فیروز شاہ کی تخت نشینی 188
فرمان خلافت 189
بنگالہ کے معاملات 190
ہاتھیوں کا شکار 191

نہر سیلمہ 191
نگرکوٹ کا کوہستان 192
قدیم کتابیں 193
شمس الدین کی بغاوت 194
قلعہ فیروز پور کی تعمیر 195
امیران صدہ کا فساد 196
فیروز شاہ میدان جنگ میں 197
فیروز شاہ کی وفات 198
عہد فیروز شاہی کے شعرا 198
سلطان تغلق شاہ 199
دہلی پر محمد شاہ کی چڑھائی 200
ہمایوں خان کا حملہ اور شکست 201
ایک شہر، دو بادشاہ 202
سلطان محمد بن فیروز شاہ 203
محمد شاہ کی علالت 204
سلطان علاء الدین بن سکندر شاہ 204
سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ 205
مقرب خان اور سعادت خان 206
شطرنج کے بادشاہ 207
مغلوں کا حملہ 208
اقبال خان کی حوصلہ آزمائی 209
ہندستان پر امیر تیمور کا حملہ 210
تیمور دہلی میں 211

شیخ احمد کھتو 211

ہندوستان کی بدتر حالت 212

اقبال خان کا انجام 212

سلطان محمود دہلی میں 213

دہلی پر سلطان ابراہیم کا حملہ 215

دہلی پر خضر خان کا حملہ 216

محمودی عہد کا شاعر 217

دہلی پر خضر خان کا تیسرا حملہ 218

تاج الملک کی فوج کشی 219

شہزادہ مبارک 220

ترکوں کی سرکشی 221

بادشاہ کے خلاف بغاوت 222

خضر خان کی وفات 223

لاہور کو از سر نو آباد کرنا 224

الپ خان کی بغاوت 225

ملک شرقی سے مقابلہ 226

حاکم بیانہ کی اطاعت 227

فولاد کی فتنہ انگیزی 228

کابل کے حاکم شیخ علی کا حملہ 229

شیخ علی کا دوسرا حملہ 230

شیخ علی کا تیسرا حملہ 231

شیخ علی کی کابل کو واپسی 232

شہر مبارک آباد 233

مبارک شاہ کی ہلاکت	234
محمد شاہ بن فرید خان	241
امیروں کی بغاوت	242
باغی امیروں کا دہلی پر حملہ	243
فتنوں کا آغاز	244
محمود خلجی کا دہلی پر حملہ	245
بہلول لودی کا دہلی پر حملہ	245
سلطان محمد شاہ کی وفات	246
بہلول لودی کا دہلی پر قبضہ	247
سلطان علاء الدین کی وفات	248

لودی خاندان

سلطان بہلول بن کالا لودی	249
محمود شرقی کا دہلی پر حملہ	250
تین سالہ جنگی معاہدہ	251
دہلی پر دوسرا حملہ	252
سلطان حسین کی شکست	253
بہلول لودی کا جونپور پر حملہ	254
سلطان بہلول لودی کی وفات	255
سلطان سکندر بن بہلول لودی	256
باربک شاہ سے مقابلہ	257
بچگوتی قوم کی بغاوت	258
قحط اور تنگدستی	259
دہلی کے حاکم کی بغاوت	260

دھول پور کی مہم 261
تباہ کن زلزلہ 262
نعمت خان 263
محمد خان ناگوری کی اطاعت 264
سلطان سکندر لودی کی وفات 265
سکندر لودی کی شعر گوئی 266
عہد سکندری کے علماء 267
شیخ طلنبی 267
شیخ عزیز اللہ طلنبی 267
شیخ الہدیہ (اللہ دیا) 268
عہد سکندری کے شعراء 268
سلطان ابراہیم بن سکندر لودی 269
ابراہیم لودی کی لشکر کشی 270
گوالیار کا محاصرہ 271
اسلام خان کی بغاوت 272
بہادر خان کی خودمختاری 273
بابر سے امیروں کی بیعت 274
بابری لشکر کی یلغار 274
بابر کا ہندوستان پر حملہ 275
بابر کی پیش قدمی 276
بابر کا توپ خانہ 277
بابر پانی پت میں 278
پانی پت کی پہلی خونریز لڑائی 278

ابراہیم لودی کا قتل 279

مغلیہ خاندان

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی 281
رانا سانگا کی جدوجہد 282
رانا سانگا کی شکست 284
بابر کی وفات 285
عہد بابری کے علماء 285
نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ 286
ہمایوں کی لشکر کشی 287
سلطان بہادر سے مقابلہ 288
مرزا عسکری کی سرکشی 289
طہماسپ کا حملہ 290
بنگال پر فوج کشی 291
جنت آباد میں قیام 292
مرزا ہندال کی بغاوت 293
صلح کا پیغام 303
ہمایوں کی شکست 304
ہمایوں کی پریشانی 305
خرابی ملک دلی 306
لاہور میں مشورے 307
ہمایوں کا فرار ہونا 308

سوری خاندان

شیر شاہ بن حسن سور 309

شیر خان بہار میں 310
شیر خان بابر کے حضور 311
بنگال میں قسمت آزمائی 312
سلطان محمود لودی 313
ہمایوں اور شیر خان کا اختلاف 314
شیر شاہی سڑک 315
ملک گیری 316
راجہ مالدیو پر حملہ 317
جنگی تدبیر 318
رفیع الدین محدث 319
کالنجر کے قلعے کا محاصرہ 320
شیر شاہ کا انتقال 321
سلیم شاہ بن شیر شاہ سوری 322
سلیم شاہ کی مکاری 323
عادل خان کی یلغار 324
جلال خان کا قتل 325
محمود خان کا قتل 326
اعظم ہمایوں کی بغاوت 327
نیازیوں کی شکست 328
خواص خان کا قتل 329
سلیم شاہ کے انتظامات 330
سلیم شاہی لائحہ عمل 331
نیازیوں کی ذلت 332

پٹھانوں سے بدگمانی 333
کامران مرزا کی توہین 334
کامران مرزا کا فرار ہونا 335
شاہ محمد دہلوی کا قصہ 336
قتل کی واردات 337
شیخ علائی کا واقعہ 338
عبداللہ نیازی کا مسلک 339
شیخ علائی کی تحریک 340
شیخ علائی کا سفر 341
علائی دربار شاہی میں 342
مہدویت پر مباحثہ 343
شیخ علائی کی جلاوطنی 344
عبداللہ نیازی کا واقعہ 345
شیخ نیازی لشکر شاہی میں 346
مخدوم الملک کی فتنہ پردازی 347
علائی شیخ بدہ کی خدمت میں 348
شیخ علائی کی شہادت 349
خواص خان کا قتل 350
سلیم شاہ پر قاتلانہ حملہ 352
ہمایوں کے خلاف لشکر کشی 353
سلیم شاہ کی بیماری 354
سلیم شاہ کی وفات 355
سلیم شاہ کی لطیفہ گوئی 359

فیروز شاہ بن سلیم شاہ	360
بغاوتوں کا آغاز	361
ابراہیم خان کی بغاوت	363
ابراہیم اور سکندر میں مقابلہ	364
فتحہا آسمانی شد	366
ابراہیم خان کی شکست	367
ہیمو کی یلغار	368
ہولناک قحط	369
ہیمو کا دسترخوان	370
ابراہیم خان ٹھٹھہ میں	371
مالوہ کا حاکم باز بہادر	372
عدلی بہ حیثیت موسیقار	373
ہمایوں کی دوبارہ ہندوستان واپسی	374
بھکر کا محاصرہ	375
راجہ مالدیو کا بلاوا	376
امرکوٹ میں قیام	378
اکبر کی ولادت	379
اکبر کی گرفتاری	380
ہمایوں طہماسپ کی پناہ میں	381
ہمایوں کی مدد	382
قندھار کی فتح	383
قزلباشوں کی پسپائی کے اسباب	384
کابل کی فتح	385

کامران سے آخری جنگ 386

کامران کی وعدہ خلافی 387

کامران کی وفات 388

ہندال کا قتل 389

مولانا زین الدین محمود 390

ہندستان کی جانب کوچ 392

سکندر سور سے مقابلہ 393

پٹھانوں کی شکست 394

غازی محمد خان کا قتل 396

ہمایوں کی وفات 398

ہمایوں کی ذاتی خوبیاں 399

عہد ہمایونی کے شعراء

جنونی بدخشی 400

وفائی 401

نادری 401

فارغی 402

جاہی 402

حیدر تونی 403

طاہر دکنی 403

خواجہ ایوب 404

عرض مترجم

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کا شاہکار منتخب التواریخ کا اردو ترجمہ مکمل ہوا۔ مترجم کو یہ بھی احساس ہے کہ ترجمہ ایک نہایت دشوار اور پیچیدہ کام ہے جس میں روح مطلب کا مفقود ہونا عام بات ہے۔ بہرحال یہ ترجمہ ہے نہ کہ اصل تالیف، مزید برآں یہ کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں ہے جو سہو، اشتباہات اور کمیوں سے مبرا ہو۔

مؤلف منتخب التواریخ کا نام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی ہے جو شاعر تھے اور قادری تخلص کرتے تھے نیز فن تاریخ گوئی میں بھی ان کا منفرد مقام ہے۔ خاص طور سے یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی عہد وسطی کے معروف مورخ ابوالفضل کے معاصر ہیں۔ جن میں ایک کو دربار اکبری میں نہایت معتبر رتبہ ملا ہوا تھا اور دوسرا اپنی تمام کوششوں کے باوجود اس درجۂ اعتبار اور قربت کو حاصل نہ کر سکا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی ولادت 947 ہجری/ 1540-41 عیسوی میں ہوئی جس کے لیے شاہد منتخب التواریخ میں یوں آیا ہے:

”مجھے خدا نے 60 سال کی عمر میں لڑکا عطا کیا جس کا نام محی الدین رکھا، جس کی

ولادت بیاور میں ہوئی۔"

اسی طرح دوسری جگہ جلد اول میں عبدالقادر بدایونی رقم طراز ہیں:

"اس منتخب کا جامع 961 ہجری/ 1553-54 عیسوی میں 12 سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ تحصیل علم کے لیے سنبھل گیا تھا۔" حالانکہ ان کی ولادت اور 12 سال کی عمر کے اعتبار سے سنین میں اختلاف موجود ہے۔

قرآن کی تعلیم سے متعلق یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ انھوں نے میر سید محمد مکی سے قرآن پڑھا تھا جو سات قرأتوں کے قاری تھے۔ عربی کی تعلیم اپنے نانا مخدوم اشرف سے حاصل کی۔ بقول ملا عبدالقادر" 961 ہجری قمری میں 12 سال کی عمر میں میاں حاتم سنبھلی سے "قصیدۂ بردہ شریف' اور فقہ کی کتاب "کنز" کے بھی چند اسباق پڑھے تھے۔" عبدالقادر بدایونی نے بہت سے علوم کے لیے ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری سے رجوع کیا اور باقاعدہ ان علوم کو اپنے استاد مبارک ناگوری سے حاصل کیا۔ میر غیاث الدین جو نقیب خاں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں وہ ملا عبدالقادر بدایونی کے ہم سبق رہے تھے۔ ان کی شادی 975 ہجری میں بدایوں میں ہوئی تھی۔ جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک کی سفارش پر ملا عبدالقادر بدایونی کو 981 ہجری میں بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں جگہ ملی اور بقول اکبر: "یہ بدایونی عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا۔" کے مصداق دربار میں مامور ہوئے۔

قاضی علی کی سعی پیہم سے ملا عبدالقادر کو ہزار بیگھہ آراضی کی مدد معاش بھی دربار اکبری سے عطا ہوئی۔ دربار میں ملا عبدالقادر بدایونی کے ذمے ترجمہ، تصنیف اور تالیف کے علاوہ کتابوں کا انتخاب بھی تفویض ہوا۔ انہیں دربار سے "اتھربن وید" کے ترجمے کا کام ملا تھا مگر وہ اس کام میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ کام بعد میں ابوالفیض فیضی کے سپرد کیا گیا۔ بدایونی کی دوسری کتاب "الاحادیث" ہے جس میں تیر اندازی اور جہاد کے سلسلے کی 60 حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ ایک کتاب "تاریخ الفی" کے لیے ایک ٹیم کا قیام کیا گیا جو سات افراد پر مشتمل تھی جس کے ایک رکن ملا عبدالقادر بدایونی بھی تھے۔ نقیب خاں اور بدایونی

نے باہمی اشتراک سے "مہابھارت" کا ترجمہ "رزم نامہ" کے نام سے انجام دیا اور "رامائن" کو عبدالقادر نے 6 سال کی مدت میں انفرادی طور پر ترجمہ کیا تھا۔ "جامع رشیدی" کو ابوالفضل کے حکم اور مشورے سے ترجمہ کیا۔ "بحرالاسمار" جو کشمیر کی تاریخ ہے اور اس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کرایا تھا وہ بھی مکمل نہ ہو سکی تھی اس کی تکمیل بھی ملا عبدالقادر بدایونی نے کی۔ "نجات الرشید" کو بدایونی نے ذاتی طور سے اور "انتخاب تاریخ کشمیر" بھی بادشاہی حکم کے مطابق مکمل کیا۔ "منتخب التواریخ" ملا عبدالقادر بدایونی کی ضخیم اور 3 جلدوں پر مشتمل تاریخ ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کو علوم معقول و منقول دونوں میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی و فارسی ان کی گھٹی میں تھی اور وہ فارسی کے صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ملا کو نجوم، ریاضی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں سے بھی شغف تھا۔ تاریخ گوئی میں ان کا سکہ چلتا تھا اور انہیں عہد اکبری کے نابغۂ روزگار میں شمار کرنا حق شناسی کہی جائے گی۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جلال الدین محمد اکبر کے 60 سالہ واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ مزید اس کی سب سے عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی حیات تک اس تالیف کا راز افشا نہیں کیا۔ غالباً قوی امکان ہے کہ اس میں جگہ جگہ پر جو حقیقت بیانی کا عنصر ہے وہ ملا عبدالقادر کے نزدیک مصلحت اندیشی اور دوربینی کے نظریے سے پوشیدہ رکھنا ہی زیادہ مناسب رہا ہوگا۔ مگر جب عہد جہانگیری میں اس تاریخ کا شہرہ ہوا تو جہانگیر نے ملا عبدالقادر بدایونی کے بچوں کو بلا کر عتاب کیا اور باز پرس کی تو انھوں نے کہا کہ ہم تو چھوٹے اور ناسمجھ تھے۔ ہمیں اس کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ مزید ان بچوں نے ایک مچلکہ لکھ کر جہانگیر کو دیا تھا کہ اگر یہ ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے مستحق ہوں گے۔ منتخب التواریخ کا ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ ہے اور آخر کے دو سالوں کے حالات کو ملا عبدالقادر بدایونی نے خود جمع کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کو میر سید مہدی جونپوری کے داماد شیخ ابوالفتح گجراتی سے یک گونہ محبت و عقیدت کے باعث کچھ حضرات ملا عبدالقادر بدایونی پر مہدوی ہونے کا بھی الزام عائد کرتے ہیں۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ عہد اکبری کے واقعات اور معاملات کو صحیح زاویۂ نگاہ سے سمجھنے اور کوئی رائے قائم کرنے کے لیے جہاں اکبر نامہ از حد ضروری ہے وہیں منتخب التواریخ کے اندراجات کو بھی ”دیوانے کی بڑ“ کہہ کر خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مترجم کوئی مورخ نہیں ہے جو منتخب التواریخ کی تاریخی اہمیت اور خصوصیات پر رائے زنی کرے، البتہ فارسی زبان و ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاں تک اکبرنامے کا تعلق ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ ابوالفضل کی تاریخ کو سرکاری اور درباری تاریخ کا درجہ ملا ہوا تھا۔ اس لیے اکبر بذات خود ابوالفضل کے اندراجات کو پڑھوا کر سنتا تھا اور حسب مرضی اس میں ردّ و بدل بھی کیا جاتا تھا اس لیے کسی حد تک اکبر نامہ کو ہم ایک ایسی تاریخ کہہ سکتے ہیں جس میں بادشاہ وقت کی رائے اور مرضی و مزاج کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ غیر سرکاری اور شخصی و ذاتی نوعیت کی تاریخ ہے جس میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کو دخل نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں اگر بدایونی کو کسی بات سے اختلاف ہے تو شدید تنقید دیکھنے کو ملتی ہے جب کہ ابوالفضل کی تاریخ میں اس نوعیت کے اندراجات نہیں ہیں اور جو شاید ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اسی لیے ہمیں عہد اکبری کے معاملات کو معروضی طریقے سے درک و استفہام کے لیے جہاں اکبرنامہ کی ضرورت ہے وہیں منتخب التواریخ بھی اہم اور نہایت لازمی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ باتیں جنھیں ملا عبدالقادر بدیونی برملا نہیں کہہ سکتے تھے اسے انھوں نے خاتمہ میں نہایت اچھے پیرائے میں یوں بیان کردیا ہے جو منتخب التواریخ کی سبب تالیف بھی کہی جاسکتی ہے۔ ملا رقم طراز ہیں:

”میرے اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرے کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہتے اور اسے پڑھ کر کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ بہرحال مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری

یہ ساری آفرین اور نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی طرفداری میں ہے۔

ارباب تصنیف و تالیف کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتا کر کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف و تالیف کو منسوب کر کے اغراض و منافع کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی بھی طمع اور توقع کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانے کے حالات و حقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے اس کی گذشتہ ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ املاء و انشا کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنیاد پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات و حسنات جتلانے میں بھی اسے ذرہ برابر خوف نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے میں جو کہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں، ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، مزید اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے۔"

ظاہر ہے یہ سب بیانات ملا عبدالقادر بدایونی کی مصلحت کوشی، دور بینی اور دور اندیشی کی طرف واضح اور مثبت اشارے ہیں اور یہی منتخب التواریخ کی سب سے اہم اور جداگانہ اہمیت بھی ہے۔

اس ترجمے میں مترجم نے یہ خیال رکھا ہے کہ ہر باب کے اختتام پر ہی حواشی ثبت کر دیے جائیں جس سے قارئین کو کتاب کے آخر میں رجوع کرنے کی زحمت سے بچایا جا سکے۔

مترجم اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی سے بخوبی آشنا ہے۔ اس ترجمے میں کئی جگہ اشتباہات اور کمیاں ضرور راہ پا گئی ہوں گی۔ مزید برآں مترجم کی خواہش تھی کہ اس ترجمے کے ساتھ ساتھ اس ترجمے کے آخر میں اشاریۂ کتب، اشخاص اور اماکن بھی درج ہو جاتا مگر چونکہ ترجمہ پہلے ہی خاصا وقت لے چکا ہے اس لیے عملی طور پر اس کی گنجائش نہیں۔ مگر اس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ ممکن ہے دوسری اشاعت میں اس کام کو انجام دیا جاسکے۔ مزید اس کمی کو تفصیلی فہرست فراہم کرکے پُر کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ بہرحال جو بھی ہو سکا وہ پیش خدمت ہے۔ مترجم کی دلی خواہش ہے کہ صاحب علم ونظر اس ترجمے میں واقع کمیوں اور اشتباہات سے مترجم کو آگاہ فرمائیں گے تاکہ بعد میں اگر ممکن ہو تو اس کی اصلاح کی جاسکے۔

آخر میں مترجم پر لازم ہے کہ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ارباب حل وعقد کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرے۔ سب سے پہلے ادارہ ہذا کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر علی جاوید صاحب میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی ڈائرکٹرشپ میں فارسی کی ایک اہم تاریخی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ نیز محترمہ مسرت جہاں صاحب ریسرچ اسسٹنٹ کا شکریہ ادا کرنا بھی اس لئے لازمی ہے کہ ان کی انتھک کوششوں سے یہ کتاب منظر عام پر آرہی ہے۔

8/ ستمبر 2007ء

علیم اشرف خاں
ریڈر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی
دہلی 110007

حمد و نعت

حمد

ای یافتہ نامہا زنام تو رواج
شاہان بدرت چوما بدیشان محتاج
حالی کہ رسید صدمت غیرت تو
نی پای بکفش ماندہ نی فرق بتاج

(اے پروردگار تیرے نام سے ہی دنیا کے دیگر ناموں کو رواج عطا ہوا ہے۔ بادشاہ تیری چوکھٹ پر اسی طرح محتاج ہیں جس طرح ہم عام لوگ بادشاہوں کے درباروں میں خود کی ضرورت کی تسکین کے لیے دیکھتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہمیں پریشانیاں، دکھ اور مصیبتیں ملتی ہیں وہ تیری خدائی کے واضح ثبوت ہیں حالت یہ ہوگئی ہے کہ نہ کفش میں پیر ہی ہے اور نہ سر میں مانگ (یعنی اس قدر پریشانیاں، مصیبتیں اور

دکھ و آلام سے مجبور ہیں کہ نہ سر سنوارنے کا وقت ہی مل پاتا ہے اور نہ اتنی فرصت ہے کہ یہ دیکھ سکیں کہ پاؤں میں جوتا ہے بھی یا نہیں)۔

اے دو جہاں کے مالک! یہ دل جو دنیا کی لالچ میں پریشان ہے، یہ پریشان دل جو صرف دنیا کا ہو چلا ہے کیسے تصور کر سکتا ہوں کہ تیری طرف راغب ہو، میری زبان جو تیرے پاک نام لینے کے قابل بھی نہیں، کیسے ممکن ہے کہ اس ناپاک زبان سے تیری تعریف کروں:

چہ زہرہ خاک مسکین را کہ توحید خدا گوید
بدین آلودگی خاک مقدس را ثناء گوید

(زمین کے ایک مسکین کی یہ حیثیت کہاں کہ وہ خدا کی توحید بیان کر سکے اور اس مٹی کی آلودگی سے بنا یہ انسان حقیر، خدا جیسے عظیم مالک کی تعریف و توصیف میں خود کو ناقص سمجھتا ہے)

میں اس راستے سے جو تو نے معین کر رکھا ہے ناواقف ہوں! میری زبان تیری تعریف کی راہ میں سست ہے تیری تعریف میرے اندر پیدا ہی نہیں ہوتی۔

آنچہ دل داند حدوث است آنچہ لب گوید حروف
من بدل چون دانست یا بازبان چون خواست

(دل جو کچھ جانتا ہے وہ حدوث ہے جو کچھ ہونٹ کہتے ہیں وہ حروف ہیں یعنی الفاظ ہیں تو جو کچھ بھی تیرے بارے میں دل سے جانتا ہوں وہی کہتا ہوں اور جو کچھ بھی تیرے بارے میں سمجھتا ہوں اسے زبان سے بیان کرنے کی حقیری کوشش کرتا ہوں)

اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے قلم کو اس میدان سے الگ رکھوں اور خود کو دنیا والوں

کے حالات پر غور وفکر کرنے سے باز رکھوں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے قریب جاؤں ان کا مطالعہ کروں اور ان کی پاک ذات پر غور کروں اور انھیں سمجھنے کی کوشش کروں۔

نعت

دوئی را نیست رہ حضرت تو
ہمہ عالم توئی و قدرت تو

(حضرت پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل عالم ہیں اور آپ کی قدرت کا جلوہ دنیا میں چمک روشن ہے۔)

اپنی زبان پر محمدؐ کا نام لاؤں اور ان کے فیض سے اپنی زبان کو معطر کروں جن کی ذات پاک، ازل اور ابد کے لیے ہے اور جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو قائم کیا ہے۔

شاہ عربی کہ شد جہان مظہر او
سوگند سرش گفت جہان ﷺ
ہمسایۂ حق بود ازاں سایہ نداشت
تا پا تنہد کسی بجائی سر او

(شاہ عربی یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات گرامی دنیا میں ظاہر ہوئی اور ساری دنیا ان کے سر کی قسم کھاتی ہے ان کا پڑوسی سچ کہتا تھا کہ آپ صلعم کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا یہ بھی خدا کی بزرگی، عظمت اور ساری دنیا کے مالک و پروردگار کا فیض تھا کہ آپ کی ذات کے سائے پر کوئی انسان جہاں آپ کے سر کا سایہ

پڑے اپنے پاؤں نہ رکھ سکے۔ یہ خدا کی قدرت کا نشان ہے۔)

ہزاروں ہزار تحسین و آفرین ہو ان کے حق میں خصوصاً خلفائے راشدینؓ پر جنھوں نے پرچم اسلام بلند کرنے اور کلمۂ حق کے لیے اپنی جانیں نثار کیں، اپنے سر فدا کیے اور ہر طرح کے کفر و بدعت کے خار و خاشاک سے ملک شرع کی وادی کو پاک کیا۔

علم تاریخ

حمد الٰہی اور نعت حضرت رسالت محمدؐ کے بعد اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ علم تاریخ ایک علم شریف اور فن لطیف ہے۔ اس لیے یہ اہل خیر کا سرمایۂ عبرت اور اہل عقل کا آئینۂ تجربات ہے۔ اصحاب قصص اور سیر نے حضرت آدمؑ سے لے کر زمانۂ حال تک اس فن میں بڑی معتبر اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور اس کی حقیقت کا ثبوت دلائل و براہین سے بہم پہنچایا ہے۔ اس لیے یہ خیال کبھی دل میں نہیں لانا چاہیے کہ ضعیف العقیدہ اور شقی طبیعت رکھنے والوں نے اس علم کے مطالعے کے متعلق جو خیال آرائی کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس سے مسلمان شریعت محمدی کی راہ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں اور ہوا و بدعت کے مکدر چشموں کے کنارے اترتے ہیں، اس لیے کہ جس گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ اسے فطری طور پر دین حق سے لگاؤ نہ ہو اور کلام ازلی جو سعادت ابدی کی کلید ہے اور دونوں جہان کے لیے رحمت و شفا ہے اس کی تلاوت سے بھی اس کی شقاوت قلبی نہ گئی ہو اور وہ خسران جاوید میں رہ گیا ہو۔ ” واذا یمتدوا به فیقولون هذا امك قدیم “ جب قرآن مجید کے بارے میں اس کی یہ رائے ہو تو پھر علم تاریخ اس کی زد سے کیسے بچ سکتا ہے۔

چو حس سمع از مالیخولیا ضائع شود کس را
نیابد بہرہ از مزمار داؤدی والحانش

مگر ہمارے مخاطب وہ اصحاب ہیں جو سلامتی طبع، جودت ذہن اور شیوۂ انصاف کے حامل ہیں، نہ کہ وہ جماعتیں جو شرع شریف کی پابند نہیں اور اصل و فرع کی منکر ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے لوگ تخاطب کے قابل نہیں اور ان کا شمار اہل اختیار اور اولی الابصار کے زمرے میں نہیں ہوتا۔ بھلا ایسے علم کا کوئی شخص کیسے منکر ہوسکتا ہے جس کی فضیلت کا یہ حال ہو کہ اسے سبع مثانی کی ساتویں آیت کا درجہ حاصل ہوا اور سبع[1] مثانی کی اہمیت ظاہر ہے کہ اسے ایمان اور یقین کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

وَكُلًّا نقص عليك من ابناء الرسل ما نثبت به فؤادك۔ یہ آیۂ شریفہ اس کا بیّن ثبوت ہے اور علمائے حدیث و تفسیر کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں امام بخاریؒ[2] اور قاضی بیضاوی[3] سے لے کر ہمارے اپنے زمانہ تک کے علمائے کرام شامل ہیں۔ ان سب نے اس دل پذیر علم کو اپنا مشغلۂ تحریر بنائے رکھا اور اقوام مشرق و مغرب جو اگرچہ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں وہ بھی ان کے قول و عمل کو مستند سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل بدعت کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے اور اس کی یہ بدبختی ہے کہ اپنے نفس امارہ کے تعصب اور ظاہر و باطن کی کوتاہ بینی سے انہوں نے اس حد تک جرأت کی کہ قابل یادگار اور صحیح تاریخ کے واقعات کو باہم خلط ملط کیا اور اس طرح ان کے حقیقی مفہوم کو خبط کر دیا۔ اس نے مسلم ترکیبوں، تشریکوں اور وضاحتوں کے اسلوب کو ترک کر کے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے معرکوں اور مناظروں کا قیاس اپنے زاویۂ نظر سے کیا اور ان کی بنا حصول دولت اور خاندانی جاہ و حشم کے ذاتی تقاضوں پر رکھی۔ یقیناً یہ گروہ ایسے سادہ لوح لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوا جو پہلے ہی ضعیف الاعتقاد تھے اور اس نے اپنی غلطیوں کو ان پر محمول کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے آپ کو بھی اور اپنے ساتھ ان کو بھی دارالبوار جہنم میں پہنچایا۔

انا کان الغراب دلیل قوم
سیهدیهم لسبل الهالکنا

اور جس شخص کی آنکھیں سرمۂ توفیق اور نور یقین سے منور ہوں ہر وہ سانحہ جو اس عالم کون و فساد میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کی سطح سے بالاتر ہو کر وہ اس ذوالجلال صانع قدیم کی وحدت کو پالیتا ہے، جو حدوث کے عیب سے منزا اور تغیر و انتقال کے داغ سے پاک ہے اور میں اپنے چاروں طرف بغور دیکھتا ہوں تو یہ دنیا مجھے بذات خود ایک قدیم کتاب نظر آتی ہے جس کا کوئی سر ہے نہ پیر اور اس کے تمام اوراق پراگندہ ہیں، مگر اس کے ہر ورق پر افراد انسانی کی کسی ایسی جماعت یا گروہ کے احوال و کوائف درج ہیں جس کے ہاتھ میں زمام اختیار دی گئی تھی۔

ز احوال شہان گیتی بود شہنامہ کہنہ
تو دائم از سر عبرت دروی بین و میخوانش
فسون این فسانہ خواب خوش می آورد آنرا
کہ سرسائی است و از سودا دماغ آمد پریشانش
ولی بیدارہم می سازد آن کس را کہ از نخوت
بخواب غفلت افتاد است و بازی دادہ شیطانش

سبب تالیف کتاب

بنی نوع انسان کے اس دعا گو عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے 999ھ 1590-91ء کے اوایل میں حضرت خلیفۂ زمان ظل الہی اکبر شاہ حکمران ہندستان کے حکم کے تعمیل میں انتخاب تاریخ کشمیر[4] کا ہندی سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے سے فراغت پائی۔ مجھے چونکہ بچپن سے بڑھاپے تک اس علم (تاریخ) سے لگاؤ رہا، اس لیے اس عرصہ میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ میں اس علم کے مطالعہ یا تحریر میں مشغول نہیں رہا، خواہ وہ اپنی

رغبت سے تھا یا کسی دوسرے کی حکم کی تعمیل میں، چنانچہ بارہا میرے دل میں آیا کہ درالسلطنت دہلی کے سلاطین کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھا جائے۔

جملہ عالم روستا چند آن سواد اعظم است

ابتدائے اسلام کے زمانہ سے لے کر اس زمانہ تک (زمانہ تحریر کتاب تک) مختصراً لکھا جائے تا کہ ہر سلطان کے احوال کی وہ ایک ایسی اجمالی یادداشت ہو جو احباب کے لیے تذکرے کا کام دے اور لوگ اس تذکرے سے فائدہ اٹھائیں اور ارباب بصیرت کی نظر میں اسے تبصرے کی حیثیت حاصل ہو۔ اگرچہ میرے پاس اس موضوع پر کوئی کتاب یا تصنیف نہیں پھر بھی بقول شاعر۔

این کہن اوراق گردون کش زانجم زیور است
کہنہ تاریخ بسی شاہان انجم لشکر است

ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے عام لوگوں یا خاص لوگوں میں سے کسی کے دل پر اپنا نورانی پرتو ڈالے اور وہ ترک دنیا کے جذبے کے تحت اس سرائے فانی کی محبت اپنے دل سے نکال کر ان اوراق جامع کی جانب رجوع ہوں۔ چنانچہ میں امید کرتا ہوں کہ میری یہ کوشش رنگ لائے گی۔ جب کہ ہر دن نئے نئے غم زندگی میں آتے ہیں اور مشکلیں ایک نئے انداز اور نئے رنگ میں زندگی میں رونما ہوتی ہیں اور مدد کم ملتی ہے۔ ان حالات کے باعث وقت اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک جگہ قیام کیا جائے:

ہر روز بمنزلی و ہر شب جائی

اور اس پر میرے ذریعۂ معاش کی کوئی مستقل اور یقینی صورت نہ تھی اور وہ زمین و آسمان کے مابین معلق تھا۔ یہ پریشان دل اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی جدائی میں پریشان تھا، اس لیے میرے مقصد کی تکمیل میں تاخیر لازمی تھی، مگر اسے حسن اتفاق کہیے کہ

میرے مہربان اور شفیق دوستوں میں سے ایک نے تاریخ نظامی [5] کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ میرے اس دوست کو دین سے کافی لگاؤ تھا۔ اس فقیر سے بھی اسے محبت تھی اور اس فقیر کو بھی اس کے ساتھ انس تھا مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ رخت حیات باندھ کر فردوس اعلیٰ کی جانب روانہ ہو گیا ہے:

او رفت و روئیم ما بدنبال
آخر ہمہ را بود ہمین حال

اس مرحلہ پر جب کہ زمانے نے مجھے قدرے فرصت سے نوازا تو میں نے اپنی زندگی کے گونا گوں اوقات کا ایک حصہ چرا لیا جس سے میرے اس مقصد میں نئی جان آ گئی اور میرا ارادہ زیادہ مستحکم ہو گیا۔ چونکہ ماضی ہمیشہ مستقبل پر اثر انداز رہا ہے بقول شاعر

آنر دہقان نہ خرمن کند پاک
گذارد حصہ گنجشک در خاک

میں نے بھی مناسب سمجھا کہ ہندستان کے صاحب استقلال سلاطین کے حالات قلم بند کروں، چنانچہ تاریخ مبارک شاہی [6] اور نظام التواریخ [7] دونوں کو پیش نظر رکھا۔ کچھ مواد اس سے اخذ کیا اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ میری اس تصنیف کو ان دونوں تاریخوں سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو بحر زخار سے اور حباب کو تیز و تند طوفان سے، میں نے اپنی اس تصنیف میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور استعارات سے بھی احتراز کیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا نام میں نے "منتخب التواریخ" رکھا جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ بادشاہان اسلام کے فرخندۂ فرجام ناموں کو باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس مؤلف کی ایک یادگار بھی اس سرائے مستعار میں رہ جائے۔ امید ہے کہ یہ ناتمام تالیف آخرت میں میری مغفرت کا موجب ہوگی نہ باعث اضافہ گناہ:

تو ای بلبل چو بخزای درین باغ
بہر لحنی تگیری نکتہ بر زاغ

چونکہ میری اس تحریر کا مقصد دیانت اور ایمانداری کا پرچم بلند کرنا ہے، اگر اتفاقاً کوئی سہو اور لغو الفاظ زبان قلم پر آجائے تو امید ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اسے اپنے کرم عمیم سے درگذر کرے گا اور بخش دے گا:

ب بد گفتن زبان من مگردان
زبان من زیان من مگردان

چونکہ محمد بن قاسم (چچا زاد بھائی اور داماد حجاج بن یوسف ثقفی) بلاد سندھ، ملتان اور گجرات فتح کرنے کے بعد ولید بن عبدالملک مروانی کے حکم نامہ کی تعمیل میں شہزادوے پور سے روانہ ہوا تھا، اور راستے ہی میں اپنے آپ کو چرم خام میں سلوا کر جان بحق تسلیم ہو گیا تھا۔ اس لیے ہندستان کے مفتوحہ شہروں میں احکام اسلامی کی ترویج اور پابندی کا انتظام نہ ہوسکا۔ یہ سعادت ناصر الدین سبکتگین اور اس کے فرزند سلطان محمود غزنوی ہی کو نصیب ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف ہندستان کو فتح کیا بلکہ اسلام کا جھنڈا بھی اس سرزمین پر بلند کیا اور احکام اسلامی کی ترویج اور پابندی کا انتظام کیا۔ سلطان محمود غزنوی جو ہر سال غزوہ اور جہاد کی نیت سے ہندستان آتا تھا، اس کی اولاد نے لاہور کو پایہ تخت بنایا۔ یہاں تک کہ ان علاقوں میں اسلام کے پیر مضبوطی سے جم گئے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کی ابتدا اس سلطان عاقبت محمود سے کی جائے جس کی ابتدا بھی مسعود تھی اور انتہا بھی محمود۔ واللہ خیر الناصرین و المعین۔

غزنوی عہد حکومت

سلطان ناصر الدین سبکتگین سے خسرو ملک تک

سرزمین ہند پر اسلامی حکومت کا بانی جس نے دہلی فتح کرنے سے قبل ہی اسلام کا ڈنکا بجا دیا۔

عہد حکومت 367ھ/978-79ء سے 582ھ/1186-87ء تک

سلطان ناصر الدین کا تعلق ترک نسل سے تھا اور الپتگین کا غلام، مزید الپتگین خود امیر منصور 9بن نوح سامانی کا غلام تھا۔ الپتگین کے فرزند ابو اسحاق کی وفات کے بعد افواج اور رعایا کی متفقہ رائے سے سبکتگین تخت نشین ہوا۔ اس نے پرچم فتح و نصرت بلند کیا اور غزوہ و جہاد کے جذبۂ بے پناہ سے وہ کوہ جود 10 کے راستہ عازم ہندوستان ہوا اور راجہ جے پال کے ساتھ جو اس وقت ہندوستان کا ایک فرماں رواں تھا، ایک عظیم جنگ لڑی مگر اس جنگ کا انجام باہمی مصالحت پر ہوا۔ بعد میں راجہ جے پال نے عہد شکنی کی اس لیے سبکتگین نے

دوبارہ ایک لاکھ سوار اور بے شمار کوہ پیکر ہاتھیوں کے ساتھ اس پر چڑھائی کی اور لمغانات 11 کے نواح میں طرفین کی فوجوں کی آپس میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اس بار بھی نسیم ظفر متدی ناصر الدین سبکتگین کے پرچم کی طرف چلی اور راجہ جے پال نے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی۔ اس لمغانات کا تمام علاقہ سبکتگین کے قبضہ میں آیا، اس کے نام کا خطبہ ہر طرف پڑھا گیا اور اسی کا سکہ بھی جاری ہوا۔ پھر وہ یہاں سے لوٹا اور امیر نوح بن منصور سامانی کی مدد کو خراسان اور ماوراء النہر کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں کی عظیم فتوحات اسی کی مرہون منت تھیں۔ اس نے ماہ شعبان 387ھ / 997ء میں انتقال کیا۔ انھوں نے بیس سال تک حکومت کی۔

یمین الدولہ سلطان محمود بن ناصر الدین سبکتگین

غزنی کے راستے ہی میں جب ماہ شعبان 387ھ /998ء میں سبکتگین نے داعی حق کو لبیک کہا۔ اس سے قبل سبکتگین اپنے فرزند اسمٰعیل کو اپنا ولی عہد مقرر کر چکا تھا۔ جب اس بات کی خبر محمود کو ملی تو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو تعزیتی خط لکھا جس میں بطور مصالحت یہ تجویز بھی پیش کی کہ وہ غزنی کا علاقہ محمود کے حوالے کر دے اور اس کے عوض بلخ کی گورنری قبول کر لے۔ اسمٰعیل نے اس سے صاف انکار کر دیا، چنانچہ دونوں بھائیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ محمود کو فتح نصیب ہوئی اور اسمٰعیل چھ ماہ تک قلعہ بند رہا۔ آخر اس خاندان کے چند خیر خواہوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں بھائیوں میں صلح کرا دی۔ اسمٰعیل خود محمود کے پاس گیا اس کے بعد حکومت یمین الدولہ سلطان محمود کے ہاتھ آئی۔ اس اثناء میں سلطان محمود اور امیر منصور بن نوح سامانی اور اس کے بھائی عبدالملک بن نوح سامانی کے درمیان کشیدگی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ جنگ کی نوبت آ گئی۔ عبدالملک کے ساتھی، امراء، اور فائق بھی میدان جنگ میں اتر آئے، مگر ان میں سے کوئی بھی سلطان محمود کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ ہر ایک نے شکست کھائی اور غزنی سے لے کر خراسان اور حدود ہندستان کی تمام سلطنت سلطان محمود کے قبضے میں آ گئی۔ چونکہ اس کی ماں رئیس زابل (قندھار) کی دختر تھی اس لیے اسے بھی محمود زابلی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فردوسی بھی شاہنامہ

میں لکھتا ہے:

خجستہ درگہ محمود زاولی دریاست
چگونہ دریا کہ آنرا کنارہ پیدا نیست
شدم بدریا، غوطہ زدم، ندیدم دُر
گناہ بخت من است این گناہ دریا نیست

حکومت کے ابتدائی ایام میں خلیفۂ بغداد القاضی باللہ عباسی اور سلطان محمود کے درمیان کسی وجہ کی بنا پر تلخ اور ناگوار خط و کتابت شروع ہو گئی۔ خلیفہ عباسی نے اسے بڑی تدبیر سے ختم کیا۔ چنانچہ اس نے ایک خلعت فاخرہ اور دیگر بیش بہا تحائف و جواہر کے ساتھ سلطان محمود کے لیے بھیجے اور اسے ''امیر الملت یمین الدولہ کا خطاب عطا کیا۔'' سلطان محمود 387ھ/997ء میں غزنی سے بلخ اور ہرات پہنچا اور وہاں کے اختلافات حل کرنے کے بعد واپس غزنی آیا۔ اس کے بعد متعدد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور چند قلعے فتح کیے۔ عسجدی نے انہی اطراف کے ایک سفر میں یہ قصیدہ لکھا تھا:

چون شاہ خسروان سفر سومنات کرد
کردار خویش را علم معجزات کرد

ماہ شوال 391ھ/1000ء میں سلطان محمود نے غزنی سے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس کے ہمراہ دس ہزار سوار تھے۔ سب سے پہلے اس نے پشاور فتح کیا، پھر انہی حدود پر اس کا مقابلہ راجہ جے پال سے ہوا جو بے شمار سوار اور پیادہ لشکر اور تین سو ہاتھیوں کے ساتھ مقابلے میں آیا۔ دونوں طرف سے خوب داد شجاعت دی گئی مگر آخر کار سلطان محمود کو فتح نصیب ہوئی۔ راجہ جے پال اپنے پندرہ رشتہ داروں کے ساتھ گرفتار ہوا جن میں اس کے بھائی اور بیٹے بھی شامل تھے۔ اس معرکے میں پانچ ہزار لوگ جان بحق ہوئے اور مال غنیمت کی ایک کثیر مقدار فاتحین کے ہاتھ آئی۔ راجہ جے پال کے گلے کا ہار جس کی قیمت

ایک لاکھ اسی ہزار دینار کے قریب تھی، اس کے علاوہ اس کے دوسرے رشتہ داروں کے گلے کے بیش قیمت ہار بھی اس میں شامل تھے۔ سلطان محمود کو یہ فتح بروز ہفتہ 8/محرم الحرام 392ھ مطابق 1001ء کو نصیب ہوئی۔ یہاں سے وہ تھرہندہ[12] کی جانب بڑھا، یہ مقام راجہ جے پال کی قیام گاہ تھی محمود نے اسے فتح کرلیا۔

اس کے بعد پھر ماہ محرم 393ھ/1002-03ء میں وہ غزنی سے براہ سیستان عازم ہندستان ہوا اور ملتان کے نواح میں بھاتیہ[13] جہاں کے راجہ بیجے رائے نے، اس کی آمد کی خبر پاتے ہیں ڈر کے مارے اپنے آپ کو خنجر سے ہلاک کرلیا۔ اس کا سر سلطان محمود کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد ہلاک ہوئی۔ سلطان محمود کو دو سو ستر ہاتھی مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔ داؤد بن[14] نصر ملحد حاکم ملتان نے بھی خائف ہو کر اطاعت قبول کر لی اور سالانہ بیس مرتبہ بیس بیس ہزار درہم تاوان دینے کا وعدہ کیا۔ سلطان محمود جس وقت ملتان کی جانب بڑھ رہا تھا تو راجہ جے پال کے بیٹے انند پال سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی تھی مگر جنگ کے بعد وہ کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان[15] محمود اس کے بعد براستہ ملتان[16] پہنچا یہ واقعہ 396ھ/1005-06 میں پیش آیا۔

اس کے اگلے ہی سال 397ھ/1006-7 میں سلطان محمود اور ماوراء النہر کے بادشاہ ایلک خان کے مابین جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود غالب آیا اور 403ھ/1012ء میں ایلک خان کی وفات ہوگئی۔

398ھ/1007ء میں سلطان محمود ترکستان میں داخل ہوا اور ترکوں کے جھگڑے سے فارغ ہوکر اس نے سندھ کے راجہ سکھ پال نورسہ شاہ کا تعاقب کیا۔ وہ گرفتار ہوا اور قید میں ہی مرگیا۔ یہ وہی راجہ سکھ پال تھا جس نے ایک بار اسلام قبول کرلیا تھا اور اسی بنا پر اسے ابو علی سجوری کی قید سے رہا بھی کیا گیا تھا مگر وہ دوبارہ اہل شرک وارتداد میں شامل ہوگیا۔

399ھ/1008ء میں سلطان محمود نے پھر ہندستان کا رخ کیا اور راجہ انند پال کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں راجہ انند پال ہار گیا اور بے حد و حساب مال غنیمت سلطان محمود کو ملا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر قلعہ بھیم نگر[17] میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوا اور

وہاں کے خزانوں اور دیگر قیمتی چیزوں پر قبضہ کرلیا۔ جو بھیم کے زمانہ سے مدفون اور محفوظ تھے۔ 400ھ/1009ء میں اس نے حکم دیا کہ سونے اور چاندی کے وہ تمام تخت بے اندازہ دولت اور کثیر اموال غنیمت جسے وہ ہندستان سے لایا تھا دربار میں پیش کیے جائیں۔ چنانچہ سونے چاندی کے تخت دربار میں بچھائے گئے اور تمام مال و دولت کو اوپر نیچے رکھ کر اس کی نمائش سے اصل مقصد لوگوں کو مرعوب کرنا تھا۔

401ھ/1010ء میں سلطان محمود نے پھر غزنی سے ملتان کا قصد کیا، اور اس علاقہ کے باقی ماندہ حصے پر بھی قابض ہوگیا۔ اس نے یہاں کے بہت سے قرامطہ[18] اور ملاحدہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارا اور جو بچ رہے انھیں قلعہ میں بند کردیا یہاں تک کے وہ مر گئے۔ داؤد بن نصر حاکم ملتان کو غزنی لے جاکر قلعہ غوری (غورک) میں مقید کردیا اور وہ اسی کے اندر مرگیا۔ 402ھ/1011ء میں سلطان محمود نے تھانیسر کا عزم کیا اور راجہ جے پال ثانی پچاس ہاتھی اور دیگر اموال وتحائف بطور نذرانہ لے کر پیش ہوا مگر سلطان محمود نے اسے قبول نہ کیا۔ اس لیے کہ تھانیسر بتوں اور مندروں کی وجہ سے مشہور تھا اور سلطان محمود کے پیش نظر بھی (صرف بت شکنی) تھی اور وہ اسی مقصد سے یہاں آیا بھی تھا جس کی حفاظت کی خاطر بے شمار ہندوؤں نے اپنی جانیں دیں۔ سلطان محمود اس بت کو اٹھوا کر غزنی لے گیا اور حکم دیا کہ اسے دربار کے آستانے پر رکھ دیا جائے تاکہ لوگ اس کے اوپر سے چل کر گزریں اور اسے پامال کریں۔ اس میں سے ایک بت چکرسوم نامی[19] تھا۔

403ھ/1012ء میں سلطان محمود نے غرجستان فتح کیا۔ اسی سال ایک قاصد عزیز مصری کی طرف سے آیا اور جب سلطان کو معلوم ہوا کہ قاصد مذکور کا تعلق فرقہ باطنیہ سے ہے تو ذلت کے ساتھ اسے واپس کردیا۔

404ھ/1013ء میں سلطان محمود نے شہر بندنہ[20] پر لشکر کشی کی۔ یہ شہر بال ناتھ کے پہاڑوں میں واقع تھا۔ راجہ جے پال ثانی نے کچھ فوج اس قلعہ کے دفاع کے لیے مقرر کی اور خود درۂ کشمیر کی جانب چلا گیا۔ چنانچہ سلطان محمود نے یہ قلعہ بڑی آسانی سے مسخر کرلیا اور اس کی نگرانی اور حفاظت کا کام سارغ کوتوال کے سپرد کرکے خود راجہ جے پال ثانی کے

تعاقب میں نکلا اس کوہستانی علاقے سے اس کے ہاتھ کثیر مال و دولت آیا، بے شمار دشمن تہ تیغ ہوئے اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی اور کچھ کو قیدی بنا کر غزنی روانہ کیا گیا۔

406ھ/1015ء میں سلطان محمود پھر کشمیر کی تسخیر کے لیے نکلا اور لوہر کوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر جلد ہی اسے اس محاصرہ سے دست کش ہونا پڑا اس لیے کہ برف باری اور بارش کی زیادتی نے اسے پریشان کر دیا تھا اور کشمیریوں کو پیچھے سے مسلسل کمک بھی پہنچ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی پوزیشن پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ غزنی واپس جا کر سلطان محمود نے اپنی ہمشیرہ کا عقد ابوالعباس شاہ ابن مامون خوارزم شاہ کے ساتھ کر دیا اور اپنی ہمشیرہ کو اس کے پاس بھیج دیا۔

407ھ/1016ء میں کچھ بدمعاشوں اور دیگر انتہا پسندوں نے مل کر سلطان محمود کے بہنوئی ابوالعباس شاہ کو قتل کر دیا۔ جب سلطان محمود کو اس کی اطلاع ملی تو وہ غزنی سے بلخ اور پھر وہاں سے خوارزم پہنچا اور وہاں کے سپہ سالار سے اس کی خونریزی جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود کو فتح ہوئی اور اس نے اس علاقہ کی حکومت پر التون تاش کو مقرر کیا اور اسے خوارزم شاہ کا خطاب عطا کیا اس سے اس نے اپنے بہنوئی کے قاتلوں کی خبر لی اور ان کا صفایا کر کے غزنی واپس آ گیا۔ 408ھ/1017ء میں قنوج پر قبضہ کرنے کی غرض سے سلطان محمود غزنی سے روانہ ہوا اور ہندستان کے سات خوفناک دریاؤں کو عبور کر کے جب وہ قنوج پہنچا تو یہاں کے فرمانروا کورہ[21] نے بلا چون و چرا اطاعت قبول کر لی، تحفہ پیش کرنے اور جان کی بخشش کی اجازت مانگی۔ اس کے بعد سلطان محمود نے قلعہ برنہ[22] کا رخ کیا جہاں کے حکمران ہردت نے جب یہ سنا تو قلعہ اپنے عزیزوں کے سپرد کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ اہل قلعہ نے بھی جب یہ دیکھا کہ وہ مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے تو ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور تیس ہاتھی بطور نذرات پیش کیے اور پناہ چاہی۔ یہاں سے دریائے جمنا کے کنارے قلعہ مہاون[23] پہنچا۔ جہاں کے حاکم کلچند کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے ہاتھی سواروں کو حکم دیا کہ وہ اسے دریا کے پار بھگا کر لے چلیں۔ اسی اثناء میں سلطان محمود بھی مع

اپنے لشکر سے آ پہنچا، خوف کے مارے کل چندر نے اپنی تلوار سے خودکشی کر لی۔ رفت بدوزخ ہم ازآن راہ آب

زیستن چون بکام خصم بود
مردن از زیستن بسی بہتر

قلعہ قنوج سر کرتے وقت 85 ہاتھی اور بے شمار مال غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمود شہر متھرا کی جانب بڑھا۔ یہ شہر ہندوؤں کی پاک جگہوں میں سے ایک تھا ان کے مطابق یہ شہر کرشن بن باسن دیو کی جائے پیدائش تھی جسے ہندو خدا مان کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ یہاں اتنے معبد (مندر) تھے کہ اسے کفر کی کان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس شہر کو سلطان نے بغیر جنگ کیے پامال کیا اور بے شمار مال غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ یہاں سونے کا ایک بت بھی تھا جسے سلطان محمود کے حکم سے توڑ ڈالا گیا۔ اس بت کا وزن 993 مثقال اصلی سونا تھا اور یاقوت کا ایک ٹکڑا بھی اس میں ایک جگہ پیوست تھا جس کا وزن 450 مثقال تھا۔ ایک کوہ پیکر ہاتھی جو ہندستان کے راجاؤں میں سے ایک راجہ گوبند چند کی ملکیت تھا۔ سلطان محمود نے اس کی شہرت سن رکھی تھی اور اس کے دل میں اس کو خریدنے کی تمنا تھی مگر وہ کسی طرح پوری نہیں ہوئی تھی۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ ایک دن وہی ہاتھی بغیر فیل بان خیمہ شاہی میں داخل ہوا اسے دیکھ کر سلطان محمود کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، چنانچہ اس نے اس کا نام اسی مناسبت سے خداداد رکھا۔ اس یلغار کے بعد جب سلطان محمود غزنی پہنچا تو اس کے ساتھ 2 کروڑ 53 ہزار درہم اور ساڑھے تین سو سے زیادہ ہاتھی مال غنیمت کے طور پر تھے۔

410ھ 1019ء میں سلطان پھر ہندستان پر حملہ آور ہوا اور کالنجر کے راجہ نندا سے دریائے جمنا کے کنارے اس کا سخت مقابلہ ہوا۔ راجہ نندا کے پاس 45000 پیادہ فوج اور 640 ہاتھی تھے اس نے راجہ قنوج کو بھی اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اس نے سلطان محمود کی

اطاعت قبول کر لی تھی اور راجہ جے پال جو کئی بار سلطان محمود سے شکست کھا کر بھاگا تھا اس کی بھی مدد کی تھی مگر اتنے بڑے لشکر کے باوجود سلطان محمود کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکا اور ڈر کے مارے اپنا جملہ ساز و سامان چھوڑ کر چند خاص مصاحبوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ جب سلطان شہر میں داخل ہوا تو اسے شہر خالی ملا۔ فوج اور دیگر حفاظتی دستوں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ چنانچہ اسے خوب لوٹا۔ پھر اس کے بعد راجہ نندا کا تعاقب کرتے ہوئے جب عساکر سلطانی ایک جنگل میں پہنچی تو وہاں 580 ہاتھی اس کے ہاتھ آئے۔ سلطان محمود یہ تمام تر مال و دولت لے کر غزنی پہنچا۔ اس مہم میں اکثر بڑے شہروں پر محمود نے قبضہ کر لیا اور لوگوں نے اسلام مذہب کو دل کھول کر قبول کیا۔

412ھ/ 1021ء میں سلطان محمود ایک بار پھر کشمیر پر حملہ آور ہوا اور ایک ماہ تک اس نے قلعہ سوہر کوٹ کا محاصرہ کیا مگر وہ اتنا مستحکم تھا کہ فتح نہ ہو سکا۔ سلطان محمود اسے چھوڑ کر لاہور کی جانب روانہ ہوا اور موسم بہار کے شروع ہوتے ہی غزنی لوٹ گیا۔

413ھ/ 1022ء میں سلطان محمود نے پھر راجہ نندا کے علاق کا رخ کیا اور جب قلعہ گوالیار پہنچا تو بغیر کسی رکاوٹ کے وہ فتح ہو گیا اور وہاں کے حاکم سے نذرانہ قبول کرنے کے بعد سلطان محمود نے پھر اسی کو حاکم مقرر کیا۔ اس نذرانہ میں 35 ہاتھی شامل تھے۔ یہاں سے کالنجر پہنچا جہاں کے حکمران راجہ نندا نے تین سو ہاتھی کی پیش کش کی اور جان کی امان مانگی۔ اس کے علاوہ راجہ نندا نے ہندی زبان میں ایک قصیدہ بھی سلطان کی مدح میں بھجوایا۔ جسے سلطان اپنے ملک کے دانشور اور ہندوستان کے دانشوروں کو سنایا۔ سب نے اسے بے حد پسند کیا اور سلطان محمود کو خود بھی اس پر فخر و ناز تھا چنانچہ اس کے صلے میں اس نے راجہ نندا کو پندرہ قلعوں کا حکمران مقرر کر دیا۔ راجہ نندا نے بھی سلطان محمود کے حضور بے حساب زر مال اور جواہر ہدیہ بھیجے۔ اس مہم سے سلطان خوشی خوشی غزنی واپس پہنچا۔

414ھ/ 1023ء میں سلطان محمود نے اپنی عساکر قاہرہ کا اور ان لشکروں کا جو اطراف میں متعین تھے محاسبہ کیا تو یہ سب 54 ہزار سوار اور تیرہ سو ہاتھی احاطۂ تحریر میں آئے۔

415ھ/ 1024ء میں سلطان محمود بلخ پہنچا۔ جب اس نے دریائے جیحون پار کیا تو ماوراء

النہر کے سردار اس کے استقبال کو آئے اور یوسف قدر خان جو پورے ترکستان کا حکمران تھا وہ بھی آیا اور سلطان محمود کی ملاقات سے فیض یاب ہوا۔ ایک محفل جشن آراستہ کی گئی اور دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو تحفے اور نذرانے پیش کیے۔ علی تگین کے ہاتھوں ماوراء النہر کے عوام سخت پریشان تھے۔ جب اسے سلطان محمود کے آنے کی خبر ملی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا مگر تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا گیا اور ہندوستان کے ایک قلعہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمود واپس غزنی پہنچا اور موسم سرما وہیں گزارا۔

سلطان محمود نے ایک بار پھر سومنات کی جانب لشکر کشی کی۔ سومنات بحر ہند کے کنارے ایک بڑا شہر ہے جہاں برہمنوں کا معبد ہے۔ ان کا معبود ایک بہت بڑا بُت ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے سونے کے بت ہیں۔ اگرچہ بعض مورخوں نے اس بڑے بت کا نام منات لکھا ہے اور اس کے بارے میں یہ خیال آرائی بھی کی ہے کہ یہ ویسا ہی بت ہے جیسا کہ مشرکین عرب حضرت محمدؐ کے عہد رسالت میں ہندوستان کے ساحل پر لائے تھے۔ مگر یہ بات ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے اس لیے کہ ہندوستان کے برہمنوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ یہ بت کرشن کے وقت سے اسی جگہ موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے چار ہزار سال کے قریب ہو چکے ہیں اور اس کا نام بھی ہندی زبان میں سوبھا 24 ناتھ یعنی خالق حسن ہے۔ اس غلطی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان دونوں ناموں میں کافی مشابہت ہے۔ اس مہم میں سلطان محمود نے پہلے پٹن 25 فتح کیا جو نہر والہ کے نام سے مشہور ہے اور گجرات میں واقع ہے۔ جہاں سے خاصا سامان رسد لے کر وہ سومنات پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی اہل قلعہ نے دروازہ بند کر دیا جس کی پاداش میں قلعہ مفتوح ہونے پر ان کو سخت خمیازہ برداشت کرنا پڑا۔ اس بڑے بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غزنی بھیجے گئے جہاں انہیں جامع مسجد کے دروازے پر رکھ دیا گیا اور لوگ آتے جاتے اسے پامال کرنے لگے۔ واپسی کے وقت پرم دیو سلطان محمود کی راہ میں حائل ہوا۔ اس کا شمار ہندوستان کے بڑے حکمرانوں (راجاؤں) میں ہوتا تھا مگر سلطان محمود نے مصلحتاً اس سے جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور راستہ بدل کر سندھ کی جانب چلا اور ملتان پہنچا۔ یہاں خوراک اور پانی کی قلت کے باعث فوج کو بڑی

تکلیف اٹھانی پڑی۔ جس کی وجہ سے قیام کیے بغیر وہ واپس غزنی چلا گیا۔

417ھ/ 1026ء میں خلیفہ القادر باللہ نے نامہ نیابت کے ساتھ حکومت خراسان، ہندستان، نیمروز اور خوارزم کا علم (جھنڈا) بھی سلطان محمود کو بھیجا اور اس کے بھائیوں اور فرزندوں کو مختلف خطابات سے نوازا۔ سلطان محمود کو "کہف الدولہ والاسلام" اس کے فرزند اکبر امیر مسعود کو شہاب الدولہ وجمال الملت اور چھوٹے بھائی امیر محمد کو جلال الدولہ اور امیر یوسف کو عضد الدولہ وغیرہ کے خطابات عنایت فرمائے۔ اسی سال ملتان کے جاٹوں نے سر اٹھایا تو انکی سرکوبی کے لیے سلطان محمود نے ملتان پر چڑھائی کی۔ جاٹوں کے پاس چار ہزار کشتیاں تھیں اور بعض کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ ان کشتیوں میں جاٹ فوج کے اہل وعیال بھی تھے۔ عین دریا میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جاٹوں کی بہت سی کشتیاں غرقاب ہوگئیں اور جو لوگ بچ گیے وہ سب تلوار کا لقمہ بنے۔ جاٹوں کے اہل وعیال گرفتار ہوئے۔ اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو سلطان محمود کی کشتیوں کی تعداد مقابلتاً زیادہ تھی دوسرے اس نے لڑائی بڑی حکمت عملی سے لڑی۔ اس لڑائی سے سلطان محمود مظفر ومنصور غزنی لوٹا۔

418ھ/1027ء میں وہ باوردو کی جانب روانہ ہوا اور اس شہر کے ترکوں کا قلعہ برباد کرنے کے بعد رے پہنچا اور اس علاقہ کے خزانوں اور دیگر قیمتی چیزوں پر قبضہ کرلیا اور چھوٹے چھوٹے مذاہب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس کے بعد وہ اصفہان کو اپنے بیٹے اکبر امیر مسعود کے سپرد کر کے غزنی واپس چلا گیا جہاں اس نے ابھی زیادہ دن قیام نہیں کیا تھا کہ مرض دق میں مبتلا ہوگیا، روز بروز کمزور ہوتا گیا تاہم اپنے آپ کو تندرست اور طاقتور ظاہر کرنے کو کوشش کرتا۔ مرض کی حالت میں وہ بلخ بھی گیا اور موسم بہار میں وہ وہاں سے واپس آیا مگر اس مرتبہ اس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا اور آخر کار بروز منگل 23، ربیع الاول 421ھ/1030ء کو وفات پائی اور غزنی میں دفن ہوا۔ اس کی عمر 60 سال تھی اس نے 31 سال تک حکومت کی۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان محمود نزع کی حالت میں تھا تو اس نے حکم دیا کہ خزانے کے تمام مال ودولت اور تحائف ونوادر اس کے سامنے لائے جائیں چنانچہ اس

کی تعمیل کی گئی اور اس نے جملہ املاک کی طرف بار بار حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور آہیں بھرتا رہا مگر ایک چھدام بھی کسی کو دینے کے لیے نہ کہا۔ سلطان محمود نے بارہ مرتبہ ہندستان پر چڑھائی کی اور ہر مرتبہ وہ بے پناہ دولت کے ساتھ لوٹا۔ انما صبابه عند ربه اور فردوسی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا مشہور خاص و عام، چنانچہ عارف جامی لکھتا ہے:

خوش است قدر شناسی کہ چون خمیدہ سپہر
سہام حادثہ را کرد عاقبت طوسی
گزشت شوکت محمود دور زمانہ نماند
جز این فسانہ کہ نشناخت قدر فردوسی

تذکرہ محمد عوفی میں بھی یہ اشعار سلطان محمود سے منسوب ہیں:

زبیم تیغ جہان گیر و گرز قلعہ کشاء
جہان مسخر من شد چو تن مسخر رائی
گہی بعز و بدولت ہمی نشستم شاد
گہی بحرص ہمی رفتی زجائی بجائی
گہی تفاخری کردم کہ من کسی ہستم
کنون برابری بینم ہمی امیر و گدائی
ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست
بی مصاف شکستم بیک فشردن پائی
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نداشت
بقا بقائی خدای است و ملک ملک خدائی

سلطان محمد بن سلطان محمود غزنوی لقب جلال الدولہ

مذکورہ سن 421ھ میں اپنے باپ کی وصیت کے مطابق اور اسی کے ایک رشتہ دار ابن ارسلان کی رائے سے غزنی میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ ابھی ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا کہ امیر ایاز نے بعض دوسرے ملازمین کے ساتھ مل کر سازش کی اور وہ سب کے سب شاہی اصطبل کے گھوڑوں پر سوار ہو کر شہاب الدین مسعود کے پاس ملازمت کی غرض سے روانہ ہو گئے۔ شہاب الدین مسعود اصفہان میں تھا جہاں پہنچنے کے لیے انھوں نے بسط کا راستہ اختیار کیا۔ امیر محمد نے سوندھی رائے نامی ایک ہندو کو بے شمار لشکر کے ساتھ ان کے تعاقب میں بھیجا، مگر امیر ایاز جنگ میں اس پر غالب آیا۔ اس نے سوندھی رائے کو ہندوؤں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ قتل کر دیا۔ ان کے سر کاٹ کر امیر محمد کے پاس بھیج دیے اور خود نیشاپور میں امیر مسعود کے ساتھ جا ملا۔ چار ماہ بعد امیر محمد نے اپنے خیموں کو بسط کی جانب منتقل کر دیا اور پوری جمعیت کے ساتھ اپنے بھائی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکلا۔ جب تگین آباد پہنچا تو تمام امراء اس سے برگشتہ ہو گئے اور اسے اندھا کر کے نجرستان کے علاقے کے قلعہ تج میں ڈال دیا۔ اس کے بعد تمام جوانوں اور خزانوں کے ساتھ وہ ہرات میں امیر مسعود کے ساتھ جا ملے۔ اندھے سلطان محمد نے صرف پانچ ماہ حکومت کی مگر بقول قاضی بیضاوی 14 سال کی، جس میں سے نو سال اس نے قید میں گزارے، واللہ اعلم۔

صاحب لب التواریخ لکھتا ہے کہ محمد ابن محمود نے پہلے پہل اپنے باپ کی زندگی میں چار سال بادشاہی کی تھی اس کے بعد نو سال قید میں رہا اور اپنے بھائی مسعود کے قتل کے بعد اس نے ایک سال اور حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا:

امیری را کہ بر قدمش ہزاران پاسبان بینی
کنون بر قبہ گورش کلاغان پاسبان بینی
سر اسپ ارسلان دیدی ز رفعت رفتہ بر گردون
بہ مرو آ تا بخاک اندر تن اسپ ارسلان بینی

شہاب الدولہ سلطان مسعود بن محمود غزنوی

سلطان محمود کے امیروں اور وزیروں کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا اور ہرات سے بلخ جا کر اس نے موسم سرما گزارا۔ احمد ابن حسن میمندی کو سلطان محمود نے قلعہ کالنجر میں قید کر رکھا تھا، اسے بلا کر اپنا وزیر بنایا۔ پھر بلخ سے غزنی واپس آیا اور وہاں سے اصفہان اور رے کی جانب کوچ کا حکم دیا۔ جب ہرات پہنچا تو ترکمان سے مقابلہ ہو گیا، ان سے شکست کھائی اور غزنی واپس چلا گیا۔ اس کی کمزوری کے باعث ترکمان روز بروز دلیر ہوتے گئے، ان کے حوصلے حد سے زیادہ بڑھ گئے جس کا ثبوت آئندہ کے واقعات سے ملے گا۔

423ھ/ 1032ء میں احمد بن حسن میمندی کا انتقال ہو گیا اور 424ھ/1033ء میں سلطان مسعود ہندوستان کی تسخیر کے عزم سے براستہ قلعہ سرتی روانہ ہوا۔ یہ قلعہ کشمیر میں واقع ہے۔ سب سے پہلے اس نے اس کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا جسے لے کر وہ غزنی لوٹ گیا 425ھ/ 1034ء میں سلطان مسعود نے آمل[26] اور ساری[27] کو تسخیر کیا اور کالنجر اور طبرستان تک اپنے قاصد بھیجے تاکہ ہر جگہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور اسی کا سکہ رواں ہو۔ تغدی بیگ اور حسین ابن علی ابن میکائل کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ نیشاپور سے بھیجا تاکہ وہ ترکمان کی سرکوبی کریں۔ فریقین میں سخت جنگ ہوئی۔ حسین قید ہو گیا اور تغدی بیگ بھاگ گیا اور سلطان مسعود کے پاس پہنچ گیا۔

امیر احمد نہال[28] تگین، خازن سلطان محمود کو کسی قصور میں سزا دی گئی تھی، اسے بلا کر ہندوستان بھیجا مگر یہاں آ کر اس نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان مسعود نے ایک ہندو جرنیل[29] ناہر کو اس کے مقابلہ کے لیے نامزد کیا۔ امیر احمد مقابلے کی تاب نہ لا کر میدان جنگ سے بھاگ کر منصورہ[30] سندھ پہنچا اور غرقاب ہو گیا۔ اس کا سر کاٹ کر غزنی بھیج دیا گیا۔

427ھ/ 1036ء میں ایک نیا محل تعمیر ہوا جس میں جواہرات سے جڑے تخت لگائے گئے تھے، اس پر ایک جواہر جڑا تاج بھی لگا تھا۔ سلطان مسعود اس تخت پر جلوہ افروز ہوا، سر پر وہی تاج پہنا اور رعایا کو باریابی بخشی۔ اسی سال اس نے اپنے فرزند امیر مجدود کو طبل و علم

کے اعزاز کے ساتھ بلخ بھیجا اور خود ہندستان کی جانب روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قلعہ ہانسی[31] فتح کیا پھر قلعہ سون پت[32] پہنچا جہاں کا حاکم دیپال بھاگ کر جنگل میں جا چھپا اور قلعہ بغیر کسی دقت کے فتح ہو گیا۔ یہاں سے کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا اور دیپال کی فوج کی ایک بڑی تعداد مسعودی عساکر کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ پھر سلطان مسعود آگے بڑھا تو وادیٔ رام میں داخل ہوا، جہاں کے حاکم رام نے بہت ساز و مال نذرانے کے طور پر بھیجا، ساتھ ہی ایک عرضداشت کے ذریعہ اپنی غیر حاضری کی معذرت بھی کی۔ امیر مسعود نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ اس کے بعد اس نے اپنے فرزند امیر مودود کو طبل و علم کے اعزاز کے ساتھ لاہور بھیجا اور خود غزنی کی طرف مراجعت کی۔

428ھ/1037ء میں سلطان مسعود اس ارادے سے بلخ روانہ ہوا کہ ترکمانوں کو قرار واقعی سزا دے۔ جب ترکمانوں نے اس کی آمد کی خبر سنی تو وہ بلخ چھوڑ کر اس کے اطراف و نواح میں پناہ گزین ہو گئے اور سلطان مسعود دریائے جیحون سے گزر کر تمام ماوراء النہر پر مسلط ہو گیا۔ داؤد ترکمان جس نے تغدی بیگ اور امیر حسین کو اس سے قبل شکست دی تھی پوری جمعیت کے ساتھ بلخ کی جانب روانہ ہوا۔ اس درمیان میں سلطان مسعود بھی وہاں پہنچ گیا۔ داؤد ترکمان ابھی مرو میں تھا کہ یہ اطلاع آئی کہ تغدی بیگ نے گورگان کے نواح میں ظلم و ستم برپا کر رکھا ہے۔ سلطان مسعود نے جب یہ دیکھا تو حکم دیا کہ اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔ سلطان مسعود نے اس قبیلہ کے سردار بیغو ترکمان سے بھی اس امر کا عہد لیا کہ آئندہ وہ کسی قسم کی ناشائستہ حرکات کا مرتکب نہیں ہوگا اور اس کے لیے مناسب حدود مقرر کر کے سلطان مسعود ہرات چلا گیا۔ راستے میں ترکمان کی ایک جماعت اس پر حملہ آور ہوئی، اس نے سلطان مسعود کے ہمراہیوں میں سے چند ایک کو قتل کر دیا اور سامان لوٹ لیا۔ سلطان مسعود نے اس کا بدلہ لینے کے لیے جن لشکریوں کو نامزد کیا انھوں نے ترکمان کی اس جماعت کو تہ تیغ کر دیا اور ان کے اہل و عیال کو مقتولین کے کٹے ہوئے سروں کے ساتھ سلطان مسعود کے حضور میں پیش کیا۔ سلطان نے ان سروں کو گدھے پر لدوا کر بیغو ترکمان کے پاس بھیجا اور بیغو نے معذرت خواہی کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ وہی بیغو ہے جس کی

مدح میں ایران کے ایک شاعر ضیائی[33] نے قصیدے لکھے ہیں۔

ترکمان کی سرکوبی کے بعد سلطان مسعود ہرات نیشاپور اور پھر طوس پہنچا۔ ترکمان کی ایک جماعت راستہ میں اس کے ساتھ جنگ آزما ہوئی مگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ باورد کے باشندے اپنا شہر ترکمانوں کے حوالے کر چکے تھے سلطان مسعود نے ان کے قلعہ پر قبضہ کر کے سب کو مروا ڈالا اور اس کے بعد موسم سرما نیشاپور میں گزارا۔

430ھ/1038ء میں ترکمان طغرل کا سر کچلنے کے لیے سلطان مسعود روانہ ہوا۔ اس نے باورد میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ جب طغرل بھاگ گیا تو سلطان مسعود وہاں سے لوٹ کر مہنہ[34] کے راستہ سرخس[35] پہنچا۔ اس نے مہنہ کے قلعہ کو زمین دوز کر دینے کا حکم دیا اور وہاں کی رعایا میں سے بعضوں کو مروا ڈالا اور اکثروں کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے۔ وہاں سے وہ زیرقان[36] کی طرف بڑھا جہاں ترکمانوں نے ایک لشکر عظیم کے ساتھ سلطان مسعود کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں غزنی کے اکثر سپہ سالار برگشتہ ہو کر دشمن سے جا ملے اور سلطان تن تنہا میدان میں رہ گیا اور آخر کار بہ ہزار جدوجہد اس معرکہ سے صحیح وسلامت نکل آیا۔ یہ واقعہ 431ھ/1039ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد سلطان مسعود مرو پہنچا۔ اس کے اطراف کے کچھ لشکری اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور وہ غور کے راستہ غزنی پہنچا اور جو سردار بغیر جنگ کیے میدان سے بھاگ نکلے تھے ان کو سزائیں دیں اور بعض کو مثلاً علی دایہ، حاجب بزرگ اور تغدی وغیرہ کو ہندستان بھیج کر قلعوں میں بند کر دیا اور وہ سب قید میں مر گئے۔

ترکمانوں کی سرکوبی کے لیے سلطان مسعود نے طے کر لیا کہ پہلے وہ ہندستان جا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرے۔ یہاں سے ایک بڑا لشکر لے کر واپس آئے اور ترکمانوں پر چڑھائی کر کے سزا دے۔ چنانچہ اس نے امارت بلخ امیر مودود کے سپرد کی اور خواجہ محمد بن عبداللہ کو اس کا وزیر مقرر کیا۔ اس کے بعد اپنے بیٹے امیر مجدود کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ ملتان روانہ کیا۔ اپنے دوسرے بیٹے امیر ایزدیار کو غزنی کے پہاڑوں کے دامن میں متعین کر دیا تاکہ دوسرے ضلع کے افغانوں کی روک تھام کرے، جنھوں نے ہنگامہ اور سرکشی برپا کر رکھی تھی۔ اس انتظام کے بعد وہ اپنے باپ سلطان محمود کے ان خزانوں کو اونٹوں پر لاد کر

ہندستان روانہ ہو گیا جو غزنی اور اس کے نواح کے قلعوں میں محفوظ تھے اور راستے ہی میں اپنے اندھے بھائی امیر محمد کو لانے کے لیے کسی کو اس کے پاس بھیجا۔ وہ قلعہ برغند[37] میں قید تھا۔ سلطان مسعود ابھی ماریکلہ[38] کے سرحدی قلعہ تک پہنچا تھا کہ اس کے اپنے ہی ملازموں نے وہ تمام مال ودولت لوٹ لیا جو اس کے ہمراہ تھا۔

اسی دوران امیر محمد بھی پہنچ گیا چنانچہ سلطان مسعود کے مظالم کا خاتمہ کرنے کے لیے وہ امیر محمد سے پاس گئے اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد بغاوت کا جھنڈا بلند کر کے وہ سلطان مسعود کو قلعہ سے باہر نکال کر لے آئے اور قیدی بنا کر اسے قلعہ گیری میں بند کر دیا یہاں تک کہ جمادی الاول 432ھ/1040ء میں ایک جھوٹا حکم امیر محمد کے نام سے اس قلعہ کے کوتوال کے پاس پہنچا کہ وہ سلطان مسعود کا سر کاٹ کر بھیج دے۔ کوتوال نے اس کی تعمیل کی اور سلطان مسعود کا سر کاٹ کر بھجوا دیا۔ قطعہ:

زحادثات زمانم ہمین پسند آمد
کہ خوب و زشت وبدونیک درگزر دارم
کسی کہ تاج مرصع بسرنہاد صباح
نماز شام در انخشت زیر سر دارم

یہ تفصیل، کتاب نظامی کے مطابق ہے مگر قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اس کے نزدیک سلطان مسعود 432ھ/1040ء میں سلجوقیوں سے شکست کھا کر ابھی غزنی پہنچا تھا کہ امیر محمد نے اسے گرفتار کر لیا جو اس کی غیر حاضری میں اپنی پوزیشن کافی مضبوط کر چکا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اسے قلعہ میں بند کر دیا تھا جہاں امیر محمد کے بیٹے نے جا کر اسے قتل کر دیا۔

سلطان مسعود کی حکومت گیارہ سال رہی، مگر یہ امر قابل غور ہے کہ قاضی بیضاوی نے اس کی وفات کا سال433ھ/1041ء لکھا ہے۔ ان تمام شاعروں میں سے جنھوں نے سلطان مسعود کے عہد حکومت میں نشو ونما پائی ایک شاعر منوچہری بھی تھا جس نے اس کے

وزیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہمی نازد بہ عدلش شاہ مسعود
چو پیغمبر بہ نوشیروان عادل

سلطان مودود بن مسعود بن محمود غزنوی

بامیان میں اپنے باپ کے قتل کے بعد سلطان مودود وزیروں اور امیروں کی متفقہ رائے سے تخت نشین ہوا۔ باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اس نے مارینکلہ کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ کیا مگر ابونصر احمد بن محمد بن عبد الصمد نے اسے اس کام سے باز رکھا اور غزنی لے گیا۔ یہاں سے ایک بڑے لشکر کے ساتھ سلطان مودود، اپنے اندھے چچا امیر محمد پر چڑھائی کرنے کے لیے نکلا۔ وہ ابھی دینپور کے قریب تھا کہ امیر محمد سے اس کا سامنا ہوگیا۔ جس نے آخر خونریز جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی، رات ہونے پر فریقین اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔ دوسرے دن جب جنگ شروع ہوئی تو سلطان مودود نے امیر محمد کے ایک معتبر جرنیل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ امیر محمد اور اس کا لڑکا احمد دونوں گرفتار ہوگئے اور انھیں قتل کردیا گیا۔ سلطان مودود نے اس مقام پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام فتح آباد رکھا۔ یہ فتح اسے ماہ شعبان 432ھ/1040ء میں ملی ایک دوسرے قول کے مطابق 433ھ/1041ء میں ملی۔

چونکہ سلطان مودود خواجہ احمد بن عبد الصمد سے ناراض تھا اس لیے اس نے اسے غزنی میں قید کردیا۔ جہاں آخر کار وہ مرگیا۔ اسی سال اس نے ابونصر محمد بن احمد کو ہندستان بھیجا تا کہ نائی ابن محمد کے ساتھ جنگ کرے۔ نائی اس جنگ میں مارا گیا۔

434ھ/1042ء میں سلطان مودود کے حکم سے ارتگین کو ایک جمعیت کے ساتھ طبرستان کی جانب روانہ کیا گیا تا کہ وہ داؤد ترکمان کے ساتھ جنگ کرے۔ اس جنگ میں اس کے بہت سے آدمی کام آئے۔ ارتگین پھر بلخ کی طرف بڑھا اور وہاں اس نے سلطان

مودود کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اسی کے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔ ارتگین کو وہاں زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ترکمانوں نے پوری طاقت کے ساتھ اس پر چڑھائی کر دی۔ وہ ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا اس لیے واپس غزنی چلا آیا۔ 435ھ/1043ء میں سلطان مودود نے غزنی کے کوتوال ابو علی کو قید کر لیا مگر چند روز کے بعد پھر اس کی رہائی کا حکم بھی جاری ہو گیا اور کوتوال غزنی کے علاوہ اسے دیوان مملکت بھی بنا دیا گیا اور اس کے بجائے یسوری بن ایمغور دیوان کو قید خانے میں ڈال دیا جو وہیں مر گیا۔ سلطان مودود نے ارتگین کو بھی بغیر سزا دیے نہ چھوڑا۔

436ھ/1044ء میں جب خواجہ طاہر نے جسے خواجہ احمد کے بعد وزیر مقرر کیا گیا تھا انتقال کیا تو خواجہ امام ابو الفتح عبدالرزاق کو اس کی جگہ وزیر مقرر کیا گیا۔ اسی سال طغرل حاجب کو بسط کی جانب بھیجا جو زنگی ابو منصور کے بھائی ابو الفضل کو گرفتار کر کے غزنی لایا۔ پھر سیستان چلا گیا۔ رباط امیر کے مقام پر ترکمانوں کے ساتھ اس کی خونریز جنگ ہوئی۔ طغرل حاجب اس جنگ میں فتح یاب ہوا۔ اس کے بعد وہ گرم سیر پہنچا اور اس علاقے کے ترکمانوں کو جنہیں سرخ کلاہ [39] کہا جاتا تھا۔ تلوار کے گھاٹ اتارا اور ان کی کافی بڑی تعداد کو گرفتار کر کے غزنی لے آیا۔ سلطان مودود نے طغرل حاجب کو 438ھ/1046 میں تکینا باد بھیجا جہاں پہنچ کر اس نے بغاوت کر دی۔ جب سلطان مودود کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے علی بن ربیع کو اس کی سرکوبی کے لیے نامزد کیا۔ طغرل حاجب ڈر کے مارے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ بھاگ گیا۔ علی بن ربیع نے اس کی فوج کو غارت کیا اور کچھ سپاہیوں کو گرفتار کر کے غزنی بھیج دیا۔

439ھ/1047ء میں امیر قصدار نے بغاوت کی، اور جب اس نے حاجب بزرگ ارتگین کے ہاتھوں سے شکست کھائی تو اطاعت قبول کر لی۔ 440ھ/1048ء میں سلطان مودود نے اپنے فرزندان ابو القاسم محمود اور منصور کو بیک وقت خلعت اعزاز اور طبل وعلم عطا کیا۔ ان میں سے ایک کو ہندستان بھیجا اور دوسرے کو پرشور [40] اس کے علاوہ ابو علی حسن کوتوال غزنی کو بھی ہندستان روانہ کیا تاکہ وہ جا کر سرکشوں کو گستاخی کے مطابق سزا دے اور

جب وہ خدمت بجالانے کے بعد غزنی واپس ہوا تو اسے میرک بن وکیل کے سپرد کر دیا گیا۔ جس نے اسے قید کر دیا اور قید خانہ ہی میں مروا ڈالا۔ چونکہ میرک بن وکیل نے ابو علی حسن کو سلطان کے حکم کے بغیر مروا ڈالا تھا اور وہ اسے پردہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے سلطان مودود کو کابل جانے پر اُکسایا۔ مگر جب سلطان مودود سیالکوٹ کے قلعے کے پاس پہنچا اور درد قولنج 41ھ میں مبتلا ہو گیا جس کے باعث اسے غزنی واپس جانا پڑا اس نے غزنی واپس پہنچنے پر میرک کو حکم دیا کہ ابو علی کوتوال کو فوراً رہا کر دیا جائے مگر میرک نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ اسی اثناء میں 24 رجب 441ھ/1049ء کو سلطان مودود نے اس دنیا سے رخت سفر باندھ لیا۔ اسکی مدت حکومت 9 سال تھی لب التواریخ میں لکھا ہے کہ سلطان مودود نے چغر بیک کی لڑکی سے شادی کی تھی اور اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام مسعود رکھا گیا۔ اس نے سات سال حکومت کی۔ ماہ رجب 441ھ/1049ء میں سلطان مودود چغر بیک سے ملاقات کے لیے خراسان سے روانہ ہوا، مگر راستہ ہی میں درد قولنج سے انتقال کر گیا۔

سلطان مسعود بن مودود بن مسعود بن محمود غزنوی

مسعود بن مودود صرف تین سال کا بچہ تھا مگر علی بن ربیع نے اپنی حکمت عملی سے اسے تخت پر بٹھایا، مگر یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کی حکومت کے قیام کو صرف پانچ ماہ ہوئے تھے کہ لوگوں نے اس کے چچا علی کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔

سلطان علی ابن مسعود ابن محمود غزنوی

امراء کی رائے سے وہ تخت نشین ہوا، مگر جب عبد الرزاق بن احمد میمندی سیستان سے بسط اور اسفراز 42ھ کے درمیان قلعہ تک پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ سلطان مودود کے حکم سے اس قلعہ میں عبد الرشید ابن محمود قید ہے تو وہ اسے قید خانے سے نکال لایا اور تخت سلطنت پر

بٹھا دیا۔ علی کی حکومت کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ یہ واقعہ 443ھ/1052 کا ہے۔

سلطان عبدالرشید ابن محمود غزنوی

سلطان عبدالرشید نے تخت نشین ہوتے ہی عبدالرزاق کے مشورے سے غزنی کا رخ کیا۔ علی ابن مسعود بغیر جنگ کیے بھاگ گیا اور طغرل حاجب جو سلطان محمود کا خانہ زاد غلام تھا سیستان فتح کرنے کے بعد غزنی کی جانب بڑھا۔ سلطان عبدالرشید نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر 445ھ/1053ء میں طغرل حاجب نے موقعہ پا کر اسے اور اس کے ساتھ سلطان محمود کے تمام وارثوں کو قتل کرڈالا۔ سلطان محمود کی لڑکی سے اس کی مرضی کے خلاف شادی کرلی۔ ایک روز جب کہ وہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ دلیر پہلوان کی ایک ٹولی کی رگ حمیت وغیرت پھڑک اٹھی اور انھوں نے جوش میں آکر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سلطان عبدالرشید کا عہد حکومت صرف چار سال رہا، مگر نظام التواریخ کے نزدیک سات سال اور لب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال 445ھ/1053ء میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سلطان فرخ زاد بن مسعود بن محمود غزنوی

سلطان فرخ قید خانے سے رہائی کے بعد امراء کی رائے سے تخت نشین ہوا۔ جب سلجوقیوں کی ایک جماعت نے غزنی پر چڑھائی کی تو اس نے ان کی ایک کثیر تعداد کو قتل کرادیا اور آخر ان پر غلبہ پالیا۔ جو سلجوقی گرفتار ہوئے انھیں غزنی بھجوا دیا۔ الپ ارسلان سلجوقی بادشاہ عراق اور خراسان سے فوج کشی کر کے غزنی پر چڑھ آیا۔ جب وہ جنگ میں کامیاب ہوا تو غزنی کے بہت سے سرداروں کو قید کر کے اس نے خراسان بھیج دیا، مگر جب دونوں میں صلح ہوگئی تو دونوں طرف کے قیدیوں کو رہا کردیا وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔ چونکہ جنگ کے سبب زابلستان پوری طرح سے برباد ہوگیا تھا اس لیے سلطان فرخ زاد نے اس کا تاوان (ہرجانہ) معاف کردیا اور وہاں کے عوام کے ساتھ بطریق احسن پیش

آیا۔ وہ تین ماہ تک مسلسل روزے رکھتا اور رات کا زیادہ وقت نماز اور عبادت میں گزارتا۔ آخر وہ بھی درد قولنج میں مبتلا ہوا اور 450ھ/1058ء میں انتقال کر گیا۔ 43 اس نے چھ سال تک حکومت کی۔

سید السلاطین ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی

وہ ایک عادل، زاہد اور متقی بادشاہ تھا۔ ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا کرتا۔ اس نے اپنے لیے کوئی محل سرا تعمیر نہیں کرایا تھا، سوائے ایک مسجد اور مدرسے کے اور وہ بھی خدا کے لیے تھا۔ جب اُمور سلطنت کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر پڑی تو اس نے سب سے پہلے سلجوقیوں کے ساتھ مصالحت کی اور پھر پوری دل جمعی اور اطمینان کے ساتھ ہندستان کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں بہت سے قلعوں اور علاقوں کو فتح کیا۔ ان میں سے ایک شہر ایسا بھی تھا جہاں ان خراسانیوں کی نسل آباد تھی جنھیں افراسیاب نے شہر خراسان سے شہر بدر کیا تھا، انھوں نے ہندستان آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلطان ابراہیم نے اس شہر کے ہزاروں خراسانی النسل باشندوں کو گرفتار کر کے غزنی بھجوا دیا اور علیٰ ھذا القیاس بے شمار مال غنیمت بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے اپنے قیام کے دوران چند قصبوں کی بنیاد بھی ڈالی۔ ان میں سے خیر آباد اور ایمن آباد وغیرہ بھی ہیں۔ اسے سید السلاطین بھی کہا جاتا ہے اور اسے ولی اللہ سمجھا جاتا ہے اس کے عہد حکومت میں غزنی کے لوگوں کو راوی چشم، شربت اور دیگر دوائیں اور غذائیں غرض تمام اشیاء خزانہ شاہی سے مفت ملا کرتی تھیں۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد اس نے 472ھ/492ء میں وفات پائی۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا دور حکومت 450ھ تا 492ھ/1058ء تا 1097ء تھا۔ مسعود سعد سلمان سلطان ابراہیم کے زمانہ ہی کا شاعر تھا، ذیل کے اشعار اسی کے ایک قصیدے کے ہیں جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھے تھے۔

ابوالقاسم ملک محمود ابراہیم بن مسعود
کہ تازہ چار چیز از وی کند ہریک بدو مفخر

یکی افروختہ چتری دوم افروختہ رایت
سوم دینارگوں کلکی چہارم آب گون خنجر

ولہ

ای عزم سفر کردہ و بستہ کمر فتح
بکشاد چپ و راست فلک بر تو در فتح
مسعود جہانگیر کہ از دھر سعادت
ہر لحظہ بسوئی تو فرستاد نفر فتح
مانند سنان سر بسطی رزم نہادی
چون تیر میان تو بہ بند و کمر فتح
صد فتح کنی بی شک و صد سال ازین پس
در بند بہر خطہ بپیند اثر فتح

استاد ابوالفرج رونی بھی سلطان ابراہیم کا مداح تھا اور اس کے قبل وہ مسعود کا مداح تھا۔ ان دونوں کی مدح میں اس نے بے شمار قصیدے لکھے تھے جو اس کے کلیات میں موجود ہیں۔ وہ رون نامی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں نواح لاہور میں واقع تھا مگر مرور ایام میں اس حد تک ویران اور برباد ہوگیا کہ آج اس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ استاد ابوالفرج نے ذیل کا قصیدہ بھی سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھا تھا:

زہی بیازوی شمشیر کامگار ترا
شبیہ نفس عزیز و نظیر عقل عدیم

اسیر کردہ آن بی نفس چو حلق گلو
یتیم کردۂ این بی عقب چو دُرّ یتیم

اور مسعود سعد سلمان نے ازروئے حسد جو شعرا کا لازمی خاصہ ہے استاد ابوالفرج کی مذمت کی تھی جس کی بنا پر اسے دس سال قید میں رہنا پڑا اور یہ رباعی اس نے قید خانہ ہی میں کہی تھی:

زندان ترا ملک شہی می باید
تا بند پائی غدار می شاید
آن کس کہ ز پشت سعد سلمان زاید
گر مار بُوَد ملک ترا نگزاید

اس کے کلیات عربی، فارسی اور 44 ہندی تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔

علاء الدین مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

باپ کے بعد تخت نشین ہوا، اور 508ھ/1114ء میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس نے 17 سال تک حکومت کی۔

سلطان شیراز الدین مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

باپ کے فرمان کے مطابق بادشاہ ہوا۔ صرف اس نے ایک سال تک حکومت کی۔ اس کے بھائی ارسلان شاہ نے بغاوت کر کے اس کا تختہ پلٹ دیا اور 509ھ/1115ء میں بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

سلطان ارسلان شاہ بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے تمام بھائیوں کو گرفتار کرلیا، مگر بہرام شاہ بھاگ کر سلطان سنجر کے پاس چلا گیا جو اس کا خالہ زاد بھائی تھا۔ سلطان سنجر نے ہرچند سفارشی خطوط لکھے مگر ارسلان شاہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان سنجر نے مجبور ہوکر اس پر چڑھائی کردی۔ ارسلان شاہ تیس ہزار فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے آیا مگر شکست کھائی اور ہندستان کا رخ کیا۔ سلطان سنجر چالیس روز غزنی میں رہا۔ پھر تمام علاقہ بہرام شاہ کے حوالے کر کے لوٹ گیا۔ ارسلان شاہ ہندستان سے ایک بڑے لشکر کے ساتھ غزنی پہنچا۔ بہرام شاہ اس کے مقابلے میں کھڑا نہ ہوسکا اور بامیان کے قلعہ میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان سنجر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ مدد کو آیا اور بہرام شاہ نے دوبارہ غزنی پر قبضہ کرلیا۔ ارسلان شاہ گرفتار ہوا اور 510ھ/1116ء اسے قتل کروادیا گیا۔ ارسلان شاہ نے 7 سال تک حکومت کی۔

سلطان بہرام شاہ مسعود بن ابراہیم

سلطان بہرام شاہ جب تخت پر بیٹھا تو حکیم سنائی اس کا مداح تھا۔ کلیلہ ودمنہ اور بہت سی دوسری کتابیں اس کے عہد حکومت میں احاطۂ تحریر میں آئیں۔ اس کی تخت نشینی کے روز سید حسن غزنوی نے جو قصیدہ کہا تھا اس کا مطلع ہے:

ندائی بر آمد ہاتف آسمان
کہ بہرام شاہ است شاہ جہان

اور ذیل کا قصیدہ مکہ معظمہ میں کہہ کر اس کی خدمت میں بھیجا :

ہر گز بود کہ باز بچشم لقائی شاہ
شکرانہ در دو دیدہ کشم خاک پائی شاہ
بہرام شاہ کہ جان سلاطین قداش باد
باشد ایشان باشد سزائی شاہ
سیارگان چرخ در افتد چون شہاب
پا از برون نہند ز حد وفائی شاہ

حکیم سنائی نے اپنی مشہور تصنیف ''حدیقۃ الحقیقہ'' اپنے اسی ممدوح بہرام شاہ کے نام منسوب کی تھی۔ حکیم سنائی کو قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اس کی وجہ غزنوی تعصب تھا۔ جب یہ تصنیف دارالخلافہ بغداد پہنچی اور اکابرین اور بزرگان دین کی نظر سے گزری تو ان سب نے حکیم سنائی کے معتقدات کی تائید کی اور اس سلسلہ میں ایک یادداشت بھی لکھی جس کی وجہ سے حکیم سنائی کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور رحلت کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیخ مجدود نے اس تصنیف کی بنا پر حکیم سنائی پر رافضی ہونے کا الزام لگایا تو اس نے بہرام شاہ کو یہ خط لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ اما بعد بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جو چیزیں عمر کی درازی، بارش کے برسنے اور درختوں کے اگنے کا باعث ہوتی ہیں وہ یہ ہیں: مظلوموں کی حمایت، ظالموں پر قہر، اس کی تائید میں حضرت محمدؐ کا یہ قول شاہد اور عادل ہے کہ آسمان عدل کی وجہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے اور عدل کی مثال اس پرندے کی سی ہے کہ جہاں کہیں وہ سایہ فگن ہو دولت میں فراوانی ہوتی ہے اور جہاں کہیں وہ آشیانہ بنائے اس کا آشیانہ استدامت کا قبلہ ہوتا ہے اور بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ظلم اور عدو ایسے پرندے کی طرح ہیں کہ جس طرف بھی وہ پرواز کریں قحط اور وبا عام ہوتی ہے اور انسانوں کے دل سے زندگی

اور حیا معدوم ہونے لگی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ سلطان اسلام و بادشاہ عادل بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن ابراہیم شاہ بن مسعود شاہ بن محمود غزنوی کو جور و ظلم سے محفوظ اور مصئون رکھے۔ اگر تمام دنیا بھی جمع ہو جائے تو اس فقیر کے دل میں علم و معرفت کا جو سرمایہ اور دولت ہے، اس کی حقیقت کے اظہار سے قاصر ہے اور جو درخت کے مالک الملک نے اسرار غیوب کا مشاہدہ کرنے کے لیے لگایا ہے اور جبریل اور میکائیل کو بھی اس کی تہہ تک رسائی نہیں، یہ امر یقینی ہے کہ عادل کے لیے وہ ہر حال میں موجب سعادت ہے اور جابر کے لیے باعث شقاوت، اور بدترین ظلم وہ ہے کہ کسی کتاب یا مضمون کو پڑھے مگر اس کے مفہوم اور معنی سے بے بہرہ رہے مگر اس کے باوجود وہ مغرور اور خود پسند ہو اور علماء کے خلاف زبان طعن و تشنیع کھولے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہمارے پیغمبرؐ نے فرمایا: ارحموا ثلثً غنیا افتقر وعزیز قوم ذل وعالما بین الجہال ترجمہ۔ تین آدمیوں پر رحم کھاؤ ایک وہ دولت مند جو غریب ہو جائے، دوسرے قبیلہ کا وہ بزرگ جو ذلیل ہو جائے، تیسرے وہ عالم جو جہلا میں پھنس گیا ہو۔

جو کتاب ارباب معرفت وکمال کی زبان میں لکھی گئی ہو، بایزیدؒ اور شبلی جیسے بنیادی عارف ہی اس میں کوئی تصرف کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں کو مذہبی علوم اور دینیات سے دور کا بھی لگاؤ نہیں یہ بڑی نادانی اور حماقت ہوگی کہ وہ اس کتاب پر نکتہ چینی کریں۔ ان کی کورچشمی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ آل مروان کو قابل نفرت و شقاوت ٹھہراتے ہیں اور آل محمدؐ کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے ہیں، مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کا درجہ صدیقؓ، فاروقؓ اور ذی النورینؓ کے بعد رکھا گیا ہے اور آل مروان کے عیوب اور آل محمد صلعم کے مناقب کے بارے میں حضرت محمد صلعم کے ارشادات کافی ہیں اور ہمارے لیے وہی دلیل راہ ہیں۔

کلمہ حق یہ ہے کہ اے خدا تو دنیا کو ایسے عالموں کے وجود سے آراستہ کر جو تجھ سے ڈریں اور عوام سے شرم و حیا ملحوظ رکھیں اور تو ہمیں ایسے لوگوں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ جو تیری محبت کی راہ سے بھٹک گئے ہوں۔ ''بفضلک وجودک وکرمک یا ارحم الراحمین'' یہ شعر

حدیقہ ہی کا ذیل میں لکھتا ہوں:

عرش گر بارگاہ را نسید
شاہ بہرام شاہ را نسید

سلطان بہرام شاہ نے ہندستان پر لشکر کشی کی اور ان مقامات کو فتح کیا جنھیں اس کے اسلاف فتح نہیں کر سکے تھے، وہ اپنے امرا میں سے ایک کو ہندستان میں چھوڑ کر واپس غزنی چلا گیا۔ اس امیر نے بغاوت کی، سلطان امیر کی سرکوبی کے لیے آیا، ملتان کے نواح میں زبردست جنگ ہوئی۔ امیر گرفتار ہو کر سلطان کے سامنے آیا، اسے قتل کر دیا گیا اور دوسری بار پھر ہندستان اس کے قبضے میں آ گیا۔ جب علاؤ الدین حسن بن حسین غوری جو ملوک غور میں سے تھا اس نے اس کے خلاف بغاوت کی اور غزنی تک آ پہنچا تو بہرام شاہ بھاگ گیا اور علاؤ الدین اپنے بھائی سیف الدین غوری کو غزنی میں چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ بہرام شاہ نے واپس آ کر غزنی پر قبضہ کر لیا اور سیف الدین کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں ذلیل کیا اور پھر ذلت کے ساتھ اسے قتل کیا۔ جب علاؤ الدین کو اس کی اطلاع ملی تو اسے بے حد رنج ہوا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ غزنی کے لیے چل پڑا، مگر اس کے غزنی پہنچنے سے پہلے بہرام شاہ ملک آخرت کا سفر اختیار کر چکا تھا۔ اس کے بجائے اس کا بیٹا تخت نشین تھا۔ علاؤ الدین نے اپنے بھائی کا سخت انتقام لیا اور غزنی کی خاک پر جو ہزاروں افراد کے قتل کے خون کی حامل تھی خون کی ندیاں بہادیں۔ بہرام شاہ 547ھ/1156ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا تھا اس کے نصیب میں 32 سال کی حکمرانی لکھی تھی۔ مسعود سعد سلمان نے اس کی مدح میں یہ مسدس کہا تھا:

بہرام شاہ خسرو گیتی کشائی گشت
خورشید دہر وسایۂ فرخدائی گشت

چترش کہ شد ہمایون فرہنائی گشت
او را خدای عزو جل رہنمائی گشت

خسرو شاہ بن بہرام شاہ

اپنے والد کے بعد تخت نشین ہوا۔ علاء الدین حسین بن حسن غوری اس کے مقابلے پر آیا۔ خسرو شاہ نے بھاگ کر لاہور کا رخ کیا اور جب علاء الدین غزنی سے کامیاب ہوکر واپس آیا تو خسرو شاہ جو موقع کی تلاش میں لگا ہوا تھا فوج کشی کی اور غزنی پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ جب قبیلہ غزان نے سلطان سنجر کو گرفتار کرلیا تو علاء الدین وہاں سے غزنی پہنچا۔ خسرو شاہ تک جب یہ خبر پہنچی تو وہ دوبارہ بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ یہاں 555ھ/ 1160ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس نے 8 سال تک حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں بڑے بڑے شاعر ہوئے تھے۔ جنھوں نے خسرو شاہ کی مدح میں قصیدہ لکھے تھے۔ یہ شعر ایک ترجیع بند سے لیا گیا ہے:

شاہنشہ معظم خسرو شہ آنکہ آسمان
با تیغ و گرز گیرد از ھند تا خراسان

قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ خسرو شاہ کا انتقال غزنی ہی میں ہوا تھا۔ علاء الدین نے جب غزنی کو تباہ و برباد کر کے قتل کیا تھا تو وہ اپنے بھتیجوں غیاث الدین ابو الفتح اور شہاب الدین ابو المظفر کو وہاں چھوڑ آیا تھا۔ انھوں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس دوران انھوں نے مختلف ترکیبوں سے خسرو شاہ کو اپنی امن پسندی اور وفاداری کا اطمینان دلایا تھا۔ مگر 1160/555ء میں انہی کے ہاتھوں خسرو شاہ گرفتار ہوا اور اسی سال اُس کا انتقال بھی ہوگیا۔ خسرو شاہ کے انتقال کے بعد غزنوی خاندان کا عہد حکومت ختم ہوگیا۔ کیونکہ اس کی تمام سلطنت شہاب الدین غوری کے قبضے میں آگئی تھی۔ چونکہ نظام الدین احمدؒ نے تاریخ نظامی میں لکھا ہے جسے انھوں نے اسے

روضتہ الصفا سے اخذ کیا ہے کہ خسرو ملک ابن خسرو شاہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس لیے میں نے بھی انکی پیروی کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

خسرو ملک ابن خسرو شاہ

خسرو شاہ کے انتقال کے بعد خسرو ملک لاہور کے تخت پر بیٹھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا عیاش تھا اس لیے اس کے عہد حکومت میں ہر طرف ابتری پھیل گئی۔ غزنوی حکومت جو پہلے کمزور ہو چکی تھی، خسرو ملک اس کی مردہ لاش کو بس ذرے مار مار کر گھسیٹتا رہا۔ غوری خاندان کا ستارہ عروج پر تھا اور وہ دن رات ترقی کرتا رہا۔ اس لیے حکومت عورتوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن گئی۔ سلطان معزالدین محمد سام المعروف بہ سلطان شہاب الدین غوری نے غلبہ پا کر غزنی کو اپنا پایہ تخت بنایا اور غزنوی بادشاہوں کی طرح اس نے بھی ہندستان پر لشکر کشی کی اور لاہور کے نزدیک آ پہنچا۔ خسرو ملک کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا، سلطان شہاب الدین غوری کا مقابلہ کیسے کرتا؟ اس لیے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر امان چاہی۔ سلطان شہاب الدین غوری اسے اپنے ہمراہ غزنی لے گیا اور وہاں سے اسے غیاث الدین کے پاس بھیج دیا جس نے اسے فیروز پہاڑ کے دامن میں قید کر دیا جہاں قید کے دس سال بعد وہ مر گیا:

دل چند بد درین دہر کہ بی بنیاد است!
نو عروسی است کہ در عقب بسی داماد است!

خسرو ملک نے 583ھ/ 1187ء میں وفات پائی، وہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے 28 سال تک حکومت کی، اس کے بعد غوری خاندان کی باری آئی اور اس نے زمام حکومت سنبھالی۔

"توتی الملک من تشاء"
بقا بقای خدای ست و ملک ملک خدای

قاضی بیضاویؒ غزنوی مملکت کی مدت سلطان محمود سے خسرو شاہ تک 161 سال لکھتے ہیں اور اس کے بارہ بادشاہوں نے حکومت کی، مگر قاضی یحییٰ قزوینی کے نزدیک یہ عہد حکومت 155 سال تھا اور 14 بادشاہوں نے حکومت کی۔ تاریخ نظامی کے مصنف کی رائے میں 215 سال ہوتی ہے اور 15 بادشاہوں نے حکومت کی، واللہ اعلم بالصواب۔

غوری عہدِ حکومت

جس نے دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا اور ہندستان میں اسلامی حکومت قائم کی، سلطان شہاب الدین غوری نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

سلطان معز الدین محمد سام المعروف بہ سلطان شہاب الدین محمد غوری

معز الدین کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین غوری، عراق اور خراسان کا بادشاہ تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری اسی کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے غزنی میں تخت نشین ہوا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا نیز اپنے بڑے بھائی کے حکم سے ہندستان پر لشکر کشی کی اور نعرۂ غزوہ اور جہاد بلند کیا۔ اسی کے عہد حکومت میں دلی فتح ہوئی تھی۔ اس پر انھوں نے اسلامی پرچم لہرایا تھا اور انھوں نے مستقبل میں ہندستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ سلطان غیاث الدین نے تگین آباد پر جو گرمسیر کے توابع میں سے

تھا، قبضہ کر کے سلطان شہاب الدین کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا اور خود غزنی پر لگاتار حملہ کرتا رہا یہاں تک کہ اسی سال اُس نے اس ملک کو اپنے دائرہ فتوحات میں لے لیا۔ اس نے غزنی سے قبیلہ غزان کو بھی نکال باہر کیا جو سلطان سنجر کی گرفتاری کے بعد اس پر قابض ہو گیا اور معز الدین کو سلطان شہاب الدین کا لقب دیا۔ سلطان شہاب الدین نے اپنے بڑے بھائی کی نیابت کے پہلے سال کے دوران ہی 570ھ/1174ء میں گردیز کو فتح کر لیا اور پھر اچہ[45] اور ملتان پر قبضہ کر لیا اور قرامطیوں کے طائفوں کو وہاں سے نکال دیا۔ قبیلہ بھٹیہ[46] نے اپنے آپ کو قلعہ بند کر رکھا تھا ان کا بھی قلع قمع کیا اور اس کے بعد یہ پورا علاقہ علی کرمانی کے سپرد کر کے غزنی لوٹ گیا۔

574ھ/1178ء میں سلطان شہاب الدین اپنی فوج کے ساتھ گجرات پہنچا۔ اس علاقے کے حکمران بھیم دیو کے ہاتھ سے شکست کھائی اور بڑی مشکل سے غزنی پہنچا۔ 575ھ/1179ء میں اس نے پرشور[47] فتح کیا اور 580ھ میں لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان خسرو شاہ کو جو غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ خبر ملتے ہی لاہور کے قلعے کو بند کر کے بیٹھ گیا کافی خط و کتابت کے بعد اس نے اپنے بیٹے کو ایک ہاتھی کے ساتھ بطور نذرانہ بھیجا تو سلطان شہاب الدین نے اس کی عرض داشت صلح قبول کر لی۔ اسی موقع پر اس نے قصبۂ سیالکوٹ کی بنیاد ڈالی اور وہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے غزنی چلا گیا۔ 581ھ/1185ء میں وہ دیول[48] کی جانب بڑھا۔ اور بحر شور کے ساحلی شہروں کو تہس نہس کر کے آدھے سے زیادہ مال و اسباب لوٹ لیا۔

582ھ/1186ء میں پھر وہ لاہور آیا اس کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کیا اور حسین کو قلعہ سیالکوٹ کا نگراں مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ تاریخ نظامی جو اس منتخب التواریخ کا ماخذ ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سیالکوٹ[49] کی بنیاد اسی سال ڈالی گئی تھی۔ یہ مبارک شاہی کے اس خیال سے مختلف ہے کہ اس کی بنیاد اس سے دو سال قبل ڈالی گئی تھی، واللہ اعلم۔ چونکہ تاریخ بھی خانہ خراب اور دوسری چیزوں کی طرح خراب ہے اس لیے اختلاف کی عذر خواہی ظاہر ہے اور اسی سال خسرو ملک کھوکھروں کی مدد سے ایک مدت تک

حصار سیالکوٹ کا محاصرہ کیے رہا مگر ناکام واپس ہوا۔ اسی سال سلطان شہاب الدین نے دوبارہ لاہور پر چڑھائی کی خسرو ملک قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا مگر کب تک؟ آخر مجبور ہو کر اسے سلطان شہاب الدین کے حضور آنا پڑا۔ سلطان اسے اپنے ہمراہ لے گیا اور اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کے سپرد کر دیا جس نے اسے فیروز کوہ میں بند کر دیا۔ جہاں اسی حالت میں وہ مر گیا۔ فیروز کوہ گرجستان کے قلعوں میں سے ایک ہے۔ اس تاریخ سے حکومت بلا خوف وخطر غوریوں کے پاس چلی گئی۔

اسی سال سلطان شہاب الدین نے حاکم ملتان علی کرمانی کو لاہور میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور 587ھ/1191 میں پھر غزنی سے روانہ ہو کر قلعہ تبر ہندہ کو سر کیا۔ یہ مقام ہندستان کے بڑے بڑے راجاؤں کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ ملک ضیاء الدین تولکی کو ایک ہزار اور بیس چنے ہوئے سواروں کو لے کر اس قلعے میں چھوڑا اس نے واپسی کا ارادہ کیا مگر حاکم اجمیر رائے پتھورا اور اس کے بھائی کھندی رائے دونوں کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوا۔ کھندی رائے پہلے دلی کا حاکم تھا وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ موضع ترائن پہنچا جو دریائے سرسوتی 50 کے کنارے واقع ہے اور دہلی سے سات کوس کے فاصلے پر ہے اور آج کل تراوڑی کے نام سے مشہور ہے۔ اسلامی فوج نے اس معرکے میں مات کھائی اس لڑائی میں سلطان نے بڑی پھرتی دکھائی اس نے کھندی رائے پر جو ہاتھی پر سوار ہو کر لشکر کے آگے آگے تھا جھپٹ کر حملہ کر دیا جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو گیا کھندی رائے نے بھی جوابی حملہ کیا اور سلطان پر نیزہ سے وار کیا جس سے سلطان کا بازو زخمی ہو گیا مگر دونوں کی جان سلامت رہی۔ سلطان گھوڑے سے اترا آیا اور اپنے بیٹے خلجی کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ خلجی نے گھوڑے کو تیز دوڑایا اور دونوں باپ بیٹے میدان جنگ سے صحیح سلامت باہر نکل آئے رائے۔ پتھورا نے قلعہ بتر ہندہ کا ایک سال اور ایک ماہ تک محاصرہ کیا اور آخر صلح و صفائی کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔

588ھ/1191ء میں سلطان شہاب الدین غوری چالیس ہزار نامور سواروں کے ساتھ پھر ہندستان آیا اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور سلطان سنے ہانسی اور

سرتی کے قلعوں پر چڑھائی کی اور ان پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اجمیر کی جانب بڑھا یہ شہر رائے پتھورا کا دارالسلطنت تھا اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے اردگرد کے نواح کو خوب تاخت و تاراج کیا بڑی تعداد میں عوام وسپاہی گرفت میں آئے۔ دوسرے ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی اجمیری قدس اللہ سرہ العزیز جو دیار ہند کے مشائخ عظام کا سرچشمہ ہیں اور جن کا مزار متبرک اجمیر میں ہے۔ اس معرکہ میں سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ تھے اور یہ فتح اسی قطب ربانی کے فیوض و برکات کے طفیل تھی۔

اسی سال سلطان اپنے غلام، متبنّی اور جانشین ملک قطب الدین ایبک کو قصبۂ کہرام[51] میں چھوڑ کر خود کوہ سوالک کے راستہ غزنی پہنچا۔ بعد میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو مسخر کیا اور رائے پتھورا اور کھندی رائے کے اقربا کے ہاتھ سے چھین لیا۔

589ھ/1192ء میں سلطان شہاب الدین نے چندوار اور اٹاوہ کے حدود میں راجہ جے چند حاکم قنوج کے ساتھ جنگ کی اور اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد غزنی روانہ ہوگیا اور قلعہ کول[52] قطب الدین ایبک کے قبضے میں آیا۔ اس نے دہلی کو پایہ تخت بنایا اور اس کی اطراف ونواح میں شاہی نظم ونسق قائم کردیا۔ اس دن سے دہلی سلاطین اسلام کا دارالسلطنت قرار پایا اور مینار اور دوسری عمارتیں اور مسجد وغیرہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ چنانچہ ان سب کا ذکر اپنی اپنی جگہ کیا جائے گا۔

591ھ/1194ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے قلعہ تھنگرام اور بداؤں (بدایوں) پر قبضہ کیا اور 593ھ/1196ء میں گجرات فتح کرکے نہروالہ یعنی پٹن کی جانب بڑھا۔ بھیم رائے دیو سے بہت سا مال غنیمت سلطان کے ہاتھ آیا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اسی سال سلطان غیاث الدین کا انتقال ہوگیا۔ سلطان شہاب الدین کو جب اس کی خبر ملی تو وہ طوس اور سرخس کی حدود میں تھا وہ فوراً بادغیس کی جانب روانہ ہوگیا وہاں پہنچ کر مراسم عزاداری ادا کیے اور پھر اپنے بھائی کی ملکیت کو رشتہ داروں میں تقسیم کرکے غزنی روانہ ہوگیا۔ پھر خوارزم پر چڑھائی کی۔ سلطان محمد خوارزم کے ساتھ جنگ ہوئی اور غوریوں کی کافی تعداد اس چڑھائی میں کام آئی مگر اس کے باوجود سلطان خوارزم غوریوں پر فتح نہ

پا سکا۔ اسی دوران ترکستان کے تمام بادشاہوں کی طرف سے محمد خوارزم کو مدد پہنچ گئی اور سلطان شہاب الدین کو اس لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں سلطان نے شکست کھائی اور ایک ہزار سوار فوج کے ساتھ وہ اندخود کے قلعے میں بند ہو گیا۔ امان پانے کے بعد وہاں سے غزنی واپس آیا۔

اس درمیان میں نواحی لاہور کے کھوکھروں کے ایک گروہ نے سر اٹھایا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے ان پر چڑھائی کر دی اور مدد کے لیے قطب الدین ایبک کو بھی دہلی سے بلوا بھیجا۔ دونوں نے مل کر کھوکھروں کی خوب گوشمالی کی۔ اس کے بعد سلطان غزنی لوٹ گیا۔ اور راستے میں ابھی توابع غزنی کے ایک مقام دمیک پہنچا تھا کہ ایک فدائی کھوکھر نے موقع پا کر اسے شہید کر دیا۔ اس کی وفات سے متعلق یہ قطعہ تاریخ ہے:

شہادت ملک بحر و بر شہاب الدین
کز ابتدائی جہان ہمچو او نیامد یک
سوم ز غرہ شعبان سال ششصد بود
فتادہ در رہ غزنین بمنزل دمیک 5 3

اس نے 32 سال تک حکومت کی۔ اس کے پس ماندگان میں سے اسکی وارث صرف ایک لڑکی تھی۔ اس نے سونے چاندی اور جواہرات کے بے بہا خزانے اپنے پیچھے چھوڑے تھے ان میں سے ایک خزانہ پانچ سو من الماس 54 کا تھا۔ الماس کا شمار نفیس ترین جواہرات میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دوسرے خزانوں کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے نو مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ دو مرتبہ معرکوں میں شکست کھائی تھی اور سات مرتبہ فتح حاصل کی تھی:

معزالدین محمد سام را دیدی کہ در ہیجا
قوی تر بود بازو و دل از سام نریمانش

میسر گشت چون محمود از فیلان ہندستان
سیاست ہای ساسان وولایت ھای سامانش
گذشت از عالم و گوید وبر راوی بود عہدہ
کہ پانصد من فزون الماس ماند از گنج سامانش

اس کے عہد حکومت میں علماء اور فضلاء کی ایک کثیر تعداد نے شہرت پائی تھی۔ ان میں سے ایک امام فخر الدین رازیؒ بھی تھے جنھوں نے "لطائف غیاثی" اور دیگر کتب لکھیں اور سلطان شہاب الدین کے بھائی سلطان غیاث الدین ابوالفتح کے نام سے منسوب کیں۔ امام موصوف کا قیام معز الدین المعروف بہ سلطان شہاب الدین غوری کے لشکر میں تھا۔ وہ ہفتہ میں ایک بار وعظ فرمایا کرتے۔ وعظ کے خاتمے پر سلطان پر رقت طاری ہو جاتی۔ چونکہ امام رازیؒ اس دوامی سلسلہ ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، ایک روز جب وہ منبر پر کھڑے ہوئے تو سلطان کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا کہ اے سلطان معز الدین کچھ عرصہ کے بعد نہ تیری یہ عظمت وشان باقی رہے گی اور نہ رازی کا یہ تملق اور نفاق یہ قطعہ بھی انہی کا ہے:

اگر دشمن نسازد باتوای دوست
ترا باید کہ بادشمن بسازی
وگر نہ چند روزی صبر فرما
نہ او ماند نہ تو نہ فخر رازی

سلطان کے قتل کے بعد بعض فتنہ انگیزوں نے حسد کی بنا پر امام رازیؒ پر یہ الزام لگایا کہ ان کا تعلق فدائیوں55 سے ہے اور وہ ان کے ارادے سے بخوبی واقف ہیں۔ فتنہ پردازوں نے جب امام رازیؒ کی جان لینے کا قصد کیا تو انھوں نے موید الملک سجزی جو سلطان کے معتمد امراء میں سے تھے ان سے حفاظت جان کی التجا کی۔ کسی شاعر نے سلطان

کی تعریف میں قصیدہ کہا جس کے دو شعر ہیں:

سلطان معز الدین شاہ غازی کہ در جہان
تیغش چو ذوالفقار علی مرتضی شدست
سلطان حق محمد سام آن کہ خلق را
مہرش چو مہر دوستی مصطفی شدست

سلطان قطب الدین ایبک

سلطان معز الدین المعروف بہ شہاب الدین غوری کے خاص برگزیدہ اور معتبر غلاموں میں سے تھا، چونکہ چاند گرہن کے وقت اس کی چھوٹی انگلی ٹوٹ گئی تھی اس لیے اس کے نام کے ساتھ ایبک[56] کا اضافہ ہو گیا۔ اسے قطب الدین لکھ بخش بھی کہتے تھے۔ ہندستان کے امراء کی رائے سے دہلی کے استحکام وحفاظت کے لیے اس نے یہاں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ سلطان معز الدین کی شہادت کے بعد اس کے بھائی کا لڑکا غیاث الدین محمود نے فیروز کوہ سے چتر اور خلعت بادشاہی دونوں چیزیں ملک قطب الدین کو بھیجیں اور سلطان کے نام سے مخاطب کیا۔ سلطان غیاث الدین محمود کی مدح میں یہ شعر کہا گیا تھا:

سلطان مشرقین، جہاندار مغربین
محمود بن محمد بن سام بن حسین ۔

سلطان قطب الدین ایبک 602ھ1206ء میں دہلی سے لاہور جا کر بروز منگل 16/ ماہ ذی قعدہ کو تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ جود و سخا میں اپنی مثال آپ تھا اور مستحقین کو حوصلے سے بڑھ چڑھ کر انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ لکھ بخشی کے طریقہ کا بانی بھی وہی تھا۔ فضلائے عصر میں سے فاضل بہاء الدین اوشی[57] نے یہ اشعار اسی کی مدح میں لکھے تھے:

اے بخشش لک تو در جہان آوردہ
کان را کف تو کار بجان آوردہ
از رشک کف تو خون گرفتہ دل کان
وز لعل بہانہ درمیان آوردہ

زیادہ وقفہ نہیں گزرا ہوگا کہ سلطان قطب الدین ایبک اور تاج الدین یلدوز کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ تاج الدین یلدوز سلطان فخر الدین کے بندگان خاص میں سے تھا۔ اس نے غزنی میں اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا اور لاہور پر بھی چڑھائی کر دی۔ چنانچہ پنجاب کی حدود میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھی جس میں تاج الدین یلدوز نے شکست کھائی اور اپنے مستقل مستقر کرمان کی جانب بھاگ نکلا۔ سلطان قطب الدین اس کے بعد رفتہ رفتہ غزنی پر بھی قابض ہو گیا اور چالیس روز وہاں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے اپنے اوقات خوب لہو ولعب اور عیش پرستی میں گزارے، یہاں تک کہ غزنی کے باشندے اس سے عاجز ہو گئے انھوں نے خفیہ طور پر تاج الدین یلدوز سے سازباز کی اور اسے بلوا بھیجا۔ وہ اس انتظار میں بیٹھا تھا چنانچہ فوراً آ پہنچا۔ سلطان قطب الدین اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر سنگ سوراخ[58] کے راستے لاہور چلا آیا:

چو سلطان سر انداز باشد تہی
فتد بی خبر از سرش تاج کی

ابھی اس کی حکومت کو زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ 617ھ/1220ء میں جب کہ وہ لاہور میں چوگان کھیلنے میں مصروف تھا گھوڑے سے گر کر مر گیا اور اسی شہر میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر پر آج بھی لوگ زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ وہ پہلا ہندستان کا مسلمان فاتح تھا۔[59] جس کی کل مدت حکمرانی بیس سال پر مبنی ہے مگر اس بیس سال کے عرصے میں وہ بحیثیت سلطان صرف چار سال ہی حکومت کر سکا۔

گردون گردان شکست این کہنہ چرخ چنبری
ناتوانی دل جنہ بر مہر و ماہ و مشتری

سلطان معز الدین کے دوسرے امیروں اور غلاموں میں سے سات نے ہندستان کے مختلف صوبوں جیسے بنگال، لاہور اور غزنی وغیرہ میں حکومت کی تھی اور ان کے حالات اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ اس میں سے ایک تاج الدین یلدوز تھا جو ترائن عرف تراوڑی کی حدود میں سلطان شمس الدین التمش کے خلاف جنگ کرتا ہوا گرفتار ہوا۔ دوسرا سلطان ناصر الدین قباچہ جس نے تاج الدین یلدوز کی ایک بیٹی سے شادی کی تھی اور اس کی دوسری بیٹی سلطان قطب الدین ایبک سے بیاہی گئی تھی سلطان معز الدین نے اپنی زندگی ہی میں سلطان ناصر الدین قباچہ کو اُچہ [60] اور ملتان عطا کر دیا تھا [61]۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اس نے اپنی حدود حکمرانی میں توسیع کی، سرسوتی اور کہرام تک کے علاقے کو بھی قبضے میں لے آیا نیز لاہور پر بھی قابض ہوگیا۔ ملک تاج الدین یلدوز کا جو لشکر غزنی سے مؤید الملک سجزی کی قیادت میں آرہا تھا سلطان ناصر الدین قباچہ نے اس کے ساتھ بھی جنگ کی مگر ہار گیا اور سندھ کی جانب چلا گیا جہاں اس نے دوبارہ اپنی قوت بحال کی۔

611ھ/1214ء [62] میں مغلوں کے لشکر نے چالیس روز تک ملتان کا محاصرہ کیا۔ سلطان ناصر الدین قباچہ نے خزانہ شاہی کے دروازے عوام پر کھول دیے اور اتنی بہادری دکھائی کہ مغلوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے آخر کار 22 سال کی حکومت کے بعد وہ سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھ گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ [63]

سلطان ناصر الدین قباچہ کے علاوہ سلطان معز الدین کے امیروں اور غلاموں میں ایک اور شخص کا بھی شمار ہوتا تھا اور وہ ملک بہاء الدین طغرل ہے۔ جب سلطان معز الدین نے قلعہ بھنگر [64] فتح کیا تو اسے اسی ملک طغرل کے حوالے کر دیا جس نے بھیانہ کے علاقے میں تعینات کیا اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

وہ ہمیشہ گوالیار کے نواح کو تاخت و تاراج کرتا تھا۔ سلطان معز الدین نے جب

گوالیار سے مراجعت کی تھی تو اس نے اسی وقت وعدہ کیا تھا کہ یہ قلعہ بھی ملک بہاء الدین طغرل کو دے دیا جائے گا۔ وہ گوالیار سے تین چار میل کے فاصلہ پر بڑی مضبوطی سے جم کر بیٹھا تھا۔

اس نے قلعہ کے اندر موجود لوگوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا یہاں تک کہ اسی حالت میں ایک سال گزر گیا۔ آخر کار قلعہ والوں نے پیغامات اور تحائف بھیج کر سلطان قطب الدین ایبک کو بلوایا اور قلعہ اس کے حوالہ کر دیا۔ اس بات پر قطب الدین ایبک اور ملک بہاء الدین طغرل کے بیچ اختلاف ہو گیا۔ جس نے آخر کار سخت عداوت کی صورت اختیار کر لی، مگر بہاء الدین طغرل کی عمر نے وفا نہ کی اور تھوڑے عرصے کے اندر وہ انتقال کر گیا۔

سلطان معز الدین کے سلسلۂ امراء میں ایک شخص ملک محمد بختیار [65] غوری بھی تھا جو بلاد غور اور گرمسیر کے اکابر میں سے تھا۔ وہ جملہ اوصاف حمیدہ کا مالک تھا سلطان معز الدین کے عہد حکومت میں وہ پہلے غزنی آیا پھر ہندستان پہنچا مگر یہاں پہنچ کر اس نے اسے پسند نہ کیا کہ سلطان قطب الدین کے ساتھ لاہور میں مقیم رہے۔ اس لیے وہ حسام الدین اوغلبک کے پاس گیا جو دو آبہ اور دریائے گنگا کے اس پار کے علاقے کا حاکم تھا اور کنتیلا [66] اور پٹیالی اسے بطور انعام ملے تھے۔ ملک محمد بختیار غوری وہاں سے اودھ کو روانہ ہوا، اسے فتح کیا۔ اس کے بعد بہار اور منیر [67] کی جانب بڑھا اور اسے جیتا، جہاں انواع و اقسام کا مال غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ سلطان قطب الدین ایبک کو جب اس کی روز افزوں فتوحات کی اطلاع ملی تو ملک محمد بختیار غوری کی عزت افزائی کے واسطے خلعت شاہی اور لوائے سلطنت بھیجا۔ ملک محمد بختیار غوری نے بھی اس کے عوض بے شمار تحائف سلطان کی خدمت میں بھیجے اور مزید انعام و اکرام سے مالا مال کیا بارگاہ سلطانی کے امراء نے جب ملک محمد بختیار غوری کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھی اور اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بالکل بے بس پایا تو حسد اور جلن سے انھوں نے اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کیے یہاں تک کہ سلطان ان کی باتوں میں آ گیا اور اس نے ملک محمد بختیار غوری کو مست ہاتھی سے لڑنے کا حکم دے دیا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو ملک غوری نے ہاتھی کے خرطوم پر

ایک بھاری گرز سے اتنی کاری ضرب ماری کہ وہ چکرا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ سلطان اس واقعے سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ملک غوری کے لیے لکھنوتی[68] کے تمام علاقے کا فرمان جاری کر دیا۔ اس کے دوسرے سال ملک غوری اپنے لشکر کے ساتھ لکھنوتی سے ندیا[69] پہنچا۔ یہ شہر آج ویران اور برے حال میں ہے۔ اس کا حاکم رائے لکھمیہ تھا جس نے ملک محمد بختیار غوری اور اس کی طاقت کے متعلق پہلے ہی نجومیوں سے سن رکھا تھا، چنانچہ اس کی آمد کی خبر پاتے ہی وہ کامروپ کی جانب فرار ہو گیا اور بے شمار دولت مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔ محمد بختیار نے معبدوں اور بت خانوں کو مسمار اور ویران کیا، ان کی جگہ مسجدیں اور مکتب تعمیر کیے۔ اس نے دار السلطنت کی بنیاد ڈالی اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام گور[70] (غور) رکھا:

آنجا کہ بود نعرہ و غوغائی مشرکان
اکنون خروش و غلغل اللہ اکبر است

اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے اور سکہ جاری کرنے کے بعد ملک بختیار غوری نے تبت اور ترکستان کے ممالک فتح کرنے کا ارادہ کیا اور ایک بڑی جمعیت کے ساتھ اُدھر روانہ ہوا جو امیر علی[71] میچ کی کمان میں تھی۔ اس کے مقابلے کے لیے بارہ سرتاپا مسلح سوار بردھن شہر پہنچ گئے۔ ملک غوری کے راستے میں دریائے برہم پتر پڑتا تھا جس کا دوسرا نام برہمکوی تھا یہ دریائے گنگا سے تین چار گنا بڑا ہے۔ شاہ گشتاسپ جب ادھر آیا تھا تو اس نے اس دریا پر ایک پل بنایا تھا اور کامروپ کے پاس سے اسے عبور کر کے آگے بڑھا تھا، ملک بختیار نے بھی اسی پل سے اسی مقام پر دریا کو عبور کیا۔ پل کی نگرانی اور راستے کی حفاظت کے لیے اس نے اپنے پیچھے چند قابل اعتماد جرنیلوں کو چھوڑا۔ پھر وہ تبت پہنچا، دس روز پہاڑوں کے دشوار راستہ طے کرنے میں گزارے آخر اسے ایک صحرا دکھائی دیا جہاں ایک بے حد مستحکم قلعہ تھا۔ اہل قلعہ گشتاسپ کی نسل سے تھے اور اس قلعے کی بنیاد بھی گشتاسپ نے ڈالی تھی، چنانچہ اہل قلعہ جنگ کرنے کے لیے میدان میں نکل آئے اور شام تک لڑتے رہے۔ محمد

بختیار کے بہت سے آدمی کام آئے، اس نے اس جگہ خیمے گاڑ دیے تو اسے خبر ملی کہ اس شہر سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک اور شہر ہے جہاں پچاس ہزار جنگجو ترک ہیں اور وہ اہل قلعہ کی امداد کو آئیں گے اس لیے دوسرے دن محمد بختیار نے وہاں ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ چونکہ اس میں مقابلے کی طاقت نہیں تھی اسی پل پر واپس آ گیا مگر اس کے پہنچنے سے قبل ہی جن جرنیلوں کو اس نے پل کا نگران اور راستے کا محافظ مقرر کیا تھا کسی وجہ سے وہ آپس میں لڑ پڑے تھے جس کی وجہ سے کفار کو پل کے دو طاق توڑنے کا موقع مل گیا۔ جب محمد بختیار پل کی جانب واپس آ رہا تھا تو کفار اس کے تعاقب میں تھے چنانچہ اس نے پلٹ کر حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس مقام کے قریب ہی ایک مضبوط بت خانہ تھا، محمد بختیار نے رات وہیں گزاری، صبح دریا پار کرنے کا سوال درپیش ہوا تو قریب ہی ایک جگہ دریا پایاب نظر آیا، اور اس کے چند آدمی وہاں سے گزر کر پار ہونے لگے ریت ریگ رواں بن گئی اور جہاں کہیں وہ پاؤں رکھتے ریت نیچے سے کھسک کر زمین میں دھنس جاتی اور اس کے بجائے پانی کا چشمہ ابل پڑتا۔ چنانچہ محمد بختیار کے اکثر لشکری اس بحر فنا میں غرق ہو گئے اور جو بچ گئے وہ تیغ کفار کا لقمہ بنے اور جام شہادت نوش کیا۔ اتنے ہزار آدمیوں میں سے محمد بختیار صرف چار سو کے ساتھ دیوکوٹ پہنچا اور رنج و اندوہ کے باعث بیماری نے مرض دق کی صورت اختیار کر لی۔ اس حالت میں وہ اکثر کہتا کہ شاید سلطان معزالدین سام کو جو حادثہ پیش آیا تھا اس کی وجہ سے دولت اس سے برگشتہ ہو گئی ہے۔ روز بروز اس کی حالت گرتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے امراء میں سے ایک بڑے امیر علی مردان نے جو نارنول 72 کے علاقے سے دیوکوٹ پہنچا تھا۔ جب محمد بختیار کو صاحب فراش دیکھا تو اس کے چہرے سے چادر ہٹا کر خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ 603ھ/1206ء کو رونما ہوا۔ جب کہ سلطان معزالدین سام وفات پا چکا تھا۔ اسی علی مردان نے سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد بھی بڑی حکمت عملی سے عنان حکومت چھین لی تھی۔ لکھنوتی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا تھا، اپنا ہی سکہ جاری کیا تھا اور سلطان علاء الدین کے نام کی آڑ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ چونکہ وہ بڑے درجے کا کمینہ، مغرور اور بیہودہ تھا اس

لیے لکھنوتی میں بیٹھا اپنے آدمیوں میں ممالک ایران و توران کی تقسیم کرتا رہتا اور کسی کو اس سے یہ دریافت کرنے کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ ممالک تو مابدولت کے احاطہ تصرف سے باہر ہیں۔ اس لیے ان کی تقسیم یہاں کے آدمیوں میں کیسے کی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مصیبت زدہ تاجر نے سلطان علاء الدین سے اپنے افلاس اور غربت کی شکایت کی۔ چنانچہ اس سے دریافت کیا گیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس نے اصفہان کا نام بتایا۔ یہ سنتے ہی اس نے حکم دیا کہ ایک فرمان حاکم اصفہان کے نام جاری کر دیا جائے کہ وہاں کی زمین کا ایک قطعہ گزارے کے لیے تاجر مذکور کو دے دیا جائے۔ تاجر نے اس قسم کا فرمان لے جانے سے انکار کر دیا، مگر وزیروں میں سے کسی کو اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سلطان کو اس امر کی اطلاع دیتا۔ ایک مرتبہ سلطان سے یہ کہا گیا کہ حاکم اصفہان کو نظم و ضبط بحال کرنے کے لیے خرچ کی ضرورت ہے اس پر اس نے حکم دیا کہ اسے ایک خطیر رقم بھیج دی جائے جو توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ جب اس کے مظالم حد سے زیادہ بڑھ گئے تو امرائے خلج نے متحد و متفق ہو کر اسے قتل کر ڈالا اور اس کی جگہ ملک حسام الدین کو تخت پر بٹھا دیا جو غور اور گُرمسیر کے امراء اور محمد بختیار کے خدمت گزاروں میں سے تھا۔ علی مردان کی حکومت کی مدت 32 سال تھی۔ ملک حسام الدین تخت نشین ہوتے ہی ترہت، بنگال، جاج نگر اور کامروپ کے تمام علاقوں پر قابض ہو گیا۔ اس نے سلطان غیاث الدین لقب اختیار کیا۔ 622ھ/1225ء میں اس نے سلطان شمس الدین التمش کو 38 ہاتھی اور ستر ہزار تنکہ 73 علاوہ سونے چاندی کے بطور نذرانہ بھیجا اور ان کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا چنانچہ اس کا تذکرہ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

624ھ/1227ء میں ملک ناصر الدین محمد بن سلطان شمس الدین التمش اپنے بعض امیروں کے ورغلانے اور اکسانے پر اودھ سے لکھنوتی روانہ ہوا۔ غیاث الدین اس وقت فوج کے ساتھ کامروپ گیا ہوا تھا۔ یہ بات اسے پتہ چلی تو وہ واپس آ گیا اور ملک ناصر الدین محمد کے ساتھ اس کی خونریز جنگ ہوئی مگر وہ اپنے امراء کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ گرفتار ہو گیا اور بعد میں ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ انھوں نے دو سال تک حکومت کی۔

ہندستان کے ان چند مسلمان بادشاہوں کا ذکر دہلی کے سلاطین بزرگ کے سلسلے میں ضروری اور مناسب تھا اور باقی ملوک معزی کے حالات میں جو ملتان اور دوسرے مقامات پر قابض رہے دوسری جگہ درج ہے۔

سلطان آرام شاہ بن قطب الدین ایبک

باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا:

جہان را نماند بی کد خدائی
یکی گر رود دیگر آید بجائی
ھمین است رسم سرای قریب
پدر رفت و پائی پسر در رکیب

امراء کے اتفاق رائے سے آرام شاہ نے لاہور سے دہلی کی جانب کوچ کیا۔ اس اثناء میں سپہ سالار علی اسمٰعیل کی استدعا پر ملک شمس الدین التمش بردوار اور بدایوں سے آکر دہلی پر قابض ہو گیا۔ واضح رہے کہ ملک شمس الدین التمش سلطان قطب الدین کا غلام، منہ بولا بیٹا اور داماد تھا۔ ملک ناصر الدین قباچہ کے ساتھ بھی اس کے باج گزارانہ تعلقات تھے۔ جب آرام شاہ نواح دہلی میں پہنچا تو ملک شمس الدین التمش اس کے مقابلے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور دہلی کی سرحد پر صف آرا ہوا۔ اس جنگ میں آرام شاہ نے شکست کھائی اس طرح کل ملا کر آرام شاہ[74] کا عہد حکومت ایک سال یا اس سے کچھ کم وقت تھا۔

سلطان شمس الدین التمش[75] المخاطب بہ یمین امیر المومنین

607ھ/1210ء میں دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ التمش[76] کی وجہ تسمیہ یہ ہے

کہ اس کی پیدائش چاند گرہن کی شب کو ہوئی اور ترک ایسے بچے کو التمش کہتے ہیں۔ اس کا باپ قبائل ترکستان کا سردار تھا۔ اس کے رشتہ دار ایک روز التمش کو سیر کے بہانے باغ میں لے گئے اور حضرت یوسف کی طرح ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا جہاں سے وہ بخارا اور اس کے بعد سلطان محمد سام کے عہد حکومت میں غزنی آیا۔ عین اس وقت قطب الدین ایبک نہروالہ اور گجرات کی مہم کے بعد غزنی پہنچا تھا، چونکہ بغیر حکم سلطان سام کے کوئی شخص التمش کو خرید نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے سلطان سے اجازت طلب کی۔ سلطان محمد سام نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ چونکہ وہ حکم دے چکے ہیں کہ غزنی میں اسے کوئی نہ خریدے اس لیے اسے دہلی لا کر فروخت کیا جا سکتا ہے، چنانچہ قطب الدین ایبک دہلی واپس آیا اور یہاں آ کر اس نے ایک لاکھ تنکہ میں دو غلام خریدے۔ ایک اس کا ہم نام ایبک تھا اور دوسرا یہ التمش۔ ایبک غلام کا نام امیر مغاج رکھا اور اسے تبرہندہ کا امیر مقرر کر کے بھیج دیا۔ جب قطب الدین ایبک کی جنگ تاج الدین یلدوز سے ہوئی تو یہ ایبک غلام شربت فنا سے آشنا ہوا۔ اس کے بعد التمش کو اس نے اپنا منظور نظر بنایا اور گوالیار کی فتح کے بعد وہاں کی وزارت اس کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد برن 77 اور اس کے علاقے کو اس کے سپرد کر دیا۔ جب اس کی قابلیت اور پروان چڑھی تو بدایوں علاقہ بھی اس کے ماتحت کر دیا۔ کھوکھروں کی جنگ میں التمش ایک بڑا لشکر لے کر سلطان معز الدین کی مدد کے لیے گیا تھا اور اپنے مسلح گھوڑوں کو دریا میں ڈال کر اس نے ان کے ساتھ مردانہ وار جنگ آزمائی کی تھی جس کے صلے میں سلطان نے اسے القابات خسروانہ اور شایان شان خلعتوں سے نوازا تھا۔ ملک قطب الدین نے اس کی بہت سفارش کی تھی اور اس کی تربیت کی تعریف کی تھی۔ اسی دن قطب الدین نے اسے آزادی کا پروانہ عطا کیا، پھر رفتہ رفتہ اسے امیر الامراء کے منصب پر فائز کر دیا یہاں تک کہ وہ اس عالی مرتبہ تک پہنچ گیا جہاں تک اسے پہنچنا تھا۔ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی ایام میں معزی اور قطبی امراء میں سے بعض نے بغاوت کی، ان کی سر کوبی کی گئی اور وہ سزا کا مستحق ہوا۔ جب ملک تاج الدین یلدوز خوارزم کے لشکر سے شکست کھا کر لاہور پر قابض ہوا تو التمش دہلی سے اس کے استقبال کے لیے لاہور روانہ ہوا

612ھ/1215ء میں ترائن جو تراوڑی کی سرائے کے نام سے مشہور ہے اس کی حدود میں دونوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوئیں اور خونریز جنگ ہوئی جس میں ملک تاج الدین یلدوز نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔ اسے بدایوں بھیج دیا گیا جہاں اس کی موت واقع ہوئی اور اسی شہر میں اسے دفن کر دیا گیا۔

612ھ/1215ء میں سلطان ناصر الدین قباچہ سے سلطان التمش کی جنگ ہوئی۔[78] قباچہ نے سلطان قطب الدین ایبک کی دو بیٹیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے شادی کی تھی۔ اس مہم میں بھی سلطان التمش کو فتح نصیب ہوئی۔ تیسری مرتبہ پھر اس کا مقابلہ سلطان ناصر الدین قباچہ سے ہوا۔ وہ حصار اُچ کو مستحکم کر کے خود قلعہ بھکر کی جانب چلا گیا۔ نظام الملک وزیر جنیدی نے اس کا پیچھا کیا اسی عرصے میں التمش نے قلعہ اُچ فتح کر لیا۔ جب اس کی خبر سلطان ناصر الدین قباچہ کو ملی تو اس نے اپنے بیٹے بہرام شاہ کو سلطان التمش کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی درخواست کی، بعد میں قلعہ بھکر بھی قبضہ میں آ گیا۔

615ھ/1218ء میں ناصر الدین پنجاب میں فوت ہوا اس کے مرنے کی وجہ سیلاب تھی۔ اس لیے سلطان التمش دہلی واپس آ گیا 618ھ 1221ء میں اس نے سلطان جلال الدین منکبرتی نے[79] خوارزم شاہ پر لشکر کشی کی جو چنگیز خاں سے شکست کھا کر تاج الدین یلدوز کے بعد غزنی پہنچا تھا۔ پھر وہاں سے بھی خائف ہو کر اپنے متعلقین کے ساتھ لاہور آ گیا تھا۔ سلطان جلال الدین اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر سندھ اور سیستان کی جانب چلا گیا، وہاں سے کچھ اور مکران کے راستے کرمان اور عراق پہنچا۔

622ھ/1225ء میں سلطان التمش نے بہار اور لکھنوتی کا رُخ کیا اور سلطان غیاث الدین خلجی جس کا ذکر آ چکا ہے تحفہ قبول کرنے کے بعد اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنا سکہ جاری کیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو سلطان ناصر الدین محمد کا خطاب دے کر ولی عہد مقرر کیا اور وہ علاقہ اس کے سپرد کر کے خود دہلی واپس آ گیا، بعد میں سلطان ناصر الدین محمد اور غیاث الدین خلجی کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس میں سلطان غیاث الدین خلجی کو شکست ہوئی اور وہ سلطان ناصر الدین محمود کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس معرکے میں لوٹ مار کا جو سامان

سلطان ناصر الدین محمود کو ملا اس نے اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا اور امرائے دہلی میں سے ہر ایک کو بطور ہدیہ الگ الگ حصہ بھیجا۔

کہتے ہیں کہ ناصر علی نامی ایک شاعر دہلی سے خواجہ قطب الدین اوشی[80] قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو بتایا کہ اس نے ایک قصیدہ سلطان التمش کی مدح میں کہا ہے۔ اس نے حضرت قدس سرہ سے درخواست کی کہ وہ فاتحہ خوانی کریں تاکہ اسے ثواب ملے، چنانچہ انھوں نے فاتحہ خوانی کی اس کے بعد وہ سلطان التمش کی مجلس میں آیا اور یہ مطلع پڑھا:

ای فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ
تیغ تو مال و فیل ز کفار خواستہ

ایک ہی بار پڑھنے سے یہ مصرعہ سلطان التمش کو ازبر ہوگیا اور اس پر اثر ہوا۔ اس کے بعد جب شاعر نے پورا قصیدہ سنایا تو سلطان نے دریافت کیا کہ کل کتنے شعر ہوئے؟ جب شاعر نے بتایا کہ 53 شعر ہوئے، تو سلطان نے حکم دیا کہ 53 ہزار تنکہ سفید ناصری شاعر کو بطور انعام دیا جائے۔

623ھ/1226ء میں سلطان التمش نے رنتھنبور کا ارادہ کیا اور اسے فتح کیا۔ اس کے بعد ایک لشکر لے کر 624ھ/1227ء میں مندور کے قلعہ کی فتح کے لیے بھیجا جو شوالک کی پہاڑی کے فتح کے درمیان میں پیش آیا اور وہ دہلی واپس آ گیا۔ اسی سال امیر روحانی جس کا شمار فاضل روزگار اور دانشمندوں میں ہوتا تھا چنگیز خان کے ہاتھوں پریشان ہو کر دہلی میں وارد ہوا۔ اس نے ان فتوحات کی خوشی کے موقعے پر قصائد لکھے۔

626ھ/1229ء میں کچھ عرب سفیر اس لیے القاب اور خلعت مصر[81] سے لے کر آئے اس خوشی میں شہر کو خوب سجایا گیا خوب صورت محرابیں بنائی گئیں اور جشن کی محفل اور خوشیوں کا جلسہ منعقد کیا گیا۔ اسی سال اسے اطلاع ملی کہ اس کا بڑا لڑکا سلطان ناصر الدین محمد لکھنوتی میں انتقال کر گیا ہے، غم سے فراغت کے بعد سلطان نے اپنے چھوٹے لڑکے کا نام ناصر الدین رکھ دیا۔ کتاب طبقات ناصری اسی کے نام سے موسوم ہے۔

627ھ/1230ء میں وہ خود لکھنوتی پہنچا اور وہاں کے فتنے کو زیر پا کیا اور حکومت عزالملک علاء الدین خانی کے سپرد کر کے خود پایہ تخت کو واپس چلا گیا۔ 629ھ/1232ء میں اس نے گوالیار کے قلعے کو فتح کیا اور دبیر مملکت تاج الدین یلدوز نے اس قلعے کی گھیرا بندی کے موقعے پر ذیل کی رباعی کہی جسے پتھر پر کندہ کر دیا گیا:

ہر قلعہ کہ سلطان سلاطین بگرفت
از عون خدا نصرت دین بگرفت
آن قلعہ گالیور و آن حصن حصین
درستاًیہ سن 2 [illegible] ششین بگرفت

ظاہرا یہ تاریخ محاصرہ ہے جو ایک سال پہلے کہی گئی تھی، قلعہ ایک سال کے بعد قبضے میں آیا 631ھ/1233ء میں اس نے صوبہ مالوہ کی طرف یورش کی بھیلسا[83] کو فتح کیا۔ اس کے بعد شہر اجین کی طرف بڑھا اور اس پر بھی قبضہ کیا۔ اس میں ایک بت خانہ تھا جس کا نام مہاکال تھا۔ اس کی تعمیر ہوئے چھ سو سال ہو چکے تھے اسے برباد کیا یہاں تک اس کی بنیادوں کو بھی اکھاڑ پھینکا۔ راجہ بکرماجیت کا ایک مجسمہ بھی وہاں نصب تھا اسے بھی تڑوا دیا۔ واضح رہے کہ یہی وہ بکرما جیت ہے جس کے نام سے ایک سن بھی جاری ہے اور راقم الحروف نے خلیفہ الرحمانی شہنشاہی ظل الٰہی کے حکم سے پہلے 972ھ اور دوبارہ 1003ھ/ 1554- 1594ء میں ہندو پنڈتوں کی مدد سے اسی راجہ کے متعلق 32 نادر اور عجیب وغریب کہانیوں کا ہندی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس مجموعہ کا نام خرد افزا[84] رکھا۔ یہاں سے سلطان پیتل کے کچھ مجسمے بھی اپنے ہمراہ لے گیا جنھیں اس نے دہلی کی جامع مسجد کے دروازے کے پاس رکھ دیا اور حکم دیا کہ لوگ آتے جاتے انھیں پامال کریں۔ ایک بار پھر وہ بڑی فوج کے ساتھ ملتان پہنچا۔ مگر بدقسمتی سے اسی سفر میں اسے ایک جسمانی مرض لاحق ہو گیا اور 633ھ/1235ء میں فوت ہوا۔ اس نے 26 سال حکومت کی تھی:

وزان سرد آمد این کاخ دلاویز
کہ چون جا گرم کردی گویدت خیز

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ سلطان التمش سرد مزاج تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اس کے دل میں آیا کہ کسی خوبصورت حسین کنیز کی صحبت سے لطف اندوز ہو مگر قوت مردی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور کئی بار ایسا ہی ہوا۔ ایک دن جب کہ وہ کنیز سلطان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی تو اس حسین کنیز کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے سلطان کے سر پر گر پڑے سلطان نے سر اٹھا کر دیکھا اور اس سے رونے کا سبب دریافت کیا۔ بڑے پس و پیش کے بعد آخر کنیز نے بتایا کہ اس کا ایک بھائی تھا جس کا سر سلطان کی طرح گنجا تھا اس لیے سر میں تیل ڈالتے ہوئے کنیز کے دل میں اپنے بھائی کی یاد تازہ ہو گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے کنیز نے یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی ایک مرتبہ قید ہو چکا تھا۔ چونکہ سلطان بھی قید ہوا تھا اس لیے اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ گویا کنیز مذکور اس کی بہن ہے اور حق سبحانہ تعالی نے اس کنیز کو شاید اسی وجہ سے حرام کاری سے بچائے رکھا۔ راقم الحروف نے خلیفۂ آفاق یعنی اکبر شاہ خلد اللہ کی زبانی پہلے فتح پور اور اس کے بعد لاہور میں بھی ایک رات یہ بات سنی تھی جب کہ انھوں نے پایہ تخت کی خلوت گاہ میں بلا کر راقم الحروف کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان غیاث الدین بلبن سے بھی یہی روایت منقول ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب سلطان التمش نے ارادہ مباشرت کیا تھا تو کنیز کو حیض جاری ہو گیا تھا۔

سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن شمس الدین التمش

اپنے والد کے عہد حکومت میں سلطان رکن الدین فیروز شاہ چند مرتبہ بدایوں کے اضلاع کا مختار رہا تھا۔ اس کے بعد چتر شاہی اور عصائے اختیارات بھی حاصل کیا تھا اور جب لاہور کے سیاہ و سفید کا مالک تھا تو اس کی حیثیت ولی عہد کی تھی۔ سلطان التمش کے

انتقال کے بعد تمام امراء کی متفقہ رائے سے 633ھ/1235ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دبیر ملک تاج الدین یلدوز نے اس تقریب سعید میں ایک تہنیتی قصیدہ کہا تھا:

مبارک باد ملک جاودانی
فلک را خاصہ در عہد جوانی
یمین الدولہ رکن الدین کہ آمد
ورش از یمن چون رکن ایمانی

جب تخت نشین ہوا تو شاہی خزانوں کے منھ کھول کر اس نے خوب داد عیش و عشرت دی اور اپنے اوقات گرامی طوائفوں اور رزیلوں کی صحبت میں صرف کیے:

دل چو یکی خانہ گراید ترا
جز مغ ومطرب کہ ستاید ترا

اس کی والدہ ترکان خاتون، ایک ترکی کنیز تھی۔ وہ حرم کی دوسری خواتین کو بہت تنگ کرتی۔ سلطان کا بڑا لڑکا قطب الدین دوسرے کے بطن سے تھا۔ اس نے اسے بھی قتل کروا دیا تھا۔ سلطان رکن الدین کی عیش کوشی اور غفلت شعاری کے سبب خزانہ خالی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی ملک غیاث الدین محمد شاہ جو اودھ کا حاکم تھا جب اس نے یہ حالت دیکھی تو بغاوت کر دی۔ ساتھ ہی اس نے عز الدین وکبیر خان سلطانی والئی ملتان اور ملک سیف الدین ضابطہ ہانسی کو بھی خطوط لکھے اور انھیں آمادہ کیا کہ سلطان کی مخالفت کریں۔ سلطان رکن الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو فتنے کو دبانے کی غرض سے منصور پور اور ترائن کے حوالی میں پہنچ گیا۔ اس واقعہ سے پہلے نظام الملک جنیدی وزیر و وکیل ممالک ہندستان کے ڈر سے کیلو کھڑی کی راہ فرار اختیار کر کے کول میں ملک عز الدین محمد سالاری سے جا ملا تھا۔ لشکر کے دوسرے باقی ماندہ معتبر امراء منصور پور کے علاقے سے واپس دہلی چلے گئے اور وہاں رضیہ خاتون سے بیعت کر لی جو سلطان التمش کی بڑی لڑکی تھی اور اپنے

والد کی وصیت کے مطابق اسی کو حق ولی عہدی پہنچتا تھا۔ وہ شجاعت، سخاوت اور فراست جیسی پسندیدہ خصلتوں کی حامل تھی۔

انھوں نے اسے تخت سلطنت پر بٹھایا اور ترکان خاتون[85] کو قید کر دیا۔ جب سلطان واپس ہوا اور ابھی کیلوکھڑی پہنچا تھا تو سلطان رضیہ اس کے استقبال کے لیے بڑے لشکر کے ساتھ دہلی سے باہر نکلی اور بغیر جنگ کیے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ وہ قید کی حالت میں ۱۸ ربیع الاول 1236/634ء کو انتقال کر گیا۔ اس نے چھ ماہ سے کچھ زیادہ عرصے تک حکومت کی تھی۔

سلطان رکن الدین کے ہم عصر شعراء اور اساتذہ میں سے ایک شہاب الدین مہمرہ [86]بدایونی تھا۔ امیر خسرو نے اپنے ایک قصیدے میں اس کا ذکر کیا ہے:

در بدایون مہمرہ سرمست برخیزد زخواب
گر برآید غلغل مرغان دہلی زین توا

ملک الکلام توکلی نے اسے استادی کے القاب سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ استاد الشعراء شہاب مہمرہ بدایونی کے ایک قصیدے کا انتخاب ذیل ہے۔ اس لیے درج کیا جا رہا ہے کہ احباب کے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہو اور راقم الحروف کا حق ہم شہری ادا ہو۔

از زبان گرچہ شکافم موی ہنگام بیان
ورثنای حق زحیرت ہمچو موریم بی زبان
در پی زنجیر مویان بی پرواز ھوس
بستہ ام بسیار چون موران زدل جان برمیان
وز برای مور چشمان شکرلب و زنخیان
سفتہ ام موی سخن صدرہ ز روی آسمان

تا ذخیرہ باشدم چو مور اندر مدح او
مو دو نیمہ کردم ویک مو ندیدہ از کس نشان
بعد ازین چون موربندم بر دو چون کمر
وز تن ہر موی توفیقش کشایم صد زبان

یہ قصیدہ ممدوحہ کے زور قلم کا نتیجہ ہے، موی اور مور کے التزام کے ساتھ توحید نعت ختمی پناہ صلعم کی تشریح کا حق ادا کیا ہے۔

سلطان رضیہ بنت سلطان شمس الدین التمش

634ھ/1236ء میں تخت پر بیٹھی اس نے اپنے پیش نظر عدالت وانصاف کا مدعا
رکھا اور ان مشکل کاموں کو حل کرنے کی کوشش کی جس میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ کرم
وزری کا وہ طریق کار جو عورتوں کے لیے اسی طرح معیوب تھا جس طرح مردوں کے لیے
بھی۔ سلطان رضیہ نے اس پر عمل کیا۔ اس نے نظام الملک جنیدی کو اپنا وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس
کے امراء کے مابین بعض وجوہات کی بنا پر آپس میں مخالفانہ جذبات پیدا ہوگئے اور وہ
اعلانیہ لڑنے جھگڑنے لگے۔ سلطان رضیہ نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان
امیروں کے گروہ میں انتشار پیدا کردیا اور ان کی طاقت بکھر گئی۔ بعض موت کے گھاٹ اتار
دیا گئے۔ نظام الملک سرمو چلا گیا اور اس نے نہاں خانہ عدم میں سکونت اختیار کرلی۔ خواجہ
مہذب نائب اس کی جگہ وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ سلطان رضیہ کی حکومت بڑی طاقتور اور مستحکم
ہوگئی۔ چنانچہ اس نے رنتھمبور فوج بھیجی اور سلطان التمش کی وفات کے بعد جن مسلمانوں کو
ہندوؤں نے محصور کر رکھا تھا ان کو چھٹکارا دلوایا۔ جمال الدین یاقوت حبشی جو میر آخور 87
تھا وہ اس کا اس حد تک معتمد اور قابل اعتبار ہوگیا کہ سلطان رضیہ ہاتھی اور گھوڑے کی سواری
کے وقت بازو یا کندھے پر تکیہ لگا کر بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے دوسرے امراء کے دل میں حسد
کی آگ بھڑک اٹھی۔ سلطان رضیہ نے پردہ نشینی بھی ترک کردی اور مردانہ لباس پہن لیا۔ وہ

بڑی دلیری سے قبا پہنتی اور سر پر ٹوپ رکھ کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتی اور حکومت کے فرائض کو بخوبی انجام دیتی۔

637ھ/1239ء میں ملک عزالدین ایاز حاکم لاہور نے کھلے طور سے اس کی مخالفت شروع کردی۔ رضیہ نے وہاں پہنچ کر اس کے حلقے میں اضافہ کر کے ملتان بھی دے دیا۔ اسی سال اس نے تبرہندہ کی جانب بھی مہم چلائی۔ راستہ میں ترک امراء نے جب اس کی بعض ناشائستہ حرکات دیکھیں تو بغاوت کردی اور سلطان رضیہ اور جمال الدین یاقوت حبشی جو امیرالامراء کے منصب پر فائز تھا ان دونوں کو گرفتار کر کے قلعہ تبرہندہ میں بند کردیا۔ [88]

سلطان معز الدین بہرام بن شمس الدین التمش

سلطان رضیہ کے بعد سلطان معز الدین بہرام تخت نشین ہوا اور دہلی پہنچا۔ اس وقت ملک اختیار الدین التونیہ حاکم تبرہندہ نے سلطان رضیہ کے ساتھ عقد کر کے تمام زمینداروں، جاٹوں اور کھوکھروں کی جماعت اور ان کے امراء میں سے چند ایک کو اپنا ہم نوا بنالیا تھا اور ان کی مدد اور اعانت سے دہلی کی جانب فوجی مہم شروع کردی تھی۔ سلطان معزالدین بہرام نے ملک بلبن خورد کو جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوا۔ ملک اختیار الدین التونیہ کے مقابلے میں بھیجا۔ رضیہ بھی ملک التونیہ کے ساتھ تھی۔ جب چھوٹے بلبن کی فوج میدان جنگ میں آئی۔ رضیہ کی فوج میں انتشار پیدا ہوگیا اور وہ تبرہندہ واپس چلی گئی مگر چند روز کے بعد پھر فوج کو جمع کر کے دہلی کی فتح کے خیال سے دوبارہ روانہ ہوئی، اور قصبہ کیتھل [89] پہنچی، مگر اس بار بھی چھوٹے بلبن کے مقابلے کی وہ تاب نہ لاسکی اور شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ راستہ میں التونیہ اور رضیہ دونوں گواروں [90] کے ہاتھ آگئے اور سلطان معز الدین بہرام کے حکم سے انھیں قتل کردیا گیا۔ یہ واقعہ 637ھ/1238ء کا تھا۔ [91]

سلطان رضیہ کی حکومت 3 سال 6 ماہ اور 6 روز تھی:

سری را کہ گردن برآرد بلند
ہمش بارو گردن آرد کمند

جب سلطنت کی باگ ڈور سلطان بہرام شاہ کے ہاتھ آئی تو ملک اختیار الدین ایتگین جو پہلے حاجب تھا اور سلطان کی ہمشیرہ اس کے نکاح میں تھی اور نظام الملک مہذب الدین کی تائید وحمایت سے مملکت کے جملہ امور پر وہ حاوی تھا اور ہمیشہ ایک بہت بڑا ہاتھی بادشاہوں کی طرح اپنے دروازے پر باندھے رکھتا تھا۔ 638ھ/1239ء میں اسے اور نظام الملک مہذب الدین وزیر دونوں کو چند فدائیوں[92] نے سلطان کے اشارہ پر قتل کر دیا۔ اسی سال سلطان کے امراء، اکابر، اعیان، صدور اور قاضیوں کی ایک جماعت کو جو درپردہ یہ سازشیں کرتی تھی کہ کسی طرح سلطان کو تبدیل کرکے اس کی جگہ کسی دوسرے کو بٹھایا جائے، انھیں برباد کیا، اور ان میں سے بعضوں کو قتل کر دیا گیا اور کچھ کو جیسے بدرالدین سنقر، امیر حاجب وغیرہ کو بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا اور قاضی شمس الدین قاضی مارہرہ[93] کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روند ڈالا گیا۔

639ھ/1241ء میں مغل چنگیز خان کی فوج نے آکر لاہور کا گھیرا ڈالا اور ملک قراقش حاکم لاہور آدھی رات کو بھاگ کر دہلی چلا گیا اور سلطان کو حالات کی اطلاع دی۔ سلطان نے مناسب سمجھا کہ ایسے نازک وقت میں امراء سے از سرنو بیعت کی جائے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور ان سب کے مشورے سے نظام الملک وزیر کو مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پنجاب بھیجا۔ نظام الملک کا دل پہلے ہی سے سلطان کی طرف سے صاف نہیں تھا چنانچہ اس نے مکر وفریب سے سلطان کو ایک خط لکھا، جس میں اپنے ہمراہی امراء کی شکایت کی اور سلطان سے درخواست کی کہ وہ بنفس نفیس تشریف لائیں، خط کے مضمون سے سلطان نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کچھ گڑبڑ ہے اس لیے اس نے بڑے سادہ لفظوں میں نظام الملک کو ایک فرمان کے ذریعہ اطلاع دی کہ منافق اُمراء اپنے وقت پر اس کی سزا پائیں گے مگر نظام الملک کو یہ لازم ہے کہ اس وقت ان کے ساتھ خاطر ومدارات سے پیش

آ گئے۔ نظام الملک نے سلطان کا یہ فرمان امراء کے سامنے رکھ دیا اور انھیں اپنا طرفدار بنا لیا۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ نے شیخ الاسلام خواجگان قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس سرہ العزیز کو نظام الملک کے امیروں کے پاس بھیجا کہ وہ انھیں سمجھائیں بجھائیں اور صورت حال کو بہتر بنانے میں اس کی مدد کریں مگر سبھی کوششیں ضائع گئیں۔ شیخ الاسلام دہلی واپس تشریف لے آئے اور ان کے پیچھے پیچھے نظام الملک اور دوسرے امراء بھی پہنچ گئے اور انھوں نے دہلی کو اپنے گھیرے میں لے لیا[94] سلطان کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور چند روز میں اسے مار دیا اور اس کی جگہ پر دوسرے کو بادشاہ بنا دیا:

زمانہ دیر شد کین رسم دارد
کز ین بستاند و با آن سپارد

اس نے 2 سال ایک مہینہ اور 15 دن حکومت کی۔

سلطان علاؤالدین مسعود شاہ بن رکن الدین فیروز شاہ

اپنے چچا سلطان ناصر الدین محمد اور سلطان جلال الدین جو نسب میں سلطان شمس الدین التمش سے تھے ان سب کی رائے سے وہ تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ اس وقت قید خانہ میں تھا مگر عزالدین بلبن کے بڑے بیٹے نے اپنی ایک روز کی تخت نشینی کے دوران ہی اس کی رہائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ملکوں اور امیروں میں سے کوئی بھی عزالدین بلبن کی تخت نشینی پر خوش نہیں تھا اس لیے جب اس نے علاء الدین کے متعلق سنا تو ہر ایک نے اس طرف غور و خوض کیا۔ ملک قطب الدین حسن کو نائب اور ملک مہذب الدین نظام الملک کو وزیر ممالک مقرر کیا گیا مگر 640ھ/1242ء میں سلطان علاء الدین مسعود شاہ کے امراء نے مہذب الدین نظام الملک کو قتل کرا دیا۔

اب وزارت صدر الملک نجم الدین ابوبکر کے سپرد ہوئی۔ ملک غیاث الدین خورد جو پہلے الغ خان کے نام سے مشہور تھا اور بعد میں سلطانی کے منصب پر بحال ہوا تھا اسے امیر

حاجب مقرر کیا گیا۔ ناگور، سندھ، اور اجمیر کی حکومت ملک عزالدین بلبن کے ہاتھ آئی اور بدایوں ملک تاج الدین یلدوز کو عطا کیا گیا۔ اسی سال طغاخاں نے جو آگرہ [95] سے لکھنوتی کی جانب گیا تھا۔ شرف الملک اشعری کو ایک خط دے کر سلطان علاء الدین کی خدمت میں بھیجا اور سلطان نے چتر لعل اور خلعت خاص حاکم اودھ [96] کے توسط سے نجف خان کے پاس لکھنوتی بھیجی اور اپنے مذکورہ صدر چچا کو قید سے رہا کرایا۔ ان میں سے قنوج کا علاقہ ملک جلال الدین کے سپرد کیا اور بہرائچ ملک ناصر الدین محمد کو حوالے کیا۔ ان دونوں علاقوں میں انھوں نے پسندیدہ کارنامے دکھائے۔ 642ھ/1244ء میں مغلوں کی فوج لکھنوتی پہنچ گئی۔ قیاس یہ ہے کہ مغل تبت اور خطا کے راستے آئے ہوں گے، چنانچہ سلطان علاء الدین نے تیمور خاں قرابیگ کو طغا خان کی مدد کے لیے بھیجا اگرچہ ان دونوں نے مل کر مغلوں کو شکست دی مگر ان میں آپس میں ان بن ہوگئی۔ طغاخان دہلی چلا آیا اور لکھنوتی میں تیمور خان برقرار رہا۔ اسی سال مغلوں کے لشکر نے اُچہ کے نواح میں لوٹ مار شروع کردی۔ سلطان کو جب معلوم ہوا تو وہ پوری تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا دریائے بیاہ کے کنارے پہنچا۔ جب مغلوں کو اس کی خبر ملی تو وہ محاصرہ سے دستبردار ہوکر بھاگ گئے۔ اس کے بعد سلطان دہلی واپس آگیا اور اس نے گرفتاریوں اور خوں ریزی کا وہ بازار گرم کیا کہ اُمراء اور اکابر اس سے برگشتہ ہوگئے اور انھوں نے متفقہ رائے سے ملک ناصر الدین محمود کو بہرائچ سے بلا بھیجا۔ جب دہلی پہنچا تو 644ھ/1246ء میں انھوں نے سلطان علاء الدین مسعود کو گرفتار کرکے قید کردیا جہاں وہ مرگیا اور اس نے چار سال ایک ماہ حکومت کی۔

حواشی

1. سبع مثانی ۔ بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں ہیں جن سے قرآن مجید کی ابتدا ہوتی ہے، اور وہ سورہ فاتحہ ہے۔

2. حافظ ابوعبداللہ محمد بن حسن اسمٰعیل بن ابراہیم بن المغیرات بن الاحناف آپ صحیح بخاری کے مصنف ہیں۔ 194ھ/809ء میں پیدا ہوئے تھے اور 256ھ/869-70ء میں انتقال کیا۔

3. قاضی نصیرالدین ابوالخیر عبداللہ بیضاوی ابن عمر ابن محمد۔ جائے پیدائش بیضا اس لیے بیضاوی کہلاتے ہیں۔ بیضا شیراز کا یک گاؤں ہے۔ قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے الغایۃ فی الفقہ، شرح المصباح و المنہاج اور تفسیر بیضاوی زیادہ مشہور ہیں، 685ھ میں انتقال ہوا اور شیراز میں دفن ہوئے۔

4. تاریخ کشمیر کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے کیا تھا۔

5. تاریخ نظامی کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد بن خواجہ مقیم ہروی ہیں۔ خواجہ مقیم ہروی بابر بادشاہ کے دیوان تھے اور خواجہ نظام الدین احمد اکبر بادشاہ کے

دیوان خانگی تھے جنھیں بعد میں ترقی دے کر گجرات میں بخشی مقرر کیا گیا۔ تاریخ نظامی کا شمار بڑی مستند اور شہرہ آفاق کتابوں میں ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کا نام طبقات اکبر شاہی رکھا تھا اور یہ طبقات اکبری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ فرشتہ کی رائے میں تمام تاریخی کتابوں میں یہ سب سے زیادہ معتبر ہے جو اس کے مطالعے میں آئی۔ خواجہ نے 1003ھ/ 1594ء میں انتقال کیا۔

6 تاریخ مبارک شاہی۔ یہ یحییٰ بن احمد ابن عبداللہ سرہندی کی تصنیف ہے اور اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مبارک شاہ کے عہد حکومت کے حالات اور واقعات قلمبند کیے جائیں۔ اس تاریخ کی ابتدا محمد سام، بانی سلطنت غوری سے ہوتی ہے اور اختتام سلطان سید محمد پر ہوتا ہے۔

7 نظام التواریخ۔ اس نام کی کتاب سے ملا بدایونی کی مراد وہی تاریخ نظامی ہے جس کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد ہیں اور جن کی تصنیف طبقات اکبری کے نام سے معروف ہے۔

8 چرم خام۔ اس کا تعلق راجہ داہر کی دو کنواری لڑکیوں سے تھا جنھوں نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے دروغ بیانی سے کام لیا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب 93ھ/ 12-711ء میں راجہ داہر قلعہ راور کے محاصرے میں لڑتا ہوا مارا گیا تو محمد بن قاسم نے اس کی دونوں کنواری لڑکیوں کو حبشی غلاموں کی نگرانی میں بغداد بھیج دیا۔ جب انھیں خلیفہ ولید ابن عبدالملک مروانی کے حضور میں پیش کیا گیا تو دیکھتے ہی وہ ان پر فریفتہ ہو گیا اور انھیں اپنے حرم میں رکھنے کا حکم دے دیا۔ ان لڑکیوں نے موقع غنیمت جان کر خلیفہ وقت کو ہر ممکن طریقے سے اس امر کا یقین دلایا کہ یہاں بھیجنے سے پہلے محمد بن قاسم نے ان کو تین روز اپنے پاس رکھا تھا، اس لیے وہ خلیفہ وقت کے حرم میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہیں۔ یہ سن کر خلیفہ ولید کو بے حد غصہ آیا اور ایک حکم نامے کے ذریعے محمد بن قاسم کو لکھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو اپنے آپ کو چرم خام میں سلوا کر دارالخلافہ پہنچے۔ محمد بن قاسم

اس وقت اودے پور راجستھان میں تھا۔ چنانچہ حکم پاتے ہی اس نے تعمیل کی اور اپنے آپ کو چرم خام میں بند کر کے سلوایا۔ جب چرم خام کا یہ سلا ہوا تھیلا خلیفہ ولید کے حضور میں لایا گیا، تو محمد بن قاسم اس کے اندر جان بحق تسلیم ہو چکا تھا۔ خلیفہ ولید نے سبز مہندی کی ٹہنیوں کا ایک دستہ ہاتھ میں لے کر لاش کی طرف اشارہ کیا اور ان دونوں لڑکیوں کو دکھایا جسے دیکھتے ہی لڑکیاں فوراً بول اٹھیں کہ یہ دروغ بیانی تھی اور انھوں نے اس لیے یہ دروغ گوئی کا راستہ اختیار کیا کیوں کہ انھیں محمد بن قاسم سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا تھا۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک محمد بن قاسم اُن کے باپ کا قاتل تھا۔ اس دروغ بیانی کے عوض میں خلیفہ ولید نے یہ حکم دیا کہ دونوں لڑکیوں کو دو دیواروں کے درمیان چن دیا جائے۔ (آئین اکبری، جلد دوم، ص، 325)

9 امیر منصور بن نوح سامانی۔ خاندان سامانی کا آٹھواں حکمراں جس نے 22 سال حکومت کی۔ اس حکومت کی بنیاد اسد بن سامان نے ڈالی تھی جو خراسان سے ماوراء النہر تک تھی۔ امیر منصور کا 366ھ/976ء میں انتقال ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کا فرزند ابوالقاسم نوح تخت نشین ہوا تھا۔

10 کوہ جود۔ غزنی اور لاہور کے درمیان ایک کوہستانی علاقہ کا نام ہے۔

11 لمغانات۔ غزنی کے پہاڑوں کا ایک حصہ ہے۔ ابوالفدا اور لباب اس پر متفق ہیں۔

12 تبرہندہ۔ فرشتہ کے نزدیک بھٹندہ ہے اور جموں کے راجگان نامی تاریخ میں بھی یہی لکھا ہے۔

13 بہاتیہ۔ بھیرہ

14 داؤد بن نصر ملحد حاکم ملتان شیخ حمید لودھی کے پہلے حکمراں کا پوتا۔

15 امیر محمود غزنوی پہلا مشرقی حکمران تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔

16 فرشتہ کے نزدیک براستہ ہندستان کے بجائے براستہ بھٹندہ زیادہ صحیح ہے۔

17 یہ قلعہ قصبہ بھیم سے ایک میل کے فاصلے پر ہے اور قلعہ نگر کوٹ بھی کہلاتا ہے اور کوٹ کانگڑہ سے 35 میل کے فاصلے پر ہے۔

18 قرامطہ۔ ملحد مسلمانوں کا ایک فرقہ، جس کا بانی ایک شخص قرامط تھا، اس نے 278ھ میں اس کی بنیاد ڈالی تھی، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جبر و تشدد سے ہر قسم کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ 319ھ میں اس کے ایک معتقد ابوطاہر کی قیادت میں مکہ معظمہ میں خونریز جنگ ہوئی تھی۔ جس میں بے شمار آدمی قتل ہوئے تھے اور بڑی لوٹ مار مچی تھی۔ قرامطہ خانہ کعبہ سے حجر اسود بھی اٹھا کر لے گئے تھے جو بیس سال تک انہی کے پاس رہا، بحوالہ۔ کتاب الملل و النحل، ص 147، سیاست نامہ، نظام الملک طوسی

19 چکر سوم بت یا چکرا سوامن بت۔ اس کے معنی چکرا کا آقا یا دیوتا ہے۔ البیرونی کی تصنیف کتاب بالہند جلد اول، ص، 117 پر اس کی پوری تفصیل درج ہے۔

20 بندانہ یا تندانہ، البیرونی نے لکھا ہے کہ یہ افغانوں کا ایک قلعہ ہے جو کشمیر کے پہاڑوں میں واقع ہے۔ البیرونی کتاب بالہند، انگریزی ترجمہ از سچاؤ، ص 317)

21 فرشتہ نے قنوج کے فرمانرواں کا نام کورہ کے جگہ پر کنور راسے لکھا ہے۔

22 برنہ۔ یہی وہ مقام ہے جو برن اور بعد میں بلند شہر (اترپردیش) کے نام سے مشہور ہوا۔ ابھی بھی بلند شہر کے ضلع میں اس نام کا ایک گاؤں واقع ہے۔

23 قلعہ مہاون/قلعہ مہابن ہے۔

24 البیرونی لکھتا ہے کہ سومناتھ کا بت مہادیو کا لنگ تھا جسے چاند کا کوڑھ پن دور کرنے کے لیے نصب کیا تھا۔ اس کے نزدیک لفظ سومناتھ کے معنی چاند کا دیوتا ہے۔

25 چمن، راؤ دھن پور سے بیس میل اور گجرات سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

26 آمل۔ طبرستان کا پایہ تخت اور طبرستان علامہ طبری کا مولد ہے۔

27 ساری۔ یعنی سرپارہ۔ یہ بھی طبرستان کا ایک قصبہ ہے مگر لباب کی رائے میں یہ مازندران میں واقع ہے۔

28 امیر احمد نیال تگین۔ تاریخ سبکتگین میں اسے سلطان محمود کا خانہ زاد بیٹا لکھا ہے۔

29 جرنیل ناہر کے بجائے بیہقی تلک لکھتا ہے اور فرشتہ امرائے ہند میں اسے ناتھ کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

30 المنصورہ سندھ میں واقع ہے جو پہلے بہمنوا کا شہر تھا۔ محمد بن قاسم نے اسے فتح کر کے اس نام سے منسوب کیا (آئین اکبری، تالیف ابوالفضل، جلد اول)

31 ہانسی۔ شہر حصار کے مشرق کی جانب 11 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

32 سون پت۔ جسے اب سونی پت کہتے ہیں۔ ہریانہ ضلع میں دہلی کے شمال میں واقع ہے۔

33 ضیائی۔ ضیاء الدین خجندی الفارسی شیراز کا باشندہ تھا۔ جوانی ہی میں اس نے خجند میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ سلطان کا مداح تھا۔

34 سپنہ۔ ضلع خاوران کا ایک قصبہ ہے۔

35 سرخس۔ اس شہر کو کیکاؤس نے آباد کیا تھا۔

36 زیرقان۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام غلطی سے لکھا گیا ہے۔ اصل میں زندخان ہے جو سرخس سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔

37 برغنٹر۔ برغنہ

38 ماریکلہ۔ فرشتہ اسے مرکالہ لکھتا ہے۔ بعضوں کے نزدیک یہ قصبہ دریائے جہلم کے کنارے تھا ایک انگریز مصنف راورٹی اپنے ایک نوٹ میں اسے ایک دشوار گزار درہ بتایا ہے جو راولپنڈی اور اٹک کے درمیان ہے۔

39 سرخ کلاہ یعنی قزلباش۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ ترکی میں قزل کے معنی سرخ اور باش کے معنی سر ہے۔

40 پرشور۔ پشاور جس کا اصلی نام پرشوارہ تھا۔

41 قولنج۔ ایک طرح کا مرض ہے، ریڑھ میں شدید درد ہوتا ہے۔ یہ مرض کیلشیم کی کی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

42 اسفراز۔ فرشتہ کے نزدیک اسفرائین ہے، جو نیشا پور کے نواح میں ہے۔

43 فرشتہ کے مطابق اس پر جان لیوا حملہ حمام خانہ میں ہوا تھا۔

44 البتہ اس کی ہندی کلیات کا فی الوقت کوئی سراغ نہیں ملتا۔ (مترجم)

45 اُچھ۔ ملتان سے 70 میل کے فاصلے پر ہے۔

46 قبیلہ بھیہ کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے اس نام کا ایک قلعہ بھی ملتان اور الور کے درمیان واقع تھا۔ مرآت جہاں نما میں لکھا ہے کہ اس قبیلہ کا ایک راجہ بھی تھا۔

47 پرشور۔ پشاور (پاکستان)

48 دیول۔ ٹھٹھہ دونوں ایک ہی جگہ کا نام ہے۔ دیول کا محل وقوع "تا مختصر" اور پروفیسر عرفان حبیب کے مطابق کتاب Historical map of medieval India کراچی اور ٹھٹھہ کے درمیان ہے، کراچی سے 30 میل کے فاصلے پر اور ٹھٹھہ سے ستر میل کے فاصلے پر۔ کراچی سے مشرق کی جانب یہ سمندر سے 20 میل کے فاصلے پر ہے۔ ان دو حصوں میں سے ایک میں واقع ہے جنھوں نے کسی زمانے میں مہران (سندھ) کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اگر آج کے پاکستان کا مخصوص نقشے اور دنیا کے سیاسی نقشے پر غور کیا جائے تو اس جگہ کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، یا تو وہ بالکل غائب ہو گیا ہے یا اس حد تک کہ کہیں نظر نہیں آتا۔

49 برہمنوں کے نزدیک شہر سیالکوٹ کی بنیاد پانچ ہزار سال قبل ایک راجہ سول یا سال نے رکھی تھی جو پانڈوؤں کا چچا یا ماموں تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے اس کا نام بھی سیالکوٹ رکھا تھا۔ اس خاندان نے ڈیڑھ ہزار سال تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد ایک سیلاب نے اسے اس حد تک تباہ و برباد کر دیا کہ ایک ہزار سال تک وہ ویران اور اجاڑ رہا۔ ایک دوسرے راجہ سالباہن نے اسے دوبارہ آباد کیا اور اس میں قلعہ بھی تعمیر کیا۔ اس کا تعلق سیا نسل سے تھا اور اسی وجہ سے کچھ کا خیال ہے کہ سیالکوٹ کا نام سالباہن نے رکھا تھا اور لفظ سیا

کی بنا پر اس کا نام سیالکوٹ رکھا۔ بلاشبہ شہاب الدین غوری اس وقت لاہور پر حملہ آور ہوا تھا۔ جب وہاں غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ خسرو ملک حکمران تھا اور سیالکوٹ پر بھی اس نے چڑھائی کی تھی جو ایک ہندو راجہ کے زیرِ نگین تھا اور وہ اس پر غالب آیا تھا۔ مگر جہاں تک سیالکوٹ کی بنیاد رکھنے کا تعلق ہے وہ غلط ہے۔ اس لیے اس کی بنیاد تو کئی ہزار سال قبل رکھی گئی تھی۔ البتہ اتنا صحیح ہے کہ راجہ سالباہن نے جو قلعہ بنایا تھا اس کی حالت خراب و خستہ تھی اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس نے اس کی مرمت کی تھی۔ پنجاب گزیٹر۔

50 سرچتی/سرسوتی۔ زمانہ قدیم میں یہ ہندو مذہب کے عقائد کے مطابق تین پاک ندیوں گنگا، جمنا اور سرسوتی ہوا کرتی تھی۔ جو اپنا سنگم الہ آباد میں بناتے ہوئے تھی آج صرف گنگا اور جمنا ہے ہندو قول کے مطابق سرسوتی لپت (غائب یا روپوشی اختیار کر لی ہے) ہو چکی ہے۔

51 کہرام۔ دہلی سے 70 کوس کے فاصلے پر واقع ہے: ابھی یہ جگہ ضلع ہریانہ میں ہے۔

52 قلعہ کول۔ آگرہ سے 40 میل پر شمالی جانب واقع ہے۔

53 دریائے اٹک کے اس پار غزنی کی شاہراہ ہے۔ فرشتہ نے اسے رہتک لکھا ہے جو غلط جان پڑتا ہے۔

54 ہیرا۔ (الماس)

55 ملاحدہ کی ایک جماعت۔ جن کا سرغنہ حسن بن صباح تھا جسے قلعہ الموت کا ساحر بھی کہتے ہیں۔

56 سلطان قطب الدین کے نام کے ساتھ لفظ ایبک کا اضافہ اور اس کی تشریح کے بارے میں اختلاف ہے۔ ملا بدایونی نے لکھا ہے اور دوسرے مورخین کی اکثریت اس بات پر اتفاق رکھتی ہے کہ ایبک ترکی لفظ ہے۔ حالانکہ ترکی لفظ ایبک کے لفظی معنی مرغ کی کلغی ہے اور ترکی زبان میں انگلی کے لیے پرتی کا استعمال ہوتا ہے اگر اس لفظ کو مرکب سمجھا جائے تو اس کے معنی مختلف ہو جائیں

گے۔ ترکی میں ای کے معنی چاند اور بک کے معنی آقا یعنی چاند آقا یا چاند کا دیوتا کے ہیں۔

57 بہاء الدین محمد اوشی فرغانی عالم و فاضل شخص تھا۔ عوفی کے نزدیک وہ بہت بڑا مقرر بھی تھا اور نظم و نثر دونوں اصناف تحریر میں خوب لکھتا تھا۔

58 سنگ سوراخ۔ غزنی اور پنجاب (پاکستان) کے درمیان ایک راستے کا نام ہے۔

59 مؤلف کی مراد یہاں پر ہندستان کا پہلا مسلمان بادشاہ ہے۔

60 اُچھ۔ یہ ملتان سے 70 میل جنوب مغربی جانب واقع ہے۔ ناکفھطر لکھتا ہے کہ اس نام کے تحت سات گاؤں کی ایک بستی ہے اس میں سے ایک گاؤں میں سید بخاری کا مقبرہ ہے اور یہی گاؤں ان تمام گاؤں میں زیادہ ممتاز ہے جو اوچھ کہلاتا ہے۔

61 اس سے الگ بات طبقات ناصری میں مذکور ہے، قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد قباچہ اس نیت سے اوچھ اور ملتان کی جانب روانہ ہوا تھا کہ ان مقامات پر قبضہ مخالفانہ کرے نیز اس نے قطب الدین ایبک کی دو بیٹیوں سے شادی کی تھی۔

62 یہ سن تاج المآثر میں 612ھ/ بمطابق 1215ء لکھا ہے۔

63 طبقات ناصری کے مطابق وہ ڈوب کر مرا تھا۔

64 طبقات ناصری اور تاریخ الفی میں تمغلر لکھا ہے۔

65 اسے محمد بختیار خلجی بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلا مسلمان فاتح تھا جس نے بنگال پر چڑھائی کی تھی اور ندیا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ ندیا شہر کو برباد کردیا۔ لکھنوتی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد سے ہی بنگال دہلی کے مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ (آئین اکبری، جلد دوم)

66 صحیح نام لکھا ہے۔ (امپریل گزیٹر)

67 منیر بھی اب بہار میں ہے پٹنہ کے نزدیک ہے اور یہاں معروف فردوسی صوفی حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کا روضہ مبارک ہے۔

68 لکھنوتی۔ یہ بنگال کا قدیم پایہ تخت تھا جس کا اصلی نام لکشمن وتی تھا بعد میں

لکھنوتی ہوگیا، اکبر بادشاہ نے اس کا نام جنت آباد رکھا تھا۔ آئین اکبری، طبقات ناصری، امپریل گزٹیئر

69 ندیا یا نوادیپ یہ بھاگیرتی ندی کے جنوبی کنارے پر واقع تھا۔ اس کی بنیاد لکشمن یعنی مہر بلال سین بنگال کے راجہ نے رکھی تھی۔

70 اس امر کا کہیں تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ محمد بختیار غوری کے نام کی مناسبت سے اس کا نام گور (غور) رکھا گیا تھا۔ (امپریل گزٹیئر)

71 کنج اور بنج قبیلوں کا سردار۔ یہ قبیلے تبت اور لکھنوتی کے درمیان علاقوں میں رہتے تھے اور ترکوں سے مشابہت رکھتے تھے اور زبان بھی مختلف تھی نہ ہندستان سے ملتی تھی نہ تبت سے، محمد بختیار کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی کو انھوں نے اپنا مرشد مان لیا تھا۔ (طبقات ناصری)

72 اسے نارکھوٹی بھی کہتے ہیں۔

73 تنگہ۔ آئین اکبری کے مطابق موجودہ ایک روپیہ کے برابر کا یہ سکہ تھا۔

74 منہاج السراج نے لکھا ہے کہ آرام شاہ کے انتقال کے وقت ہندستان کی حکومت چار بڑے صوبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سندھ ناصر الدین قباچہ کے قبضے میں تھا، لکھنوتی علی مردان جو خلجی حکمراں تھا اس کے پاس تھا، لاہور، سندھ، دہلی اور غزنی پر التتمش کا قبضہ تھا۔ (پٹھان بادشاہ، صفحہ 40)

75 پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے دہلی میں ایک خودمختار سلطان کی حیثیت سے حکومت کی۔ اسے خلیفہ بغداد المستنصر باللہ سے سند خلافت بھی ملی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بغداد کے خلیفہ نے ہندستان کے کسی مسلمان بادشاہ اور اس کی حکومت کے وجود کو اس طرح تسلیم کیا تھا۔

76 یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مقدمۃ الجیش یا دستہ ہراول ہے۔ اگر اس کی املا یوں لکھی جائے التمش تو سورج گرہن کے معنی حاصل ہوتے ہیں۔

77 برن۔ آج کا بلند شہر اتر پردیش آج بھی بلند شہر میں برن نام کا ایک علاقہ موجود ہے۔

78 تذکرہ الملوک کے نزدیک یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں کے بیچ اس طرح کی مخالفت ہوئی۔ لیکن طبقات ناصری کی رائے اس سے الگ ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان دونوں کے درمیان اندر ہی اندر مخالفانہ جذبات دم بھر رہے تھے۔ اس دونوں رائے کے مقابلے میں ملا بدایونی کی رائے زیادہ معتبر اور پر معنی معلوم ہوتی ہے۔

79 ترکی زبان میں منکرن کے معنی سیاہ تل کے ہیں۔ چوں کہ اس کی ناک پر تل تھا اس لیے اسے منگرنی کہا گیا۔ (طبقات ناصری)

80 حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جن کا مزار مہرولی، دہلی میں ہے اور جو عام و خاص کے لیے باعث زیارت ہے۔ کاکی یعنی کاک جس کے معنی کیک یا روٹی کے ہیں۔ حضرت خضر خواجہ کے خاندان کے لیے روٹیاں بھیجا کرتے تھے اس لیے وہ کاکی کہلائے۔ (آئین اکبری)

81 مصر کی جگہ بغداد ہوگا، کیوں کہ خلیفہ المستنصر باللہ نے بغداد سے اسے سند خلافت وغیرہ بھیجی تھی نہ کہ مصر سے۔

82 26/ ماہ صفر 630ھ/ 1232ء (طبقات ناصری)

83 بھیلسا۔ ہندو یہاں عبادت کے لیے جاتے ہیں اور اس کے قریب متعدد بودھ وہار ہیں۔

84 طبقات شاہ جہانی کے مطابق ملا بدایونی کا انتقال 1024ھ/1615ء میں ہوا تھا نیز نامہ خرد افزا، سنگھاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ ہے۔

85 ترکان خاتون لقب بہ خداوندہ جہاں

86 شاعر کا پورا نام شہاب الدین ابن جمال الدین مہمرہ ہے۔ غلطی سے ہمرہ لکھا گیا ہے وہ شہاب الدین مہمرہ کے نام سے مشہور ہے۔

87 میر آخور۔ گھوڑے کا سردار، شاہی گھوڑوں کی دیکھ ریکھ کے لیے یہ عہدہ تھا اور وہ میر آخور کہلاتا تھا۔

88 طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ جمال الدین کو قتل کر دیا گیا۔

89 کیتھل سنسکرت زبان میں ہے اس کا نام کپتھالا تھا۔ کرنال سے 38 میل کے فاصلے پر ہے اور کپورتھلا جو ابھی کے پنجاب صوبے میں واقع ہے۔

90 یہ ہندو جاٹوں کی ایک نسل ہے صحیح لفظ گنوارہ معلوم ہوتا ہے اس ذات کے لوگ گوہانہ کے دیہات اور دریائے جمنا کے آس پاس اتر پردیش کا گنگا اور جمنا کے بیچ کا علاقہ ہے۔

91 تاریخ وفات میں کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ فوجوں کی مذبھیر 4 / ربیع الاول 637ھ / 1238 کو ہوئی تھی اور رضیہ اور التونیہ دونوں اس ماہ کی 25 تاریخ کو قتل کر دیے گئے تھے چوں کہ رضیہ 634ھ میں تخت نشین ہوئی تھی اس لیے 637ھ سن وفات صحیح معلوم ہوتا ہے۔

92 فرشتہ کے نزدیک دو ترک شراب میں مست تھے۔

93 طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ ایک درویش کی چال بازیوں اور حیلہ سازیوں کا یہ نتیجہ تھا جو حسد کے مارے قاضی مارہرہ کی مقبولیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

94 ہفتہ 19 شعبان 639ھ کو محاصرہ کیا جو شعبان کے مہینے تک رہا۔ (طبقات ناصری)

95 اگرہ۔ غلط ہے۔ اس کے بجائے کٹرہ ہونا چاہیے جو دریائے گنگا کے کنارے آباد تھا۔ یہ مقام اکبر بادشاہ سے پہلے پایہ تخت تھا۔ (امپریل گزیٹیر)

96 قاضی جلال الدین کاشانی۔

سلطان ناصر الدین محمود بن شمس الدین التمش

644ھ/1246ء میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے چھوٹے غیاث الدین جو غیاث الدین خورد کے نام سے مشہور تھا، کو اپنا وزیر بنایا جو وہ اس کے والد کا غلام اور داماد تھا۔ تخت نشینی کے وقت بے شمار تحفے سلطان ناصر الدین کی خدمت میں پیش کیے گئے اور شاعروں نے ان کی مدح میں اشعار پیش کیے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں:

آں خداوندی کہ حاتم بذل و رستم کوشش است
ناصر دنیا و دیں محمود بن التمش است
آں جہاں داری کہ سقف چرخ در ایوان او
در علو مرتبت گوئی فرو دیں پوشش است
سکۂ زالقاب میمونش چہ انداز وسع نو
خطبہ رازسم ہمایونش چو مایہ نازش است

[وہ خداوند جس کا بذل حاتم جیسا اور اس کی سعی رستم مانند ہے وہ دنیا اور دین دونوں کے لیے ناصر (فتح کرنے والا) ہے، اس کا نام محمود

> منقش ہے۔
>
> اس کے ایوان میں جو چھت ہے وہ جہاں داری کے آسمان جیسی ہے اس کی عظمت، بڑائی اور شان و شوکت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دین کی عظمت و شوکت و شکوہ کا پردہ ہے جس کے زیر سایہ دین کی عظمت و بزرگی قائم و دائم ہے۔
>
> اس کی صفات کے بارے میں جو کچھ کہا جائے کم ہے کیونکہ اس کے محمود اور پاک القاب سکے پر گڑھے ہوئے اور منقش ہیں اور جو نماز کے پہلے خطبہ دیا جاتا ہے وہ اس کے بیانات اور اس کی ثنا ہی سے پُر ہے جو مایۂ ناز ہے۔]

اس کے عدل و انصاف اور اخلاق حمیدہ کی یادگار کتاب "طبقات ناصری" ہے جو اس کے نام سے موسوم ہے۔ سلطان نے جمیع امور سلطنت غیاث الدین بلبن کے سپرد کر کے اسے "الغ خانی" کے خطاب سے نوازا، ساتھ ہی اختیارات دے کر یہ تاکید کی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے اسے اور سلطان کو شرمندگی اٹھانی پڑے۔ سلطان اپنے بیشتر اوقات حجرے میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرتا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دربار عام میں خاکساری سے جاتا اور بے حد سادہ لباس پہنتا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا گزارا قرآن مجید کی کتابت کی آمدنی سے کرتا۔ سلطان ناصرالدین محمود کے بارے میں اور بہت سی باتیں لوگوں کی زبانوں پر عام تھیں جن سے خلفائے راشدین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک کتاب میں راقم الحروف [مؤلف منتخب التواریخ مُلّا عبدالقادر بدایونی] نے یہ پڑھا کہ ایک روز اس کی بیوی نے شکایت کی کہ اس کے پاس کوئی کنیز نہیں، جس کی وجہ سے روٹی پکاتے پکاتے اس کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اس کے جواب میں سلطان نے رو کر جواب دیا کہ دنیا فانی ہے کچھ دن اور صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن ایک حور اس کے عوض میں عطا کرے گا۔ اس وقت یہ ممکن نہیں ہے کہ بیت المال سے کوئی کنیز خریدی

جائے۔ اس جواب کو سن کر سلطان کی بیوی مطمئن ہو گئی:

جہان خوابی است نزد چشم بیدار
بخوابی دل مبندو مرد ہشیار

[ہوشیار اور جاگتی آنکھوں کے لیے دنیا کسی خواب سے زیادہ کی حقیقت
نہیں رکھتی۔ اس لیے تجھے چاہیے کہ اگر تو خود کو ہوشیار مرد سمجھتا ہے تو
اس خواب سے دل مت لگا یعنی دنیا سے زیادہ تعلق قائم مت کر]

سلطان رجب ماہ میں فوج کے ساتھ ملتان کے لیے روانہ ہوا اور ماہ ذی قعدہ میں اس نے راوی ندی کو پار کیا۔ الغ خاں کو اپنے نائب کی حیثیت سے جود کی پہاڑیوں اور سندھ کی مہم کے واسطے بھیجا اور خود سندھ ندی کے کنارے سکونت اختیار کی۔

اسی دوران الغ خاں نے اس علاقے کے سرکشوں کی سرکوبی کی اور انھیں زیر کیا۔ اس نے کھوکھروں اور دوسرے شورش پسندوں کو بھی پامال کیا۔ اس کے بعد سلطان کے ساتھ آملا اور پھر دونوں ایک ساتھ دہلی واپس آگیے۔ 645ھ/ 1247ء سلطان نے میوات کی مہم کا ارادہ کیا اور اسے جیتنے کے بعد دوآبہ 1 کی جانب بڑھا۔ اسی سال الغ خاں کو کنزہ کی حدود سے باغیوں کو نکالنے کے کام پر مامور کیا اور وہ بے شمار مال غنیمت لے کر دہلی لوٹا۔

646ھ/ 1248ء میں سلطان نے رنتھمبور کی جانب مہم چلائی اور اس علاقے کے باغیوں کو کچل کر واپس آیا۔ 1249/647ء میں اس نے الغ خاں کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔

648ھ/ 1250ء میں اس نے ملتان پر چڑھائی کی۔ چند روز بعد جب ملک عزالدین یعنی بڑے بلبن جو ناگور کا حاکم تھا، نے بغاوت کی تو سلطان ادھر متوجہ ہوا۔ اس نے جان کی امان چاہی اور وہ پھر وفادار امراء کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

649ھ/ 1251ء میں سلطان نے گوالیار، چندیری اور مالوہ کی جانب کوچ کیا۔ راجہ جاہر دیو پانچ ہزار سوار اور دو لاکھ پیادہ فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے باہر نکلا مگر شکست

کھائی اور ترودر کا قلعہ فتح کرلیا۔ اسی سال شیر خاں جو ملتان کا حاکم تھا، عزالدین نے بڑے بلبن کے ساتھ مل کر ناگور ہوتے ہوئے اُچہ کا قلعہ فتح کرلیا۔ شیر خاں نے اسی قلعے میں سکونت اختیار کرلی مگر عزالدین (بڑا بلبن) سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سلطان نے اسے بدایوں کا حکمراں بنا دیا اور کشلو خاں کے لقب سے نوازا۔

650ھ/ 1252ء میں سلطان نے دہلی سے لاہور کا ارادہ کیا، وہاں سے ملتان اور اُچہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس سفر میں کشلو خاں بیاہ ندی تک اس کے ساتھ تھا۔

651ھ/ 1253ء میں سلطان دہلی سے کوچ کرکے تبرھندہ، اُچہ اور ملتان پہنچا۔ یہ علاقہ شیر خاں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور سندھی اس پر قابض تھے۔ اس نے دوبارہ اس پر قبضہ کیا پھر اس کو ارسلان خان کے حوالے کردیا اور خود دہلی لوٹ آیا۔

652ھ/ 1254ء میں سلطان نے بجنور کے پہاڑوں کے دامن میں لشکر جمع کیا اور جوالاپور کے پاس سے گنگا ندی پار کی۔ پھر پہاڑ کے دامن کے ساتھ چلتے چلتے رہاب ندی تک پہنچا۔ راستے میں جہاں کہیں بھی گیا کامیابی ملتی گئی اور عوام کی ایک کثیر تعداد کو گرفتار کیا پھر کٹھیر کی جانب بڑھا، وہاں سے بدایوں اور اودھ پہنچا اور اس کے بعد پایہ تخت کو روانہ ہوا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ اسے خبر ملی بعض امراء مثلاً الغ خان اعظم، ارسلان خان وغیرہ جن کو سلطان کے پاس سلطان کے بھائی ملک جلال الدین کی حمایت حاصل تھی، ان سب نے مل کر مخالفت شروع کردی ہے۔ خبر ملتے ہی سلطان نے دہلی سے کوچ کیا مگر جب وہ تبرھندہ، کہرام اور کیتھل[2] کے علاقہ میں پہنچا تو چند امراء کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ مخالفین صلح کے واسطے آمادہ ہوگئے۔ اور اُن سب نے قسمیں کھا کھا کر اپنے جان ومال کی سلامتی چاہی اور وعدہ کیا کہ وہ سلطان کے وفادار رہیں گے۔

653ھ/ 1255ء میں سلطان کا مزاج اپنی والدہ ملکہ جہاں کی طرف سے کچھ بدل سا گیا۔ چنانچہ قتلغ خان کو جس کے حبالہ عقد میں ملکہ جہاں تھی کچھ جاگیر عطا کی اور چند روز بعد اسے وہاں سے بہرائچ بھیج دیا۔ مگر بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر وہ اتنا خائف تھا کہ بہرائچ میں زیادہ قیام نہ کر سکا اور سرمور کے پہاڑ کی جانب چلا گیا۔ جہاں ملک

عزالدین، کشلو خان اور بعض دوسرے امراء نے اس کی ہمت افزائی کی، پھر سب نے مل کر بغاوت شروع کی۔ سلطان نے الغ خان کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ادھر بھیجا۔ جب فریقین ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو شیخ الاسلام سید قطب الدین، قاضی شمس الدین بہرائچی اور کچھ دوسرے امراء نے قتلغ خاں کو ہدایت دی کہ وہ دہلی پر دھاوا بول دیں اور اس پر قبضہ کرلیں۔ دہلی کے باشندوں نے بھی اس سلسلے میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جب الغ خاں نے سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے حکم دیا کہ جن لوگوں نے قتلغ خاں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں اپنی جگہ چھوڑ کر منتشر ہوجائیں۔ قتلغ خاں اور عزالدین کشلو خاں نے سو کروہ[3] کی مسافرت دو دن میں طے کی اور سامانہ سے دہلی پہنچے، مگر دہلی کی جس جماعت نے ان کو طلب کیا تھا اس کے آدمیوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ ملا۔ یہ دیکھ کر دونوں کو بے حد افسوس ہوا اور انھوں نے الگ الگ راہ سے بھاگ جانا مناسب سمجھا۔ جدھر منھ اٹھا چل دیے۔[4] مگر بعد میں الغ خاں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

655ھ/1257ء[5] میں سلطان نے دہلی کے چند اکابر و اعیان کو شہر سے باہر جانے کا حکم صادر کیا۔ اسی سال کے آخر میں مغل اچہ اور ملتان کی حدود میں داخل ہوئے۔ جب کہ عزالدین کشلو خاں ان کے ساتھ جنگ کرنے اور انھیں روکنے میں مصروف تھا۔ سلطان بھی تیزی سے آپہنچا۔ مغل ان دونوں کا مقابلہ ایک ساتھ نہیں کر سکے۔ اس لیے وہ خراسان کی جانب لوٹ گئے۔ اس کے بعد سلطان نے بھی سکون کی سانس لی اور اپنے پایۂ تخت کی جانب لوٹ گیا اور ملک جلال الدین جانی کو خلعت عطا کر کے لکھنوتی بھیج دیا۔

656ھ/1258ء میں ترکستان سے کچھ ایلچی سلطان کے پاس آئے جنھیں سلطان نے بے شمار انعام و اکرام کے ساتھ واپس بھیجا۔ اسی سال حضرت شیخ شکر[6] اصلح[7] اللہ اعلیٰ ذکرہ کا وصال ہوا۔

658ھ/1260ء میں لکھنوتی سے بے شمار ہاتھی اور خزانے اور بے حساب جواہرات بطور تحفہ بھیجے گئے۔ اسی سال رجب کے مہینے میں ملک عزالدین کشلو خاں بلبن کا انتقال ہوگیا

اور اسی سال غوث العالم حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ نے بھی خیمۂ وصال ذوالجلال عز شانہ کے جوار قدس میں انتقال کیا۔ ایک عزیز نے یہ مصرعۂ تاریخ کہا ہے:

ز تیر عشق ربانی یکی زخمی، دگر خون شد

[عشق ربانی کے تیر سے ایک زخمی ہوا دوسرا خدا کو پیارا ہوگیا۔]

658ھ/1259ء میں سلطان ناصر الدین محمود نے میوات کے علاقوں کی مہم کی اور جب ان پر وہ پوری طرح قابض ہوگیا تو 664ھ/1265ء میں بیمار ہوگیا اور دنیا کی رونق سے دور کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا جو کہ تخت پر دعویٰ کرتا اور تخت کی عظمت آگے بڑھاتا۔ اس نے 19 سال3 ماہ اور چند روز حکومت کی۔ اس کی قبر دہلی میں ہے، ہر سال اس کی قبر پر ایک بڑا اجتماع ہوتا ہے:

بیاد یک نظر اعتبار کن در خاک
کہ خاک تکیہ گہ خسروان معتبر است

[زمین پر ایک نظر سے اعتبار کرکیوں کہ شاہوں اور بزرگوں کے مزارات کی مٹی بھی اعتبار اور سند کا مرتبہ رکھتی ہے۔]

اس جماعت میں سے جس نے عہد ناصری میں شاعری کا ڈنکا بجایا اور ملک العلائی کے درجے پر پہنچا، ایک شاعر شمس الدین دبیر تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے وہ اس کے شان میں کم ہوگی۔ امیر خسرو قدس اللہ سرہٗ نے اپنے اشعار کا معیار اس کے کلیے کو قرار دیا اور اس پر بے حد فخر و مباہات کیا۔ دیباچہ غرۃ الکمال اور اپنے کلام ہشت بہشت کے خاتمے پر انھوں نے شمس الدین دبیر کی خوبیوں کے ذکر اور اس کے اوصاف کے اظہار سے اپنی کتابوں کو سجایا اور سنوارا۔ سلطان غیاث الدین عرف چھوٹے بلبن نے جب کہ شمس الدین

دبیر کی عمر کے آخری حصہ تھا، اسے بنگال اور کامروپ کا منشی مقرر کر کے اپنے بڑے بیٹے نصیرالدین بغرا خاں کے پاس بھیج دیا تھا۔

ملک الملوک والکلام امیر فخرالدین عمید تولکی نے بھی قصیدہ میں لکھا ہے:

چو بردارد نگارم چند بند و زخم بر ناخن
زند ناہید را صد زخم غیرت بر جگر ناخن

جب کہ عمید کا ذکر درمیان میں آگیا جو جملہ ممالک ہند کا کنٹرولر تھا، تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ اور نادرالوجود اشعار درج کیے جائیں، چنانچہ ذیل میں چند اشعار درج ہیں:

برخیز عمید ازنہ فرو است دل تو
بگذر زغزل حمد خداوند جہان گو
مداحی درگاہ خدا کن کہ برافراشت
بی زحمت آلات لبی گنبد مینو
دوشاہ روان کرد برین طارم ازرق
پس داد ز سیارہ شان فیل زہرسو

سلطان غیاث الدین بلبن خورد

الغ خانی خطاب تھا 664ھ / 1265ء میں تمام امراء اور ملوک کی رائے سے قیصر سفید میں اس نے تخت سلطنت کو زینت بخشی۔ یہ سلطان التمش کے ان چالیس غلاموں میں سے تھا جن میں سے ہر ایک منصب امارت پر فائز ہوا۔ جب کہ وہ ابھی الغ خاں تھا اور مملکت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی اس نے حکمرانی پر بخوبی قابو پالیا تھا۔ وہ رذیلوں کو کبھی اپنے حکمرانی اور دیگر معاملات میں مداخلت کا موقع نہیں دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ فخر نامی ایک رئیس سالہا سال تک اس کی ملازمت میں رہا ایک مرتبہ اس نے سلطان کے مقربین میں سے ایک تک کسی طرح رسائی پیدا کرلی اور اس سے یہ التجا کی کہ اگر اسے ایک بار سلطان غیاث الدین کے ساتھ بات کرنے کا موقع مل جائے تو وہ اپنی تمام قیمتی چیز خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان اس کے بدلے میں دے دے گا۔ جب اس التجا کی خبر سلطان کے کانوں تک پہنچی تو اس نے اسے گوارہ نہیں کیا۔ اس نے یہ کہلا بھیجا کہ سفلوں اور رذیلوں کے ساتھ بات کرنا اس کی شان کے خلاف ہے وہ ظلم وتشدد کے سخت خلاف تھا۔ ان میں سے ایک دو کو تو مدعیوں کے حوالے کر دیا گیا تا کہ وہ خود ان سے قصاص لیں۔ جن امیروں نے زر قصاص ادا کر دیا وہ جب تک زندہ رہے شرم کے مارے اپنے گھر سے باہر نہ نکلے یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نامداری بعدل و داد بود
ظلم و شاهی چراغ و باد بود

[اس کے عدل و انصاف و داد کی شہرت ایک مثال ہے کیونکہ بادشاہت اور ظلم میں وہی تعلق ہے جو چراغ اور ہوا میں ہوتا ہے۔]

اس کے تمام اوصاف حمیدہ کا اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی بے طہارت نہیں رہتا تھا اور مجالس وعظ میں بے حد گریہ و زاری کیا کرتا۔ مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ہی وہ سرکشوں اور باغیوں کا سر کچلنے میں بڑی سختی کرتا تھا:

فرّ کیخسروی ازین جاه نواست
که جهان را به علم و عدل آراست
روز خلوت گلیم پوشیدی
هم نازو نیاز کوشیدی
روی بر رنگ و دل چو دیگ بجوش
دل سخن گستر و زبان خاموش
تا بدیدی دلش بدیده راز
دیده پنهانی این نشیب و فراز

[اس کی عظمت اور بزرگی و بادشاہی کا شکوہ قابل بیان ہے کہ جس نے دنیا کو اپنے علم و انصاف سے سنوارا ہے جب وہ تنہائی میں ہوتا ہے تو گلیم (فقیری لباس) پہنتا ہے اور ناز و نیاز میں مشغول رہتا ہے دل کو معاملات دنیا سے جدا اور دل کو دنیا سے بیزار اور جس طرح کہ کسی دیگ میں جوش آتا ہے اسی طرح سے خود کو الگ تھلگ کیے رہتا

> ہے دل سے وہ سب کچھ بیان کر دیتا ہے مگر زبان خاموش رہتی ہے تم جب تک اپنی آنکھوں سے اس کے دل تک پہنچو گے تو اس کے معاملات میں نشیب و فراز کی پوشیدگی پر تمہاری نظر پڑ سکتی ہے۔]

اسی سال تاتار خاں جو ارسلان خاں کا لڑکا تھا، اُس نے لکھنوتی سے 63 ہاتھی بطور تحفہ بھیجے اور اسی سال نیپالی[8] اور کٹیلہ[9] جاتے ہوئے جھوجپور[10]، نچھ، نیپالی اور کٹیلہ کے قلعے مسخر کیے۔ پانچ ہزار سوار کے ساتھ جود پہاڑ کی مہم کی تیاری کے بہانے اس نے دریائے گنگا عبور کیا۔ دہلی کی روانگی سے دو روز قبل وہ کاتیر[11] کے علاقے میں پہنچ گیا جہاں اس نے ہر مرد کو قتل کر دیا یہاں تک کہ آٹھ سال کے بچے کو بھی نہیں چھوڑا اور عورتوں کو قید کر دیا۔ اس علاقے کے باشندوں کو اس نے ایسی سزائیں دیں کہ جلال الدین کے عہد تک بدایوں اور امروہہ کی مملکت کاتیروں کے شر سے محفوظ رہی۔ بہار، جونپور اور مشرقی ہندستان جانے والے تمام راستے جو پہلے بند تھے، اس نے ان سب کو کھول دیا نیز میوات کی مملکت جو دوآبے کے درمیان واقع ہے اسے طاقتور سرداروں کے سپرد کیا اور ان کو حکم دیا کہ باغیوں کو قتل کر دیں۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور کچھ باغیوں کو قید بھی کیا گیا اس کے بعد سلطان نے سنتور کی پہاڑی کے دامن میں آباد علاقے پر چڑھائی کی اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ سلطان معزالدین بہرام شاہ کے عہد حکومت میں یہ علاقہ مغلوں کے ہاتھوں بری طرح ویران ہوا تھا اور اس وقت تک اسی حالت میں برقرار تھا اور یہیں سلطان بیمار پڑ گیا۔ اس کی بیماری کی خبر جب لکھنوتی پہنچی تو طغرل خان جو نائب امین خان جسے شیر خان کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، سرکشی کی اور اپنے مالک امین خان کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ امین خان نے اسے شکست دی اور اسے قید کرنے کے بعد شان و شوکت سے شاہی ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور اس نے اپنا لقب سلطان معزالدین رکھا۔ سلطان غیاث الدین بھی طغرل کے خلاف فوج لے کر پہنچا تھا مگر وہ جاج نگر اور تارکیلہ کی جانب نکل گیا اس لیے ملک اختیار الدین برلاس کو اس کے تعاقب کا حکم دیا گیا۔ سنارگاؤں کے راجہ دھنوج

نے سلطان کو یہ پیش کش کی کہ وہ طغرل اور ملک اختیارالدین کو پکڑ کر لائے گا۔ طغرل جنگل کی جانب بھاگ گیا تھا۔ ایک روز غفلت میں پا کر اس کا سر کاٹ دیا اور اسے سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان نے وہ مملکت اپنے بڑے بیٹے بغرا خان، جو کہ سامانہ کا حاکم تھا اُس کو چتر اور عصائے اختیار کے ساتھ دے دی۔ بغرا خان بعد میں سلطان ناصر الدین کے خطاب سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد سلطان پایہ تخت کو واپس لوٹ گیا۔ چونکہ شیر خان کی وفات کے بعد مغلوں کی آمد و رفت کا راستہ کھل گیا تھا۔ واضح رہے کہ بغرا خاں شیر خان کا چچا زاد بھائی اور سلطان شمس الدین التمش کے چالیس غلاموں میں سے تھا۔[12] اسے لاہور اور دیپال پور کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس نے غزنی میں سلطان ناصرالدین کے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا تھا۔ اس کے عہد میں مغلوں کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ہندستان کا رخ کرتے مگر اس کی وفات کے بعد وہ بات قائم نہ رہ سکی اس لیے سلطان بلبن نے اس فتنے کے تدارک کے لیے اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کو جو خان شہید اور قاآن ملک کے خطاب سے نوازا تھا۔ چتر، عصا و اختیارِ سلطنت کے دوسرے امتیازی نشانات اور ساز و سامان دے کر ولی عہد بنایا اور سندھ اس کے سپرد کر کے ملتان بھیجا۔ ٹھٹھہ تک کا تمام علاقہ اور سمندری کنارہ اس کے قبضے میں تھا۔ امیر خسرو دہلوی اور امیر حسن دہلوی ملتان میں پانچ سال تک اس کی خدمت میں رہے اور ان کا شمار قریبی دوستوں کے زمرے میں ہوتا تھا۔ سلطان نے ملتان سے دو مرتبہ بے شمار سونے اور دوسرے قیمتی چیزیں شیراز بھیجیں اور شیخ سعدی سے آنے کی درخواست کی۔ شیخ نے پیرانہ سالی کا عذر کیا اور خط میں اس نے سلطان کو یہ مشورہ دیا کہ امیر خسرو کی اچھی طرح خاطر و مدارات کی جائے اس کے علاوہ امیر خسرو کی بہت تعریف کی اور اپنے ہاتھ سے تعریف کے اشعار لکھ کر بھیجے۔ سلطان محمد کا معمول تھا کہ ہر سال سلطان بلبن کو دیکھنے کے لیے دہلی آتا اور خلعت اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر واپس جاتا۔ آخری بار جب کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی سلطان نے خلوت میں سلطان محمد کو کچھ نصیحتیں کیں اور اسے لاہور روانگی کی اجازت دے کر ملتان روانہ کیا۔ اسی سال تمر مغل نے تیس ہزار سواروں کے ساتھ دریائے راوی کو لاہور کے پُل کے ذریعہ

عبور کیا اور اس شہر میں ایک بڑے فتنے کو انجام دیا۔ لاہور کے حاکم نے اس بات کی اطلاع خان شہید کو لکھ بھیجی مگر اس نے اپنی مجلس میں جب خط پڑھ کر سنایا تو بجائے تیس ہزار بڑی فوج لے کر تیزی سے سرے13 پہنچا۔ جو راوی ندی پر تھا وہ کفر سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ یہ واقعہ ماہ ذی الحجہ 683ھ/1283ء14 میں رونما ہوا تھا۔ اس سلسلے میں امیر حسن دہلوی15 نے ایک مرثیہ میں لکھ کر دہلی بھیجا۔

امیر خسرو کی گرفتاری

اس لڑائی میں امیر خسرو بھی سلطان محمد کے ساتھ تھے۔ انھیں ایک مغل سردار نے گرفتار کر لیا۔ وہ ظالم ان کے سر پر اپنے گھوڑے کے کھانے کا جھول اٹھوایا کرتا تھا۔ اس سارے واقعہ کو انھوں نے نہایت پر اثر انداز میں قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے سلطان کی شہادت کے متعلق دو مرثیے بھی لکھے ہیں۔16 ان کی پہلی نظم کا مطلع ہے:

من بر سر نی نہادم گل
بار بر سر نہاد و گفتہ جل

[میں نے سر پر کوئی پھول نہیں ڈھویا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے
سر پر بوجھا اٹھایا ہوا تھا جس طرح سے گھوڑے اور گدھے جھول میں
سامان ڈھوتے ہیں۔]

جب یہ دہلی پہنچا تو ایک مہینے تک لوگ انھیں مجلسوں میں پڑھتے اور اپنے ہلاک ہونے والے عزیزوں کو یاد کر کے روتے رہے۔

بلبن کی وفات

جب سلطان بلبن کو اس شکست اور سلطان محمد کی شہادت کی اطلاع ملی تو اسے بہت صدمہ ہوا اور بہت دنوں تک اس کے ماتم میں کھویا رہا۔ ان مراسم سے فراغت ہوئی تو اس نے اپنے دوسرے لڑکے بغرا خاں جسے ناصر الدین کا خطاب دے کر لکھنوتی کی حکومت عطا کی تھی خط لکھا کہ ''تمہارا بھائی اس طرح مارا گیا اب تم ہی اس کے قائم مقام ہو اور اب تمہاری ہی صورت دیکھ دیکھ کر اس غم کو بھلانا چاہتا ہوں اس لیے تم فوراً ہی یہاں چلے آؤ۔'' بغرا خاں کو لکھنوتی میں مستقل حکومت ملی ہوئی تھی اور وہاں اس کا دل لگ گیا تھا اس لیے اس نے باپ کے بلانے پر پس وپیش کیا اور آنے میں کافی دیر کر دی۔ بادشاہ نے اسے تاکیدی خطوط لکھے تو وہ دل برداشتہ دہلی پہنچا لیکن حوصلہ آزمائی کی امنگ اور حکومت کی چاٹ ایسی لگی تھی کہ جب تک دہلی میں رہا اس کا دل گھبراتا ہی رہا۔ آخر ایک مرتبہ شکار کا بہانہ کر کے چند سرداروں اور مصاحبوں کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور شکارگاہ سے سیدھا لکھنوتی چلا گیا۔

بیٹے کی موت نے بوڑھے بلبن کو بہت حد تک توڑ دیا تھا اس کی عمر بھی اسی سے کچھ اوپر ہی ہو چکی تھی چنانچہ اس نے محمد خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو خسرو خاں کا خطاب اور تمام لوازمات سلطنت عطا کیے اور اپنا ولی عہد بنا لیا۔ ملتان کا علاقہ اسے بطور جاگیر کے دے دیا اور وصیت کی کہ بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو اس کے باپ کے پاس لکھنوتی بھیج دیا جائے۔ اس سارے انتظامات سے فراغت کے بعد وہ صرف تین دن اور زندہ رہا اور بائیس سال چند ماہ کی حکمرانی کے بعد 686ھ/1287ء میں عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔

سلطان معزالدین کیقباد

سلطان بلبن نے خسرو خان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا لیکن ایک امیر ملک جسے اہتمر بھی کہتے تھے کچھ اور امراء کے ساتھ مل کر (جو خسرو خاں کے باپ شہید کے مخالف تھے) خسرو کے بجائے بغرا خاں کے لڑکے معزالدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت کیقباد کی عمر

صرف 18 سال کی تھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد کیقباد نے سب سے پہلی کارروائی یہ کی کہ خسرو خاں اور اس کے متعلقین کو ملتان روانہ کر دیا اور وہاں کی عملداری اس کے نام بحال رکھی۔ خسرو خاں کے جتنے ہوا خواہ اور حامی تھے سب کو جلاوطن کر دیا۔ جب ملک کا نظم و نسق حسب مرضی ترتیب پا گیا تو کیقباد نے ملک قیام الدین کو "دادبیگی" اور ملک قیام الدین کو "وکیل" مقرر کیا اور باقی امراء کو ان کے پرانے عہدوں پر ہی بحال رکھا۔

تخت نشینی کا دربار

چھ ماہ بعد سلطان کی سواری دہلی سے قصبہ کیلوکھڑی پہنچی۔ اس موقعے پر کیلوکھڑی کو خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ سلطان نے یہاں اپنا پہلا دربار عام منعقد کیا۔ اسی دربار میں خواجہ خطیر الدین کو "خواجہ جہانی" اور ملک شاہک امیر حاجب کو "وزیر خانی" کے خطابات ملے۔ ملک نظام الدین[17] وزیر کے کہنے سے سلطان نے دربار میں نو مسلم مغلوں کو پکڑ کر بلوایا اور ان سب میں سے اکثر کو قتل کروا دیا۔

کیقباد نے ملک چھجو[18] کی لڑکی سے شادی کی ملک چھجو کو صلے میں سامانہ کی جاگیر دی۔ اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخر میں سلطان کو خبر ملی کہ تاتاریوں نے استحر کی قیادت میں ملتان اور لاہور کے علاقے میں فتنہ و فساد مچا رکھا ہے۔ بادشاہ نے شاہک باربک کو "خان جہانی" کا خطاب عطا کیا اور تین ہزار سوار دے کر تاتاریوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ شاہک باربک نے تاتاریوں پر دلیرانہ حملے کیے اور ان کو بھگا کر جود کی پہاڑیوں تک پیچھا کیا بہت سے تاتاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ان کی ایک بڑی جماعت کو گرفتار کر کے دارالسلطنت میں لے آیا۔

کیقباد کی عیش پسندی

سلطان معز الدین کیقباد اپنے دادا کے زمانے میں معلموں اور اتالیقوں کی تحت نگرانی

اور تربیت میں پرورش پاتا رہا تھا، اب غیر متوقع طور پر عین عالم شباب میں ایک بہت بڑی سلطنت اس کے ہاتھ آگئی تھی۔ ملک میں چاروں طرف امن وامان تھا، فارغ البالی اور خوش حالی کی وجہ سے لوگ نہایت اطمینان اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان حالات میں نوجوان بادشاہ بہت جلد ہی عیش عشرت کا شکار ہوگیا اور اس کے اوقات رنگ رلیوں میں بسر ہونے لگے، اس کے دادا کے عہد کے برخلاف بھانڈوں، قوالوں اور بازیگروں نے بادشاہ کے مزاج میں دخل پالیا اور علم و زہد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر ملک نظام الدین کی بن آئی وہ شاہی خاندان کو ختم کر کے اپنی سلطنت کے سنہرے خواب دیکھنے لگا۔ اس غرض کے لیے اس نے بادشاہ کو بہکا کر کئی فساد برپا کیے۔ پہلے تو اس نے بادشاہ کو خان شہید کے لڑکے کیخسرو کے قتل پر آمادہ کیا، چنانچہ سلطان نے خسرو کو ملتان سے بلوا کر قصبۂ روہتک میں شہید کرادیا اس کے بعد خان جہان پر جھوٹی تہمت لگوا کر اس کی بے عزتی کروائی اور ان تمام امیروں کو جن کی نومسلم مغلوں سے قرابت داری تھی قید کر کے دور دراز کے قلعوں میں بند کروا دیا۔ بادشاہ کی ان حرکتوں کی وجہ سے دربار کی وہ رونق و سطوت نہیں رہی جو بلبن کے زمانہ میں تھی۔

باپ اور بیٹے کی ملاقات

جب بغرا خاں ناصر الدین نے لکھنوتی میں اپنے بیٹے کا یہ حال سنا تو اس نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا اور اشارتاً نظام الملک کی شرارت کی طرف اسے توجہ دلائی لیکن وہ بادۂ جوانی کے سرمستیوں میں ایسا سرشار تھا کہ باپ کی ایک نہ سنی، آخر کار طویل مراسلت کے بعد طے پایا کہ باپ بیٹا دونوں اودھ میں ملاقات کریں[19]۔

یہ ملاقات کافی دیر تک چلی اور دونوں نے تفصیلی طور پر آپس میں مشورے کیے۔ ناصر الدین بادشاہ سے مل کر اپنے خیمہ میں آیا تو اس نے لکھنوتی کے نفیس تحفے بیٹے کے پاس بطور پیش کش روانہ کیے۔ معز الدین نے بھی باپ کی نذر کے لیے عراقی گھوڑے اور طرح طرح کا عمدہ اسباب روانہ کیا۔ اس وقت دونوں طرف کے لشکروں نے بڑی خوشیاں منائیں

اور ان کے افسر بھی ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے آتے جاتے رہے۔ امیر خسرو نے "قران السعدین" میں ان صحبتوں کا پورا پورا نقشہ کھینچا ہے۔

زہی ملک خوش چون رو سلطان یکی شد
زہی عہدش جود و پیمان یکی شد

[سلطان کے چہرے سے ملک کی خوشحالی اور بھلائی ہویدا تھی، وہ عہد تھا کہ جس میں جود و پیمان ایک ہونے کے مصداق تھے۔]

اس نظم کا ایک شعر ہے۔

سلطان معزالدین والی کیقباد بادشاہ
یک دیدہ دو مردمک چار بادشاہ

[سلطان معزالدین بن کیقباد بادشاہ کہنے کو ایک مرد کی آنکھ جس میں دو پتلیاں اور چار بادشاہ بنتے تھے۔]

آخری نصیحت

دوسرے دن سلطان ناصرالدین الوداعی ملاقات کے لیے بادشاہ کے پاس آیا۔ نظام الملک اور قوام الملک دونوں سرداروں کے سامنے بادشاہ کو بڑی نصیحتیں کیں اور کثرت شراب نوشی، عیاشی، نظم و نسق سے بے پروائی، بعض بڑے سرداروں اور کیخسرو کے قتل پر اسے سرزنش کی اور نماز، روزہ، زہد و تقویٰ کی طرف رغبت دلائی اور جہاں بانی کے قاعدوں اور ضابطوں سے آگاہ کیا۔ بغل گیر ہوتے وقت پیچھے سے کان میں کہا کہ "نظام الملک کا قصہ جلد ختم کر دو۔ اگر اس نے قابو پالیا تو تمہاری خیر نہیں۔" دونوں نے بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ ایک دوسرے کو رخصت کیا[20] معزالدین چند دنوں کے لیے اپنے باپ کی نصیحتوں

پر کاربند رہا آخر کار حسین وجمیل لڑکیوں، خوب صورت مطربوں (بجانے والے) اور بازی گروں نے بادشاہ کو اپنی عشوہ گری کے جال میں پھنسا لیا اور نوجوان بادشاہ کی توبہ شیشۂ نازک کی طرح چور چور ہو گئی۔

چنانچہ چند ہی منزل آگے بڑھا تھا کہ وہ اس طرح رنگ رلیوں[21] میں مصروف ہو گیا۔ دہلی تک یہ سارا سفر اسی عیش وعشرت میں کٹ گیا۔ دہلی میں سلطان کی واپسی 689 ھ/1289ء میں ہوئی۔

بادشاہ کا یہ حال دیکھ کر بعض سردار بددل ہو کر پہاڑی علاقوں میں چلے گئے۔ ان میں سے شیر خان پشیمان ہو کر بعد میں لوٹ آیا تھا لیکن بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور وہ اسی قید میں مر گیا۔ بادشاہ نے فیروز خان یغرش خلجی کے بیٹے کو شائستہ خاں[22] کا لقب دے کر برن (بلند شہر) کے علاقے پر مامور کیا۔

شمس الدین کی تخت نشینی

ملک اتمر نے بادشاہ کے قتل کی سازش کی تھی۔ سلطان نے اسے بڑی حکمت عملی سے گرفتار کروا کے قتل کر ڈالا۔ باپ کی فرمائش کے مطابق اس نے نظام الملک کی بھی فکر کی اور اس کو ملتان جانے کا حکم دیا مگر نظام الملک سلطان کے ارادے کو بھانپ گیا اور وہاں جانے میں پس وپیش کرنے لگا۔ اس دوران بادشاہ نے خفیہ طور پر زہر دلوا کر اس کا بھی قصہ ختم کر دیا۔ نظام الملک کی ہلاکت کے بعد نظم ونسق میں کافی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ ادھر بادشاہ کا یہ حال تھا کہ شب وروز حالت مستی میں گزارتے تھے اور شراب ومعشوق کے سوا اسے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ چنانچہ عیاشی کی وجہ سے وہ لقوہ کے عارضے میں مبتلا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نہایت ضعیف اور کمزور ہو گیا اس کے قویٰ اور اعصاب بالکل ناکارہ ہو چکے تھے۔ سلطنت کا کاروبار بری طرح درہم برہم ہو چلا تھا۔ یہ حال دیکھ کر چند خیر خواہ امیروں نے اس کے ایک کم عمر لڑکے کیاؤس کو شمس الدین کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

شائستہ خان کی بغاوت

688ھ/ 1289ء میں شائستہ خان خلجی نے بہت سے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنی عملداری ''برن'' سے ایک بڑی فوج لے کر دہلی پر چڑھائی کر دی۔ بادشاہی امراء بھی فوجی تیاریاں کر کے مقابلے پر روانہ ہوئے اور سلطان معزالدین کو جو بیماری اور کمزوری کی وجہ سے ایک بے جان تصویر بن کر رہ گیا تھا قصر کیلوکھڑی کی چھت پر چتر شاہی کے نیچے بٹھا دیا۔ ملک چھجو غیاث الدین کے بھتیجے نے بلند آواز کے ساتھ اعلان کیا کہ ہم چاہتے ہیں معزالدین کو کشتی میں سوار کر کے لکھنوتی میں اس کے باپ کے پاس بھجوا دیں اور سلطان شمس الدین کیکاؤس کی خدمت میں حاضر رہیں۔ اس اعلان پر دہلی والے شمس الدین کیکاؤس کی حمایت کے لیے شائستہ خاں کے مقابلے پر تیار ہو گئے اور بدایونی دروازہ کے سامنے جمع ہو گئے۔

کیقباد کا انجام

لڑائی کا فیصلہ شائستہ خاں کی جانب رہا۔ ملک الامراء فخرالدین کوتوال کے لڑکے قید کر لیے گئے اور ملک اتمر سرخہ جس نے شائستہ خاں کے قتل کا وعدہ کیا تھا شائستہ خاں کے بیٹے اختیارالدین کے ہاتھ مارا گیا۔ ملک الامرا نے جب اپنے آپ کو مقابلے سے عاجز پایا تو اپنی جمعیت کو پیچھے ہٹا لیا اور فاتح سپاہیوں نے شمس الدین کیکاؤس کو تخت سے اٹھا کر شائستہ خاں کے پاس بہادر پور روانہ کر دیا۔ شائستہ خاں نے ایک شخص کو جس کے والد کو معزالدین نے قتل کر دیا تھا قصر کیلوکھڑی پر قبضہ کے لیے بھیجا۔ وہ جب اس بدنصیب سلطان کے پاس پہنچا تو اس کا حال یہ تھا کہ وہ گم سم بیٹھا تھا اور بس اس کی سانس ہی باقی رہ گئی تھی۔ اس شخص نے دو تین لاتیں مار کر اسے جمنا 23 میں دھکیل دیا۔ یہ واقعہ نصف ماہ محرم 689ھ/ 1260ء میں پیش آیا۔ سلطان معزالدین نے تین سال چند ماہ تک حکومت کی اور اس پر خاندان غلامان غوری یعنی غیاث الدین کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس مہم میں شائستہ خاں

خلجی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے ایتمر سرخہ کی ہلاکت اور دہلی والوں کے فتنے کو ختم کرنے کے بعد شاہزادہ کیکاؤس کو تخت پر بٹھا کر مملکت کا انتظام ہاتھ میں لے لیا۔

سلطان شمس الدین کیکاؤس

کیکاؤس برائے نام بادشاہ تھا۔ اسے کم سنی میں شائستہ خاں اور ملک چھجو کشلی خاں نے 689ھ/ 1290ء میں تخت پر بٹھایا تھا۔ ان دنوں شائستہ خاں کے چچا ملک حسین نے جو کیلوکھڑی میں معز الدین کا محافظ تھا کافی اثر ورسوخ پیدا کر لیا تھا۔ جب سارے انتظامات حسب مرضی طے پا گئے تو شائستہ خاں نے ملک چھجو کشلی خاں سے کہا کہ تم بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے دارالخلافہ میں رہو۔ تبرہندہ اور دیپال پور کو میں اپنی جاگیر قرار دے کر یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں، ملک چھجو نے اس ذمے داری کو اپنے سر لینے سے انکار کر دیا اور شائستہ خاں کا نائب رہنے کے لیے اصرار کرنے لگا اور اپنے لیے کڑہ مناق جاگیر میں دینے کی درخواست کی۔ ملک الامراء فخر الدین نے شائستہ خاں کو سمجھایا کہ چھجو کو جانے دو، وہ نکل گیا تو پھر سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ چنانچہ شائستہ خاں نے ملک چھجو کی تجویز فوراً ہی قبول کر لی۔

شائستہ خاں کیکاؤس کو تخت پر بٹھا کر تقریباً دو ماہ تک ملک کا نظم ونسق چلاتا رہا۔ اس کے بعد وہ نو عمر بادشاہ کو سوار کرا کے کیلوکھڑی لے آیا اور وہاں اسے قید کر دیا، پھر چند دن بعد ہی اسے قتل کرا دیا۔ سلطان شمس الدین کیکاؤس کی کل مدت حکومت تین مہینے اور کچھ دن ہے۔

خلجی خاندان — خلجی حکمراں

سلطان جلال الدین بن یغرش خلجی

سلطان جلال الدین کا اصلی نام ملک فیروز اور خطاب شائستہ خاں تھا۔ کیکاؤس کو قتل کرنے کے بعد وہ ملک چھجو خاں کی مدد کے باعث تخت پر بیٹھا۔ ''تاریخ طبقات محمود شاہی'' کے مصنف شہاب الدین حکیم کرمانی جونپوری نے سلطان جلال الدین اور سلطان محمود مالوی کو چنگیز خاں کے داماد قالج خاں کی اولاد بتایا ہے اور اس بارے میں ایک طویل قصہ بھی نقل کیا ہے۔ لیکن یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ ''قالج'' اور ''خلجی'' میں کوئی مناسبت نہیں۔ ''قالج'' ترکی زبان کا لفظ بھی نہیں ہے، اگر ہو بھی تو اس لفظ کے معنی تلوار کے ہوں گے۔ دوسری بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ یافث بن نوح علیہ السلام کے کسی لڑکے کا نام ''خلج'' تھا اور خلجی اس کی طرف منسوب ہے۔

شہر نو کی تعمیر

سلطان جلال الدین نے تخت نشین ہونے کے بعد حکومت کے بڑے بڑے عہدے اپنے بھائیوں اور بیٹوں میں تقسیم کر دیے۔ بڑے بیٹے کو خان خاناں اور منجھلے کو ارکلی خاں اور چھوٹے کو قدر خاں اور اپنے چچا ملک حسین کو "تاج الملک" کے خطابات سے نوازا۔ سلطان جلال الدین نے جمنا کے کنارے معز الدین کے محل کے مقابل ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، اس میں ایک مضبوط قلعہ اور باغ بنوایا، جب شہر بن گیا تو اس کا نام "شہر نو" رکھا۔

ملک چھجو کی بغاوت

سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے بعد حسب قرار داد ملک چھجو کشلی خاں کڑہ کی جاگیر پر چلا گیا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اس نے تخت نشینی کے دوسرے ہی سال ماہ شعبان میں خود سری اختیار کی اور اس نواح کے اکثر جاگیر دار جو غیاث الدین کے امراء تھے اس سے مل گئے اور لشکر تیار کر کے یہ سب امیر اپنے اپنے مقام سے بدایوں میں آ کر جمع ہو گئے۔ گنگا کو نکوانہ کے گھاٹ سے عبور کر کے وہاں ملک چھجو کے انتظار میں رکے رہے تاکہ وہ آ جائے تو پھر دہلی پر یورش کریں۔

سلطان جلال الدین کو جب اس شورش کی خبر ملی تو اس نے خان خاناں کو دہلی میں چھوڑا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ فوج کے ساتھ خود کول کے راستے سے بدایوں روانہ ہوا اور دوسرے حصہ کو ارکلی خاں کی قیادت میں ملک چھجو کے مقابلے کے امروہہ روانہ کر دیا۔

ارکلی خاں رہب کے کنارے ملک چھجو کی فوج سے چند دن تک برسر پیکار رہا۔ اسی اثنا میں راجہ برم دیو کولہ نے اس کو کوبلہ بھی کہتے ہیں ملک چھجو کو اطلاع دی کہ ارکلی خاں کی مدد کے لیے سلطانی لشکر بھی آ رہا ہے یہ سنتے ہی وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ راتوں رات بھاگ گیا لیکن راستہ میں گنواروں نے گھیر کر اسے پکڑ لیا۔

ارکلی خاں نے رحب ندی کو عبور کر کے غنیم کی بھاگتی ہوئی فوج پر حملہ کیا اور برم دیو کو قتل کر دیا۔ ملک چھجو اور دوسرے باقی امیروں کو حراست میں لے کر بہادری اور کسم کور (شمس آباد) کی طرف کوچ کیا۔

جب ملک چھجو اور بلبن کے وقت کے بہت سے امرا زنجیر میں گرفتار سلطان جلال الدین کی بارگاہ میں پیش کیے گئے تو انھیں دیکھ کر سلطان کو اپنا اور ان کا گزرا زمانہ یاد آ گیا اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ انھیں فورا رہا کر کے حمام میں بھجوا دیا اور خلعتیں عطا کیں اور ان سب کے قصور کو معاف کر کے اپنا ہم نشین بنا لیا۔ ملک چھجو نے انھیں بڑے احترام اور عزت کیساتھ ملتان بھیج دیا اور کڑے پر اس کی جگہ اپنے بھتیجے اور داماد علاؤ الدین کو جو اس وقت بدایوں میں مامور تھا، روانہ کر دیا۔ اس کے بھائی الماس بیگ کو آخور بیگی 24 کا عہدہ عطا کیا۔

اس دوران بڑے شاہزادے خان خاناں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کا سلطان کو بہت رنج ہوا امیر خسرو نے اس کا مرثیہ کہا ہے:

چہ روز است این کہ من خورشید تابان را نمی بینم
دگر شب چرا ماہ درخشان را نمی بینم

[یہ کون سا دن ہے کہ میں چمکتے سورج کو بھی نہیں دیکھ پا رہا ہوں اور دن تو دن ہے رات کو بھی پتہ نہیں کیوں میں چمکتے چاند کی روشنی بھی دیکھنے سے قاصر ہوں (یعنی خسرو پر غم کی یہ کیفیت تھی کہ وہ دن رات دونوں میں بینائی سے محروم ہو گیے تھے۔]

دوسرے سال جب ارکلی خاں ملتان سے دہلی آیا تو بادشاہ نے اسے دہلی میں چھوڑ کر مندا ور کا رخ کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اسے غدر کی اطلاعات ملیں اس کی فوج میں عیاری امراء بھی شامل تھے۔ ان امیروں کی طرف سے اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں غدر کی خبر سن کر یہ

کوئی سازش نہ کریں۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ملک مغلتی کو بدایوں، ملک مبارک کو تیرعتدہ کی طرف رخصت کر دیا اور جب منداور کا قلعہ فتح ہوگیا تو بلا تاخیر شب و روز کوچ کرتا ہوا دہلی واپس آ گیا۔ سلطان کو اطلاع ملی تھی کہ دہلی میں بغاوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور اس غدر کا بانی سیدی مولہ ہے چنانچہ دہلی آ کر اس نے سیدی مولہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

سیدی مولہ درویش

سیدی مولہ نہایت عابد و زاہد اور صاحب کرامات بزرگ تھے وہ عجم سے ہندستان آئے اور پہلے اجودھن میں حضرت قطب الاولیاء مخدوم شیخ فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے پھر ان سے رخصت ہوکر ہندستان کے شہروں کی سیر کرتے ہوئے، دہلی آ کر قیام کیا۔ شیخ فرید نے رخصت ہوتے وقت ان کو وصیت کی تھی کہ "لوگوں کے ہجوم اور امراء وملوک کی صحبت سے بچتے رہنا۔" دہلی میں سیدی مولہ نے بہت جلد شہرت عام حاصل کر لی اور بڑے بڑے امراء ان کے مریدوں میں شامل ہوگئے۔ یہاں تک کہ سلطان کا بڑا لڑکا شاہزادہ خان خاناں مرحوم بھی ان کا عقیدت مند تھا۔ بلبن کے عہد کے اکثر معزول امراء بھی ان کے یہاں آتے رہتے تھے کہ دونوں وقت اس کے دسترخوان پر بہت سے امیر حاضر رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں روزانہ ہزار من میدہ اور پانچ سو من گوشت اور تین سو من شکر خرچ ہوتی تھی۔ امیر و غریب سب کے لیے ان کا دسترخوان عام تھا۔ محتاجوں کو لنگر بٹا کرتا تھا۔ وہ کبھی کسی سے کوئی تحفہ یا معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس خرچ پر لوگ گمان کرتے تھے کہ وہ کیمیا[25] بناتے ہیں۔ سیدی مولہ نماز روزہ کے نہایت پابند تھے لیکن جمعہ[26] میں حاضر نہیں ہوتے تھے کہ جو بڑے بڑے لوگ ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے ان میں قاضی جلال الدین کاشانی اور قاضی لشکر بھی شامل تھے۔

سیدی مولہ کی شہادت

سلطان کو جب اس قسم کی اطلاعات ملیں کہ سیدی مولہ کی خانقاہ میں بغاوت کی سازشیں ہوتی ہیں تو ایک دن وہ خود بھیس بدل کر خانقاہ میں گیا اور جیسا سنا تھا اس سے زیادہ لوگوں کو سید کا معتقد پایا اور اس کے شبہات قوی ہو گیے۔ چنانچہ اس نے دوسرے دن صبح ایک بڑی مجلس منعقد کی اور بے گناہ سید ان کے معتقد امیروں اور قاضی کو پابہ زنجیر حاضری کا حکم دیا۔ ان کو بڑی بے عزتی کے ساتھ دربار میں لایا گیا اور ان پر سلطنت سے دغا اور بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ سلطان نے ہر ایک سے ان کی تحقیق کی۔ سیدی مولہ نے انکار کیا اور قسم بھی کھائی۔ قاضی جلال الدین کو بھی سلطان نے بہت اذیتیں دیں لیکن اس نے بھی اس الزام سے انکار کیا۔ سلطان نے ان کو دہلی کے عہدۂ قضاء سے معزول کر کے بدایوں تبادلہ کر دیا۔ سیدی مولہ کا امتحان لینے کے لیے نمرود کی طرح بہت سی آگ جلوائی، ان کو مع ساتھیوں کے اس آگ میں جھونک دینے کا حکم دیا مگر حق گو علماء نے فتوی دیا کہ "یہ شرعاً جائز نہیں، آگ ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔ اس طرح کے امتحان کا کوئی اعتبار نہیں" اس فتوی کی وجہ سے سلطان اس وحشیانہ حرکت سے باز رہا۔ اسی مجلس میں سید کے معتقد اکثر امیروں کو سزا دی اور بعض کو جلا وطن کر دیا۔ سلطان نے خود بالمشافہ سیدی مولہ سے مباحثہ کیا اور تحت جرح کی۔ سید نے ہر بات کا معقول جواب دیا اور سلطان ان پر کسی شرعی الزام کو ثابت نہ کر سکا۔ بیزار ہو کر اس نے ابوبکر طوسی کو جو آزاد قلندروں کا سرغنہ تھا مخاطب کر کے کہا "فقیر تم ہی اس ظالم سے میرا انصاف لو" یہ سن کر ایک قلندر کود کر آگے آیا اور اس نے ان کو زخم لگائے، داڑھی مونڈلی اور سوئیاں چبھوئیں۔ اتنے میں ارکلی خان کے اشارے پر ایک فیل بان نے مست ہاتھی ان پر چھوڑ دیا۔ غرض وہ حق پسند مرد درویش بڑی اذیتوں سے شہید ہوا۔ مشہور ہے کہ سیدی مولہ اس حادثہ سے دو سال پہلے ہی سے اکثر یہ دو شعر پڑھ کر ہنسا کرتے تھے۔

در مطبخ عشق جز نکورا نکشند
لاغر صفتان زشت خو را نکشند

گر عاشق صادقی زکشتن مگریز
مردار بود ہر آنکہ او را نکشند

[عشق کے مطبخ میں نیک لوگوں کے سوائے کسی اور کو نہیں مارا جاتا ہے جو کمزور صفت ہوتے ہیں انھیں اپنی برائی نظر نہیں آتی ہے اگر تو خود کو عاشق صادق سمجھتا ہے تو پھر مرنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ تو خود کو زندہ سمجھ کیوں کہ مرے ہوئے لوگوں کو کوئی نہیں مارتا۔)

جس دن سیدی مولہ کو شہید کیا گیا اس دن بڑی سخت سیاہ آندھی[27] آئی۔ اس سال بارش بھی نہیں ہوئی اور ایسا سخت قحط پڑا کہ دیہات اجڑ گیے اور دیہاتوں سے ہندو جوق در جوق شہر میں آگیے، فاقہ کی تاب نہ لاکر بیس بیس، تیس تیس آدمی ہاتھ میں ہاتھ دے کر جمنا میں کود کود کر خودکشی کرنے لگے۔ ہزاروں مسلمان بھی قحط سے بے حال ہو کر مر گیے۔ ان حادثوں سے لوگوں کو عام طور پر یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس بے گناہ شہید پر ظلم[28] کا وبال ہے لیکن یہ باتیں زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ اتفاقی طور پر ایسے حادثے ہوتے ہی رہتے تھے۔ سیدی مولہ کے ساتھ بہت سے بے گناہ پکڑے گیے، ان میں سے بعض کو ارکلی خاں کی سفارش پر رہائی مل گئی۔

اسی سال سلطان نے دوبارہ رنتھمبور کا قصد کیا اور اس کے گرد و نواح کو تباہ و برباد کر دیا اور وہاں کے بت خانوں کو بالکل نیست و نابود کر دیا لیکن وہ قلعے کو فتح نہیں کر سکا اور ویسے ہی لوٹ آیا۔ اسی سال ارکلی خاں بادشاہ کی اطلاع و اجازت کے بغیر دہلی سے ملتان چلا گیا۔ شہزادے کی اس حرکت سے سلطان کو بہت رنج پہنچا۔

نو مسلم مغل

691ھ / 1292ء میں چنگیزی مغلوں نے ہندستان پر حملہ کیا[29] سنام کے قریب

ہندستانی فوج سے ان کا مقابلہ ہوا۔ ہندستانی فوج کی قوت دیکھ کر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی گفتگو کی۔ ان کے سردار نے بادشاہ کو باپ کہہ کر فرزندی اختیار کرنے کی خواہش کی، بادشاہ نے بھی صلح کر لی اور اسے بیٹے سے مخاطب کیا۔ دونوں طرف سے بہت سے تحائف کا تبادلہ ہوا اور مغل ہندستان کی سرحد سے لوٹ گیے۔ اسی دوران چنگیز خاں کا نواسہ الغو کئی ہزار مغلوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور سلطان کی حمایت میں آ گیا، سلطان نے اسے غیاث پور30میں رہنے کی جگہ دے دی اور اپنی بیٹی کا اس سے نکاح کر دیا۔ ان مغلوں کو لوگ نومسلم کہنے لگے۔

اسی سال کے آخر میں بادشاہ نے مند اور پر حملہ کیا اور اس کے مضافات کو تباہ کر کے لوٹ لیا۔ بادشاہ کے داماد اور بھتیجے علاء الدین نے جو کڑہ کا حاکم تھا بھیلسہ پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی اور اس کو فتح کر کے کافی مال غنیمت لے کر سلطان کی خدمت میں لوٹ آیا۔ علاء الدین بھیلسہ سے ایک بت بھی اٹھا لایا تھا جس کو ہندو بہت زیادہ پوجا کرتے تھے، اسی بت کو اس نے بدایوں کے دروازے کے سامنے راستے میں ڈال دیا۔ علاء الدین کے اس کارنامہ پر سلطان بہت خوش ہوا اور اودھ کا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں دے دیا۔

علاء الدین کی مہم پسندی

علاء الدین کو اپنی بیوی اور ساس سے بڑی رنجش تھی وہ دونوں بادشاہ کے سامنے ہی اس کی برائی کرتی رہتی تھیں۔ اس لیے اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ دونوں بادشاہ کو اس کے خلاف کر کے اس کو کسی خطرے میں مبتلا نہ کر دیں۔ اس لیے وہ بادشاہ کی عملداری سے کسی اور طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکر میں نئے آدمیوں کو بھرتی کیا اور سلطان سے چندیری پر حملے کی اجازت لے کر کڑہ آیا۔ وہاں اس نے اپنے ایک نائب علاء الملک کو متعین کر کے اسے ہدایت دی کہ کوئی ایسی کارروائی نہ ہو جو بادشاہ کی ناراضگی کا باعث بنے۔ پھر وہ کڑہ سے چل کر ایلچ پور آیا لیکن یہاں بجائے چندیری کے دیوگڑھ کے راستے پر روانہ ہو گیا۔

دکن کی فتح

چند دن تک بادشاہ کو علاء الدین کی کوئی خبر نہیں ملی جس کی وجہ سے وہ بڑی تشویش اور فکر میں مبتلا رہا۔ ایک عرصے بعد خبر آئی کہ علاء الدین نے دیوگیر اور تقریبا سارے دکن کو فتح کرلیا ہے اور وہاں سے وہ بہت مال و دولت، ہزاروں گھوڑے، ہاتھی اور تحائف و اسباب لے کر کڑہ واپس آرہا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن لوگوں کو گمان تھا کہ علاء الدین نے اپنی ساس اور بیوی کے ہاتھوں بہت رنج اٹھایا ہے اور وہ دیوگڑھ بغیر اجازت کے ہی چلا گیا تھا۔ اب اس کے پاس کافی مال و اسباب بھی جمع ہوگیا ہے ممکن ہے وہ کوئی فتنہ برپا کرنے کی فکر میں ہو لیکن کسی کو جرأت نہیں تھی کہ بادشاہ کے سامنے ان اندیشوں کو ظاہر کرے، نہ بادشاہ کو ہی اطلاع تھی کہ اس کو ساس اور بیوی کے خلاف اتنا شدید رنج ہے۔ وہ اس کے خلاف جب بھی کچھ کہتی تھیں بادشاہ ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتا اور ٹال دیا کرتا تھا۔

علاء الدین کی واپسی

جس وقت بادشاہ کو علاء الدین کی واپسی کی خبر ملی تو وہ گوالیار میں تھا۔ اس نے امراء کی مجلس مشاورت طلب کی اور ان سے کہا کہ علاء الدین اس شان وشوکت کے ساتھ آرہا ہے اب ہم چندیری کے راستے پر آگے اس کا استقبال کریں یا اس سے اسی جگہ ملیں یا دہلی واپس چلے جائیں۔

ملک احمد چپ جلال الدین کا نہایت خیر خواہ اور دانش مند وزیر تھا۔ اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ میری رائے میں تو یہی مناسب ہے کہ سلطان مع لشکر چندیری کی طرف کوچ کرے اور علاء الدین کو راستے ہی میں روک سکے اور جو کچھ ساز و سامان وہ لے کر آرہا ہے اس سے لے لے اور اتنی قوت رہنے نہ دے کہ وہ بغاوت کا خیال کرسکے، اس نے اپنی تائید میں ملک چھجو کی سرکشی کا بھی حوالہ دیا لیکن بادشاہ نے اس کی تجویز نہیں مانی اور یہی کہتا

رہا کہ علاء الدین میرے ہی نمک کا پروردہ ہے اور میں نے ہی اسے اس بلند مرتبے پر پہنچایا ہے، میں نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی کہ جو وہ کسی فاسد خیال کو اپنے دل میں جگہ دے۔ بعض امیر بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے حالانکہ احمد چپ کی رائے نہایت معقول اور دوراندیشی پر مبنی تھی۔ ملک احمد نے جب مجلس کا یہ رنگ دیکھا تو وہ غصہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ ''اگر خدانخواستہ علاء الدین کڑے میں آنے کے بعد سریوندی عبور کر کے لکھنوتی کا ارادہ کرے تو میں کسی میں بھی یہ جرات نہیں پاتا کہ اس کو روک سکے''۔ بہرحال بادشاہ اس خطرے کا اندازہ نہیں کر سکا جس کو احمد چپ بھانپ چکا تھا اور وہ وہاں سے کوچ کر کے دہلی چلا گیا۔

علاء الدین کی سازش

علاء الدین نے کڑے میں پہنچ کر بادشاہ کو متعدد عرضیاں لکھیں اور بہت سے ہاتھی اور تحائف روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی لکھا کہ اگر میری طلبی کا فرمان صادر ہو تو حاضر ہو کر باریابی کا شرف حاصل کروں۔ لیکن ان سب باتوں سے اس کی غرض صرف یہ تھی کہ اسے کچھ مہلت مل جائے۔ اس عرصے میں اس نے لکھنوتی جانے کی تیاریاں پوری کر لیں اور اپنے چھوٹے بھائی ظفر خاں کو اودھ رخصت کر دیا کہ وہ سریوندی میں کشتیاں تیار رکھے۔

جلال الدین کا پھنسنا

سادہ لوح بادشاہ نے حسب تحریر عماد الملک اور ضیاء الدین دو سرداروں کے ذریعے حاضری کا فرمان ارسال کیا۔ علاء الدین نے ان کو فوراً ہی حراست میں لے کر قید میں ڈال دیا۔ اپنے دوسرے بھائی الماس بیگ کو جو دہلی میں تھا ایک خط لکھا کہ ''میں نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دیوگیر پر حملہ کیا تھا اس کو بہانہ بنا کر لوگوں نے بادشاہ کو مجھ سے بدظن کر دیا ہے حالانکہ میں ان کا ویسا ہی فرمانبردار فرزند اور غلام ہوں اگر وہ خود تنہا آ کر مجھے لے

جائیں تو میں اطاعت کے لیے موجود ہوں اور اگر بادشاہ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا ہے اور وہ اس کو صحیح سمجھتے ہیں جو لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے تو میں مایوس ہو کر جس طرف سینگ سمائیں گے چلا جاؤں گا پھر میرا پتہ تک نہیں ملے گا" الماس بیگ نے یہی خط بادشاہ کو سنادیا۔ بادشاہ نے اسی وقت الماس بیگ کو علاء الدین کے پاس روانہ کر دیا اور کہا کہ تم چلو میں بھی پیچھے آ رہا ہوں۔ الماس بیگ کشتی کے ذریعے ساتویں دن علاء الدین کے پاس پہنچ گیا، اس کو لکھنوتی چلے جانے کا مشورہ دیا لیکن بعض ہوشیار خیر خواہوں نے کہا کہ لکھنوتی جانے کی کیا ضرورت ہے؟ دیوگڑھ کے ہاتھیوں، گھوڑوں اور مال و اسباب کا لالچ بادشاہ کو اسی برسات میں یہاں کھینچ لائے گا، اس وقت وہ تمہارے قابو میں ہوگا، جو چاہو اس سے سلوک کرو۔ ان کا یہ خیال ٹھیک تھا۔ سلطان جلال الدین کی قضا اسے کشاں کشاں اپنے بھتیجے کے پاس کھینچ لائی اور مال کی لالچ میں اس نے آگے پیچھے کا کوئی خیال نہیں کیا اور اپنے سرداروں کے ساتھ ایک ہزار سوار لے کر کڑے کی طرف کوچ کر دیا۔ ملک احمد چپ کو خشکی کے راستے لشکر لے آنے کا حکم دیا۔ احمد چپ نے بادشاہ کو اس ارادے سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور وہ بڑی تیزی سے کوچ کرتے ہوئے رمضان کی سترہ تاریخ کو کڑہ پہنچ گیا۔

سلطان جلال الدین کا قتل

علاء الدین کڑے اور مانک پور کے درمیان گنگا میں اتر کر اپنی فوج کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ جب بادشاہ کے قریب آنے کی خبر سنی تو اس نے الماس بیگ کو بادشاہ کے لیے کچھ جواہر نذرانہ دے کر بھیجا کہ کسی تدبیر سے وہ اسے تنہا لشکر میں لے آئے۔ مکار الماس بیگ نے بادشاہ کے پاس جا کر بڑی چاپلوسی کی باتیں کیں اور کہا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو علاء الدین تو ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا کیوں کہ دشمنوں نے آپ کی طرف سے اسے بہت بدگمان کر دیا تھا، میں نے بہت کچھ اس کی دل جمعی کر دی ہے لیکن آپ کی ہیبت اس کے دل پر اس طرح چھائی ہوئی ہے، حضور سے التماس ہے کہ شفقت و عنایت کا اظہار کریں اور تنہا جا کر اس کا ہاتھ پکڑ

کر لے آئیں۔ بادشاہ کی تو عقل پھر چکی تھی وہ ان جھانسوں میں آ گیا اور ایک ہزار سواروں کو وہیں چھوڑ کر چند مسلح محافظوں کو لے کر الماس بیگ کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دور جانے کے بعد الماس بیگ نے پھر عرض کی میرا بھائی اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ جب حضور کے ساتھ ان ہتھیار بند آدمیوں کو دیکھے گا تو دہشت کے مارے بھاگ جائے گا۔ بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو ہتھیار کھول دینے کا حکم دیا۔ حالاں کہ لوگوں پر یہ بہت گراں گزرا لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔ جب آگے بڑھے تو ایک بڑے لشکر کو وہاں صف آرا پایا۔ محافظ سرداروں نے الماس بیگ سے کہا آخر یہ کیا معاملہ ہے تم نے ہم سے ہتھیار رکھوا لیے اور یہاں یہ فوج لڑائی کے لیے مستعد دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے کہا اندیشہ نہ کرو اصل میں بھائی مع لشکر کے بادشاہ کو سلامی دینا چاہتے ہیں تاکہ ساری فوج حضور کے ملاحظے سے گزر جائے۔ ان باتوں پر بھی بادشاہ نہیں چونکا۔ اس کو نہ معلوم کیوں ایسا اعتماد تھا کہ وہ کسی وہم میں نہ پڑا اور چلتا رہا۔ اس طرح جب کافی مسافت طے ہو گئی تو بادشاہ نے الماس بیگ سے کہا "میں بوڑھا آدمی یہاں تک چلا آیا اور تیرے سنگ دل بھائی کو اب تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ کسی کشتی میں بیٹھ کر میرے پاس آجاتا"۔ اس نے عرض کیا کہ "وہ آپ کے حضور خالی ہاتھ کیسے آئے، وہ تو اس وقت پیش کش اور نذرانوں کی ترتیب اور ہاتھی گھوڑوں کے انتخاب میں مشغول ہوگا"۔ بادشاہ نے اس وقت قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی اور عصر کے وقت تک کشتی دوسرے کنارے پہنچی۔ بادشاہ کشتی سے اتر کر جب مقررہ مقام پر پہنچا تو علاء الدین اپنی جمعیت کے ساتھ آگے بڑھ کر آیا اور حکمران چچا کے قدموں میں گر گیا۔ بادشاہ نے اسے اٹھایا اور مسکرا کر محبت سے اس کے رخساروں پر ایک طمانچہ مارا اور اسے نصیحتیں کیں اور اپنے شوق ملاقات کا حال بیان کیا۔ وہ تسلی آمیز باتیں کرتے ہوئے اس کا منہ چومتا جاتا اور اپنے قریب کھینچتا جاتا تھا۔ اسی عالم میں بدبخت بھتیجے نے بادشاہ کا پنجہ زور سے پکڑ لیا اور اپنے آدمیوں سے جو پہلے سے تیار کھڑے تھے اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر محمود سالم ایک کمینے شخص نے جو سامانہ کا رہنے والا تھا بادشاہ پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بادشاہ زخمی ہو کر کشتی کی طرف بھاگا اور کہا علاء الدین نامراد یہ تو نے کیا کیا؟ اتنے میں اختیار الدین نے جو بادشاہ کا پروردہ تھا پیچھے سے ایسا کاری ہاتھ

مارا کہ اس کا کام تمام ہوگیا اور سر کاٹ کر علاء الدین کے پاس لے آیا۔ اس کے حکم سے بادشاہ کا سر ایک نیزہ پر چڑھا کر کڑے اور مانک پور میں گھمایا گیا۔ اس کے بعد بریدہ سر کو اودھ بھیج دیا گیا بادشاہ کے تمام ساتھیوں کو بھی وہیں قتل کر دیا گیا، ان میں سے کچھ دریا میں کود کر ڈوب گئے۔ ملک فخر الدین کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

قدر خان کی تخت نشینی

جب احمد چپ کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً دہلی لوٹ گیا۔ ارکلی خان جو بادشاہ کا بڑا بیٹا اور تخت کا وارث تھا ان دنوں ملتان میں تھا۔ احمد چپ نے اس کا انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور چھوٹے شاہزادے قدر خان کو سلطان رکن الدین ابراہیم کا خطاب دے کر ملکہ جہاں کے تعاون سے تخت نشین کر دیا۔ مرحوم سلطان کے تمام امراء نے بھی قدر خان کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور مبارک باد دی۔ لیکن قدر خان کی بادشاہت برائے نام رہی۔

دہلی پر قبضہ

علاء الدین نے اسی دن جس دن کہ جلال الدین شہید ہوا تھا چتر شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا اور بارش کے باوجود وہ دن رات دہلی کی جانب بڑھتا رہا اور دہلی پہنچا۔ راستے میں اس نے کافی اشرفیاں اور دوسرے قیمتی سامان لوگوں میں خیرات اور انعام کے طور پر تقسیم کیے۔ جب وہ بدایوں پہنچا تو اس کے لشکر میں ساٹھ ہزار سوار تھے۔ ملک رکن الدین چونکہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ ارکلی خاں کے پاس ملتان چلا گیا۔

علاء الدین نہایت اطمینان کے ساتھ دہلی پہنچ گیا[31] وہاں اس نے جمنا کے کنارے ایک باغ میں قیام کیا۔ قدیم امراء اور سردار روپے کے لالچ میں اس سے آ کر مل گئے۔

عہد جلال الدین کے شعرا

سلطان جلال الدین کی شہادت کا حادثہ 17/ رمضان 694ھ/ 1295ء کو پیش آیا۔ سات سال اس نے سلطنت کی مرحوم سلطان کو شعروسخن کا بھی خاصا ذوق تھا۔ سلطان معز الدین کے قتل کے بعد امیر خسرو کو اس نے اپنی مجلس میں شریک کرلیا تھا۔ بادشاہ کا مصحف ان کی تحویل میں رہتا تھا اور ہر سال ان کو ایک بھاری خلعت ملتی تھی۔ اس کے ندیموں میں امیر حسن، مؤید امیر ارسلان کاتبی، سعد منطقی اور قاضی خطیب جیسے صاحب علم و ادب لوگ شامل تھے۔ اسی عہد کے سب سے بڑے عالم قاضی مغیث بانسوی تھے۔

جن کی ایک غزل بہت مشہور ہے۔ یہ غزل فن غزل گوئی کا ایک نادر نمونہ تھی اسے انیس بحروں میں پڑھ سکتے تھے۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

رو ذر گوش وقد خوش دو خد خوب وخط تر
فرتو فری پری وپری وبا کز وفر

سلطان جلال الدین خود بھی شعر کہتا تھا۔ اس کا نمونہ کلام درج ذیل ہے:

آن زلف پریشانت ژولیده نمی خواہم
وآن روئی چو گلنارت تفسیده نمی خواہم
بی پیر منت خواہم یک شب بکنارآئی
جان بانمک بلندست این پوشیده نمی خواہم

سلطان نے جس زمانہ میں گوالیار کا محاصرہ کیا تھا تو وہاں اس نے ایک بڑا گنبد تعمیر کرایا تھا اس کے کتبہ کے لیے خود ہی یہ رباعی کہی تھی:

ماراکہ قدم بہ سرگردون ساید
از تودۂ سنگ و گل چہ قدر افزاید
این سنگ شکستہ زان نہادم درست
باشد کہ دل شکستہ آساید

سلطان نے اس رباعی کو ہم نشیں شاعروں، خاص طور پر سعد منطقی کو سنا کر اس پر تنقید و جرح کرنے کا حکم دیا۔ سب نے بے حد تعریف کی اور کوئی غلطی نہیں بتائی۔ سلطان نے کہا تم لوگ میرا پاس ولحاظ کر رہے ہو اس رباعی کے عیب میں خود ایک دوسری رباعی میں ظاہر کر دیتا ہوں:

باشد کہ درین جا گزر کس باشد
کس خرقہ روائی چرخ اطلس باشد
شاید کہ زمین قدم میروزش
یک ذرہ بہار سعد عمان بس باشد

سلطان علاء الدین خلجی

سلطان علاء الدین خلجی دہلی میں 32 ذی الحجہ 695ھ / 1296ء کو جلوہ افروز ہوا۔ تخت نشینی کی رسم سلطان کے بھائی الماس بیگ کی تائید و اتفاق سے انجام پائی۔ سلطان نے الماس بیگ کو الغ خاں، اپنے سالے سنجر کو جو میر مجلس تھا الپ خاں، ملک نصرت جلیسری کو نصرت خاں اور ملک جدرالدین کو ظفر خاں کا خطاب دیا۔

تخت نشینی کے بعد سلطان نے ایک میدان میں لشکر کا خیمہ لگوایا اور وہاں دربار عام منعقد کر کے عوام و خواص سب کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ اس مجلس میں سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امیر اور سرداروں کو مناسب جاگیریں عطا کی گئیں۔

ملتان کی مہم

جب پایۂ تخت کا بندوبست بحسن وخوبی ہو گیا تو سلطان نے سب سے پہلے سلطان جلال الدین کے بیٹوں کی سرکوبی کی طرف توجہ کی اور 696ھ / 1297ء میں الغ خان اور الپ خاں کو بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کرکے ارکلی خاں اور سلطان رکن الدین کے مقابلے کے لیے بھیجا، یہی مہم ملتان کی مہم کہلاتی ہے۔ دونوں شہزادے ملتان کے قلعے میں بند ہو گئے۔ بادشاہی لشکر نے شہر پر حملہ کردیا لیکن کوتوال شہر اور باشندوں نے امان طلب کرکے صلح کرلی۔ شہزادوں میں بھی مقابلے کی تاب نہیں تھی اس لیے انھوں نے بھی شیخ رکن الدین قریشیؒ کو ذریعہ بنا کر مصالحت کی درخواست کی اور الغ خاں کے پاس آگئے۔ الغ خاں نے نہایت عزت وتوقیر کے ساتھ ان سے ملاقات کی اور فتح کی خوشخبری دہلی کے لیے روانہ کردی اور خود بھی اسیر شہزادوں کو لے کر دہلی کی طرف چلا۔ جب وہ ضلع ہانسی میں بجوہر گاؤں پہنچا تو نصرت خاں اس کے نام ایک شاہی فرمان لے کر آیا جس کے حوالے سے الغ خاں نے دونوں شہزادوں اور مرحوم سلطان کے مغل داماد الغو بیگ اور دانش مند وزیر ملک احمد چپ کو اندھا کردیا۔ ارکلی خاں کے دونوں بیٹوں کو قتل کرادیا اور دونوں شہزادوں کو ہانسی کے کوتوال کی حراست میں دے کر باقی اسیروں کو مع اہل وعیال دہلی روانہ کردیا۔ سلطان نے الغو مغل اور احمد چپ کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا اور دوسروں کو دہلی ہی میں قید رکھا۔ اس زمانے میں اور دوسرے بہت سے قدیم امراء کو بھی اندھا کردیا گیا اور کچھ کو جلا وطنی کا حکم دیا گیا۔ غرض سلطان جلال الدین کا سارا خاندان دیکھتے ہی دیکھتے تباہ وبرباد ہو گیا اور اس طرح قدرت نے حق پسند درویش سیدی مولہ کے خون کا بدلہ پوری طرح چکا دیا۔

697ھ / 1298ء میں نصرت خاں منصب وزارت پر مامور ہوا۔ اس نے لوگوں سے وہ سارے انعامات بڑی سختی کرکے واپس لے لیے جو علاء الدین نے ابتداء میں تالیف قلب کے لیے عطا کیے تھے۔ اس طرح سرکاری خزانہ میں بے انتہا روپیہ داخل ہو گیا۔ علاء الملک [33] جو دہلی کا کوتوال تھا۔ سلطان نے اسے کڑے کی حکومت عطا کرکے روانہ کردیا تھا

لیکن دوبارہ اسے کڑہ سے بلا کر اس کے قدیم عہدہ پر فائز کر دیا۔ ملتان کا علاقہ الپ خاں کو بطور جاگیر ملا۔

مغلوں کا پہلا حملہ

698ھ/1299ء میں مغلوں نے چتلا نامی مغل سردار کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ سندھ سے آگے تک بڑھ آیا۔ سلطان نے اس کے مقابلے کے لیے الغ خاں اور تغلق خان غازی الملک کو جو دیپال پور کا حاکم تھا، روانہ کیا۔ شاہی لشکر کی مغلوں سے جارت منجھور کے علاقے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخرکار مغلوں کو شکست ہوئی اور کئی ایک مغل میدان میں مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے اور شاہی لشکر مال و غنائم لے کر فاتح اور کامیاب واپس آیا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ

مغلوں کا دوسرا حملہ قتلغ 34 خواجہ ولد سلطان داؤد کی قیادت میں ہوا۔ خواجہ ماوراء النہر سے فتح اور کامیابی کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ دہلی کی سرحد تک آ پہنچا۔ حملہ آوروں نے مضافات اور دیہات میں کسی قسم کی غارت گری نہیں کی۔ البتہ دہلی کی پوری طرح ناکہ بندی کر دی جس کی وجہ سے شہر میں غلہ کی کمی ہو گئی اور گرانی کے سبب لوگ تنگ آ گئے۔ سلطان نے حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے الغ خان اور ظفر خان کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ آمادہ کیا اور دہلی کی سرحد پر لڑائی ہوئی۔ اس معرکہ میں ظفر خان 35 مارا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی ہلاکت خود سلطان کی مرضی کے مطابق ہوئی۔ قتلغ خواجہ شکست کھا کر خراسان بھاگ گیا اور وہیں انتقال کیا۔

مغلوں کا تیسرا حملہ

تیسری بار مغلوں نے ترغی مغل کی قیادت میں جو بڑا ماہر تیرانداز تھا ہندوستان پر حملہ کیا۔ ترغی کی کمان میں ایک لاکھ پیادہ اور بیس ہزار سوار تھے وہ کوہستانی علاقوں کو فتح کرتا ہوا قصبہ برن تک آپہنچا۔ برن کا حاکم ملک فخرالدین امیردار قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان نے اس کی مدد کے لیے ملک تغلق غازی الملک کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ جس وقت شاہی لشکر وہاں پہنچا تو ملک فخرالدین بھی قلعے سے نکل کر اس سے آملا دونوں نے مل کر رات کو مغل فوج پر چھاپہ مارا۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ مغل بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ترغی کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

مغلوں کا چوتھا حملہ

علاء الدین کے عہد میں مغلوں نے چوتھی بار خراسان کے شہزادوں محمد تریاق اور تغی بیگ کی قیادت میں ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ اس مرتبہ مغلوں نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کا ایک لشکر ناگور کی طرف بڑھا اور دوسرا سرمور کے پہاڑوں کو فتح کرتے ہوئے بیاہ یعنی کالی ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ سلطان نے ملک مانک غلام اور حاکم دیپال پور ملک تغلق کو ان کے مقابلے پر امروہہ کی جانب روانہ کیا۔ مغل غنیمت میں ملا ہوا کافی مال و اسباب لیے ہوئے رحب ندی کو عبور کر رہے تھے کہ ملک مانک نے ان پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اس موقعے پر بڑی خوں ریز لڑائی ہوئی۔ دونوں مغل شاہزادے خوب جم کر لڑے اور انھوں نے بڑی بہادری دکھائی۔ لیکن وہ گرفتار ہو کر قتل ہوئے اور ان کا ایک بڑا لشکر گاجر مولی کی طرح کٹ گیا، جو بچے وہ جان بچا کر اپنے ملک کو بھاگ گئے۔ دونوں شہزادوں کے سر قلعہ بدایوں کے کنگرے پر لٹکا دیے گئے۔ [36]

کسی شاعر نے اس موقعے پر بدایوں کے جنوبی دروازہ پر یہ قطعہ لکھ دیا:

ای حصن کہ تائید خدا یار تو باد
فتح و ظفر شاہ عالم دار تو باد
از نو ملک زمانہ معمار تو شد
ترغی چو علاء بیگ گرفتار تو باد

مغلوں کا پانچواں حملہ

مغلوں نے پانچویں بار دیک نامی مغل سردار کی قیادت میں حملہ کیا۔ دیک دونوں شہزادوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک بڑا لشکر لے کر ملتان کی طرف آیا۔ سلطان نے اس بار بھی ملک نائک اور ملک تغلق کو ہی ان کے مقابلے پر بھیجا۔ شاہی لشکر عین اس وقت جب کہ مغل ملتان کو لوٹ کر واپس جا رہے تھے ان کے سر پر جا پہنچا۔ اور ایسا بھر پور حملہ کیا کہ مغل سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ لشکر نے ان کا پیچھا کر کے کئی ایک مغل سرداروں اور دیک کو گرفتار کر لیا۔ کافی مال غنیمت جس میں ملتان کی لوٹ بھی شامل تھی شاہی لشکر کے ہاتھ آیا۔ اس شکست کے بعد مغل ایسے پست ہوئے کہ پھر ہندستان کی جانب رخ کرنے کی ان کی جرات نہ ہوئی۔

شراب کی ممانعت

فتح کی بنیاد پر پورے ہندستان پر سلطان علاء الدین کا رعب چھا گیا اور ملک کی سرحدیں بھی محفوظ ہو گئیں۔ سلطان نے ان فتوحات کی خوشی میں شاہی جشن منعقد کیا اور رات بھر شراب اڑانے کی محفل آراستہ کی۔ اس رات جب کافی دیر ہو گئی تو اہل مجلس اٹھنے کے لیے ایک دوسرے کو اشارہ کرنے لگے۔ سلطان جو شراب کے نشے میں مدہوش ہو رہا تھا اس کو یہ گمان ہوا کہ لوگ میرے قتل کے لیے اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر "غدر غدر" چلانے لگا اور اپنے محافظوں کو قاضی بہار کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا۔ قاضی بہار سلطان کا

نہایت چہیتا اور رازدار تھا۔ اسی وقت سب لوگ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔ جب صبح ہوئی اور بادشاہ کے ہوش ٹھکانے آئے تو اسے خیال آیا کہ رات میں اس نے خواہ مخواہ بدگمانی کی تھی چنانچہ اس نے قاضی بہار کو بلوا بھیجا۔ خدام نے عرض کیا وہ تو اسی وقت قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ سن کر سلطان کو سخت صدمہ ہوا اور ایسی پشیمانی ہوئی کہ اس نے اسی وقت شراب سے توبہ کی اور منادی کرادی کہ پوری مملکت میں کسی جگہ بھی شراب فروخت نہ کی جائے۔ شاہی محل میں جتنے بھی شراب کے ذخیرے تھے سب بہا دیے گئے۔ اس حکم کے بعد جو بھی حالت مستی میں پایا جاتا اسے سزا دی جاتی تھی۔ میخانے بند ہو گئے اور محتسبوں کی بن آئی، زہد وتقویٰ کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔

697ھ/1298ء میں نومسلم مغلوں نے بغاوت کا ارادہ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری افسران نے ان سے سرکاری روپے اور سلطان کے دیے ہوئے انعامات واپس لینے میں بڑی سختی کی۔ تنگ آکر انھوں نے طے کیا کہ جس دن سلطان شکار میں مصروف ہو وہ غدر برپا کر دیں گے۔ سلطان کو ان کے ارادوں کا علم ہوا۔ اس نے خفیہ احکام جاری کر دیے کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو جو بھی مغل نظر آئے قتل کر دیا جائے، چنانچہ مقررہ دن پورے ہندستان میں بیچارے یہ پردیسی نومسلم اس قدر قتل ہوئے کہ شمار سے باہر ہے۔

علاء الدین کی خام خیالی

دنیاوی کامیابیاں انسان کو اپنے متعلق ایسی ایسی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ آسمانوں کی پرواز کرنے لگتا ہے۔ علاء الدین کو بھی جب لگاتار کئی کامیابیاں ملتی گئیں اور سارا ملک اس کی حکمرانی کے ماتحت آگیا تو وہ بھی طرح طرح کے خیالی پلاؤ بنانے لگا۔ ایک تو یہ سوجھی کہ دین محمدی کی طرح ایک اور دین ایجاد کرے۔ اس نے خلفائے اربعہ کی طرح الغ خاں، الپ خان، ظفرخان اور نصرت خان کو چار خلفاء بنانا بھی طے کر لیا۔ دوسرا یہ خبط سوار ہوا کہ سکندر کی طرح تمام دنیا کو فتح کر لے۔ چنانچہ اس نے خطبہ میں اپنے نام کے ساتھ سکندر ثانی پڑھنے کا حکم دے دیا۔ لیکن خدا نے اسے گمراہی سے بچالیا۔ سلطان نے ان

دونوں باتوں کے لیے علاء الدین کوتوال شہر سے مشورہ کیا، علاء الملک دانا آدمی تھا، اس نے ان دونوں باتوں سے منع کیا کہ دین کسی بندے کے ایجاد کرنے سے نہیں بن جاتا یہ تو صرف اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے، پھر اس کے ساتھ معجزوں کا ہونا بھی ضروری ہے بغیر اس کے صرف دولت اور قوت کے زور سے دین کو بدل دینا ممکن نہیں، ایسے کسی اقدام سے تو طرح طرح کے فتنے پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے جن کے نتیجے میں سوائے رسوائی اور پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ البتہ ملک گیری کا ارادہ نہایت معقول اور مناسب ہے لیکن نہ سکندر سا ساز و سامان میسر ہے، نہ ارسطو جیسا وزیر، آپ اگر ہندستان کے قلعوں کو کافروں سے اور دہلی کے علاقے کو سرکشوں سے پاک کردیں تو یہ کارنامہ سکندر کی جہانگیری سے کم نہ ہوگا۔ علاء الدین نے ان کی باتوں پر غور وخوض کرنے کے بعد حالات کی نزاکت کے تحت مشورہ کیا اور علاء الدین کو علاء الملک کا مشورہ پسند آیا اور وہ اپنی ان خام خیالی سے باز آگیا اور خوش ہوکر علاء الملک کو خلعت اور انعامات عطا کیے۔ دربار کے دوسرے امراء جو بادشاہ کی ہیبت اور بدمزاجی کی وجہ سے خلاف مرضی کوئی بات کہنے کی جرات نہیں رکھتے تھے، وہ بھی علاء الملک کی اس بے باکی اور حق گوئی پر بہت خوش ہوئے اور اس کی بہت تعریف و تحسین کی اور اس کے پاس تحفے بھیجے۔ اسی سال بادشاہ نے دیوگیر[37] کو دوبارہ فتح کیا اور اس فتح کے نتیجے میں وہاں سے کافی مال غنیمت اور نفیس تحفے ہاتھ آئے۔

گجرات پر فوج کشی

698ھ / 1298ء میں سلطان نے گجرات کے راجہ کرن پر فوج کشی کے لیے الغ خان[38] کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ رائے کرن تیس ہزار سوار، اسی ہزار پیادے اور اور تیس ہاتھی لے کر مقابلے کے لیے آیا لیکن شاہی لشکر کے مقابلے میں اسے شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ الغ خان نے سرولا کو لوٹ لیا اور رائے کرن کا تعاقب کیا۔

وہ دیوگیر (دکن) کے راجہ رام دیو کے پاس جا کر پناہ گزین ہوگیا۔ اس کے اہل و

عیال اور گجرات [39] کا خزانہ مسلمانوں کو مال غنیمت کی شکل میں مل گیا۔ رائے کرن کی ایک بیوی دیول رانی نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ سلطان کا بڑا لڑکا خضر خان اس پر عاشق ہو گیا۔ خضر خان نے امیر خسرو سے اس عشقیہ داستان کو نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ انھوں نے ان دونوں کے عشق کی داستان کو بڑے عمدہ انداز میں نظم کی شکل دی ہے جو بہت مشہور ہے۔ الغ خان نہروالہ سے ایک بڑا بت جس کی ہندو بہت تعظیم کیا کرتے تھے دہلی لے آیا تھا، اس نے اس بت کو دہلی کی سڑک پر ڈال دیا تھا کہ راہ گیر اس کو پامال کریں۔

جس وقت رائے کرن شکست کھا کر بھاگا تھا۔ الغ خان اس کے تعاقب میں سومنات [40] تک گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اس مشہور بت خانے کو دوبارہ تباہ کر دیا اور وہاں ایک مسجد بنوائی۔

اس زمانہ میں نصرت خان کے کھمبایت [41] پر جو ساحل سمندر پر ایک مشہور بندرگاہ ہے، حملہ کیا۔ کھمبایت سے نصرت خان کو بے شمار مال و دولت لعل و جواہرات حاصل ہوئے۔ مشہور فاتح کافور ہزار دیناری بھی اس لڑائی میں گرفتار ہو کر آیا تھا جس نے ترقی کر کے سلطان کے نائب کی حیثیت اختیار کر لی۔

الغ خان جب گجرات فتح کر کے الور میں آیا تو اس نے فوجوں پر بڑی سختی کر کے مال غنیمت وصول کیا۔ اس کارروائی سے مغل لشکری بگڑ گئے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے لیکن الغ خان نے ان کو شکست دے کر سخت سے سخت سزا دی [42] اور انھیں منتشر کر دیا۔ ان میں سے کچھ مغل تو رنتھمبور کے قریب جھاین میں راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے اور الغ خان مسلسل کوچ کرتے ہوئے دہلی لوٹ آیا۔

رنتھمبور کا معرکہ

الغ خان نے 699ھ/1299ء نے رنتھمبور اور جھاین پر جو نوشہرہ کے نام سے موسوم ہے، حملہ کیا۔ یہاں کا راجہ رائے پتھورا کا پوتا ہمیر دیو تھا وہ دس ہزار سوار، بکثرت پیدل فوج اور بے شمار ہاتھی لے کر مقابلے کے لیے آیا لیکن اسے بری طرح شکست ہوئی وہ

اپنا مال و اسباب سمیت کر رنتھنبور کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔ الغ خان نے اس مہم کے متعلق تفصیلی رپورٹ دہلی روانہ کی اور سلطان کو رنتھنبور پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔

چتوڑ[43] کی فتح

سلطان علاء الدین نے الغ خان کے مشورے پر ایک بڑی فوج لے کر کوچ کیا اور تھوڑی مدت میں ہی اس قلعے کو بڑی آسانی سے فتح کر لیا اور ہمیر دیو کو قتل کروا دیا۔ اس قلعے سے مال و دولت کا ذخیرہ برآمد ہوا۔ سلطان نے اس کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ دار مقرر کیا اور جھاین کا علاقہ الغ خان کے حوالے کر کے چتوڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہی لشکر نے مختصر وقت میں چتوڑ کو فتح کر لیا۔ سلطان نے اس کا نام خضر آباد رکھا اور خضر خان لعل کو ایک چتر عطا کر کے چتوڑ کی سربراہی پر مامور کر دیا۔

شاہزادہ کی وفات

اس مہم میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ بادشاہ کی روانگی سے پہلے شاہزادہ نصرت خان نے الغ خان کی مدد کے لیے رنتھنبور کے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ایک دن قلعہ والے مورچوں پر سنگ باری کر رہے تھے کہ ایک پتھر نصرت خان کو لگا، جس کی چوٹ کی تاب نہ لا کر وہ مر گیا۔ اس سے پہلے ظفر خان کے مر جانے سے بادشاہ کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا۔ اب نصرت خان کے شہید ہونے کے بعد اس کا دوسرا بازو بھی کٹ گیا۔

علاء الدین خطرے میں

دوسرا واقعہ خود بادشاہ کے ساتھ پیش آیا۔ جب بادشاہ جھنت کے قصبے میں پہنچا تو وہ ایک مرتبہ ساری رات قمرغہ[44] میں مصروف رہا، دوسرے دن صبح فوجوں کو تقسیم کر کے مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔ اس وقت وہ ایک ٹیلے پر چڑھ کر فوجوں کی روانگی کا معائنہ کر رہا تھا۔

عین اس موقع پر اکت خان ان نومسلم مغلوں کو جو پہرہ پر متعین تھے، ساتھ لے کر بادشاہ پر حملے کے ارادے سے بڑھا۔ باغیوں نے تیر برسانے شروع کر دیے۔ بادشاہ کے بازو میں بھی ایک تیر لگا اور وہ زخمی ہو گیا لیکن خوش قسمتی سے موسم سرما کی وجہ سے روئی کا موٹا کوٹ پہنے ہوئے تھا اس لیے تیر زیادہ کارگر نہیں ہوا تاہم سلطان نیم جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اکت خان نے گھوڑے سے اتر کر چاہا کہ سلطان کا سر کاٹ لے تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے لیکن سرداروں نے اکت خان کا استقبال کرتے ہوئے دوستانہ باتیں کہیں اور عرض کیا بادشاہ کا کام تمام ہوا اب سر کاٹنے کی کیا جلدی ہے۔ اکت خان پس و پیش میں پڑ گیا اور سیدھا شاہی خیمے میں جا کر سلطان کے تخت پر بیٹھ گیا، کسی امیر نے کوئی عذر نہ کیا بلکہ سب نے نذرانے پیش کیے۔ اکت خان کم حوصلہ آدمی تھا۔ اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ اسی وقت شاہی حرم سرا میں گھسنے لگا۔ ملک دینار (کافور) اپنی جمعیت کے ساتھ پہرے پر تھا اس نے اسے روک دیا اور کہا جب تک تم بادشاہ کا سر نہ لاؤ گے میں اندر نہیں جانے دوں گا۔ ادھر علاء الدین کو جب ہوش آیا تو اس کی مرہم پٹی ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا کہ یقین امراء اکت خان سے مل گئے ہیں۔ ان کی موافقت کے بغیر اکت خان کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس وقت لشکر گاہ میں جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اب جو پچاس ساتھ ہمراہی رہ گئے ہیں ان کے ساتھ الغ خان کے پاس جھائن میں چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ لیکن بعض سرداروں نے اس کی تائید نہ کی اور اسے مجبور کر کے لشکر گاہ کی طرف لے چلے۔ ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ پچاس سوار اور آ کر بادشاہ کے ہمراہ ہو گئے۔ جیسے ہی اکت خان کو یہ خبر ملی کہ بادشاہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے، وہ حواس باختہ ہو کر افغان پور کی طرف بھاگ نکلا۔ لشکر والوں نے اس کا پیچھا کیا اور اسے گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے اس کے سارے کنبے کو قتل کر دیا۔ اس حادثہ میں اس کا بھائی قتلغ خان بھی مارا گیا۔ اسی زمانہ میں بادشاہ کے دو بھتیجوں عمر خان اور منگو خان نے بدایوں 45 میں بغاوت کی تو دو تین شاہی سردار وہاں جا کر ان دونوں کو پکڑ لائے۔ ان کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔

حاجی مولا کی بغاوت

محاصرہ رنتھنبور کے موقعے پر بھی ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا تھا۔ ملک الامرا کوتوال کے ایک غلام حاجی مولا نے چند فتنہ پردازوں کو ساتھ لے کر ایک سازش کی۔ وہ بادشاہ کا ایک جعلی فرمان لے کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بدایوں دروازے سے دہلی میں آیا اور وہ فرمان دکھا کر شہر کے کوتوال ترمذی کو قتل کر دیا اور شہر کے دروازے بند کر دیے پھر اپنے آقا علاء الملک کو جو قلعے کے کوتوال تھے کہلایا کہ بادشاہ کے پاس سے فرمان آیا ہے اسے آ کر پڑھو۔ علاء الملک ہوشیار آدمی تھا وہ اس کے پاس نہیں گیا۔ حاجی مولا نے کوشک لعل میں جتنے قیدی تھے سب کو رہا کر کے انھیں مسلح کر دیا اور انھیں شہر کے خزانے سے رقم دے کر اپنا موافق بنا لیا اور ایک علوی سید ہنسہ نامی کو جس کی ماں شمس الدین التمش کی اولاد میں سے تھی کوشک لعل میں تخت سلطنت پر بٹھا کر تمام امیروں سے جبراً نذر دلوائی۔ حاجی مولا کی ان سب حرکتوں کی خبر بادشاہ کو پہنچتی رہی لیکن اس نے سب خبروں کو راز میں رکھا اور پایہ تخت کے اس ہنگامے پر کچھ زیادہ پریشان نہ ہوا اور پوری دل جمعی کے ساتھ فوج کشی میں لگا رہا۔ حاجی مولا کی سرکشی کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ملک حمید الدین نے جو میر کوئی کے عہدہ پر فائز تھا اپنے بیٹے اور ظفر خان کے کچھ سواروں کو جو امروہہ 46 سے آئے تھے ساتھ لیا۔ یہاں تک ہم نے جو واقعات تحریر کیے ہیں تاریخ کی کتابوں میں ان کی سن بہ سن ترتیب قابل اطمینان نہیں ہے جس طرح لکھا ہوا تھا ہم نے اسی طرح بیان کر دیا۔

مالوہ پر حملہ

700ھ/ 1300ء میں سلطان نے عین الملک شہاب ملتانی کو ایک بڑی فوج کے ساتھ مالوہ فتح کے لیے روانہ کیا۔ مالوہ کی رانی کوکا نے چالیس ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ کی کثیر فوج کے ساتھ عین الملک شہاب ملتانی کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر وہاں سے بھاگ گئی۔ عین الملک نے رانی کے علاقے کو خوب لوٹا اور بہت زیادہ مال غنیمت لے

دارالسلطنت واپس آیا۔ اس واقعہ کو عین الملک نے نظم بھی کیا ہے:

بعین الملک اشارت کرد زاہرو
کہ تا آرد بسوئی مالوہ [47] رو

سورت کے قلعے پر حملہ

اسی سال بادشاہ شکار کے ارادے سے سورت [48] کی طرف گیا۔ سورت کے قلعے میں ایک فتنہ پرداز ستلایو نامی شخص نے ایک کثیر جمعیت فراہم کر کے ہنگامہ بپا رکھا تھا اور شاہی لشکر کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ سلطان نے سب سے پہلا شکار اس شخص کا کیا اور اسے گرفتار کر کے جہنم پہنچا دیا۔

دکن پر ملک کافور کا حملہ

701ھ / 1301ء میں چالدیو کے قلعے کو شاہی سردار کمال الدین گرک نے فتح کیا اور وہاں کے باغی کنہیر دیو کو قتل کرا دیا۔ 702ھ / 1302ء میں سلطان نے ملک کافور نائب کو کافی ساز و سامان اور بڑے لشکر کے ساتھ مرہٹوں اور تلنگوں کے وطن پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ ملک کافور نے وہاں سے کافی بڑا خزانہ، ہاتھی، گھوڑے، جواہرات اور قیمتی کپڑے مال غنیمت کی شکل میں حاصل کیے۔

وارنگل کا گھیرا

709ھ / 1309ء میں ملک کافور نے دوبارہ ارنگل [49] پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ اندر دیو کو شکست دے کر قیمتی ساز و سامان کا ذخیرہ، بہتر ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے اس سے بطور ہرجانہ لیے اور سالانہ خراج مقرر کیے اور پھر دوسرے علاقے کو اپنی گرفت میں کرتا ہوا

پورے دکن کے علاقے کو فتح کر لیا50۔

711ھ/1311ء میں ملک کافور دکن کی فتوحات سے فارغ ہو کر دہلی واپس پہنچا اور تین سو بارہ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے، 96 ہزار من سونا، جواہرات اور مروارید کے بے شمار صندوق اور ہر طرح کے مال و اسباب کے ذخیرہ بادشاہ کے سامنے لا کر رکھ دیے۔ ان فتوحات کا تذکرہ امیر خسرو نے اپنی کتاب "خزائن الفتوح" میں کیا ہے۔

سلطان علاء الدین کی ان پے در پے عظیم الشان فتوحات کو لوگ علاء الدین کی کرامت پر محمول کرنے لگے۔ بعض لوگ اسے جادوگر اور ساحر سمجھتے تھے اور بعض کو یہ یقین تھا کہ یہ ساری فتوحات شیخ نظام الدین51 اولیا کی برکت و دعا کا نتیجہ ہیں۔

جب مکمل ہندوستان دہلی سلطنت کے ماتحت ہو گیا اور سلطان ان تمام مہمات سے فارغ ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کرائیں اور ان کو علاحدہ علاحدہ علاقے جاگیر میں دے دیے۔ خضر خان کا نکاح اس کی محبوبہ دیول رانی کے ساتھ ہوا۔ امیر خسرو کی لکھی ہوئی مثنوی جو اس واقعہ کے متعلق ہے خضر خان کو سلطان نے "چتر اور دورباش" عطا کر کے اپنا ولی عہد بنایا اور اسے ہستنا پور کے علاقے میں بھیج دیا۔

علاء الدین کی علالت

کچھ عرصے کے بعد ہی سلطان علاء الدین بیمار ہوا۔ بڑھاپے نے اسے کمزور تو کر ہی دیا تھا۔ بہت جلد کئی بیماریاں لاحق ہو گئیں، یہاں تک کہ تپ دق کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ آخر زمانہ میں اس کے حواس جاتے رہے، مزاج میں چڑچڑاپن اور بدگمانی غالب آ گئی تھی۔

علاء الدین کا انتقال

خضر خان کو جب باپ کی علالت کی خبر ملی تو اس نے باپ کی صحت کے لیے منت مانی تھی۔ جب درمیان میں سلطان کو بیماریوں سے کچھ راحت ملی تو وہ ہستنا پور سے دہلی

بزرگوں کی زیارت کے ارادے سے نکلے پھر آیا اور اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا، حالانکہ وہ ان کا بہت زیادہ مشتاق تھا، ملک کافور کو خضر خان سے دلی عداوت تھی۔ اس نے اس کی آمد کو بادشاہ کے سامنے رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا اور کہا کہ اس کا ماموں الپ خان بھی گجرات سے اسی لیے آیا ہوا ہے کہ خضر خان کو بادشاہ بنا کر خود اس کا نائب بن جائے۔ سلطان اس کے جھانسے میں آگیا اور اسی وقت الپ خان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ملک کافور اور ملک کمال الدین گرگ نے اس بے گناہ کو شاہی قلعے میں لاکر بھیڑ کی طرح ذبح کر ڈالا۔ ملک کافور نے اب بادشاہ کو سمجھایا کہ ماموں کے قتل کی وجہ سے خضر خان ناراض ہوگا۔ اس لیے اب اس کو واپس جانے دینا مناسب نہیں، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ خضر خان امروہہ چلا جائے اور ہم جب تک نہ بلائیں وہ وہاں شکار میں مصروف رہے۔ خضر خان نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی۔ کچھ دن بعد اس نے باپ کے پاس عرضی لکھ کر معلوم کیا کہ آخر مجھ سے کون سا ایسا قصور ہوا کہ مجھے اس کی سزا دی جارہی ہے؟ عرضی بھیج کر وہ صاف دل بیٹا باپ سے ملنے بے اختیار چلا آیا۔ اسے دیکھ کر محبت پدری نے جوش مارا اور سلطان نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور اس کے رخساروں کا بوسہ لے کر ماں کے سلام کے لیے رخصت کیا۔ ملک کافور نے پھر بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اور اس کی طرف سے بدگمانی پیدا کرنے میں کامیاب ہوا، اسے باور کرادیا کہ خضر خان پھر بن بلائے بُرے ارادے ہی سے آیا ہے۔ بادشاہ کی عقل جاتی رہی تھی۔ وہ خضر خان سے دوبارہ بدگمان ہوگیا۔ آخر اسے اس کے بھائی شادی خان کے ساتھ گوالیار کے قلعے میں قید کرادیا۔ ان دونوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کے بعد ملک کافور نے چوتھے شاہزادے شہاب الدین کو جو خضر خان کا سوتیلا بھائی تھا ولی عہد بنا دیا اور اس سے اپنی نیابت کے لیے پختہ عہد کرالیا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد ہی سلطان نے اس دنیائے فانی سے منہ پھیر لیا۔ اس نے اکیس سال حکومت کرنے کے بعد 716ھ/ 1316ء میں رحلت کی۔

علاء الدین کہ از مہر علائی سکہ بزر زد
جہان بگرفت زیر زرکف دست زر افشانش
ز دور چرخ گشت آن سکہ دگرگون ولی آن زر
ہمانسان ماند درعالم کہ بینی دست گردانش

امیر خسرو اور امیر حسن

علاء الدین کے زمانے کے شاعروں میں امیر خسرو ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے علاء الدین کے نام پر پانچ کتابیں دو سال کے عرصے میں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ''خمسہ'' رکھا۔ خمسہ کی تکمیل 698ھ/1298ء میں ہوئی۔ اس میں ''مطلع الانوار'' کا حصہ دو ہفتے میں لکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں

سال کزین چرخ کہن گشتہ بود
از پس شش صد نود وہشت بود
از اثر اختر گردون خرام
شد بدو ہفتہ مہ کامل تمام

اپنی دوسری کتاب ''نغمات'' میں انھوں نے اپنے متعلق شیخ نظام الدین اولیاء کا قول نقل کیا ہے۔

''روز قیامت ہر کسی بہ چیزی نازد و ناز من بسوز سینۂ این ترک اللہ است''۔

خسرو کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

خسرو مسکن کوش براہ صواب
تات شود ترک خدائی خطاب

امیر خسرو کا انتقال 725ھ / 1325ء میں ہوا۔ ان کی قبر سلطان الاولیاء کے بائیں جانب ہے۔ مولانا شہاب معمائی نے قطعۂ تاریخ کہہ کر لوح قبر پر کندہ کرا دیا ہے:

میر خسرو 52 خسرو ملک سخن
آن محیط فضل و دریائی کمال
نثر او دلکش تر از ماء معین
نظم او صافی تر از آب زلال
بلبل دستان سرائی بی قرین
طوطی شکر مقال بی مثال
از پی تاریخ سال فوت او
چون نہادم سر بزانوئی خیال
شد عدیم المثل یک تاریخ او
دیگری شد طوطی شکر مقال

علاء الدین کے دربار کا دوسرا شاعر امیر حسن تھا۔ ان کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ جس سال سلطان محمد نے دہلی کو ویران کر کے دکن میں دوست آباد کو پایہ تخت بنایا تھا، امیر حسن کو بھی دولت آباد جانا پڑا تھا اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی قبر دولت آباد میں مرجع خاص و عام ہے۔

عارف جامی نے ان دونوں شاعروں کے متعلق کہا ہے:

آن دو طوطی کہ بو خیزی شان
بود در عقد شکر ریزی شان
عاقبت طعمۂ افلاک شدند
خلعۂ شان قفس خاک شدند

حواشی

1 دوآبہ گنگا اور جمنا کے بیچ کے علاقے کو کہا جاتا تھا یہ علاقہ میدانی تھا اور گنگا اور جمنا ندی کے ذریعہ لائی گئی زرخیز کالی مٹی سے اچھی فصل ہوا کرتی تھی یہ علاقہ غلہ اور حکمرانوں کے لیے وسیلہ آمدنی کی وجہ سے نہایت فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ آج کل کے اتر پردیش صوبہ کا بیشتر حصہ اسی دوآبہ میں آتا تھا۔

2 کہرام اور کیتھل موجودہ ہریانہ ریاست میں ہیں (مترجم)

3 آئین اکبری میں 180 میل لکھا ہے۔

4 صاحب طبقات ناصری کے مطابق یہ دونوں ملک شوالک کی جانب چلے گئے۔

5 صاحب طبقات ناصری لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ 656ھ / 1258ء میں رونما ہوا۔

6 حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر فرخ شاہ کابلی کے پوتے تھے۔ والد کا نام کمال الدین سلیمان تھا۔ شہاب الدین غوری کے عہد حکومت میں آپ کابل سے ملتان آئے تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کا انتقال اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے دو سال بعد ہوا تھا ان کا مقبرہ (پاک پٹن) پاکستان میں ہے شیخ مخدوم گنج شکر کے سن وفات کے بارے میں اختلاف

ہے۔ ملا بدایونی نے 656ھ/ 1258ء لکھا ہے اسی طرح شیخ بہاء الدین زکریا کا سن وفات بھی 657ھ/ 1259ء لکھا ہے مگر فرشتہ کے نزدیک شیخ بہاء الدین زکریا کا سن وفات 666ھ/ 1268ء تھا اور شیخ گنج شکر کا 668ھ/ 1270ء۔ آئین اکبری میں شیخ گنج شکر کا سن وفات 668ھ/ 1270ء لکھا ہے اور شیخ زکریا کا 665ھ/ 1267ء

7 اصلح، کے بجائے اجل ہونا چاہئے۔

8 تحصیل علی گڑھ میں واقع ہے۔ ایٹہ سے 22 میل شمال کی جانب پر ہے۔ مسمار قلعے کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ (امپریل گزیٹیر)

9 فرخ آباد ضلع میں ہے۔ مہا بھارت میں اکثر جگہوں پر اس کا ذکر آتا ہے۔ (امپریل گزیٹر)

10 بھوج پور۔ بہار میں واقع ہے۔ اجین کے راجا کی راجدھانی، آرہ کے مغربی جانب اور سہسرام سے شمالی جانب ہے۔ انگریزوں کے زمانہ تک کشتری رہا اب جدا ہو کر مختلف اضلاع میں تقسیم ہو چکا ہے۔

11 کاتہر۔ روہیل کھنڈ کا ایک ضلع۔ (تاریخ فیروز شاہی) (کٹھیر صحیح تلفظ ہے۔ مترجم)

12 یہ چالیس غلاموں کی ٹولی جسے "چہل گانی" بھی کہا جاتا ہے اور بعد میں اسی گروہ نے سیاسی حالات کو ایک نیا موڑ دینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

13 باغ سری۔ باغ سبز۔ باغ سرا ان تینوں میں تمیز کرنا مشکل ہے کہ صحیح نام کیا ہے؟ ممکن ہے وہی مقام ہو جو آج کل لاہور کے قریب ہے اور باداکی باغ کے نام سے مشہور ہے۔

14 ضیاء الدین برنی کے نزدیک یہ تاریخ 684ھ/ 1285ء ہے (تاریخ فیروز شاہی، تالیف برنی، ص، 9)

15 ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ یہ نثری مرثیہ امیر خسرو نے لکھا تھا۔ فرشتہ نے بھی

اس کی تائید میں لکھا ہے کہ امیر خسرو شہادت کے وقت خان شہید کے ہمراہ تھے مگر کسی وجہ سے اُن کی جان بچ گئی اس کے بعد انھوں نے یہ نثری مرثیہ کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "منتخب التواریخ" کے کاتب نے غلطی سے میر حسن کا نام لکھ دیا ہے ورنہ ملا بدایونی سے ایسی فاحش غلطی سرزد نہیں ہو سکتی تھی۔

16 یہ دونوں مرثیے ترکیب بند میں ہیں اور امیر خسرو کے دیوان "غرۃ الکمال" میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کا مطلع ہے۔

واقعہ است این یا بلا از آسمان آمد پدید
آفت است این یا قیامت در جہان آمد پدید

دوسرے مرثیے کا مطلع ہے:

ای دل بغم نشین کہ از شادی نشان نماند
وی غم جہان ستان کہ طرب در جہان نماند

امیر خسرو نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔

17 یہ وہی ملک نظام الدین ہیں جن کے نام سے "جامع الحکایات" اور محمد عوفی کا "تذکرہ شعرا" منسوب ہے۔

18 اس کی تعریف امیر خسرو نے "قران السعدین" میں کی ہے جس کا مطلع ہے:

خانگرہ مجو کشور کشائی
کزلب خانان گرہ بستہ بپائی

19 امیر خسرو کی "قران السعدین" اور تاریخ مبارک شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات اس قدر مصالحانہ پر امن ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ بغرا خاں ناصر الدین

بنگالہ سے دہلی پر فوج کشی کے لیے ایک بھاری لشکر لے کر آیا تھا۔ معزالدین اس کی مدافعت کے لیے اودھ پہنچا دونوں لشکر سریو ندی کے متقابل کے کناروں پر ٹھہر گیے۔ اس موقعے پر بلبن کے قدیم امیروں اور سرداروں نے بیچ میں پڑ کر باپ بیٹے میں صلح کرادی اور طے پایا کہ سلطان ناصرالدین دریا پار کر کے ملاقات کے لیے آئے۔ بیٹا تخت پر بیٹھے اور باپ تخت کے نیچے کھڑا ہوا اس طرح ایک دوسرے کی تعظیم کریں۔ حسب قرارداد جب ناصرالدین دریا اتر کر آیا تو معزالدین پر باپ کی ملاقات کا شوق ایسا غالب ہوا کہ وہ ننگے پاؤں اس کی طرف دوڑا اور چاہتا تھا کہ قدموں پر گر پڑے لیکن ناصرالدین نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ دونوں بغلگیر ہو کر دیر تک روتے رہے۔ باپ نے ہر چند چاہا کہ تخت کے نیچے کھڑا ہو لیکن بیٹے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔

20 ناصر الدین اپنے بیٹے سے رخصت ہو کر جب قیام گاہ پر پہنچا تو کھانا نہ کھایا اور مصاحبوں سے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ نہ تو یہ لڑکا زندہ و سلامت رہے گا اور نہ دہلی کا تخت (تاریخ فیروز شاہی)

21 تاریخ فیروز شاہی میں اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ عیاشی کی ناؤ میں اطراف و اکناف سے آ کر بہت سی خوش نفس اہل طرب لشکر کے ساتھ جمع تھیں۔ جب بادشاہ چلتا تو حسین و جمیل لڑکیاں ناز و ادا دکھا کر اس کو اپنی طرف مائل کرتی تھیں بادشاہ کا دل تو بہت کھنچتا تھا لیکن باپ کی نصیحتوں کے خیال سے جی مار کر رہ جاتا تھا۔ ایک دن جب سواری جا رہی تھی۔ ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی گھوڑے پر سوار چتر شاہی کے قریب پہنچ گئی اور بڑے ناز سے یہ شعر پڑھا۔

سرو سمنابہ صحرا میروی
نیک بد عہدی کہ بی ما میروی

بس سلطان کو ضبط نہ رہا اور اسی وقت شراب منگائی اور اس ماعرو کے بغل میں بیٹھا اور یہ شعر پڑھا:

شب زی توبہ کنم از ہم ناز شاہدان
بامرادان روی ساقی بازدرکار آورد

22۔ یہ وہی امیر ہے جو بعد میں جلال الدین خلجی کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

23۔ خلجیوں نے جب شاہزادہ شمس الدین کیکاوس کو تخت سے اتار کر گرفتار کر لیا تو اسی وقت معزالدین کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اسی حال میں بھوک پیاس کے صدمے سے وہ جاں بحق ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے یہ رباعی پڑھی تھی:

اسپ حزم بسر میدان ماندہ است
دست کرم در تہ سندان ماندہ است
چشم کہ زر و کان وزکرم دیدی
امروز برای نان چہ حیران ماندہ است

24۔ آخور بیگی۔ شاہی اصطبل اور رسالہ فوج کا سردار۔

25۔ تاجر اور دکاندار جب اپنے مال کی قیمت سیدی مولہ سے طلب کرتے تو وہ ان سے کہتے کہ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے اس قدر ٹنکے رکھے ہوئے ہیں لے لو۔ چنانچہ بتائے ہوئے مقام پر اسی قدر ٹنکے ان کو مل جاتے اور یہ ٹنکے ایسے نئے ہوتے تھے جیسے ابھی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہوں (تاریخ فیروز شاہی ص 209)

26۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ سیدی مولہ بادشاہت کی بنا پر ملک کو "دارالسلام" نہیں سمجھتے ہوں گے اور جو جگہ دارالسلام نہ ہو وہاں جمعہ فرض نہیں سمجھا جاتا کیوں کہ اہل سادات کے یہاں جمعہ فرض نہیں۔

27 صاحب تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے اس آندھی کو آتے دیکھا تھا۔

28 سلطان جلال الدین نے ملک چھجو اور دوسرے امراء کو رہا کرتے وقت بحوالہ تاریخ فیروز شاہی یہ کہا تھا کہ میں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا اگر بادشاہت کے لیے قتل و خون ضروری ہے تو میں مغل کافروں کے خلاف جہاد کیوں نہ کروں اور یہی وہ سلطان ہے جس نے اس حق پسند درویش اور اس کے بے گناہ ساتھیوں کے خلاف اس طرح کی سفاکانہ کارروائی کی۔

29 مغل حملہ آوروں کا سردار ہلاکو کا نواسہ عبداللہ تھا۔

30 یہ وہی جگہ ہے جہاں اب حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ ہے۔ اسے مغل پورہ بھی کہتے ہیں۔

31 جس وقت علاء الدین کے لشکر کے آنے کی خبر ہوئی تو ملکہ جہاں نو عمر بادشاہ رکن الدین اور چند وفادار امراء کو لے کر ملتان چلی گئی۔ علاء الدین نے بغیر کسی مزاحمت کے دارالسلطنت دہلی پر قبضہ کرلیا۔ (بحوالہ تاریخ فیروز شاہی)

32 یہ قدیم شہر قبل مسیح سے آباد ہے۔ سب سے قدیم علاقہ قطب صاحب کی لاٹ کے ارد گرد کا ہے۔ جو موجودہ پرانی دہلی یعنی شاہ جہاں آباد سے گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہندو راجاؤں کے آخری دور حکومت میں پرتھوی راج عرف رائے پتھورا کا دارالسلطنت نیز لال کوٹ کے نام سے مشہور تھا 589ھ/1193ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے رائے پتھورا کو شکست دے کر اس کو ہندوستانی مقبوضہ کا مرکز بنایا۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک اور اس کے جانشینوں کا دارالسلطنت رہا۔ لال کوٹ سے پہلے یہاں کی آبادی اندرپت کہلاتی تھی اور اسے اندر دیوتا کا استھان سمجھا جاتا تھا۔ اننگ پال کا پرانا قلعہ بھی اندرپت میں شامل تھا بعد میں اننگ پال تور دوم نے سمت 1109/ 1052ء لال کوٹ بسایا گیا تھا۔ لوہے کی لاٹ پر یہی تاریخ درج ہے۔ دہلی کا دوسرا قدیم مستقر تغلق

آباد، یہ قلعہ اور شہر قطب صاحب سے چار میل مشرق کی جانب متھرا کی سڑک کے قریب ہے یہاں غیاث الدین تغلق شاہ کا مقبرہ ہے اس مقبرہ میں سلطان محمد تغلق شاہ بھی دفن کیا گیا تھا۔ یہ شہر غیاث الدین تغلق شاہ کا آباد کیا ہوا تھا۔

دہلی کا تیسرا مرکزی مقام تغلق شاہ کے لڑکے سلطان محمد کا بسایا ہوا "شہر جہاں پناہ" تھا جو دہلی اور سیری کے درمیان تھا اس کے محل اور ہزار ستون کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔

چوتھا شہر سلطان علاء الدین کا بسایا ہوا تھا۔ جسے شہر سیری کہا جاتا ہے۔ یہاں سلطان نے قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ اس کو قلعہ علاول کہتے تھے۔ اس کے کھنڈر قطب کی جانب جاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

دہلی کی پانچویں صورت وہ بڑا شہر تھا جسے محمد تغلق نے دہلی اور سیری کو ایک شہر پناہ سے ملا کر تعمیر کرایا تھا۔ یہ علاقہ شمال اور مشرق کی طرف سے پہاڑیوں کی وجہ سے قدرتی طور پر حصار بند تھا۔ ابن بطوطہ نے اسی شہر کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہ نہایت وسیع اور عظیم الشان شہر بن گیا تھا۔

دہلی کا چھٹا مستقر فیروز آباد تھا۔ یہ شہر ہمایوں کے مقبرے سے موجودہ شہر کے شمال کی طرف پہاڑی تک پھیلا ہوا تھا جہاں فیروز شاہ کی لاٹ تھی (موجودہ ہندو راؤ ہسپتال تک) قلعے کا ایک حصہ تھا جسے فیروز شاہ نے بسایا تھا۔

ساتواں مرکز شاہ جہاں آباد ہے جسے شاہ جہاں نے ایک مرتبہ نقشہ پر تعمیر کرایا جس میں لال قلعہ اور جامع مسجد شامل ہیں۔

آٹھویں شکل نئی دہلی کی ہے جو انگریزوں کے عہد کا تعمیر کردہ شہر ہے۔ یہ سارے مقام اگرچہ الگ الگ ناموں سے آباد ہوئے لیکن سب کے سب دہلی ہی کہلائے۔ بلاشبہ یہ سارا علاقہ قدیم شان و شوکت کا بے مثل مرقع ہے۔

33 علاء الملک، ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے چچا تھے۔

34 ترکی میں "تغلغ" کے معنی "میانہ" درمیانی، یا "منجھلا" کے ہیں۔

35 ظفر خاں نہایت دلیر اور بہادر سپہ سالار تھا مغلوں پر اس نے بڑھ کر بھرپور حملہ کیا اور ایک ہی تاخت میں ان کو کافی دور تک پیچھے ہٹا دیا۔ جس وقت وہ ان کے تعاقب میں لگا ہوا تھا مغلوں کے ایک دستے نے پیچھے سے اسے گھیر لیا اس موقعے پر الغ خاں نے ظفر خاں سے دشمنی نبھائی۔ دشمنی کی وجہ سے سخت غداری کی اور بجائے آگے بڑھ کر ان حملہ آوروں کو روکنے کے اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ ظفر خاں نے آخری دم تک بہادری سے لڑتے ہوتے جان دے دی، اس کے مرنے کے باوجود مغلوں پر اس کے حملے کا ایسا خوف طاری تھا کہ وہ خراسان لوٹ گیے۔ (بحوالہ تاریخ فیروز شاہی)

36 امیر خسرو نے ملک نائک کی اس دلیرانہ لڑائی کا پورا حال اپنے رزمیہ "خزائن الفتوح" میں تحریر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ رزمیہ خسرو کی فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی اور سے ایسے کلام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

37 دیو گیر کو بعد میں دولت آباد کہا جانے لگا۔ یہ شہر موجودہ حیدرآباد میں واقع ہے۔ دولت آباد کا قلعہ ایک پہاڑ کی چٹان پر واقع ہے جس کا حصار پونے تین میل کا ہے۔ بالا حصار 21 فٹ بلند ہے، اس پہاڑ کی بلندی زمین سے چھ سو فٹ ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے وقت 1294ء میں یہاں یدو خاندان کا راجہ رام چندر تھا۔ علاء الدین جب نذرانہ لے کر لوٹ گیا اور دوبارہ راجہ نے بغاوت کی تو ملک کافور، بادشاہ کے سپہ سالار نے یہ قلعہ اور شہر فتح کیا۔ اس کے بعد راجہ کے بیٹے شنکر نے بغاوت کی تو ملک کافور نے تیسری بار اس کو فتح کیا کچھ عرصے بعد راجہ کے داماد ہرپال نے بغاوت کی تو مبارک خلجی نے اسے شکست دے کر زندہ جلوا دیا۔ 1328ء میں محمد شاہ تغلق نے دہلی کو اجاڑ کر اس شہر کو دار الخلافہ بنایا۔ دیو گیر دہلی سے پورے 800 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ محمد تغلق کے زمانے میں دکن کے خود مختار سرداروں نے دولت آباد پر قبضہ کر لیا تھا، پھر یہ صوبہ 1529ء تک بہمنی سلطنت کے ماتحت رہا۔ بہمنیوں کے زوال پر احمد نگر کے

نظام شاہی سلاطین قابض رہے ان سے یہ علاقہ عالم گیر اورنگ زیب نے چھین لیا۔ 1747ء میں یہ سلطنت آصفیہ دکن کا حصہ بن گیا۔ 743 ہجری میں ابن بطوطہ بھی اس جگہ گیا تھا۔ جس کی اطلاع ہمیں اُس کی تصنیف سے ملتی ہے۔

38 ترکی میں ''الغ'' کے معنی بڑے کے ہیں اور ''اکت'' کے معنی چھوٹے کے۔ اس زمانہ میں الغ خان ''امیرالامراء'' کے برابر کے عہدے پر فائز تھا۔ ناصرالدین محمود نے بلبن کو یہی خطاب دیا تھا۔ علاءالدین نے اپنے بھائی الماس بیگ کو اس عہدے پر فائز کیا تھا۔ محمد تغلق کو بھی اس کے باپ نے ''الغ خان'' کا خطاب دیا تھا۔

39 گجرات دریائے نربدا کے شمال میں سمندر کے کنارے کا علاقہ گجرات کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ نربدا سے صحرائے مارواڑ (جودھپور) تک وسیع تھا۔ اس کے مغربی حصے کا نام کاٹھیاواڑ تھا جو تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا تھا۔ اس پورے علاقے میں گجراتی زبان بولی جاتی تھی۔ گجرات کا وسطی میدان دریائے نربدا اور سابرمتی سے سیراب ہوتا تھا۔ کاٹھیاواڑ اپنی بندرگاہوں اور گھوڑوں کی تجارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس سرزمین کو ہندو مذہب کے عقیدت کے مطابق سری کرشن کا دیش بتاتے ہیں۔ ہندوؤں کے قدیم مندر دوارکا اور پاٹن میں ہے۔

40 سومنات، کاٹھیاواڑ کے موضع پٹن (گجرات) میں ایک بت خانہ ہے۔ جو وارول سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔

41 کھمبایت کے متعلق توزک جہانگیری میں سب سے زیادہ معتبر بیان ملتا ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے: ''یہ قدیم بندرگاہ ہے، برہمن اس کی تعمیر کا سال ہزارہا سال بتاتے ہیں۔ اس کا پہلا نام ترمباوتی تھا اور یہاں کا راجہ ترنیک کمار تھا۔ راجہ امبے کمار کے عہد میں اس شہر پر آسمانی عذاب نازل ہوا اور سارا شہر مٹی میں دھنس گیا۔ مہادیو کی مورتی جو لکڑی میں نقش تھی امبے کمار کو خواب میں اس عذاب سے آگاہ کر دیا تھا وہ اس بت کو کشتی میں رکھ کر مع اہل عیال و خزانہ سوار ہو گیا۔

کشتی بھی سمندر کے طوفان میں ٹوٹ گئی۔ راجہ اس بت کے سہارے بچ گیا اور دوبارہ اس نے اس شہر کی تعمیر کی اور اس بت والے ستون کو یادگار و برکت کے لیے نصب کروایا۔ ہندی میں ستون کو کھمبا اور تھمب کہتے ہیں اس لیے اس کا نام تھمب نگری اور کھمباوتی پڑ گیا جو کثرت استعمال سے کھمبات بن گیا۔ شہر کی جامع مسجد سلطان محمد تغلق کی بنائی ہوئی ہے۔ مارکو پولو اور ابن بطوطہ نے بھی اس بندرگاہ کا ذکر کیا ہے۔

42 اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کا قتل عام الغ خان کے دہلی لوٹ کر آنے کے بعد ہوا تھا۔ مورخین نے تاریخ اور ترتیب کا خیال کیے بغیر اس واقعہ کا پہلے ذکر کر دیا ہے۔ اگر پہلے ہی مغلوں کا قتل عام ہوا ہوتا تو پھر لشکر کے ساتھ مغلوں کے ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

43 چتوڑ۔ ریاست اودے پور کا صدر مقام تھا۔ یہاں پہاڑی کے دامن میں ایک تاریخی قلعہ ہے قلعے کی عمارت پانچ فٹ سطح ارض سے بلند پہاڑی پہ ہے اس کی لمبائی تین میل اور چوڑائی نصف میل ہے یہاں تک پہنچنے کا راستہ چکردار ہے اور اوپر کی جانب ہے۔ سڑک کے گرداگرد مستحکم فصیل ہے جس میں سات دروازے ہیں، بلندی پر چشمے، تالاب اور باؤلیاں بنی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کو ساتویں صدی عیسوی میں چترانگ نامی ایک راجا نے بنوایا تھا۔ اس کے نام پہ یہ چتراکوٹ پھر بگڑ کر چتوڑ ہو گیا۔ سولہویں صدی عیسوی تک چتوڑ اودے پور کے راجاؤں کا پایہ تخت رہا۔ تاریخ یہاں کے راجپوتوں کی بہادری اور حریت پسندی کے قصوں سے پر ہے۔ علاء الدین نے سب سے پہلے 703ھ/1303ء میں اس کو فتح کیا۔ علاء الدین کے دوسرے حملے میں ہی پدمنی کا وہ مشہور سانحہ ہوا جو لوگوں میں کافی مشہور ہوا تھا۔ پدمنی نے پاک دامنی کی خاطر چتا میں جل کر جان دے دی تھی۔ بعد میں سلطان محمد تغلق کو بھی چتوڑ پر قبضے کے لیے سخت معرکے کرنے پڑے۔ اس کے بعد بہادر شاہ گجرات کے حکمراں نے

سخت لڑائی کے بعد اس پر قبضہ جمایا تھا۔ پھر اکبر نے خونریز لڑائی کے بعد اس پر فتح حاصل کی تھی قلعے میں بہت سے قدیم محل اور مندر ہیں۔ ان عمارتوں میں ”بجے ستومنت“ کا مینار قابل دید ہے۔ جس کو رانا کمبھا نے 1442ء اور 1449ء میں شاہان مالوہ اور گجرات کی متحدہ فوجوں پر کامیابی کے بعد فتح کی یاد میں بنوایا تھا۔ اس کی بلندی 120 فٹ ہے اور اس کے نو درجے ہیں۔

44 ایک قسم کے شکار کا نام۔ ایک بڑے احاطہ میں ہرن، بکری، بارہ سنگھا وغیرہ چوپایوں کو گھیر کر ہانکا جاتا ہے اور شکاری گھوڑوں پر ان کا شکار کرتے ہیں۔

45 بدایوں: اتر پردیش صوبے کے بریلی ضلع میں واقع ہے اسلامی تاریخ میں 1202ء سے اس شہر کا نام ملتا ہے۔ قطب الدین ایبک نے بدایوں کے قلعے کو فتح کیا تھا۔ شہر کے وسط میں سلطان شمس الدین التمش کی یادگار ایک عالی شان مسجد ہے۔ بدایوں قدیم دور میں علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے علماء اور دانشمند پیدا کیے۔ حضرت نظام الدین اولیاء، مشہور شاعر ضیاء الدین نخشبی اور مولف کتاب منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ شہر کے باہر علماء اور صوفیا کی قبریں ہیں۔

46 امروہہ: ضلع مرادآباد، صوبۂ اترپردیش میں واقع ہے۔ امروہہ کا ذکر اسلامی تاریخ میں غیاث الدین بلبن کے زمانے سے ملتا ہے جب کہ وہ 1266ء میں کھڑکی کی بغاوت فرو کرنے کے لیے اس جگہ آیا تھا۔ یہاں شیخ سدو کا خیالی مزار ہے جو جامع مسجد کے اندر ہے۔ عورتیں شیخ سدو کی منت مانتی ہیں تاکہ بھوت پریت کا اثر نہ ہو۔ امروہہ کے قریب ایک دلدل ہے۔ جس میں سے ایک ندی نکلتی ہے اس کا نام سوت کی ندی ہے عام طور پر اسے یار وفادار کہا جاتا ہے۔

47 مالوہ: اس کا دارالسلطنت اجین تھا، فی الوقت یہ علاقہ گوالیار میں ہے۔ علاء الدین خلجی کے بعد 1387ء سے 1571ء تک مالوہ خود مختار رہا۔ بہادر شاہ حکمران گجرات نے اسے فتح کرکے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ 1571ء میں اکبر نے

اسے دوبارہ دہلی سلطنت کے ماتحت کیا۔ 1658ء میں اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی فیصلہ کن لڑائی اسی علاقے میں ہوئی تھی۔ 1792ء میں ہولکر مرہٹہ سردار نے اس علاقے کو تباہ کیا اور اجین کو جلا ڈالا۔ 1810ء میں یہاں پر مرہٹہ حکومت رہی اور یہ سندھیا مرہٹہ کا دارالخلافہ رہا۔

48 صوبہ گجرات میں تجارتی اور تاریخی حیثیت سے مشہور ہے۔ اسے شاہان گجرات نے 1530ء میں آباد کیا تھا۔ کسی شاعر نے یہ مادہ تاریخ کہا ہے: "یار آباد بندر سورت"

49 ارنگل، ورنگال، ورنگل: یہ سلطنت آصفیہ کا ایک ضلع تھا۔ اس جگہ پہلے قلعے کی تعمیر ہوئی بعد میں شہر آباد ہوا۔ یہ قلعہ بارہویں صدی ہجری میں راجہ گنپتی رودرا دیوا نے بنانا شروع کیا تھا۔ اس راجہ نے 1190ء سے 1258ء تک حکومت کی اس کے بعد اس کی رانی رودرامہ دیوی نے 38 سال حکومت کی۔ اس قلعے کو اسی رانی نے مکمل کروایا تھا۔ پتھر کی فصیلوں کی وجہ سے اس کا نام "ایکا سلاگرم" پڑ گیا جس کا ترجمہ اردو زبان میں "راور کا دل" ہے اور یہی لفظ بگڑ کر "ورنگال" بن گیا۔ 1296ء تک یہاں ہندوؤں کی حکمرانی رہی۔ ملک کافور نے 1303ء سے 1309ء تک دوبارہ اس کو فتح کیا تھا۔ 1321ء میں غیاث الدین تغلق کے بیٹے جونا خان نے اس قلعے پر حملہ کیا تھا۔ 1323ء میں جونا خان کے سردار شہاب خان یا الف خان نامی نے فتح کر کے ہندو سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ آخری راجہ جو گرفتار کر کے دہلی بھیجا گیا وہ "پرتاپ رودرا تھا" مسلمان مورخ اس کو "لدار دیو" لکھتے ہیں۔

50 علاء الدین پہلا حکمراں ہے جس کے عہد میں ہمالیہ سے راس کماری تک پورا ہندستان پایہ تخت دہلی کے تحت ہو گیا تھا اور دوسرا مسلمان بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہے جو کابل سے راس کماری تک پورے ہندستان کا حکمراں تھا۔

51 آپ کا اصلی نام نظام الدین تھا۔ لوگوں میں سلطان نظام الدین اولیاء مشہور تھے

اور دہلی والے انھیں سلطان جی کے نام سے پکارتے ہیں۔ آپ کے والد احمد بن دانیال نے غزنی سے آکر بدایوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپؒ کی ولادت 634ھ/1236ء میں ہوئی، پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے، 25 سال کی عمر میں اپنی والدہ کو لے کر دہلی آ گئے۔ یہاں انھوں نے خواجہ شمس الدین خوارزمی کی شاگردی اختیار کر لی جو حکومت وقت کے وزیر تھے لیکن اکثر وہ شیخ نجیب الدین متوکل کی صحبت میں رہے۔ یہ بزرگ بابا فریدالدین گنج شکر کے بھائی تھے، ان سے بھائی کی تعریف سن کر اجودھن بابا صاحب کی خدمت میں چلے گئے۔ بابا نے ہی ان کو خرقہ درویشی عطا کیا اور دہلی میں رہنے کا حکم دیا۔ امیر خسرو دہلوی اور خواجہ حسن مشہور شاعر آپ کے مرید تھے۔ سلطان علاء الدین نے خضر خان اور شادی خان اپنے دونوں بیٹوں کو بھی سلطان الاولیاء کا مرید کرایا تھا۔ اسی وجہ سے قطب الدین مبارک شاہ آپ کا مخالف ہو گیا تھا اور حکم دیا کہ ہر ماہ کی آخری تاریخ دربار میں حاضری دیا کریں لیکن وہ اس تاریخ سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح غیاث الدین تغلق جب بنگال میں تھا تو اس نے سلطان نظام الدین اولیاء کو پیغام دیا "یا شیخ آنجا باشد یا من" سلطان جی نے فرمایا "ہنوز دہلی دور است" چنانچہ 725ھ/1325ء میں بادشاہ کے دہلی پہنچنے سے پہلے سلطان جی کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ بھی افغان پور کے محل میں دب کر مر گیا۔

خضر خان نے آپ کی زندگی میں ایک عالی شان مقبرہ بنوایا تھا لیکن سلطان جی کی وصیت کے مطابق آپ کو اس کے سامنے دفن کیا گیا اور مقبرہ کو مسجد بنا دیا گیا۔ مسجد پر آپ کی تاریخ وفات درج ہے۔

نظام دوگیتی شدہ ماطین
سراج دوعالم شدہ بالیقین

چو تاریخ فوتم بجستم ز غیب
ندا داد ہاتف "شہنشاہ دین"
(725ھ/1325ء)

مزار پر اس وقت جو مقبرہ ہے اسے اکبری عہد میں 970ھ/1562ء میں سید فریدون خان نے تعمیر کرایا تھا۔

52 خسرو کا تعلق ماوراء النہر کے شہر کش سے تھا۔ ان کا خاندان ترک قبیلہ لاچین سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے والد سیف الدین قبیلے کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ سلطان شہاب الدین التمش کے عہد میں چنگیزی حملوں سے بچ کر ہندوستان آ گیا تھا۔ خسرو کی والدہ بلبن کے وزیر عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ خسرو کی پیدائش 625ھ/1254ء میں اتر پردیش کے پٹیالی میں ہوئی۔ خسرو کا پہلا مربی علاء الدین محمد کشلی خان عرف ملک چھجو تھا۔ ان کی یہ ملازمت 1277ء تک ہی تھی۔ بعد میں وہ بلبن کے بیٹے بغرا خان کے مصاحب بنے جو سامانہ کا گورنر تھا اس کے ساتھ وہ لکھنوتی میں بھی رہے، بعد میں وہ دلی آ گئے اور بلبن کے بڑے بیٹے سلطان محمد کے ساتھی بن گئے۔ ایک لڑائی میں وہ مغلوں کی قید میں بھی کچھ عرصہ تک رہے۔ شہزادہ کی شہادت کے بعد وہ اپنی ماں کے پاس پٹیالی میں رہے۔ سلطان جلال الدین کے زمانے میں وہ "امیر مصحف" کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد وہ سلطان علاء الدین کے درباری شاعر رہے۔ امیر خسرو نظام الدین اولیاؒ کے مرید اور عاشق تھے، علاء الدین کے بعد وہ مبارک شاہ کے مصاحب رہے۔ نظام الدین اولیاء کے انتقال کے چھ ماہ بعد یعنی 725ھ/1325ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سلطان شہاب الدین خلجی

علاء الدین کی وفات کے بعد ملک کافور نے شوال 1 715ھ/1315ء میں شہاب الدین کو نو عمری میں تخت نشین کیا اور اختیار الدین سنبل کو گوالیار کے قلعے میں بھیج کر خضر خان اور شادی خان کو اندھا کرا دیا۔ ان کی والدہ ملکۂ جہان کی حرم سرا بھی لوٹ لی گئی اور اس کو شاہزادہ مبارک خان کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ کافور ان کی بھی آنکھیں نکلوا دینا چاہتا تھا لیکن تقدیر نے ایک اور کھیل کھیلا۔ مبشر اور بشیر ملکۂ جہان کے ملازم اور قصر ہزار ستون کے محافظ و سردار تھے۔ ان دونوں نے ایک رات کافور کو گھیر کر قتل کر دیا اور مبارک خان کو قید سے نکال کر ملک کافور کی جگہ بادشاہ کا نائب مقرر کر دیا۔ مبارک خان نے ایک دو مہینے میں تمام اُمراء کو اپنے موافق بنا کر شہاب الدین کو تخت سے اُتار دیا اور گوالیار کے قلعے میں قید کرا دیا۔ اسی قلعے میں 710ھ/1310ء 2 میں مارا گیا۔ اس نے تین مہینے تک حکومت کی تھی۔ مبارک شاہ نے تخت پر بیٹھنے کے بعد مبشر اور بشیر دونوں سرداروں کو بھی جنھوں نے اسے قید سے رہائی دلائی تھی قتل کرا دیا:

نکو را نیک و بد را بد شمار است
بہ پاداش عمل گیتی بکار است

(نیک کے لیے نیک اور بد کے لیے بُرا ہی ہوتا ہے کیوں کہ دنیا میں اپنے عمل کی ہر ایک کو پاداش ملتی ہے۔)

سلطان قطب الدین خلجی

مبارک شاہ نے اپنے بھائی شہاب الدین کو ٹھکانے لگانے کے بعد تمام اُمراء کے اتفاق وتعاون سے 717ھ/1317ء میں حکومت کی کمان سنبھالی اور اپنے احباب اور دوستوں کو منصب اور جاگیریں عطا کیں۔ سلطان علاء الدین کے نائب اور حاجب ملک شادی کے پاس بردار بچہ قوم کا ایک نہایت حسین وجمیل غلام حسن نامی تھا جو مالوہ سے دہلی لایا گیا تھا۔ مرحوم سلطان نے بڑی محبت وشفقت سے اس کی پرورش کی تھی۔ مبارک شاہ اس غلام پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ چنانچہ بادشاہ بنتے ہی اس نے جوش و محبت میں اس خوبصورت غلام زادہ کو خسرو خان کا خطاب دے کر عہدہ وزارت پر فائز کر دیا۔ حالانکہ وہ اس ذمہ داری کا اہل نہ تھا:

گرت مملکت باید آراستہ
رہ کار اعظم بنو خاستہ
نخواہی کہ ضائع شود روزگار
بنا کار دیدہ مفرمائی کار

چونکہ سلطان قطب الدین نے قید واسارت کی بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں اس لیے اس نے بادشاہ ہوتے ہی تمام قیدیوں کو عام رہائی دے دی۔ ملک فخر الدین کو جس کا لقب محمد عادل تھا اور جو غازی الملک کا بیٹا تھا بادشاہ نے اپنا ”میر آخور“ مقرر کیا۔ سلطان نے پہلے ہی سال دیوگیر عرف دولت آباد پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن امیروں نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔

خضر خاں کا قتل

718ھ/1318ء میں سلطان نے اپنے کوتوال قطب الدین کو گوالیار بھیج کر خضر خان اور شادی خان کو شہید کرا دیا اور خضر خان کی محبوبہ دیول رانی کو اپنے حرم کے میں داخل کر لیا۔ جب علاء الدین کے خانوادے کا یہ حشر ہوا تو کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا" آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے جواب دیا علاء الدین نے جو آگ اپنے ولی نعمت اور محسن چچا کے خاندان میں لگائی تھی اسی آگ میں اس کا خاندان جل رہا ہے"۔

درین سپہر صدا گنبد ماتوی
سخن ہر چہ گوئی ہمان بشنوی

سلطان قطب الدین عیش پسند آدمی تھا اس لیے اس کے عہد میں وہ سارے قاعدے اور ضابطے جو علاء الدین نے بڑے تدبر اور مصلحت سے مقرر کیے تھے درہم برہم ہو گئے ملک بھر میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ ہو گیا۔ سلطان نے گجرات سے الپ خان کو واپس بلا کر قتل کرا دیا اور اس کی جگہ کمال الدین گرگ کو وہاں مقرر کیا۔ لیکن گرگ وہاں جا کر شہید ہو گیا۔ اس کی جگہ سلطان نے عین الملک ملتانی کو مقرر کیا۔ عین الملک نے گجرات کی بغاوت کو ختم کر کے نہر والہ اور گجرات کے دوسرے تمام شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ سلطان قطب الدین نے ملک دینار کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور دینار کو ظفر خان کا خطاب دے کر گجرات روانہ کیا۔ اس نے اس علاقہ کے نظم و نسق کو عین الملک کی نسبت کہیں بہتر طریقے پر سرانجام دیا۔

دیوگیر پر حملہ

718ھ/1318ء میں قطب الدین نے ایک بڑا لشکر لے کر دیوگیر کا رخ کیا، جب لشکر شاہی وہاں پہنچا تو سرکش راجہ ہرپال دیو جو راجہ رام دیو کا جانشین تھا اور اس نے دہلی

کی سلطنت کو کمزور دیکھ کر بغاوت کا رخ اختیار کر لیا تھا سلطان کا مقابلہ نہ کر سکا اور ہار گیا۔ سلطان نے اس کی کھال کھنچوا دی۔ دیوگیر سے فارغ ہو کر سلطان نے مرہٹوں پر حملہ کیا اور ان کے وطن پر بھی قبضہ کر لیا۔ خسرو خان کو" چتر اور دور باش" کا اعزاز دے کر ملیبار پر فوجی حملے کے لیے روانہ کیا اور لکھی قوم کے ایک غلام کو اپنا نائب بنا کر دیوگیر میں مقرر کر دیا اور دہلی کی طرف واپس ہو گیا۔ واپسی میں کسی مخبر نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ بغرا خان کے بیٹے ملک اسد الدین جو سلطان علاء الدین کا چچا زاد بھائی اور ملک خوش کے نام سے مشہور تھا، اس نے ساگون کی گھاٹی کے قریب بغاوت کی تیاریاں کر رکھی ہیں نیز بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس خبر کے ملنے کے بعد سلطان نے اسد الدین پر یلغار کر کے اسے پکڑ لیا اور اسے اسی وقت قتل کرا دیا۔ اس کے کنبے کے بیس آدمی جو اس واقعے سے قطعاً بے خبر تھے بادشاہ کے حکم سے مارے گئے۔ ان مقتولین میں نو عمر معصوم بچے بھی تھے۔ جھابن میں پہنچنے کے بعد سلطان نے شادی خان کتھ سلاح دار کو دوبارہ گوالیار روانہ کیا اور اس نے وہاں جا کر حکم شاہی کے بموجب شہاب الدین کو قتل کر دیا اور خضر خان 6 اور مقتول شادی خان کے اہل و عیال کو جو وہاں رہ گئے تھے قلعہ گوالیار ج سے دہلی لے آیا۔

سلطان قطب الدین کی بد اعمالی

سلطان قطب الدین حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بھی خفا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ خضر خان شیخؒ کا مرید تھا، چنانچہ سلطان نے حضرتؒ کی ناراضگی کی بنا پر ملتان سے شیخ رکن الدین کو بلا کر دہلی میں ٹھہرا لیا اور ان کے منکر شیخ زادہ جام کو بھی اپنا مقرب بنایا۔ سلطان قطب الدین نے بھی اپنے باپ کی طرح خونریزی شروع کر دی۔ ظفر خان جو کہ گجرات کا حاکم تھا اس کو بغیر وجہ کے قتل کروا دیا۔ اک لکھی دیوگیر کا سرکش اور باغی سردار تھا، خسرو خان نے اسے گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ بادشاہ نے اسے فوراً قتل کروا دیا۔ ملک شاہین کو جس کا خطاب وفا ملک تھا لوگوں کے کہنے سے قتل کروا دیا۔ اس خونریزی کے علاوہ قطب الدین کے مزاج میں بڑا زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مجلسوں میں عورتوں کا سا لباس اور

زیور پہن کر آتا تھا اور اعلانیہ شراب پی پی کر فسق و فجور کے مظاہرے کرتا رہتا تھا۔ شہدے اور مسخرے اس کے اشارے پر محل ہزار ستون کی چھت پر بیٹھ کر معتبر اور نامور امراء جیسے عین الملک ملتانی اور قرابیگ وغیرہ کی کھلی اڑایا کرتے تھے اور چھیڑا کرتے تھے، نقلیں اتار کر ان کی اہانت کرتے اور مادر زاد ننگے ہو کر بے حیائی کی حرکتیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء کے کپڑے پر اپنا پیشاب چھڑکتے تھے۔ قطب الدین کی ان بیہودہ حرکتوں سے اس کی تباہی کا سامان خود بخود تیار ہو گیا:

شاہبازی گران چہ بر خواہد خاست
وز مستی بیگران چہ بر خواہد خاست
سرمست و جہان خراب و دشمن پس و پیش
پیداست کزین میان چہ بر خواہد خاست

خسام الدین کی سرکشی

ظفر خان کے قتل کے بعد بادشاہ نے خسام الدین کو جو کہ رشتے میں خسرو خان کا بھائی لگتا تھا۔ اسے ظفر خان کی جگہ گجرات کی حکومت پر مامور کیا۔ اس نے اپنی قوم بردار بچے کے آدمیوں کو جمع کر کے وہاں بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں اور ظفر خان کے وقت کے تمام امیروں کو قید کر کے دہلی بھیج دیا۔ اسے اس حرکت پر شک ضرور ہوا مگر اس نے امیروں کو اسی وقت رہا کر دیا۔ اپنے محبوب خسرو خان کی خاطرداری کے خیال سے خسام الدین کی حرکتوں کو نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے اس سے اور قدردانی اور مہربانی کا سلوک کیا۔ انھوں نے اسے گجرات سے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ وحید الدین قریشی کو، جس کی کوششوں سے وہ کسی گرفتار ہوا تھا گجرات کا حکمراں بنا کر بھیج دیا۔

دکن پر خسرو خان کا حملہ

اسی زمانے میں خسرو خان نے دکن میں تلنگانہ پر چڑھائی کی اور وہاں کے قلعے کا محاصرہ کر کے وہاں کے راجہ سے کافی مال و دولت اور سو سے زائد ہاتھیوں کی نذر لے کر سیتھلی کی طرف کوچ کیا۔ وہاں سے 920 ہاتھی اور چھ درم وزن کا ہیرا (الماس) لے کر ملیبار[8] میں آیا۔ اس وقت اس کے پاس کافی مال و متاع اور لشکر جمع ہو گیا تھا۔ اس کے سر پر بھی بادشاہی کی دُھن سوار ہوئی اور اس نے کئی امیروں کو قتل کروادیا اس کی ان حرکتوں سے ملک تلیغہ بغدہ، ملک تلیغہ ناگوی اور ملک حاجی نائب نے اس کی سرکشی کا اندازہ لگا لیا، اور موقع پا کر اُسے اغوا کرایا اور ایک ڈولی میں بیٹھا کر سات دن کے اندر دیو گیر سے دہلی لے آئے اور بادشاہ سے اس کے فاسد ارادوں کا حال بیان کیا۔ لیکن خسرو خان نے خلوت میں اپنے عاشق و فریفتہ سلطان کو ناز نخروں، حیلوں اور بہانوں سے راضی کر لیا اور اُلٹا امیروں کے خلاف اُسے بھڑکا دیا۔ بادشاہ اس کی اداؤں پر مٹا ہوا تھا۔ اس کے کہنے پر یقین کر کے ان وفادار امیروں کی طرف سے منہ پھیر کر انہیں خوب رسوا اور ذلیل کیا۔ اس کے باوجود بھی کہ امیروں نے سچے اور چشم دید گواہ پیش کیے ان گواہوں کو بھی سزا دلوادی۔

خسرو خان کا اقتدار

اس کھیل کے ختم ہوتے ہی خسرو خان نے دوبارہ بادشاہ سے اپنی قوم کو دار السلطنت میں بلانے کی اجازت لے لی اور کوشش کر کے ان کو بادشاہ کا مصاحب بنا دیا۔ عیش پسند بادشاہ نے بھی اپنے محبوب پر اور اس کے لوگوں پر بھروسہ کیا، سارا نظم و نسق ان کے حوالہ کر دیا اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا:

مصحف و شمشیر بر انداختہ
جام و صراحی آغوشش ساختہ

اُمراء نے جب یہ رنگ دیکھا اور کوئی چارہ نہ پایا تو مجبوراً وہ خسرو خان کی خوشامد میں لگ گئے، دربار سرکار میں براؤ بچہ قوم کے لوگ چھا گئے۔ یہ لوگ خسرو خان کے گھر میں بادشاہ کے خلاف بغاوت کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ قاضی ضیاء الدین نے جن کا خطاب قاضی خان تھا ایک دن ان سازشوں کی خبر بادشاہ کو دے دی، لیکن بادشاہ نشے میں اتنا غرقاب تھا کہ اس نے خسرو خان کو ساری بات بتا دی۔ اس نے جواب دیا چونکہ میرے حال پر بادشاہ کی غیر معمولی عنایات ہیں۔ یہ لوگ حسد کے مارے ایسی تہمت لگانے کے درپے رہتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی بات کی دل و جان سے تصدیق کی اور اسے توشک خانہ خاص وغیرہ کی چابیاں بھی حوالے کر دیں۔ چابیوں کی حوالگی کو اس نے اپنے حق میں فال نیک سمجھا۔

آخری عبرت انگیز رات

ایک رات بادشاہ خسرو خان کے ساتھ بیٹھا شراب کے جام میں ڈوبا ہوا تھا، دیر رات گزر جانے کے بعد چوکی پہرے والے امیر اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر جا چکے تھے اور قاضی خان ہزار ستون کی چھت سے اتر کر دروازوں کی حفاظت اور پہرے داروں کی نگرانی میں مصروف تھا کہ خسرو خان کا چچا مدھول نامی اپنے آدمیوں کو لے کر اچانک آ پہنچا اور قاضی خان کو باتوں میں لگا کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ غریب اسی جگہ جاں بحق ہو گیا۔ اسی واردات کی وجہ سے شور وغل مچا تو بادشاہ نے خسرو خان سے پوچھا کیا بات ہے؟ وہ حال جاننے کے بہانے اٹھ کر اپنے آدمیوں کے پاس گیا اور بادشاہ کے قتل پر ان کو آمادہ کر کے چلا آیا اور بادشاہ سے کہنے لگا طویلے کے گھوڑے کھل گئے تھے اور لڑنے لگے تھے بس اسی کا شور ہو رہا ہے۔ اتنے میں خسرو خان کا ماموں جاہر نامی اپنی جماعت کے ساتھ ہزار ستون کی چھت پر چڑھ آیا اور وہاں کے محافظوں کو قتل کر کے بادشاہ کی طرف لپکا، اب بادشاہ کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے اور وہ اس نیم مستی کے عالم میں زنانہ محل کی طرف بھاگنے لگا لیکن خسرو خان نے پیچھے سے سر کے بال پکڑ لیے۔ بادشاہ اس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ اس کے لوگ آ پہنچے اور سر کاٹ کر چھت کے نیچے پھینک دیا۔ امیروں

نے جب یہ حال دیکھا تو چپکے سے اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ کئی ایک محل کے دروازے پر قتل کر دیے گئے۔ خسرو خان اپنے ساتھیوں کو لے کر شاہی محل سرا میں گھس گیا اور فریدوں خان، منگو خان جیسے شیر خوار شہزادوں کو ان کی ماؤں کی گود سے کھینچ کر ان کے سامنے ذبح کر ڈالا۔ حملہ آوروں نے عورتوں پر ظلم کر کے ان کے ساتھ جیسا جی میں آیا سلوک کیا اور سلطان علاء الدین و قطب الدین کا خاندان اور تخت دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گیا۔ ان ہنگاموں سے فارغ ہو کر خسرو خان نے عین الملک ملتانی، ملک فخر الدین جونا جو بعد کے دنوں میں سلطان تغلق کے نام سے معروف ہوا۔ ملک وحید الدین قریشی اور قرابیگ کے بیٹوں کو اسی رات بلا کر صبح تک ہزار ستون کے بالا خانے میں نظر بند کر دیا اور دن نکلا تو شہر کے تمام اعیان و اکابر کو بلا یا گیا اور دربار سجا کر خسرو خان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ جس کے متعلق بھی مخالفت کا اندیشہ ہوا اسے دھوکہ سے پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ قاضی ضیاء الدین کی بیوی کسی طرح بھاگ گئی۔ لیکن اس کا پورا خانوادہ مدہول کے سپرد کر دیا گیا۔ حسام الدین خان نے جو خسرو خان کا سگا ماموں تھا، خان خانان کا خطاب پایا اور مدہول رائے رایان بن گیا۔ سلطان قطب الدین کے حرم، دوسرے شہزادوں اور مقربین کی عورتوں کو ان لوگوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ سلطان کی ملکہ سے خسرو خان نے خود نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ 720ھ/1320ء میں پیش آیا۔ سلطان قطب الدین نے چار سال اور چند مہینے تک حکومت کی۔

تا جہان بود چنین بود و چنین خواہد بود
ہمہ را عاقبت کار چنین خواہد بود

ناصر الدین خسرو خان

پہلے اس کا نام ''حسن بروار بچہ'' تھا۔ 720ھ/1320ء میں مبارک شاہ مارا گیا تو اپنے قبیلے والوں کی حمایت سے وہ ناصر الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ علائی اور قطبی

امیروں نے بھی مجبوری میں اس کی اطاعت اختیار کر لی اور اسے بادشاہ تسلیم کر لیا۔ انقلاب سے ہندستان میں اسلامی شعار کا زوال ہونے لگا۔ ہندوؤں کے رسم و رواج ترقی کرنے لگے، اعلانیہ بت پرستی ہونے لگی، مسجدیں ویران ہونا شروع ہو گئیں۔ خسرو خان نے عوام و خواص کو اپنی طرف کرنے کے لیے خزانوں کا منھ کھول دیا جو علاء الدین اور قطب الدین کے وقت سے جمع تھے لیکن اس کی نمک حرامی اور بے دینی کی وجہ سے لوگ اس سے برگشتہ خاطر ہی رہے۔

ہندوؤں کا غلبہ

721ھ/1321ء میں خسرو خان نے علاء الدین کی اولاد میں سے ابوبکر خان، علی خان اور بہار خان کو اندھا کرا دیا۔ عین الملک اور دوسرے بڑے بڑے اُمراء اور وزراء کو بھی دور دراز علاقوں میں بھیج کر منتشر کر دیا۔ امور سلطنت پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمان تباہ و برباد ہونے لگے۔ یہ تباہی ویسی ہی تھی جیسی سلطان سنجر کے زمانے میں غزوں کی یورش میں رونما ہوئی تھی۔ خسرو خان نے ہر طرف فرامین روانہ کر کے لوگوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی۔ یوسف صوفی برادو بچہ کو صوفی خان اور اختیار الدین سنبل کو حاتم خان کے خطاب عطا کیے۔ کمال الدین صوفی کو وکیل دربار اور ملک فخر الدین جونا غازی الملک کے بیٹے کو آخور بیگی کا منصب عطا کیا۔ قرہ قمار کے بیٹے کو عارض الملک کا عہدہ ملا۔ غازی الملک کے بیٹے کی وہ بہت خاطر و مدارات کیا کرتا تھا۔ غرض یہ تھی کہ اس کا باپ علاء الدین کے زمانے کا بڑا نامی گرامی امیر تھا اور اس نے مغلوں کے خلاف بڑے معرکے سر کیے تھے۔ اس لیے خسرو خان چاہتا تھا کہ وہ دیپالپور سے اس کے پھندے میں پھنس جائے تاکہ کوئی کھٹکا باقی نہ رہے۔ عین الملک ملتانی کو بھی اس نے عالم خان کا خطاب دے کر اپنے ساتھ ملا لینا چاہا لیکن وہ اس لالچ میں نہیں آیا بلکہ اس نے غازی الملک کو لکھ بھیجا کہ اگر تم مقابلے کے لیے تیار ہو تو معرکے میں خسرو خان کا ساتھ نہیں دوں گا۔ بلکہ اپنے وطن مالوے کی طرف چلا جاؤں گا اور جب سب امیر تمہارے ساتھ ہو جائیں گے تو میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں

گا۔ غرض کچھ امیر تو ایسے تھے جو منصب اور جاگیر کی لالچ میں خسرو خان کے حامی ہو گئے اور کچھ اس سے برگشتہ خاطر ہی رہے۔

غازی الملک میدان میں

جب غازی الملک کو یہ تمام پریشان کن خبریں ملیں تو اسلامی غیرت اور اپنے آقا کے خون اور عزت و ناموس کی حمیت نے جوش مارا، اس نے خسرو خان سے بدلہ لینے کے لیے کمر باندھی اور دوسرے امراء سے بھی اس مہم کے لیے مدد مانگی۔ فخر الدین جونا نے بھی اب خفیہ خط باپ کے پاس بھیجا اور لکھا کہ اگر آپ گھوڑوں کی ڈاک بٹھا دیں تو میں یہاں سے بھاگ آؤنگا۔ چنانچہ اس انتظام کے ہوتے ہی اس نے ایک رات[9] اُچھ[10] اور ملتان کے حاکم بیرام اللہ کے بیٹے کو ساتھ لیا اور دہلی سے نکل کر اپنے باپ کے پاس دیپالپور بھاگ گیا۔ باپ کو بیٹے کی آمد پر خوشی ہوئی۔ اس کے آنے سے قبل اس کے باپ نے سرتی کے قلعے میں دوسو سواروں کو تعینات کر رکھا تھا۔ جب خسرو خان کو فخر الدین جونا کے بھاگ جانے کی خبر ملی تو وہ نہایت پریشان ہوا اور قرہ قمار کے لڑکے کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا لیکن وہ قصبہ سرتی[11] تک جا کر لوٹ آیا اور خسرو خان کو غازی الملک کی تیاریوں کی اطلاع دی۔

غازی الملک کا حملہ

جب سارا ساز و سامان مہیا ہو گیا تو غازی الملک نے نہایت دلیری اور مردانگی کے ساتھ دیپالپور[12] سے دہلی کی طرف یلغار کر دی۔ خسرو خان نے اس کے مقابلے کے لیے اپنے بھائی خانخاناں کو چتر اور دور باش کا اعزاز دے کر روانہ کیا اور صوفی خان جیسے نالائق اور کمینے امیروں کو بھی ساتھ کر دیا۔ غازی الملک زمانے کے حالات سے واقف امیر تھا۔ مغلوں کے مقابلے میں اس نے فتح و شکست کے بڑے بڑے تجربے حاصل کیے تھے اور نمایاں فتوحات حاصل کی تھیں۔ اوچھ اور ملتان کا حاکم بیرام اللہ[13] بھی ان کی مدد کے لیے

آ گیا تھا، ایسے پختہ امیروں کے مقابلے میں خسرو خان کے بھیجے ہوئے امیر نہایت کم حوصلہ اور ناتجربہ کار تھے۔ چنانچہ جب تھانیسر[14] میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو پہلے ہی حملے میں غازی خان نے دشمن کو مار بھگایا اور نمایاں فتح حاصل کی۔ بے شمار ہاتھی گھوڑے اور سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگا، غازی الملک بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا دہلی کے سامنے پہنچ گیا۔

خسرو خان مقابلے پر

خسرو خان نے شکست کھاتے ہوئے لشکر کو جمع کر کے خزانے کا دروازہ کھول دیا اور سپاہیوں کو تین تین چار چار ماہ کی تنخواہ پیشگی دی، بڑے بڑے عہدے اور جاگیروں کے وعدے کیے۔ خاندان علائی کے جن شہزادوں کو اندھا کر رکھا تھا ان کو مروا ڈالا اور کافی ساز و سامان لے کر دہلی سے باہر نکلا۔ اس کی لشکر گاہ حوض خاص سے اندر پت تک پھیلا ہوا تھا۔ غازی الملک سلطان رضیہ کے روضہ میں کیمپ لگائے ہوئے تھا۔ اس وقت عین الملک عہد و قرار کے مطابق اپنی جمعیت کو لے کر دھار[15] اور اجین کی طرف نکل گیا۔ اس کے اس طرح کٹ جانے سے خسرو کا دل ٹوٹ گیا۔

خسرو خان کی شکست

دوسرے دن لڑائی ہوئی۔ پہلی بار غازی الملک کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ منتشر ہو گیا، لیکن غازی الملک نے تین سو سواروں کے ساتھ جو گھات میں چھپے ہوئے تھے یکبارگی خسرو خان کے فاتح لشکر پر حملہ کے لیے اسے مجبور[16] کر دیا۔ ملک تلبغہ اور قمار قرہ کے بیٹے اور خسرو کے کئی دوسرے طرف دار امیر مارے گئے لیکن خسرو بڑی بہادری سے شام تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر تلپتہ کی طرف بھاگ گیا۔ جب خسرو نے بھاگنے کی صورت نہ دیکھی تو تلپتہ سے لوٹ کر اپنے پرانے رفیق ملک شادی کے باغ میں تن تنہا چھپ گیا۔ دوسرے دن اسے بڑے برے حال میں پکڑ کر غازی الملک کے روبرو پیش کیا گیا اور اس نے اپنے کیے کی سزا پائی[17] دوسرے دن

غازی الملک تلپت سے سوار ہو کر "سبز کوشک" میں آیا اور اسی جگہ قیام کیا۔ دہلی کے خاص و عام آ آ کر اس کو مبارک باد دینے لگے۔ دوسرے دن وہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ خانخانان بھی کسی باغ میں چھپا بیٹھا ہے۔ ملک فخر الدین جونا اسے بھی پکڑ لایا۔ غازی الملک کے حکم سے اس کے ناک ہاتھ پاؤں کاٹ کر شہر میں گھمایا گیا۔ یہ واقعہ 720ھ/1320ء میں پیش آیا۔ خسرو خان چار ماہ کچھ دن تخت شاہی پر قابض رہا۔

تغلق خاندان

سلطان غیاث الدین تغلق شاہ

دہلی میں داخل ہونے کے بعد غازی الملک نے تمام امیروں کی اتفاق رائے سے 720ھ/1320ء میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور غیاث الدین تغلق 18 لقب رکھا، تغلق بڑا منتظم اور مدبر شخص تھا۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر سلطنت کے درہم برہم کارخانے کو بخوبی سنوار دیا جس تیزی اور ہوشیاری سے اس نے نظم ونسق کی اصلاح کی وہ شاید دوسرں سے سالہا سال میں بھی نہ ہوتا۔ اپنے عزیزوں اور قریبوں کو اس نے عہدے اور منصب عطا کیے، علاء الدین اور قطب الدین کے زمانے کے اکثر امراء کے ساتھ مہربانی کا سلوک رکھا اور ان کو بھی جاگیریں عطا کیں۔ ان سارے انتظامات کے بعد قلعۂ تغلق آباد تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ تین سال میں تیار ہوا۔ جب قلعہ تیار ہو گیا تو وہاں ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔ اس موقعے پر بدر چاچ شاعر نے قلعے کی تعمیر کی تاریخ ''فادخلوا'' نکالی جو بلا شبہ ایک نادر تاریخ ہے۔ سلطان نے ان تمام لوگوں کو جن کے مشورے سے خسرو خان نے قطب الدین کی ملکہ سے عقد کیا تھا اور جو اس کی سرکش قوم کے مددگار بنے تھے، سب کو سزائیں دیں۔ اپنے بیٹے

ملک فخر الدین جونا کو جس کے صورت سے ہی شاہانہ صلاحیتیں جھلکتی تھیں "الغ خان" کا خطاب چتر وغیرہ شاہی اعزازات دے کر اپنا ولی عہد بنا دیا۔ اپنے دوسرے چار بیٹوں کو بہرام خان، ظفر خان، محمود خان اور نصرت خان کا خطاب عطا کیا۔

الغ خان کی فوجی مہم

721ھ/1321ء میں تغلق نے الغ خان کو چندیری،[19] بدایوں اور پورب کے دوسرے شہروں کی فوجیں دے کر دیو گیر اور تلنگانہ کی مہم پر روانہ کیا۔ الغ خان نے دیو گیر پہنچ کر وہاں کی فوج کو بھی اپنے ساتھ لیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ ارنگل کے قلعے کا گھیراؤ کر لیا۔ یہ قلعہ سات سو سال سے رائے سدر مہادیو اور اس کے آباؤ اجداد کے قبضے میں تھا۔ الغ خان نے قلعے کے باہر کا کچا حصار بہت جلد فتح کر لیا اور ممکن تھا کہ وہ اندر کے سنگین اور مضبوط حصار کو بھی فتح کر لے کہ اس عرصے میں دہلی کی ڈاک آنے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔ حاسدوں کو اچھا خاصا بہانہ ہاتھ لگ گیا۔ چنانچہ شیخ زادہ دمشقی اور عبید[20] شاعر نے یہ خبر اڑائی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر سے لشکر میں افراتفری پھیل گئی۔ عبید نے امرائے لشکر کو بھی خوب بہکایا کہ الغ خان تم لوگوں کی فکر میں مبتلا ہے۔ لشکر کی اس پریشانی سے غنیم نے عین وقت پر حملہ کر دیا اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ملک تمگین اور دوسرے امیروں نے الغ خان سے غداری کرنے کی ٹھان لی۔ ملک تمگین تو پچیس سواروں کو ساتھ لے کر فوراً ہی دہلی بھاگ گیا اور دوسرے امیر بھی اسے چھوڑ کر اپنے اپنے علاقہ کی طرف نکل گئے۔ ان میں سے ملک تمگین ملتان اور جیسلمیر کے درمیان پکڑا گیا۔ تاج الدین طالقانی اور اس کا داماد قید خانے سے نکل کر بھاگا تھا۔ سروندی کے کنارے گرفتار ہوا۔ عبید شاعر کو بھی مشکل سے گرفتار کر کے لایا گیا۔ ان سب کو ان کے ساتھیوں سمیت ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا گیا۔ اس مرتبہ الغ خان نے باہری حصار کو فتح کر کے راجہ کو مع اس کے ساتھیوں کے گرفتار کر لیا اور وہاں عامل مقرر کر کے مال غنیمت کو جو ہاتھیوں، جواہرات اور دوسرے قیمتی سامان پر مشتمل تھا، راجہ کے ساتھ سمیت دہلی روانہ کر دیا اور ارنگل کا نام سلطان پور رکھ کر خود بھی دہلی لوٹ آیا۔

بنگال کی مہم

724ھ/1324ء میں بنگال کے حاکم کی بغاوت کی خبر ملی تو خود سلطان نے اس طرف توجہ کی اور الغ خان کو تغلق آباد میں ملکی اور مالی امور کی نگرانی کے لیے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ جب سلطان لکھنوتی[21] پہنچا تو وہاں کا حاکم سلطان ناصر الدین اور اس نواح کے تمام راجہ اور امراء استقبال کے لیے آئے۔ تغلق نے ناصر الدین کو چتر دور باش اور سلطنت کے اعزاز دے کر دوبارہ لکھنوتی کی حکومت کا پروانہ عطا کیا اور فتح نامہ دہلی بھیجا۔ لکھنوتی سے تغلق نے ظفر آباد کے حاکم تاتار خان کو جسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا فوجی مہم کے لیے روانہ کیا۔ تاتار خان نے سنار گاؤں[22] کے حاکم بہادر شاہ عرف تورہ کو جو کچھ عرصے سے خود مختار بن بیٹھا تھا گرفتار کر کے تمام ساتھیوں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

تغلق کی وفات

مندرجہ فتوحات کے بعد تغلق بہادر شاہ مذکور کو ساتھ لے کر دہلی واپس ہوا۔ یہ سفر اس نے نہایت سرعت کے ساتھ طے کیا، چنانچہ دور دور منزل پر پڑاؤ ڈالتے ہوئے کوچ کیا جاتا تھا۔ الغ خان نے سلطان کی آمد کی خبر سن کر تغلق آباد سے تین کوس کے فاصلے پر افغان پور میں ایک بہت بڑا اور بلند قلعہ نما محل تین دن کے اندر تیار کرایا تاکہ بادشاہ اسی جگہ رات میں قیام کرے اور صبح کو نیک ساعت دیکھ کر تغلق آباد میں داخل ہو۔ چنانچہ بادشاہ نے حسب انتظام اسی محل میں جا کر قیام کیا، وہاں استقبال کے لیے الغ خان تمام امیروں کو لے کر آیا اور ضیافت کا بڑا شاہانہ انتظام کرایا۔ اسی جگہ وہ ہاتھی جو بنگالہ سے آئے تھے بادشاہ کے حکم سے دوڑائے گئے۔ محل چونکہ نیا بنا تھا ہاتھیوں کے دوڑنے سے ڈھل گیا۔ بادشاہ نے محل کے اندر کھانا کھایا۔ لوگوں کو یہ اطلاع تھی کہ کھانا کھاتے ہی فوراً سوار ہو جائیں گے اس لیے محل میں جتنے لوگ دسترخوان پر حاضر تھے کھانا کھاتے ہی ہاتھ دھوئے بغیر ہی سواری کے انتظام کے لیے جلدی باہر چلے آئے۔ البتہ بادشاہ ہاتھ دھونے کے انتظار میں بیٹھا رہا

لیکن اچانک چھت گر پڑی۔ اور اس کو جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑا۔ اس واقعہ کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ الغ خان نے قصداً اس کی دیواریں اندر سے کھوکھلی رکھی تھیں۔ اتنی جلدی نیا محل تعمیر کرنے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کا یہ خیال ممکن ہے سچ ہو۔ 23 تاریخ فیروز شاہی میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ واضح رہے کہ اس کا مصنف فیروز شاہ کا طرف دار اور حامی تھا۔

ہنوز دلی دور است

یہ واقعہ 725ھ/1325ء میں پیش آیا۔ غیاث الدین نے کل چار سال اور کچھ ماہ تک حکومت کی۔ ہندستان کے عوام میں یہ مشہور ہے کہ غیاث الدین کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء سے رنجش تھی۔ اس نے لکھنوتی سے دہلی آتے ہوئے شیخ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ ''اب کی بار دہلی میں یا میں رہونگا یا نظام الدین'' اس کے جواب میں شیخ کی زبان سے نکلا ''ہنوز دلی دور است'' اسی دن یہ قول ضرب المثل بن گیا۔ امیر خسرو کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ ان کی آخری تصنیف ''تغلق نامہ'' اسی بادشاہ کے نام منسوب ہے۔

سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد الغ خان نے امیروں کے اتفاق اور تائید سے سلطان محمد عادل کے لقب سے 725ھ/1325ء میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور چالیس دن تک باپ کا ماتم کرتا رہا۔ اس کے بعد قدیم شاہی محل میں جشن منعقد کر کے کافی روپیہ خیرات کیا۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی ملک فیروز کو، جو بعد میں سلطان فیروز کے نام سے تخت نشین ہوا اپنا نائب مقرر کیا اور دوسرے امیروں کو بھی اونچے مناصب پر ترقی دی۔ حمید لوبکی بادشاہ کا مقرب بن گیا۔ ملک سرتیز کو عماد الملک، ملک خرم کو ظہیر الجیوش، ملک چندار خلجی کو قدر خان اور ملک اعز الدین یحییٰ کو اعظم الملک کا خطاب عطا ہوا اور اُسے کوست گاؤں کا علاقہ جاگیر میں ملا۔

دکن پر فوجی مہم

727ھ/1327ء میں بادشاہ نے دیوگیر کی طرف کوچ کیا۔ دہلی سے دیوگیر تک ہر کوس پر ڈاک چوکی مقرر کی گئی۔ ہر منزل پر ایک خانقاہ اور مسافر خانہ بنوایا گیا۔ ہر مسافر خانے میں ایک ملا مقرر تھا۔ مسافروں کے لیے کھانے پینے اور ضروریات کی دوسری چیزیں مہیا رہتی تھیں۔ چوکیداروں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ مسافروں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ان خانقاہوں کے آثار برسوں تک باقی رہے۔

دارالخلافہ کا تبدیل کیا جانا

سلطان نے دیوگیر پہنچ کر اس کا نام دولت آباد رکھا اور یہ سوچ کر کہ دیوگیر مملکت کے وسط میں ہے اسے اپنا دار السلطنت بنا لیا۔ دہلی سے اپنی والدہ مخدومہ جہاں کو مع اہل وعیال اور دوسرے سب امیروں، لشکر کے سرداروں اور غلاموں کو دولت آباد بلا لیا اور سارے خزانے بھی منگوا لیے۔ مخدومہ جہاں کی وجہ سے بہت سے سید مشائخ اور عالم بھی دولت آباد چلے گئے۔ بادشاہ نے سب کے انعام اور وظائف کئی گنا کر دیے۔ خانہ ویرانی کی مصیبت بری ہوتی ہے۔ دہلی کے بسے بسائے گھرانے اجڑ کر دولت آباد گئے تو لوگوں کو بڑی پریشانیوں اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بیمار اور ضعیف آدمی تو راستہ ہی میں سفر کی اذیتوں سے جان بحق ہو گئے۔ جو وہاں پہنچے وہاں ان کا رہنا مشکل ہو گیا۔ 727ھ/1327ء کے آخر میں فوج کے بخشی ملک بہادر گرشاسپ[24] نے دہلی میں بغاوت کی لیکن ملک احمد ایاز خواجہ جہاں نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں اسے بغاوت کی سزا دی گئی۔

بہرام اللہ کی بغاوت

دوسری بغاوت ملک بہرام اللہ نے جسے سلطان تغلق اپنا بھائی کہا کرتا تھا، نے ملتان

میں برپا کی۔ جب بادشاہ نے اسے لانے کے لیے علی خلیلی کو اس کے پاس بھیجا تو اس نے علی کو قتل کر دیا۔ بادشاہ اس فتنے کو دبانے کے لیے دولت آباد سے کوچ کر کے دہلی آیا اور شب و روز کی محنت کے بعد دہلی سے ملتان پہنچا۔ بہرام نے جم کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور قتل ہو گیا۔ اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ بہرام کی سرکشی کے بدلے ملتان میں قتل عام کرانا چاہتا تھا لیکن حضرت شیخ رکن الدینؒ نے اپنی دستار اتار کر بادشاہ سے سفارش کی اور بیچارے ملتان والوں کی جان بچی:

از ابتدائی دور آدم تا زمان بادشاہ
از بزرگان عفو بودہ واز فرودستان گناہ

سلطان نے ملتان قوام الملک کے حوالے کیا اور دہلی واپس آ گیا۔ چند دن بعد اس کی جگہ ملتان کی حکومت پر بہزاد کو روانہ کر دیا۔ بہزاد کو شاہو لودی25 کے پٹھان نے بغاوت کر کے قتل کر دیا۔ جب بادشاہ شاہو کو سزا دینے کے لیے دیپالپور پہنچا تو وہ بھاگ کر پہاڑوں پر چلا گیا۔ سلطان دہلی واپس آ گیا۔

مغلوں کا حملہ

729ھ/1328ء میں ترمہ شیرین نے جو قتلغ خواجہ کا بھائی تھا دہلی پر چڑھائی کی۔ یہ قتلغ خواجہ وہی ہے جس نے اس سے قبل ہندستان پر حملہ کیا تھا۔ ترمہ شیرین نے لاہور 26 کے سامانہ اور اندری سے بدایوں تک بہت سے قلعے فتح کر لیے اور اس علاقے میں بڑی لوٹ مار مچائی جب اس کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر بڑھا تو سب چھوڑ چھاڑ الٹے پاؤں بھاگ گئے۔ بادشاہ نے کلانور تک ان مغلوں کا پیچھا کیا اور وہاں کا قلعہ ڈھانے کے لیے مجید الدین بورجا کو مقرر کر کے دہلی واپس آ گیا۔

سلطان کی سختی

سلطان کو دوآبہ 27 کے درمیانی علاقہ کی رعایا سے بھی سرکشی اور بغاوت کی سخت شکایات تھیں۔ اس لیے اس نے ان پر بھاری خراج لگا دیا۔ اس علاقے کی غریب رعایا پر عمال نے بھی طرح طرح کے ظلم توڑنے شروع کر دیے۔ ان کے مظالم سے تنگ آ کر لوگ وہاں سے بھاگ گئے جس سے سارا علاقہ اُجڑ گیا۔ جو لوگ باقی رہ گئے انھوں نے قزاقی اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنا لیا۔

دہلی کی ویرانی

سلطان نے دوسرا سخت حکم دہلی والوں کو یہ دیا کہ جو بھی لوگ شہر میں دولت آباد جانے سے رہ گئے ہیں وہ سب کے سب تیز دہلی کے اردگرد کی ساری رعیت بھی دولت آباد منتقل ہو جائے۔ سلطان نے سارے مکانات خرید لیے شاہی خزانہ سے ان کی قیمت لوگوں کو ادا کی گئی۔ اس طرح دولت آباد تو خوب آباد ہو گیا۔ لیکن دہلی 28 ایسی اُجڑی کہ وہاں کتوں اور بلیوں کے سوا کوئی نہ رہا۔

تانبے کا سکہ

سلطان کی ان انوکھی تدبیروں سے خزانہ بالکل ہی خالی ہو گیا۔ تلافی کے لیے اس نے تانبے کے سکے کو رواج دیا اور اس کی قیمت چاندی کے سکے کے برابر رکھی۔ جو اس شرح پر لینے میں تامل کرتا تھا۔ اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اس کاروائی سے بھی ملک بھر میں بڑی خرابی اور انتشار پھیلا۔ مفلس اور شر پسند لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں ٹکسالیں بنا لیں۔ وہ تانبے پر سکہ لگا کر بازار سے سونا، چاندی، گھوڑے ہتھیار اور ہر طرح کا عمدہ سامان خرید لیتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان لوگوں نے کافی دولت پیدا کر لی۔ غیر ملک کے پردیسی چونکہ تانبے کے سکے کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرتے تھے اس لیے بہت سے کاروبار

مندے ہو گئے۔ جب یہ تشویشناک صورت حال پیدا ہو گئی تو سلطان نے حکم دیا جس کے پاس تانبے کا سکہ ہو خزانہ میں داخل کر دے اور اس کے عوض چاندی کے سکے لے جائے۔ اس حکم کے صادر ہوتے ہی لوگوں نے من کا من تانبہ خزانہ میں داخل کر دیا اور ڈھیروں چاندی معاوضہ میں حاصل کر لی۔ اس بہانے سے لوگوں کے ہاتھ کافی دولت آ گئی اور بادشاہی خزانہ تانبے سے بھر گیا۔ [29]

ہمالیہ پہاڑ کی مہم

738ھ/1337ء میں سلطان نے ہماچل [30] کی پہاڑی کی مہم کے لیے اسی ہزار سواروں کی ایک فوج کو روانہ کیا۔ ہماچل کی پہاڑی چین اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ اسے قراچل کی پہاڑی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس مہم کی فوج کو حکم تھا کہ فاصلہ بہ فاصلہ رسد کے بندوبست کے لیے کچھ آدمیوں کو چھوڑتے جائیں۔ اس پہاڑ کی ایک عجیب خصوصیت ہے کہ وہاں آدمیوں اور گھوڑوں کے شوروغل سے بادل گھر آتے ہیں اور شدت کی بارش ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جب یہ فوج پہاڑ پر چڑھنے لگی تو برف باری اور بارش بکثرت ہونے لگی اور رسد کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ کھانے کو نہ ملا تو جو راہ دار راستے میں مقرر کیے گئے تھے وہ وہاں سے چلتے بنے اور ساری فوج نہایت پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ پہاڑی قوموں نے موقع پا کر حملہ کر دیا اور اس فوج کو شکست دے کر بھگا دیا۔ فوج بھاگ کر بھی پناہ حاصل نہ کر سکی۔ چٹانوں پر سے پتھروں کی مار، بس خدا کی پناہ۔ ان مصیبتوں سے شاہی لشکر کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ اور ہزاروں پہاڑیوں کی قید میں چلے گئے۔ جو بچے، مدتوں ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہے۔ کچھ لوگ جو مصیبتیں اٹھاتے، آفتیں جھیلتے وطن پہنچے تو بادشاہ نے بھاگ آنے کے جرم میں ان کو قتل کرا دیا۔ ایسی منظم اور آراستہ فوج پھر بادشاہ کو نصیب نہ ہو سکی اور وہ سارا روپیہ جو اس مہم میں لگا تھا خاک میں مل گیا۔

بنگال کی بغاوت

739ھ/1339ء میں سنارگاؤں کے حاکم بہرام خان کا انتقال ہوگیا۔ اسی سال ملک فخر الدین سلاحدار نے بغاوت کا رخ اختیار کیا اور اپنے آپ کو بادشاہ کہنے لگا۔ لکھنوتی کے حاکم قدر خان نے ملک حسام الدین ابوارجا اور اعز الدین یحییٰ اعظم الملک کو اپنا حامی بنا کر فخر الدین کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے کر اس کا جمع کیا ہوا خزانہ اور مال واسباب چھین لیا۔ قدر خان نے بہت سا خزانہ اور طرح طرح کے نفیس تحفے بادشاہ کی پیشکش کے لیے اپنے گھر میں ذخیرہ کیے حسام الدین نے اس طرح اعلانیہ مال اور روپیہ جمع کرنے سے منع کیا اور اسے سمجھایا کہ مال کی لالچ میں لوگ دشمن بن جاتے ہیں اور طرح طرح کے فتنہ پیدا کرتے ہیں لیکن قدر خان نے اس عاقلانہ مشورے کو قبول نہ کیا۔ آخر حسام الدین کا کہنا ہی سامنے آیا۔ ملک فخر الدین دوبارہ تیاری کر کے مقابلے پر آگیا اور اس نے قدر خان کے آدمیوں کو اندر ہی اندر اپنے ساتھ ملالیا۔ چنانچہ قدر خان کو اسی کے آدمیوں نے مار ڈالا اور وہ سارا مال اور روپیہ فخر الدین کو مل گیا نیز سنار گاؤں کی حکومت بھی مفت ہاتھ آگئی۔ اس نے اپنے غلام مخلص نامی کو لکھنوتی کی طرف روانہ کیا۔ لیکن قدر خان کی فوج کے سردار علی مبارک نے مخلص کو قتل کر دیا اور خود حاکم بن کر بیٹھ گیا۔ پھر بادشاہ کے پاس بھی مصلحت آمیز عرضیاں دہلی روانہ کیں۔ سلطان نے فخر الدین پر حملہ کرنے کے لیے ملک یوسف کو مقرر کیا لیکن وہ راستے میں ہی مرگیا۔ پھر بادشاہ کچھ دوسرے معاملات میں ایسا الجھ گیا کہ اس طرف کوئی توجہ نہ کر سکا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر فخر الدین کے علی الرغم علی مبارک نے اعلانیہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا خطاب سلطان علاء الدین رکھ لیا۔

بنگال کا پہلا سلطان

کچھ دن بعد ملک الیاس حاجی نے جس کی جمعیت کافی بڑی تھی۔ لکھنوتی کے بعض امیروں سے سازباز کر کے علاء الدین کو قتل کر دیا اور اپنا خطاب شمس الدین رکھ کر تخت پر

بیٹھ گیا۔ 741ھ/1340ء میں سلطان نے سنار گاؤں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا اور فوجی کاروائی کر کے فخر الدین کو گرفتار کر لیا۔ اسے لکھنوتی لا کر قتل کر دیا۔ شمس الدین اس طرح لکھنوتی کا حاکم بنا رہا۔ اس کی اولاد نے مدتوں یہاں حکومت کی۔

دکن کی بغاوت

سلطان کی آئے دن کی سختیوں اور خون ریزیوں سے تنگ آ کر معبر[31] میں ملک ابراہیم خریطے دار شاہی کے باپ سید حسن کیتھل نے جو حسن کانگو کے نام سے مشہور تھا سرکشی اور بغاوت کی اور اپنا خطاب علاء الدین بہمن شاہ رکھ کر اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ وہاں جو شاہی لشکر تھا وہ بھی اس کا حامی ہو گیا تھا۔ اس لیے جس نے اس کی مخالفت کی اس کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلطان لکھنوتی سے دیوگیر پہنچا اور وہاں سے تلنگانہ تک گیا مگر وہاں جا کر بیمار پڑ گیا مجبوراً وہ واپس ہوا اور رات دن کے سفر کر کے دہلی واپس آ گیا۔ بادشاہ نے قتلغ خان کو دولت آباد کے بندوبست کے لیے وہاں چھوڑ دیا تھا لیکن معبر کا فتنہ دب نہ سکا۔

کھوکھروں کی بغاوت

743ھ/1342ء میں ملک ہلاجون، گل چند کھوکھر[32] اور ملک تتار خرد نے بغاوت کر کے لاہور کے حاکم کو قتل کر دیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہان کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ باغیوں نے مقابلہ کیا لیکن شاہی لشکر سے بری طرح شکست کھا کر بھاگ گئے۔ 744ھ/1343ء میں بادشاہ نے سنام اور سامانہ سے آگے بڑھ کر کیتھل کے سیدوں پر حملہ کیا اور سید حسن کیتھل کے بغض اور حسد میں یہاں کے تمام سیدوں کا قتل عام کرا دیا۔ ان کے علاقہ میں پٹھانوں کو بسا کر ان کو جاگیریں، خلعتیں اور زری پٹکے عطا کیے۔

دہلی کی جانب واپسی

اسی سال 744ھ/1343ء میں سخت قحط پڑا، بادشاہ نے حکم دیا کہ جس کا جی چاہے پورب کے ملکوں میں چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد چھوڑ کر دہلی میں جا بسے۔ اسی سال خراسان، عراق اور سمرقند سے کافی تعداد میں لوگ بادشاہ کی بخششوں کا حال سن کر ہندستان آئے۔ چنانچہ جدھر دیکھو انہی کے قافلے نظر آتے تھے۔

خلافت کا فرمان

اس سال حاجی سعید مصری خلیفہ عباسی کی طرف سے جو مصر میں برائے نام خلیفہ تھا، بادشاہ کے لیے فرمان خلافت، نشان، خلعت اور ناصر المومنین کا خطاب لائے۔ بادشاہ اس دن شہر کے تمام اکابر و اعیان' مشائخ و سادات کو لے کر حاجی سعید کے استقبال کے لیے گیا۔ ننگے پیر ہو کر حاجی سعید کے پاؤں چومے اور ان کے پیچھے پیچھے جلوس چلا۔ خلیفہ کی اجازت اور فرمان کے آنے تک بادشاہ نے جمعہ اور عیدین کی جماعت موقوف کر رکھی تھی۔ اس دن نہایت خوشی کے ساتھ جماعت قائم کرنے کی اجازت دی۔ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس خطبہ سے متقدمین بادشاہوں کے نام ہٹا دیے، صرف سلطان محمود غزنوی کا نام رہنے دیا۔ حاجی سعید کو بادشاہ نے اتنا سونا اور تحائف دیے کہ خزانہ خالی ہو گیا۔ خلیفہ مصر کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ موتی کہ اس جیسا خزانہ میں دوسرا نہ تھا اور دوسرے قیمتی اور نادر تحفے روانہ کیے۔ فرمان خلافت کیا ملا، سلطان خود خلیفہ ہی بن بیٹھا۔ خلیفہ کا فرمان لے کر اس کے احکام سب کو سنایا کرتا تھا اور خلیفہ کے نام پر لوگوں کو بیعت کرتا تھا۔ سلطان کے نام خلیفہ کے اور بھی فرمان دو تین مرتبہ آئے۔ دوسری بار خلیفہ کی طرف سے مخدوم زادہ بغدادی آیا تھا۔ بادشاہ نے پیادہ پالم تک جا کر استقبال کیا۔ جب دور سے ان کی سواری نظر آئی تو بادشاہ نے آگے بڑھ کر ملاقات کی اور انھیں اپنے تخت پر برابر میں بٹھایا۔ مخدوم زادہ کو سلطان نے کیلی کا شہر اور وہاں کی ساری آراضی اور باغ جاگیر میں دے دیے تھے۔ 745ھ/1344ء میں کڑہ 33 کے

حاکم ملک نظام الدین نے بغاوت کی تھی۔ عین الملک کے بھائی شہر اللہ نے اودھ کی طرف سے حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور یہ بغاوت جلد ہی ختم ہو گئی۔

دکن کے باغی

اسی سال بیدر[34] میں شہاب الدین نے علم بغاوت[35] بلند کیا۔ بادشاہ نے قتلغ خان کو اس کی طرف روانہ کیا۔ شہاب الدین تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ قلعے میں بند ہو گیا۔ قتلغ خان نے اسے امن کا قول نامہ دے کر قلعے پر قبضہ کر لیا اور اسے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ 746ھ/1345ء میں ظفر خان علائی کے بھانجے علی شیر نے ایک بڑا جتھا بنا کر گلبرگہ[36] پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے بیدر کے شاہی ناظم کو قتل کر کے کافی مال و اسباب جمع کر لیا۔ قتلغ خان نے علی شیر[37] کو بھی شکست دی اور وہ بھاگ کر بیدر کے قلعے میں بند ہو گیا۔ قتلغ خان نے اسے گرفتار کر کے سرگدواری میں جو ضلع شمشاد میں واقع ہے اور جہاں شاہی لشکر ان دنوں مقیم تھا، بھیج دیا۔ بادشاہ نے ان قیدیوں کو پہلے تو غزنی کی طرف روانہ کرنے کا حکم دیا، پھر واپس بلوا کر ان کو قتل[38] کرا دیا۔

عین الملک کی بغاوت

747ھ/1346ء میں اودھ اور ظفر آباد[39] سے عین الملک کافی مال و اسباب اور نفیس تحفے بادشاہ کی نذر کے لیے لے کر آیا بادشاہ نے اس نذرانے سے خوش ہو کر طے کیا کہ قتلغ خان[40] کو دکن سے بلا کر عین الملک کو اس کی جگہ بھیج دے۔ اس تجویز سے عین الملک بجائے خوش ہونے کے دور دراز کے اندیشوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا وہم اس قدر بڑھ گیا کہ ایک رات موقع پا کر سرگدواری[41] سے بھاگ کر گنگا پار کی اور اودھ چلا گیا۔ اس کا بھائی شہر اللہ شاہی لشکر کے تمام ہاتھی اور گھوڑوں کو چرائی کے لیے جنگل میں چھوڑ آیا تھا۔ بادشاہ نے عین الملک کی سرکوبی کے ارادے سے کوچ کیا اور قنوج پہنچا۔ عین الملک کو

اس کے بھائیوں اور ملک فیروز نائب باربک کے آدمیوں نے جو شاہی لشکر کے ہاتھی گھوڑوں کی رکھوالی اور چرائی پر مقرر تھے۔ بادشاہ کے خلاف بھڑکایا اور مقابلے پر آمادہ کیا۔ عین الملک نے گنگا میں داخل ہو کر صف آرائی کر لی۔ لیکن بڑی غلطی یہ کی کہ ڈاکوؤں اور گنواروں کے طریقے پر پیادہ ہو کر حملہ کیا۔ بادشاہ کے ہاتھی سواروں اور تیر اندازوں نے گھیر کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ چنانچہ وہ جلد ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کے دو بھائی جس میں سے ایک کا نام شہر اللہ تھا اور اس کے دوسرے بہت سے حامی اور سردار گنگا میں ڈوب کر مر گئے اور جو تیر کر بمشکل پار پہنچے ان کو جاٹوں اور گنواروں نے لوٹ لیا اور ہلاک کر دیا۔ اس افراتفری میں عین الملک بھی پکڑا گیا اور اسے اس حال میں چار پائی پر برہنہ جسم باندھ دیا گیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ دن بعد بادشاہ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کر کے رہا کر دیا اور پھر مزید مہربانی اور عنایت کا اظہار کر کے دوبارہ اس کا علاقہ بھی اسے عطا کر دیا۔ اس بغاوت[42] کے ختم ہونے کے بعد بادشاہ سرگدواری سے دہلی واپس آ گیا۔ بادشاہ نے دولت آباد سے قتلغ خان کو واپس بلا لیا۔ قتلغ خان نے سارے دکن کو بخوبی سنبھال رکھا تھا۔ اس کے وہاں سے ہٹتے ہی دکن میں طرح طرح کے فتنے از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے۔

صدہ کے امرا کی سرکشی

سلطان نے عزیز خمار کو جو ایک کمینہ اور پست فطرت آدمی تھا مالوے کی حکومت پر متعین کر دیا۔ اس نے بادشاہ کے اشارے سے اکثر امرائے صدہ یعنی یوزباشی[43] کے امیروں کو قتل کر ڈالا۔ جس کی وجہ سے مالوے میں بڑے فتنے پیدا ہو گئے۔ اس قتل کا حال سن کر 748ھ/1347ء میں گجرات کے امرائے صدہ بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان امیروں نے خواجہ جہان کے غلام مقبل نامی پر جو گجرات میں وزیر کا نائب مقرر ہوا تھا اور کافی خزانہ لے کر سلطان کے پاس جا رہا تھا۔ تمام شاہی خزانہ، مال و اسباب گھوڑے وغیرہ لوٹ لیے۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے خود بادشاہ کو گجرات جانا پڑا۔ بادشاہ نے ملک علی

سرجان دار اور احمد لاچین کو بعض دوسرے امیروں کے ساتھ دولت آباد روانہ کیا تاکہ وہاں جاکر یہ لوگ دکن کے باغی امرائے صدہ کو گرفتار کرلیں۔ جب احمد لاچین مانک گنج کی گھاٹی میں پہنچا تو اسے امیران صدہ نے قتل کر ڈالا۔ عزیز خمار ان باغی امیروں کی سرکوبی کے لیے گجرات سے دیوہری اور بڑودہ[44] کی طرف گیا تھا لیکن وہ بھی مقابلہ کرتے کرتے گرفتار ہوگیا۔ ان ناکامیوں اور امیران صدہ کی خودسری کی خبریں سن کر بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جب یہ خبر ملک بھر میں عام ہوگئی تو ہر مقام کے امیر باغی بن بیٹھے سب نے اپنے اپنے گروہ بنا کر بادشاہ کی کھلے عام مخالفت شروع کردی۔

دولت آباد پر حملہ

ان باغی امیروں نے ملک عالم کے کارندوں سے دولت آباد کا قلعہ بھی چھین لیا اور اسماعیل فتح خان نامی ایک امیر کو سلطان ناصر الدین[45] کا خطاب دے کر بادشاہ بنا لیا۔ دیوہری اور بڑودہ کے امیران صدہ پر بادشاہ نے خود چڑھائی کی۔ وہ بھی شکست کھا کر دولت آباد آگئے۔ اس طرح دولت آباد باغیوں اور سرکشوں کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ سلطان نے پوری تیاری کے ساتھ دولت آباد پر حملہ کیا۔ اسماعیل مذکور نے شاہی لشکر کا تھوڑا بہت مقابلہ کیا، آخر شکست کھا کر اس نے دھارانگر یعنی دولت آباد کے قلعے میں پناہ لی۔ اس فتنے میں بھی ہزاروں مسلمان دولت آباد میں قتل وقید ہوئے۔ کچھ صدہ امرائے صدہ بیدر کی طرف بھاگ نکلے۔ بادشاہ نے عماد الملک سرتیز کو ان کے تعاقب پر مقرر کیا، ابھی بادشاہ ان باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا کہ گجرات میں غدر ہو جانے کی خبریں ملیں۔ معلوم ہوا کہ ملک طغی نے گجرات کے حاکم ملک مظفر کو قتل کر دیا ہے اور تمام گھوڑوں اور مال و اسباب پر قبضہ کرلیا ہے۔ ان تشویشناک خبروں کے سنتے ہی بادشاہ نے ملک جوہر اور خداوندزادہ، قوام الدین اور شیخ برہان بلگرامی کو دھارانگر چھوڑا اور خود تلنگانہ[46] سے گجرات چلا گیا۔

حسن کانگو بہمنی

بادشاہ کے جاتے ہی تمام امیران صدہ جو دولت آباد سے بھاگ گئے تھے، پھر اکٹھے ہو گئے۔ عماد الملک سرتیز سے مقابلہ کر کے اسے قتل کر دیا اور دولت آباد پر حملہ کر دیا۔ ملک جوہر اور قوام الدین وغیرہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور شہر خالی کر کے بھاگ گئے۔ حسن کانگو جو تمام امیران کا سردار اور اس بغاوت کا سرغنہ تھا شہر پر قبضہ کر لیا اور اسمٰعیل فتح کو علاحدہ کر کے خود سلطان علاء الدین کے خطاب سے بادشاہ بن گیا۔ اس وقت سے دولت آباد کی سلطنت اس کے خاندان سے متعلق ہو گئی۔ تاریخ ''فتوح السلاطین'' بھی اسی کے نام پر نظم میں لکھی گئی ہے۔

محمد تغلق کی پریشانیاں

گجرات میں ملک طغی نے دو مرتبہ شاہی فوج کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا وہ قزاقوں کی طرح جگہ جگہ مارا مارا پھرتا تھا۔ بادشاہ بھی برابر اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے بادشاہ نے دہلی سے ملک فیروز کو بھی بلا لیا تھا۔ اسی سال ملک گیر نے جو ملک قبول کا بیٹا تھا، انتقال کیا۔ بادشاہ کے سارے معاملات کی سربراہی اسی کے ذمہ تھی۔ اس کی طرف سے بادشاہ نے ایک خط مصر کے خلیفہ عباسی کے پاس حاجی برقعی کے ہاتھ روانہ کیا تھا۔ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کے اس آخری عہد میں سارے ملک کا انتظام، احمد ایاز خواجہ جہان، ملک قبول، قوام الملک دہلی میں بیٹھ کر سرانجام دیتے تھے۔ بادشاہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرگرداں پھر رہا تھا۔ اس وقت بغاوتوں اور فتنوں کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف کے بندوبست سے بادشاہ فارغ نہیں ہوتا تھا کہ دوسری طرف غدر برپا ہو جاتا تھا۔

محمد تغلق کی غلطیاں

سلطان محمد تغلق کے اس آخری عہد میں ملک کی جو تباہی اور بربادی ہوئی اس کی وجوہ "تاریخ فیروز شاہی" اور "مبارک شاہی" کے مصنفوں نے تحریر کی ہیں ان تمام اسباب وجوہ کا خلاصہ یہ سات باتیں ہیں:

(1) زمہ شرین مغل کی تباہ کن غارت گری۔

(2) دوآبہ کے وسیع علاقے میں دس گنا اور بیس گنا محصول مقرر کیا جاتا، نہ صرف یہ بلکہ گاؤ شماری اور خانہ شماری کے اخراجات علاحدہ وصول کیے گئے اور غریب رعایا تنگ آکر مفسد امیروں کے جتھے میں شامل ہوگئی اور بغاوت و غارت گری کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اس طرح محصول زیادہ وصول ہونے کے بجائے کم ہو گیا اور سارے دوآبے کا علاقہ اجڑ گیا۔

(3) ایک طویل اور تباہ کن قحط پڑا جو سات سال جاری رہا۔

(4) بادشاہ نے دہلی کو برباد کر کے دولت آباد بسانا چاہا اور جب ساری دہلی اجڑ گئی تو اس میں گردونواح کے گنواروں کو لا کر بسایا گیا۔ پھر انھیں بھی جبراً دولت آباد ہانک دیا گیا۔ اس جلا وطنی سے دہلی والوں کا سارا مال و متاع تلف ہو گیا اور وہ ساز و سامان پھر نصیب نہ ہو سکا۔

(5) ہمالیہ پہاڑ کی مہم میں اسی ہزار کا سوارا سجایا اور تمام جنگی امور سے آراستہ و پیراستہ لشکر تمام کا تمام تباہ و برباد ہو گیا۔

(6) لوگوں کو بادشاہ کی خون ریزی کے شوق کی وجہ سے اپنی اپنی جانوں کا بڑا ڈر ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر انھوں نے سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار کی۔ ان فتنوں میں بہت سے بے قصور لوگ مارے گئے اور شاہی کارندوں نے اکثر جھوٹی تہمتیں لگا لگا کر انھیں اور ان کے خاندانوں کو قتل کرا دیا۔ غرض ہر طرح سے مخلوق تباہ اور شہر ویران ہونے لگے۔

(7) بادشاہ کو قتل اور خون ریزی کا کچھ ایسا جنونی شوق تھا کہ اس نے سیدوں، عالموں، مشائخوں، شریفوں، کمینوں، پیشہ وروں، تاجروں، کسانوں اور سپاہیوں غرض ہر طبقے

اور ہر گروہ کے بے شمار آدمیوں کو بے تامل قتل کرادیا۔ چنانچہ اس کے دروازے پر عموماً لاشوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ جلاد مارتے اور بھنگی اٹھاتے اٹھاتے عاجز ہو گئے تھے۔ مگر نہ رعایا فساد سے باز آئی تھی اور نہ بادشاہ خون ریزی سے، آخر اس کثرت سے فتنے برپا ہوئے کہ بادشاہ عاجز آ گیا۔ اسے ان بغاوتوں کی وجہ سے اتنے سفر کرنے پڑے کہ دم بھر کے لیے چین لینا حرام ہوگیا۔ لیکن اس بندہ خدا نے تلوار نیام میں نہ ڈالی، حالانکہ اس خون ریزی سے کسی فائدے کے بجائے روز خرابیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

خونی شاہ

سلطان محمد تغلق کو غالباً سزائیں دینے میں خاصا لطف ملتا تھا،48 جسے اس نے اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا۔ وہ بڑے اہتمام کے ساتھ سزائیں دیا کرتا تھا۔ اس کی عدالت میں چار مفتی علاحدہ علاحدہ مقرر تھے جب کوئی شامت کا مارا کسی جرم میں پکڑا ہوا آتا تو بادشاہ اس کی سزا دینے کا ارادہ کر کے ان مفتیوں سے باقاعدہ بحث کرتا، مفتیوں کو یہ تاکید بھی کر رکھی تھی کہ تم سچ کہنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہ کرنا، اگر کوئی ناحق مارا گیا تو اس کا ذمہ تمہاری گردن پر ہوگا۔ ان مفتیوں سے جی بھر کر جرح اور بحث کرنے کے بعد انھیں قائل کرتا اور خواہ آدھی رات ہی کا وقت کیوں نہ ہو مجرم کو قتل کرا کر ہی دم لیتا، صبح تک انتظار کرنا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا تھا۔ اگر مفتیوں کی کسی پر زور دلیل سے خود اسے قائل ہو جانا پڑتا تو مقدمہ کو دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیتا، پھر فرصت میں مفتیوں کے دلائل کے جوابات سوچ کر ان سے دوبارہ بحث کرتا۔ اس بحث میں مفتی اور قاضی لاجواب ہو جاتے تو اسی وقت مجرم کو قتل کروا دیتا اور اگر اس بار بھی خود اسے بحث میں ناکامی ہوتی تو چاروناچار مجرم کی جان بخشی پر راضی ہو جاتا۔

شیخ زادہ جام[49] کی حق گوئی

ایک دفعہ بادشاہ قاضی کمال الدین صدر جہان کی عدالت میں پیدل اور ننگے پیر چلا گیا اور فریاد کی کہ شیخ زادہ جام نے مجھ کو ظالم کہا ہے اس کو طلب کرو تاکہ وہ میرا ظلم ثابت کرے، اگر نہ کر سکے تو اس پر تم حد شرعی جاری کرو۔ عدالت کے حکم سے شیخ زادہ موصوف حاضر ہوئے اور اعلانیہ اقرار کیا کہ ”میں بے خوف و خطر اور شک کے تم کو ظالم کہتا ہوں۔ بادشاہ نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ”جس کسی کو تم حق یا ناحق سزا دیتے ہو اس کے اہل و عیال کا کیا قصور ہوتا ہے کہ ان کو بھی جلاد کے حوالے کر دیتے ہو، یہ کون سے مذہب و ملت میں جائز ہے“؟ یہ سن کر بادشاہ لاجواب ہو گیا اور اپنا سا منہ لے کر عدالت سے اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن ظالم نے اس حق گو بیباک شیخ زادہ کو لوہے کے پنجرے میں قید کر دیا۔ جب دولت آباد گیا تو اس مظلوم مرد خدا کا پنجرہ بھی ہاتھی پر رکھا ہوا ہمراہ تھا۔ دولت آباد سے لوٹ کر دہلی آیا تو اس خونی سلطان نے دار القضہ کے آگے پنجرہ کھلوایا اور شیخ زادہ کو باہر نکال کر اپنے سامنے اس کے دو ٹکڑے کروا دیے۔

ٹھٹھہ پر چڑھائی

جب سلطان محمد تغلق کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو ملک کے نظم و نسق اور امور مملکت میں بڑا خلل اور انتشار پیدا ہو گیا اور وہ اپنی پوری سعی و جہد کے باوجود ان فتنوں کا کسی صورت میں تدارک نہ کر سکا۔ اپنی اس بے بسی اور لاچاری پر اس قدر رنج و غم ہوا کہ آخرکار اس غم نے تپ دق کی صورت اختیار کر لی۔ اسی حالت مرگ میں بادشاہ نے آخری کوشش کی اور ٹھٹھہ پر جہاں ملک طغی نے پناہ لے رکھی تھی یورش کی۔ خوش قسمتی سے اسی موقعے پر شاہ خراسان[50] کے نائب قرغن نے التون بہادر کی سرکردگی میں پانچ ہزار سوار اس کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ اس بروقت امداد سے بادشاہ کو بڑی خوشی اور ایک گونہ اطمینان ہو گیا جس سے اس کے مرض میں بھی قدرتی طور پر کچھ کمی ہو گئی۔

محمد تغلق کی وفات

غرض جب وہ لاؤ لشکر لے کر ٹھٹھہ میں داخل ہوا تو عاشورہ کے دن اس نے روزہ رکھا۔ ان دنوں گرمی کافی شدت سے پڑ رہی تھی، اس پر یہ حرکت کی کہ افطار میں مچھلی کھالی، مرض میں یکبارگی شدت آ گئی جو اس کی جان ہی لے گئی۔ سلطان محمد عادل شاہ تغلق نے 21 محرم 752ھ/ 1351ء میں ٹھٹھہ میں انتقال کیا اور ہندوستان کی رعایا کو اس کے خونی پنجے سے رہائی ملی۔ اس کے زمانے کے مشہور شاعروں میں بدر چاچ گزرا ہے جس نے اس کے نام پر تیس ہزار اشعار کا شاہنامہ نظم کیا ہے۔

حواشی

1 فرشتہ نے شوال 716ھ/1316ء لکھا ہے اور یہ سن صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ علاء الدین کی وفات 716ھ/1316ء میں ہوئی تھی اور دوسرے ہی دن ملک کافور نے شہاب الدین کو تخت پر بیٹھایا تھا۔

2 یہ سن بھی غلط معلوم ہوتا ہے۔ 716ھ/1316ء میں وہ بادشاہ بنا تھا وہ اس سن میں کیسے مارا گیا؟

3 امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں تخت نشینی کا سن نظم کیا ہے:

سنہ شانزدہ بعد ہفتصد شدہ
کہ سلطان بہ تخت زبرجد شدہ

4 یہ گجرات کی ایک ادنیٰ قوم ہے جو خدمت گزاری اور معمولی کاموں پر بسر اوقات کرتی تھی۔ یہ نام "بردار" "براؤ" "بروار" تینوں طرح لکھا گیا ہے۔

5 امیر خسرو نے اس واقعہ پر جو مثنوی لکھی ہے اس کے چند شعر یہ ہیں:

که چون مبارک شاه بی مهر
زتلخی گشت بر خویشان ترش چهر
نهان سوی خضر خان کس فرستاد
نموداری بعذر ازدل برون داد
دول رانی که در پیشت کنیز است
کنیز ار مه بود هم سهل چیز است
دول رانی که با فرخندگی بود
خضر خان را ز لال زندگی بود
بر آمد جان عاشق خون نشانان
ولی می گشت گردا گرد جانان
گلی کزوی چکیدی قطره خوئی
فشاندی خون صد روی بروئی
بجای آب ازان گل خون کشیدند
تنک کن تا گلابش چون کشیدند

6 امیر خسرو نے مثنوی "خضر خان اور دیول رانی" میں اس قتل کا سبب اس طرح بیان کیا ہے کہ مبارک شاہ نے خضر خان کو پیغام بھیجا کہ میں تجھے علاقے کا حاکم بنا دونگا اگر تم دیول رانی کو میرے پاس بھیج دو لیکن خضر خان نے انکار کر دیا:

چو با من همسر است این یار جانی
سر من دور کن زان پس بدانی

بادشاہ اس جواب پر ناراض ہو گیا:

به تندی سر سلاحی راطلب کرد
که باید صد گروه امروز شب کرد
او اندرگالیور این دم نه بس دیر
سر شیران ملک افگن به شمشیر

فرشتہ اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے: ”شادی کٹھ سردار سلاح داران کو گوالیار بھیجا کہ وہ خضر خان اور شادی خان کو قتل کر دے اور ان کے اہل وعیال کو دہلی لے آئے۔ سلطان قطب الدین نے دیول رانی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ ضیاء الدین برنی بھی ”تاریخ فیروز شاہی“ میں اس شخص کا نام جسے قطب الدین نے ان دونوں بھائیوں کے قتل کے لیے گوالیار بھیجا تھا شادی خان کٹھ سر سلاح داراں ہی لکھتا ہے۔

ج گوالیار کا قلعہ 342 فٹ بلند ایک پہاڑی پر واقع ہے، ڈیڑھ میل لمبا اور تین سو گز چوڑا ہے۔ دروازے پر ہاتھی کی مورت کھڑی ہے۔ اس دروازے کو ہاتھی پول بھی کہتے ہیں۔ قلعۂ گوالیار کی مشرقی جانب پہاڑی کے نیچے شیخ محمد غوث گوالیاری کی خانقاہ قابل دید عمارت ہے۔ راج محل راجہ مان سنگھ نے 1486ء- 1516ء میں بنوایا تھا۔ محققین جناب ہنٹر اور ولفورڈ صاحب کی تحقیق کی بنا پر گوالیار کا قلعہ راجہ سورسین نے 773ء میں بنوایا تھا۔ 1023ء میں محمود غزنوی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ 1199ء میں محمد غوری نے اسے فتح کیا۔ 1211ء میں شاہان دہلی کے قبضے سے نکل گیا۔ 1231ء میں شمس الدین التمش نے اسے فتح کیا۔ اکبر کے زمانے میں یہ امراء اور شاہزادوں کے لیے قید خانہ بنا دیا گیا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق اس کے زمانے میں بھی اس قلعے کا استعمال بطور قید خانہ ہی ہوتا تھا۔ بابر نے بھی ہتیاپول کا ذکر اپنی توزک میں کیا ہے۔ ابوریحان بیرونی نے بھی گوالیار کے قلعے کا ذکر کیا ہے۔ قلعے کے اندر ایک تالاب سورج

کنڈ نامی ہے، کہتے ہیں 300ء میں راجہ بسواپتی نے سورج کے ایک مندر کے ساتھ بنوایا تھا۔ مغربی جانب ڈھونڈہ دروازے کے مقابل قلعے کی حد سے باہر نکلا ہوا وہ تاریخی قید خانہ ہے جس میں امراء اور شاہزادے قید رہتے تھے، "اس کو نوچوکی" کہتے تھے۔ تان سین مشہور موسیقار کا مقبرہ بھی اسی قلعے میں ہے نیز اس میں ایک خوبصورت مسجد ہے جو عالمگیری دروازے کے پاس ہے معتمد خان کی بنوائی ہوئی ہے۔ کرنل سلیمن لکھتا ہے "یہ مسجد ایسی خوبصورت ہے گویا اس پر سے آج ہی معمار اترے ہیں۔"

8 ملی، پہاڑ کو کہتے ہیں اور بار کے معنی ملک کے ہیں۔ قدیم زمانے میں اسے "کرالہ" کہتے تھے۔ فی الوقت اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ 827ء میں اس علاقے کے راجہ چیرامن پیرومل نے اسلام قبول کیا اور وہ ہجرت کر کے عرب کے ساحل ظفار چلا گیا تھا۔ وہاں 831ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کی قبر ظفار میں ہے۔ اس نے ہجرت سے قبل اپنے ملک کو اپنے سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ فرشتہ نے لکھا ہے: "عراق عرب کے کچھ درویش باوا آدم کے قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ (سری لنکا) گئے، راستے میں سامری کے دارالخلافہ کرنگلور میں قیام کیا۔ راجہ نے پیغمبر اسلام کے معجزے ان سے سنے اور شق القمر کے متعلق اپنے پستک نویسوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک دفعہ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ ان کی پستک (کتاب) میں درج ہے۔ اس تصدیق سے وہ ایمان لے آیا، بعد میں وہ انہی زائرین کے ساتھ پوشیدہ طریقے پر جہاز میں سوار ہو گیا۔ حضر موت کے بندر شہر میں چلا گیا اور وہیں مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے مالک بن دینار کے ذریعے اپنے مقرر کردہ راجاؤں کے پاس وصیت بھیجی کہ عرب تاجروں کو مسجد، سرائے، مکان بنانے کی اجازت دی جائے۔ مالک بن دینار نے راجاؤں کی اجازت سے کرنگا نور، کولم، ہیلی مارادی، جرفتن، درفتن، فندرینہ، چالیات، وناکنور اور بنگلور میں نو مسجدیں بنائیں۔ سرزمین ہند

میں خدا کے یہ پہلے گھر تھے جن کے ذریعے اس ساحلی علاقے میں اسلام پھیلا۔

9 فرشتہ نے فرار کا وقت رات کے بجائے دوپہر لکھا ہے۔ ابن بطوطہ بھی دن کا وقت ہی بتلاتا ہے۔

10۔ اچھ۔ اوچھ۔ اچہ۔ اب یہ پاکستان کے بہاول پور ضلعے میں واقع ہے۔ یہاں سے ملتان کا فاصلہ 70 میل ہے۔ کننگھم صاحب کا خیال ہے کہ یہ شہر سکندر اعظم نے بسایا تھا۔ ناصر الدین قباچہ کے وقت یہ شہر سندھ کا دارالخلافہ تھا۔ بخاری اور گیلانی سادات کی سکونت اسی جگہ رہی۔ سید جلال الدین بخاری اور مخدوم جہانیاں کے مزار اسی شہر میں ہیں۔

11 سرتی۔ قدیم تاریخوں میں سرسہ کا نام سرتی لکھا ہے۔ آئین اکبری میں سرسہ ہے۔ یہ شہر دریائے سرسوتی کے کنارے واقع تھا اور اس کے نام سے منسوب تھا۔ پرانا شہر 726ء کے قحط میں برباد ہو گیا۔ ابن بطوطہ نے یہاں کے چاولوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس وقت شاید چاول اچھا اور بکثرت ہوتا تھا۔

12 بیاس ندی کے قریب اور پاکستان کے پٹن سے 28 میل مشرق کی جانب یہ شہر تھا۔ کننگھم صاحب کی تحقیق کے مطابق اس شہر کو راجہ دیو پال نے آباد کیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے یہاں ایک نہر بنوائی تھی۔ غلاموں اور خلجیوں کے وقت میں یہ شہر پنجاب کا دارالخلافہ تھا۔ چونکہ یہ لاہور اور ملتان کے درمیان واقع تھا اس لیے سیاسی نقطہ نظر سے اور خصوصاً تیموری اور چنگیز خانی حملوں کی روک تھام کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی، یہاں سے دونوں سمتوں کی حکمرانی کا اچھا انتظام ہوتا تھا۔ تیمور کے حملے کے وقت ملتان کے مشابہ شہر تھا۔ بابر کے وقت لاہور کے مشابہ شہر تھا۔

13 ابن بطوطہ اپنی تصنیف میں اس کا نام کشلو خان لکھتا ہے۔ لیکن یہ کشلو خان اس کا خطاب تھا نام نہیں۔

14 تھانیسر قدیم آریاؤں کا پہلا پڑاؤ ہے۔ اسی شہر سے ہندو مذہب اور تہذیب نے

جنم لیا۔ یہاں پر ہندوؤں کی پرانی زیارت گاہ ہے 1014ء میں سلطان محمود غزنوی نے اس شہر پر حملہ کیا۔ یہاں کی دلچسپ عمارت شیخ چلی کا مقبرہ ہے، جو اکبر کے عہد کا بنا ہوا ہے۔ تھانیسر ہندوؤں کے مقدس تالاب کھیتر کی وجہ سے مشہور ہے یہاں ہندو مذہب کے لوگ غسل کرنے آتے ہیں۔ مہابھارت کی مشہور تاریخی جنگ بھی اسی شہر کے نواح میں ہوئی تھی، ہندوؤں کے نزدیک یہ شہر نہایت ہے۔

15۔ وہار۔ بحوالہ آئین اکبری، وہار راجہ بھوج کا پایہ تخت تھا، پوار راجاؤں کا پہلا دار الخلافہ اجین تھا، بھوج نے وہار کو اپنا دار السلطنت بنا لیا تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں مالوہ کا دار الخلافہ اول وہار ہی تھا بعد میں مانڈو (مندو) مقرر ہوا۔

16۔ ابن بطوطہ کے مطابق اس وقت خسرو خان کا لشکر مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھا۔

17۔ ابن بطوطہ کے مطابق: خسرو خان پیش ہوا تو اس نے کھانا مانگا اسے کھانا کھلایا گیا۔ پھر اس نے کہا مجھے رسوا نہ کرو اور میرے ساتھ شاہانہ سلوک کرو۔ غازی الملک نے اسی جگہ جہاں قطب الدین قتل ہوا تھا، لے جا کر اسے قتل کرا دیا اور اس کی لاش چھت سے نیچے پھنکوا دی۔

18۔ ابن بطوطہ کے مطابق "تغلق" قوم سے ترک قرونہ تھا۔ یہ لوگ ترکستان اور سندھ کے پہاڑوں میں رہتے تھے۔ مارکو پولو نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے: "قرونہ ان کو کہتے ہیں جن کے باپ تاتاری اور ماں ہندستانی ہوں، ان کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی (رہزنی) ہے۔ دوسری تاریخ سے معلوم ہوتا ہے پہلے قرونہ کا طومان (دس ہزار کا دستہ) مغلوں کے لشکر کے ساتھ رہا کرتا تھا بعد میں انھوں نے رہزنی کے پیشے کو اپنا لیا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے: میں نے بادشاہ تغلق کے نسب کی بابت لاہور اور دوسرے شہروں میں ہر چند تحقیقات کیں مگر کچھ پتہ نہ چلا" نوادر المعانی" میں تغلق اور قتلغ کے معنی "اوسط" "اور درمیانہ" لکھے ہیں۔

19۔ چندیری۔ یہ شہر بیتوا ندی کے کنارے تھا اب ایک گاؤں رہ گیا ہے۔ پہاڑی پر

ایک سنگین قلعہ اب بھی موجود ہے۔ بابر نے اس قلعے کا مفصل بیان اپنی توزک میں اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں کیا ہے۔ ان کتابوں کی روشنی میں اس شہر میں چودہ ہزار سنگین مکان، تین سو چوراسی بازار، تین سو ساٹھ سرائیں اور بارہ ہزار مسجدیں تھیں۔ اس تعداد میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ اس شہر میں ایک مندر اس قدر بڑا تھا کہ نقارہ بجنے کی آواز اس مندر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ بابر لکھتا ہے میں نے اس قلعے کو تین گھڑی میں فتح کر لیا تھا۔

20 عہد غیاث الدین تغلق کا ایک مشہور فارسی شاعر ہے۔

21 لکھنوتی۔ قدیم گوڑ کا نام تھا۔ یہ بنگال کے ہندو راجاؤں کا دارالسلطنت تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شہر کا نام لکشمن وتی یعنی لکھنوتی اور علاقہ کا نام گوڑ بنگالہ تھا۔ 1204ء میں جب مسلمانوں نے بنگال کو فتح کیا تو اپنا دارالحکومت اسی کو بنایا۔ فیروز شاہ تغلق نے 751ھ/1351ء میں لکھنوتی پر حملہ کیا تو اس کا نام فیروزآباد رکھا۔ جب گنگا کی وہ شاخ خشک ہو گئی جس پر یہ شہر آباد تھا تو دلدل کی وجہ سے شہر کی آب و ہوا بگڑ گئی۔ اس وقت سے بنگال کے بادشاہوں کا پایہ تخت تبدیل ہو گیا۔ 1537ء میں شیر شاہ نے اس شہر کو لوٹا۔ 1575ء میں منعم خان خان خاناں اکبر کے سپہ سالار نے یہاں سند کیا تھا۔ آب و ہوا کی خرابی سے اس کے لشکر میں وبا پھیل گئی اور خان خاناں بھی مر گیا۔ کہتے ہیں اس کے بعد سے گوڑ بالکل ہی اجڑ گیا۔ ابوالفضل کی تصنیف آئین اکبری سے بھی تائید ہوتی ہے کہ جب شاہ شجاع نے راج محل کو بنگالہ کا دارالخلافہ بنایا تو گوڑ ویران ہو گیا اور پھر آباد نہ ہو سکا۔

22 سنارگاؤں۔ یہ شہر زمانہ قدیم سے ہندو راجاؤں کا دارالخلافہ رہا ہے۔ مسلم تاریخ میں اس کا ذکر پہلی بار مغیث الدین طغرل کے ذکر میں ملتا ہے کہ جب اس نے بلبن سے بغاوت کی تو وہ بھاگ کر سنارگاؤں چلا گیا۔ یہ علاقہ لکھنوتی سے کافی دور تھا۔ برسات میں آئے سیلاب کی سبب وہاں جانا دشوار ہو جاتا تھا۔ اس لیے

یہاں کے حاکم شاہان دہلی اور شاہان بنگال سے باغی ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ بھی سنارگاؤں گیا تھا، اس نے وہاں کے باغی فخر الدین عرف فخرو کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ شہر بسایا گیا تھا تو دریائے برہم پترا اور میگنا کے درمیان تھا۔ انگریز مورخین نے یہاں کی روئی سارے ہندستان میں تیار ہونے والی روئی سے بہتر بتائی ہے۔ ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس کی تعریف کی ہے۔ یہاں کا آم بے حد مشہور ہے۔

23 بدایونی کے الفاظ میں "یہ محل غیر ضروری طور پر تعمیر ہوا تھا جس سے عوام میں یہ خدشہ پیدا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ یہی رائے ابوالفضل اور مصنف طبقات ناصری کی بھی ہے۔ لیکن ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہ محل الغ خان نے اپنی خواہش سے نہیں بلکہ بادشاہ کے حکم سے بنوایا تھا۔ آگے وہ لکھتا ہے کہ اس محل کی بنیاد لکڑی کے ستونوں پر اس طرح رکھی گئی تھی کہ اگر اس کے ایک خاص مقام پر ہاتھی کھڑا کیا جائے تو تمام مکان گر پڑے۔ ابن بطوطہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ سب لوگ باہر نکل آئے محل میں صرف بادشاہ اور اس کا پیارا شہزادہ محمود رہ گیا۔ اس وقت ہاتھی کو خاص مقام پر لایا گیا۔ ہاتھی کا وہاں پہنچنا تھا کہ سارا مکان دھڑکانے سے بادشاہ اور شہزادہ کے سر پر گر پڑا۔ جونا خان نے ملبہ ہٹانے میں تاخیر سے کام لیا۔ جب ملبہ کھودا گیا تو بادشاہ اپنے بیٹے پر جھکا ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا اس کو بچانے کے لیے اس کو اٹھانا چاہتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ اس وقت زندہ تھا مگر اس کا کام تمام کردیا گیا۔ ابن بطوطہ پر اسرار محل کے معمار کا نام احمد بن ایاز لکھتا ہے جو بادشاہ کا امیر امارت تھا اور محمد تغلق شاہ (الغ خان) نے اپنے عہد میں اسے خواجہ جہان کا لقب عطا کیا تھا۔ فرشتہ اس روایت کو کہ مکان ارادتاً اس قسم کا بنایا گیا تھا تسلیم نہیں کرتا اور وہ "تاریخ حاجی محمد قندھاری" کی اس روایت کو کہ بجلی گری اور مکان گر پڑا، کو ترجیح دیتا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے بھی تاریخ فیروز شاہی میں یہی لکھا ہے۔ لیکن ابن بطوطہ کے راوی شیخ رکن الدین،

ملتانی ہیں وہ اس واقعے کے وقت تغلق کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے خود ابن بطوطہ سے بیان کیا کہ وہ عصر کے لیے محل سے نکل آئے اور جب شور سنا تو نماز پڑھے بغیر چلے آئے۔ ان شیخ کا بھی یہی خیال ہے کہ مکان ایسی صنعت سے بنایا گیا تھا کہ جس وقت ہاتھی اس مکان پر چڑھے تو وہ فوراً گر پڑے۔

24 گرشاسپ۔ ابن بطوطہ اس کا پورا نام بہاؤالدین گشتاسپ لکھتا ہے۔ یہ سلطان تغلق کا بھانجا تھا۔ اس نے تغلق کے مرنے کے بعد محمد عادل کی بیعت قبول نہیں کی۔ جب خواجہ جہان نے شکست دی تو یہ رائے کمپلہ (بیجانگر) کے پاس بھاگ گیا۔ شاہی لشکر نے کمپلہ کا محاصرہ کر لیا اور جب بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو اس نے گرشاسپ کو ایک اور راجہ کے پاس بھیج دیا۔ مندرجہ بالا سارا بیان ابن بطوطہ کے سفر نامے سے ماخوذ ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ بہاؤ الدین گرشاسپ بادشاہ کا عم زاد بھائی تھا اور ساگر کا صوبہ دار تھا۔ ضیاء الدین برنی نے اس بغاوت کا ذکر تک نہیں کیا البتہ وہ بہاؤالدین کو تغلق شاہ کی بہن کا لڑکا بتاتا ہے یہی ابن بطوطہ بھی لکھتا ہے۔

25 ابن بطوطہ نے اس کو شاہ افغان لکھا ہے۔ بدایونی اور فرشتہ اس کو شاہو افغان لکھتے ہیں۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے ”جب وہ دشوار گزار پہاڑوں پر بھاگ گیا تو بادشاہ نے غصے میں اپنے اہلکاروں کو لکھا کہ جہاں کہیں کوئی پٹھان ہو پکڑ لیا جائے، اور یہی قاضی جلال الدین کی بغاوت کا سبب ہوا۔ فرشتہ نے اس بغاوت کا زمانہ 744ھ/ 1343ء میں سلطان کی دکن سے واپسی اور گجرات میں بیمار ہونا بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ خبر سن کر پٹن سے پالکی میں سوار ہو کر بیماری کی حالت میں چلا آیا۔ ابن بطوطہ اس کو سب بغاوتوں کے آخر میں بیان کرتا ہے۔ غرض شاہو افغان کی یہی وہ بغاوت ہے جس کی وجہ سے گجرات اور دکن کے امیران صدی جو عموماً افغان تھے باغی اور منحرف ہو گئے اور اس کا سلسلہ دکن میں حسن کانگولی کی بہمنی سلطنت کے قیام پر جا کر ختم ہوا۔

26 لاہور۔ زمانہ قدیم سے لاہور راجپوت فرمانرواؤں کی راجدھانی تھا۔ مسلمان چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہاں آئے جبکہ سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں اس کی اولاد میں سے خسرو شاہ نے پنجاب پر قبضہ کر کے لاہور کو اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ اس کے بیٹے خسرو ملک تک غزنوی خاندان کی حکومت رہی۔ سندھ کے بعد یہ پہلا شہر ہے جہاں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ غوریوں کے عہد میں دہلی کے دار الخلافہ ہو جانے سے لاہور کی رونق ماند پڑ گئی۔

27 دوآبہ۔ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع وہ زرخیز علاقہ جہاں فصلیں اگائی جاتی تھیں اور یہ علاقہ آمدنی کے اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل تھا۔

28 دہلی کی بربادی۔ یہ حکم 729ھ/1328ء میں دیا گیا اس سے پہلے 727ھ/1326ء میں جو منتقلی ہوئی تھی اس میں زبردستی نہیں کی گئی لیکن اس مرتبہ جبراً اور حکماً لوگوں کو دہلی سے نکالا گیا۔ فرشتہ نے بھی یہی واقعات لکھے ہیں۔ ضیاء الدین برنی بھی دہلی کو خالی کرانے کا یہی سبب بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے دولت آباد کو اپنی سلطنت کا وسط سمجھ کر اسے دار الخلافہ بنانا چاہا تھا۔ ابن بطوطہ جو ان واقعات کے کچھ عرصے بعد ہی دہلی پہنچا تھا اس نے کچھ اور سبب لکھا ہے۔ لوگ رقعہ لکھ لکھ کر ان پر مہر لگاتے تھے اور لفافہ پر لکھتے تھے کہ بادشاہ کے سر کی قسم ہے کہ سوائے بادشاہ کے کوئی اور نہ کھولے اور یہ رقعہ رات کو دیوان خانے میں ڈال جایا کرتے تھے۔ جب بادشاہ اس کو کھولتا تھا تو اس کے نام گالیاں درج ہوتی تھیں۔ اس لیے بادشاہ نے دہلی کو اجاڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ آگے لکھتا ہے کہ ایک معتبر راوی نے مجھ سے ذکر کیا کہ بادشاہ ایک رات اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور شہر کی طرف دیکھا تو اس کو آگ، دھواں یا چراغ کچھ نظر نہ آیا۔ بادشاہ نے کہا کہ اب میرا دل ٹھنڈا ہوا۔ یہ سبب کسی اور مورخ نے نہیں لکھا ہے۔ ممکن ہے کچھ یہ بھی وجہ ہو لیکن اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ

جنوب اور شمال دونوں کے وسط میں مرکزی مقام کو مستقر بنانا چاہتا تھا تا کہ شمال کے حملہ آوروں سے دارالسلطنت محفوظ رہے مگر یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔

29 تاریخ مبارک شاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ مبارک شاہ کے وقت تغلق آباد میں تانبے کے وہ ڈھیر اینٹ پتھر کی طرح بیکار پڑے تھے۔

30 ہماچل۔ قراچل۔ بقول فرشتہ قراچیل، ان سب ناموں کا ذکر موجودہ ہماچل ریاست میں موجود ہمالیہ سے لگے پہاڑ کا مسلمان مورخین نے ذکر کیا ہے۔ فرشتہ بدایونی، برنی اور دوسرے مورخوں نے اس مہم کا ذکر کیا ہے لیکن کسی نے وہ مقام نہیں بتایا جہاں سے لشکر ہمالیہ میں داخل ہوا تھا۔ ہمالیہ کے راستے چین جانے کی یہ مسلمانوں کی دوسری کوشش تھی۔ اس سے قبل 603ھ/1306ء میں محمد بختیار خلجی نے آسام کے راستے سے چین جانے کی کوشش کی تھی۔

31 معبر۔ عربی زبان میں گھاٹ کو کہتے ہیں۔ عرب دکن کے مشرقی ساحل کو معبر اور مغربی ساحل کو ملی بار کہتے تھے۔ سب سے پہلے معبر کو فتح کرنے والا علاؤالدین خلجی کا سپہ سالار ملک کافور تھا۔

32 کھوکھر۔ بدایونی نے کھوکر لکھا ہے۔ اس کے برخلاف فرشتہ نے گھکراں لکھا ہے۔ کھوکر غلط لگتا ہے کیونکہ کھوکروں کی قوم پنجاب میں کبھی اس قدر طاقتور نہیں رہی لیکن گھکروں کا زور سلطان شہاب الدین کے وقت سے اکبر بادشاہ کے عہد تک چار سو سالوں تک شمالی پنجاب میں برابر قائم رہا۔ بدایونی نے جو یہ سن 743ھ/1342ء لکھا ہے وہ بھی زیادہ صحیح نہیں کیونکہ گھکروں نے اس وقت بغاوت کی تھی جب کہ سید جلال الدین احسن شاہ کی بغاوت کو کچل دینے کے بعد بادشاہ معبر کی طرف چلا گیا تھا اس لیے اس کی بغاوت بھی 740ھ/1339ء سے پہلے ہوئی ہوگی بعد میں نہیں۔ معبر کی بغاوت 737ھ/1326-1327ء میں ہوئی تھی۔

33 کنڑہ۔ الہ آباد ضلع میں گنگا کے کنارے 24 میل پر شمال مغرب کی جانب یہ شہر

آباد تھا۔ اکبر نے جب قلعہ اکبر آباد بنایا تو یہاں سے صوبہ کا دار السلطنت منتقل ہو گیا۔

34 بیدر۔ یہ ریاست، نظام حیدر آباد کا ضلع تھا۔ بیدر برید شاہی بادشاہوں کا دار الخلافہ رہا ہے۔ محمود گاواں کا مدرسہ اور بیدر کا قلعہ مشہور مقام ہیں۔

35 ابن بطوطہ اس باغی کو تاج الملک نائب سلطان نصرت خان لکھتا ہے۔ فرشتہ نے وضاحت کی ہے رقم کی وصولی نہ ہونے پر اس نے بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا۔

36 گلبرگہ۔ یہ شہر دکن کے ہندو راجاؤں کی قدیم یادگار ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں بہمنی سلاطین کا دار السلطنت بنا۔ اس وقت یہ دکن کا سب سے زیادہ بارونق اور مرکزی شہر تھا۔

37 بدایونی نے اس باغی سردار کا نام علی شیر خواہرزادہ ظفر خان علائی لکھا ہے۔ ابن بطوطہ اسے قتلو خان کا ہمراہی بتاتا ہے اور اس کا اصل نام علی شاہ بتاتا ہے۔

38 بدایونی کے اس بیان کے بر خلاف ابن بطوطہ تحریر کرتا ہے کہ "علی شاہ خود بھی خلاف حکم غزنی سے سندھ آیا تھا، اسے بادشاہ کے پاس گرفتار کر کے لے گئے تو اس نے کہا: تو میرے ملک میں پھر فساد کرنے کے لیے آیا ہے۔ پھر اس نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔"

39 ابو الفضل کے وقت ظفر آباد سرکار جونپور کا ایک محال تھا اسے علاؤ الدین خلجی کے وقت غالباً ظفر خان نے آباد کیا تھا۔

40 فرشتہ اور ابن بطوطہ اس کو بادشاہ کا استاد بتاتے ہیں یہ دولت آباد دکن کا صوبہ دار تھا۔ ابن بطوطہ اسے قتلو خان لکھتا ہے۔

41 سرگدواری۔ ضلع فرخ آباد کے قریب شمس آباد کے علاقے میں ایک چراگاہ تھی۔ یہاں شاہی لشکر قحط کے زمانے میں آکر ٹھہرا تھا اور عارضی جھونپڑے بنا لیے تھے۔ اسی موضع کو سرگدواری کہتے ہیں۔

42 فرشتہ لکھتا ہے جس عرصے میں بادشاہ سرگدواری میں رہا تو چار امیروں نے

بغاوت کی 1۔ نصرت خان، 2۔ علی شاہ، 3۔ نظام مائیں (کڑہ)، 4۔ عین الملک (اودھ)۔

43 یوز باشی۔ ترکی لفظ ہے اور اس کی معنی سو ساتھیوں کے سردار کے ہیں۔

44 بڑودہ۔ سورت سے 81 میل پر واقع ہے۔ مہاراجہ گائیک واڑ کا دار السلطنت رہا ہے۔

45 ناصر الدین۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ دولت آباد کے باغیوں نے پہلے جس شخص کو بادشاہ بنایا وہ اسمٰعیل ہی تھا۔

46 تلنگانہ۔ نظام حیدر آباد کی ریاست دو علاقوں پر مشتمل تھی۔ ایک تلنگانہ جو جنوب مشرقی سمت تھی۔ دوسرا مرٹھواڑہ جو شمال مغربی جانب تھا۔ تلنگانہ دریائے نربدا کے جنوب اور کرشنا کے شمال میں واقع تھا۔ قدیم کتابوں میں اس کا نام تلنگا اور آندھرا درج ہے۔

47 حسن کانگو دہلی کا رہنے والا تھا۔ ایک برہمن نے اس کی خدمت گزاری سے خوش ہو کر یہ بشارت دی تھی کہ تجھے بادشاہی ملے گی اور یہ قرار لیا تھا کہ جب تو بادشاہ ہو جائے تو اپنے نام کے آخر میں میرا نام بھی شامل کرنا۔ چنانچہ کانگو بہمنی اسی شرط کی تکمیل میں اس کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بھی اسے بادشاہت کی بشارت دی تھی۔ مصیبت کے دنوں میں حسن دولت آباد چلا گیا اور وہاں قتلغ خان کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب اسمٰعیل ناصر الدین کو امرائے صدہ نے دولت آباد میں بادشاہ بنا لیا تو حسن کو ظفر خان کا خطاب اور گلبرگہ جاگیر میں ملا تھا۔ اس وقت حسن نو ہزار سپاہیوں کا سردار تھا۔ دار السلطنت گلبرگہ تھا جس کا نام اس نے حسن آباد رکھ دیا تھا۔ اس نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی اور یہ خاندان اس قدر ترقی کرتا گیا کہ سارا دکن بہمنی بادشاہوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس خاندان کے بیس بادشاہوں نے حکومت کی۔ اس عہد میں دکن صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اور

شمال کی ساری رونق جنوب میں کھنچ آئی تھی۔ جس کا نکو کے زمانے کے مشہور اہل علم شیخ معین الدین بیجاپوری اور شیخ محمد سراج گورے تھے۔

48 ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں بادشاہ کی خون ریزی کو بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ ”وہ خون ریزی میں نہایت دلیر تھا، ایسا کبھی شاذ ونادر ہی ہوتا تھا کہ اس کے دروازے پر کوئی شخص قتل نہ کیا جاتا ہو۔ اکثر اس کے دروازے پر لاشیں پڑی رہتی تھیں، ابن بطوطہ نے اس سلسلے میں کچھ لوگوں کے نام لکھے ہیں: جن میں بادشاہ کے بھائی مسعود خان، شیخ شہاب الدین بن احمد جام خراسانی، فقیہ عفیف الدین کاشانی، شیخ رکن الدین ملتانی کے پوتے، شیخ زادہ ہود، شیخ شمس الدین ابن تاج العارفین، باشندہ کویل اور کھمبایت کے شیخ حیدری کا نام ملتا ہے۔

49 بقول ابن بطوطہ: شیخ شہاب الدین احمد جام خراسانی شہر کے بڑے شیخ تھے، چودہ دنوں تک روزہ رکھتے تھے۔ سلطان قطب الدین اور سلطان تغلق ان کے معتقد تھے۔ سلطان محمد تغلق کے ساتھ ابتداء میں ان کے تعلقات بہت اچھے تھے، بادشاہ بھی بہت لحاظ کرتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ابن بطوطہ اس کی داستان یوں بیان کرتا ہے بادشاہ نے ان کو بلایا، وہ نہیں گئے اور صاف صاف کہہ دیا ”میں ظالم بادشاہ کی خدمت ہرگز نہ کروں گا“ بادشاہ نے انھیں پکڑوا کر بلایا اور ظالم کہنے کی وجہ پوچھی شیخ نے دہلی شہر کے اجاڑنے کا ذکر کیا، چودہ دن تک قید رہے اور قتل کر دیے گئے“ دارا شکوہ کی تصنیف سفینہ الاولیا میں لکھا ہے کہ: ”شیخ شہاب الدین احمد جام شیخ الاسلام احمد جام ژندہ پیل کی اولاد میں سے تھے اور یہ بزرگ حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کی اولاد میں سے تھے۔ احمد جام ژندہ پیل کے متعلق مشہور ہے کہ 22 سال بالکل امی تھے۔ بعد میں ان پر سارے علوم کا کشف ہوا۔ ان کی تصنیفات تین سو ہیں ان کے ہاتھ پر ایک لاکھ اسی ہزار آدمیوں نے بیعت کی تھی۔ ان کی پیدائش

440ھ/1052ء میں اور وفات 536ھ/1141ء میں ہوئی۔ مشہور فارسی کے شاعر مولانا عبد الرحمٰن جامی نے انہی کی نسبت سے اپنا تخلص جامی رکھا تھا۔ ہمایوں کی بیوی اور اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم انہی بزرگ احمد جام کی اولاد میں سے تھی۔

50 خراسان۔ یہ ایران کا ایک صوبہ ہے، مشہد اس کا دارالخلافہ ہے جہاں امام علی بن موسی رضا کا مقبرہ ہے۔ ایک جانب کے علاقہ کو سرولایت اور دوسرے کو پائین کہتے ہیں۔ طوس۔ نیشاپور۔ سبزوار وغیرہ خراسان کے بڑے شہر ہیں۔ یہاں کے قبائل میں اعوان لو، شادلو بڑے قبیلے گزرے ہیں۔ یہ صحرا نشین اور گلہ بان ہیں۔ بندوق کے نشانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہاں کے ایک قبیلہ افشار سے مشہور فاتح نادر شاہ کا تعلق تھا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق

فیروزشاہ سلطان محمد عادل کا چچا زاد بھائی تھا۔ سلطان محمد نے مرتے وقت اسے اپنا جانشین اور ولی عہد بنایا تھا۔ چنانچہ اس کے انتقال پر فیروزشاہ اسی سن یعنی 257ھ/1521ء میں ٹھٹھہ کے قریب تخت پر بیٹھا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ اس کی تخت نشینی میں حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی[1] اور مخدوم زادہ عباسی بغدادی کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ عوام میں اس کا عام چرچا تھا کہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے بادشاہ کی زندگی ہی میں فیروز شاہ کو برسراقتدار لانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

حضرت چراغ دہلیؒ

بادشاہ کو بھی حضرت کی کوششوں کا علم ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ان پیر و مرید یعنی حضرت اور فیروز شاہ دونوں کو دہلی سے قید کر کے ہمارے لشکر میں لے آؤ۔ شاہی کارندے حسب الحکم ان دونوں کو قید کر کے لے چلے لیکن جب ہانسی[2] کے قریب پہنچے تو ملک فیروز نے محافظوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے حضرت شیخ بدرالدین نبیرہ[3] حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی خدمت میں حاضری کی مہلت لے لی۔ جب وہ ان بزرگ کی خدمت

میں پہنچا تو اسے دیکھتے ہی ان کی مبارک زبان سے یہ کلمہ نکلا "ایک کو قید کر کے بادشاہت کے لیے لے جاتے ہیں اور خود اس کو اس کی خبر نہیں"۔ غرض جب بادشاہ کے لشکر میں یہ قیدی پہنچے تو بادشاہ نے اسی وقت ان دونوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے بعد وہ حالت نزع میں مبتلا ہو گیا۔ محافظوں نے بادشاہ کا یہ حال دیکھ کر دونوں کو چھوڑ دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن بادشاہ کا بیٹا کہیں شکار پر گیا ہوا تھا اور باپ کے آخر وقت پر موجود نہ تھا۔ جب بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو فیروز شاہ ارا کین سلطنت کی تائید واتفاق سے تخت پر بیٹھ گیا اور بادشاہ کے بیٹے کو علاحدہ کر دیا۔ جب فیروز شاہ ٹھٹھہ سے دہلی آیا تو اس نے حضرت شیخ بدر الدین کی خانقاہ اور لنگر کے لیے ہانسی کے ماتحت ضلع چوراسی کو وقف کر دیا۔ عام طور پر یہ دلچسپ واقعہ مشہور ہے کہ سلطان محمد تغلق نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو اپنی جامہ داری کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ ایک دن آپؒ نے اس کپڑے میں گرہ لگا کر فرمایا "نصیر الدین بندہ خدا کشاید" کہتے ہیں اسی دن سلطان محمد کا انتقال ہو گیا۔

مغلوں کی بغاوت

سلطان محمد تغلق شاہ کے انتقال کی خبر سن کر مغل سر اٹھانے لگے۔ انھوں نے شاہی لشکر پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ چنانچہ فیروز شاہ نے سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ لشکر کے ساتھ جو مغل ہیں ان کا گروہ شاہی لشکر سے الگ اور کچھ فاصلے پر قائم کیا جائے۔ اس احتیاط کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو بادشاہ نے بذات خود نگہبانی اور نگرانی کا فرض انجام دیا اور ان مغلوں کی اچھی طرح گوش مالی کر کے فوج کو ان کی دست درازیوں سے نجات دلائی۔

خواجہ جہاں کی اطاعت

فیروز شاہ سیوستان[4] کی راہ سے کوچ کرتے ہوئے دہلی پہنچا۔ یہاں احمد ایاز خواجہ

جہاں ایک مجہول النسب لڑکے کو غیاث الدین محمود شاہ کا خطاب دے کر بادشاہ بنا بیٹھا تھا اور خود اس کا وکیل بن گیا تھا۔ لیکن اس کے کیے کچھ نہ بنا اور فیروز شاہ کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ آخر بڑی کہا سنی اور محنت کے بعد خواجہ جہاں اشرف الملک اور دوسرے امراء کی مداخلت سے ہانسی آیا اور پگڑی گلے میں ڈال کر ننگے سر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے معاف کر کے ہانسی کے کوتوال کے حوالے کر دیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس مہم میں خواجہ جہاں کے ساتھ شریک تھے مختلف سمتوں میں منتشر کر دیا۔ جس دن فیروز شاہ نے دہلی جاتے ہوئے سرتی (سروتی) میں قیام کیا تھا اسی دن شاہزادہ فتح خان کے پیدا ہونے کی خوشخبری ملی تھی اور اسی جگہ گجرات سے ملک طغی کے فتنہ وفساد کی بھی اطلاع آئی۔

فیروز شاہ کی تخت نشینی

فیروز شاہ نے 2/رجب 752ھ/1351ء میں دہلی کے تخت پر جلوس کیا اور امرا کو از سر نو منصب اور عہدے تقسیم کیے۔ دوسرے سال 753ھ/1352ء میں وہ سرمور کی پہاڑ کی طرف شکار کے لیے گیا اور پایہ تخت واپس آ گیا۔ اسی سال ماہ رجب میں شاہزادہ محمد خان کی ولادت ہوئی جس کا بعد میں ناصر الدین محمد خطاب پڑ گیا تھا۔ 754ھ/1353ء میں سلطان کلانور کی طرف شکار کے لیے گیا اور دریائے سرتی (سروتی) کے کنارے ایک عمدہ وسیع عمارت بنوا کر شیخ صدر الدین ملتانی کے حوالے کی۔ ملک قبول نائب وزیر کو خان جہاں کا خطاب عطا کیا۔

لکھنوتی پر حملہ

754ھ/1353ء کے آخر میں فیروز شاہ نے بنگال کے باغی حاکم حاجی الیاس کی بغاوت کو کچلنے کے خیال سے لکھنوتی پر حملہ کیا یہاں حاجی الیاس نے شمس الدین کا خطاب رکھ کر مستقل بادشاہی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ شاہی لشکر سے ڈر کر حاجی نے بنگال کے سب سے

زیادہ مضبوط قلعہ اکدالہ میں پناہ لے لی لیکن چند ہی حملوں میں اسے ہتھیار چھوڑنے پڑے اور اس کا بہت سا سازوسامان فیروز شاہ کے ہاتھ آ گیا۔ اتفاق سے بارش کا موسم آ گیا جس سے مجبور ہو کر بادشاہ نے حاجی الیاس سے صلح کر لی اور وہاں سے لوٹ آیا۔ 755ھ/1354ء میں سلطان مانک پور کے راستے دہلی پہنچا اور جمنا کنارے فیروز آباد کا قلعہ تعمیر کرایا۔

نہروں کی کھدائی

وہ 756ھ/1355ء میں دیپال پور گیا اور ستلج سے ایک نہر نکال کر 48 کوس کے فاصلے پر جھجھر کے مقام تک پہنچائی۔ 757ھ/1356ء میں مندول اور سرور کے قریب جمنا سے بھی ایک نہر نکالی اور اس میں دوسری سات نہریں ملا کر ہانسی تک اور وہاں سے اسے راس تک پہنچایا۔ اس جگہ ایک قلعہ حصار فیروز شاہ کے نام سے بنوایا۔ اس قلعے کے نیچے ایک بڑا حوض بھی بنوایا تھا جس میں نہر سے پانی آ کر جمع ہوتا تھا۔ ایک اور نہر گھگھر سے نکال کر قلعہ سرتی کے نیچے تک اور وہاں سے ہرنی کھیڑہ تک پہنچائی اور ان دونوں کے درمیان ایک اور قلعہ فیروز آباد کے نام سے بنایا۔

فرمان خلافت

757ھ/1356ء ہی میں مصر سے خلیفہ الحاکم بامر اللہ ابو الفتح ابو بکر بن ابو الربیع سلیمان کے یہاں سے ہندستان کی بادشاہی کا فرمان اور خلعت آئی۔ اسی سال لکھنوتی سے حاجی الیاس کے قاصد نہایت نفیس تحائف اور نذر لے کر آئے۔ بادشاہ نے ان قاصدوں پر بڑی مہربانی کی اور حکم دیا کہ حاجی الیاس ان تحفوں کے عوض ہمیشہ عمدہ ہاتھی بھیجا کرے۔ فیروز شاہ کی سلطنت یوں تو سارے ہندستان پر تھی، لیکن لکھنوتی پر صلح کے بموجب حاجی الیاس ہی کی حکمرانی تھی اور دکن میں سلطان محمد مرحوم کے زمانے ہی سے حسن کانگو بہمنی

بادشاہ ہو گیا تھا۔ 759ھ/ 1357ء میں بادشاہ نے سامانہ کا ارادہ کیا۔ مغلوں نے دیپالپور پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کی گوشمالی کے لیے اس نے ملک قبول کو روانہ کیا۔ جب شاہی لشکر پہنچا تو مغل حسب عادت ڈر کر ولایت بھاگ گئے اور سلطان دہلی واپس آ گیا۔

بنگال کے معاملات

اسی سال بادشاہ نے بہت سے تازی گھوڑے، نفیس ولایتی سامان اور دوسرے عمدہ تحفے حاجی الیاس کے قاصدوں کے ہمراہ کر کے انھیں رخصت کیا لیکن ابھی یہ قاصد راستے ہی میں تھے کہ لکھنوتی سے حاجی الیاس کے مرنے کی خبر پہنچی اور معلوم ہوا اس کی جگہ اس کا لڑکا سلطان سکندر تخت نشین ہوا ہے۔ اس خبر کے ملنے پر بادشاہ نے وہ گھوڑے اور تحائف بہار میں واپس منگا لیے اور قاصدوں کو کڑہ میں بلوا لیا۔ 760ھ/1358ء میں بادشاہ نے خاصا بڑا لشکر لے کر دوبارہ لکھنوتی کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے خان جہاں کوتوال کو دہلی کے انتظام کے لیے چھوڑا اور غزنی کی سرحد سے ملتان تک عملداری تاتار خان یعنی ملک تتار کے سپرد کر دی، خود ظفر آباد آ کر بارش کے موسم کی وجہ سے ٹھہر گیا۔ اسی مقام پر اعظم ملک شیخ زادہ بسطامی مع ملک احمد ایاز کے جسے بادشاہ نے ملک بدر کر دیا تھا خلیفہ مصر کی طرف سے ایک خلعت لے کر آیا۔ بادشاہ نے اسے اعظم خان کا خطاب دیا۔ ظفر آباد سے ہی بادشاہ نے سید رسول دار کو لکھنوتی سے آئے ہوئے قاصدوں کے ساتھ سلطان سکندر کے پاس روانہ کیا۔ سکندر نے بھی وہاں سے پانچ ہاتھی اور کچھ تحائف بارگاہ میں روانہ کیے۔ اس سفارت اور تحائف کے باوجود فریقین میں صلح کی صورت پیدا نہ ہوئی اور بارش ختم ہونے کے بعد فیروز شاہ نے ظفر آباد سے لکھنوتی کی طرف کوچ کر دیا۔ راستے میں شاہزادہ فتح خان کو سامان سلطنت، ہاتھی اور فراش خانہ لعل جو بڑی عزت کا نشان تھا عطا کیا اور اس کے نام کا سکہ بھی ضرب کرایا۔ جب بادشاہ کا لشکر پنڈوہ پہنچا تو سکندرر بھی اسی قلعہ اکدالہ میں جہاں اس کے باپ نے پناہ لی تھی پناہ گزیر ہو گیا۔ بادشاہ نے کچھ عرصے تک قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا، آخر سکندر نے 37 ہاتھی اور بے شمار عمدہ تحائف دے کر صلح کر لی۔ 761ھ/1359ء

میں فیروز شاہ پنڈوہ کے راستے سے جونپور[5] لوٹ آیا اور برسات کا موسم اسی جگہ گزارا۔ اسی سال کے آخر میں بہار کے راستہ سے جاج نگر روانہ ہوا اور لکھنوتی سے جو ہاتھی اور خیمہ وخر گاہ ملا تھا کڑہ بھجوا دیا۔

ہاتھیوں کا شکار

جب شاہی لشکر ست گھرہ پہنچا تو وہاں کا راجہ کسی طرف روپوش ہو گیا۔ وہاں سے لشکر بارانسی پہنچا وہاں کا راجہ بڑا نامی گرامی راجہ تھا وہ ڈر کر تلنگانہ کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ کچھ دور تک اس کا تعاقب کر کے واپس آ گیا اور شکار کھیلتے ہوئے رائے پربھان دیو کے علاقے میں پہنچا۔ رائے نے 32 ہاتھی اور کچھ تحائف پیش کیے۔ یہاں سے بادشاہ پدماوتی اور پرم تلا کے جنگل میں جہاں ہاتھی بکثرت تھے شکار کے لیے گیا۔ اس نے خود دو ہاتھی مار گرائے اور 33 ہاتھی زندہ پکڑوائے۔ ضیاء الدین برنی نے اس کارنامہ پر یہ رباعی کہی ہے:

شاہی کہ زحق دولت پایندہ گرفت
اطراف جہان چو مہر تابندہ گرفت
از بہر شکار فیل در جاج نگر
آمد دوہشت وی و سہ زندہ گرفت

سیر و شکار کے بعد سلطان بہت جلد وہاں سے واپس ہوا اور کڑہ پہنچ گیا۔

نہر سیلمہ

772ھ/1370ء میں سلطان کڑہ سے دہلی آیا اور کچھ دن قیام کے بعد نہر سیلمہ کی طرف گیا۔ یہ نہر ایک ریتیلے ٹیلے سے نکل کر ستلج میں جا گرتی تھی۔ اس کو سرستی بھی کہتے ہیں یہاں اس کے برابر ہی ایک دوسری نہر بھی جاری تھی۔ وہ ریتلا پشتہ دونوں کے درمیان حائل

تھا۔ اس پشتے کے ہٹ جانے سے سرتی کا پانی دوسری نہر سے مل کر سہرند، منصور پور اور سامانہ کی طرف جاری ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ پچاس ہزار بیلدار جمع ہو کر اس پشتے کو کھود دیں۔ جب اس پشتے کو کھودا گیا تو اس میں سے ہاتھیوں اور آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ آدمیوں کے ڈھانچوں میں ہاتھیوں کی ہڈیاں تین تین گز لمبی تھیں، کچھ گلی ہوئی تھیں اور کچھ اسی طرح باقی تھیں۔ بہر حال وہ نہر کھدنہ پائی۔ انہی دنوں بادشاہ نے اس ضلع سے سہرند کی جمع بندی سے دس کوس مسافت کی اراضی علاحدہ کر کے ضیاء الملک شمس الدین ابورجا کے حوالے کی جس نے اسی مقام پر فیروز پور کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔

نگرکوٹ 6 کا کوہستان

یہاں سے سلطان نگرکوٹ گیا اور لڑائی کے بعد قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ آخر وہاں کا راجہ امن کا طالب ہوا اور حاضر بارگاہ ہو گیا۔ بادشاہ نے مرحوم کے نام پر نگرکوٹ کا نام محمد آباد رکھ دیا۔ اس مقام پر پہاڑی لوگ بادشاہ کے لیے برف لے کر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے فرمایا اسی مقام پر سلطان محمد مرحوم کے لیے بھی لوگ برف لے کے آئے تھے، چونکہ میں اس وقت حاضر نہیں تھا اسی لیے سلطان نے بھی اس برف کا شربت نہیں پیا تھا۔ اس واقعے کو یاد کر کے بادشاہ نے اس برف میں مصری ڈلوائی جو کئی ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدی ہوئی ہمراہ تھی اور شربت تیار کرایا اور سلطان محمد کی فاتحہ کے لیے قرآن ختم کرا کے سارے لشکر میں تقسیم کرایا۔ اس موقع پر لوگوں نے بادشاہ کو بتایا کہ جب سکندر ذوالقرنین ہندستان آیا تھا اس وقت سے اس علاق کے لوگ نوشابہ کی تصویر اپنے گھروں میں رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے بت خانہ میں جسے لوگ ''جوالا مکھی'' کہتے ہیں پچھلے زمانے کے برہمنوں کی ایک ہزار تین سو کتابیں رکھی ہوئی ہیں اس جگہ سے آگ کے شعلے کافی اونچے نکلتے رہتے ہیں کہ ہزاروں مشک پانی بھی ڈالا جائے تو یہ آگ نہیں بجھ سکتی۔

قدیم کتابیں

بادشاہ نے وہاں کے برہمنوں کو بلا کر وہ کتابیں منگوائیں اور ان کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ان کتابوں ہی میں سے ایک کتاب کو اعز الدین خالد قاضی نے، جو اس کے عہد کے بڑے شاعروں میں سے تھا، علم نجوم کے بیان میں نظم کیا اور اس کا نام "دلائل فیروزی" رکھا۔ میں نے بھی (یعنی مؤلف کتاب منتخب التواریخ) اس کتاب کو لاہور میں 1000ھ/ 1591ء میں اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ اس قدر عمدہ اور لائق کتاب ہے کہ اس کی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔

ٹھٹھہ پر فوج کشی

محمد آباد سے بادشاہ ٹھٹھہ گیا۔ وہاں کا حاکم جسے جام کہتے ہیں، قلعے میں بند ہو گیا۔ اس ضلع میں بارش کی کثرت سے ندی نالوں اور دریاؤں کا جال سا بچھا تھا غلہ بھی گراں تھا اس لیے بادشاہ زیادہ عرصے تک محاصرہ جاری نہیں رکھ سکا اور وہاں سے گجرات چلا گیا۔ وہاں کے حاکم نظام الملک کو نائب وزیر بنا کر دہلی روانہ کر دیا اور اس کی جگہ ظفر خان کو گجرات کی حکومت پر مقرر کر دیا۔ وہاں سے بادشاہ پھر ٹھٹھہ لوٹ آیا۔ اس مرتبہ جام نے امن کی درخواست کی اور بارگاہ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ کے رکاب ہی میں دہلی آیا، وہاں نوازش خسروانہ سے حسب سابق ٹھٹھہ ہی کی حکومت پر دوبارہ فائز ہو گیا۔

وزیر اور شہزادے کی رحلت

722ھ/ 1322ء میں خان جہان وزیر نے انتقال کیا تو ان کی جگہ اس کا لڑکا جونا شاہ وزیر بنا اسے بھی خان جہان ہی کا خطاب عطا ہوا۔ 773ھ/ 1371ء میں ظفر خان کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ گجرات کی حکومت پر اس کا بیٹا مامور کیا گیا۔ ۷۷۶ھ/ ۱۳۷۴ء میں شاہزادہ فتح خان کے انتقال کا سانحہ پیش آیا جس کی بدولت بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا۔

شمس الدین کی بغاوت

اسی سال یعنی 776ھ/1374ء میں شمس الدین دامغانی[10] کو زریں کمر پٹے اور نقرئی چنڈول کا اعزاز عطا ہوا۔ اس نے گجرات کی حکومت اس شرط پر قبول کی تھی کہ ہر سال سو ہاتھی اور دو سو تازی گھوڑے اور چار سو غلام اور دوسرا مال واسباب اور نقدی بارگاہ شاہی میں روانہ کرے گا۔ لیکن وہ اس قدر مال وہاں سے حاصل نہ کر سکا اور بغاوت اختیار کر لی۔ 787ھ/1377ء میں گجرات کے امیران صدہ نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سر بادشاہ کے پاس دہلی بھیج دیا۔ اس کے بعد گجرات کی عمل داری فرحت الملک عرف ملک مفرح سلطانی کو عطا کی گئی۔

اٹاوہ پر فوج کشی

779ھ/1377ء میں بادشاہ نے اٹاوہ[11] اور اکچک کے علاقے پر حملہ کیا، وہاں کے راجاؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور ان کو مع اہل وعیال دہلی روانہ کر دیا۔ اس علاقے کے فتح ہونے کے بعد یہاں حکم شاہی سے کئی ایک قلعے بنائے گئے۔ فیروز پور[12] اور جلالی ملک تاج الدین ترک کے لڑکے کو اور اکچک کا علاقہ ملک افغان کو سپرد کر کے بادشاہ دہلی واپس آ گیا۔ اس سال حاکم اودھ[13] ملک نظام الدین کا جو اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا، انتقال ہو گیا۔ اس طرح اس کا علاقہ اس کے بیٹے یوسف الدین کے سپرد کر دیا گیا۔

سامانہ اور سنتور کی مہم

781ھ/1398ء میں سلطان فیروز شاہ نے سامانہ کا رخ کیا اور انبالہ[14] سے آگے بڑھ کر سنتور کے کوہستان پر لشکر کشی کی۔ وہاں کے راجاؤں سے قیمتی نذرانے لے کر دار السلطنت واپس آ گیا۔ بادشاہ نے نصیر خان کو کڑے اور مہوبہ[15] کے ضلع سے واپس بلا کر مغلوں کی سرکوبی کے لیے ملتان کی طرف متعین کیا اور مہوبے کا ضلع اس کے بیٹے سلیمان کے

سپرد کر دیا۔ یہ نصیر خان وہی شخص ہے جس نے سلطان علی الدین بدایونی کے دادا سید قطب خان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔

کیتھل[16] کی مہم

782ھ/1399ء میں سلطان نے کیتھل کی مہم سر کی۔ کیتھل کا مقدم رائے کھوکر تھا، اس نے بدایوں کے حاکم سید محمد اور سید علی الدین کو جو حقیقی بھائی تھے دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ ان بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ہی سلطان نے فوج کشی کی تھی۔ بادشاہ کے پہنچنے کی خبر پا کر کھوکر کمایوں کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے کیتھل کو تاخت و تاراج کر دیا اور کھوکر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ملک افغان کو سنبھل[17] میں مقرر کیا۔ ملک قبول کو بدایوں کی عملداری پر روانہ کیا۔ بدایوں میں محلہ قبول پور اسی کی یادگار ہے۔ ہر سال وہ شکار کھیلنے کے لیے کیتھل آ کر اسے لوٹ لیتا تھا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ دہلی واپس آ گیا۔

قلعہ فیروز پور کی تعمیر

787ھ/1385ء میں سلطان فیروز شاہ نے بدایوں سے سات کوس کے فاصلے پر موضع بیولی میں جسے مواسا بھی کہتے ہیں ایک قلعہ تیار کرا کے اس کا نام فیروز پور رکھا۔ یہ فیروز شاہ کی سب سے آخری تعمیر ہے[18]۔ اس لیے اسے آخریں پور بھی کہا جاتا ہے۔ اب اس قلعہ کی عمارت باقی نہیں ہے، اس کی جگہ ایک ٹیلہ بطور نشانی رہ گیا ہے۔

خان جہان کی فتنہ پردازی

اس وقت بادشاہ کی عمر نوے سال کی ہو چکی تھی۔ عمر کے باعث عقل اور قویٰ میں کمزوری آ چکی تھی۔ وزیر خان جہان حاسد مزاج تھا، وہ کسی دوسرے امیر کی ترقی اور وقعت دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو بہکا کر کچھ بے قصور امیروں کو دربار سے نکلوا دیا اور بعض

کو قتل کروا دیا بعض امیروں کے خلاف یہ سازش کی کہ وہ شاہزادہ محمد خان سے مل گئے ہیں اور اسے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی باتوں کا یقین کر کے ان کے قتل کا ارادہ کر لیا اور شاہزادہ بھی ڈر کے مارے منہ چھپاتا رہا۔ آخر ایک دن شہزادہ نے خلوت میں باپ سے گفتگو کی اور خان جہان کے سارے فریب کھول کر رکھ دیے۔

فیروز شاہ کی گوشہ نشینی

اس واقعہ کے بعد شاہزادے کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے اور وہ مطلق العنان ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی شاہی لوازمات، ہاتھی، گھوڑے اور سلطنت کے اعزازات اسے عطا کر کے ماہ شعبان 789ھ/ 1387ء میں اسے تخت حکومت پر بٹھا دیا اور خود عبادت الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو گیا اس دن سے جمعہ کے خطبہ میں دونوں سلاطین کا نام لیا جاتا تھا۔

خان جہان کا قتل

محمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد از سر نو امیروں کو عہدے اور جاگیریں تقسیم کیں۔ ملک یعقوب کو سکندر خان کا خطاب دے کر خان جہان کے مقابلے پر روانہ کیا۔ میوات کے زمیندار کوکا چوہان نے خان جہان کو پکڑ کر سکندر خان کے حوالے کر دیا۔ سکندر نے اسے قتل کر کے اس کا سر بادشاہ کے پاس بھجوا دیا اور گجرات چلا گیا۔

امیرانِ صدہ کا فساد

790ھ/1388ء میں محمد شاہ شکار کے لیے سرمور کی پہاڑی کی طرف گیا ہوا تھا، ادھر گجرات میں ملک مفرح نے امیرانِ صدہ کی مدد سے سکندرر خان کو مار ڈالا اور اس کا لٹا پٹا لشکر سپہ سالار کی سرکردگی میں برے حالوں لوٹ کر دہلی آیا۔ جب بادشاہ سرمور سے لوٹ کر پایہ تخت پہنچا تو اس نے جوانی کی ترنگ میں بڑی لاپروائی برتی، سکندر خان کے انتقال کی فکر

نہیں کی اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔

لشکریوں کی بغاوت

محمد شاہ کی اس غفلت اور کمزوری کی وجہ سے شرپسندوں کی جراتیں بڑھ گئیں اور ملک میں نت نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے محمد شاہ کے حضور سماء الدین 19ل اور ملک کمال الدین نام کے دو نہایت مقرب امیر نظم مملکت میں داخل ہو گئے تھے، ان کے عمل دخل کو دیکھ کر فیروز شاہ کے قدیم لشکری اور امیر سخت برہم تھے۔ چنانچہ یہ سب بغاوت کے ارادے سے ایک میدان میں اکٹھا ہو گئے۔ محمد شاہ نے ان کو سمجھانے کے لیے ملک ظہیر الدین لاہوری کو روانہ کیا۔ باغیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اُسے پتھر مار مار کر زخمی کر دیا۔ ظہیر الدین اسی حالت میں لہولہان محمد شاہ کے پاس آیا اور اس سے فریاد کی۔ شاہزادہ نے اپنی خاص جمعیت کو اکٹھا کر کے سرکش لشکریوں پر حملہ کر کے انھیں منتشر کر دیا۔ یہ بھاگ کر سلطان فیروز کی پناہ میں چلے گئے اور دوبارہ تیاری کر کے آمادہ ہو گئے۔ دو دن تک فریقین میں سخت لڑائی ہوتی رہی۔

فیروز شاہ میدان جنگ میں

جب باغیوں نے دیکھا کہ مقابلے میں ان کا پہلو کمزور ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے بوڑھے فیروز شاہ کو بہکا کر بیٹے کے مقابلے کے لیے آمادہ کر لیا اور لاغر و کمزور بادشاہ کو اپنے ساتھ میدان میں لے آئے۔ باغیوں کی یہ چال بڑی کارگر ہوئی۔ جیسے ہی محمد شاہ کے لشکریوں اور فیل بانوں (ہاتھی بانوں) نے میدان میں مقابلے پر بوڑھے بادشاہ کو دیکھا فوراً لڑائی بند کر دی اور باغی لشکر سے مل گئے۔ محمد شاہ کے ساتھ گنتی کے چند آدمی رہ گئے، وہ بے چارہ انھیں ساتھ لے کر سرمور کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ فیروز شاہ کی رکاب میں اس وقت ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ سوار اور پیادے اس کامیابی کے بعد محمد شاہ کے محلات میں گھس گئے اور اس کے تمام مقربوں اور حواریوں کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ فیروز شاہ

نے بھی اہل غرض کے بہکانے سے محمد شاہ ولی عہدی کی منسوخی کا اعلان کر دیا اور اس کے بجائے فتح خان کے بیٹے تغلق خان کو تغلق شاہ کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنا لیا۔ تغلق شاہ نے اختیارات پاتے ہی بادشاہ کے داماد میر حسن کو جو محمد شاہ کا دوست اور حامی تھا قتل کرا دیا اور غالب خان حاکم سامانہ کو جلا وطن کر کے سامانہ بھیج دیا۔

فیروز شاہ کی وفات

8رمضان المبارک 770ھ/1388ء میں فیروز شاہ کا انتقال ہوا۔ اسے حوض خاص (دہلی) کے کنارے دفن کیا گیا اور اس کے مزار پر ایک بڑا گنبد تعمیر کرا دیا گیا۔ اس کی وفات کی تاریخیں ہیں "وفات فیروز بتغلق فیروز شاہ" اس دوسری تاریخ میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

عہد فیروز شاہی کے شعرا

فیروز شاہ نے 83 سال چند ماہ حکومت کی20۔ اس کے بڑے شاعروں میں سے امیر خسروؒ کا بیٹا ملک احمد تھا۔ یہ بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ اس کا کوئی دیوان مشہور نہیں لیکن یہ بڑا قادر الکلام نقاد تھا۔ اس نے متقدمین کے کلام پر جو جرح اور گرفت کی ہے اسے اکثر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

ملک احمد کی اصلاحیں

مشہور شاعر ظہیر کے شعر میں اس نے جو تصرف کیا وہ کچھ اس طرح ہے۔ ظہیر کا شعر تھا:

کلاہ گوشہ حکم تو از طریق نفاذ
ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

ملک احمد نے کہا پہلا مصرعہ اس طرح ہونا چاہیے:

زہی طپانچہ قہر تو از طریق نفاذ

میری (مؤلف منتخب التواریخ کی نظر) سے اس کی اصلاح کے اور بھی شعر گزرے تھے لیکن یاد نہیں ہیں۔ ملک احمد امیر خسروؒ کے فرزند تھے اس لیے متقدمین کے کلام میں ان کے تصرف وتبدل کو بادشاہ اور اس زمانے کے امیر اور اہل علم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے[21]۔ اس عہد کے دوسرے شاعر مولانا مطہر کڑہ تھے۔ ان کی اولاد میرے اس عہد تک لکھنوتی میں موجود ہے۔ (یعنی مؤلف منتخب التوریخ کے عہد میں) اور اپنے بزرگوں کے وقت سے برابر عزت ومراتب پر فائز ہے۔ مولانا مطہر کا ایک دیوان بھی ہے جس میں پندرہ سولہ ہزار شعر ہیں۔ ان کے کلام پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا اور مقصدیت کے تناسب سے شعریت دب کر رہ گئی تھی اس لیے ان کی فضیلت کا جتنا چرچا تھا اتنا ان کے شعر رواج نہ پا سکے۔ بہر حال غور سے دیکھنے پر ان کے کلام کی ندرت واضح ہوتی ہے۔ فیروز شاہ عادل کے زمانے میں تیسرے شاعر قاضی عابد گزرے ہیں جن کا یہ قطعہ مشہور ہے۔

دوستان گویند عابد باچنین طبع لطیف
چیست اشعار وغزل از تو فراوان بر نخاست
باگرا شعر وغزل گوییم چون در عہد ما
شاہدی موزون و ممدوح زر افشان بر نخاست

سلطان تغلق شاہ

تغلق شاہ فتح خان مرحوم شاہزادے کا لڑکا تھا۔ دادا کی وصیت کے مطابق 790ھ/1389ء میں وہ تخت نشین ہوا اور غیاث الدین تغلق اپنا خطاب رکھا۔ محمد شاہ کے مقابلے کے لیے اس نے فوج روانہ کی۔ محمد شاہ نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا۔ پھر نگرکوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ نگرکوٹ دشوار راستے پر ہے اس لیے شاہی فوج اس کا تعاقب نہ کر سکی۔ اسی اثناء

میں بادشاہ کے بھتیجے ابوبکر خان نے ملک رکن الدین اور دوسرے امرا کی سازش سے بغاوت کی اور تغلق شاہ کی جائے سکونت فیروز آباد میں داخل ہو گیا اور اس کے محل خاص کے دروازے پر ملک مبارک کبیر کو قتل کر دیا اور اس کے سر کو شہر کے صدر دروازے پر لٹکا دیا۔ یہ سانحہ 791ھ/1389ء میں پیش آیا۔ اس طرح تغلق شاہ کی حکومت صرف پانچ ماہ 18 دن رہی۔

سلطان ابوبکر شاہ بن ظفر خان

تغلق شاہ کے قتل کے بعد احق امیروں کے اتفاق سے ابوبکر شاہ تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے امیروں اور سرداروں کو مناصب اور عہدے تقسیم کر دیے اور رکن الدین کو اپنا وزیر بنایا لیکن کچھ ہی دن بعد معلوم ہوا کہ رکن الدین کی نیت ٹھیک نہ تھی اور وہ بعض امیروں سے اپنی بادشاہت جمانے کی سازش کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ابوبکر شاہ نے رکن الدین اور اس کے مشیروں کو قتل کرا دیا اور ان کے مال و اسباب لوٹ لیے۔ اس پہلی ہی سخت کارروائی کی وجہ سے اس کی حکومت مستحکم ہو گئی۔

سامانہ کے امیران صدہ

اسی دوران سامانہ کے امیران صدہ نے امیر سامانہ ملک سلطان شاہ خوش حال کو جو محمد شاہ کے مقابلے پر مامور کیا تھا۔ سامانہ کے تالاب کے کنارے قتل کر دیا اور اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، اس کا گھر بار لوٹ لیا، اس کا سر نگر کوٹ میں شاہ زادہ محمد شاہ کے پاس بھجوا دیا اور اسے نگر کوٹ سے سامانہ آنے کی دعوت دی۔

دہلی پر محمد شاہ کی چڑھائی

امیران صدہ کے پیغام اور مطالبے پر محمد شاہ نگر کوٹ سے کوچ کرتے ہوئے جالندھر کے راستے سے سامانہ پہنچ گیا اور شاہانہ اسباب مہیا کر کے دوبارہ 791ھ/1389ء میں اپنی

بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ماہ ربیع الآخر 791ھ/1389ء میں محمد شاہ نے پچاس ہزار کا لشکر لے کر دہلی کی طرف کوچ کیا اور قصر جہان نما میں آکر قیام کیا۔ امراء کو منصب اور اعزاز عطا کیے۔ ملک سرور کو خواجہ جہان اور ملک الشرق نصیر الدین حاکم ملتان کو خضر خان کا خطاب دیا۔

محمد شاہ اور ابوبکر کا مقابلہ

محمد شاہ کے مقابلے پر ابوبکر شاہ نے بہادر ناہر میواتی کی مدد سے صف آرائی کی۔ ماہ جمادی الاول سن مذکور میں فیروز آباد کے میدان میں ایک گھمسان جنگ کی۔ محمد شاہ کی بدنصیبی اس کے ساتھ تھی اسے شکست ہوئی اور وہ دو ہزار سواروں کی حفاظت میں جمنا پار کر کے دوآبہ کے علاقے میں چلا گیا، پھر وہاں سے اس نے اپنے منجھلے بیٹے ہمایوں خان کو سامانہ مدد کے لیے بھیجا۔ جہاں سے تیاری کے ساتھ وہ پچاس ہزار سواروں کا لشکر لے کر آیا۔ اس لشکر کو لے کر محمد شاہ نے دوبارہ دہلی پر حملہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی اس نے ابوبکر شاہ کے مقابلے میں مات کھائی۔ ابوبکر شاہ نے کچھ دور تک اس کا پیچھا کیا۔ محمد شاہ کا سارا سازوسامان اور لشکر تباہ ہو گیا اور وہ برے حالوں میں گنگا ندی کے کنارے ایک قصبہ جیتور میں پناہ گزین ہو گیا۔

ہمایوں خان کا حملہ اور شکست

792ھ/1390ء میں شہزادہ ہمایوں خان نے سامانہ کے بہت سے امراء کی مدد سے دہلی پر ایک بار پھر حملہ کیا اور شہر کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ اس حملے کے مدنظر ابوبکر شاہ نے عماد الملک کو چار ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ پانی پت کے میدان میں دو دنوں تک فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ ہمایوں خان شکست کھا کر سامانہ بھاگ گیا۔

ایک شہر، دو بادشاہ

ماہ جمادی الاول 790ھ/1390ء میں ابوبکر شاہ ایک بھری لشکر لے کر محمد شاہ کے فتنے کو ختم کرنے کے خیال سے چتر کی طرف روانہ ہوا اور دہلی سے بیس کوس کے فاصلے کو طے کر کے پڑاؤ ڈالا۔ اس موقع پر محمد شاہ نے ایک گہری چال چلی۔ وہ ابوبکر شاہ کے لشکر کو دھوکا دے کر دوسرے راستے سے دہلی میں داخل ہو گیا اور قصر ہمایوں میں جا کر قیام کیا اور شہر کے سب خواص و عام اس سے جا ملے۔ ابوبکر شاہ کو جب غنیم کی اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ الٹے پاؤں دہلی لوٹا اور ملک بہاء الدین جنگی کو جو محمد شاہ کی طرف سے دروازے کا محافظ تھا قتل کر کے شہر میں داخل ہو گیا اور سیدھا قصر ہمایوں کا رخ کیا۔ محمد شاہ اس حملے سے غافل تھا۔ مقابلے کی تاب نہ پا کر گھبرا گیا۔ جو امیر اس سے مل گئے تھے وہ اس حملے میں مارے گئے۔ اب محمد شاہ میں ابوبکر شاہ کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ مسلسل ناکامیوں نے اس کا دل توڑ دیا تھا لیکن رعایا اور لشکریوں کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ تھیں اور یہ سب ابوبکر شاہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔

دہلی پر محمد شاہ کا قبضہ

اس سال کے ماہ رمضان میں مبشر چپ اور فیروز شاہ کے عہد کے بعض امرا نے جو مختلف وجوہ سے ابوبکر سے ناراض تھے محمد شاہ کے پاس خفیہ خطوط روانہ کیے اور اس سے حملہ کرنے کی استدعا کی۔ جب ابوبکر شاہ کو امرا کی اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ نہایت پریشان ہوا۔ اور بہادر ناہر سے مدد لینے کے لیے کوٹلہ میوات کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی میں ملک شاہین، عماد الملک، ملک بحری اور صفدر خان کو چھوڑ گیا۔ اس موقع پر محمد شاہ امرا کے بلانے پر تیسری مرتبہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور قصر فیروز آباد میں تخت شاہی پر باقاعدہ جلوس کیا۔ مبشر چپ کو اسلام خان کا خطاب دے کر وزارت کا عہدہ عطا کیا کچھ دنوں کے بعد قصر فیروز آباد سے قصر جہاں نما میں منتقل ہو گیا اور ان فیروز شاہی کو غلاموں کو

جو پہلے فتنہ وفساد کے بانی تھے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ غلاموں کے اس قتل عام میں پورب کے اکثر آزاد لوگ بھی جن کی زبانیں کچی تھیں غلاموں کے دھوکے میں قتل ہو گئے۔ اس انقلاب سے ابوبکر شاہ ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ محمد شاہ نے اس کو کچلنے کے لیے کوٹلہ میوات کی طرف فوج کشی کی ناچار ابوبکر شاہ اور بہادر ناہر امان طلب کرتے ہوئے خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بہادر ناہر کو تو خلعت وانعام ملا اور ابوبکر شاہ کو قلعہ میرٹھ کی قید 22ے، زندگی بھر وہ اس قید خانے میں رہا۔ اس کی وفات 793ھ/1391ء میں ہوئی۔ اس نے صرف ایک سال چھ مہینے تک حکومت کی۔

سلطان محمد بن فیروز شاہ

اس فتح اور اپنے بھتیجے ابوبکر کی وفات کے بعد 793ھ/1391ء میں سلطان محمد نے دہلی کے تخت پر قدم رکھا اب کوئی دوسرا سلطنت کا دعوے دار نہیں رہا تھا۔ محمد شاہ مستقل اور کامل الاختیار سلطان ہو گیا۔

بغاوتیں

اسی سال حاکم گجرات ملک مفرح سلطانی کی سرکشی کی خبریں ملیں، سلطان نے ظفر خان ولد وجیہ الملک کو اس کی سرکوبی کے لیے مقرر کر دیا۔ 794ھ/1392ء میں سواب کے زمینداروں نے دوآبہ کے علاقے میں فتنہ انگیزی کی اور قصبہ بلا رام کو لوٹ لیا۔ اسلام خان نے وہاں کے باغی سرغنہ ہر سنگھ رائے پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ بادشاہ نے قنوج اور اٹاوے کی طرف توجہ کی اور وہاں کے سرکشوں کی اچھی طرح خبر لی اور اٹاوے کو تاخت وتاراج کر کے قصبہ جیتر جو اس کا قدیم پسندیدہ مقام تھا لوٹ لیا۔ شہر محمد آباد کی تعمیر شروع کرائی۔ اسی سال بغاوت کے الزام میں اسلام خان کا قتل ہوا۔ 795ھ/1393ء میں بادشاہ نے اٹاوے کے باغیوں کی طرف ملک مقرب الملک کو روانہ کیا۔ اس نے وعدہ وعید کر کے سب

باغیوں کو لشکر میں بلایا، پھر انھیں توج لے جا کر قتل کر ڈالا اور محمد آباد واپس آ گیا۔

محمد شاہ کی علالت

ماہ شوال 795ھ/1393ء میں بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اس درمیان بہادر ناہر 23 نے کئی مواضعات لوٹ لیے۔ بادشاہ نے اسی بیماری کی حالت میں کوٹلہ کی طرف کوچ کیا۔ بہادر ناہر تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ گیا اور بادشاہ محمد آباد واپس آ گیا۔ محمد آباد واپس ہونے کے بعد بادشاہ نے کسی عمارت کی تعمیر شروع کرائی۔ اس مصروفیت میں اس کا مرض شدید ہو گیا۔ حالت مرض میں بادشاہ کو خبر ملی کہ لاہور میں سرشیخا کھوکھر نے بغاوت کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلطان نے لاہور کی مہم پر شہزادہ ہمایوں کو مقرر کیا۔ ابھی شہزادہ اس مہم پر روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ معبود حقیقی سے جا ملا اور اپنے باپ کے روضے، حوض خاص کے کنارے سپرد خاک کیا گیا۔ سلطان محمد شاہ کی حکومت چھ سال سات ماہ رہی۔

سلطان علاء الدین بن سکندر شاہ

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں خان سلطان علاء الدین سکندر شاہ کے لقب سے 19 ربیع الاول 795ھ/1393ء میں تخت نشین ہوا لیکن اس کی مدت حکومت صرف ایک ماہ سولہ دن رہی یعنی عالم شباب میں وفات پائی:

تا جہان بود چنین بود وچنین خواہد بود
ہمہ را عاقبت کار ہمین خواہد بود

اس بادشاہ کے عہد شاہزادگی میں ایک صاحب علم نے مقامات حریری کے مقابلے میں ایک کتاب اس کے نام پر تصنیف کی تھی۔ اس کا ایک مضمون میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ (یعنی مؤلف منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی)

سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ

علاؤ الدین کی رحلت کے بعد محمد شاہ مرحوم کا چھوٹا لڑکا محمود شاہ تمام امیروں کی اتفاق رائے سے 20 جمادی الاول 795ھ/1393ء میں تخت نشین ہوا اور سلطان ناصر الدین محمود شاہ اس کا خطاب مقرر ہوا۔ اس نے مقرب الملک کو مقرب خان کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنایا اور دوسرے تمام امرا کو منصب، جاگیر اور خطاب عطا کیے۔ گزشتہ چند سالوں کے حالات نے سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھ کھول دیے تھے اور سارے ملک میں فتنہ و فساد پھیل گیا تھا۔ سلطان نے ان باغیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے خواجہ جہان کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر قنوج سے بہار تک کا سارا علاقہ حوالے کر دیا اور اسے فوجی مہم کے لیے رخصت کیا۔

خواجہ جہان کی کوششیں

خواجہ جہان نے جاج نگر تک فوجی کارروائی کر کے قبضہ کر لیا اور اس علاقے سے کافی مال غنیمت اور بہت سے ہاتھی حاصل کر کے بادشاہ کے پاس بھجوائے۔ لکھنوتی کے بادشاہ نے بھی ہر سال دہلی کو بطور نذرانہ ہاتھی روانہ کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران کڑہ، اودھ، بلوتالیہ، بہرائچ اور ترہت کے قلعے جنھیں ہندوؤں نے تباہ کر دیا تھا ان کو از سر نو تعمیر کیا اور سندیلہ کے قلعے کی بھی تعمیر کروائی گئی۔

سارنگ خان کا حملہ

مشرقی علاقے کے باغیوں کا تو کچھ انتظام ہو گیا لیکن لاہور اور دیپالپور کی طرف شیخا کھوکھر کی بغاوت اب بھی موجود تھی۔ بادشاہ نے فتنے کو ختم کرنے کے لیے سارنگ خان کو روانہ کیا۔ جب سارنگ خان وہاں پہنچا تو اسی سال ماہ ذی قعدہ کے آخر میں لاہور سے بیس کوس کے فاصلے پر موضع سامورحملہ میں شیخا کھوکھر نے سارنگ خان سے ایک سخت لڑائی

لڑی لیکن شکست کھا کر جموں کے پہاڑ پر بھاگ گیا۔ سارنگ خان نے لاہور اپنے چھوٹے بھائی عادل خان کے سپرد کر دیا اور دیپالپور لوٹ گیا۔

مقرب خان اور سعادت خان

ماہ شعبان 795ھ/1393ء میں سلطان محمود نے مقرب خان کو شہر میں اپنا نائب بنا کر سعادت خان کو جو عبدالرشید سلطان کے نام سے مشہور تھا، اپنے ہمراہ لیا اور بیانہ اور گوالیار کی طرف سفر کیا۔ قصبہ لپساور میں ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کرائی جو آج تک موجود ہے۔ جب شاہی لشکر گوالیار کے قریب پہنچا تو ملک علاء الدین دھاروال، ملوخان جو سارنگ خان کا بھائی تھا اور ملک راجو نے سعادت خان کے قتل کا ارادہ کیا لیکن سعادت خان ان کی سازش سے واقف ہو گیا اور اس نے ملک علاء الدین اور مبارک خان کو گرفتار کر کے قتل کر دیئے۔ البتہ ملوخان جان بچا کر نکل گیا اس نے دہلی جا کر مقرب خان کے یہاں پناہ لے لی۔ بادشاہ نے بھی اسی وقت پایہ تخت لوٹ کر اور شہر کے مضافات میں سلطانی کیمپ لگا لیا۔ مقرب خان نے چونکہ سرکش ملوخان کو پناہ دی تھی اس لیے خوفزدہ ہو کر قلعے میں محصور ہو گیا۔ تین ماہ تک مقرب خان اور سعادت خان کے لشکر میں لڑائی ہوتی رہی۔

نصرت شاہ

سعادت خان یہاں سے فیروزآباد چلا گیا اور بعض امیروں کو اپنے ساتھ ملا کر فتح خان کے بیٹے نصرت خان کو میوات سے بلایا۔ ماہ ربیع الاول 797ھ/1395ء میں اس کو ناصر الدین نصرت شاہ کا خطاب دے کر تخت پر بیٹھا بھی دیا تھا۔ نصرت شاہ بس نام کا بادشاہ تھا سارے اقتدار اور قوت کا مالک تو سعادت خان تھا۔ نصرت شاہ اس بے بسی کے سبب سخت پریشان رہتا تھا۔ چنانچہ فیروز شاہ کے چند غلاموں اور فیل بانوں کے ساتھ مل کر اس نے ایک سازش کی اور کسی بہانے سے ہاتھی پر سوار ہو کر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ

سعادت خان پر حملہ کر دیا۔ سعادت خان اس سازش سے بے خبر تھا وہ کچھ نہیں کر سکا اور وہاں سے بھاگ نکلا اور اپنے پرانے دشمن مقرب خان کے پاس ہی فریاد لے کر پہنچا۔ اس نے سعادت خان کو ملاقات کے لیے بلا کر دھوکے سے قتل کرا دیا۔

شطرنج کے بادشاہ

اب ایک ہی تخت کے دو دعویدار ہو گئے۔ دہلی میں سلطان محمود اور فیروز آباد میں نصرت شاہ۔ فیروز شاہ کے غلاموں محمد مظفر وزیر، شہاب ناہر، ملک فضل اللہ بلخی اور دوسرے چند امیروں نے نصرت شاہ سے ازسرنو بیعت کی۔ اس نے ان میں مناصب اور اعزاز تقسیم کیے۔ مقرب خان نے دہلی کا پرانا قلعہ بہادر ناہر میواتی کے حوالے کیا اور ملو خان کو اقبال خان کا خطاب ملا۔ اب عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں بادشاہوں میں ہر روز شطرنج کے بادشاہوں کی طرح لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن کوئی دوسرے کو مات نہیں دے سکتا تھا۔ دوآبہ کا درمیانی علاقہ، سنبھل، پانی پت، روہتک اور جھجھر نصرت شاہ کے قبضے میں آ گیا تھا اور چند پرانے قلعے جیسے دہلی، سیری وغیرہ سلطان محمود کے تصرف میں تھے مشہور مثل "حکم خداوند عالم از دہلی تا پالم" اسی زمانے سے رائج ہوا ہے۔ کیونکہ دہلی اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کو چھوڑ کر سارے ہندستان میں جہاں جس کا بس چلا علاقہ دبا کر خود مختار ہو گیا تھا۔ اور پورے ملک میں افراتفری کا عالم تھا۔

خضر خان اور سارنگ خان

کافی عرصے تک فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کبھی فیروز آباد والے دہلی والوں پر غالب آ گئے تو کبھی دہلی والوں نے فیروز آباد والوں کو پسپا کر دیا۔ یہاں تو یہ صورت حال تھی کہ شمال کی طرف خضر خان امیر ملتان اور سارنگ خان حاکم دیپالپور میں بھی ٹھن گئی اور ان دونوں کے درمیان 798ھ/1396ء تک سخت لڑائی ہوئی آخر کار ملک مروان کے غلاموں

نے خضر خان سے بے وفائی کی اور سارنگ خان سے جا کر مل گئے۔ یہ ملک مروان خضر خان کے باپ ملک سلیمان کا محسن اور مربی تھا۔ ان غلاموں کی غداری کی وجہ سے ملتان خضر خان کے قبضے سے جاتا رہا اور سارنگ خان کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس کے لشکر میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

سارنگ خان کی شکست

799ھ/1396ء میں سارنگ خان نے حاکم سامانہ غالب خان اور والی پانی پت تاتارخان کو بے دخل کر کے دہلی تک قبضہ کر لیا۔ نصرت خان نے فیروز شاہ کے غلام ملک الماس کو بڑا لشکر اور بہت سے ہاتھی دے کر تاتار خان کی مدد کے لیے روانہ کیا تاکہ سامانہ سارنگ خان سے چھین کر غالب خان کے سپرد کر دیا جائے۔ محرم 800ھ/1397ء میں موضع کوٹلہ کے علاقے میں ان دونوں فوجوں میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ سارنگ خان شکست کھا کر ملتان بھاگ گیا۔ تاتارخان نے تلونڈی تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے کمال الدین مبین کو اس کے تعاقب پر مامور کر کے لوٹ آیا۔

مغلوں کا حملہ

اسی سال ماہ ربیع الاول 800ھ/ 1397ء میں میرزا پیر محمد نے جو امیر تیمور گورکان سلطان خراسان و ماوراء النہر کا پوتا تھا۔ ہندستان پر حملہ کیا اور دریائے سندھ کو پار کر کے قلعہ اُوچ کا محاصرہ کر لیا۔ سارنگ خان کا قلعہ دار علی ملک ایک مہینے تک قلعے میں بند ہو کر مقابلہ کرتا رہا۔ اس کی مدد کے لیے سارنگ خان نے تاج الدین بختیار کو ایک ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ جب وہ اُوچ کے قلعے کے قریب پہنچا تو میرزا پیر محمد محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا لیکن یہ محض اس کا فریب تھا، کیونکہ اس نے دشمن کو دھوکے میں رکھ کر بیاس ندی کو عبور کیا اور ملک تاج الدین کی فوج پر جب کہ وہ غافل سو رہی تھی حملہ کر دیا اور بہت سے سپاہی قتل کر دیے

بعض دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ مددگار فوج کو تباہ کر کے میرزا پیر محمد نے دوبارہ ملتان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ سارنگ خان برابر چھ ماہ تک پیر محمد سے لڑتا رہا۔ آخر امن طلب کر کے اس کی پناہ میں آ گیا۔ پیر محمد نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور تیمور کے آنے تک ملتان ہی میں قیام پذیر رہا۔

اقبال خان کی حوصلہ آزمائی

ماہ شوال 800ھ/1397ء میں اقبال خان جو ملو یا سلطان کے نام سے مشہور تھا بڑے عہد و پیمان کے ساتھ نصرت شاہ کا حامی اور شریک بن گیا اور اسے پورے لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ قصر جہاں نما میں لے گیا۔ مقرب خان اور بہادر ناہر پرانی دہلی کے قلعے میں بند ہو گئے۔ تیسرے دن اقبال خان نے دھوکا دے کر نصرت شاہ کے لشکر پر حملہ کر دیا، وہ بے خبر تھا۔ بدحواس ہو کر فیروز آباد چلا گیا۔ وہاں سے جمنا پار کر کے اپنے وزیر تاتار خان کے پاس پانی پت چلا گیا۔ نصرت شاہ کا سارا ساز و سامان ہاتھی گھوڑے مکار اقبال خان کے ہاتھ آ گئے۔ اقبال خان اور مقرب خان کے مابین دو ماہ تک برابر لڑائی ہوتی رہی۔ کچھ دن کے بعد بعض امرا نے بیچ بچاؤ سے دونوں کی صلح کرا دی لیکن ایک دن موقع پا کر اقبال خان نے دغا کی اور اچانک مقرب خان کے گھر کا محاصرہ کر لیا، اور جب وہ امن کا قول و قرار کر کے باہر نکلا تو اسے قتل کر ڈالا اور سلطان محمود کو تخت پر بٹھا کر برائے نام بادشاہ بنا لیا اور ملک کا سارا بندوبست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ماہ ذی قعدہ 800ھ/1397ء میں اقبال خان نے تاتار خان سے پانی پت بھی چھین لیا اور وہاں کا سارا ساز و سامان اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس حملے سے تاتار خان نے دہلی پر حملہ کیا مگر وہ کچھ نہ کر سکا بلکہ الٹا ایک بڑا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لاچار ہو کر وہ دہلی سے اپنے باپ کے پاس گجرات چلا گیا۔ اقبال خان نے دہلی آنے کے بعد تاتار خان کے داماد نصیر الملک کو باذل خان کا خطاب دے کر دوآبہ کا درمیانی علاقہ اس کے حوالہ کر دیا۔

ہندستان پر امیر تیمور کا حملہ

801ھ/1398ء میں امیر تیمور نے ہندستان پر حملہ کیا اور ملتان پہنچ گیا۔ میرزا پیر محمد نے سارنگ خان کے بے شمار لشکریوں کو یہاں قید کر رکھا تھا۔ تیمور نے ان کو قتل کرا دیا۔ تیمور ملتان سے آگے بڑھا اور لگاتار کوچ کرتے ہوئے بہت کے قلعے کو فتح کر لیا۔ راجہ جھجین بھتی اور دیگر لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ تیموری لشکر نے پیش قدمی کر کے سامانہ بھی فتح کر لیا۔ اس وقت دیپالپور، اجودھن اور سرتی کے سارے لوگ جان کے خوف سے ادھر ادھر بھاگ نکلے اور اس بلائے آسمانی سے بچنے کے لیے جہاں جگہ ملی چلے گئے۔ تیمور نے ان مفرورین میں سے جن کو بھی جہاں پایا قتل کر دیا اور بعض کو قید کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔

تیموری لشکر دوآبہ میں

سامانہ سے تیمور نے آگے بڑھ کر جمنا کو پار کیا اور دوآبہ کے علاقے میں تباہی مچادی، سارا ملک اس کی لوٹ کھسوٹ سے ویرانہ بن گیا۔ جمنا کے کنارے قصبہ لونی میں جو دہلی کے قریب ہے یہاں اس نے قیام کیا اور یہاں تقریباً پچاس ہزار قیدی جو گنگا کے کنارے تک پکڑے گئے تھے قتل کروا دیے۔ تیمور کے لشکر میں کچھ لوگ بڑے بڑے عمامہ باندھے مولویوں کی صورت بنائے ساتھ تھے۔ انھوں نے مسلمان قیدیوں کو بھی ہندوؤں کے فہرست میں رکھ کر جہاد کی نیت سے ان بے کسوں کو قتل کر دیا۔ 801ھ/1398ء ماہ جمادی الاول میں تیمور نے جمنا کو عبور کیا اور فیروز آباد آکر رکا۔ دوسرے دن حوض خاص پر اس کے لیے شامیانے لگائے گئے۔

سلطان محمود کا فرار ہونا

اقبال خان تیموری لشکر کے مقابلے پر بہت سے ہاتھی اور بھاری لشکر لے کر آیا لیکن تیموری فوج نے ایک زوردار حملے میں اسے بری طرح شکست دی اور سارے ہاتھی تیمور کے ہاتھ آگئے۔ جب رات ہوئی تو اقبال خان اور سلطان محمود عزت وآبرو اور شرم وحیا کو بالائے

طاق رکھ کر اور اپنے اہل وعیال کو اس مصیبت میں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سلطان محمود تو گجرات کی طرف بھاگا اور اقبال خان جمنا پار کر کے قصبہ برن میں جا چھپا۔

تیمور دہلی میں

دوسرے دن امیر تیمور دہلی میں داخل ہو گیا اور شہر والوں کو کافی مال و دولت کا اقرار لے کر جان کی امان عطا کی۔ حسب اقرار شہریوں سے مقررہ رقم اور مال وصول کر لیا۔ اس کے علاوہ اسے بڑے نذرانے اور قیمتی پیش کش بھی حاصل ہوئی۔ اس درمیان میں تیموری لشکر کے کئی سپاہیوں کو شہر والوں نے قتل کر دیا۔ جب تیمور کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے تمام شہر والوں کی عام گرفتاری کا حکم دیا اور دہلی کے رہنے والے بے شمار لوگوں کو ماوراء النہر پہنچا دیا۔

شیخ احمد کھٹو

ان قید ہونے والوں میں شیخ احمد کھٹو24 بھی تھے جن کا مزار گجرات کے قریب ہے وہ بھی تیمور کے لشکر کے ساتھ گئے تھے۔ تیمور سے ان کی ملاقات بھی ہوئی اور تیمور ان کے فضل وکمال کا بڑا معتقد ہو گیا۔ انھوں نے ماوراء النہر کے تمام علماء کو مباحثے میں لاجواب کر دیا اور تیمور سے قیدیوں کی رہائی کی سفارش کی۔ تیمور نے انکی خاطر سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ بلا شبہ شیخ کا اہل ہند پر بڑا احسان ہے۔ اس شیخ کے کچھ دن خسرو خان اور بہادر ناہر میواتی جو میوات کے پہاڑوں میں ڈر کر چھپ گئے تھے، امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تیمور نے خضر خان کے سوا باقی سب کو قید کر لیا۔ خضر خان کی غالباً امیر تیمور سے کچھ شناسائی تھی اس لیے وہ بچ گیا۔

لاہور پر تیمور کا حملہ

خضر خان کو دیپالپور اور ملتان کا مالک بنا کر اس سے کہا کہ دہلی بھی ہم نے تجھے عطا

کر دی۔ امیر تیمور لاہور سے کابل ہوتا ہوا قندھار کے راستے سمرقند چلا گیا۔ اس سال دہلی میں ایسی وبا پھیلی اور اتنا سخت قحط پڑا کہ اس کی بربادی اور ویرانی میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ شہر اور گاؤں ایسے اجڑے کہ انسان تو انسان کسی چرند پرند کا سایہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

ہندستان کی بدتر حالت

نصرت شاہ جو اقبال خان کے مقابلے سے بھاگ کر دوآبہ میں چلا گیا تھا اس موقعے کو غنیمت جان کر میرٹھ آیا، وہاں سے سیدھا دہلی پہنچ گیا۔ جو لوگ مغلوں کے ظلم سے جان بچا کر ادھر ادھر چھپے بیٹھے تھے وہ سب اور عادل خان اس کے گرد جمع ہو گئے اور اچھا خاصا لشکر بن گیا۔ اب نصرت شاہ نے شہاب الدین خان کے مقابلے کے لیے برن کی طرف کوچ کیا لیکن راستے میں انھیں ہندوؤں نے قتل کر دیا۔ اقبال خان نے پیش قدمی کر کے اس کے مال واسباب اور ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی سے اقبال خان کا اقبال چمک اٹھا اور روز بروز اس کی جمعیت میں ترقی ہوتی گئی اور نصرت شاہ کی رونق اٹھتی چلی گئی۔ اقبال خان نے پوری تیاری کے بعد برن سے دہلی کی طرف کوچ کیا اس کی لشکر کشی کی خبر سنتے ہی نصرت شاہ فیروز آباد سے میوات کی طرف بھاگ گیا جہاں اس کا انتقال ہوا۔ اس وقت ہندستان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ جہاں جس نے قدم جما لیا وہ خود کو ہندستان کا سلطان سمجھنے لگا تھا۔

اقبال خان کی کاروائیاں

802ھ/1399ء میں اقبال خان نے بیانہ کے حاکم شمس خان اوحدی پر حملہ کیا، نوہ اور پٹل کے جنگل میں ان کا مقابلہ ہوا جس میں اقبال خان کو فتح نصیب ہوئی اور شمس خان شکست کھا کر بیانہ کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔ بیانہ کے بعد اقبال خان نے کٹھر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ رائے ہر سنگھ سے کافی مال بطور پیش کش لے کر واپس ہوا۔ اسی سال جونپور

میں خواجہ جہاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ ملک مبارک قرنفل، مبارک شاہ کے خطاب سے قائم مقام بنا۔ 803ھ/1400ء میں بیانہ کے شمس خان اور بہادر ناہر خان کے لڑکے مبارک خان نے اقبال خان سے صلح کر لی اور اس نے دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر پٹیالی کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ آب سیاہ جو کہ کالے پانی سے مشہور ہے وہاں کے مقدم رائے سیر کو شکست دے کر بھگا دیا اور ان کافروں کا اٹاوہ تک پیچھا کیا۔ اقبال خان جب فوج کشی کرتے ہوئے قنوج پہنچا تو وہاں گنگا کے دوسرے کنارے پر مبارک شاہ جونپور سے کوچ کر کے پہنچ گیا تھا اور اس کی فوج مقابلے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اقبال خان نے اس کنارے پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ فریقین میں سے کسی کو بھی گنگا عبور کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور دونوں اپنے اپنے علاقے کو لوٹ گئے۔ دریا سے واپسی پر اقبال خان نے شمس خان اور مبارک خان کو بر طرف کر کے قتل کر دیا۔ اسی سال ایک بادشاہی غلام نے جو سامانہ کا حاکم تھا کافی بڑی جمعیت اکٹھی کر لی اور 9 رجب 803ھ/1400ء میں اجودھن کے علاقے میں اس نے خضر خان سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر قصبہ بھوہر میں جا چھپا۔ غالب خان اور دوسرے امیروں نے متحد ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔

سلطان محمود دہلی میں

804ھ/1401ء میں محمد شاہ کا بیٹا سلطان محمود دھار25 سے دہلی آیا۔ اقبال خان دکھاوے کے لیے اس کے استقبال کے لیے آیا اسے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ لے جا کر کوشک جہان نما میں ٹھہرایا، لیکن سلطنت کے سارے اختیارات اسی طرح اپنے ہاتھ میں رکھے یہ بات سلطان محمود کو بڑی گراں گزری لیکن وہ بالکل مجبور و بے بس تھا۔ اسی سال مبارک شاہ مر گیا۔ سلطان ابراہیم اس کا چھوٹا بھائی جانشین بنا۔ ابراہیم لشکر تیار کر کے اقبال خان اور سلطان محمود کے مقابلے کے لیے آیا۔ سلطان محمود اقبال خان سے بدگمانی رکھتا تھا وہ لڑائی ہونے سے پہلے شکار کے بہانے اقبال خان کے لشکر سے بھاگ نکلا اور سلطان ابراہیم کے پاس پہنچ گیا سلطان ابراہیم نے اس سے بڑی بے رخی اور لاپرواہی برتی اسی

عرصے میں سلطان محمود نے قنوج سے شاہزادہ فتح خان ہروی کو جو مبارک شاہ کی طرف سے وہاں کا حاکم تھا، نکال کر قلعہ قنوج پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کی تمام رعایا اس کی حامی بن گئی۔ سلطان ابراہیم جونپور اور اقبال خان دہلی کی طرف بغیر لڑے لوٹ گئے اور سلطان محمود نے صرف قنوج پر ہی تسکین کر لی۔ 804ھ/1401ء میں اقبال خان نے گوالیار پر حملہ کیا۔ مغلوں کے حملے کے دوران یہ قلعہ ہرسنگھ نے مسلمانوں سے چھین لیا تھا۔ اقبال خان نے قلعہ کو ہرسنگھ کے بیٹے بیرم دیو کو شکست دے کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

تاتار خان کی ہلاکت

807ھ/1404ء میں تاتار خان ناخلف نے اپنے باپ ظفر خان کو دھوکے سے قید کر کے اساول بھیج دیا۔ سلطان ناصر الدین نے محمد شاہ خطاب رکھ کر ایک بڑا لشکر جمع کیا اور دہلی کی طرف پیش قدمی کی، لیکن راستے میں اس کے چچا شمس خان نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا اس طرح ظفر خان کو قید سے رہائی دی۔ سارا لشکر اس کے ساتھ ہو گیا۔ 807ھ/1404ء میں اقبال خان نے گوالیار اور اٹاوے کا رخ کیا۔ اس نواح کے جتنے بھی راجہ تھے وہ سب اٹاوے کے قلعے میں اکٹھے ہو گئے۔ چار ماہ تک لڑائی ہوتی رہی آخر کار ان راجاؤں نے چار ہاتھی اور کچھ پیش کش دے کر صلح کر لی۔ اقبال خان نے اٹاوے سے لوٹ کر قنوج کے قلعے پر سلطان محمود سے مقابلے کے لیے حملہ کیا لیکن قلعے کی مضبوطی سے لاچار ہو کر دہلی واپس ہو گیا۔

اقبال خان کا انجام

محرم 808ھ/1405ء میں اقبال خان سامانہ اور پھر وہاں سے روپڑ کی طرف گیا اور بہرام خان ترک بچہ کو جو سارنگ خان کا مخالف ہو گیا تھا۔ دھوکے سے گرفتار کر کے اس کی کھال کھنچوا دی اور وہاں سے خضر خان کے مقابلے کے لیے ملتان کا رخ کیا۔ تلونڈی سے

وہاں کے زمینداروں رائے کمال الدین وغیرہ کو اپنے ہمراہ لے کر آگے بڑھا۔ اسی سال 19 جمادی الاول کو ضلع اجودھن میں خضر خان سے مقابلہ ہوا۔ اقبال خان کا اقبال رو بہ زوال تھا اس لیے پہلے ہی حملے میں اسے شکست ہوئی اس کا گھوڑا زخمی ہو گیا تھا اس لیے وہ معرکہ گاہ سے جان بچا کر نکل نہ سکا۔ خضر خان کے لشکریوں نے اس کا تعاقب کر کے پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر فتح پور ضلع ملتان میں بھیج دیا۔

سلطان محمود کی دوبارہ تخت نشینی

808ھ/1404ء ماہ جمادی الآخر میں امرائے دہلی کے بلانے پر سلطان محمود قنوج سے دہلی آ کر دوبارہ تخت نشین ہوا۔ سب امیروں کو مناصب تقسیم کیے۔ مبارک خان کے خاندان کو کول کی طرف روانہ کر دیا۔ 809ھ/1405ء میں سلطان محمود قنوج کے ارادے سے روانہ ہوا لیکن سلطان ابراہیم نے گنگا عبور کر کے راستہ روک دیا اور مقابلے کے لیے صف آرائی کر لی لیکن دونوں فریق بغیر لڑے اپنے اپنے علاقے کو لوٹ گئے۔ ابراہیم نے دوبارہ فوج کشی کر کے قنوج کا محاصرہ کر لیا۔ قنوج میں سلطان محمود کی طرف سے ملک محمود ترمتی ناظم تھا، اس نے چار مہینے تک حملہ آوروں سے مدافعت کی لیکن جب کسی طرف سے بھی مدد نہ ملی تو مجبوراً امان لے کر قنوج ابراہیم کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم نے برسات قنوج میں گزاری پھر اختیار خان کو قنوج میں چھوڑ کر دہلی کی تسخیر کے ارادے سے کوچ کیا۔

دہلی پر سلطان ابراہیم کا حملہ

810ھ/1407ء میں سلطان محمود کے کچھ آدمی باغی ہو کر ابراہیم سے آ کر مل گئے۔ ان باغیوں میں نصرت خان گرگ انداز، تاتار خان ولد سارنگ خان، اقبال خان کا غلام ملک مرحبا وغیرہ شامل تھے۔ البتہ اسد خان لودی سنبھل میں قلعہ بند ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن سلطان ابراہیم نے قلعہ سنبھل کو فتح کر لیا اور اسے تاتار خان کے سپرد کر دیا اور گنگا عبور

کر کے دہلی کی طرف یلغار کی۔ جب جمنا کے کنارے پہنچا تو اسے خبر ملی کہ ظفر خان نے دہار کو تسخیر کر کے جونپور کی طرف فوج کشی کر دی ہے یہ سن کر سلطان ابراہیم نے دہلی کا خیال چھوڑ دیا اور برن میں ملک مرحبا کو متعین کر کے بڑی تیزی سے جونپور پہنچا۔ سلطان محمود نے اس کا پیچھا کر کے مرحبا کو قتل کر دیا۔ سنبھل کا قلعہ بھی بغیر لڑے اس کے ہاتھ آ گیا اسے سلطان نے اسد خان لودی کے حوالے کر دیا۔ تاتار خان قنوج بھاگ گیا۔ ان اقدامات کے بعد سلطان محمود دہلی لوٹ آیا۔

دہلی پر خضر خان کا حملہ

اسی سال خضر خان نے بڑی تیاریوں کے ساتھ پیش قدمی کی اور دولت خان کو سامانہ سے بے دخل کر دیا۔ وہاں کے سارے امیر خضر خان کے ساتھ ہو گئے، دھیرے دھیرے دہلی کے قریب تک کا سارا علاقہ خضر خان کے ہاتھ آ گیا، صرف روہتک اور دوآبہ کا درمیانی ملک سلطان محمود کے پاس رہ گیا۔ 811ھ/1408ء میں سلطان محمود نے حصار فیروز کا رخ کیا۔ وہاں خضر خان کی طرف سے قوام خان ناظم تھا اسے بھگا کر سلطان محمود نے حصار فیروز26 پر قبضہ کر لیا اور علاقہ رند تک فوج کشی کر کے دہلی لوٹ آیا۔ خضر خان نے بھی فتح آباد سے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ روہتک کے راستے پیش قدمی کی، دہلی پر حملہ کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت دہلی میں بڑا شدید قحط پڑا تھا۔ اس لیے وہاں ٹھہر نہ سکا اور دوآبہ کے علاقے پر قبضہ کر کے فتح پور لوٹ گیا۔ 812ھ/1409ء میں بیرم خان ترک بچہ نے خضر خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ بیرم خان نے بہرام خان کے بعد سامانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور دولت خان سے شکست کھا کر خضر خان کے پاس آ گیا تھا، پھر خضر خان سے بغاوت کر کے دوبارہ دولت خان سے جا کر مل گیا تھا۔ خضر خان نے اسے سابقہ جاگیر عطا کر دی۔ 813ھ/1410ء میں خضر خان نے روہتک کا محاصرہ کر لیا اور چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد اسے فتح کر کے فتح پور واپس چلا گیا اسی سال سلطان محمود بھی کیتھل کی طرف گیا اور وہاں سے لوٹ کر دہلی آ گیا۔

خضر خان کا دہلی پر دوسرا حملہ

814ھ/1411ء میں خضر خان نے نارنول اور میوات پر حملہ کر کے بڑی لوٹ مار مچائی اور دہلی پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود سیری کے قلعہ میں اور اختیار خان فیروز آباد میں قلعہ بند ہو گیا، کئی دنوں تک لڑائی جاری رہی آخر غلے کی گرانی کی وجہ سے خضر خان پانی پت کے راستے فتح پور چلا گیا۔

سلطان محمود کی وفات

815ھ/1412ء میں محمود کا انتقال ہو گیا اور فیروز شاہ کے خاندان کی سلطنت ختم ہو گئی۔ سلطان محمود نے اتنے فتنہ وفسادات کے باوجود بیس سال دو ماہ حکومت کی۔

محمودی عہد کا شاعر

سلطان محمود کے عہد کا سب سے بڑا شاعر قاضی ظہیر دہلوی گزرا ہے۔ اس کا ایک دیوان مدحیہ قصائد پر مشتمل ہے:

وارث سلطنت قاہرہ سلطان محمود
کہ جہان خدمت جد و پدرش نگزیدہ!

حقیقت تو یہ کہ ہندستان میں قاضی ظہیر کے بعد ایسا بڑا شاعر کوئی اور نہیں گزرا۔

دولت خان اور خضر خان کے مقابلے

سلطان محمود کے انتقال کے بعد مبارز خان، والی روہتک نے جو روہتک کے نگراں تھے، ملک ادریس اور دوسرے امرا نے خضر خان کے مقابلے میں دولت خان سے موافقت

کر لی، خضر خان اس سال فتح پور ہی میں رہا۔ 816ھ/1413ء میں دولت خان شکار کے لیے کٹیھر گیا اور وہاں کے تمام راجاؤں کو گرفتار کر کے پٹیالی کا رخ کیا۔ اس جگہ بدایوں کا حاکم مہابت خان بھی اس سے آ کر مل گیا۔ اسی سال سلطان ابراہیم نے کالپی 27 میں قادر خان ولد محمود خان کو گھیر لیا۔ دولت خان کے پاس لشکر زیادہ نہ تھا اس لیے اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور دونوں میں سے کسی کو مدد نہ دی۔ اسی سال ماہ ذی القعدہ میں خضر خان فیروز آباد آیا۔ وہاں کے تمام امیر اس سے آ کر مل گئے۔ ملک ادریس روہتک میں قلعہ بند ہو گیا، خضر خان وہاں سے میوات چلا گیا اور بہادر ناہر کے بھتیجے جلال خان میواتی کو ہمراہ لے کر سنبھل پر حملہ کیا اور اسے خوب لوٹا۔

دہلی پر خضر خان کا تیسرا حملہ

816ھ/1413ء ذی الحجہ میں خضر خان نے دہلی پر حملہ کیا اور شہر سے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔ دولت خان قلعہ بند ہو گیا لیکن خضر خان کے طرف داروں، ملک لوٹا وغیرہ کی بے رخی کی وجہ سے مقابلے سے عاجز آ گیا اور بڑی عاجزی سے امن طلب کر کے خضر خان کے پاس حاضر ہو گیا۔ خضر خان نے اسے قید کر کے قوام خان کے سپرد کر دیا۔ قوام خان نے اسے حصار فیروز آباد لے جا کر قتل کر ڈالا یہ واقعہ 17 ربیع الاول 816ھ/1413ء کو پیش آیا۔

سلطان خضر خان بن ملک اشرف

خضر خان پایہ تخت ہند، دہلی کو فتح کرنے کے بعد 816ھ/1413ء میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

خضر خان کا خاندان

فیروز شاہ کے زمانے میں خضر خان کے دادا ملک سلیمان کو ملک نصیر الملک مردان نے

منھ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم جہانیاں شیخ جلال الدین بخاری28ؒ کسی کام سے ملک مروان کے گھر آئے۔ کھانے کے وقت ملک سلیمان حضرت کا ہاتھ دھلانے کے لیے آفتابہ اور طشت لے کر سامنے آیا۔ حضرت مخدوم نے اسے دیکھ کر فرمایا "اس سید زادے سے ایسی خدمتیں لینا مناسب نہیں"۔ اس دن سب کو علم ہوا کہ ملک سلیمان نجیب سید ہے ویسے بھی اس کے طور طریقے سیدوں جیسے ہی تھے۔ ملک مروان جس کا ذکر کیا گیا، فیروز شاہ کے زمانے میں ملتان کا حاکم تھا۔ اس کے مرنے پر ملتان اس کے بیٹے ملک شیخ کو مل گیا۔ کچھ دن بعد جب اس نے بھی وفات پائی تو ملتان کا علاقہ ملک سلیمان کے سپرد ہو گیا۔ کچھ دن بعد جب ملک سلیمان کا انتقال ہوا تو ملتان کا صوبہ اور اس کے ماتحت تمام علاقے فیروز شاہ نے اس کے پوتے خضر خان کے حوالے کر دیے۔

رایاتِ اعلیٰ

ملتان کی عملداری سے بتدریج ترقی کر کے خضر خان بادشاہی کے بلند درجہ تک پہنچ گیا لیکن اس نے بادشاہی کا خطاب اختیار نہیں کیا صرف "رایات اعلیٰ" اپنا لقب مقرر کر کے سلطنت کا انتظام سنبھال لیا۔

تاج الملک کی فوج کشی

816ھ/1413ء میں خضر خان نے سلطان محمود کے قصر میں قیام کیا اور خاص و عام ہر ایک کو انعامات دیے۔ اپنے مقربوں کو مناصب و خطابات تقسیم کیے۔ جلوس کے پہلے سال ملک تحفہ کو تاج الملک کا خطاب دے کر پورب کی طرف روانہ کیا۔ تاج الملک جب دریائے گنگا عبور کر کے کٹیھر پہنچا تو وہاں کے سرکش رائے ہر سنگھ وغیرہ آنولہ کے جنگل میں روپوش ہو گئے۔ تاج الملک نے کٹیھر کو لوٹ کر پامال کر دیا۔ مہابت خان حاکم بدایوں بھی ملاقات کے لیے اس کے پاس حاضر ہوا۔ رائے ہر سنگھ بھی آخر کار حاضر خدمت ہوا اور سالانہ اخراج

میں ایک بھاری رقم دینی منظور کی۔ کٹھیر سے تاج الملک اور مہابت خان نے ایک ندی کے کنارے کوچ کیا اور دونوں سرگدواری پہنچے۔ وہاں گنگا عبور کر کے کھور کہ، کنپلہ 29 اور پٹیالی پر فوج کشی کی اور وہاں کے باغیوں کی اچھی طرح خبر لی اس کے بعد قصبہ سکینہ اور یادہم سے گزر کر راپڑی پہنچے۔ راپڑی پر حسن خان اور اس کے بھائی ملک حمزہ کی حکومت تھی۔ یہ دونوں بھائی اور رائے سر حاکم چندوار گوالیار کے سرداروں کے ساتھ حاضر ہو گئے اور سالانہ خرچ دینے کا اقرار کیا۔ تاج الملک نے وہاں سے قصبہ جلیسر کا رخ کیا اور اسے چندوار کے ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر اس جگہ ایک مسلمان حاکم مقرر کیا۔ یہاں سے فوجی کارروائی کر کے آب سیاہ یعنی کالا پانی کے علاقے کو فتح کر لیا اور اتاوہ کے ہندوؤں کا صفایا کر کے دہلی لوٹ آیا۔

شہزادہ مبارک

818ھ/1415ء میں خضر خان نے اپنے چھوٹے لڑکے مبارک کو جس کے خدوخال سے بادشاہی کے آثار جھلکتے تھے۔ فیروز پور، سرہند اور بہرام خان ترک بچہ کا سارا علاقہ حوالے کر دیا اور علاقے کے نظم و نسق پر اسے کامل اختیارات دے دیے۔ اس شاہزادہ کا نائب ملک سدھو نادرہ کو مقرر کیا گیا۔ شاہزادے نے اسی سال سدھو نادرہ، زیرک خان امیر سامانہ اور دوسرے امرا کے ساتھ پورے علاقہ کا دورہ کیا اور سارے بندو بست کو انجام دے کر دہلی لوٹ آیا۔

گوالیار اور بیانہ پر حملہ

819ھ/1416ء میں خضر خان نے ملک تاج الملک کو بڑا لشکر دے کر گوالیار اور بیانہ کی طرف رخصت کیا۔ شمس خان اوحدی کا بھائی ملک کریم الملک بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ تاج الملک اس پورے علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور پورے علاقے پر قبضہ کر کے دہلی لوٹ آیا۔

ترکوں کی سرکشی

اسی سال بیرم خان کے ترکوں نے ملک سادھو نادرہ کو جو شہزادے کی طرف سے سرہند میں ناظم تھا دھوکے سے پکڑ کر قتل کر دیا اور سرہند پر قبضہ کر لیا خضر خان کے حکم سے زیرک خان اس طرف گیا اور وہاں کا انتظام کر کے واپس ہوا۔ اسی سال گجرات کے حاکم سلطان احمد نے ناگور کا محاصرہ کر لیا لیکن جب خضر خان کے آنے کی خبر سنی تو محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔

گوالیار پر خضر خان کا حملہ

خضر خان نے جھاین پہنچ کر وہاں کے حاکم الیاس خان کو بلایا۔ پھر وہاں سے گوالیار گیا۔ گوالیار کا قلعہ فتح نہ ہو سکا لیکن خراج اور پیش کش میں کافی مال و دولت وصول ہو گئی۔ گوالیار سے بادشاہ نے بیانہ کا رخ کیا۔ شمس خان اوحدی حاکم بیانہ نے اطاعت قبول کر لی۔ 820ھ/1418ء میں طوغان روحی ترک سردار نے جس کے آدمیوں نے ملک سادھو کو قتل کیا تھا دوبارہ سرکشی کی۔ زیرک خان نے دوبارہ جا کر ان کو منتشر کر دیا۔

شاہی لشکر کے اقدامات

821ھ/1418ء میں خضر خان کٹھیر میں آیا۔ ہر سنگھ دیو اس آنولہ کے جنگل میں جو چوبیس کوس کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا روپوش ہو گیا۔ وہاں سے کچھ دن تک مقابلہ کرتا رہا آخر شکست کھا کر کمایوں کی طرف بھاگ گیا۔ تاج الملک نے رہب ندی اتر کر پہاڑوں تک اس کا تعاقب کیا اور وہاں سے بدایوں آیا۔ حاکم بدایوں مہابت خان کو ساتھ لے کر گنگا کو بجلانہ کے گھاٹ سے عبور کیا، وہاں سے مہابت خان کو رخصت کر کے اٹاوہ تک فوج کشی کی اور کافی مال غنیمت لے کر دہلی واپس آیا۔

بادشاہ کے خلاف بغاوت

اسی سال خضر خان نے دوبارہ کٹھیر پر حملہ کیا اور کول کے راستے سے پٹیالی پہنچ گیا۔ وہاں سے گنگا پار کر کے بدایوں کا عزم کیا۔ اس بار مہابت خان خوفزدہ ہو کر قلعہ بند ہو گیا اور برابر چھ ماہ تک بادشاہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ خضر خان قلعہ کو فتح کر لیتا لیکن اسی دوران اسے اطلاع ملی کہ محمود شاہ کے قدیم امیر قوام خان اور اختیار خان جو دولت خان کو چھوڑ کر خضر خان سے آ کر مل گئے تھے بغاوت کی سازش کر رہے ہیں اس اطلاع کے ملتے ہی وہ بدایوں کو چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا اور 822ھ/1419ء میں گنگا کے کنارے ان باغی امیروں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔

نقلی سارنگ خان

822ھ/1419ء میں ایک غیر معروف شخص نے سارنگ خان ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ سارنگ خان ایک مدت پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ اس شخص نے بہت سے لوگوں کو جمع کر لیا۔ جب اس کا فتنہ بہت بڑھا تو خضر خان نے سلطان شاہ لودی کو اس کے مقابلے پر روانہ کیا۔ سہرند کے علاقے میں بہت سخت لڑائی ہوئی، آخر نقلی سارنگ خان شکست کھا کر پہاڑوں میں بھاگ گیا۔

تاج الملک کا انتقال

اسی سال خضر خان نے تاج الملک کو دوبارہ اٹاوہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں کا زمیندار رائے سیر قلعہ میں بند ہو گیا۔ اس نے معافی چاہی اور اپنے ذمے کا روپیہ ادا کرنے کا عہد کیا۔ تاج الملک وہاں سے چندوار گیا اور خوب لوٹ مار کر کے کٹھیر آیا اور وہاں سے دہلی لوٹ گیا۔ اسی سال تاج الملک کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا ملک سکندر وزیر مقرر ہوا۔ طوغان ترک نے سہرند میں پھر چڑھائی کی اس بار خیر الدین نے حملہ آور کو روکا۔

میوات اور گوالیار پر حملہ

824ھ/1421ء میں خضر خان نے میوات کی طرف توجہ کی اور کوٹلہ کے قلعہ کو فتح کر کے وہاں سے گوالیار پر فوج کشی کی اور گوالیار کے راجہ سے بہت سامال اور قیمتی پیش کش لے کر اٹاوہ چلا گیا اور وہاں رائے سیر کو قتل کر دیا۔ اس کے بیٹے نے اطاعت قبول کر لی۔

خضر خان کی وفات

خضر خان اٹاوہ ہی سے بیمار ہو کر دہلی آیا، دہلی پہنچے کے بعد 17 جمادی الثانی 824ھ/1421ء میں اسکا انتقال ہو گیا۔ اس کی مدت سلطنت سات سال چند ماہ رہی:

جہان ای برادر نماند بہ کس
دل اندر جہان آفریں بندو بس

سلطان مبارک شاہ بن خضر خان

سلطان خضر خان کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ تمام امرا کی اتفاق رائے سے 824ھ/1421ء میں تخت نشین ہوا۔

جسرت کھوکھر کی وفات

اسی سال شیخا کھوکھر کے بیٹے جسرت کھوکھر نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا محرک یہ تھا کہ سلطان علی کشمیر کے بادشاہ نے ٹھٹھہ کی جیت کے ارادے سے فوجی کاروائی کی تھی۔ جسرت نے پہاڑ کی گھاٹی میں دھوکے سے اسے شکست دے کر سارا ساز وسامان لوٹ لیا۔ اس کامیابی کا اسے ایسا گھمنڈ ہوا کہ سلطنت دہلی کے خواب دیکھنے لگا اور ایک بڑی جمعیت اکھٹی کر کے بیاس اور ستلج عبور کر کے تلونڈی کے کنارے آیا وہاں رائے فیروز اس کا مقابلہ نہ

کر سکا اور بھاگ گیا۔ اب جسرت کے لیے میدان کھلا ہوا تھا وہ کداہنہ تک بڑھ آیا اور ستلج کے ساحلی علاقوں کو روپڑ تک لوٹ کر تباہ کر دیا پھر آگے بڑھ کر جالندھر پہنچا۔ زیرک خان جالندھر میں قلعہ بند ہو گیا۔ جسرت نے سرتی کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ پہلے تو صلح کر لی پھر دھوکے سے زیرک خان کو قید کر لیا۔ جب جسرت کی ان جسارتوں کی مسلسل خبریں مبارک شاہ کو ملیں تو وہ خود جسرت کے مقابلے کے لیے آیا۔ جسرت کو بادشاہ کے آنے کی خبر ملی تو اس نے زیرک خان کو رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ سامانہ میں مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مبارک شاہ جب لدھیانہ پہنچا تو جسرت نے لدھیانہ کی ندی عبور کر کے مقابلے کے لیے صف آرائی کر لی۔ اس علاقے کی ساری کشتیاں جسرت نے اپنے اختیار میں کر لی تھیں اس لیے مبارک شاہ اس سے پہلے دریا کو پار نہیں کر سکا۔ جب کچھ دن بعد دریا میں پانی کم ہو گیا تو شاہی لشکر نے دریا پار کیا۔ شاہی لشکر کی پیش قدمی سے جسرت ڈر کر بھاگ گیا اور چناب پار کر کے پہاڑی مقام بھلھر کی جانب چلا گیا۔ مبارک شاہ نے تعاقب کر کے اس کے بہت سے سوار اور پیادے قتل کر دیے اور کافی مال و اسباب لوٹا۔

لاہور کو از سر نو آباد کرنا

اس مقام پر جموں کا زمیندار رائے بھیم مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لشکر کے ساتھ مل گیا۔ مبارک شاہ نے لاہور پہنچ کر ایک ماہ تک راوی کے کنارے قیام کیا اور لاہور شہر کو جو پچھلے تباہ کن ہنگاموں میں ویران ہو چکا تھا از سر نو آباد کرایا۔ لاہور کے قلعے کی مرمت کرائی اور ملک محمود کو جس کا خطاب ملک الشرق تھا وہاں چھوڑ کر دہلی واپس لوٹ آیا۔ مبارک شاہ کے لاہور پہنچنے کا سنہ 825ھ/1422ء ہے۔

لاہور پر جسرت کی چڑھائی

پانچ ماہ بعد جسرت نے دوبارہ ایک لشکر جمع کر کے لاہور پر چڑھائی کی اور حضرت شیخ

حسن زنجانی30 کے مزار کے قریب اپنا خیمہ لگایا۔ جسرت کی فوج ہر روز شہر پر حملہ کرتی تھی لیکن اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑتا تھا۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نہ نکلی تو مجبوراً کلانور کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں اس کی خبر لینے کے لیے رائے بھیم کی جمعیت تیار تھی۔ فریقین میں لڑائی ہوئی لیکن جلد ہی صلح ہو گئی۔ مبارک شاہ نے ملک محمود حسن کی مدد کے لیے دہلی سے ملک سکندر کو بھیجا۔ اس نے بیاس ندی کو بوہی کے گھاٹ سے پار کیا۔ جب جسرت کو خبر ملی کہ ملک سکندر لاہور پہنچ چکا ہے تو وہ چناب ندی پار کر کے تلواہ کی پہاڑی کی جانب بھاگ گیا۔ شاہی لشکر اس فتنے کو ختم کر دہلی لوٹ آیا۔

شمس آباد پر دھاوا

826ھ/1423ء میں مبارک شاہ کٹیھر گیا۔ یہاں مہابت خان بدایونی نے جو خضر خان کے عہد میں باغی ہو گیا تھا حاضر ہو کر باریابی حاصل کی۔ مبارک شاہ نے اس پر بڑے رحم و کرم کیے۔ کٹیھر سے کوچ کر کے بادشاہ نے گنگا کو پار کیا، اور کھور عرف شمس آباد کے علاقے میں ہنواروں کے علاقہ کو لوٹ لیا اور اسے تباہ کر دیا۔ یہاں کے باغیوں کے بندوبست کے لیے ملک مبارز خان، زیرک خان اور کمال خان کو بھاری لشکر دے کر کمپلہ کے قلعے میں مقرر کر دیا اور خود دہلی واپس آ گیا۔

الپ خان کی بغاوت

826ھ/1423ء میں دہار کے حاکم الپ خان نے گوالیار پر حملہ کیا۔ جب مبارک شاہ کو یہ خبر ملی تو وہ گوالیار کی جانب روانہ ہوا۔ بیانہ کے قریب پہنچا تو محمد خان اوحدی کا بیٹا جو بیانہ کا حاکم تھا قلعے میں بند ہو گیا۔ اس نے اپنے چچا مبارک خان سے بغاوت کر کے اسے قتل کر دیا تھا۔ اسی قتل کے ڈر سے اس نے بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا لیکن وہ زیادہ دنوں تک قلعہ کے اندر بند نہیں رہ سکا اور جلد ہی اطاعت اختیار کر لی۔ بیانہ سے فارغ ہو

کر مبارک شاہ نے گوالیار کی طرف کوچ کیا۔ الپ خان نے شاہی لشکر کا راستہ روکنے کے لیے چنبل ندی کے کنارے پر مورچہ بندی کر لی تھی لیکن مبارک شاہ نے اسے غفلت میں رکھ کر ایک دوسرے گھاٹ سے چنبل کو پار کیا اور حملہ آور ہو کر الپ خان کے لشکر کو تہس نہس کر دیا۔ آخر الپ خان نے بھاری پیش کش دے کر صلح کر لی اور اپنے علاقے کی جانب لوٹ گیا، بادشاہ بھی دہلی واپس آ گیا۔

ہندستان میں قحط

827ھ/1424ء میں مبارک شاہ نے دوبارہ کیتھر اور کمایوں کا رخ کیا۔ وہاں سے واپسی پر میوات کو بُری طرح پامال کر دیا۔ اسی سال ہندستان میں بہت شدید قحط پڑا تھا۔ 829ھ/1426ء میں بادشاہ نے پھر میوات پر فوج کشی کی اور اندور اور الور کے قلعے فتح کر لیے۔

گوالیار کے راجاؤں کی اطاعت

831ھ/1428ء میں اس نے بیانہ سے محمد خان اوحدی کے عمل دخل کو ختم کر دیا اور اپنے ایک غلام ملک مقبل کو بیانہ کی حکومت دے دی۔ سیکری کو ملک خیر الدین تحفہ کو تفویض کیا۔ اوحدی کے سارے خاندان کو بیانہ سے ہٹا کر کوشک جہاں نما میں ٹھہرا دیا۔ ان انتظامات کے بعد گوالیار پر فوج کشی کی۔ اس مرتبہ وہاں کے سارے راجاؤں نے اطاعت قبول کر لی۔

ملک شرقی سے مقابلہ

831ھ/1428ء میں حاکم کالپی قادر خان کے قاصدوں نے آ کر اطلاع دی کہ ملک شرقی نے کالپی کا محاصرہ کر لیا۔ مبارک شاہ قادر خان کی مدد کے لیے دہلی روانہ ہوا۔ راستے میں معلوم ہوا کہ ایک شرقی بھون گاؤں میں پہنچ چکا ہے اور وہاں سے بدایوں کا ارادہ کر رہا

ہے۔ بادشاہ نے تیزی سے کوچ کیا اور نوہ ٹیل کے گھاٹ سے جمنا پار کر کے موضع جرتولی اور پھر وہاں سے اترولی پہنچ گیا۔ یہاں مخبروں نے اطلاع دی کہ ملک شرقی کا بھائی مختص خان ایک بڑا لشکر اور ہاتھی لے کر اٹاوہ کی سرحدوں پر پہنچ گیا ہے۔ مبارک شاہ نے ملک الشرق محمود حسن کو دس ہزار سوار دے کر مختص خان کی طرف روانہ کیا۔ جب اسے شاہی لشکر کی آمد کی خبر ملی تو اپنے بھائی ملک شرقی سے جا ملا۔ اس وقت ملک شرقی نے آب سیاہ یعنی کالے پانی کو گھیر لیا اور قصبہ برہان آباد کے قریب جو اٹاوہ کے تحت ہے، مقیم تھا۔

ملک شرقی کا فرار ہونا

مبارک شاہ نے اترولی سے کوچ کیا اور کوٹہ میں آ کر رکا لیکن ملک شرقی مقابلہ کیے بغیر راپڑی چلا گیا، وہاں سے جمنا پار کر کے بیانہ پہنچا اور گنگھر کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ مبارک شاہ اس کا پیچھا کرتا ہوا چندوار پہنچ گیا۔ اب دونوں لشکر چار کوس کے فاصلے پر بالمقابل تھے روزانہ فریقین میں صف آرائی اور جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ بیس دن تک لڑائی کا یہی رنگ رہا آخر ملک شرقی نے ایک دن پوری تیاری سے حملہ کیا، دوپہر سے شام تک گھمسان لڑائی ہوتی رہی۔ دوسرے دن ملک شرقی میدان چھوڑ کر اپنے علاقہ کی جانب بھاگ گیا اور مبارک شاہ نے اس خیال سے کہ دونوں طرف مسلمان ہیں ناحق خون بہے گا اس کا پیچھا نہیں کیا۔

حاکم بیانہ کی اطاعت

ملک شرقی کو بھگا کر بادشاہ نے رستگالی پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے چنبل کے ساحل پر قبضہ کرتے ہوئے بیانہ پہنچا۔ محمد خان اوحدی ملک شرقی کے ساتھ ہو گیا تھا اب جو شاہی لشکر آیا تو وہ خوفزدہ ہو کر قلعے میں بند ہو گیا پھر معافی طلب کرتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس کے بعد مبارک شاہ دہلی چلا گیا۔ 823ھ/1428ء میں ملک الشرق

حسن محمود جو بیانہ میں رہ گیا تھا اس ضلع کا نظم ونسق درست کر کے اور ان لوگوں کو سزائیں دے کر جو محمد خان اوحدی کے گرد جمع ہو گئے تھے، دہلی لوٹ آیا۔ اسی سال ملک رجب نادرہ جو کہ ملتان کا حاکم تھا، مر گیا اور اس کی جگہ ملک محمود حسن کا تقرر ہوا۔ بادشاہ نے اسے عماد الملک کا خطاب عطا کیا۔

فولاد کی فتنہ انگیزی

823ھ/1429ء میں ملک شاہ نے بیانہ کے راستے کوچ کیا اور گوالیار پہنچا۔ راپڑی سے حسن خان کو ہٹا کر ملک حمزہ کو مقرر کیا اور دہلی لوٹ گیا۔ راستے میں سید سالم جو خضر خان کی خدمت میں تیس سال رہا تھا اور تبر ہندہ اس کی جاگیر میں تھا فوت ہو گیا۔ مبارک شاہ نے اس کے ایک بیٹے کو سید خان دوسرے کو شجاع الملک کا خطاب عطا کیا لیکن تبر ہندہ میں سید سالم کے ایک ترک غلام فولاد نے بغاوت کر کے اس کے مال و اسباب اور تبر ہندہ کی عملداری پر قبضہ کر لیا۔ مبارک شاہ نے سید سالم کے مذکورہ بیٹوں کو قید کر لیا۔ (غالباً یہ بغاوت ان کے اشارے پر ہوئی تھی) اور ملک یوسف سردار اور رائے ہنسو بھٹی کو فولاد سے مقابلے کے لیے روانہ کیا فولاد نے رات میں چھپ کر ان کے لشکر کو تباہ کر دیا۔ کافی مال و غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔ اس بے عزتی کے جواب میں مبارک شاہ خود فولاد پر حملہ آور ہوا۔ فولاد قلعے میں بند ہو گیا مبارک شاہ نے ملتان سے عماد الملک کو بلا کر اس کے پاس بھیجا۔ عماد الملک کی کوششوں سے وہ معافی طلب کر کے قلعے سے نکل کر عماد الملک کی پناہ میں آ گیا لیکن اس کا دل مطمئن نہیں تھا اس لیے دوبارہ بھاگ کر قلعے میں چلا گیا اور لڑائی جاری رکھی۔ مبارک شاہ نے عماد الملک کو ملتان واپس کر دیا اور فولاد کے مقابلے کے لیے لشکر چھوڑ کر خود دہلی واپس آ گیا۔

کابل کے حاکم شیخ علی کا حملہ

فولاد چھ ماہ تک برابر بادشاہی لشکر سے ٹکر لیتا رہا پھر اس نے کابل کے حاکم شیخ علی31 مغل کے پاس کافی سونا اور قیمتی تحفہ بھیج کر اس سے اپنی مدد کی درخواست کی، شیخ علی ایک بڑا لشکر لے کر فولاد کی مدد کے لیے آیا۔ پنجاب کے ہزاروں آدمی اس کے ساتھ ہو گئے ۔ شیخ علی نے تبر ہندہ سے فولاد اور اس کے قبیلے کو اپنے ہمراہ لیا اور لاہور پر چڑھائی کر دی ۔ ملک الشرقی اسکندر حاکم لاہور ہر سال شیخ علی کے پاس نذرانہ روانہ کرتا رہتا تھا۔ اس بار بھی اس نے نذرانے دے کر شیخ علی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا لاہور سے شیخ علی قصور پہنچا اور وہاں سے اس نے دیپالپور کا ارادہ کیا۔ ملتان سے عماد الملک اس کا راستہ روکنے کے لیے پہنچ گیا۔ شیخ علی، راوی کے کنارے طلنبہ تک چلا گیا اور وہاں سے خوط پور کو لوٹ کر عماد الملک کے لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی عماد الملک کا سردار ملک سلیمان شاہ لودی اس لڑائی میں مارا گیا۔ پھر شیخ علی خسرو آباد آ کر ٹھہر گیا اور ایک طویل عرصے تک ہر روز اس کی اور عماد لملک کی فوج میں لڑائی ہوتی رہی ۔

شیخ علی کی شکست اور اس کا بھاگ جانا

834ھ/1430ء میں مبارک شاہ نے فتح خان بن سلطان مظفر خان گجراتی کی سرکردگی میں ایک بھاری لشکر عماد الملک کی مدد کے لیے روانہ کیا ۔ شیخ علی اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکا اور پیچھے ہٹ کر اس احاطہ میں جو اس نے اپنے لشکر کے اطراف بنایا تھا محصور ہو گیا جب عماد الملک نے اس حصار کو بھی گھیر لیا تو مجبور ہو کر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ دریائے جہلم میں اس کے بہت سے لشکری ڈوب گئے ۔ عماد الملک کا لشکر برابر تعاقب میں لگا ہوا تھا اس نے شیخ علی کی بہت بڑی جمعیت کو اس جگہ تہ تیغ کر دیا کافی کو گرفتار کر لیا شیخ علی اور امیر مظفر تھوڑے آدمیوں کے ساتھ قصبہ شیور میں پہنچے۔ عماد الملک نے اسی قصبے تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں امیر مظفر تو ایک قلعے میں محصور ہو گیا اور شیخ علی جان بچا کر کابل بھاگ گیا۔

شاہی لشکر فتح کے جھنڈے گاڑتا ہوا دہلی لوٹ آیا۔

جسرت کی بغاوت

مبارک شاہ نے کچھ عرصہ بعد ملتان سے عماد الملک کو ہٹا کر خیر الدین کو مقرر کر دیا۔ اس کاروائی سے ملتان میں بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے اور ادھر جسرت نے بھی پہاڑی علاقے میں شورش برپا کر دی۔ 835ھ/1431ء میں لاہور کا حاکم ملک سکندر جسرت کی بغاوت کو کچلنے کے لیے روانہ ہوا۔ جسرت نے سکندر کو غفلت میں رکھ کر اچانک اس کی فوج پر حملہ کر دیا اور جالندھر کے علاقے میں سکندر کو گرفتار کر لیا پھر اسے اپنے ساتھ ملا کر لاہور پر فوج کشی کر دی سکندر کا نائب نجم الدین اور اس کا غلام ملک خوش خبر جسرت سے مقابلہ کرتے رہے۔

شیخ علی کا دوسرا حملہ

اسی اثناء میں شیخ علی دوبارہ تیاریاں کر کے ملتان کی حدود تک پہنچ گیا اور خوط پر چڑھائی کر کے جہلم کے رہنے والے بہت سے باشندوں کو قید کر لیا۔ طلنبہ کو بری طرح لوٹا وہاں کئی آدمیوں کو قتل اور قید کر کے کابل چلا گیا۔ اسی دوران تبرہندہ سے فولاد ترک نے رائے فیروز کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ رائے فیروز اس مقابلے میں مارا گیا۔ فولاد نے اس کا سر کاٹ کر تبرہندہ بھیج دیا۔

جسرت اور شیخ علی کا بھاگ جانا

اسی سال مبارک شاہ نے ان فتنوں کو ختم کرنے کے لیے لاہور اور ملتان کی جانب کوچ کیا جب شاہی لشکر سامانہ کے قریب پہنچا تو جسرت لاہور کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف اور شیخ علی کابل کی جانب واپس چلا گیا۔ مبارک شاہ نے لاہور اور جالندھر سے شمس الملک کو

معزول کر کے یہ علاقہ نصرت خان گرگ انداز کے سپرد کر دیا اور شمس الملک کے سارے خاندان کو لاہور سے دہلی روانہ کر دیا اور خود بھی دہلی لوٹ آیا۔

مخدومہ جہان کی وفات

836ھ/1432ء میں مبارک شاہ نے جسرت کی بغاوت کو کچلنے کے لیے دوبارہ سامانہ کی طرف کوچ کیا لیکن وہ پانی پت پہنچا کہ اسے اپنی والدہ مخدومہ جہان کے انتقال کی خبر ملی اس نے لشکر کو وہیں چھوڑا اور تنہا دہلی لوٹ آیا۔ دس دن تک ماتم کی رسوم ادا ہوتی رہیں اس کے بعد وہ لوٹ کر لشکر کے پاس چلا گیا اور ملک یوسف سرورالملک کو فولاد کی سزا کے لیے تبر ہندہ کی طرف روانہ کیا اور نصرت خان کو لاہور اور جالندھر سے ہٹا کر یہ شہر ملک الہداد لودی کے سپرد کر دیے۔

جسرت کی دوبارہ شکست

الہداد نے لاہور سے جسرت پر فوج کشی کی اور جالندھر جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ جسرت نے بیاس ندی کو پار کر کے بجوارہ میں الہداد سے مقابلہ کیا۔ اور اسے شکست دے کر پہاڑوں کی طرف بھگا دیا۔ اسی سال شاہ نے میوات میں جلال خان پر حملہ کیا۔ وہاں سے گوالیار اور اٹاوہ کی فوجیں روانہ کر کے وہ دہلی لوٹ آیا۔

شیخ علی کا تیسرا حملہ

اس سال مبارک علی نے پھر پنجاب میں داخل ہو کر لڑائی چھیڑ دی۔ مبارک شاہ نے اس علاقے کے امرا کی مدد کے لیے عمادالملک کو روانہ کیا۔ شیخ علی نے شیور سے بیاس تک سارے علاقے کو بری طرح پامال کر دیا اور سینکڑوں آدمیوں کو قید کر کے لاہور پہنچا، جہاں زیرک خان اور دوسرے امرا قلعے میں بند ہو گئے اور کافی عرصے تک حملہ آور غنیم کی مدافعت

کرتے رہے۔ ایک رات غنیم کو غافل پاکر ملک یوسف، سرورالملک اور زیرک خان رات میں چھپ کر حملہ آور ہوئے لیکن شکست کھا کر لوٹ گئے۔ شیخ علی نے ان کا پیچھا کر کے اکثر کو قتل اور باقی کو قید کر لیا۔

شیخ علی کا لاہور پر قبضہ

دوسرے دن شیخ علی لاہور شہر میں داخل ہو گیا اور لاہور کے بہت سے باشندوں کو قتل کر دیا اور اکثر کو قیدی بنا لیا۔ کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد دیپالپور پہنچا۔ ملک یوسف، سرورالملک دیپالپور پر مورچہ بندی کیے ہوئے تھا اس نے دشمن کے دباؤ کو محسوس کر کے وہاں سے نکل جانے کا ارادہ کیا لیکن عمادالملک نے بروقت دیپالپور کے قلعے کی حفاظت کے لیے تبرہندہ سے اپنے بھائی ملک احمد کو بھیج دیا جب شیخ علی کو اس مدد کی اطلاع ملی تو وہیں سے لوٹ گیا۔ اس فتنے کو حل کرنے کے لیے سلطان مبارک شاہ نے پھر لشکر کشی کی اور سامانہ سے تلونڈی پہنچا وہاں سے کوچ کر کے بیاس ندی کو لوہی کے گھاٹ سے پار کیا اور دیپالپور پہنچ کر راوی ندی کے کنارے خیمے لگا دیے۔

شیخ علی کی کابل کو واپسی

شیخ علی بادشاہ کے آنے کی وجہ سے گھبرا کر جہلم پار کر کے بھاگا۔ مبارک شاہ اسکا پیچھا کرتے ہوئے شیور کے قلعے تک چلا گیا اور راوی کو طلنبہ کے قریب پار کیا۔ یہاں ایک قلعے میں شیخ علی کا بھتیجہ مظفر بند ہو گیا۔ وہ ایک ماہ تک بادشاہی لشکر سے لڑتا رہا آخر کار معافی مانگ کر صلح کر لی اور اپنی لڑکی کو بھاری جہیز کے ساتھ شاہزادے کے عقد میں دیا۔ شیخ علی کا جو لشکر لاہور کے قلعے میں بند تھا وہ شمس الملک سے معافی طلب کر کے باہر نکل آیا۔ مبارک شاہ جب شیور اور لاہور کی مہم سے فارغ ہوا تو لشکر چھوڑ کر اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے ملتان چلا گیا اور وہاں سے لوٹ کر دیپالپور آ گیا۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور شیخ علی کے قید

کرنے کی خاطر لاہور اور دیپالپور کی حکومت عماد الملک کے حوالے کر دی۔ بیانہ پر عماد الملک کی بجائے شمس الملک کو مقرر کیا۔ پھر وہاں سے تنہا تیزی سے کوچ کرتا ہوا عید الاضحیٰ کے دن دہلی واپس آ گیا۔

سرور الملک کی سازش

دہلی پہنچنے کے بعد مبارک شاہ نے وزارت پر ملک سرور الملک کو فائز کیا اور نائب لشکر ملک کمال الملک کو اس کا مددگار بنا لیا لیکن ان دونوں میں نبھ نہ سکی۔ سرور الملک کو دیپالپور کی حکومت کے نہ ملنے کا پہلے ہی رنج تھا۔ عماد الملک کی تقرری کے بعد تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا اس لیے مبارک شاہ سے ناراض ہو کر غدر برپا کرنے کی فکر میں لگ گیا اور مبارک شاہ کے قتل کی سازش میں کانگوی اور کنجوی کھتریوں، میران صدر نائب عرض کو جو باپ دادا کے وقت سے مبارک شاہ کے خاندان میں پرورش پاتا رہا تھا اور بڑے بڑے عہدے اور منصب حاصل کیے تھے ساتھ میں لیا اور کچھ دوسرے نمک حرام مسلمانوں کو بھی شریک کر لیا۔

شہر مبارک آباد

837ھ/1433ء میں مبارک شاہ نے جمنا کے کنارے ایک نیا شہر مبارک آباد بسایا لیکن حقیقت میں یہ شہر اس کے لیے مبارک ثابت نہ ہوا۔ وہ اس کی عمارتوں کے بندوبست میں مصروف تھا کہ قلعہ تبر ہندہ سے فتح کی خوش خبری اور فولاد کا سر حضور میں پیش ہوا، بادشاہ نے خوشی خوشی تبر ہندہ کا ارادہ کیا اور جلد ہی وہاں سے لوٹ کر مبارک آباد آ گیا۔ اسی سال خبر پہنچی کہ سلطان ابراہیم شرقی اور کالپی کے حاکم الپ خان المخاطب بہ سلطان ہوشنگ کے مابین لڑائی ہو رہی ہے اس خبر کے ملتے ہی بادشاہ نے ہر طرف فرمان بھیجے اور ہر جگہ سے لشکر کو اکٹھا کر کے کالپی پر حملے کی تیاریاں کرنے لگا۔

مبارک شاہ کی ہلاکت

ایک دن مبارک شاہ حسب معمول نئی عمارتوں کے معائنہ کے لیے دہلی سے مبارک آباد گیا، وہاں جمعہ کی نماز کی تیاریاں ہو رہی تھی کہ نمک حرام میران صدر جو سرور الملک کے بہکانے سے گھات میں لگا ہوا تھا کسی بہانے سے محل میں آیا اور بادشاہ پر حملہ کر دیا اور سدھ پال کھوی کھتری کے پوتے نے مبارک شاہ کو شہید کر دیا۔

مبارک شاہ کی شہادت 837ھ/1434ء میں ہوئی۔ اس نے تیرہ سال تین ماہ سولہ دن تک حکومت کی۔

حواشی

1 سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ بزرگ تھے۔ ان کے وصال پر دہلی کی ولایت شیخ چراغ دہلی سے متعلق ہو گئی۔ ان کے دادا عبداللطیف یزدی تھے والد کا نام یحییٰ تھا اور آپؒ لاہور میں پیدا ہوئے تھے لیکن چراغؒ دہلی کی ولایت اودھ میں ہوئی۔ ابتداء میں مولانا عبدالکریم شیروانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی آ کر سلطان المشائخؒ کی ارادت وعقیدت سے وابستہ ہو گئے، حضرت نے ان کو محمود گنج کا خطاب اور چراغ دہلی کا لقب عطا کیا تھا، کہتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق نے جو عام طور سے مشائخ کا مخالف تھا ایک دن چراغ دہلی کو اپنے پاس دعوت دی اور کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پیش کیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ کھالیں تو ان پر حجت شرعی قائم ہو جائے کہ سونے چاندی میں کھا کر حرام کے مرتکب ہوئے اور نہ کھائیں تو بادشاہ کی حکم عدولی کی سزا دی جائے حضرت اس کی نیت بھانپ گئے آپ نے تھوڑا سا کھانا ان برتنوں میں سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور کراہت سے کھالیا۔ حاسد ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ آپ کے خلفاء میں میر سید محمد گیسو دراز گزرے ہیں جن کا مزار گلبرگہ دکن میں ہے۔

مخدوم جہانیاں جلال الدین جہاں گشت جیسے بڑے بزرگ آپ کے مرید تھے۔ 65سال کی عمر میں شب جمعہ 18 ماہ رمضان 757ھ/1356ء میں وصال فرمایا۔

2 ہانسی ۔ یہ شہر ضلع حصار موجودہ ہریانہ ریاست میں واقع ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ خوبصورت اور مستحکم شہر ہے اس کی فصیل بھی اونچی ہے اسے ایک ہندو راجہ تورا نے بسایا تھا'' ابن بطوطہ تورا دراصل راجہ اننگ پال کو لکھتا ہے ۔

3۔ شیخ بدرالدین ۔ شیخ بدرالدین اسحاق سمرقندی کا ذکر ''خزینۃ الاصفیاء'' میں ملتا ہے جو شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے۔ ہندستان آ کر نظام الدین اولیا کی خدمت میں رہنے لگے۔ 716ھ/1361ء میں موضع ففکولہ میں وفات پائی۔ یہ بدرالدین کوئی دوسرے بزرگ ہیں کیونکہ یہ 752ھ/1351ء میں باحیات تھے۔

4 ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ ایک بڑا شہر ہے اور ایسے ریگستان میں ہے جس میں سوائے کیکر کے کوئی اور درخت نہیں ہے۔ مچھلی اور بھینس کا دودھ افراط سے ملتا ہے یہاں کے باشندے سقنقور یعنی ریگ ماہی کھاتے ہیں۔ گرمی بہت زیادہ پڑتی ہے۔ سیوان یا سہوان ضلع کراچی کا ایک قصبہ ہے کراچی سے 91 میل پر آباد ہے۔ یہاں شہباز قلندر کی مشہور خانقاہ ہے جو 1356ء میں تعمیر ہوئی تھی کہتے ہیں کہ یہاں کا قلعہ سکندر نے بنوایا تھا۔

5 جونپور اس وقت معمولی مقام تھا۔ فیروز شاہ نے یہاں ایک شہر کا سنگ بنیاد رکھا اور مرحوم سلطان فخر الدین جونا کے نام پر جونپور نام رکھا، بعد میں اس شہر نے بڑی ترقی کی یہاں سلاطین شرقی کا خاندان مستقل حکمراں بھی رہا۔

6 نگرکوٹ۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ یہ شہر پہاڑی کے اوپر آباد ہے اور شہر کا تعلق صوبہ لاہور سے تھا۔ اس شہر میں ایک قلعہ تھا جس کا نام کنگڑہ تھا یہاں ایک ہندو دیوی مہابائی کی زیارت گاہ ہے۔

7 ان کتابوں میں جو سلطان فیروز شاہ کے نام پر ترجمہ ہوئی تھیں، کچھ تو فن موسیقی سے متعلق تھیں اور بعض میں فن کشتی کے داؤ پیچ کا ذکر تھا۔ دوسرے ایسے ہی مختلف اور عام موضوعات پر تھیں۔

8 ابوالفضل کے مطابق: ''قدیم زمانے سے یہ خود مختار اور جداگانہ ریاست تھی۔ پہلے اس کا پایۂ تخت برہمن آباد تھا۔ یہاں ایک مستحکم قلعہ اور اس کے ساتھ ہی ایک بڑا شہر تھا۔ اس قلعے میں تقریباً 1400 برج تھے یہاں زیادہ تر آبادی بلوچوں کی رہتی تھی۔ یہاں زمانہ قدیم میں ایک راجا سہرس نامی کرتا تھا۔ ایرانیوں سے جنگ میں یہ مارا گیا اور اس کا لڑکا رائے ساہی تخت نشین ہوا اس کے وزیر رام کے پاس ایک ایک برہمن جو چچ ملازم تھا اس کا اقتدار بڑھتا گیا اور یہ وزیر کا جانشین ہو گیا۔ چچ خاندان سے ہی راجہ داہر تھا یہی وہی داہر تھا جس کو محمد بن قاسم نے (611-612ء) شکست دی تھی۔

9 مولانا داؤد یا ملّا داؤد نے لورک اور چندا کے عشق کی داستان مثنوی چنداین کے نام سے اسی خان جہان کے نام سے منسوب کی ہے یہ مثنوی بڑی اثر انگیز اور صاحبان ذوق کے لیے وجد آور ہے۔

10 یہ شخص مانک پور کا رہنے والا تھا۔

11 اٹاوہ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس شہر کے مطابق صرف اتنا لکھا ہے کہ ''قلعہ ہے اور دریائے جون کے کنارے پر ہے۔ یہاں چوہان راجاؤں کی حکومت تھی۔

12 ایک فیروز پور تو بنگال میں ہے اس فیروز پور کا ذکر ''آئین اکبری'' میں سرکار تجارہ صوبہ آگرہ کے جدول میں کیا گیا ہے۔ قلعہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور اس پہاڑ میں ایک چشمہ ہے اور اس جگہ مہادیو کی مورت بنی ہوئی تھی اور یہاں پر ہندوؤں کا معبد تھا۔ یہ چشمہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ اکبر کے وقت یہاں کے زمیندار میو تھے۔

13 اودھ۔ بادشاہت کے زمانے میں اس صوبہ کی حدود کم وبیش گورکھپور سے قنوج اور شمالی ہمالیہ کی پہاڑی سے الہ آباد کی سرحد سدھ پور تک تھیں۔ مشرق میں بہار، شمال میں ہمالیہ کی پہاڑی، جنوب میں مانک پور اور مغرب میں قنوج واقع تھا۔

14 انبالہ۔ یہ شہر موجودہ ریاست پنجاب کا ایک ضلع ہے مگر بادشاہت کے زمانے میں ایک چھوٹا سا شہر دہلی کے ماتحت تھا۔ یہاں قبیلہ بارہہ اور جاٹ زیادہ آباد تھے۔

15 آئین اکبری کے مطابق، صوبہ کا نام "مہوبا" درج ہے۔ بقول ابوالفضل یہاں ایک سنگین قلعہ ہے اس کی عمارت دو رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی ہے اس کے احاطے میں ایک بڑا پہاڑ بھی ہے۔

16 کیتھل۔ آئین اکبری کے مطابق: یہ سرکار ہند صوبہ دہلی کے تحت بتایا گیا ہے یہاں راجپوت قوم آباد تھی۔ ابوالفضل نے صرف اتنا لکھا ہے" یہاں ایک اینٹوں سے بنا قلعہ ہے اور ہندوؤں کی مقدس زیارت گاہ ہے۔

17 سنبھل۔ آئین اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ سنبھل صوبہ دہلی کے ماتحت تھا جہاں اینٹوں سے بنا ایک قلعہ بھی ہے۔

18 یہ قلعہ جس موضع میں تعمیر ہوا اسے بسولی لکھا گیا ہے۔ فیروز شاہ نے ندیوں اور دریاؤں کے باندھ بندھوائے۔ کئی ایک محلے اور بے شمار باغ اس کی یادگار ہیں شہروں میں فیروز پور، حصار فیروز آباد اور جونپور اس کے بسائے ہوئے ہیں۔

19 دوسری تاریخوں میں یہ نام بہاؤ الدین اور کمال الدین ہیں۔ یہ دونوں ناصر الدین محمد شاہ کے چچازاد بھائی تھے۔

20 فیروز شاہ جب تخت پر بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے زائد تھی یعنی کہ فیروز شاہ 1351ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔

21 امیر خسرو کے فرزند نہ بھی ہوتے تو ان کی اصلاحیں اس پایہ کی تھیں کہ انھیں ہر حال میں پسند کیا جاتا اس زمانے میں نہیں تو بعد میں۔

22 ابوبکر شاہ کو میرٹھ کے قلعہ میں 1389ء میں قید کیا گیا تھا۔ بحوالہ ابن بطوطہ۔

23 اس شخص کا پورا نام ''آزروی یمن ناہر سنگھ تھا اور راٹھور قوم کا سردار تھا۔

24 شیخ احمد۔ تھانیسر کے رہنے والے تھے اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔ آپ کا مزار گجرات میں سرکھیج / سرخیز میں واقع ہے۔

25 دہار۔ ابن بطوطہ نے اسے ظہار لکھا ہے وہ لکھتا ہے یہ مالوہ کا سب سے بڑا شہر ہے جہاں زراعت ہوتی ہے۔

26 حصار فیروز۔ یہ سلطان فیروز شاہ نے آباد کیا تھا اور دریائے جمنا سے ایک نہر نکال کر شہر میں پانی پہنچایا تھا۔ کہتے ہیں ایک مرد عارف نے فیروز شاہ کو فرمانروائی کی بشارت سنائی تھی اور ان کی ہی ہدایت پر یہ شہر تیار کی گئی تھی۔

27 کالپی۔ یہ قصبہ جمنا کے کنارے بہت سے بزرگان دین کی خواب گاہ ہے، سلاطین شرقی کے زمانے میں یہ شہر دہلی کے زیر نگین تھا۔ قادرخان کالپی کے حکمران نے بغاوت کی اور خودمختار بن گیا۔ سلطان ہوشنگ حاکم مالوہ نے فوج کشی کر کے اس کو شکست دی لیکن فتح کے بعد شہر اسی کے سپرد کر دیا۔

28 مخدوم جہانیاں۔ اچہ کے سید جلال الدین سرخ بخاری کے پوتے تھے، سید صدر الدین راجو قتال ان کے حقیقی بھائی تھے۔ دو سال تک مدینہ منورہ میں رہ کر شیخ عفیف الدین سے خرقہ طریقت حاصل کیا۔ مکہ میں شیخ امام عبداللہ یافعی سے بھی ارادت تھی، وہاں سے دہلی آ کر نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی خدمت میں رہے اور سلسلہ چشتیہ کا خرقہ حاصل کیا۔ مشہور ہے کہ جہاں چاہتے تھے، پلک جھپکتے ہی پہنچ جاتے تھے، اس لیے جہانیاں جہان گشت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مؤلف اخبار الاخبار حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی تصنیف میں ان کی وفات 887ھ/1386ء اور ان کی عمر 81 سال لکھی ہے۔ ابن بطوطہ کی زبانی ''میں نے آچہ میں سید جلال الدین حیدر علوی کی زیارت کی، انھوں نے مجھے اپنا خرقہ عنایت کیا'' اس نام سے ابن بطوطہ کی مراد جہانیاں جہان گشت سے ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ

فیروزشاہ اور جام بابنیہ جو کہ سندھ کا حاکم تھا ان کی صلح بھی سید جلال نے 761ھ/1359ء میں کرائی تھی۔

29 کنپلہ۔ کنپیل۔ قنوج کی حکومت میں ایک محل تھا (بحوالہ آئین اکبری) ابن بطوطہ نے سرگدوارہ کو اسی کے علاقہ میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ پانڈوؤں کی رانی دروپدی یہاں کے راجہ کی بیٹی تھی۔ وہاں ایک ٹیلے کو اب تک راجہ دروپد کا قلعہ بتایا جاتا ہے۔ غیاث الدین کے وقت یہ ڈاکوؤں کی پناہ گاہ تھی۔ غیاث الدین نے اس پناہ گاہ کو درست کر کے ایک قلعہ بنا دیا تھا۔ جہاں پر شاہی فوج رہتی تھی۔ مگر مغلوں کے زمانے میں اس جگہ کے بارے میں اطلاعات بہت کم ملتی ہیں۔ (بحوالہ ہنٹر) ایک اور قدیم مقام کمپیلہ یا کمپلی ریاست بیجانگر کے پاس بلاری احاطہ مدراس کے ضلع میں بھی واقع تھا۔

30 شیخ زنجانی۔ شیخ سید حسین زنجانی ان کا اصلی نام ہے۔ بدایونی نے صرف "حسن" لکھا ہے۔ خزینۃ الاصفیا، میں سید حسین ہے۔ وہ معزالدین بہرام شاہ کے آخر دور میں فوت ہوئے شیخ زنجانی جنیدی سلسلے کے بزرگ اور سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کے خلیفہ ہیں اور انھیں کے ساتھ زنجان سے لاہور تشریف لائے تھے۔

31 شیخ علی سلطان، شاہرخ مرزا کی جانب سے کابل کا حاکم تھا۔ خضر خان شاہرخ مرزا کے پاس تحائف اور نذرانہ روانہ کیا کرتا تھا۔ مبارک شاہ نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مرزا نے شیخ علی کو ہندستان پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مؤلف منتخب التواریخ بدایونی نے اس کا سبب بیان نہیں کیا ہے اور صرف فولاد کے اس کو بلانے کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی سبب رہا ہو۔ مگر بعد کی تصنیفات میں یہ حوالہ منقول ہے۔

محمد شاہ بن فرید خان

مبارک شاہ کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا محمد شاہ جسے مبارک شاہ نے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ 837ھ/1433ء میں تخت نشین ہوا۔ سرور الملک نے مصلحتاً اس سے بیعت کرلی۔ محمد شاہ نے اس کی فتنہ پردازیوں سے صرف نظر کر کے اسے خان جہان کا خطاب اور خلعت عطا کی۔ میران صدر کو معین الملک کا خطاب ملا۔ سرور الملک کے شریک وزارت کمال الملک نے بھی سلطان محمد سلطان محمد شاہ سے بیعت کرلی لیکن اس نے اپنی اقامت شہر سے باہر رکھی۔

سرور الملک کا اقتدار

نمک حرام سرور الملک برابر فتنہ پردازی میں لگا رہا، چنانچہ جلوس کے دوسرے ہی دن مبارک شاہ مرحوم کے بعض غلاموں کو کسی بہانے سے پکڑ کر قتل کرادیا اور لوگوں کو اپنے آپ جاگیریں تقسیم کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے مبارک شاہ کے قاتلوں سدھ پال اور سدھارن کو بیانہ، امروہہ، نارنول اور دوآبہ کے کئی ایک پرگنے عطا کردیے۔

سدھ پال کا غلام رانوں سپہ بیانہ پہنچ کر قلعے میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن عین وقت پر ہنڈون سے یوسف خان اوحدی اپنی جمعیت لے کر پہنچ گیا اور رانوں پر حملہ کرکے اس کے

بہت سے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے اہل وعیال مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور رانوں کا سر کاٹ کر قلعے کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا۔

امیروں کی بغاوت

سرور الملک کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر خضر خان اور مبارک شاہ کے وقت کے سارے امیر جہاں تھے، باغی بن بیٹھے تھے اور تمام ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ از سرنو طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا۔ سنبھل کا حاکم ملک الہداد کالا لودی، حاکم بدایوں ملک چمن اور امیر علی گجراتی وغیرہ مبارک شاہ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے دہلی پر چڑھ آئے۔

کمال الملک کی بغاوت

بادشاہ نے ان کے مقابلے کے لیے سید خان ولد سید سالم جس کا خطاب اعظم خان تھا اور کمال الملک کو روانہ کیا۔ کمال الملک کے ساتھ ملک یوسف ولد سرور الملک سدھارن اور کانگو بھی گئے۔ جب دہلی کا یہ لشکر آہچہ کے گھاٹ کو عبور کر کے برن پہنچا تو الہداد اور دوسرے امیروں سے یہ خفیہ اطلاعات ملیں کہ خود کمال الملک سرور الملک سے مرحوم سلطان کے خون کا بدلہ لینے کی فکر میں ہے۔ اس بات پر انھوں نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ سرور الملک کو بھی کسی طرح کمال الملک کے ارادوں کی ہوا لگ گئی اس نے کمال الملک کی مدد کے بہانے اپنے نائب ملک ہشیار کو اپنے بیٹے کی حفاظت کے خیال سے بھیج دیا۔ یوسف خان وغیرہ بھی کمال الملک کے رویہ سے کھٹک گئے تھے، چنانچہ ایک دن موقع پا کر یوسف خان ملک ہشیار اور سدھارن لشکر سے نکل کر دہلی بھاگ گئے۔

باغی امیروں کا دہلی پر حملہ

سنبھل اور بدایوں وغیرہ کے امیروں کا لشکر کمال الملک کے لشکر سے جا ملا اور یہ سب مل کر کچھ پہنچ گئے۔ دوسرے دن جمنا پار کر کے ایک باغ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ سرور الملک نے قلعہ بند ہو کر لڑنے کی تیاریاں کر لیں۔ سرور الملک کے لشکریوں نے شہر سے نکل کر امیروں کی فوج پر حملہ کیا لیکن جوابی حملے کی تاب نہ لا کر پسپا ہو گئے اور لوٹتے ہوئے ان کے بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے قید ہو گئے۔

دوسرے دن مبارک شاہی امیروں نے سیری کے قلعے کے سامنے خیمہ لگا دیا۔ شہر کے حصار سے بھی اکثر امیر نکل کر ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ لڑائی برابر تین ماہ تک جاری رہی۔ اس سال کے آخر میں زیرک خان حاکم سامانہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا علاقہ اس کے بیٹے محمد خان کو مل گیا۔

سرور الملک کا قتل

خود سلطان محمد شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ مصلحتاً اور مجبوراً سرور الملک کے ساتھ تھا اور دل سے مبارک شاہی امیروں کا حامی تھا۔ سلطان کی اس دلی کیفیت سے سرور الملک غافل نہیں تھا اور اسے ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ سرور الملک نے مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور 8 محرم 838ھ/1434ء میں سرور الملک میران صدر کے لڑکے کو لے کر سراپردۂ شاہی میں محمد شاہ کے قتل کے ارادے سے گھس گیا۔ محمد شاہ نے اسی وقت کمال الملک کو بلانے کے لیے آدمی بھیجے لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی شاہی خادموں نے سرور الملک اور میران صدر کے لڑکوں کو گھیر کر قتل کر دیا۔ ان کے دوسرے ساتھی اپنے اپنے گھر بند کر کے بیٹھے رہے۔

مفسد کھتریوں کا انجام

سرور الملک کا قضیہ پاک ہونے کے بعد کمال الملک دوسرے امراء کے ساتھ بغداری

دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ بدبخت سدھو پال ہندوانہ رسم کے مطابق اپنی عورتوں کو چتا میں جلا کر مارنے پر تیار ہو گیا۔ لی

سدھارن، کانگو اور اس کے کھتری دوست بھی مبارک شاہ کے روضے کے پاس قتل کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ ملک ہوشیار اور ملک مبارک کوتوال کی گردن ماردی گئی۔

ملک شاہ کی مستقل حکمرانی

دوسرے دن کمال الملک اور دوسرے تمام امیروں نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وزارت کا منصب کمال الملک کے حوالے ہوا۔ ملک چمن بدایونی کو غازی الملک کا خطاب عنایت ہوا اور اسے بدایواں کی قدیم عملداری کے علاوہ امروہہ بھی جاگیر میں دیا گیا۔ ملک الہداد نے خود تو کوئی خطاب قبول نہ کیا لیکن اپنے بھائی کو دریا خان کا خطاب دلوا دیا۔ اس کے بعد محمد شاہ کامل الاختیار بادشاہ بن سکا اور اس کی حکمرانی کے لیے کوئی خطرہ اور خدشہ نہ رہا۔

ملتان کا سفر

840ھ/1436ء میں محمد شاہ نے ملتان کا عزم کیا اور کچھ دن مبارک پور میں رُکا رہا۔ جب ہر طرف کے امیر اور سردار مبارک پور میں جمع ہو گئے تو انھیں لے کر ملتان گیا اور وہاں بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کر کے دہلی لوٹ گیا۔

اسی سال اس نے سامانہ پر فوج کشی کی اور اس علاقے کو غارت کر کے ایک فوج شیخا کھوکھر کے مقابلے پر مقرر کر دی اور خود دہلی لوٹ گیا۔

فتنوں کا آغاز

841ھ/1437ء میں ملتان میں لنگاہ پٹھانوں کی شورش انگیزی کی خبر ملی اور اسی دوران سلطان ابراہیم شرقی نے دہلی کے بعض پرگنوں پر یلغار کر کے قبضہ کر لیا۔ گوالیار کے زمینداروں

نے بھی مالگزاری دینی بند کر دی۔ ضرورت تھی کہ مختلف سمتوں سے اٹھنے والے فتنوں کی طرف سلطان فوری متوجہ ہوتا لیکن محمد شاہ نے ان کے روکنے میں سستی برتی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور سارے ملک میں پھر سے فتنہ وفساد کا دور دورہ ہو گیا۔

محمود خلجی کا دہلی پر حملہ

میوات کے خان زادوں نے جو حسن خان میواتی کے بزرگ تھے مالوہ کے محمود خلجی کو دہلی پر حملے کی دعوت دی اور 844ھ/1439ء میں محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ نے بھی اس کے مقابلے کی تیاریاں کیں اور اپنے بیٹے سید علاء الدین کو حملہ کرنے کے لیے شہر سے باہر بھیجا۔

محمود خلجی نے اپنے بیٹوں غیاث الدین اور مدن خان کو اس کے مقابلے پر مقرر کیا۔ دونوں فوجوں میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر محمود خلجی نے صلح کر لی اور لوگوں سے یہ بہانہ کر کے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مالوہ پر بڑی تباہی آ گئی ہے۔ راتوں رات دہلی کا میدان چھوڑ کر مالوہ کی طرف کوچ کر گیا۔

بہلول لودی نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے لشکر کا کافی مال و اسباب لوٹ لیا۔ یہ کامیابی چونکہ بہلول لودی کی کارگزاری سے حاصل ہوئی تھی اس لیے محمد شاہ نے فتح کے انعام میں اسے لاہور اور دیپالپور بطور جاگیر عطا کیا۔

845ھ/1441ء میں محمد شاہ نے دوبارہ سامانہ کا رخ کیا اور بہلول لودی کو جسرت کے مقابلے پر رخصت کر کے دہلی لوٹ آیا۔

بہلول لودی کا دہلی پر حملہ

جسرت نے بہلول کے ساتھ ساز باز کر لی اور اسے سلطنت دہلی کے سبز باغ دکھا کر قسمت آزمائی پر آمادہ کر لیا۔ بہلول کے دل میں بھی سلطانی کی امنگ دوڑنے لگی اور اس

نے اپنی برادری کے تمام پٹھانوں کو ہر طرف سے اپنے پاس بلالیا اور کئی ایک پرگنوں پر قبضہ جمالیا۔ اس طرح محمد شاہ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کردیا اور دہلی پر حملہ آور ہوا۔ بہلول کافی عرصہ تک دہلی کا محاصرہ کیے وہاں رکا رہا لیکن اس کی محنت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور دہلی میں داخل ہونے کی کوئی راہ پیدا نہ ہوئی اسے مجبوراً محاصرہ اٹھا کر لوٹ جانا پڑا۔

سلطان محمد شاہ کی وفات

اسی دوران محمد شاہ بُری طرح بیمار ہوگیا۔ اس کی بیماری کی وجہ سے موقع پاکر ہر طرف لوگ باغی ہوگئے۔ یہاں تک کہ دہلی سے بیس کوس تک کے امیروں نے بھی اس کے حلقہ اطاعت کو اُتار پھینکا اور خودمختار بن بیٹھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر محمد شاہ نے اپنے بیٹے علاء الدین کو جس کی بدایوں میں جاگیر تھی اور جو اس وقت شکار کے لیے پہاڑوں پر گیا ہوا تھا دہلی بلا کر اپنا ولی عہد بنالیا۔

سلطان محمد شاہ اس بیماری سے جانبر نہ ہوسکا۔ 847ھ/1444ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ اس کی سلطنت چودہ سال چار ماہ رہی۔

علاء الدین بن محمد شاہ

محمد شاہ کی وصیت کے مطابق اسی سال علاء الدین نے تخت سلطنت پر قدم رکھا۔ ملک بہلول اور دوسرے امیروں نے اس سے بیعت کرلی۔

بہلول لودی کے ارادے

علاء الدین اپنے باپ سے کہیں زیادہ غافل اور لاپرواہ تھا۔ اس کی سستی اور غفلت کو دیکھ کر ملک بہلول کی نیت پھر بدلنے لگی اور وہ دل ہی دل میں اپنی بادشاہت کے منصوبے بنانے لگا۔

850ھ/1446ء میں سلطان علاء الدین بیانہ کے ارادے سے روانہ ہوا۔ لیکن کسی نے راستہ ہی میں یہ افواہ پھیلا دی کہ جونپور کا بادشاہ دہلی پر حملے کے لیے آ رہا ہے۔ علاء الدین نے کوتاہ اندیشی کے باعث اس خبر کی تحقیق نہ کرائی اور الٹے پاؤں دہلی لوٹ آیا۔

بدایوں کا سفر

851ھ/1447ء میں بادشاہ نے بدایوں کا سفر کیا۔ اسے بدایوں کچھ ایسا پسند آیا کہ اسی جگہ مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور ایک عمارت کی بنیاد رکھ کر دہلی لوٹ آیا۔

852ھ/1448ء میں اپنے ایک سالے کو کوتوال شہر اور دوسرے کو میر کو مقرر کر کے دوبارہ بدایوں گیا۔ اس کے پیچھے ان دونوں بھائیوں نے ایسے فتنے برپا کیے کہ شہر والے ان سے تنگ آ گئے اور ہجوم کر کے ان کو قتل کر دیا۔

بہلول لودی کا دہلی پر قبضہ

بادشاہی امراء نے سرکشی اختیار کر لی۔ عمدۃ الملک حسام خان نے جو بادشاہ کے سامنے بے جھجک کھری کھوٹی سنانے کا عادی تھا اور اسی وجہ سے سلطان کی خفگی سے دوچار رہتا تھا اور اسے اپنے عہدے سے بھی معزول ہونا پڑا تھا۔ حمید خان نے جو بادشاہ کی سزا سے ڈر کر دہلی بھاگ آیا تھا متفق ہو کر بہلول لودی کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور لودی نے سرہند ہی میں شاہی خطاب تجویز کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور ایک بھاری لشکر کے ساتھ آ کر دہلی پر بے روک ٹوک قبضہ کر لیا۔

علاء الدین شاہ کی بے نیازی

بہلول لودی نے دہلی میں اپنے ایک نائب کو مقرر کر کے مزید لشکر فراہم کرنے کے لیے دیپالپور کا عزم کیا لیکن ساتھ ہی ایک منافقانہ عریضہ علاء الدین کے پاس روانہ

کر دیا کہ ”میں آپ کا فرمانبردار غلام ہوں اور ساری کارروائی مجھے آپ کی خیرخواہی میں کرنی پڑی ہے“۔

علاء الدین شاہ بھی کچھ نرالے مزاج کا بادشاہ تھا۔ اس نے جواب دیا کہ ”میں کون سا سلطان 3 ابن سلطان ہوں۔ محمد شاہ مرحوم نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا تھا اس لیے بادشاہ بن گیا، اب میرے پاس بادشاہی کا ساز و سامان نہیں اس لیے میں بدایوں پر ہی صبر و قناعت کرتا ہوں اور باقی سلطنت سے ترے حق میں سبکدوش ہو جاتا ہوں۔

اس خط کے ملنے پر اب کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس لیے بہلول لودی دیپالپور سے لوٹ کر دہلی آیا اور بلا کسی مزاحمت اور جھگڑے کے تختِ دہلی پر بیٹھ کر مفت میں ہندستان کا بادشاہ بن گیا۔

سلطان علاء الدین بہلول لودی کی اجازت سے بدایوں میں گنگا کے کنارے تک اور ہمالیہ کے دامن سے خیرآباد تک کے حصوں پر قابض رہا۔ اس علاقے میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

سلطان علاء الدین کی وفات

علاء الدین اپنی اس مختصری سلطنت میں مگن، کافی عرصے تک زندہ رہا، یہاں تک کہ سات سال چند ماہ کی حکمرانی کے بعد 855ھ /1451ء میں وہ عالم بقا کی طرف کوچ کر گیا۔ اس کے بعد ہندستان کی سلطنت ایک نئے خاندان کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔

لودی خاندان

سلطان بہلول بن کالا لودی

محمد شاہ کے عہد میں بہلول[4] کو خان خاناں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ سلطان علاء الدین کی دستبرداری کے بعد وہ حمید خان کے تعاون سے 855ھ/ 1451ء میں تخت نشین ہوا۔

اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے کہ عمدۃ الملک حسام الدین اور حمید خان نے بادشاہ کے خلاف دہلی میں سازش کی تھی۔ سلطان علاء الدین نے حسام الدین کو قتل کرا دیا تھا لیکن حمید خان بہلول لودی کو بادشاہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ حمید خان نے حسام الدین کے قتل کے بعد دہلی میں علاء الدین کے خاندان اور اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا تھا اور جب بہلول دہلی آیا تو قلعے کی کنجی اس کے حوالے کر دی۔ اس کی نمک حرامی بہت جلد اس کے سامنے آ گئی اور بہلول نے اس کے احسان کا یہ بدلہ دیا کہ اسے قید میں ڈال دیا اور بے کھٹکے اپنی بادشاہی کا سکہ جما لیا اور اسی سال ملتان کے بندوبست کے لیے روانہ ہو گیا۔

بہلول لودی کی تخت نشینی سے ہندستان پر افغانوں[5] کا قبضہ ہو گیا۔

محمود شرقی کا دہلی پر حملہ

856ھ/1452ء میں علاء الدین کے امیروں کی سازش سے سلطان محمود شرقی نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس مرتبہ بھی بڑی سخت جنگ ہوئی۔ مقابلے میں محمود کا دایاں ہاتھ، فتح خان ہروی مارا گیا۔ اس کی ہلاکت سے محمود کے حوصلے پست ہو گئے اور مقابلے کی تاب نہ لا کر وہ جونپور لوٹ گیا۔

دوسرے سال وہ تیاری کر کے پھر جونپور سے نکلا اور دہلی کے ارادے سے اٹاوہ تک پہنچ گیا۔ اس مرتبہ فریقین میں اس شرط پر صلح ہوگئی کہ دہلی کے وہ پرگنے جو مبارک شاہ کے قبضے میں تھے سلطان بہلول کے ہوں گے اور جن پرگنوں پر سلطان ابراہیم شرقی قابض تھا وہ محمود کے قبضے میں رہیں گے۔ ایک اور شرط یہ تھی کہ شمس آباد بھی جہاں محمود کا نائب جونا خان رہتا تھا موسم برسات کے بعد بہلول کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس قرارداد پر دونوں فریق اپنے اپنے علاقے کی جانب لوٹ گئے۔

شمس آباد پر قبضہ

شرائط صلح کے بموجب برسات کے بعد بہلول نے شمس آباد پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی حکومت بھونگاؤں کے حاکم رائے کرن کے سپرد کر دی۔ محمود کو بہلول کی یہ کارروائی بہت گراں گزری اس نے شمس آباد کے نواح میں بہلول کے لشکر سے لڑائی چھیڑ دی لیکن اسی دوران وہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد شاہ جونپور کا سلطان بن گیا اور وہ صلح کی سابقہ شرائط پر راضی ہو کر اپنے ملک واپس چلا گیا۔

بہلول کا جونپور پر حملہ

جونپور کی اس لشکر کشی کے موقعے پر بہلول کے چچا قطب خان کو محمد شاہ کے لشکر نے قید کر لیا تھا۔ اپنے چچا کو قید سے چھڑانے کے لیے بہلول نے معاہدے کو نظر انداز کیا اور محمد

شاہ کی سرحدوں پر حملہ کیا۔ محمد شاہ بھی جونپور سے نکل کر شمس آباد پہنچا اور اسے ہندو حاکم سے چھین لیا۔ راپڑی کی سرحد پر بہلول کی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر قنوج کی طرف بھاگ گیا۔ بہلول بھی اس کا پیچھا کرنے میں لگا رہا۔

سلطان حسین اور بہلول کی صلح

ادھر محمد شاہ بہلول سے اپنا پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا کہ جونپور میں اس کا بھائی حسین شاہ امراء سے سازش کر کے بادشاہ بن گیا اور ایک بھاری لشکر بھیج کر اس نے گنگا کے کنارے راج گڑھ میں محمد شاہ کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد سلطان حسین نے جونپور سے بہلول کے چچا قطب خان کو بلایا اور اسے گھوڑا و خلعت عطا کر کے بہلول کے پاس بھیج دیا اور از سر نو بہلول سے صلح کر کے جونپور سے قنوج کی طرف کوچ کیا۔

بہلول نے بھی سلطان حسین کے بھائی جلال خان کو، جسے اس نے قطب خان کے عوض گرفتار کر رکھا تھا، نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ سلطان حسین کے پاس بھیج دیا۔

تین سالہ جنگی معاہدہ

صلح کی یہ حالت کئی سال قائم رہی۔ پھر سلطان اور بہلول کے مابین چنداور کی سرحدوں پر لڑائی ٹھن گئی، یہ لڑائی زیادہ طول نہیں پکڑ سکی اور تین سال تک کے لیے دونوں کے درمیان معاہدہ ہو گیا کہ تین سال بعد دونوں مقابلہ کریں گے۔ اس لڑائی کے موقعے پر حاکم بیانہ احمد خان جلوانی سلطان حسین کا حامی بن گیا اور اس نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔

سلطان حسین کا دہلی پر حملہ

جب معاہدہ کی یہ تین سالہ مدت گزر گئی تو سلطان حسین ایک لاکھ سوار، ایک ہزار ہاتھی اور بڑا ساز و سامان لے کر دہلی پر حملہ کرنے نکلا۔ بھتوارہ کے مقام پر بہلول کے لشکر سے مقابلہ ہوا

لیکن اس بار بھی مصالحت ہوگئی اور سلطان بہلول کو سلطان حسین اٹاوہ لوٹ گئے۔

دونوں بادشاہوں کے یہ دم خم تھے اور مضحکہ انگیز بات یہ تھی کہ ان دونوں کی حدود سلطنت بس سات منزل کی مسافت تک ہی تھیں۔

سلطان حسین کا بدایوں پر قبضہ

اسی سال بدایوں میں سلطان علاء الدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کی بیٹی ملکہ جہان سلطان حسین کے نکاح میں تھی۔ علاء الدین کے انتقال پر سلطان حسین بدایوں آیا اور اسے علاء الدین کے بیٹوں کے قبضے سے نکال کر اپنی حدود میں شامل کرلیا۔ پھر سنبھل پہنچ کر وہاں کے حاکم تاتار خان کو قید کر کے سارن بھیج دیا۔

دہلی پر دوسرا حملہ

ذی الحجہ 880ھ/1475ء میں سلطان حسین نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ دہلی کا ارادہ کیا اور جمنا کے کنارے کچھ کے گھاٹ پر منزل کی۔

سلطان بہلول سرہند سے کوچ کر کے دہلی پہنچا اور خان جہان کے بیٹے حسین خان کو میرٹھ سے بلا کر سلطان حسین کے مقام پر مقرر کیا۔ لیکن جنگ نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی قطب خان نے بیچ بچاؤ کر کے اس شرط پر صلح کرادی کہ گنگا دونوں کے درمیان حد رہے اور اس کنارے تک سلطان حسین اور اس کنارے سلطان بہلول قابض رہیں۔

بہلول کا وعدہ توڑنا

سلطان حسین صلح کر کے اپنے وطن کی جانب لوٹ گیا اور مصالحت کے بھروسے پر اس منزل پر اپنا بہت سامال واسباب چھوڑ گیا۔ سلطان بہلول نے اس کے پیٹھ پھیرتے ہی دغا پر کمر باندھ لی اور اس کا چھوڑا ہوا سامان لوٹ لیا۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر لدا ہوا اس کا کچھ

خزانہ بھی مال غنیمت میں بہلول کو مل گیا۔

نوید خرابی

سلطان حسین کے چالیس امیر جن میں اس وقت کے مشہور عالم قاضی سماء الدین جن کا خطاب قتلغ خان تھا، شامل تھے بہلول کے لشکر میں قید ہو گئے۔ بہلول نے قتلغ خان کو طوق و زنجیر پہنا کر قطب خان کے سپرد کر دیا اور خود لشکر لے کر سلطان حسین کے پیچھے پیچھے دوآبہ میں شمس آباد تک گیا۔ اس وقت شمس آباد سلطان حسین کے قبضے میں تھا۔ بہلول نے وہاں قبضہ کر کے اپنا عامل مقرر کر دیا۔

یہ واقعہ 884ھ/1479ء میں پیش آیا، اس کا مادہ تاریخ ''نوید خرابی'' ہے۔ سلطان حسین نے بہلول کا پیچھا کرنے سے تنگ آ کر راپڑی کی سرحد پر مقابلے کا ارادہ کیا، لیکن فریقین میں پھر سے از سر نو مصالحت ہو گئی اور طے پایا کہ دونوں اپنے اپنے قدیم علاقوں پر قابض رہیں۔

سلطان حسین کی شکست

اس صلح کے بعد حسین نے عہد کیا اور شمس آباد میں لشکر جمع کر کے سلطان بہلول کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ موضع سونہار کے قریب بڑے مقابلے کی جنگ ہوئی اور اس جنگ میں سلطان حسین کو بری طرح شکست ہاتھ لگی۔ اس کا خاصا مال و اسباب لودیوں کے ہاتھ لگا۔ اس کامیابی سے لودیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔

اس دوران دہلی میں خان جہان کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے سلطان بہلول گوپامئو سے دہلی آیا اور اس کے بیٹے کو خان جہان کا عہدہ دے کر واپس چلا گیا۔

راپڑی کی جنگ

راپڑی میں سلطان حسین سے اس کی ایک اور لڑائی ہوئی، اس بار بھی سلطان حسین شکست کھا کر بھاگا۔ اس بھاگم بھاگ میں سلطان حسین کے خاندان کے کچھ لوگ جمنا میں ڈوب گئے۔ قوم بھدوریہ کے شرپسندوں نے بھی اس کی بھاگتی ہوئی فوج کو خوب لوٹا۔

سلطان حسین بھاگ کر گوالیار گیا، حاکم گوالیار رائے کیرت سنگھ نے اس کی اطاعت قبول کرلی اور بطور پیش کش بہت سا نقد روپیہ مال وجنس، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے دیے اور بہت سے فوجی اس کے ہمراہ کردیے اور خود بھی کالپی تک اس کے ساتھ گیا۔

کالپی کی جنگ

سلطان بہلول بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا کالپی پہنچ گیا۔ کالپی کی سرحد پر فریقین میں پھر لڑائی ہوئی اور یہ مقابلہ کافی دیر تک ہوتا رہا۔ اسی دوران میں بکسر کے حاکم رائے تلوک چند (ترلوک چند) نے سلطان حسین کی خدمت میں آکر اس کے لشکر کو گنگا پار کروا دیا۔ سلطان حسین مزید مقابلے کی ہمت نہ پاکر پٹنہ چلا گیا۔ وہاں کے راجہ نے بھی بڑھ کر استقبال کیا اور بہت سا نقد، مال، جنس اور ہاتھی نذر دیے اور اسے جونپور پہنچا دیا۔

بہلول لودھی کا جونپور پر حملہ

سلطان بہلول نے ان لڑائیوں کا قصہ ختم کرنے کے لیے جونپور پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ سلطان حسین بھی جونپور سے نکل کر بہرائچ کی راہ قنوج پہنچا اور وہاں دریائے رھب کے کنارے سلطان بہلول سے مقابلہ کیا۔ پرانے طرز پر اسے پھر شکست ہوئی اور لودیوں نے اس کی بادشاہی کا سارا ساز وسامان لوٹ لیا۔

سلطان حسین کی بیوی ملکہ جہان بی بی خونزا جو علاء الدین کی بیٹی تھی لودیوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئی۔ بہلول نے اسے بڑی عزت وعفت کے ساتھ رکھا اور جب اس نے دوبارہ جونپور

پر حملہ کیا تو وہ کسی تدبیر سے نکل کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔

سلطان بہلول نے جونپور پہنچ کر قبضہ کر لیا اور وہاں مبارک خان لوحانی کو مقرر کر کے بدایوں آیا۔ لیکن جیسے ہی بہلول جونپور سے رخصت ہوا سلطان حسین موقع پا کر جونپور میں داخل ہو گیا اور بہلول کے امیر وہاں سے بھاگ کر قطب خان کے پاس مجھول چلے گئے اور سلطان حسین سے التجا کرتے رہے اسی دوران ان کی مدد کے واسطے سلطان بہلول نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو روانہ کیا اور خود بھی اس کے پیچھے جونپور کی طرف کوچ کر دیا۔ بہلول کی آمد سے سلطان حسین گھبرا کر بہار چلا گیا۔ جب بہلول قصبہ ہلدی میں پہنچا تو اسے قطب خان کے انتقال کی خبر ملی۔ بہلول نے اپنے چچا کے مراسم تعزیت ادا کیے اور اس کے بعد جونپور میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔

بہلول نے جونپور کے تخت پر اپنے بیٹے باربک کو بٹھایا اور خود کالپی چلا گیا۔ یہ علاقہ اپنے بھتیجے اعظم ہمایوں کو جس کا اصلی نام خواجہ بایزید تھا دے دیا۔ وہاں سے دھول پور پہنچا وہاں کے راجہ سے کئی من سونا نذرانہ لے کر باری سے ہوتا ہوا رنتھنبور کے علاقے پالھن پور گیا اور اسے پامال و غارت کر کے دہلی لوٹ آیا۔

کچھ دن بعد بہلول نے حصار فیروزہ کا سفر کیا اور وہاں مختصر سے قیام کے بعد دہلی واپس آ گیا۔ دہلی سے سلطان نے گوالیار کی طرف بھی کوچ کیا۔ وہاں کے راجہ مان سے اس وقت کے مروجہ اسی لاکھ ٹنکے پیش کش وصول کر کے اور گوالیار کی حکومت اسی کے نام سے بحال کر کے واپس آ گیا۔

سلطان بہلول لودی کی وفات

سلطان بہلول گوالیار سے اٹاوہ کی راہ دہلی واپس جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے صحیح سلامت دہلی واپس جانا نصیب نہیں ہوا وہ قصبہ سکیٹ میں پہنچا تو بیماری اس کے لیے جان لیوا بن گئی۔

سلطان بہلول نے 894ھ/1489ء میں اڑتیس سال آٹھ مہینے آٹھ دن حکومت

کرنے کے بعد وفات پائی۔

قطعہ تاریخ:

بہ ہشتصد و نود وچار رفت از عالم
خدیو ملک ستان وجہان کشا بہلول
بہ تیغ ملک ستان بود لیک دفع اجل
بود محال بہ شمشیر و خنجر معقول

سلطان سکندر بن بہلول لودی

سلطان بہلول کے انتقال کی خبر جب اس کے بیٹے نظام خان کو ملی تو وہ اسی وقت دہلی سے کوچ کر کے قصبہ جلالی میں لشکر سے آملا اور باپ کی نعش دہلی کے لیے روانہ کی۔

سکندر کی تخت نشینی

نظام خان نے جمعہ کے دن سلطان فیروز کے قصر میں جو کالی ندی کے کنارے ہے اپنا خطاب سلطان سکندر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ مشہور ہے کہ جب وہ دہلی سے چلنے لگا تو حضرت شیخ سماء الدین S کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ حضرت شیخ جمالی کے پیر تھے اور اس عہد کے بڑے عالم و بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ شاہزادے نے ان سے ''اسعد ک اللہ'' کے معنی پوچھے۔ انھوں نے فرمایا ''تجھ کو اللہ تعالیٰ نیک بخت بنائے'' شاہزادے نے عرض کیا: ''آپ اپنی زبان مبارک سے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمادیجئے'' شیخ نے تین مرتبہ ایسا ہی کہا تو شاہزادے نے اٹھ کر کہا کہ ''میری مراد بر آئی'' اور شیخ سے دعا کرا کے لشکر کی طرف چلا گیا۔

باربک شاہ سے مقابلہ

جب سلطان سکندر کی سلطانی اچھی طرح جم گئی تو اس نے دہلی سے راپڑی اور اٹاوہ کی طرف کوچ کیا۔ اس علاقے میں وہ سات ماہ تک ٹھہرا رہا اور اس دوران اپنے بھائی باربک شاہ سلطان جونپور کے پاس اسمٰعیل خان لوحانی کو مصالحت کا پیغام دے کر بھیجا۔ خود جیالی کے حاکم عیسیٰ خان پر حملہ کر دیا۔ مقابلے میں عیسیٰ خان نے زخمی ہو کر اطاعت قبول کر لی لیکن وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور مر گیا۔ پٹیالی کا راجہ رائے گنیش جو باربک شاہ کا حامی تھا سکندر سے مل گیا اور سکندر نے اسے پٹیالی کی حکومت پر بحال رکھا۔

باربک شاہ مصالحت پر راضی نہیں ہوا اور لشکر لے کر جونپور سے قنوج آیا۔ اسی جگہ دونوں بھائیوں میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باربک کا طرف دار امیر مبارک خان گرفتار ہو گیا اور باربک بدایوں بھاگ گیا۔ سکندر نے پیش قدمی کر کے بدایوں کا محاصرہ کر لیا۔ باربک مجبور ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سکندر نے باربک کا اچھی طرح سے خیر مقدم کیا اور اسے تسلی دے کر اپنے ساتھ جونپور لے گیا حسب سابق اسے مملکت شرقی کا حکمران بنا دیا لیکن جونپور کے سارے پرگنے اپنے امیروں میں تقسیم کر دیے اور ہر جگہ اپنی فوج مقرر کر دی۔ کالپی سے اعظم خان ہمایوں کو معزول کر دیا۔

اس انتظام کے بعد سکندر چھترو گیا اور وہاں سے گوالیار پہنچا۔ خواجہ محمد علی فرملی کو خلعت خاص دے کر اپنا وکیل بنایا اور اسے راجہ مان کے پاس بھیجا۔ راجہ نے بھی اظہار اطاعت کے لیے اپنے بھتیجے کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور وہ بیانہ تک بادشاہ کے ساتھ رہا۔

بیانہ کی تسخیر

جب سکندر شاہ بیانہ پہنچا تو سلطان الشرق حاکم بیانہ جو سلطان احمد جلوانی کا بیٹا تھا حاضر خدمت ہوا اس نے قلعہ بیانہ کی کنجی سکندر کے گماشتوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن

بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور بیانہ واپس جا کر قلعے میں بند ہو گیا۔

یہاں سے سلطان سکندر آگرہ گیا۔ جہاں سلطان الشرق کا عزیز ہیبت خان جلوانی موجود تھا۔ وہ سکندر کی سرحد پر قلعہ آگرہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ سکندر نے چند امیروں کو آگرہ پر مقرر کیا اور خود بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔

897ھ/1491ء میں جب سلطان الشرق بالکل مجبور ہو گیا تو ہتھیار ڈال دیے اور پناہ طلب کر کے قلعہ بیانہ سلطان کے حوالے کر دیا۔ سکندر نے بیانہ کی حکومت خان جہان فرملی کے حوالے کر دی۔

بچگوتی قوم کی بغاوت

اسی سال جونپور میں بچگوتی قوم نے بغاوت کی اور تقریباً ایک لاکھ سوار اور پیادے جمع کر کے فساد برپا کر دیا۔ ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے سکندر نے جونپور کا رخ کیا۔ باربک نے آگے بڑھ کر سلطان کا استقبال کیا۔ یہاں سے سکندر کچھ دن کے لیے سیر و شکار کی غرض سے اودھ چلا گیا۔ پھر لوٹ کر جونپور کا قصد کیا۔

جب سکندر جھجھار کے قلعے کے پاس پہنچا تو سلطان حسین شرقی کے امیروں نے اس سے مقابلہ کیا۔ سکندر نے ان کو شکست دے کر بھگا دیا اور وہ قلعہ بند ہو گئے۔ سکندر نے ان کے محاصرہ کی فکر نہ کی بلکہ سیدھا الہ آباد کے قریب باریل چلا گیا اور اس علاقے کو بری طرح پامال کر کے کڑہ اور مانک پور کے راستے دلمئو کا رخ کیا۔ وہاں سے شمس آباد آیا جہاں چھ ماہ تک قیام کیا پھر سنبھل جا کر شمس آباد لوٹ آیا۔

پٹنہ اور بہار پر فوج کشی

900ھ/1494ء میں برسات کے بعد سکندر شاہ نے پٹنہ پر لشکر کشی کی اور وہاں کے سرکشوں کی خبر لی اور پھر جونپور واپس آ گیا۔ اس سفر میں اتنے گھوڑے مرے کہ دس میں سے

بس ایک زندہ رہا۔ اس کے لشکر کو اس مشکل میں گرفتار دیکھ کر پٹنہ کے زمینداروں نے سلطان حسین شرقی کو عرضی بھیج کر بلایا۔ سلطان حسین ایک بڑی جمعیت فراہم کر سکندر پر حملے کے ارادے سے روانہ ہوا۔

جب سکندر کو اس کی خبر ملی تو وہ گنگا عبور کر کے جھجھار پہنچا اور وہاں سے بنارس آیا۔ سلطان حسین نے بھی یلغار کرتے ہوئے بنارس کا رخ کیا۔ لیکن ابھی وہ 18 کوس پر ہی تھا کہ سکندر اس کے سر پر بجلی کی مانند ٹوٹ پڑا۔ راستے میں پٹنہ کا راجہ سالباھن بھی سلطان حسین سے کٹ کر سکندر کے پاس آ گیا۔ یہ لڑائی بھی سلطان حسین ہار گیا اور پٹنہ کی طرف بھاگ نکلا۔ سکندر نے ایک لاکھ سپاہیوں کے ہمراہ اس کا پیچھا کیا۔ راستے میں معلوم ہوا کہ سلطان حسین بہار کی طرف بھاگ گیا۔ غرض سکندر نویں دن اس کے تعاقب سے لوٹ کر لشکر کے خیمے میں واپس آ گیا اور بہار پر حملے کے ارادے سے روانہ ہوا۔

سلطان حسین کو جب بہار پر اس کی فوج کشی کی اطلاع ملی تو وہ بہار میں اپنے ایک نائب کو چھوڑ کر کھل گاؤں ضلع لکھنوتی چلا گیا۔ سکندر نے حملہ کر کے بہار پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ترہٹ کو فتح کیا۔

901ھ/1495ء میں خواجہ جہان نے انتقال کیا اور اس کے بڑے بیٹے احمد خان کو اعظم خان ہمایوں کا خطاب ملا۔

ترہٹ میں سلطان سکندر حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی زیارت کے لیے گیا۔ ان کی زیارت سے فارغ ہو کر درویش پور آیا۔ وہاں سے شاہ بنگالہ علاء الدین پر فوج کشی کی۔ بہار کے علاقے میں علاء الدین کا بیٹا دانیال اس کے مقابلے پر آیا۔ آخر دونوں میں صلح ہو گئی اور دونوں اپنے وطن کی طرف واپس ہو گئے۔

قحط اور تنگدستی

اس سال شاہی لشکر قحط و تنگدستی میں بری طرح مبتلا ہو گیا اور بادشاہ نے ہر طرف فرمان بھیج دیا کہ غلہ کی زکوٰۃ بند رکھی جائے۔ سکندر بنگالہ کی سرحد سے لوٹ کر سارن پہنچا اور اس

علاقے کو تقسیم کر کے اپنے امیروں کے حوالے کر دیا شاہی لشکر سارن سے براہ بکلی گڑھ، جونپور پہنچ گیا جہاں چھ ماہ تک قیام کیا۔

جون پور سے سکندر نے دوبارہ پٹنہ پر لشکر کشی کی اور 904ھ/1498ء میں پٹنہ سے باندھو گڑھ کا سارا علاقہ برباد کر ڈالا۔ البتہ وہاں کے مضبوط قلعوں کو فتح کیے بغیر ہی جونپور واپس چلا گیا۔

امیروں کی سازش

جونپور کے امیروں میں کسی کھیل کے دوران اختلاف ہو گیا اور قتل و خون تک نوبت پہنچ گئی۔ سکندر اپنے ان جھگڑالو امیروں سے بدگمان ہو گیا اور اپنی حفاظت کے لیے خاص بھروسے کے لوگوں کو مقرر کر دیا۔ یہ محافظ دستہ ہتھیار باندھے رات بھر بادشاہ کی حفاظت کرتا تھا۔

سکندر نے ناراض ہو کر جن جن امیروں کو معزول کر دیا تھا انھوں نے سلطان بہلول کے بیٹے فتح خان کو سلطنت کے لیے اکسایا۔ فتح خان سادہ لوح آدمی تھا، اس نے اپنی ماں، شیخ طاہر اور سلطان کے معتمد امراء سے سازش کا ذکر کر دیا اور ترغیب دینے والے امیروں کے نام بھی ظاہر کر دیے۔ ان سب نے فتح خان کو اس خام خیالی سے منع کیا اور اسے اچھی طرح سمجھا بجھا کر ایسے کسی اقدام سے روک دیا اور خود کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے سلطان سکندر سے بھی اس کا ذکر کر دیا۔ سکندر نے بڑی حکمت عملی سے کام لے کر ان مفسد امیروں کو منتشر کر دیا۔

905ھ/1499ء میں سکندر سنبھل آ کر رکا۔ پورے چار سال یہاں اس نے سیر و شکار، تفریح اور عیش و عشرت میں گزارے۔

دہلی کے حاکم کی بغاوت

سکندر کو عیش و عشرت میں مشغول دیکھ کر 905ھ/1499ء میں دہلی کے حاکم اصغر

نے بغاوت کردی۔ سکندر نے سنبھل سے ماچھی واڑہ کے حاکم خواص خان کے نام فرمان بھیجا کہ "اصغر کو گرفتار کر کے ہمارے حضور بھیج دو" خواص خان فرمان شاہی کی تعمیل میں روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اصغر نے خود ہی سنبھل پہنچ کر اپنے آپ کو گرفتار کے لیے پیش کردیا۔ اس کی جگہ سلطان نے خواص خان کو دہلی کا حاکم مقرر کردیا۔

اسی سال بیانہ کے حاکم خان خانان فرملی کا انتقال ہوگیا۔ کچھ دنوں تک بیانہ پر اس کے بیٹے عماد اور سلطان مقرر رہے، پھر دونوں کو خدمت شاہی میں طلب کرلیا گیا اور بیانہ کا قلعہ خواص خان کے سپرد ہوگیا۔ آگرہ صفدر خان کے حوالے کردیا گیا۔

دھول پور کی مہم

خواص خان نے حاکم میوات عالم خان لوحانی اور خان خانان لوحانی کو اپنی مدد کے لیے ساتھ لے کر دھولپور راجہ پر فوج کشی کی۔ دھولپور کے راجہ نے جم کر مقابلہ کیا۔ لڑائی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی۔ جب سکندر کو خبر ملی تو وہ لشکر لے کر ان کی مدد کے لیے دھولپور آیا۔ شاہی لشکر کی آمد پر دھولپور کا راجہ مانک دیو قلعہ چھوڑ کر گوالیار بھاگ گیا اور اس علاقے میں لوٹ مار اور غارت گری شروع کردی۔

سکندر ایک ماہ تک دھولپور میں رہا پھر وہاں سے کوچ کر کے گوالیار پہنچا اور وہاں آدم لودی کو مقرر کر کے چنبل ندی کو پار کیا اور مینڈکی کے کنارے لشکر گاہ قائم کی۔ وہاں آب وہوا کی خرابی کی وجہ سے لشکر میں وبا پھیل گئی۔ اسی اثنا میں گوالیار کے راجہ نے صلح کرلی اور بادشاہ کے لشکر سے بھاگے ہوئے امیروں سعید خاں، بابو خان اور رائے گنیش وغیرہ کو جو گوالیار میں پناہ لیے بیٹھے تھے اپنے قلعے سے باہر کردیا اور اپنے بڑے بیٹے کو سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان نے اسے گھوڑے اور خلعت عطا کر کے واپس کردیا، وہ وہاں سے آگرہ چلا گیا اور دھولپور کی حکومت مانک دیو کے نام دوبارہ بحال کردی۔ سکندر نے پورا موسم برسات آگرہ میں بسر کیا۔

910ھ/1504ء میں آگرہ سے کوچ کر کے قلعہ مورائل پر لشکر کشی کی وہاں کے رائے

نے معافی لے کر قلعہ چھوڑ دیا۔ سکندر نے قلعے میں داخل ہو کر وہاں کی ساری عبادت گاہیں توڑ دیں۔ وہاں سے لوٹ کر دھولپور کے قلعے کو از سر نو تعمیر کرایا اور وہاں سے آگرہ چلا گیا۔

آگرہ پہنچ کر سلطان سکندر نے اپنے تمام امیروں کو لشکر سے چھٹی دے کر ان کو متعلقہ جاگیروں پر رخصت کر دیا۔

سید محمد مہدی

900ھ/1494ء میں سید محمد جون پوری نے انتقال فرمایا۔ یہ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی کامل تھے۔ انھوں نے امام مہدی ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ جب وہ حج سے لوٹ رہے تھے شہر فرہ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تاریخ وفات قاضی حسین زرگر قندھاری نے لکھی ہے:

گفتا کہ بروز شیخ کن استغفار

شیخ مبارک نے مادہ تاریخ نکالا تھا: ''مقضاء مہدی''

تباہ کن زلزلہ

911ھ/1505ء میں سارے ہندستان میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ پہاڑ تک ہل گئے اور بڑی بڑی عمارتیں زمین کے اندر دھنس گئیں۔ جابجا زمین میں دراڑ پڑ گئی اور درخت اکھڑ کر دور دور تک جا گرے۔ لوگ یہ دیکھ کر سمجھنے لگے کہ بس قیامت آ گئی۔ بابر کی تاریخ اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن یہ زلزلہ صرف ہندستان میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی آیا تھا۔ اس زلزلہ کی تاریخ لفظ ''قاضی'' سے نکلتی ہے۔

قطعہ:

در نہصد واحدی عشر از زلزلہ ہا
گردید سواد آگرہ چون مرحلہا

با آنکہ بناهاش بسی عالی بود
از زلزلہ شد عالیہا سافلہا

کہتے ہیں کہ آدم کے وقت سے لے کر اس وقت تک ایسا زلزلہ کبھی نہیں آیا تھا۔

اونت گڑھ اور نرور کی فتح

912ھ/1506ء میں سلطان سکندر نے اونت گڑھ کے قلعے پر حملہ کیا اور اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس محاصرے میں سلطانی فوج کے بہت سے لوگ مارے گئے لیکن سلطان کو فتح حاصل ہوئی۔ بڑی تعداد میں ہندو بھی جاں بحق ہوئے۔ جو بچے اپنے اہل و عیال سمیت خود جل کر مر گئے۔ سلطان نے وہاں کے بت خانے توڑ کر مسجدیں تعمیر کرائیں۔

913ھ/1507ء میں نرور کے قلعے پر چڑھائی کی۔ راستے میں جلال خان لودی نے اپنے سواروں اور پیادوں کی ایک بڑی جمعیت بادشاہ کے حضور پیش کی۔ سکندر کو اس کی یہ کارگزاری کہ اتنی بڑی جمعیت اس نے اپنے گرد اکٹھی کر لی تھی کچھ پسند نہ آئی اور اس نے اس جمعیت کو منتشر کر کے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ اوسکر میں بھیج دیا۔ نرور کے محصورین نے معافی مانگ کر صلح کر لی۔

نعمت خان

914ھ/1508ء میں نرور کے اطراف ایک اور حصار تعمیر کرایا تاکہ قلعہ اور زیادہ مستحکم ہو جائے۔ اسی دوران قطب خان کی بیوی نعمت خاتون سکندر سے ملنے کے لیے آئی۔ سلطان نے شہزادہ جلال خان کو دو سو گھوڑے اور پندرہ ہاتھی دیے اور اسے نعمت خان کے ساتھ کالپی کے لیے روانہ کیا اور وہ علاقہ شہزادے کی جاگیر میں دے دیا۔

آگرہ کی طرف واپسی

915ھ/1509ء میں سلطان حاجر سے کوچ کر کے ہتکانت اور وہاں سے آگرہ روانہ ہوا۔ راستے میں جگہ جگہ تھانے مقرر کیے۔ اس کے آگرہ پہنچنے کا مادہ تاریخ ہے:

"ولہ الحکم والیہ ترجعون"

اسی سال مالوہ کے سلطان ناصرالدین کا نواسہ اپنے نانا کے خوف سے بھاگ کر سکندر کے پاس پناہ لینے آیا۔ سلطان نے چندیری اس کی جاگیر میں عطا کیا اور شہزادہ جلال خان کو اس کی مدد اور تعاون کی تاکید کی۔

915ھ/1509ء میں سکندر نے آگرے سے دھولپور تک جگہ جگہ عمارتیں، نوائیں اور باغات لگوائے تاکہ اس علاقے میں سیر و شکار اور آرام کرنے کی سہولتیں موجود رہیں۔

محمد خان ناگوری کی اطاعت

اسی سال محمد خان ناگوری نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اس کی ساری قوم پہلے ہی سے سکندر سے مل گئی تھی اور اب اس کے لیے اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک میں سلطان کے نام کا خطبہ بھی شروع کرا دیا نیز بغیر کسی جنگ کے یہ علاقہ سکندر کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

جس وقت سکندر اونت گڑھ کی مہم پر گیا تھا اس نے خان خانان فرملی کے بیٹے سلیمان کو نوپر کی طرف روانہ کیا تھا لیکن یہ تعیناتی اس نے قبول نہیں کی تھی اور ٹال مٹول کرتا رہا تھا۔ اس سال سکندر نے اس حکم عدولی کے جرم میں اسے معزول کر دیا البتہ اندری کرنال کا پرگنہ اس کی معاش کے لیے دے دیا۔ وہ اسی جگہ جا کر مقیم ہو گیا۔

چندیری کا شامل کیا جانا

مالوہ کے سلطان محمود کی سلطنت کمزور ہو چکی تھی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بھجت

خان مالوہ نے چندیری کو سلطان سکندر کے حوالے کر دیا اور وہاں سکندر کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا۔ اس خوش خبری کے فرمان اور فتح نامے ہر طرف بھیجے گئے۔ سلطان سکندر نے سلطان ناصر الدین کے پوتے محمود خان کے پہلے شہر چندیری میں نظر بند کر دیا تھا بعد میں چندیری اس کو عطا کر کے اسے بحال کر دیا، البتہ احتیاط کے لیے اس پر اپنے اعتبار کے لائق حاکم بھی مقرر کر دیے گئے۔

سید نعمت اللہ حسینی

چندیری کے انتظام کے بعد بادشاہ نے بیانہ کا سفر کیا اور وہاں کے علماء وفضلاء کی خدمت میں حاضری دی۔ بیانہ میں سید نعمت اللہ حسینی 8 سے جو بڑے بزرگ اور صاحب کشف وکرامات تھے جن سے سلطان سکندر کو بڑی عقیدت تھی، آخر وہ ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

دولت خان کی اطاعت

رنتھنبور کے حاکم شاہزادہ دولت خان نے بھی جو سلطان محمود مالوی کے ماتحت تھا علی خان ناگوری کے ذریعہ سلطان کی ملازمت اختیار کر لی اور قلعے کی کنجی حوالے کر دینے کا عہد کیا لیکن علی خان ناگوری کی نیت کچھ بدل گئی اور اس نے کنجی دینے سے روک دیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع مل چکی تھی لیکن اس نے علی خان کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیا اور دولت خان سے بیٹوں کی طرح شفقت ومہربانی کا سلوک کیا، خاص خلعت کئی گھوڑے اور ہاتھی اسے عطا کیے۔

سلطان سکندر لودی کی وفات

سلطان نے قلعہ تھنکر پہنچ کر کچھ دن قیام کیا۔ وہاں سے سیر کرتے ہوئے قصبہ باری

میں آیا پھر آگرہ واپس ہو گیا۔

آگرے پہنچے کے بعد سکندر بیمار ہو گیا اور اسی بیماری میں اتوار کے دن 17 ذی القعدہ 922ھ/1516ء میں انتقال ہوا اس کی تاریخ وفات کا مادہ ہے۔

"وَجَنَّاتُ الفردوسِ نزُلاً"

سلطان سکندر نے 28 سال پانچ ماہ بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔

سکندر لودی کی شعر گوئی

سلطان سکندر بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ شعر و سخن کا اسے ذوق تھا۔ شاعروں سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا، اکثر شعراء اس کی مجلس میں حاضر رہتے تھے۔ سکندر خود بھی قدیم ہندی طرز میں شعر کہا کرتا تھا اس نے اپنا تخلص گلرخ رکھا تھا۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں:

سروی کہ سمن پیرھن وگل بہ نستش
روحی ست مجسم کہ دران در شکنش
مشک ختن چیست کہ صد مملکت چین
در حلقہ آن زلف شکن در شکنش
گلرخ چہ کند جوہر دندان ترا وصف
ھم چون در سیراب سخن درد ہنستش
در سوزن مژگان بکشم رشتہ جان را
تا چاک بدوزم کہ دران پیرھنستش

سلطان سکندر کے عہد میں ایک نامور شاعر برہمن بھی تھا جو باوجود کفر کے مروجہ علوم کی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا۔ حسب ذیل مطلع اسی کا ہے، جسے اس نے مسعود بیگ کی زمین میں کہا ہے:

دل خون نشدی چشم تو خنجر نشدی گر
رہ گم نشدی زلف تو اختر نشدی گر

عہد سکندری کے علماء

سلطان سکندر کے زمانے کے علماء میں دہلی میں شیخ عبداللہ طلنبی اور شیخ عزیز طلنبی سنبھل میں تھے۔ یہ دونوں بزرگ ملتان کی بربادی کے وقت ہندستان آئے تھے۔ ہندستان میں علوم معقولات کی ترویج میں ان بزرگوں کا بڑا حصہ ہے۔ اس سے پہلے علم منطق اور کلام میں "شرح شمسیہ اور شرح صحائف" بس یہ دو رسالے ہی ہندستان میں رائج تھے۔

شیخ طلنبی

استادوں سے سننے میں آیا ہے کہ شیخ عبداللہ کے حلقۂ درس میں چالیس سے زیادہ بڑے بڑے متبحر عالم جیسے میاں لادن، جمال خان دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدایونی فارغ ہو کر نکلے تھے۔

کہتے ہیں کہ سلطان سکندر بھی شیخ عبداللہ کے درس میں حاضر ہوا کرتا تھا اور دبے پاؤں آ کر ادب سے ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا تھا تاکہ طلبہ کے سبق میں خلل نہ پڑے۔ درس کے بعد سلام علیک کہہ کر دیر تک ان کی صحبت میں بیٹھا رہتا تھا۔

شیخ عزیز اللہ طلنبی

دوسرے عالم شیخ عزیز اللہ طلنبی بھی بڑے رشد و ہدایت والے عالم تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تیز اور ذہن خوب رسا تھا۔ مشکل سے مشکل متنی کتابوں کو بغیر مطالعے کے بہ آسانی پڑھا دیتے تھے۔

اکثر لوگوں نے امتحان کے طور پر ان کے سامنے الجھے ہوئے پیچیدہ سوالات رکھے

لیکن انھوں نے ان سوالوں کو چٹکیوں میں حل کر کے دکھا دیا۔

ان کے تلامذہ میں میاں حاتم سنبھلی تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی عمر میں شرح مفتاح کا تیس سے زیادہ اور مطول کا چالیس سے زیادہ مرتبہ بسم اللہ سے آخر تک درس دیا۔

شیخ الہدیہ (اللہ دیا)

ایک دوسرے صاحب تصانیف عالم جونپور کے شیخ الہدایہ تھے۔ انھوں نے فقہ کی ہدایہ پر چند جلدوں پر مشتمل شرح لکھی ہے۔ انھوں نے کافیہ کی جو شرح لکھی ہے اس کی تعریف تو زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ انھوں نے تفسیر مدارک وغیرہ پر حاشیے لکھے ہیں جو اس زمانے تک پڑھائے جاتے ہیں۔

سکندر نے ایک مرتبہ اپنے ایک ملک کے تمام علماء کو جمع کیا۔ ایک جانب شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ اور دوسری جانب سے شیخ الہدیہ اور ان کے لڑکے بھکاری نے علمی مباحثہ کیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے دو بزرگ تقریر میں اور دوسرے دو تحریر میں سب سے فائق و ممتاز ہیں۔

شیخ عبداللہ کا انتقال 922ھ/1516ء میں ہوا ان کا مادہ تاریخ ہے:

"اولئك لهم درجات العلى"

عہد سکندری کے شعراء

اس زمانے کے شاعروں میں ایک شیخ جمالی کنبو دہلوی تھے۔ سلطان سکندر ان کو اکثر اپنے شعر سنایا کرتا تھا۔ شیخ جمالی بڑے رنگا رنگ شاعر تھے، سیر و سیاحت بھی بہت کی تھی۔ مولانا جامی 9 کی خدمت میں بھی عرصے تک رہے تھے اور شعر و سخن میں ان سے اصلاح لی تھی۔ ان کا نمونہ کلام ہے:

مارا از خاک کویت پیرہنی ست بر تن
و آن ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

عشق را طی لسانی ست کہ صد سالہ سخن
دوست بادوست بیک چشم زدن میگوید

ان کی یہ غزل جو ہندی طرز میں کہی گئی ہے بڑی وجد آور اور بہت مشہور ہے۔

طال شوقی الی منازلکم
ایہا الغائبون عن نظری
روز و شب مونسم خیال شماست
فاسئلوا عن خیالکم خبری

تذکرہ سیر العارفین

شیخ جمالی نے سیر العارفین کے نام سے ہندستان کے بزرگوں کے حالات پر ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ یہ تذکرہ ہے تو خوب لیکن اس میں غلطیاں بے شمار ہیں۔ تذکرے کی ابتداء حضرت خواجہ بزرگوار معین الحق والدین الاجمیریؒ سے اور اس کا اختتام ان کے اپنے پیر شیخ سماء الدین کنبو دہلوی پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم ونثر میں ان کی اور بھی چیزیں ہیں۔ ان کا دیوان آٹھ نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

سلطان ابراہیم بن سکندر لودی

سلطان سکندر کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم امراء کے اتفاق سے تخت نشین ہوا۔ سلطان سکندر نے شہزادہ جلال خان کو جونپور کی حکومت عطا کی تھی۔ امراء نے اسے بھی شریک سلطنت قرار دے دیا۔ اسی دوران خان جہان خان لوحانی راپڑی کا حاکم آگرہ آیا اور جلال خان کو شریک سلطنت بنانے پر امیروں کو لعنت ملامت کی۔ پورب کے تمام امراء کے نام فرامین جاری کرائے کہ جلال خان کو گرفتار کر کے دارالخلافہ روانہ کر دیں۔

جلال خان کا بادشاہت کا دعویٰ

جلال خان جونپور سے کالپی پہنچا۔ وہاں ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کر کے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرایا اور اپنا خطاب سلطان جلال الدین رکھا۔ اعظم ہمایوں سروانی کچھ عرصے تک تو جلال خان کا معاون بنا رہا لیکن بعد میں سلطان ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سلطان ابراہیم نے اسمٰعیل خان، حسین خان اور دوسرے شاہزادوں کو جو پہلے سے قید میں تھے، ہانسی کے قلعے میں بھجوا دیا۔ ان کے لباس اور کھانے کا انتظام کرا کے دو دو خدمت گار ہر ایک کے لیے مقرر کر دیے۔

ابراہیم لودی کی لشکر کشی

سلطان ابراہیم نے پورب کی طرف لشکر کشی کی اور بھون گاؤں پہنچا اور اس علاقے کو پامال کرتا ہوا قنوج آیا۔ وہاں سے کئی ایک امیروں کی سرکردگی میں جلال خان کے مقابلے کے لیے لشکر روانہ کیا۔ جلال خان نے بھی تیس ہزار سواروں اور کثیر ہاتھیوں کے ساتھ آگرے کا رخ کیا۔ سلطان ابراہیم کی طرف سے آگرے کی حفاظت پر ملک آدم کا تقرر کیا۔ اس کی مدد کے لیے بھی کئی ایک امیر پہنچ گئے۔

جلال خان کا اظہار اطاعت

امیروں نے جلال خان سے تفصیلی گفتگو کی اور کہہ سن کر اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سلطان ابراہیم کے حق میں بادشاہت سے الگ ہو جائے اور کالپی اس کی جاگیر میں رہے۔ اس شرط پر امراء نے اس کے قصور معاف کرا دینے کی حامی بھری۔ جلال خان اس بات پر راضی ہو گیا اور شاہی امتیاز، چتر، آفتاب گیر اور نقارہ وغیرہ ملک آدم کو دیا۔ ملک آدم نے اٹاوہ کے قریب یہ چیزیں بادشاہ کے حضور پیش کیں اور جلال خان کی سفارش کی۔

جلال خان کا فرار ہونا

سلطان ابراہیم نے اس بات کو قبول نہیں کیا اور جلال خان کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کردی۔ جلال خان پریشان ہوکر گوالیار بھاگ گیا اور سلطان سکندر کے تمام امیروں نے جنھوں نے یہ حالت پیدا کی تھی سلطان ابراہیم کی اطاعت قبول کرلی۔ صرف ایک امیر میاں بھوہ ایسا تھا جسے بادشاہ نے معاف نہیں کیا یہ سکندر کا بڑا نامی وزیر اور مشیر رہ چکا تھا۔ ابراہیم نے سلطنت کے برخلاف اسے زنجیر میں بندھوا کر ملک آدم کے حوالے کردیا اور وہ اسی قید میں مرگیا۔ بادشاہ نے اس کے بیٹے کو باپ کا منصب اور عہدہ دے دیا۔

سلطان نے حاکم کڑہ اعظم خان ہمایوں سروانی کی کمان میں تمیں ہزار سوار اور ایک سو ہاتھی گوالیار کا محاصرہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جب جلال خان کو شاہی لشکر کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ گوالیار سے سلطان محمود مالوی کے پاس مالوہ چلا گیا۔

گوالیار کا محاصرہ

شاہی فوج نے گوالیار کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت وہاں کا حاکم راے مان سنگھ تھا جس نے اپنے باپ راۓ بکرماجیت کو قتل کرکے حکومت حاصل کی تھی وہ مسلمانوں کے حملے کی مدافعت نہیں کرسکا اور گوالیار کا قلعہ زیریں حصار بادل گڑھ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ وہاں ایک کانسے کا بت تھا جس کی ہندو پوجا کرتے تھے۔ ہمایوں نے وہ بت سلطان کے پاس آگرہ روانہ کردیا۔ بادشاہ کے حکم سے اس بت کو شہر دہلی کے دروازے پر ڈال دیا گیا۔ یہ بت اس کتاب کی تصنیف سے دس سال پہلے فتح پور سیکری لایا گیا تھا۔ میں (مؤلف منتخب التواریخ) یعنی عبدالقادر نے اس بت کو دیکھا ہے۔ اس کے سامنے ناقوس اور گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں سلطان ابراہیم اپنے اکثر امیروں سے بدظن ہوگیا اور مختلف مقامات پر تبادلے کرکے ان کو منتشر کردیا۔

جلال خان کا قتل

مالوہ میں جلال خان اور محمود مالوی کے درمیان زیادہ دن نبھ نہ سکی اور جلال خان مالوہ سے بھاگ کر گڑہ کنکہ کی طرف نکل گیا۔ اس جگہ گونڈ قبیلے کے لوگوں نے اسے پکڑ کر سلطان ابراہیم کے پاس روانہ کر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو بھی دوسرے شاہزادے کے ساتھ قلعہ ہانسی میں قید رکھا جائے لیکن کسی دشمن نے اسے راستے ہی میں قتل کر دیا۔

اعظم ہمایوں کی گرفتاری

گوالیار پر اعظم ہمایوں برابر محاصرہ کیے پڑا تھا۔ قریب تھا کہ اس کی کوششوں سے یہ مستحکم قلعہ فتح ہو جائے کہ عین وقت پر سلطان کی طلبی کا فرمان آ گیا اور وہ محاصرہ اٹھا کر آگرہ لوٹ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی بادشاہ نے اسے اور اس کے بیٹے فتح خان کو قید کر لیا۔

اسلام خان کی بغاوت

اعظم ہمایوں کا دوسرا بیٹا اسلام خان کڑہ میں تھا۔ اسے باپ کی ساری دولت اور ساز و سامان مل گیا۔ اس نے اس مال سے کڑہ میں ایک بڑی جمعیت منظم کر لی اور اس نواح کے امراء کو اپنا معاون بنا لیا اور حاکم کڑہ احمد خان پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔

اعظم ہمایوں لودی کا بھائی احمد خان ایک بڑے جتھے کا سربراہ تھا۔ سلطان نے اسے اور خان خاناں فرملی جیسے بڑے بڑے امراء کو اسلام خان اور اس کے شریک باغی امیروں کے مقابلے پر بھیجا۔ جب یہ شاہی لشکر قنوج کے قریب بانگرمئو کے قصبے میں پہنچا تو اعظم خان ہمایوں کا دایاں ہاتھ اقبال خان جو کہ گھات لگائے بیٹھا تھا اس نے گھات سے نکل کر ایسا حملہ کیا کہ شاہی لشکر بکھر گیا۔

بادشاہ نے احمد خان کی مدد کے لیے اور فوج روانہ کی۔ باغی امیر بھی چالیس ہزار سوار اور پانچ سو ہاتھی لے کر مقابلے پر آیا، سخت لڑائی ہوئی۔ عین لڑائی کے وقت بہار کی جانب

سے نصیر خان لودی نے آ کر باغیوں پر حملہ کر دیا۔ باغی امیر دو سمتوں سے گھر گئے۔ دونوں طرف سے ان پر حملے ہو رہے تھے لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، آخر بڑی جانفشانی اور جدوجہد کے بعد شاہی لشکر ان کو شکست دے سکا۔ اس مقابلے میں اسلام خان مارا گیا اور سعید خان قید ہو گیا۔

امیروں سے بدگمانی

شاہی امراء نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بڑی ایمانداری، دیانت داری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا تھا لیکن ابراہیم کا دل اپنے امیروں کی طرف سے پھر بھی صاف نہ ہوا اور وہ ان سے اسی طرح بدگمان اور بدظن رہنے لگا۔ سلطان کے اس رویئے سے امیر بھی برداشتہ خاطر اور ٹوٹے ٹوٹے رہنے لگے اور ہر طرف سے بادشاہ کی مخالفت شروع ہو گئی۔

اعظم ہمایوں سروانی اور سکندر وزیر میاں بھوہ بڑے کارگر اور پایہ کے امیر تھے۔ سلطان ابراہیم نے ان دونوں کو قید کر لیا۔ اور وہ اسی قید میں مر گئے۔ میاں حسن فرملی ایک اور امیر تھا جسے سلطان ابراہیم کے اشارے پر چندیری میں اوباش شیخ زادوں نے قتل کر دیا۔ دریا خان لوحانی بہار کا حاکم اور خان جہان لودی بھی بادشاہ کی عادت سے ڈر کر باغی بن بیٹھے۔ دریا خان چند دن بعد مر گیا۔ اس کا بیٹا بہادر خان جانشین ہوا اور وہاں کے تمام پرگنوں کے امیر اس کے ساتھ ہو گئے۔

بہادر خان کی خود مختاری

بہادر خان نے بہار میں ایک لاکھ سوار جمع کر کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا اور اپنا خطاب سلطان محمد رکھ کر بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سکہ اور خطبہ اپنے نام کا جاری کرا دیا۔ اس نے سنبھل تک فوج کشی کی اور مدت تک بہار اور اس کے اردگرد اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔

مغلیہ سلطنت کو دعوت

اسی دوران لاہور سے دولت خان لودی کا بیٹا خان خانان آگرے آ کر شاہی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن وہ بھی بادشاہ کے رویہ سے خوفزدہ ہو کر اپنے باپ کے پاس بھاگ گیا۔ دولت خان نے جب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بادشاہ کے چنگل سے کسی طرح محفوظ نہیں رکھ سکتا تو اس نے اسے کابل بھیج دیا۔ یہی خان خانان وہ شخص ہے جو ہندستان میں مغل سلطنت کے قیام کا باعث بنا۔ اس نے کابل جانے کے بعد ظہیر الدین بابر کو ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا اور اسے لے کر ہندستان آیا تھا۔ بعد میں اسی خان خانان نے بابر سے اپنے باپ کی شکایتیں کر کے اس کا دل دولت خان سے پھیر دیا تھا۔ خان خانان، شیر شاہ کے عہد تک زندہ تھا اور اسی کی قید میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

بابر سے امیروں کی نسبت

بہار میں سلطان محمد خان کا جلد انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک تمام امیر سلطان ابراہیم لودی سے بری طرح بگڑ گیے تھے اور اس کے خلاف سازشوں میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ ان امیروں نے جن میں دولت خان اور اس کے بیٹے غازی خان اور دوسرے بڑے بڑے امیر شامل تھے، عالم خان لودی کے ذریعے ظہیر الدین بابر کے پاس کابل میں عرضیاں لکھ لکھ کر بھیجیں اور اسے ہندستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

بابری لشکر کی یلغار

بابر نے پہلے اپنے چند امیروں کو عالم خان کے ساتھ ہندستان کے سرحدی علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان امیروں نے بہت جلد لاہور اور سیالکوٹ وغیرہ فتح کر لیا اور تفصیلی حالات بابر کے پاس لکھ کر روانہ کیے۔ اس کی فتح کی تاریخ ہے:

ظہیرالدین محمد شاہ بابر
سکندر دولت و بہرام صولت
بہ دولت کرد فتح کشور ھند
کہ تاریخ آمدش فتح بدولت

بابر کا ہندستان پر حملہ

جب بابر کو ان فتوحات کی خبریں موصول ہوئی تو وہ بھی متواتر کوچ کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے آ کر اُتر گیا۔ اس پڑاؤ پر اس کا لشکر دس ہزار تھا۔ بابر کے حملہ کی خبر پاتے ہی دولت خان اور غازی خان اپنے عہد و پیمان سے منحرف ہو گئے اور تیس ہزار پٹھان سواروں کو لے کر قصبہ کلانور پر قبضہ کرلیا اور بابر کے امیروں پر حملہ کرنے کے لیے لاہور کی طرف کوچ کردیا۔ جب غازی خان سیالکوٹ پہنچا تو بابر کا امیر خسرو قلعہ چھوڑ کر بابر کے لشکر سے جا کر مل گیا۔

سیالکوٹ کی تباہی

کچھ دن بعد بابر سیالکوٹ آیا اور اسے بری طرح تاخت و تاراج کردیا۔ پوری طرح ویران کر کے سیالکوٹ کے بجائے دھولپور کو آباد کرایا۔ یہاں سے بابر نے عالم خاں کو دہلی پر حملے کے لیے آگے بڑھایا۔ اس نے سلطان ابراہیم کے لشکر پر رات میں چھپ کر حملہ کردیا۔ اس رات ابراہیم کے چند امیر جلال خان وغیرہ عالم خان سے جا کر مل گئے۔

عالم خان کی شکست

سلطان ابراہیم نے اس رات کے حملے کے جواب میں صبح تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ عالم خان کا لشکر غنیم کی خاموشی پر اپنی فتح کے گمان میں ادھر اُدھر منتشر ہوگیا۔ اس

وقت صبح ہو چکی تھی اور عالم خان کے ساتھ تھوڑے فوجی رہ گئے تھے۔ سلطان ابراہیم نے اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ایک ہاتھی کو آگے بڑھا کر حملہ آور غنیم پر حملہ کر دیا۔ اس کا یہ حملہ ایسا سخت اور غیر متوقع تھا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ عالم خان میدان سے جان بچا کر بھاگا اور دوآبہ سے گزر کر سرہند پہنچا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر قلعہ گنگوٹہ میں جو ملوت کے توابعات میں پہاڑ پر واقع ہے پناہ لی۔

دلاور خان لوحانی یہاں سے عالم خان کے لشکر سے جدا ہو کر بابر کے لشکر میں چلا گیا۔ جب وہ بابر کے پاس گیا تو وہ اس کی تعظیم میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بڑی عزت و توقیر کی اور اسے خلعت عطا کی۔

بابر کی پیش قدمی

اب بابر نے خود پیش قدمی کی اور ضلع کلانور جا کر پڑاؤ کیا۔ یہاں لاہور سے اس کے امیر محمد سلطان مرزا وغیرہ بھی آ کر مل گئے۔ قلعہ ملوت کے اردگرد میں جہاں سے غازی خان بھاگ گیا تھا۔ بابر کی لشکر پہنچا تو دولت خان جو بابر سے منحرف ہو چکا تھا لشکر میں حاضر ہو گیا۔ لوگوں نے اس کو باندھ کر اس کی گردن میں دو تلواریں ڈال دیں۔ اس حالت میں اسے بابر کے دربار عام میں پیش کیا گیا۔ بابر نے جب یہ دیکھا تو لوگوں کو اس سے منع کیا اور دولت خان کو نہایت تعظیم سے بلایا اور اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ دی لیکن اس کا سارا مال و اسباب لشکر والوں میں تقسیم کرا دیا۔ ملوت پر بابری لشکر نے قبضہ کر لیا اور دولت خان چند دن بعد بابر کی قید میں ہی انتقال کر گیا۔

دولت خان کا قصہ تمام ہونے کے بعد بابر نے غازی خان کا پیچھا شوالک کی پہاڑی تک کیا۔ اور ناردوں کے مقام پر خیمہ لگایا۔ جب وہاں غازی خان لشکر والوں کے ہاتھ نہ آیا تو بابر وہاں سے لوٹ کر منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے ضلع سرہند میں پہنچا اور گھگر کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ پھر وہاں سے سامانہ اور سنام کا رخ کیا۔

سلطان ابراہیم نے عالم خان کو شکست دینے کے بعد سرحدوں کی فکر نہیں کی اور دہلی

میں پڑا رہا۔ بابر نے ابراہیم کے لشکر اور جنگی تیاریوں کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے بعد امیر کتہ بیگ کو نامزد کر کے رخصت کیا۔ اسی مقام پر بابر کا امیر بین افغان باغی ہو گیا تھا لیکن جلدی شاہی لشکر سے آ کر مل گیا۔

شہزادہ ہمایوں کا حملہ

بابر کو اطلاع ملی کہ سلطان ابراہیم کا خاص رسالدار حمید خان حصار فیروزہ سے لشکر فراہم کر کے لڑنے کے لیے آ رہا ہے۔ بابر نے مقابلے پر شاہزادہ محمد ہمایوں کے ساتھ مرزا خواجہ کلاں اور دوسرے امراء کو مقرر کیا۔ ہمایوں اور حمید خاں کی فوجوں میں سخت جنگ ہوئی شدید جدو جہد کے بعد حمید خاں کو ہمایوں نے شکست دی۔ اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور کچھ گرفتار ہو گئے۔ اس فتح کی خوشی میں بابر نے حصار فیروزہ ہمایوں کو جاگیر میں دے دیا۔

پٹھانوں کی سرکوبی

یہاں سے آگے بڑھ کر بابری لشکر نے جمنا کے کنارے شاہ آباد سے دو منزل پر قیام کیا۔ سلطان ابراہیم کے امیر داؤد خان وغیرہ پانچ چھ ہزار سوار لے کر جمنا پار کر گئے تھے۔ داؤد خان کے مقابلے پر بابر نے سید محمد مہدی، خواجہ محمد سلطان مرزا اور سلطان جنید برلاس کو آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے پٹھانوں کی اچھی طرح کچلا اور بہتوں کو قتل و قید کر لیا۔ جو جان بچا کر نکل گئے، وہ ابراہیم کے لشکر سے جا ملے۔

بابر کا توپ خانہ

بابر نے شاہ آباد سے کوچ کر کے لڑائی کا ساز و سامان درست کیا۔ اسی ایک دن میں اٹھ سو گاڑیاں تیار ہو گئیں۔ بابر کے ماہر آتش باز استاد علی قلی نے حسب الحکم توپ خانے کو

روم کے توپ خانہ کی طرح مستحکم کر دیا۔ اس نے تمام گاڑیوں کو زنجیروں اور تسموں سے باہم جکڑ دیا اور جابجا دو دو گاڑیوں کے درمیان چھ سات مٹی سے بھرے ہوئے بورے رکھوا دیے تاکہ ان مورچوں کی حفاظت میں رہ کر سپاہی بندوقیں چلا سکیں۔

طے یہ پایا کہ یہاں سے چل کر پانی پت تک لشکر کو پیچھے رکھ کر قیام کیا جائے اور میدان میں ان گاڑیوں کی قطار لگا دی جائے۔ سارے سوار اور پیادے ان کے پیچھے رہیں، حملے کے وقت ادھر اُدھر سے نکل کر دشمن پر یلغار کریں اور حسب ضرورت اس مورچہ بندی کی حفاظت میں آجائیں۔

بابر پانی پت میں

30 رجمادی الآخر 932ھ نومبر 1525ء بروز جمعرات بابر نے پانی پت کے قریب خیمہ لگایا۔ وہاں سے سلطان ابراہیم کا لشکر چھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت بابر کے پاس صرف پندرہ سوار اور پیادے تھے اس کے مقابلے میں ابراہیم لودی کے پاس ایک لاکھ سوار اور ہزار ہاتھی تھے۔ بابر کے لشکر روزانہ پٹھانوں پر چھاپے مار کر سپاہیوں کے سر کاٹ لے جاتے تھے۔ لشکر لڑنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن ابراہیم اپنی جگہ چپ چاپ رہا اور کوئی حرکت نہ کی۔

ایک رات بابر کے امیر مہدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا وغیرہ نے پانچ ہزار کی جمعیت لے کر ابراہیم کے لشکر پر رات میں چھپ کر حملہ بول دیا اور بہت سے سپاہیوں کو قتل کر کے صحیح سلامت لوٹ گئے۔

پانی پت کی پہلی خونریز لڑائی

932ھ/1526ء کو بروز جمعہ خدا خدا کر کے سلطان ابراہیم کی سواری حرکت میں آئی اور اس نے فوج کی تنظیم و ترتیب کر کے میدان میں صف بندی کر لی۔

بابر نے بھی بڑی آن بان کے ساتھ فوج کو منظم کیا۔ نقشہ جنگ اس طرح تجویز کیا کہ دائیں جانب سے امیر قراقورچی اور امیر شیخ علی وغیرہ اور بائیں جانب سے ولی قزلی اور بابا قشقہ تمام مغل جمعیت کو ساتھ لے کر دو جانب سے دشمن کے پیچھے سے حملہ کریں اور بقیہ میمنہ اور میسرہ والی فوج اور امیر محمدی کوکلتاش، امیر یونس علی اور امیر شاہ منصور برلاس کا لشکر سامنے سے دشمن پر حملہ کرے۔

جب لڑائی چھڑی تو دائیں طرف پٹھانوں کا زیادہ دباؤ تھا۔ اسی لیے بابر نے امیر عبدالعزیز کو بھی اس سمت پر روانہ کر دیا۔ اس نے جاتے ہی یک بارگی دشمن پر تیروں کی بوچھار کر دی۔ فریقین نے جب خوب جم کر مقابلہ کیا دونوں طرف کے بہادروں نے جی کھول کر داد شجاعت دی اور ایسی گھمسان کی جنگ ہوئی کہ دونوں طرف خون کی ندیاں بہہ نکلیں اس لڑائی کو دو قرن کی مدت (پون صدی) گزر چکی ہے۔ لیکن آج تک (مولف کے وقت تک) راتوں میں اس میدان سے "مار مار" کی آواز آتی رہتی ہے۔ ایک مرتبہ 997ھ/1584ء میں، میں (مولف منتخب التواریخ) لاہور سے فتح پور جا رہا تھا، اسی میدان سے گزر ہوا۔ چاروں طرف سے "بکش" "بزن" کی آوازیں آنے لگیں، جو لوگ ہمراہ تھے ان کو شبہ ہوا شاید کوئی دشمن حملہ کرنے پہنچ گیا ہے۔

ابراہیم لودی کا قتل

مختصر یہ کہ اس خوں ریز جنگ کے نتیجے میں بابری فوج کو فتح ہوئی، پٹھان شکست کھا کر بھاگے۔ سلطان ابراہیم کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے پیش کیا گیا۔

جس جگہ سلطان ابراہیم قتل ہوا تھا وہاں پانچ چھ ہزار مقتولین کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

بابر دہلی میں

اس فتح کے بعد بابر بادشاہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بابر نے

شاہزادہ محمد مرزا کو بہت سے امراء کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ کیا اور سلطان ابراہیم کا سارا خزانہ جو حد و شمار سے زیادہ تھا، مغل لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔

یہ واقعہ 932ھ/1526ء میں پیش آیا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے۔

''شہید شدن ابراہیم''

سلطان ابراہیم نے نو سال حکومت کی۔ وہ لودی سلطنت کا آخری پٹھان فرمانروا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کی بادشاہت تیموری خاندان کے ہاتھ آ گئی۔

مغلیہ خاندان

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی

پانی پت کی فتح کے بعد مقابلے میں کوئی طاقت نہیں رہی تھی۔ بابر نے 10 دہلی پہنچ کر تخت سلطنت کو اپنے جلوس سے زینت بخشی اور جی کھول کر فیاضی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ اس فتح کے شکرانے میں سمرقند، کاشغر، عراق اور خراسان کے لوگوں کو انعامات روانہ کیے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور اکثر بزرگوں کے مزاروں پر نذریں بھیجیں اور ہندستان کے خزانوں سے بدخشاں اور کابل کے باشندوں کے لیے بھی کافی زر نقد روانہ کیا۔ اس کے لطف وکرم سے سارے ہندستان میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ بابر نے ہندستان کے امراء کی بھی بڑی دل دہی کی لیکن وہ دل وجان سے اس کے مطیع نہیں ہوئے اور قلعوں میں پناہ گزیں رہے۔ چنانچہ سنبھل میں قاسم سنبھلی، بیانہ میں نظام خان، الور میں حسن خان میواتی اور گوالیار میں تاتار خان اور سارنگ خان قلعے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ اٹاوہ میں قطب خان اور کالپی عالم خان کے قبضے میں تھے۔ قنوج اور شمال مشرق کے سارے علاقے پٹھانوں کے قبضے میں تھے انھوں نے بہادر خان کے بیٹے کو سلطان محمد کا لقب دے کر بادشاہ بنا لیا تھا اور

بہار تک کے علاقے پر اسی کا قبضہ تھا۔ نصیر خان لوحانی اور معروف فرملی جیسے امراء نے بھی اس کی اطاعت اختیار کرلی تھی۔ مہابن کے قصبے پر سلطان ابراہیم کے ایک غلام مرغوب نامی نے قبضہ کر رکھا تھا۔

سنبھل پر حملہ

جب یہ امیر سیدھی راہ پر نہیں آئے تو بابر نے ان پر لشکر روانہ کیے اس فوج کشی سے کچھ پٹھان ان کے مطیع ہوگئے۔ فیروز خان، سارنگ خان اور مصطفےٰ فرملی کے بھائی شیخ بایزید نے حاضر ہوکر جاگیر پائی۔

شیخ گھورن بھی دوآبہ کی جمعیت کو لے کر بادشاہ کے حضور میں آگیا۔ یہ شخص ہندستان کا معزز امیر تھا۔ ظرافت اور موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔ بابر نے سنبھل شاہزادہ ہمایوں کی جاگیر میں عطا کیا۔ ہمایوں نے سنبھل پر حملہ کر کے قاسم سنبھلی کو گرفتار کرلیا اور بابر کے حضور بھیج دیا۔ ایک دوسرے لشکر نے بیانہ پر حملہ کر کے نظام خان کا محاصرہ کرلیا۔

اسی سال رانا سانگا نے رنتھنبور کے ایک نواحی قلعے کھندہار پر حملہ کر کے اسے حسن ولد مکھن سے چھین لیا۔ ادھر لوحانی پٹھان پچاس ہزار کی تعداد میں قنوج سے آگے بڑھ کر پیش قدمی کرنے لگے۔ بابر نے ہمایوں کو ان امراء کے ساتھ جو کہ دھولپور میں مقرر تھے پٹھانوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ ہمایوں چلا تو سید مہدی خواجہ اور سلطان مرزا بھی، جو اٹاوہ کی مہم پر لگے ہوئے تھے اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ ہمایوں نے اس یلغار میں تمام شمالی علاقے کو جو کہ جونپور تک شمار کیا جاتا تھا فتح کرلیا۔

رانا سانگا کی جدوجہد

اسی اثناء میں رانا سانگا اور حسن خان میواتی نے باہمی اتفاق سے سلطان محمود کو جو سکندر لودی کی اولاد میں سے تھا، بادشاہ بنا لیا اور ایک بڑا لشکر جمع کر کے لپاور کی طرف سے

پیش قدمی کی اور فتح پور سیکری پہنچ گئے۔

بیانہ کے حاکم نظام خان نے مصالحت و اطاعت کے لیے بابر کے حضور میں بہت سے عریضے روانہ کیے اور سید رفیع الدین صفوی [11] کے وسیلے سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سید صفوی بلخ کے سادات عظام میں سے تھے اور علم حدیث کے بڑے ماہر عالم تھے۔ سکندر لودی کے عہد میں یہ ہندستان آئے تھے۔ ان کو "حضرت مقدسی" کا خطاب ملا تھا۔

جب رانا سانگا نے کھنڈ پار پر قبضہ کیا تھا تو اس طرف کے علاقوں میں ہندوؤں کو بڑی طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کی شورہ پشتی دیکھ کر تاتار خان سارنگ خان نے بھی متعدد عریضے بادشاہ کے پاس بھیجے تھے اور گوالیار کے قلعے کو سپرد کر دینے پر رضامند ہو گیا تھا لیکن جب خواجہ رحیم داد اور شیخ گھورن قلعے کو تحویل میں لینے وہاں پہنچے تو اس کی نیت بدل گئی۔ شاہی امیر شیخ محمد غوث گوالیاری عامل کے ذریعے قلعے میں داخل ہو گئے اور تاتار خان سے جبراً قلعہ چھین لیا۔ تاتار خان کو بادشاہ کے حضور بھیج دیا گیا۔

دھولپور کے قلعے پر محمد زیتون افغان قابض تھا۔ اس نے بھی قلعہ امرائے بابر کے حوالے کر دیا اور خدمت میں حاضر ہو گیا۔ رانا سانگا نے بیانہ کا رخ کیا اور وہاں کچھ دن رکنے کے بعد فتح پور آ گیا، رانا کے مقابلے کے لئے بابر نے بھی تیاری کی اور آگرہ میں جتنی فوج تھی ہمراہ لے کر باہر نکلا۔ ہمایوں کو لکھ بھیجا کہ جونپور پر کسی امیر کو مقرر کر کے جلد رانا سے مقابلے کے لیے آگرہ آ جائے۔ اس اثناء میں ہمایوں خرند اور بہار بھی نصیر خان لوحانی سے چھین چکا تھا۔ اس نے جونپور کی حکومت امیر شاہ حسن اور امیر جنید برلاس کو تفویض کی اور وہاں سے کالپی پہنچ کر عالم خان کو صلح سے یا لڑائی کے ذریعے زیر کر لیا اور وہاں سے تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے باپ کی خدمت میں ہندستان پہنچ گیا۔

اس زمانہ میں خواجہ خاوند [12] نقشبندیؒ جو ایک باکمال بزرگ تھے۔ کابل سے ہندستان آئے۔

رانا سانگا کی شکست

رانا سانگا13 ایک ذرپوک دل لشکر کو لے کر میدان جنگ میں آیا تھا۔ بابر کے پاس اس کے مقابلے میں بہت مختصر فوج تھی۔ اس کے امیروں نے رائے دی کہ آگرہ کے قلعے میں کچھ چھوڑ کر بادشاہ پنجاب چلا جائے اور دیکھے غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بابر نے اس بزدلانہ مشورے کو قبول نہ کیا اور جان لڑا دینے کا عزم کیا۔ اس کے حوصلے کو دیکھ کر امرا نے بھی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جنگ میں لڑ کر جان دے دینے یا دشمن پر فتح حاصل کرنے کا حلف اٹھایا۔ جب رانا کی فوج سے مقابلہ ہوا تو امراء نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ آخر ایک گھمسان لڑائی کے بعد اللہ نے بابر کو فتح دی۔ حسن خان میواتی پیشانی پر تیر لگنے سے گر کر مر گیا۔ اس کی لاش لوگوں نے ایک کنویں میں ڈال دی۔ اس کے گرتے ہی باقی ساری فوج بھاگ نکلی۔

نقلی حسن خان

سلیم شاہ کی وفات کے بعد 960ھ/1552ء، دسمبر، میں ایک میواتی نے جو بلند قد اور تنومند جسم والا تھا۔ حسن خان ہونے کا دعویٰ کیا اور میواتیوں کو خاص علامتیں بتائیں جس سے بہتوں کو اس پر یقین آ گیا تھا۔ 965ھ/1557ء میں، میں نے بھی (مؤلف منتخب التواریخ) اسے آگرے میں اُسے دیکھا ہے۔ اس کے چہرے سے تو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی سردار ہے بلکہ وہ بدشکل گنوار معلوم ہوتا تھا۔ خان خاناں بیرم خان کہا کرتے تھے کہ حسن خان بڑے رعب داب کا آدمی اور شاعر بھی تھا۔ اس کے شعر بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ یہ شخص بہر حال کسی صورت میں بھی حسن خان نہیں تھا۔ اس کو چند دن بعد میواتی خان زادوں نے غیرت کے مارے قتل کر دیا۔

بابر کی وفات

رانا سانگا پر فتح پانے کے بعد بابر[14] بیمار ہوگیا اور بیماری کچھ اس طرح اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی کہ جان لے کر ہی ٹلی۔ بابر نے 937ھ/1530ء میں اس عالم فانی سے کوچ کیا۔ اس کی عمر 50 سال تھی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ تخت نشین ہوا تھا اور ماوراء النہر، بدخشان، کابل، کاشغر اور ہندستان میں اس کی سلطنت کی کل مدت 38 سال ہے۔

بابر کی تاریخ وفات ہے:

تاریخ وفات شاہ بابر
درنہ صد وسی وھشت بودہ

لفظ ''شش شوال'' بھی اس کی وفات[15] کا مادہ تاریخ ہے۔

عہد بابری کے علماء

بابر کے وقت کے ممتاز عالم شیخ زین خان[16] تھے۔ جنھوں نے ''تاریخ واقعات بابری'' کا جو خود بابر بادشاہ نے لکھی تھی بڑی عمدہ زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ اشعار انہی کے ہیں:

آرمیدی بہ رقیبان ورمیدی ازما
ماچہ کردیم وچہ دیدی وچہ شنیدی ازما
بہر دل بردن ماحاجت بیداد نبود
ی سپردیم اگری طلبیدی ازما

ایک دوسرے فاضل مولانا بقائی تھے۔ انھوں نے مخزن کی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ ایک اور عالم مولانا شہاب الدین معمائی تھے۔ معمے کے فن میں ان کو ایسی مہارت تھی کہ ان

کے سامنے ان کے دوسرے اوصاف وکمال لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"اِن ربکم الذی خلق السموٰت والارض فی ستت ایام"

اور یہ حدیث صحیح ہے کہ دنیا کی پیدائش سات دن میں ہوئی۔ اس کو رفع کیا تھا۔ مولانا شہاب الدین نے ان کی تقریر کو رد کر کے حدیث اور آیت کی، مطابقت میں کئی ایک عمدہ وجہیں لکھی تھیں۔ اس رسالہ پر اکثر علماء نے تقریظیں لکھی تھیں۔ میں نے (مؤلف منتخب التواریخ) بھی نظم ونثر میں تھوڑا بہت لکھا تھا۔

ہمایوں بادشاہ 942ھ/1535ء میں جب گجرات کے سفر سے واپس ہوا تو اس وقت شہاب الدین انتقال فرما گئے تھے۔ ان کی وفات کا مادہ تاریخ میر آخوند مورخ نے کہا تھا جو: "شہاب ثاقب" ہے۔

بابر کی علم دوستی

بابر خود بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کی خاص ایجاد "خط بابری" ہے۔ اس خط میں قرآن لکھ کر اس نے مکہ معظمہ روانہ کیا تھا۔ اس کے ترکی اور فارسی اشعار کا ایک دیوان بھی مشہور ہے۔ بابر نے ایک کتاب "فقہ مبیَّن" 17 (ب اور ی پر زبر) فقہ حنفی میں لکھی تھی، اس کی شرح شیخ زین نے شرح مبین کے نام سے لکھی ہے۔ فن عروض میں بھی بابر کے رسالے مشہور ہیں۔

نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ

والد کے مرنے کی خبر ملتے ہی ہمایوں سنبھل سے کوچ کر کے دارالخلافہ پہنچا وکیل سلطنت اور وزیر مطلق امیر خلیفہ کے مشورے وحمایت سے 937ھ/1530ء میں تخت نشین ہوا۔

شاعر نے اس کے جلوس کی تاریخ لکھی ہے۔

محمد ہمایون شاہ نیک بخت
کہ خیرالملوک است اندر سلوک
چو بر مسند بادشاہی نشست
شدش سال تاریخ "خیرالملوک"

اس نے تخت نشینی کے موقعے پر سونے سے بھرا طشت لوگوں میں تقسیم کرایا۔ اس لیے کسی نے اس کی تاریخ جلوس "کشتی زر" بھی نکالی ہے۔

ہمایوں کی لشکر کشی

سلطنت کے نظم ونسق سے فراغت پا کر ہمایوں نے کالنجر پر فوج کشی کی اور اسے فتح کرلیا۔ جونپور میں سکندر لودی کے بیٹے سلطان عالم نے بغاوت کردی تھی، اس پر بھی حملہ کرکے اس فتنے کو ختم کیا۔

ان فتوحات کے بعد آگرہ واپس آکر بادشاہ نے ایک بڑے جشن کا انعقاد کیا۔ اس جشن میں بارہ ہزار آدمیوں کو خلعتیں عطا کی گئیں۔ اسی زمانے میں زمان میرزا جو کچھ عرصے سے باغی ہوگیا تھا گرفتار ہوکر آیا۔

ہمایوں نے اسے بیانہ کے قلعے میں بھیج کر اندھا کردینے کا حکم دیا تھا لیکن حسن اتفاق سے اس کی بینائی سلامت رہی اور کچھ دن بعد وہ قید سے بھاگ کر گجرات کے بادشاہ سلطان بہادر گجراتی کے پاس پناہ گزیں ہوگیا۔

سلطان بہادر گجراتی

جس وقت محمد زماں مرزا سلطان بہادر گجراتی کے یہاں گیا وہ چتوڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ موسم نہایت ہی گرم تھا، گرمی سے محمد زمان کو اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ طبیبوں نے صرف گلقند علاج میں تجویز کیا۔ مرزا نے سلطان بہادر کے پاس سے تھوڑا سا گلقند

منگوایا۔ سلطان نے اپنے شربت دار کو بلا کر پوچھا لشکر کے ساتھ کتنا گلقند ہے؟ اس نے عرض کیا "بیس سے زیادہ چھکڑے گلقند سے بھرے ہوئے موجود ہیں۔ سلطان نے وہ سارے چھکڑے محمد زمان کے پاس بھجوا دیے اور معذرت بھی کی کہ سفر کی حالت میں لشکر کے ساتھ فقط اتنا ہی گلقند موجود تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سلطان بہادر کے لیے گلقند کا عرق کشید کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس قدر گلقند ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

اسی دوران محمد زماں میرزا کے دونوں بیٹوں الغ مرزا اور شاہ مرزا نے حملے کر کے قنوج میں فساد برپا کر دیا۔ ہمایوں نے کئی بار محمد زمان مرزا کو روانہ کرنے کے لیے سلطان بہادر کو خط لکھے لیکن اس نے ہمیشہ دوٹوک جواب بھیج دیا۔ اس کی اس گستاخی پر ہمایوں نے گجرات پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس زمانے میں سلطان بہادر نے رانا سانگا کے خلاف لشکر کشی کر کے چتوڑ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس کی طرف سے تاتار خان لودی نے حملہ کر کے بیانہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور آگرے تک چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ تاتار خان نے تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ مرزا ہندال پر حملہ کیا اسی لڑائی میں تاتار خان مارا گیا۔

جس زمانے میں سلطان بہادر نے چتوڑ کا دوسری مرتبہ محاصرہ کیا تھا اسی وقت ہمایوں نے آگرے سے گجرات کا عزم کیا۔ اسی زمانے میں لاہور سے مرزا کامران نے قندھار پر حملہ کر کے شاہ طہماسپ کے بھائی سام مرزا کو جس نے ان دنوں خواجہ کلاں بیگ کا محاصرہ کر رکھا تھا شکست دی۔ اس فتح کی تاریخ ہے:

"زرہ بادشہ کامران سام را"

سلطان بہادر سے مقابلہ

ہمایوں نے گجرات پر حملے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ یہ سوچ کر سارنگ پور میں رک گیا کہ ایسے وقت میں جبکہ دشمن چتوڑ کے محاصرے میں لگا ہوا ہے اس پر فوج کشی کر کے

اس محاصرہ سے ہٹا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لینا شیوۂ مردانگی نہیں بلکہ باعث رسوائی ہے۔

سلطان بہادر نے بھی جلد از جلد قلعہ چتوڑ کو فتح کر لیا اور اس مہم سے فارغ ہو کر ہمایوں کے مقابلے کی تیاری کی۔ مندسور کے علاقے میں فریقین کے درمیان دو ماہ تک جنگ کی سی حالت رہی۔ اسی دوران سلطان بہادر کے لشکر میں غلہ کی رسد بند ہو گئی۔ اس کے سپاہی اور مویشی بھوک کے مارے مرنے لگے۔ مجبور ہو کر سلطان بہادر اپنے پانچ معتمد ساتھیوں کے ساتھ خیمہ گاہ کے پیچھے سے نکل کر مندسور بھاگ گیا۔

ہمایوں نے بہادر کا پیچھا کیا۔ ایک دن تو مغل لشکریوں نے اسے سوتے ہوئے گھیر لیا لیکن وہ جاگ کر نہایت پھرتی کے ساتھ ان کے قبضے سے نکل گیا اور چھ سات سواروں کے ہمراہ گجرات بھاگ گیا۔ البتہ سلطان عالم لودی پکڑا گیا اور اس کے پاؤں کے جوڑ کاٹ دیے گئے۔

ہمایوں سلطان بہادر کا پیچھا کرتا ہوا احمد آباد پہنچ گیا اور اس شہر کو خوب لوٹا۔ سلطان بہادر احمد آباد سے بھاگ کر کھمبایت اور وہاں سے بندر دیپ کی طرف نکل گیا۔ اس یلغار میں قلعہ چپانیر پر بھی ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس قلعے سے بادشاہ کو بڑا خزانہ غنیمت میں ملا۔

مرزا عسکری کی سرکشی

سلطان بہادر گجراتی نے دوبارہ سورت کے زمینداروں کو اپنے ساتھ لے کر احمد آباد پر قبضے کا ارادہ کیا تھا۔ ہمایوں احمد آباد، مرزا عسکری کے حوالے کر کے برہانپور چلا گیا تھا۔ ہمایوں کے جاتے ہی مرزا عسکری نے امیر ہندو بیگ قوچین کی تائید و حمایت سے چاہا تھا کہ اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر بادشاہت کا اعلان کر دے لیکن بہادر خان کی سرکشی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوا اور وہ بہادر خان سے کچھ مقابلہ کر کے چپانیر کی طرف چلا گیا۔

چپانیر کے حاکم تردی بیگ کو جب مرزا عسکری کے ارادوں کا پتہ چلا تو وہ قلعے میں بند ہو گیا اور عسکری کو داخل نہیں ہونے دیا اور ایک عریضہ بھیج کر ہمایوں کو عسکری کے باغیانہ خیالات کی اطلاع دی۔ جس وقت ہمایوں مندو سے آگرے کی طرف جا رہا تھا، میرزا عسکری

ہر طرف سے مایوس ہو کر خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا اور سلطان بہادر نے تردی بیگ سے صلح کر کے چپانیر پر قبضہ کر لیا۔

اسی سال جمالی کنبوہ 18 کی وفات ہوئی۔ ان کا مادہ تاریخ ہے: ''خسرو هند بوده'' 942ھ/1535ء

طہماسپ کا حملہ

اسی سال سام مرزا کا بدلہ لینے کے لیے عراق سے شاہ طہماسپ 19 قندھار پہنچا۔ خواجہ کلاں بیگ نے شہر خالی کر دیا اور اس حال میں وہاں سے نکلا کہ دیوان خانہ جو عمدہ فرش اور مجلسی ساز و سامان سے آراستہ تھا اسی طرح سجا پڑا تھا۔ شاہ طہماسپ نے اسی سال دیوان خانہ میں اپنی نشست رکھی اور خواجہ بیگ کی بڑی تعریف کی کہ کامران مرزا نے نوکر بہت اچھا رکھا ہے۔ پھر وہ اپنے ایک امیر بدرغ خان کو قندھار پر مقرر کر کے عراق واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی کے بعد کامران مرزا نے قندھار پر حملہ کر کے دوبارہ اسے فتح کر لیا۔

سلطان بہادر چھنی ہوئی حکومت واپس لینے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس نے محمد زمان مرزا کو فتنہ و فساد برپا کرنے کے لیے ہندستان بھیج دیا تھا۔ جس وقت مرزا کامران لاہور سے رخصت ہوا تو اس نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ جب بادشاہ کے لوٹنے کی خبر ملی تو محاصرہ اٹھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔

شیر خان کا فتنہ

باوجود اس کے کہ اطراف و اکناف سے کئی ایک فتنے کھڑے ہوئے تھے۔ ہمایوں نے آگرے سے حرکت نہ کی۔ ہمایوں کی اس لاپروائی سے شیر خان افغان سوری نے پورا فائدہ اٹھایا اور گوڑ، بہار، جونپور، اور قلعہ چنار پر قبضہ کر لیا اور اس کی طاقت کافی بڑھ گئی۔

شیر خان کے بڑھتے ہوئے اثرات سے گھبرا کر آخر کار ہمایوں نے آگرہ سے کوچ کیا

اور 14 صفر 943ھ/1536ء کو چنار کے قلعے سے باہر کیمپ لگا دیا۔ یہاں شاہی لشکر سے شیر شاہ کے بیٹے جلال خان نے جو اسلام شاہ کے خطاب سے شیر شاہ کا جانشین بنا تھا مقابلہ کیا، لیکن مغل لشکر کے ماہر فن آتش باز رومی خان کی تدبیروں سے چنار کا قلعہ جلد ہی فتح ہو گیا۔

یہ رومی خان وہی شخص ہے جس کے نام کو سلطان بہادر نے ایک معمہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

حیف باشد نام آن سگ برزبان
تیغ درجانش نہ و نامش بخوان

چنار سے شکست کھا کر جلال خان دریا کے راستے بھاگ گیا اور شیر شاہ کے لشکر سے جو اُن دنوں حاکم بنگالہ نصیب شاہ سے لڑ رہا تھا، جا کر مل گیا۔ نصیب خان کو شیر خان کے مقابلے میں شکست ہوئی اور وہ زخمی ہو کر ہمایوں کے پاس چلا آیا۔

بنگال پر فوج کشی

اسی زمانے میں ہمایوں نے ہندو بیگ قوچین کو امیر الامراء کا عہدہ دے کر جونپور کی حکومت پر مامور کیا اور اسے ایک زریں کرسی بھی عطا کی۔ خود لشکر لے کر بنگال کی طرف کوچ کیا۔ یہاں ہمایوں نے بہار اور بنگال کے درمیان گڑھی کی تنگ وادی کو عبور کیا۔ اس گھاٹی پر شیر خان کے لشکر نے بڑی مستحکم ناکے بندی کر رکھی تھی۔

ہمایوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی شیر خان نے جھار کھنڈ کے راستے یلغار کی اور قلعہ رہتاس پر پہنچ کر وہاں کے راجہ کو پیغام بھیجا۔ "میں اپنی عورتوں وغیرہ کو آپ کے اس مضبوط اور محفوظ قلعے میں چھوڑ جانا چاہتا ہوں"۔ رہتاس کے راجہ نے اس لالچ میں کہ شیر خان کی عورتیں اور بہت سا سامان واسباب مفت میں ہاتھ آ رہا ہے رضامندی ظاہر کر دی اور قلعے

کا دروازہ کھول دیا۔ شیر شاہ نے پردہ دار ڈولوں میں دو ہزار سپاہیوں کو بٹھا کر قلعے میں بھیج دیا۔ جب ڈولے رکھے گئے تو بجائے عورتوں کے سفاک سپاہی تلواریں سونت کر نکل آئے اور تمام قلعے والوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ اس تدبیر سے شیر شاہ نے رہتاس کے قلعے پر بہ آسانی قبضہ کر لیا۔

جنت آباد میں قیام

ہمایوں کو بنگال کی آب و ہوا بہت پسند آئی۔ اس نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھ دیا اور دو تین ماہ اسی جگہ ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے واپسی کے ارادے سے کوچ کیا۔ اس مہلت میں شیر خان نے کافی جمعیت اکٹھی کر لی تھی۔ جب ہمایوں لوٹنے لگا تو شیر شاہ نے اسے عرضی لکھی کہ: ”تمام پٹھان آپ کے فرمان بردار اور غلام رہنا چاہتے ہیں اور جاگیروں کے طلبگار ہیں، اگر حضور سے ان کو جاگیریں مل جائیں تو امن وچین سے رہیں گے ورنہ بھوک کے مارے ان کے سرکش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اب تک میں حسن وتدبیر سے ان کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں، آئندہ حضور کی مرضی پر ہی سارا انحصار ہے۔“

ہمایوں اس عریضہ کو دیکھ کر اس کے اصل منشا سے واقف ہو گیا لیکن اس وقت اس کی توجہ اور ہی معاملات پر لگی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو لشکر کا ساز وسامان درست کرانا تھا کیونکہ ان مسلسل طویل اسفار میں سارا سامان خرچ ہو چکا تھا۔ اکثر گھوڑے اور اونٹ مر چکے تھے، دوسری طرف دہلی سے برابر محمد سلطان مرزا، الغ مرزا اور شاہ مرزا کی فتنہ انگیزیوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ ان باغیوں کی خبر لینے کے لیے بادشاہ نے مرزا ہندال کو جو مونگیر تک ہم رکاب تھا مقرر کیا اور اسے رخصت کیا لیکن وہ اس مہم کے بہانے آگرے جا کر بیٹھ گیا تھا۔

سلطان بہادر کو فرنگیوں نے دھوکے سے سمندر میں غرق کر دیا اور محمد زمان مرزا بے یار و مددگار رہ گیا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو وہ ہمایوں کی پناہ میں آ گیا۔

945ھ/1538ء میں مرزا ہندال نے شیخ محمد غوث 20 گوالیاری کے بڑے بھائی شیخ بہلول کو قتل کر دیا۔ شیخ بہلول صاحب فضل اور مشہور عالم تھے بادشاہ بھی ان سے بڑی

عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی تاریخ شہادت: ''قدمات شہیدا'' ہے۔

مرزا ہندال کی بغاوت

اسی سال مرزا ہندال نے آگرے میں خود مختاری اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ ہمایوں نے جہانگیر بیگ مغل کو پانچ ہزار سپاہی دے کر بنگال کی حکومت عطا کی اور اسے حسب ضرورت اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس انتظام کے بعد ہمایوں نے آگرہ کا رخ کیا۔ اس وقت شاہی لشکر کی حالت بہت خستہ وخراب تھی، ہمایوں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے اسی بے سروسامانی کی حالت میں گنگا کے کنارے ایک قصبہ چوسہ 21 نامی مقام پر پہنچ گیا۔ اسی جگہ جونپور اور چنار کے امیر، بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شیر خان کا حملہ

شیر خان کو شاہی لشکر کی بے سروسامانی کی پوری اطلاع تھی اور وہ برابر تاک میں لگا ہوا تھا۔ چوسہ میں جب ہمایوں رُکا تو اس نے آگے بڑھ کر شاہی فوج کا راستہ روک لیا۔ گنگا کی شاخ برسات کے پانی سے لبریز چل رہی تھی۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر فریقین مورچے جمائے ہوئے تھے تین ماہ تک برابر دونوں لشکروں میں لڑائی ہوتی رہی۔

حواشی

1. ستی: ہندو عورتیں اپنی عزت وقار اور پاکی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے شوہر کے مرجانے یا شہید ہوجانے پر چتا میں جل کر اپنی جان نچھاور کردیا کرتی تھیں کبھی کبھی اپنے شوہر کے میدان جنگ میں جانے سے پہلے بھی ستی ہوجایا کرتی تھیں۔
2. سرہند: مولف اکبر نامہ اور آئین اکبری ابوالفضل اپنی معتبر تصنیف آئین اکبری میں تحریر کرتا ہے کہ یہ صوبہ دہلی کے ماتحت تھا۔ اس وقت اس سرکار کے تحت 31 محال اور پرگنے تھے۔ یہ شہر پٹیالہ، لدھیانہ اور انبالہ (پنجاب) کے درمیان راجپورہ سے 16 میل کے فاصلے پر تھا۔ آخری مغل عہد میں سکھوں نے اسے لوٹ کر تباہ کردیا تھا۔
3. مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ علاء الدین شاہ محمد مبارک شاہ کا لڑکا نہیں تھا بلکہ فرید خان بن خضر خان کا بیٹا تھا۔
4. بہلول لودی: یہ شخص سلطان شاہ لودی کا بھتیجہ اور شاہوخیل قبیلہ کا رکن تھا۔ سلطان کا باپ قلوت سے ملتان آکر تجارت کرنے لگا یہ سلطان محمود کا زمانہ تھا۔ سلطان شاہ نے خضر خان کی ملازمت اختیار کی۔ سرہند جاگیر اور اسلام خان کا خطاب

ملا۔ سلطان شاہ لودی کے بھتیجے کا لڑکا بہلول ملتان میں پیدا ہوا تھا، اس کی ماں حاملہ تھی کہ مکان کی چھت گرنے سے مرگئی۔ مردہ ماں کا پیٹ چاک کر کے اسے نکالا گیا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں سے ایک درویش نے کہا کہ کون سا شخص دہلی کا تخت اتنی رقم کے عوض خریدنے کو تیار ہے؟ سب ہنسنے لگے لیکن بہلول نے خوشی سے اتنی رقم درویش کو دے دی۔ کہتے ہیں کہ اس فقیر کی دعا سے وہ اس مرتبے پر پہنچا۔

5 افغان: یہ قوم ہمیشہ سے وحشی اور اجڈ رہی ہے۔ لودی قوم کے لوگ افغان ہونے سے انکار کرتے رہے اور خود کو شاہ عجم ضحاک تازی کے نسب سے جوڑتے رہے ہیں۔ محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ اپنی تصنیف تاریخ فرشتہ میں اس قوم کے متعلق یوں لکھتا ہے: 22ھ/642ء میں حضرت عثمان کے زمانے میں فارس کے مرتدوں کی سرکوبی کے لیے عبداللہ بن عامر نے فوج کشی کی۔ حجاج بن یوسف کے وقت میں کابل کا حاکم خالد بن عبداللہ تھے جنھیں یوسف نے معزول کر دیا اور وہ ملتان اور پشاور کے درمیان کوہ سلیمان پر جا کر بس گئے اور وہاں کے ایک پٹھان سردار کے نکاح میں اپنی لڑکی دے دی۔ اس سے دو لڑکے ہوئے ایک لودی اور دوسرا سور لودی اور سوری قوم انہی دو کی اولادیں ہیں''

مطلع الانوار کے مصنف نے ان کی نسل کا ایک اور سلسلہ بتایا ہے جسے فرشتہ نے بھی نقل کیا ہے۔ جب نیل ندی میں فرعون غرق ہوا تو قبطیوں کی ایک جماعت جلاوطن ہو کر کوہ سلیمان میں آ کر بس گئی اور یہاں کا قبیلہ افغان کہلایا۔ فرشتہ کے ایک اور بیان کے مطابق ''جب یہ قوم ہندستان میں پہنچنے کے بعد پٹنہ میں جا کر مقیم ہوئی تو ان کا نام پٹھان پڑ گیا۔

فرشتہ کا ہم عصر مورخ خواجہ نعمت اللہ بن خواجہ حبیب اللہ مصنف ''تاریخ مخزن افغانی'' جس نے 1018ھ/1609ء یعنی جہانگیری عہد میں خان جہان لودی کی سفارش پر فرزندی کا خطاب حاصل کیا تھا وہ اس کو قبطی کے بجائے بنی

اسرائیلی ثابت کرتا ہے اور اس کے بیان کے مطابق: ''جس وقت بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کردیا تو بنی اسرائیل کی ایک شاخ جلاوطن ہوکر کوہ سلیمان میں آکر بس گئی۔ ان کی زبان سریانی تھی۔ کوہ وصحرا کے قیام سے بدلتے بدلتے پشتون بن گئی'' اور مصنف یہی ان کی وجہ تسمیہ بتاتا ہے کہ فتح مکہ کے دن قیس بن عبدالرشید کی بہادری پر خوش ہوکر حضور اکرمؐ نے اسے'' جہاز کی بنیادی لکڑی'' یعنی ''بتان'' کہا تھا۔ اور یہی لفظ بتان سے پٹھان ہوگیا۔ انھیں قیس بن عبدالرشید کے بیٹوں سربنی، بتنی، غرغشتی اور کرالی کے خاندان سے پٹھانوں کے مختلف قبیلوں کا تعلق ہے۔

6 شیخ سماء الدین سہروردیؒ: یہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے پوتے سید کبیرالدین اسمٰعیل کے خلیفہ تھے، علوم ظاہری و باطنی دونوں پر عبور حاصل تھا۔ بیانہ میں عرصے تک مقیم رہے پھر دہلی آکر متوطن ہوئے، آخری عمر میں نابینا ہوگئے تھے مگر بغیر علاج ہی ان کی بصارت لوٹ آئی۔ ''مفتاح الاسرار'' ان کی تصنیف ہے۔ شیخ فخرالدین عراقی کی ''لمعات'' پر بڑے عمدہ حواشی لکھے ہیں۔ سلطان بہلول اور سکندر، شیخ کے معتقد تھے، سکندر کے زمانے میں 17/ جمادی الاولی 901 ھ/1495ء میں آپؒ نے وصال فرمایا۔ ان کی کرامات بڑی مشہور ہیں۔

7 ابوالفضل نے اپنی تصنیف آئین اکبری میں دھولپور کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ '' آگرے کا تحت ایک محال تھا اور دریائے چنبل کے کنارے واقع تھا''۔ راجہ دھولن نے اس شہر کو گیارہویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔ 1501ء میں سلطان سکندر لودی نے اس پر قبضہ کرلیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں ہمایوں نے چنبل کے سیلاب سے حفاظت کی خاطر آبادی کو شمال کی طرف منتقل کردیا۔ شہر سے باہر مسجدوں، سراؤں اور مقبروں کے آثار اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ صادق محمد خان کا مقبرہ قدیم صناعی کا نمونہ ہے یہ اکبر کے عہد کا جرنیل تھا اور 1597ء میں فوت ہوا۔ دھولپور کا حکمراں خاندان بروليا گوت کے جاٹ ہیں جو پہلے گوہد

کے رانا کہلاتے تھے، گوالیار بھی ان کے ماتحت تھا۔ مرہٹوں نے اس ریاست کو ختم کردیا تھا۔

8 فرشتہ نے شاہ نعمت اللہ ولی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی دعا و برکت سے دکن کے فیروز شاہ بہمنی کے خان خانان احمد کو فیروز شاہ کی سلطنت نصیب ہوئی۔ موصوف نے ان کی تاریخ وفات 834ھ/1430ء بمقام کوہ بیگی ودستور لکھی ہے۔ لیکن بدایونی نے جس بزرگ کا نام لکھا ہے وہ سید نعمت اللہ حسینیؒ ہے اور 915ھ/1509ء میں سلطان سکندر کی ان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یا تو ناموں یا تاریخوں کے درمیان غلطیاں ہیں یا دونوں مختلف بزرگ ہیں۔ کیونکہ نعمت اللہ ولی قادریہ سلسلہ کے بزرگ تھے اور حضرت غوث اعظمؒ کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔

9 مولانا جامی: ان کا لقب عمادالدین اور نورالدین ہیں۔ نام عبدالرحمٰن احمد جام ژندہ پیل کی نسبت سے جامی تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام نظام الدین اور دادا کا شمس الدین تھا۔ سلسلہ نسب امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد شیبانی سے ملتا ہے آپ کی 99 تصانیف ہیں۔

10 تاتاری مغلوں نے اپنے وطن سے نکل کر (1210ء) ماوراء النہر ایران اور خراسان اور ایشیا کے تقریباً ایک تہائی حصے پر قبضہ کرلیا۔ چنگیز خان اور ہلاکو کی تلوار نے عرب وعجم کے بیشتر ملکوں کو فتح کرلیا۔ ان کے بعد امیر تیمور نے دریائے ڈلگا سے گنگا کے کنارے تک مغل فتوحات کی دھاک بٹھائی (1398ء) تیمور کے مرنے کے بعد اس عظیم الشان سلطنت کے تمام اجزاء پریشان ہوگئے اور جگہ جگہ خود مختار مغل حکمرانوں نے اپنی اپنی بادشاہت قائم کرلی۔ بابر کی پیدائش کے وقت سمرقند پر بابر کا ایک چچا سلطان احمد مرزا حاکم تھا۔ بدخشاں، قندز، ترمذ اور حصار پر سلطان محمود مرزا کی حکومت تھی۔ کابل اور غزنی پر الغ بیگ مرزا قابض تھا۔ تاشقند اور شاہرخیہ پر بابر کا ماموں سلطان محمود خان حکمران تھا۔

خراسان پر سلطان حسین مرزا کی فرمانروائی تھی۔ ولایت فرغانہ پر بابر کا باپ عمر شیخ مرزا حاکم تھا۔ عمر شیخ مرزا سلطان ابوسعید مرزا کا بیٹا تھا اور ابوسعید امیر تیمور کے بیٹے میران شاہ کا پوتا تھا۔ عمر شیخ مرزا کی اپنے بھائیوں اور سسرال والوں سے ہمیشہ لڑائی رہی۔ اس کی وفات 4 رمضان 899ھ/1493ء کو اخسی کے قلعے میں ہوئی۔

بابر کی ماں قتلغ نگار خانم، یونس خان مغل کی بیٹی تھی۔ یونس خان چنگیز خان کی اولاد میں سے تھا۔ اس طرح بابر کی رگوں میں تیمور اور چنگیز دو اولوالعزم فاتحین کا خون بہہ رہا تھا۔ بابر نے اپنی تصنیف تزک میں اپنی ماں کے متعلق لکھا ہے۔ "اکثر معرکوں اور لڑائیوں میں میری ماں ساتھ دیتی تھی۔ اس کا انتقال 911ھ/1505ء میں کابل میں ہوا۔ بابر فرغانہ کا رہنے والا تھا۔ جو ترکستان کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اس کے قصبوں میں اوش جہاں کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ بابر 6 محرم 888ھ/1484ء کو پیدا ہوا۔

شاعر جامی لکھتا ہے:

اندرشش محرم زاد آں شہ مکرم
تاریخ مولدش ہم آمد شش محرم

بابر 5 برس کی عمر میں اپنے چچا سلطان مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا اور اس کی شادی چچا کی لڑکی عائشہ سلطان بیگم سے ہوگئی۔ بابر کی تعلیم و تربیت قاضی عبداللہ خواجہ مولانا کے سپرد ہوئی۔ یہ بزرگ شیخ الاسلام برہان الدین کی اولاد میں سے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں بابر شیخ فرید کے زیر سایہ حکومت کے کام کاج میں داخل ہوا۔ اسی سال سلطان احمد مرزا اور بابر کے ماموں سلطان محمود خان نے مل کر فرغانہ پر حملہ کیا نیز عمر شیخ مرزا کا انتقال اسی دوران ہوا۔ بابر 5 رمضان 899ھ/1493ء میں بارہ سال کی عمر میں قلعہ فرغانہ میں تخت نشین ہوا۔ سولہ سال کی

عمر میں اس نے شوال 901 ھ/1495ء میں سمرقند پر حملہ کیا لیکن برف باری کی وجہ سے لوٹ آیا۔ 902 ھ/1496ء میں دوبارہ سمرقند پر حملہ کیا اور بایسنغر مرزا اور شیبانی خان کو شکست دے کر سمرقند پر قبضہ کر لیا۔ پھر سمرقند پر سلطان علی مرزا نے قبضہ کر لیا اور بابر صحرانوردی میں یہاں سے وہاں دوڑتا رہا پھر وہ ترمذ پہنچا اور دو تین سو آدمی ساتھ لے کر کابل پر حملہ کر دیا۔ اس وقت کابل پر سلطان حسین مرزا کی حاکم ارغون خان کی حکومت تھی۔ بابر نے اس کے بھائی مقیم خان کو شکست دے کر کابل پر قبضہ کر لیا اور شیبانی خان کے قتل کے بعد بابر نے تیسری مرتبہ سمرقند و بخارا کو فتح کیا لیکن آٹھ ماہ بعد ہی ازبکوں نے اسے شکست دے کر وہاں سے نکال دیا۔ بابر نے افغانستان پر صبر کر لیا اور بادشاہ کا لقب اختیار کر کے سلطان بن گیا۔ تیموری خاندان میں بادشاہ کا لقب پہلی مرتبہ بابر نے ہی رکھا۔ اب تک تیموری اولاد مرزا کہلاتی تھی۔ بابر 932 ھ/1525ء میں نومبر، والے حملے سے پہلے بھی چار حملے پنجاب پر کر چکا تھا۔ جس وقت بابر نے ہندستان پر حملہ کیا اس وقت لودی خاندان کی حکومت پنجاب سے بہار تک تھی۔ دکن میں بہمنی سلطنت مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ گجرات کی بادشاہت 175 برس کے اقتدار کے بعد دم توڑ رہی تھی۔ مالوہ کی خودمختار حکومت جس کا دارالخلافہ مندو (اندور) تھا رانا سانگا کے حملوں سے دم توڑ رہا تھا۔ بنگال میں ایک خاندان الگ خودمختار بادشاہی کر رہا تھا۔ ہندوؤں میں چتوڑ کا راجہ رانا سانگا اور بیجے نگر کا راجہ مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے حتی الامکان کوشش کر رہے تھے۔

1 ق یہ بزرگ میر معین الدین مصنف "تفسیر معین" کی اولاد میں سے تھے۔ سالہا سال مدینہ منورہ میں مجاوری کی اور مولانا جلال الدین دوانی سے علم حدیث و تفسیر حاصل کیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سلیم شاہ کے عہد میں شیخ علائی مہدوی سے 954 ھ/1548ء میں مناظرہ کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں 954ھ/1548ء میں ان کا انتقال ہوا اور بعض 957 ھ/1551ء بتاتے ہیں خیر جو بھی ہو۔ یہ سلیم شاہ

پسر شیر شاہ کا عہد تھا" ان کا مزار اکبر آباد میں آصف جاہ کی حویلی میں واقع ہے۔
(بحوالہ مخبر الواصلین)

12 خواجہ خاوند نقشبندیؒ ۔ سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے بزرگ ہیں والد کی طرف سے خواجہ علاء الدین عطار سے ان کا نسب ملتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں سلسلہ طریقت اختیار کیا اور بخارا سے سیاحت کے لیے نکلے اور کابل پہنچے، وہاں سے کشمیر گئے۔ ایک عرصے تک وہاں مقیم رہے کشمیر سے ہندوستان آ کر لاہور، دہلی اور اکبر آباد میں قیام کیا۔ شاہ جہاں کے عہد تک زندہ تھے۔

13 رانا سانگا میواڑ کے راجاؤں میں اکیاون واں راجہ تھا جو 1509ء میں چتوڑ کے تخت پر بیٹھا تھا۔

14 بابر کس مرض میں گرفتار ہوا۔ نہ تو فرشتہ نے لکھا ہے نہ کسی اور مورخ کی تصنیف میں نظر سے گزرتا ہے۔ البتہ بابر آگرہ میں 936ھ/1529ء میں بیمار پڑا تھا۔

15 بابر کی وفات بروز پیر 5 جمادی الاولی/ 937ھ/ 1530ء میں ہوئی۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی لاش کابل میں دفن کی جائے۔ اس لیے چند دن میت "نور افشاں باغ" جسے اب آگرہ میں آرام باغ کہتے ہیں میں امانتاً رہی۔ پھر کابل لے جا کر "قدم گاہ رسول" میں دفن کیا گیا۔ شاہ جہاں نے قبر پر سنگ مرمر کا مقبرہ تیار کرایا تھا۔

16 ان کا پورا نام شیخ زین الدین خوافی خان تھا اور تخلص وفائی تھا۔ آگرہ میں جمنا کے دوسری طرف ان کی یادگار ایک مدرسہ اور مسجد ہے۔ فن معمہ، تاریخ گوئی، بدیہہ گوئی اور نظم و نثر کی تمام اصناف میں بے مثل عالم تھے۔ ان کا انتقال چنار گڑھ کی حدود میں 940ھ/1533ء میں ہوا اور آگرے میں اپنے ہی مدرسے میں دفن ہوئے۔

17 فتح مبین، فرشتہ نے بابر کی اس کتاب کا نام "مثنوی مبین" لکھا ہے۔ ممکن ہے پورا نام مثنوی فتح مبین ہو کیونکہ یہ کتاب ترکی نظم میں تھی اور فقہ کے موضوع پر

تھی۔ بابر کی فقہ حنفی میں مہارت کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے۔ ''وہ مجتہدانہ قوت رکھتا تھا۔'' اس مثنوی کے کچھ شعر ''واقعات بابری'' میں بھی درج ہیں۔ اس نے اپنے حالات پر جو تزک لکھی ہے وہ بھی ترکی میں ہے۔ اکبر کی فرمائش پر عبدالرحیم خان خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ''واقعات بابری'' رکھا گیا۔ فرشتہ ان کی تصنیف تزک کے متعلق لکھتا ہے۔ ''بابر بڑا اچھا ادبی نقاد بھی تھا۔ خواجہ آصفی کے کلام کی نسبت اس نے بڑی موزوں رائے دی ہے۔'' فن عروض میں بھی بابر کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ عروض پر بھی اس کا ایک رسالہ ہے۔ موسیقی میں بھی بڑی اچھی دسترس تھی۔ معاصر موسیقاروں کے حسن و قبح پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ مشہور مصور بہزاد بابر کا معاصر تھا۔ اس نے بہزاد کی ایک تصویر کے نقائص بھی ظاہر کیے ہیں۔ فرشتہ لکھتا ہے: ''بابر دربار میں بادشاہ، جنگ میں سپہ سالار، بزم میں یار باش رند، اہل علم کی صحبت میں محقق اور نقاد تھا۔''

18 جمالی کنبو: آزاد بلگرامی نے ''خزانہ عامرہ'' میں لکھا ہے کہ یہ ایک باکمال سخنور شاعر تھے۔ نام فضل اللہ تھا قوم کنبو تھی، قوم کنبو کے دہلی میں قاضی اور مفتی تھے۔ حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور سلطان حسین مرزا کے عہد میں خراسان کا سفر کیا اور مولانا جامی اور جلال الدین دوانی سے فیض حاصل کیا تھا۔

19 شاہ طہماسپ: ایران کے صفوی خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا۔

20 شیخ محمد غوث گوالیاریؒ: غوث اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی کے سلسلۂ طریقت میں شیخ حاجی حمید کے خلیفہ اور بڑے صاحب کمال گزرے ہیں۔ ان کے دادا نیشاپور کے شیخ تھے اور ہندوستان میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ شیخ غوث لاغر اندام شخص تھے لیکن سیاحت بہت کی تھی۔ ابتدا میں قلعہ کلچیتر / کالنجر میں وعظ و بیان کا مشغلہ تھا بعد میں راہ سلوک اختیار کی۔ ہمایوں ان کا معتقد تھا۔ آپ نے ایک ''معراج نامہ'' لکھی تھی جس میں اپنی ''معراج'' کا تذکرہ تھا۔ شیر شاہ کے زمانے میں اس کتاب پر بڑے اعتراض ہوئے شیر شاہ ان کی فکر میں تھا کہ وہ

گوالیار سے گجرات چلے گئے۔ گجرات کے علماء نے بھی ان کو گھیر لیا۔ آخر میں علماء کی مجلس میں جب انھوں نے یہ کہا کہ مجھے یہ معراج عالم بے ہوشی کے حالت میں ہوئی تب کہیں جا کر ان کی جان بچی۔ آپ کی تصانیف میں جواہر خمسہ، اوراد غوثیہ اور بحرالحیات مشہور ہیں۔ وفات 5 رمضان المبارک 997 ھ/1589ء میں ہوئی۔ مزار گوالیار میں ہے، ہمایوں سے تعلقات کی وجہ سے ان کا بھائی شیخ بہلول عمدہ مناصب پر پہنچ گیا تھا۔ جس کی شہادت کا واقعہ بالا بیان کیا گیا ہے۔

21 اصل فارسی متن میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جوسہ لکھا ہے ہوسکتا ہے کہ کتابت کی غلطی ہو اصل نام چوسہ ہے نہ کہ جوسہ۔

صلح کا پیغام

کہتے ہیں ایک دن ہمایوں نے ملا محمد عزیز کو جس کی شیر خان سے پہلے کی جان پہچان تھی، اپنا قاصد بنا کر اس کے پاس روانہ کیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سخت گرمی میں شیر خان آستین چڑھائے پھاوڑا ہاتھ میں لیے ہوئے خندق کھود رہا ہے۔ ملا محمد کو دیکھ کر اس نے ہاتھ دھوئے ان کے لیے شامیانہ لگوایا اور خود بے تکلف وہیں زمین پر بیٹھ گیا جب بادشاہ کا پیغام سن چکا تو اس نے کہا: ”میری طرف سے اتنا جا کر کہہ دیجیے کہ تم خود لڑنا چاہتے ہو لیکن تمہارا لشکر لڑنا نہیں چاہتا اور میں لڑنا نہیں چاہتا لیکن میرا لشکر لڑنے پر مصر ہے۔“

اس کے بعد خود شیر خان نے شیخ خلیل کو جو حضرت شیخ فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے اور شیر خان کے پیر تھے، صلح کا پیام دے کر بادشاہ کے پاس بھیجا اور کہلوایا: ”بنگال کے سوا میں کسی اور علاقے سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا اور یہاں بھی میں خطبہ اور سکہ بادشاہ کے نام کا ہی برقرار رکھونگا۔ اس عہد کے لیے کلام اللہ کی قسم بھی کھائی۔ ہمایوں نے اعتماد و یقین کر کے صلح پر رضامندی کا اظہار کیا اور پوری طرح مطمئن ہو کر ندی پر پل باندھنے کا حکم دیا۔

ہمایوں کی شکست

شیر خان کی طرف سے صلح کا یہ پیغام محض ایک دھوکا تھا۔ اس نے دوسرے دن صبح ہی اچانک شاہی لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کی فوج بالکل ہی بے خبر تھی، پریشانی میں صف آرا نہ ہو سکی اور شیر خان نے ایک ہی حملے میں ہمایوں کو شکست دے دی۔ جو پل اس نے تیار کرایا تھا اسے پٹھانوں نے توڑ دیا۔ ان کے توپچیوں اور تیر اندازوں نے کشتیوں میں بیٹھ کر ہمایوں پر گولوں اور تیروں کی بوچھار کر دی۔ اس معرکے میں محمد زمان میرزا مارا گیا۔ ہمایوں نے اس عالم میں کہ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا گھبرا کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب ڈوبنے لگا تو ایک سقے نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اور دریا سے پار کرا دیا۔ اس وقت شیر خان نے یہ شعر کہا:

فرید حسن راتو شاہی دگی
سپاہ ہمایوں بہ ماہی دگی

اس کے استاد نے اس کی اس طرح اصلاح کی ہے:

یکی رابہ آری و شاہی دگی
سپاہ ہمایون بہ ماہی دگی

یہ واقعہ 946ھ/1539ء میں پیش آیا۔ اس کی تاریخ ہے: "سلامت بود بادشاہ کسی" اس فتح کے بعد شیر خان نے بنگال کے علاقوں پر لشکر کشی کی اور متعدد لڑائیوں کے بعد جہانگیر قلی بیگ کو اس کے لشکر سمیت تباہ و تاراج کر دیا۔ اب سارا بنگال شیر خان کے قبضے میں تھا، وہ وہاں اپنے نام کا خطبہ پڑھ کر شیر شاہ کے خطاب سے تخت نشین ہو گیا۔ دوسرے سال ہی شیر شاہ نے بڑی تیاریوں کے ساتھ آگرے کا قصد کیا۔

ہمایوں کے بھائی

کامران میرزا کو جب چوسہ کی شکست، شیر خان کے غلبے اور میرزا ہندال کی سرکشی کی خبریں ملیں تو وہ قندھار سے لاہور پہنچ گیا اور وہاں سے کوچ کر کے 946ھ/1539ء میں آگرے میں داخل ہوا۔ مرزا ہندال اس کے آنے سے پہلے ہی دہلی جا چکا تھا، وہاں اس نے میر فخر علی اور میرزا یادگار ناصر کا جو دہلی میں قلعے کے اندر بند ہو گئے تھے محاصرہ کر لیا لیکن جب کسی طرح کامیابی حاصل نہ ہوئی تو محاصرہ اٹھا کر آگرے میں مرزا کامران سے آ کر مل گیا۔ چند دن بعد میر فخر علی بھی کامران کے پاس گیا، البتہ مرزا یادگار ناصر برابر دہلی کے قلعے پر جما رہا، پھر مرزا ہندال کامران سے آگرے میں مل کر الور کی طرف چلا گیا۔

ہمایوں کی پریشانی

چوسہ کی شکست کا داغ تو تھا ہی، آگرے میں بھائیوں کی ان حرکتوں کا حال سن سن کر ہمایوں سخت پریشان اور مضطرب تھا، ایک دن کامران سراپردہ میں غافل بیٹھا تھا کہ اچانک ہمایوں اندر داخل ہو گیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے مقابل ہو گئے لیکن جیسے ہی ان کی نظریں ملیں خون نے جوش مارا، محبت امڈ آئی اور دونوں گلے مل کر رونے لگے۔ اس کے بعد ہندال مرزا، محمد سلطان مرزا، اس کے دونوں بیٹے جو عرصے سے مخالف و سرکش بنے ہوئے تھے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہمایوں نے سب کے قصور کو معاف کر دیا اور شیر خان کو کچلنے کے لیے ان سب سے مشورہ کیا۔ بظاہر مرزا کامران نے یہ کہا کہ میرے ساتھ پنجاب کا جو لشکر ہے وہ آراستہ اور تازہ دم ہے اس لیے آپ دارالخلافہ میں رہیں اور میں شیر خان کے مقابلے پر فوج کشی کرتا ہوں۔ ہمایوں نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ چند دن بعد کامران نے پنجاب واپس ہو جانے کی اجازت مانگی اور بادشاہ سے بھاری مطالبہ کرنے لگا۔ ہمایوں نے پنجاب کے علاوہ اس کے سارے مطالبے قبول کر لیے۔ خواجہ کلاں بیگ نے بھی کامران کو پنجاب رخصت کر دینے کے لیے تاکید کی۔ چھ ماہ بس اسی کہا سنی میں نکل

گے اور کچھ طے نہ پاسکا اسی دوران مرزا کامران کو مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔ طبیبوں نے تشخیص کیا کہ ان تمام بیماریوں کا اصل مادہ زہر ہے۔ جو کسی نے کھلا دیا ہے۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے اس کو ہمایوں کی طرف سے بدگمان کرا دیا اور وہ یہ سمجھ کر کہ ہمایوں نے ہی زہر دلوایا ہے۔ اسی بیماری کی حالت میں پنجاب کی طرف کوچ کر گیا۔ پہلے تو اس نے یہاں تک کہا تھا کہ میں اپنی ساری فوج آگرے میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن اس قول کو پس پشت ڈال کر سکندر نامی سردار کے صرف دو ہزار سپاہی آگرے میں چھوڑ دیے اور باقی سارا لشکر اپنے ساتھ ہی لے کر چلا گیا۔ میرزا حیدر مغل کشمیری بھی آگرے میں رہ گیا۔ اس پر بادشاہ نے بڑے لطف و کرم کا اظہار کیا۔

بھائیوں کی نااتفاقی

شیر خان کو بھائیوں کی اس نااتفاقی کی بھی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں، ان حالات میں اس کی جرأت اور بڑھ گئی اور وہ اسی سال کے آخر میں گنگا کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنے بیٹے قطب خان کو ایک لشکر دے کر کالپی اور اٹاوہ کی طرف روانہ کیا۔ قاسم حسین سلطان اوزبک نے یادگار ناصر مرزا اور اسکندر سلطان کو ہمراہ لے کر کالپی کے علاقے میں قطب خان کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دے دی اس کا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے سر کاٹ کر ہمایوں کے پاس آگرے کے لیے روانہ کر دیے۔

خرابی ملک دلّی

ہمایوں ایک لاکھ سواروں کا لشکر لے کر شیر خان کے مقابلے کے لیے آگرے سے نکلا اور قنوج کا دریا پار کر کے صف آرائی کی۔ شیر خان کی فوج پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مہینہ بھر تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر جمی رہیں۔ ممکن تھا کہ شاہی لشکر کامیاب ہو جاتا لیکن اس نازک موقعے پر محمد سلطان مرزا اور اس کے بیٹے لشکر سے فرار ہو گئے اور

کامران کی فوج کے جتنے لشکری تھے وہ بھی ہمایوں نے کسی اونچے مقام پر پڑاؤ ڈالنے کے لیے وہاں سے کوچ کرا دیا تھا، اس حال میں شیر خان نے بھرپور حملہ کر دیا۔ اکثر مغل بغیر لڑے ہی بھاگ گیے۔ بادشاہ کا ارادہ صرف اونچے مقام پر جانا تھا نہ کہ بھاگنا۔ لیکن لشکر والوں نے اسے فرار پر محمول کر کے میدان جنگ سے پیٹھ پھیر لی اور جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اپنا گھوڑا گنگا میں ڈال دیا اور پانی کے بہاؤ میں دریا میں گر پڑا۔ اس وقت شمس الدین محمد غزنوی نے مدد کی اور بادشاہ کو دریا پار کروالیا۔ وہاں سے ہمایوں آگرہ گیا مگر شیر خان برابر پیچھا کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس لیے وہ وہاں بھی ٹھہر نہ سکا اور فوراً پنجاب چلا گیا۔ یہ لڑائی 947ھ/1540ء میں ہوئی تھی، اس کا مادۂ تاریخ ہے۔ ''خرابی ملک دلی (947ھ)''

لاہور میں مشورے

ہمایوں نے لاہور پہنچ کر یکم ربیع الاول 947ھ/1540ء میں تمام امراء و سلاطین کو جمع کر کے مشورہ کیا لیکن ہمایوں کے بھائیوں اور دوسرے امرا کے درمیان پھوٹ پڑ چکی تھی اس لیے کسی تجویز پر اتفاق نہ ہو سکا۔ محمد سلطان اور اس کے بیٹے لاہور سے ملتان بھاگ گیے۔ مرزا ھندال اور مرزا یادگار ناصر ٹھٹھہ کی طرف چلے جانے کی رائے دے رہے تھے۔ مرزا کامران چاہتا تھا کہ سب لاہور سے ٹل جائیں تو وہ کابل چلا جائے۔ آخر بڑے صلاح ومشورے کے بعد طے پایا کہ مرزا حیدر کو ایک لشکر دے کر کشمیر پر حملہ کیا جائے اور کشمیر فتح ہو جائے تو بادشاہ وہاں چلا جائے۔ ہمایوں نے مرزا حیدر کو اس مہم پر روانہ کر دیا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اور بہت سے کشمیریوں کو اپنا گرویدہ بنا کر کشمیر فتح کر لیا اور 22 رجب 947ھ/1540ء میں اس علاقے پر قابض ہو گیا۔

ہمایوں کا فرار ہونا

خواجہ کلاں بیگ سیالکوٹ تک پہنچا تھا کہ بادشاہ کو خبر ملی، شیر خان سلطان پور کی ندی پار کر کے لاہور سے 22 کوس کے فاصلے پر آ گیا ہے۔ یہ سن کر ہمایوں لاہور کی ندی کو پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ مرزا کامران مصلحتاً کچھ دور تک تو ساتھ رہا۔ خواجہ کلاں بیگ بھی سیالکوٹ سے ہٹ کر لشکر سے آ ملا لیکن جب یہ سب بھیرہ کے علاقہ میں پہنچے تو میرزا کامران اور مرزا عسکری عہد و پیمان بھول کر خواجہ کلاں بیگ کے ساتھ کابل کی طرف نکل گیے، ہمایوں نے سندھ کا رخ کیا۔ چند منزل بعد میرزا ہندال اور میرزا یادگار ناصر بھی ساتھ چھوڑ گیے لیکن امیر ابوالبقاء کے سمجھانے سے دوبارہ لوٹ آئے۔ سندھ ندی کے کنارے شاہی لشکر ایسے قحط میں مبتلا ہوا کہ ایک سیر غلہ ایک اشرفی میں بھی ملنا محال ہو گیا۔ پانی بھی دور دور تک نہیں تھا۔ بھوک اور پیاس سے اکثر لشکری مر گئے۔ ہمایوں سخت مصیبتوں اور صعوبتوں کے بعد ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ جیسلمیر اور مارواڑ پہنچ سکا۔ وہاں بھی اسے کئی ایک حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر وہ کسی طرح ہندستان کی سرحد سے نکل کر عراق پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے شاہ طہماسپ سے مدد لے کر قندھار اور کابل پر حملہ کیا اور ان شہروں کو فتح کر کے وہاں لشکر منظم کر کے دوبارہ اس نے ہندستان کو فتح کیا۔

سوری خاندان

شیر شاہ بن حسن سور

''خرابی ملک دلی'' نہ صرف ہمایوں کی شکست کی، بلکہ شیر شاہ کی تخت نشینی کی بھی تاریخ ہے، کیونکہ اس سال یعنی 947ھ/1540ء میں شیر شاہ نے آگرے میں تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔

شیر شاہ کے ابتدائی حالات

شیر شاہ کا اصل نام فرید خان تھا۔ اس کا دادا ابراہیم سور[1] افغانستان کے علاقے رن سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں وہ سلطان بہلول لودی کے لشکر میں ملازم ہو گیا اور کافی عرصے تک حصار فیروزہ اور نارنول میں کار پرداز رہا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹے حسن نے سلطان سکندر لودی کے ایک امیر جمال خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسے جمال خان کی طرف سے سہسرام[2] اور خواص پور جو کہ قلعہ رہتاس کے ماتحت پرگنے تھے، جاگیر کے طور پر ملے تھے۔ اس کے زیر حکم پانچ سو سوار تھے۔ فرید خان (شیر شاہ) کے سات اور بھائی تھے۔

اس نے باپ اور بھائیوں سے لڑ کر ملازمت ترک کر دی اور جونپور میں جا کر طالب علمی اختیار کر لی۔

اس زمانے میں اس نے کافیہ مع حواشی اور چند مختصر دوسرے رسالے اور فارسی میں گلستان و بوستان اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس کے اکثر اوقات جونپور کے مدرسوں اور خانقاہوں میں گزرتے تھے جہاں وہ علماء اور صلحاء کی صحبت سے استفادہ کرتا اور اپنے اخلاق کی تربیت میں مصروف رہتا تھا۔ چند دن بعد اس کی باپ سے صلح ہو گئی اور اس کے باپ حسن خان نے جاگیر کے انتظام کے لیے اسے مقرر کر دیا۔ اپنی عملداری میں شیر خان نے بڑے عدل و انصاف اور حسن انتظام سے کام لیا اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس نے تمام فتنہ پردازوں کا صفایا کر دیا۔ شیر خان کا یہ دور بھی مختصر رہا۔ چند معاملات میں اس کی باپ سے پھر مخالفت ہو گئی اور وہ اپنے ایک بھائی کے ساتھ آگرے چلا گیا، وہاں سلطان ابراہیم کے ایک سردار دولت خان کے یہاں ملازمت کر لی اور سلطان ابراہیم کے پاس اپنے باپ اور بھائیوں کی شکایت پہنچائی۔ سلطان الٹا اسی سے ناراض ہو گیا اور کہا کہ ''یہ تو بہت برا آدمی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باپ اس سے ناراض ہے اور یہ ہے کہ باپ کی شکایت کرتا ہے۔'' حسن خان کے مرنے کے بعد دولت خان نے اس کی جاگیر کے پرگنے شیر خان کو دلوا دیے اور وہ ایک عرصے تک اپنی جاگیروں ہی میں رہا۔ بھائیوں سے اس کی مخالفت پہلے کی طرح باقی تھی۔

شیر خان بہار میں

جس زمانے میں سلطان ابراہیم پانی پت میں مارا گیا تھا اور بابر نے فتح پائی تھی، دریا خان کے بیٹے بہادر خان نے بہار میں سلیمان محمد کے لقب سے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا فرید خان بھی ان دنوں جاگیر کو چھوڑ کر بہار چلا گیا اور سلطان محمد کے یہاں ملازم ہو گیا اور ایک دن سلطان محمد کی رکاب میں اس نے ایک شیر کا شکار کیا۔ اس وقت سلطان محمد نے اسے ''شیر خان'' کا خطاب عطا کیا اور اپنے بیٹے جلال خان کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ولایت ''چوند'' کے حاکم محمد خان سور نے شیر خان کے بھائیوں کی طرفداری میں سلطان

محمد کو شیر خان سے بدول کر دیا اور جاگیر میں اس کے بھائیوں کو بھی شریک کرا دیا۔ اور اس کے بھائی سلیمان کو اپنے ایک غلام شادی خان کے ساتھ کر کے خواص پور کا قبضہ دلانے کے لیے بھیجا۔ وہاں ان کا مقابلہ شیر خان کے ایک غلام بھکہ نامی سے ہوا۔ اس شخص کے متعلق مشہور تھا کہ یہ خواص خان کا باپ ہے۔ مقابلے میں بھکہ مارا گیا اور اس کے آدمی بھاگ کر شیر خان کے پاس سہسرام میں آ گئے۔

شیر خان مغل لشکر میں

شیر خان نے جب دیکھا کہ وہ محمد خان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تو جاگیروں سے دست بردار ہو کر سلطان جنید برلاس کے پاس چلا گیا جو بابر کی طرف سے کڑہ اور مانک پور کا حاکم تھا اور اس کو بہت سے تحائف نذر دے کر اپنا حامی بنا لیا، پھر اس سے مدد لے کر محمد خان پر حملہ کر دیا اور اس سے پرگنہ چوند بھی چھین لیا۔ محمد خان نے روہتاس کے قلعے میں پناہ لی۔ شیر خان نے اپنی جاگیروں پر قبضہ کر کے بھائیوں کو سزا دی، اور محمد خان سے اس گستاخی کی معذرت کر کے اس کے پرگنے اسے لوٹا دیے اور جاگیر کے انتظام پر اپنے بھائی نظام کو مقرر کر کے سلطان جنید برلاس کے پاس واپس چلا گیا۔

شیر خان بابر کے حضور

سلطان جنید عموماً بابر کے دربار میں جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شیر خان کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور بادشاہ سے سفارش کر کے اسے شاہی ملازموں میں شامل کرا دیا۔ چنانچہ چندیری کے سفر میں وہ بابر کے ہم رکاب تھا۔ اسی سفر میں اس کو اندازہ ہوا کہ مغل حکمران امور مملکت سے نہایت بے پرواہ ہے اور عملہ کے لوگ رشوتیں لے کر لوگوں کے معاملات کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر شیر خان کو یقین سا آ گیا کہ ان مغلوں سے بادشاہت چھین لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس وقت سے شیر خان حصول اقتدار کی تدبیروں

میں لگ گیا۔ ایک دن بابر نے کھانا کھاتے وقت دستر خوان پر شیر خان کی کوئی گستاخانہ حرکت دیکھی۔ اس وقت اہل مجلس نے موقع پا کر شیر خان کی خودسری اور اس کے باغیانہ خیالات سے بابر کے کان بھرے۔ شیر خان ان باتوں سے نہایت خوفزدہ ہوا، اور شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور اپنے پرگنوں میں جا کر رکا۔ جنید برلاس کو یہ شکایت لکھ کر بھیجی کہ "مغلوں کی ملازمت اختیار کر لینے کی وجہ سے محمد خان نے جس کو مجھ سے دلی عداوت ہے۔ سلطان محمد کو میری جاگیر پر لشکر کشی کے لیے آمادہ کر دیا تھا اس لیے جلدی اور اضطراب میں بادشاہ سے اجازت لینے کی مہلت نہ مل سکی اور میں بغیر پوچھے ہی اپنے پرگنوں میں چلا آیا۔ میں اسی طرح بادشاہ کا خیر خواہ اور مخلص ہوں۔" اس کے بعد شیر خان نے دوبارہ سلطان محمد کے یہاں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور اس کا مقرب بن کر ممتاز خدمات پر مامور رہا۔ پھر اس کے بیٹے جلال خان کا وکیل مقرر ہوا اور اس کے سارے معاملات شیر خان کے زیر انتظام ہو گئے اور جب سلطان محمد کا انتقال ہوا تو بہار سرکار کا سارا نظم و نسق اسی کے حوالے ہو گیا۔

بنگال میں حوصلہ آزمائی

اسی زمانے میں بنگال کے حکمران کے ایک امیر مخدوم عالم سے جو حاجی پور3ی کا حاکم تھا، شیر خان کی بڑی دوستی ہو گئی۔ پھر بنگال میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ وہاں کے سلطان نے مخدوم عالم پر حملہ کرنے کے لیے اپنے ایک امیر قطب خان کو روانہ کیا۔ شیر خان نے حق دوستی ادا کر کے مخدوم عالم کی طرف سے قطب خان کا مقابلہ کیا اور اسے قتل کر کے اس کا سارا خزانہ مال و اسباب اور ہاتھی لوٹ لیے۔ بعد میں اس کے معاون جلال خان اور دوسرے لوحانیوں نے بہار کا علاقہ سلطان بنگال کے سپرد کر دیا اور شیر خان کو مصیبت میں تنہا چھوڑ کر سلطان کی اطاعت اختیار کر لی۔ بنگال والوں نے مقتول قطب خان کے لڑکے ابراہیم خان کو اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے شیر خان کے خلاف روانہ کیا۔ شیر خان نے قلعے میں بند ہو کر کافی عرصے تک ان کا مقابلہ کیا۔ اس اثناء میں بنگالی فوج کی مدد پر مزید دستے وہاں پہنچ گئے اور شیر خان کے بچ نکلنے کا [illegible] بھی بند ہو گیا اب شیر خان چاروں

طرف سے بُری طرح گھر گیا تھا۔ کوئی راہ نہ پا کر آخر اس نے ایک دلیرانہ حملہ کرنے کا عزم کیا اور قلعے سے باہر نکل کر جان توڑ مقابلہ کیا۔ بڑی سخت جدو جہد کے بعد ان پر فتح پائی۔ اس لڑائی میں ابراہیم مارا گیا اور اس کا سارا مال و اسباب فیل خانہ اور توپ خانہ شیر خان کے ہاتھ آ گیا۔ اس فتح سے اسکی شان وشوکت بہت بڑھ گئی اور سارا بہار اس کے قبضہ اقتدار میں آ گیا۔

سلطان محمود لودی

اس دوران سلطان محمود لودی جسے حسن خان میواتی اور رانا سانگا نے بادشاہ بنا کر بابر سے مقابلہ کیا تھا، مغل لشکر سے شکست کھا کر چتوڑ کے قلعے میں محفوظ ہو گیا تھا۔ لودی امرا نے اسے چتوڑ سے بلا کر پٹنہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے لشکر کشی کر کے شیر خان سے بہار کا علاقہ چھین لیا اور شیر خان نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد شیر خان، سلطان محمود سے اجازت لے کر اپنے پرگنے میں آ گیا۔ بعد میں جس وقت محمود کا سہرام سے گزر ہوا تو اس نے شیر خان کو بہار کا عہد نامہ لکھ کر دے دیا اور وہاں سے جونپور کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔ جونپور پر ہمایوں کے سرداروں کو شکست ہوئی اور یہ علاقہ لکھنو کی سر حدوں تک لودیوں کے قبضے میں آ گیا، ہمایوں کے امیر شکست کھا کر کالنجر کے علاقے میں بادشاہ کے لشکر میں حاضر ہو گئے۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے خود ہمایوں نے سلطان محمد اور اس کے معاون بایزید کے مقابلے کے لیے کوچ کیا۔ اس اثناء میں شیر خان سلطان محمود کے لشکر سے کچھ دن تو علاحدہ ہی رہا بعد میں آ کر اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو شیر خان نے مغلوں کے امیر الامراء ھندو بیگ قوچین کو خفیہ پیغام بھیجا کہ "میں لڑائی کے وقت بہانے بنا کر الگ ہو جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے سلطان محمد اور بایزید کا اقتدار ایک آنکھ نہیں بھاتا۔" چنانچہ جب لڑائی ہوئی تو شیر خان اپنی جمعیت کو لے کر میدان سے ہٹ گیا اور سلطان محمود شکست کھا کر پٹنہ چلا گیا۔ اس کا انتقال 949ھ/1542ء میں اڑیسہ کی سرحد پر ہوا۔

ہمایوں اور شیر خان کا اختلاف

اس فتح کے بعد ہمایوں نے ہندو بیگ کو اپنا نمائندہ بنا کر شیر خان کے پاس بھیجا اور اس سے قلعہ چنار سپرد کر دینے کا مطالبہ کیا۔ شیر خان نے بہانہ کر کے بادشاہ کے مطالبہ کو ٹال دیا۔ ہمایوں نے اپنے چند امیروں کو قلعے کے محاصرہ کے لیے رخصت کیا۔ وہ خود بھی اس مہم پر جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ شیر خان کی ایک عرضی اس کے نام آئی جس میں اس نے اپنے خلوص اور اطاعت کا ذکر کیا تھا اور بابر بادشاہ کے وقت کی خدمات اور سابقہ حقوق کے حوالے تھے، خاص طور سے سلطان محمود سے میدان جنگ میں علیحدگی کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ شیر خان نے یہ عریضہ اپنے بیٹے قطب خان کے ذریعے ایک بڑی جمعیت اس کے ہمراہ کر کے روانہ کیا تھا اور اپنے وکیل اور وزیر عیسیٰ خان حجاب کو بھی اس کے ساتھ کر دیا۔ گجرات میں قطب خان ہمایوں کے لشکر سے فرار ہو کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور شیر خان نے ہمایوں کی گجرات سے واپسی تک کے عرصے میں اپنی قوت میں کافی اضافہ کر لیا، پھر ہمایوں سے مقابلہ کر کے اسے شکست دی۔

شیر گڑھ

شیر شاہ نے تخت نشینی کے بعد قنوج کے قدیم شہر کو ویران کر دیا اور اسے گنگا کے کنارے آباد کرایا۔ یہ شہر اب شیر گڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شمس آباد کے قلعے کو بھی اجاڑ کر اسے دوسری جگہ اس نے تعمیر کرایا اور اس کا نام رسول پور رکھا لیکن اب یہ قلعہ پھر اپنی اصلی جگہ پر آباد ہو گیا ہے۔ شیر خان نے علاؤ الدین کی بسائی ہوئی پرانی دلی کو بھی ویران کر کے ایک شہر فیروز آباد تین کوس کی لمبائی میں بسایا۔ اس کے قلعے کا دروازہ سنگ و گچ (چونے) سے نہایت بلند بنوایا تھا۔ ضروری انتظامات کے بعد شیر شاہ کوچ کرتے ہوئے سلطان پور پہنچ گیا۔ یہاں ہمایوں کے بھائی آپس کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے شیر شاہ کے آتے ہی یہ جھگڑالو بھائی وہاں سے بھی نکل بھاگے، پھر شیر شاہ نے ان کو ہندستان کی

حدود میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔

شیر شاہی سڑک

اس سال شیر شاہ نے حکم دیا کہ بنگال سے روہتک (ہریانہ) تک جو چار ماہ کا راستہ ہے سڑک بنائی جائے۔ اس سڑک پر آگرے سے مانڈو تک ہر کوس پر ایک سرائے، مسجد اور پختہ کنواں تعمیر کرایا گیا اور مسجد میں ایک موذن اور ایک امام مقرر کیا گیا ایک ہندو سقے کو بھی مقرر کیا گیا۔ اس سڑک پر بادشاہ کے حکم سے دونوں جانب درخت لگوائے گئے تاکہ مسافر ٹھنڈی چھاؤں میں سفر کریں۔ ان تعمیرات کے آثار میرے اپنے زمانے (مؤلف منتخب التواریخ) تک کہ شیر شاہ کے عہد کو باون سال گزر چکے ہیں، باقی ہیں۔

عدل و انصاف

شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھے۔ اس کے عدل و انصاف کی ایسی دھاک تھی کہ بڑھیا بھی آکر جنگل میں سونے کا تھال اچھالتی ہوئی چلی جائے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔ خدا کا میں (مؤلف منتخب التواریخ) بڑا شکر گزار ہوں کہ میری پیدائش اس عادل بادشاہ کے زمانے میں ماہ ربیع الثانی 947ھ/1540ء میں ہوئی۔ شیر شاہ نے مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے بالنات کی پہاڑی کے اوپر قلعہ تعمیر کرایا اور خواص خان کو ہمایوں کے تعاقب پر مقرر کر کے دارالخلافہ کو لوٹا۔

قاضی فضیحت کی رسوائی

راستے میں اطلاع ملی کہ بنگال میں خضر خان سرگ نام کے ایک سردار نے سرکشی اختیار کی ہے اور اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ شیر شاہ نے فوراً بنگال کا رخ کیا اور خضر خان کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اس علاقے کو اپنے امیروں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے

لشکر کے قاضی کو جس کا نام قاضی فضیلت تھا رہتاس کے مشرقی قلعے کا ناظم مقرر کیا۔ عوام اس قاضی فضیلت کو اس کے رویہ کی وجہ سے قاضی فضیحت کہتے تھے۔ شیر شاہ اس مہم سے فارغ ہو کر 948ھ/1541ء میں آگرہ واپس آ گیا۔

ملو گیدی

949ھ /1542ء میں شیر شاہ مالوہ کی فتح کے ارادے سے گوالیار گیا۔ گوالیار کے قلعے میں ہمایوں کا ایک امیر ابوالقاسم بیگ مقرر تھا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں قلعے کی کنجی لے کے حاضر ہو گیا۔ اسی جگہ حاکم مالوہ ملو خان بھی جو شاہان خلجی کا غلام اور اس علاقہ کا با اقتدار شخص تھا۔ بادشاہ کی قدم بوسی کے لیے باریاب ہوا۔ شیر شاہ نے اس پر بڑی عنایتیں کیں اور بھاری انعام و اکرام سے نوازا اور اپنے خیمہ کے نزدیک ہی اس کا خیمہ لگوایا۔ شیر شاہ اسے ایک سو ایک گھوڑے اور دوسرے اعزاز بھی عطا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا لیکن ملو خان نہ معلوم کس وجہ سے خائف ہو کر غلاموں کی طرح خیمہ چاک کر کے راتوں رات لشکر سے بھاگ گیا۔ یہ شعر شیر شاہ نے اسی کے متعلق کہا تھا:

باما چہ کرد دیدی ملو غلام گیدی
قولیست مصطفے را لا خیر فی عبیدی

ملو خان کو کچلنے کے لیے شیر شاہ نے حاجی خان سلطان کو تو مالوہ کی طرف اور سزاول خان کو سرکار ستواس کی طرف روانہ کیا۔ ان دونوں کے مقابلے میں ملو خان کو شکست ہوئی اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ انہی دنوں خان خانان شیروان نے رنتھنبور کا قلعہ شاہی لشکر کے حوالے کر دیا اور خود اپنے خاندان کو لے کر پشاور کے قصبے میں چلا گیا۔ کہتے ہیں وہاں اس کو کسی نے زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کی قبر پشاور سے باہر ایک نہایت ہی پر فضا مقام پر ہے۔

پورن مل کا قتل

اسی سال رائے سین کے مقدم پورن مل نے چندیری کو لوٹ لیا اور وہاں کے اکثر آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اپنے حرم میں وہاں کی دو ہزار ہندو اور مسلمان عورتوں کو داخل کر لیا۔ جب شیر شاہ کو اس فساد کی اطلاع ملی تو وہ برق و باد کی طرح رائے سین کے قلعے پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ کا مادہ تاریخ ہے: "قیام بارگہ باشد مبارک"

شیر شاہ قلعے کو فتح نہ کر سکا اس لیے اس نے شاہزادہ عادل خان اور قطب خان کے وسیلے سے فریب دے کر پورن مل کو بلوایا اور بڑی عزت کے ساتھ اسے لشکر میں ٹھہرایا۔ سو گھوڑے، کافی سونا اور نقدی خلعت انعام میں دیا، بعد میں شیر شاہ نے عہد شکنی کی اور میر سید رفیع الدین صفوی سے فتویٰ لے کر پورن مل کو اس کے اہل و عیال سمیت ہاتھیوں کے پیروں تلے کچلوا دیا۔ اس کارروائی میں پورن مل کے دس ہزار ہندوؤں میں سے ایک کی بھی جان نہ بچی اور وہ سب بیوی بچوں سمیت قتل ہوئے۔ بعض خود آگ میں جل کر مر گئے۔ [4] یہ واقعہ 950ھ/1543ء میں پیش آیا تھا۔

راجہ مالدیو پر حملہ

کچھ عرصے بعد بادشاہ نے آگرے سے راجہ مالدیو کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ مالدیو، ناگور اور جودھ پور کا بڑا نامی گرامی راجہ تھا اور مسلمانوں پر اس کے غلبے اور زیادتی کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ شیر شاہ کا قاعدہ تھا کہ خواہ دشمن زیادہ ہو یا کم، اپنے لشکر کے اطراف وہ خندق ضرور بنا لیتا تھا۔ اجمیر کے علاقے میں راجہ مالدیو پچاس ہزار سوار لے کر بڑی تیاریوں کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ وہاں میدان جنگ پورا ریتیلا تھا، حصار اور خندق بنانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ شیر شاہ نے اس بارے میں اپنے تجربہ کار امراء سے مشورہ کیا، کسی کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی اور سب عاجز و حیران ہو گئے۔ اس وقت شیر شاہ کا ایک کم سن پوتا جس کا نام شاہ عالم تھا بے ساختہ بول اٹھا: "بنجاروں کو حکم دیجیے کہ وہ اپنے تھیلے ریت سے بھر

کر لشکر کے گرد مورچہ بندی کر دیں۔" بادشاہ اس کی بات سن کر پھڑک اٹھا۔ اسی وقت اپنی پگڑی اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا ولی عہد بنا لیا۔ لیکن سلطنت شاہ عالم کی قسمت میں نہیں تھی۔ جب سلیم شاہ بادشاہ بنا اس نے سب سے پہلے اسی کو قتل کرایا تھا۔

جنگی تدبیر

شیر شاہ اپنے پٹھان لشکر کی جانوں کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا اسی لیے عموماً وہ لڑائیوں کو مقابلے کے بجائے حکمت عملی سے جیتنا چاہتا تھا۔ راجہ مالدیو کے مقابلے میں بھی اس نے ایک چال چلی۔ راجہ مالدیو کے سرداروں کی طرف سے اس نے اپنے نام بہت سے جعلی خط لکھوائے۔ ان کا مضمون یہی تھا کہ لڑائی کے دن آپ کو مقابلہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہم خود راجہ مالدیو کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے بشرط کہ آپ فلاں فلاں علاقے ہم کو جاگیر میں عطا کریں۔ پھر شیر شاہ نے کسی تدبیر سے وہ خطوط راجہ کے ہاتھوں تک پہنچا دیے۔ شیر شاہ کی چال کامیاب ہوئی اور وہ اپنے تمام سرداروں سے بدگمان ہو گیا راتوں رات میدان جنگ سے نکل کر بھاگ گیا۔ امیروں نے اس سے مل کر بہت کچھ یقین دلایا کہ ہم ہرگز دغا نہیں کریں گے یہ سارا فریب شیر شاہ کا ہے، لیکن راجہ کو ان کے کہنے کا کسی صورت میں بھی یقین نہ آیا۔ مالدیو کا ایک سردار گویا نامی تھا۔ اس کو بڑا غصہ اور غیرت آئی اور اس نے بگڑ کر مالدیو کو بری بری گالیاں دیں۔ اپنے چار ہزار آدمیوں کے ساتھ شیر شاہ پر رات کو حملہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ رات کے حملے کے ارادے سے نکلے، لیکن یہ لوگ بدقسمتی سے راستہ بھول کر رات بھر بھٹکتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اور طرف کافی دور نکل آئے ہیں ان لوگوں نے جان دے دینے کا قول و قرار کیا تھا اس لیے واپس نہ ہوئے۔ جب انہیں شیر شاہ کا لشکر نظر آیا تو گھوڑوں سے اُتر کر سب نے از سر نو قسم کھائی اور ایک دوسرے کے کمرپٹے سے اپنے کمرپٹے کو باندھ لیا۔ برچھے اور تلوار لے کر شیر شاہ کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ شیر شاہ نے ان حملہ آوروں پر ہاتھی دوڑا دیے اور ان میں سے اکثر ہاتھیوں کے پیروں میں پامال ہو گئے جو بچے وہ توپوں

اور تیروں کی بوچھار کی نذر ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھی سلامت نہ رہا۔ اس لڑائی میں ایک بھی فرد شیر شاہ کی طرف کا زخمی نہ ہوا۔ اس فتح کے بعد شیر شاہ اکثر کہا کرتا تھا: ''بڑی خیر ہو گئی میں نے تو تمام ہندستان کی سلطنت مٹھی بھر جوار کے عوض بیچ دی تھی'' اس کے بعد شیر شاہ نے رنتھنبور کا قلعہ اپنے بیٹے عادل خان کو دیا اور اسے وہاں چند دن کے لیے رخصت کر دیا تا کہ اس کا انتظام کر کے لوٹ آئے۔

رفیع الدین محدثؒ

میں نے معتبر آدمیوں سے سنا ہے کہ سید رفیع الدین محدثؒ نے جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے اس سفر میں شیر شاہ سے کہا تھا: ''میرے باپ دادا سب اہل علم اور صاحب تصانیف تھے اور حرمین شریفین میں وعظ کیا کرتے تھے۔ سارے خاندان میں میں ہی ایک ایسا نالائق ہوں جو روپے کے لالچ میں ہندستان میں آوارہ گردی کر رہا ہوں اور بالکل ہی جاہل رہ گیا ہوں۔ اب حضور مجھے معاف فرمائیں تا کہ وطن جا کر اپنے خاندان کا چراغ روشن کروں۔''

شیر شاہ کے نیک ارادے

شیر شاہ نے ان سے کہا، مجھے آپ کو رخصت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نے آپ کو ایک مصلحت کی خاطر روک رکھا ہے۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ ہندستان کے وہ قلعے جو غیر مسلمانوں کے قبضے میں رہ گئے ہیں فتح کر لوں، اس کے بعد ان قزلباشوں کی خبر لوں جو حاجیوں کو راستوں میں لوٹ لیتے ہیں۔ ان قزلباشوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کو سلطان روم دباتا ہے تو وہ اس طرف چلے آتے ہیں اور جب وہ لوٹ جاتا ہے تو یہ پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے جو تدبیر سوچی ہے اس کے مطابق ادھر سے شاہ روم اور ادھر سے میں، دونوں مل کر ان قزلباشوں کا ایسا صفایا کریں گے کہ پھر انھیں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اس مہم کے لیے اور حرمین شریفین میں کسی ایک مقام کی خدمت کا اجازت نامہ حاصل کرنے

کے لیے میں آپ کو اپنا وکیل بنا کر شاہ روم کے پاس بحیثیت سفیر روانہ کروں گا۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ اس سفارت کے لیے آپ کے سوا دوسرا کوئی آدمی موزوں نظر نہیں آتا۔" کیا عجب کہ شیر شاہ کی یہ حسن نیت ہی اس کی مغفرت کا سبب بن جائے۔ عمرو بن لیث[5] جو شاہان عراق میں ممتاز بادشاہ گزرا ہے اسی طرح حسرت ظاہر کیا کرتا تھا کہ میں اگر امام حسین کے ساتھ ہوتا تو یزیدیوں کے دماغ ٹھکانے لگا دیتا۔ لوگوں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ روضۂ جنت میں سیر کر رہا ہے۔ بہر حال آدمی کوئی بھلا کام کر سکے یا نہ کر سکے اس کی نیت اور آرزو تو کر سکتا ہے، اس کا بھی اللہ کے یہاں بڑا اجر ہے۔

کالنجر کے قلعے کا محاصرہ

952ھ/1545ء میں شیر شاہ نے کالنجر[6] کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ہندستان کے مضبوط قلعوں میں سے ایک ہے۔ بادشاہ کے حکم سے فصیل کے گرد سرنگیں کھودی گئیں اور جب یہ سرنگیں قلعے کے اندر پہنچیں تو شیر شاہ کے بہادر سپاہی ان سرنگوں کے ذریعہ قلعے میں داخل ہو گئے اور وہاں اپنی تلواروں سے قیامت برپا کر دی۔ شیر شاہ اپنی نگرانی میں ایک مقام سے بارودی گولے قلعے میں پھنکوا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک گولہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر شاہی لشکر ہی میں لوٹ آیا اور پھٹ گیا۔ اس کے اثر سے وہاں جتنے گولے تھے سب پھٹ پڑے اور ہر طرف آگ پھیل گئی۔ شعلوں میں شیر شاہ بھی گھر گیا اور اس کا سارا بدن جل کر سیاہ کوئلہ ہو گیا۔ شیخ خلیل پیرزادہ اور مولانا نظام الدین دانش مند کو بھی اس آگ سے صدمہ پہنچا۔ بارودی مورچے کے قریب ہی بادشاہ کے لیے ایک چھوٹا خیمہ لگایا گیا تھا۔ شیر شاہ اسی نازک حالت میں دوڑتا ہوا اس خیمے میں چلا گیا۔ فوج قلعے پر چڑھائی کر رہی تھی اور بادشاہ خیمے میں بے ہوش پڑا تھا۔ جب بھی اسے کچھ ہوش آتا وہ چلا چلا کر لوگوں کو قلعہ فتح کرنے پر اکساتا رہتا اور جو کوئی اسے دیکھنے اندر آتا تو بادشاہ اسے محاذ پر جانے کا اشارہ کرتا۔ جاں بہ لب بادشاہ کے اس عزم کو دیکھ کر امرائے لشکر نے بھی بجائے ہراساں ہونے کے پورے جوش و خروش کے ساتھ قلعے پر حملہ کیا اور خنجروں اور تلواروں سے دشمنوں کے حلق پھاڑ کر رکھ دیے۔

غیبی امداد

میں نے ایک معتبر آدمی سے سنا ہے (مؤلف منتخب التواریخ): ''اس دن ایک شخص سیاہ لباس پہنے اور سر پر عمامہ باندھے فوج کو لڑائی کے لیے بڑھانے لیے جا رہا تھا۔ سب اسے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے اسے نہ پہچانا کہ کون تھا؟ سب کے ساتھ وہ بھی قلعے میں داخل ہوا تھا۔ فتح کے بعد لوگوں نے جب اسے ڈھونڈا تو کہیں اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس طرح دونوں طرف کے مورچہ والوں نے بھی یہی بیان کیا کہ اسی لباس کے سوار لشکر کے آگے آگے جاتے ہوئے نظر آئے۔ جب سب قلعے میں داخل ہو گئے تو وہ غائب ہو گئے۔ بہر حال یہ بات کافی مشہور ہے کہ اس دن مسلمانوں کے لیے غیب سے مدد آئی تھی۔

شیر شاہ کا انتقال

شیر شاہ اسی بے قراری اور تڑپ کی حالت میں بار بار قلعے کی فتح کے متعلق پوچھتا رہا، اس دن گرمی بھی بہت تھی لوگوں نے اس کے جسم پر صندل اور گلاب کا لیپ لگایا لیکن اس کی تکلیف برابر بڑھتی گئی۔ جیسے ہی شیر شاہ نے فتح کی خبر سنی، اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا گیا ہے:

شیر شاہ آنکہ از مہابت او
شیر و بز آب را بہم می خورد
از جہان رفت و گفت پیر خرد
سال تاریخ او ز آتش مرد

952ھ

شیر شاہ کا آبائی قبرستان سہسرام میں تھا اس لیے اس کی لاش وہیں لے جا کر دفنائی گئی۔ شیر شاہ نے پندرہ سال تک سرداری اور حکومت کی اور پانچ سال خود مختار بادشاہت کی تھی۔

آئینہ دیکھ کر وہ کہتا تھا: ''افسوس مجھے شام کے وقت بادشاہی ملی۔''

سلیم شاہ بن شیر شاہ سوری

شیر شاہ کے انتقال کے بعد امرا نے اس کے بیٹے سلیم خان جی کو تخت نشینی کے لیے بلایا۔ وہ اس وقت پٹنہ کے پاس تھا۔ سلیم خان کوچ کرتے ہوئے نہایت تیزی سے لشکر میں پہنچ گیا۔ عیسیٰ خان حجاب اور دوسرے امرا کی تائید سے اس کی تخت نشینی ہوئی۔ اس نے اپنا خطاب سلیم شاہ رکھا۔ سلیم شاہ کا سن جلوس ملا احمد جنید نے اس آیت سے نکالا: **ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔**

سلیم شاہ کا خط

تخت نشینی کے بعد سلیم شاہ نے اپنے بڑے بھائی عادل خان کو جو رنتھمبور میں رکا ہوا تھا۔ اس نے اس مضمون کا خط لکھا: ''اگرچہ آپ ہی ولی عہد اور جانشین تھے لیکن آپ لشکر سے بہت دور تھے اور یہاں فتنوں کے پیدا ہو جانے خطرہ تھا اس لیے میں کچھ دن کے لیے آپ کے نائب کی حیثیت سے لشکر کی حفاظت کر رہا ہوں۔ جب آپ تشریف لے آئیں گے تو مجھے ہر طرح اطاعت گزار اور فرماں بردار پائیں گے۔ سلیم شاہ نے کالنجر سے آگرے کی طرف کوچ کیا۔ کورہ گھاٹم کے قصبے میں خواص خان نے اپنی جاگیر سہرند سے حاضر ہو کر سلیم شاہ کی اطاعت قبول کی لیکن وہ درحقیقت عادل خان کا ہی دل سے طرفدار تھا۔

تخت نشینی کا جشن

سلیم شاہ نے آگرے میں ایک میں بڑا جشن منعقد کیا اور باقاعدہ جلوس کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں لمبی بات چیت ہوتی رہی۔ آخرکار عادل خان نے

اپنی آمد کے معاملے کو سلطنت کے چار بڑے امیر قطب خان نائب، عیسیٰ خان نیازی، خواص خان اور جلال خان جلوانی کی رائے پر چھوڑ دیا۔ سلیم شاہ نے ان چاروں امیروں سے عہد کیا وہ اسے پہلی ملاقات کے فوراً بعد ہی اس کی جاگیر پر رخصت ہو جانے دے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ ہندوستان میں جہاں چاہے اپنے لیے جاگیر حاصل کر لے۔ چاروں امیر اس عہد و پیمان کے بعد عادل خان کو لانے کے لیے گئے اور وہ ان کے ساتھ آگرہ اور وہاں سے سیکری آیا۔ سلیم شاہ نے شکار پور تک آ کر اس کا استقبال کیا۔ یہاں دونوں بھائیوں میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے باپ کی تعزیت کی رسم ادا کی۔ پھر دونوں مل کر آگرے کی طرف روانہ ہوئے۔

سلیم شاہ کی مکاری

سلیم شاہ بظاہر بڑی محبت و خلوص کا برتاؤ کر رہا تھا لیکن اس کے دل میں کھوٹ تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ عادل خان کے ساتھ قلعے میں دو تین آدمیوں سے زیادہ داخل نہ ہونے پائیں، لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور عادل خان کافی جمعیت کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گیا اب سلیم شاہ بھی مجبور ہو گیا اور کسی قسم کی بدگمانی پیدا نہ کرنے کے خیال سے عادل خان کی خوشامد درآمد میں لگا رہا، اس نے کہا میں نے ان سرکش پٹھانوں کو آج تک بڑی مشکل سے قابو میں رکھا ہے۔ اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے عادل خان کو تخت پر بٹھایا اور خود فرمانبرداروں کی طرح سامنے کھڑا رہا۔ دکھاوے کے لیے بڑی لچھے دار باتیں کرنے لگا۔

عادل خان کی دوراندیشی

عادل خان باہوش، تنومند، زور آور نوجوان تھا۔ اس کی طاقت اور زور آزمائی کے قصے لوگوں میں مشہور تھے، لیکن وہ سلیم شاہ کی چال بازیوں کو بھی خوب بھانپ چکا تھا۔ اس لیے اس نمائشی رویے پر اس نے دھوکا نہ کھایا اور تخت سے اتر کر سلیم شاہ کو ہی تخت پر بٹھا دیا

اور نیچے کھڑے ہوکر بادشاہت کی مبارک باد دی۔ اس دن بہت سا سونا چاندی لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ سلیم شاہ نے حسب وعدہ عادل خان کو بیانہ کی جاگیر عطا کی اور اسے عیسی خان اور خواص خان کے ہمراہ رخصت کردیا۔

سونے کی زنجیر

دو ماہ بعد ہی سلیم شاہ اپنے امراز خاص غازی محل کو عادل خان کو گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کیا۔ جب یہ خبر عادل خان کو ملی تو وہ بیانہ سے خواص خان کے پاس میوات چلا گیا۔ خواص خان نے غازی محل کو بلا کر اس کو اسی سونے کی زنجیر میں بندھوا دیا جو وہ عادل خان کو قید کرنے کے لیے لے کر آیا تھا۔

عادل خان کی یلغار

ان دونوں نے ایک بھاری لشکر آراستہ کر کے آگرے پر یلغار کر دی۔ قطب خان اور عیسی خان بھی جو تخت کے بلند پایہ امیر تھے اور انہی کے اعتماد پر عادل خان اس قول و قرار پر راضی ہوا تھا۔ سلیم شاہ کی اس بد عہدی پر ناراض ہو گئے اور انھوں نے عادل خان کے پاس خفیہ پیام بھیجا کہ آپ شب برات کی صبح کو اوّل وقت آگرے میں داخل ہوں، ہم سب یہاں آپ سے بیعت کر لیں گے۔ عادل خان اور خواص خان شب برات کو سیکری پہنچ گئے وہاں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی خدمت میں رات بھر عبادت کرتے اور نوافل پڑھتے رہے۔ اس شب گزاری کی وجہ سے آگرہ پہنچنے میں دیر ہو گئی اور وہ مقررہ وقت پر شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ ان کی آمد سے سلیم شاہ گھبرا گیا وہ قطب خان اور دوسرے امرا کو سمجھا بجھا کر عادل خان کے پاس بھیجنا چاہتا تھا تاکہ مخالف امرا سے قلعہ خالی ہو جائے تو وہ چنار کے قلعے میں جا کر رک جائے اور وہاں کے خزانے اور دفینے پر قبضہ کر کے جنگ کا سامان تیار کر کے عادل خان کے مقابلے پر آئے۔ اس کی اس تجویز سے عیسی خان حجاب نے اختلاف کیا اور

اس کے نقصان اور خطرے سمجھا کر اسے چنار جانے سے روک دیا۔

بھائیوں میں مقابلہ

سلیم شاہ اپنے قابل اعتماد دو تین ہزار قدیم ملازمین کو لے کر شہر سے باہر مقابلے کے لیے نکلا۔ ان امیروں کو جنھیں اس نے عادل خان کے پاس قاصد بنا کر بھیجا تھا یہ کہلوا کر بلا لیا کہ مجھے عادل خان کا کوئی اعتبار نہیں، خدا جانے وہ تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم لوگ لوٹ آؤ۔ اب میرے اور اس کے درمیان تیز زبان سے ہی بات چیت ہوگی۔ آگرے کے علاقے میں دونوں فوجوں میں بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اور عادل خان شکست کھا کر تنہا چہت کی طرف نکل گیا خواص خان اور عیسیٰ خان نیازی نے میوات کا راستہ لیا، کیوں کہ یہ دونوں دل و جان سے ایک دوسرے کے شریک تھے۔ سلیم شاہ کے ایک لشکر نے ان دونوں کا پیچھا کیا۔ قصبہ فیروز پور میں اس لشکر کو انھوں نے شکست دے کر بھگا دیا لیکن سلیم شاہ کا خوف ایسا تھا کہ وہ کمایوں کے پہاڑی علاقہ کے راجہ کے پاس جا کر پناہ گزیں ہوگئے۔ سلیم شاہ نے اس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے قطب خان کو نامزد کیا اور وہ عرصے تک ان پہاڑوں میں لوٹ مار کرتا رہا۔

جلال خان کا قتل

اس فتح کے بعد سلیم شاہ چنار گیا اور وہاں کے سارے خزانے اٹھوا کر گوالیار منتقل کر دیے۔ چنار سے لوٹ کر جب وہ گھاٹم پور کے قصبے میں آیا تو اس نے جلال خان جلوانی کو چوگان کھیلنے کے بہانے اپنے خیمے میں بلایا۔ جلال خان بڑی حیثیت والا پٹھان سردار تھا اور دل سے عادل خان کا طرفدار تھا اس لیے سلیم شاہ اس کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگا ہوا تھا، چنانچہ جیسے ہی وہ اندر آیا۔ سلیم شاہ نے اسے اور اس کے بھائی خداداد کو گرفتار کروا کے ایک پٹھان کے حوالے کر دیا۔ یہ پٹھان پہلے ہی جلال خان سے کسی خون کا انتقام لینے کی فکر میں

تھا، اس طرح سلیم شاہ نے قصاص کا بہانہ کر کے جلال خان کو قتل کرا دیا اور وہاں سے آگرہ لوٹ آیا۔ کچھ عرصے بعد سلیم شاہ نے آگرے کے بجائے گوالیار کو پایہ تخت بنالیا اور عادل خان کے طرف داروں کو ختم کرنے کی تدبیروں میں لگا رہا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے بساط سلطنت پر سے ایک ایک کر کے مخالف مہروں کو اٹھادیا اس کی اس کاروائی سے قطب خان بھی خوف زدہ ہو گیا اور گکھڑوں کی مہم چھوڑ کر لاہور میں ہیبت خان نیازی کے پاس چلا گیا۔ یہ نیازی وہی امیر ہے جسے شیر شاہ نے اعظم ہمایوں کا خطاب عطا کیا تھا۔ ہیبت خان نے قطب خان کو پناہ نہ دی بلکہ سلیم شاہ کے مطالبے پر اسے مقید کر کے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ سلیم شاہ نے قطب خان، شہباز خان اور دوسرے تیرہ چودہ نامی امیروں اور امیر زادوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ ان میں سے اکثر کو بارود سے اڑا دیا گیا۔

محمود خان کا قتل

ان مظلومین میں عادل خان کا بیٹا محمود خان بھی تھا جس نے سات سال کی عمر میں شیر شاہ کو لشکر کے اطراف ریت کے بوروں کا حصار بنانے کی تدبیر بتلائی تھی اور شیر شاہ نے اس کو اپنا ولی عہد کہہ دیا تھا۔ اسی سال سلیم شاہ نے لاہور سے اعظم ہمایوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ عذر کر کے خود نہ آیا بلکہ اپنے بھائی سعید خان کو جو بڑا بہادر اور عقل مند آدمی تھا، بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلیم شاہ بظاہر اس سے بھی بڑی مہربانی اور عنایت سے پیش آتا رہا لیکن دل ہی دل میں اسے بھی ٹھکانے لگانے کی فکر کرتا رہا۔

دیوار مرگ

ایک دن وہ اسے تنہا اپنے محل میں لے گیا اور وہاں بعض امیروں کے سر دکھائے جنہیں اس کے حکم سے زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم انہیں پہچانتے ہو یہ کون کون ہیں؟'' سعید خان نے ان کے نام بتلا دیے جنہیں وہ جانتا تھا۔

باہر آنے کے بعد سعید خان نے جان بچا کر بھاگنے کی فکر کی اور لاہور کے راستے میں ڈاک چوکی کا انتظام کرا کے تین راتوں میں آگرے سے لاہور چلا گیا۔

کمال خان کا قصہ

سلیم شاہ نے جن امیروں کو گوالیار کے قید خانے میں بارود میں آگ لگا کر جلوا دیا تھا ان میں سے صرف کمال خان کھوکر زندہ بچ گیا تھا۔ اس کے بچ جانے کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ اس کی بہن سلیم شاہ کے نکاح میں تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ رات میں قیدیوں کو بارود لگا کر جلا دیا جائے گا تو اس نے اس کی اطلاع اپنے بھائی کمال خان کے پاس بھجوا دی اور ساتھ ہی روئی سے بھرے چار لحاف اور کئی مشک پانی بھی اس کے پاس بھیج دیا۔ کمال خان نے غسل کے بہانے سے ان لحافوں کو پانی میں اچھی طرح بھگو دیا اور ان کو اوڑھ کر سب سے الگ ایک کونے میں جا کر لیٹ گیا۔ جب آگ لگائی گئی تو سارے قیدی جل کر راکھ بن گئے مگر کمال خان ان لحافوں میں زندہ بچ گیا۔ صبح جب سلیم شاہ آتشزدگی کا تماشہ دیکھنے قید خانہ میں آیا تو اسے سلامت دیکھ کر کہا تو چونکہ میرے ساتھ سچا خلوص رکھتا تھا اس لیے تجھے آگ نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اب میں تجھے بھی نقصان نہیں پہنچاؤنگا۔ چنانچہ اسے رہا کر کے حاکم پنجاب کے ہمراہ کھوکروں کے علاقے میں تعینات کر دیا۔ وہاں اس نے بڑا اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔

اعظم ہمایوں کی بغاوت

اعظم ہمایوں نے اپنے بھائی سعید خان کے واپس آجانے کے بعد خود مختاری اختیار کر لی اور کافی قوت فراہم کر کے لاہور میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سلیم شاہ نے اس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ہر جگہ کے لشکر بلا لیے اور ایک بڑی فوج لے کر آگرے سے لاہور کی طرف یلغار کی۔ راستے میں مالوہ کے حاکم بزاول خان نے حاضر ہو کر باریابی حاصل کی۔ بادشاہ نے

اس پر بڑی عنایتوں کا اظہار کیا، بعد میں یزاول خان اپنی بعض مصروفیتوں کا بہانہ کر کے اجازت لے کر لشکر سے رخصت ہو گیا۔ سلیم شاہ دہلی پہنچ کر چند روز رکا اور وہاں لشکر کو منظم کر کے لاہور کی طرف کوچ کر گیا۔ خواص خان اور عیسیٰ خان نیازی بھی کمایوں کی پہاڑی سے اعظم ہمایوں کے پاس آ گئے تھے۔ یہ سب باغی امیر اپنے اپنے لشکر لے کر بادشاہ سے مقابلے کے لیے شہر سے روانہ ہوئے۔ سردیوں کا موسم شروع ہو گیا، انبالہ کے قریب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔ جس دن لڑائی ہونے والی تھی اس رات کو ان امیروں کی مجلس مشاورت میں اعظم ہمایوں نے خواص خان سے پوچھا: ''فتح حاصل ہو جائے تو تخت پر کون بیٹھے گا؟'' خواص خان نے جواب دیا۔ ''شیر شاہ کا بڑا بیٹا عادل خان ہی سلطنت کا حق دار ہے۔'' نیازیوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور کہنے لگے: ''یہ بھی خوب رہا جائیں تو ہم لڑائیں اور سلطنت کا حق دار دوسرا بنے۔ سلطنت کوئی میراث تو نہیں بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتی ہے۔'' خواص خان کو نیازیوں کا یہ ادعا پسند نہ آیا کیونکہ وہ دل و جان سے شیر شاہ اور اس کی اولاد کا خیر خواہ تھا۔ جب صبح مقابلہ ہوا تو بڑی لڑائی کے بعد خواص خان عیسیٰ خان کو ساتھ لے کر میدان جنگ سے کنارہ کش ہو گیا اور کسی طرف کو نکل گیا۔

نیازیوں کی شکست

نیازیوں نے سلیم شاہ کے مقابلے میں بڑی جرأت دکھائی لیکن تقدیر میں ناکامی لکھی تھی اس لیے بُری طرح شکست کھائی۔ اعظم ہمایوں کے بھائی سعید خان نے اس وقت اپنا حلیہ تبدیل کر لیا اور چند سواروں کے ساتھ سلیم شاہ کے لشکر میں پہنچ گیا۔ وہاں پوچھتا پھر رہا تھا: ''بادشاہ کہاں ہے؟ میں اسے مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔'' وہ اس بہانے سے سلیم شاہ تک پہنچ کر اس کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ اس وقت سلیم شاہ نے ہاتھیوں کے حلقے میں اپنی نشست رکھی تھی۔ اتفاقاً کسی نے ہاتھی بان سعید خان کی آواز پہچان لی اور اس پر نیزہ سے وار کیا اور وہاں ایک ہجوم سا لگ گیا۔ سعید خان اس ہنگامے سے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا۔ نیازیوں کی فوج منتشر ہو کر رہ۔ قصبہ دھنکوٹ میں بھاگ گئی۔ جو

بھاگ نہ سکے ان کو جاٹوں اور گنواروں نے لوٹ مار کے تباہ کر دیا۔ ان میں کچھ ابتالہ کی ندی میں ڈوب کر مر گئے۔ سلیم شاہ نے نیازیوں کا رہتاس تک خود پیچھا کیا اور وہاں سے خواجہ ویس شیروانی کو ایک بھاری لشکر دے کر روانہ کیا اور خود آگرہ لوٹ آیا اور وہاں سے گوالیار چلا گیا۔

خواص خان کا حملہ

عیسیٰ خان اور خواص خان جو نیازیوں کا ساتھ چھوڑ کر میدان جنگ سے نکل گئے تھے، ان میں سے عیسیٰ خان تو پہاڑوں کی طرف چلا گیا لیکن خواص خان پانچ چھ سو سواروں کو لے کر لاہور لوٹ آیا۔ اس وقت سلیم شاہ کی طرف سے لاہور کا حاکم شمس خان لوحانی تھا۔ وہ کسی ضرورت کی وجہ سے لاہور سے باہر تیس کوس پر گیا ہوا تھا۔ خواص خان نے اپنے سواروں کے ساتھ لاہور پر حملہ کرنے کے لیے مرزا کامران کے باغ میں پڑاؤ ڈالا۔ شہر والے قلعے کے اندر بند ہو گئے اور شمس خان کے آنے تک حملہ آوروں سے لاہور کی حفاظت کرتے رہے۔ اس اثناء میں خواص خان نے باغ کے اونچے اونچے پیڑ کاٹ کر زینے بنانے کا ارادہ کیا تھا لیکن اسی وقت اطلاع ملی کہ رائے حسین جلوانی اور دوسرے سلیم شاہی امیر تیس ہزار سواروں کے ساتھ بہت ہی قریب آ پہنچے ہیں۔

خواص خان کی بہادری

جس وقت رائے حسین وہاں پہنچا تو خواص خان نے عیسیٰ خان سے مشورہ کر کے لاہور کی فکر چھوڑ دی اور اپنے سواروں کو لے کر بلائے ناگہانی کی طرح مدد کے لیے آنے والی فوج پر چڑھ دوڑا۔ ان کے اس ہلاکت خیز حملے کو دیکھ کر رائے حسین نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ: ”اس مصیبت کو یہاں سے نکل جانے دو اور ان کے جانے کے لیے راستہ چھوڑ دو۔“ خواص خان کے سوار اس فوج کو چیر کر دوسری طرف نکل گئے، پھر پیچھے سے پلٹ کر حملہ کر

دیا۔ اس وقت خواص خان کا زانو زخمی ہو گیا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا لیکن غنیم کے آدمیوں کو آگے بڑھ کر اسے گرفتار کر لینے کی ہمت نہ ہوئی اس کے آدمی اسے چارپائی پر ڈال کر سب کے سامنے سے لے کر نکل گئے۔ رائے حسین نے اپنے لشکر کو ان کے تعاقب سے روک دیا اور خواص خان صحیح سلامت نگرکوٹ پہنچ گیا جہاں سے وہ کمایوں کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اعظم ہمایوں کے نیازیوں نے بادشاہ سے شکست کھا کر کشمیر کا رخ کیا۔ وہاں کی گھاٹیوں میں کشمیریوں نے دھوکے سے ان سب کو نیست و نابود کر دیا۔

سزاول خان کی بغاوت

سزاول خان بھی بادشاہ سے سرکش ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے کسی باعث عثمان نامی ایک پٹھان کا ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ وہ پٹھان انتقام کی فکر میں تھا، چنانچہ اس نے 994ھ/1586ء میں موقع پا کر سزاول خان پر تلوار سے حملہ کر دیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسے گمان ہوا کہ پٹھان نے یقیناً سلیم شاہ کے اشارہ ہی پر حملہ کیا تھا، اس وجہ سے وہ سلیم شاہ سے کٹ کر مالوہ کی طرف چلا گیا۔ بادشاہ نے بانس والہ تک اس کا تعاقب کیا لیکن وہ سرود کے زمینداروں کے علاقے میں ایسا گم ہو گیا کہ اس کا پتہ نہ چلا۔ سلیم شاہ نے عیسیٰ خان سور کو بیس ہزار سوار دے کر اجین میں چھوڑ دیا اور خود گوالیار واپس ہو گیا۔

سلیم شاہ کے انتظامات

سلیم شاہ نے اپنی حکمرانی کے آغاز میں ہندوستان کی تمام بڑی بڑی سرکاروں میں پانچ پانچ ہزار سوار متعین کر دیے تھے۔ ان سواروں میں نظام سوار کا بیٹا مبارز خان بھی شامل تھا۔ یہ سلیم شاہ کا چچا زاد بھائی اور سالا بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا بعد میں سلطان محمد عدلی خطاب ہوا ہے۔ سلیم شاہ نے مبارز خان کو سنبھل کی سرکار میں اجاون کے علاقہ پر بیس ہزاری منصب دے کر روانہ کیا تا کہ خواص خان یا کوئی اور باغی اس جانب سے فتنہ انگیزی نہ

کرے۔ پائندہ خبرک کو بادشاہ نے مبارز خان کا نائب مقرر کیا تھا۔ اپنے ابتدائی عہد میں سلیم شاہ نے شیر شاہ کی بنائی ہوئی سرایوں کے درمیان ہر جگہ ایک ایک اور سرائے بنانے کا حکم دیا تھا۔ اس سرائے کے ساتھ مسجد خانقاہ اور آبدار خانوں کا بھی انتظام رکھا گیا تھا۔ اس نے عام لنگر بھی جاری کرائے جس میں مسلمانوں کو تو پکا ہوا کھانا ملتا تھا اور ہندوؤں کو اناج۔ سلیم شاہ نے ایک حکم کے ذریعے ان تمام لوگوں کے روزینے حسب سابق بحال رکھے جن کو شیر شاہ نے جاری کیا تھا۔ اس نے حکم دے کر امراء کے گھروں سے پاتروں کے اکھاڑے برخاست کرا دیے، جن کا ہندوستان میں بڑا رواج تھا۔ امرا سے بادشاہ نے تمام ہاتھی بھی لے لیے، صرف کمزور اور لاغر ہتھنیاں جو بوجھ اٹھانے کے کام کی نہ تھیں رہنے دیں۔ سلیم شاہ نے حکم دیا کہ بادشاہ کے سوا سرخ سراپردہ اور کوئی نہ لگائے۔ اس نے تمام ملک کو اپنا خالصہ قرار دے دیا۔ فوجیوں کی تنخواہ اسی قاعدے پر جاری رکھی جس پر شیر شاہ کے عہد میں تقسیم ہوئی تھی۔ سلیم شاہ نے ہر سرکار میں حکم نامے جاری کیے۔ ان میں دینی، دنیوی، جزئی، کلی، مالی اور ملکی تمام معاملات کے متعلق قوانین درج تھے اور ان طریقوں کی وضاحت تھی جن کے مطابق فوج، رعیت اور تاجروں کو معاملات کرنے چاہئیں۔ حکام کے لیے بھی تفصیلی لائحہ عمل درج تھا۔ جس میں تمام امور کے بارہ قوانین لکھ دیے گئے تھے۔ یہ لائحہ عمل اتنا مکمل تھا کہ اس کے بعد حکام کو بہت کم ضرورت پڑتی تھی کہ وہ کسی معاملے میں قاضی یا مفتی سے دریافت کریں۔

سلیم شاہی لائحہ عمل

سلیم شاہ نے اپنے ہر سردار کو ایک ایک جوتی اور ایک ایک ترکش دے رکھا تھا۔ ہر جمعہ کو بیس ہزاری، دس ہزاری اور پانچ ہزاری تمام امیر آٹھ فٹ اونچا خیمہ لگوا کے سلیم شاہ کی جوتی اور ترکش کو ایک کرسی پر رکھتے تھے اور ان چیزوں کو سب سے پہلے لشکر کے سردار پھر منصف یعنی امین پھر دوسرے افسر اور عہدے دار جھک جھک کر سلام کرتے تھے اور بڑے ادب و ترتیب کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے تھے پھر منشی مذکورہ حکم نامہ کو جو اسی صفحات پر

مشتمل تھا، لے کر داخل ہوتا تھا اور اسے اول سے آخر تک پڑھتا تھا۔ اس میں ہر مشکل مسئلے کے شق اور حل تفصیل سے درج تھے، اسی کے مطابق سارا نظم و نسق چلایا جاتا تھا۔ اگر کوئی امیر کسی بھی معاملے میں اس لائحہ عمل کے خلاف کام کرتا تو منشی اس کی خبر بادشاہ کو پہنچا دیتا تھا اور اس امیر کو مع اہل و عیال سزا دی جاتی تھی۔ سلیم شاہ کے آخری عہد تک یہی معمول اور طریقہ تھا۔ میں (مؤلف منتخب التواریخ) 955ھ/1548ء میں کم عمر لڑکا تھا۔ اس وقت میں فرید تارن پنج ہزاری کے لشکر کے ساتھ اپنے نانا کے ہمراہ بجوارہ گیا تھا، بجوارہ بیانہ کا ماتحت علاقہ ہے۔ وہاں میں نے یہ کیفیت یعنی لائحہ عمل پڑھنے کی رسم اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس سے پہلے 954ھ/1547ء میں بھی ایک مرتبہ ایسی محفل کو دیکھ چکا تھا۔

نیازیوں کی ذلت

خواجہ اویس شروانی کو سلیم شاہ نے اعظم ہمایوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دھن کوٹ کی سرحد پر نیازیوں کے مقابلے میں شکست کھائی اور اعظم ہمایوں نے سرہند تک اس کا پیچھا کیا۔ بادشاہ نے ایک دوسرا بڑا لشکر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا اور اس نے نیازیوں کو شکست دے دی۔ ان کی بعض عورتیں بھی شاہی لشکر کے ہاتھ آ گئیں۔ سلیم شاہ نے ان کو بے عزت کرا کے قلعہ گوالیار میں بھیج دیا غنیمت جو نیازیوں کے پاس سے ہاتھ لگا تھا، وہ سب بادشاہ نے طوائفوں کو دے دیا اور ان طوائفوں میں سے کسی کو اعظم ہمایوں کسی کو سعید خان اور کسی کو شہباز خان کا خطاب دیا۔ ان طوائفوں کے دروازوں پر نوبت کے وقت نقارے بجتے تھے۔ اس شاہانہ الطاف کی وجہ سے ان کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ یہ رنڈیاں جمعہ کی شب میں دربار کے دستور کے مطابق سلیم شاہ کے پاس سلام کرنے جایا کرتی تھیں، اس وقت نقیب بلند آواز سے کہتا تھا: ''بادشاہ ہم نظر و دولت اعظم ہمایوں خان نیازی، سعید خان نیازی، شہباز خان نیازی دعا کے لیے حاضر ہیں۔'' سلیم شاہ کی یہ حرکت پٹھانوں کو بڑی ناگوار تھی، کیونکہ وہ سب آخر کار ایک ہی برادری اور قبیلے کے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ خطاب علم اور نقارے پہلی فتح کے وقت ہی طوائفوں کو دیے گئے تھے۔

پٹھانوں سے بدگمانی

اس شکست فاش کے بعد اعظم ہمایوں کی طاقت کم ہو گئی۔ نیازیوں کی جمعیت بکھر گئی اور انھیں پھر مقابلے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ رہتاس کے نواح میں گکھڑوں کی پناہ میں تھا پھر کشمیر کے پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہو گیا تھا۔ سلیم شاہ نے ایک بڑا لشکر لے کر نیازیوں کے مکمل استیصال کے لیے کوچ کیا۔ پنجاب پہنچنے کے بعد اس نے شمالی پہاڑیوں میں پانچ قلعوں کو تھانے کے لیے تعمیر کرایا، جیسے مانکوٹ، رشیدکوٹ وغیرہ۔ سلیم شاہ پٹھانوں سے بڑا بدگمان ہو گیا تھا، اس لیے اس نے لشکر کے پٹھانوں کو ذلیل کرنے کے لیے قلعوں کی مرمت پر لگا دیا اور وہ دو سال تک چونا پتھر ڈھوتے رہے۔ اس عرصے میں اس نے ان کو ایک حبہ بھی تنخواہ کا نہیں دیا۔ جو اس مصیبت سے بچ گئے تھے ان کو گکھڑوں کے مقابلے پر لگا دیا گیا۔ گکھڑ حسب عادت دن بھر ان پٹھانوں سے لڑتے تھے اور رات میں چوری چھپے چھاپہ مار کر ان کے لشکر میں سے عورت، مرد، باندی اور غلام جو بھی ہاتھ لگ جاتا اڑا لے جاتے تھے اور ان اسیروں کو کچھ عرصے قید میں رکھ کر بیچ دیتے تھے۔

فرملی کا لطیفہ

پٹھان ان مصیبتوں اور ذلتوں سے تنگ آ گئے لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ سے کچھ کہتا۔ ایک دن شاہ محمد فرملی نے، جو ایک نامی امیر تھا اور نہایت خوش طبع ہزل گو اور گستاخ بھی تھا، سلیم شاہ سے کہا کہ میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے کہ ”آسمان سے تین تھیلیاں اتریں، ایک میں سونا ایک میں کاغذ اور ایک میں خاک بھری ہوئی تھی۔ سونا تو دفتر کے ہندوؤں کے گھر چلا گیا، کاغذ شاہی خزانے میں رہے اور خاک سپاہیوں کے سر پر پڑی۔“ سلیم شاہ کو یہ لطیفہ بہت پسند آیا اور اس نے خوش ہو کر حکم دیا کہ جب ہم گوالیار لوٹ کر جائیں تو سارا حساب کر کے سپاہیوں کی دو سال کی تنخواہ ادا کر دی جائے۔ اس حکم کی تعمیل سے پہلے ہی سلیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔

نیازیوں کا حشر

نیازیوں کو کشمیریوں نے جو بڑے مکار ہوتے ہیں، دھوکا دے کر اپنے یہاں بلا لیا اور راستے سے بھٹکا کر گھاٹیوں میں پھنسا دیا پھر سلیم شاہ کے اشارے سے ان کا راستہ بند کر کے ان پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں نیازیوں کی عورتیں بھی اپنے وقار و عزت کی خاطر لڑ کر مر گئیں۔ خود اعظم ہمایوں کی ماں اور بیوی بھی مقابلہ کرتی ہوئی پتھروں کے نیچے دب کر مر گئیں۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ مشہور ہے کہ شیر شاہ کے زمانے میں ان نیازیوں نے سنبھل کے قبیلے کے پٹھانوں کو وعدہ کر کے بلایا تھا اور پھر عہد توڑ کر کے شیر شاہ کے اشارے سے اس قبیلے کے دو ہزار آدمیوں کو عورتوں بچوں سمیت ہلاک کر دیا تھا۔ زمانہ کا پھیر دیکھیے کہ ان کا کیا ان کے آگے آیا۔ کشمیریوں نے ان تینوں بھائیوں کے سر کاٹ کر سلیم شاہ کے پاس بھیج دیے۔

کامران مرزا کی توہین

جس زمانے میں سلیم شاہ نے گکھڑوں پر فوج کشی کی تھی اور مال گڑھ کا قلعہ بنانے میں مصروف تھا، کامران مرزا ہمایوں سے شکست کھا کر کابل سے ہندستان آیا تھا تاکہ سلیم شاہ سے مدد لے کر ہمایوں سے دوبارہ مقابلہ کرے۔ سلیم شاہ نے اس کے استقبال کے لیے اپنے لشکر میں ہیموں بقال کو منتخب کیا اور اس کے ہمراہ پٹھانوں کو روانہ کیا۔ ہیموں بقال پہلے بازار کا نگراں تھا، لوگوں کی چغلیاں کھا کر اور مخبری کر کے وہ سلیم شاہ کے یہاں قابل اعتبار بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مرزا بھی اسے قابل اعتبار سمجھے گا لیکن مغل شہزادہ میرزا کامران کے آنے سے خوف زدہ ہوا اور اسے ہندستان کا رخ کرنے پر پشیمانی سی ہوئی۔ مرزا کو توقع تھی کہ سلیم شاہ ملاقات کے وقت تعظیم و تکریم سے پیش آئے گا۔ لیکن جب وہ ملنے گیا تو سلیم شاہ دربار میں بڑے تکبر اور غرور کے ساتھ تخت پر بیٹھا رہا۔ سرمست خان افغان داؤدزئی نے جو بارگی کے عہدے پر تھا، معمولی ملازمین کے درجہ کی تعظیمات ادا کیں اور نہایت بد

تیزی کے ساتھ مرزا کی گردن کو بادشاہ کے سامنے جھکا کر چلا چلا کر کئی مرتبہ کہا: "بادشاہ نظر دولت کامران مقدم زادہ کابل دعا کرتا ہے۔" سلیم شاہ نے نہایت بے پروائی کے ساتھ مرزا کو دیکھا اور کہا خوش آمدی اور اپنے سراپردہ کے قریب اس کے لیے ایک خیمہ اور شامیانہ لگوا دیا اور ایک خلعت، ایک کنیز اور ایک خواجہ سرا اس کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے خدمت پر مقرر کر دیے۔ کبھی کبھی مرزا کو اپنے یہاں بلا کر شعر و سخن کی باتیں کر لیا کرتا تھا، لیکن یہ صحبتیں تلخ رہتی تھیں۔ کامران مرزا ان تکلفات اور مراسم سے نہایت تنگ آچکا تھا۔ اپنی زندگی سے بیزار اور نکل بھاگنے کا موقع دیکھ رہا تھا۔ پٹھان ہندی زبان میں اسے چھیڑا کرتے تھے۔ جب وہ دربار میں آتا تو کہتے تھے "موز" آتا ہے۔ ایک مرتبہ مرزا نے سلیم شاہ کے حضور ایک امیر سے پوچھا "موز" کسے کہتے ہیں؟ اس نے جواب دیا "مرد عظیم الشان" کو اس وقت سلیم شاہ نے حکم دے دیا آئندہ کوئی مرزا کے متعلق یہ لفظ نہ کہے اور نہ اس کی ہنسی اڑائے۔

کامران مرزا کا فرار ہونا

ایک دن سلیم شاہ نے مرزا سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ مرزا نے فی البدیہ یہ شعر پڑھا:

گردش گردون گردان گردنانرا گرد کرد
برسر اہل تمیزان ناقصان را مرد کرد

سلیم شاہ اس وقت تو اس کنایہ کو سمجھ کر ٹال گیا لیکن خفیہ احکام جاری کر دیئے کہ: "مرزا کی سخت نگرانی کی جائے تاکہ وہ کہیں نکل کر جا نہ سکے۔" مرزا نے زمینداروں کے ذریعے کسی پہاڑی راجہ کو بہت سے وعدوں کے ساتھ اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے بھاگنے میں مدد دے۔ چنانچہ راجہ نے چناب کے کنارے تک گھوڑوں کی ڈاک بٹھا دی اور کامران رات میں چادر اوڑھ کر ڈیرے سے نکل گیا۔ محافظوں نے سمجھا مرزا کے

سراپردہ سے کوئی عورت نکل کر جارہی ہے۔ اس کے بعد مرزا گھوڑے پر سوار ہوکر دریا پار کرگیا اور اس راجہ کے یہاں چلا گیا۔ وہاں سے برقع اوڑھ کر ایک نگہبان کے ساتھ راجہ کے آدمیوں کے ہمراہ آگے روانہ ہوگیا۔ جب وہ موضع گھری میں دریائے بہت کے کنارے پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس لیے وہاں رُک گیا۔ یہ موضع سلطان پور کے علاقے میں قلعہ رہتاس سے تین کوس پر ہے۔ کسی نے سلطان پور کے حاکم سلطان آدم کو خبر پہنچادی کہ ایک مغل عورت جلودار کے ہمراہ تنہا فلاں جگہ ٹھہری ہوئی ہے اور وہ صبح وہاں سے چلی جائے گی۔ سلطان آدم نے آدمی دوڑا کر تحقیق کرائی۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ خود مرزا سے ملاقات کے لیے آیا۔ مرزا نے سلطان آدم کی بڑی خوشامد کر کے اس سے یہ قول لیا کہ وہ اسے اس کے مقام تک پہنچا دے گا۔ اس وقت ہمایوں بھی کہیں قریب پہنچا ہوا تھا۔ سلطان آدم نے سارا حال اس کے پاس لکھ بھیجا اور مرزا کی جان بخشی کی درخواست کی۔ ہمایوں نے اس کے حسب مرضی فرمان لکھ کر بھیج دیا اور دو سال بعد مرزا کو اپنے یہاں طلب کر کے اس کی آنکھوں میں نشتر پھیر کر اسے مکہ معظمہ کو روانہ کر دیا۔ اس واقعہ کی تاریخ اسی لفظ "نیشتر" سے نکلتی ہے سارا واقعہ اکبرنامہ اور تاریخ نظامی میں تفصیل سے درج ہے۔

شاہ محمد دہلوی کا قصہ

سلیم شاہ کے واقعات میں شاہ محمد دہلوی کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ شاہ محمد شیر شاہ کے زمانے میں ایران سے ہندستان آیا تھا اور اپنے آپ کو سید کہتا تھا لیکن لوگوں کو اس کے سید ہونے میں شکوک وشبہات تھے۔ اس نے اپنی حالت مشائخ جیسی بنا رکھی تھی۔ لیکن یہ سب مکر اور ڈھونگ تھا۔ شیر شاہ پر اس نے اپنے ولی ہونے کا سکہ جما دیا تھا۔ سلیم شاہ بھی شاہزادگی کے زمانے میں اس کا بڑا معتقد تھا اور اس کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی بادشاہت کی فال نکلوایا کرتا تھا۔ اسے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اس کی جوتیاں تک اٹھایا کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص شاہ محمد کے لیے خربوزوں سے بھرا ہوا ٹوکرا لے کر آیا۔ سلیم شاہ بھی اس وقت وہاں پہنچ گیا۔ شاہ محمد نے اس سے کہا: "اس ٹوکرے کو ہم چتر شاہی

سمجھ کر تجھے دیتے ہیں اٹھا سر پر رکھ اور چل۔" سلیم شاہ نے عقیدت میں بے تکلف اس بوجھ کو اٹھا لیا اور اسے اپنے لیے اچھا شگون سمجھا لیکن بعد میں ایسی باتیں اس کو ناگوار گزرنے لگیں اور وہ شاہ محمد سے ناراض رہنے لگا۔ سلیم شاہ کے زمانہ میں عالی نسب سید بھی ہندستان آئے تھے۔ یہ دونوں بڑے عابد، زاہد، خوش اخلاق اور وجیہ تھے۔ ان میں سے جو خادم تھا اس کا نام امیر طالب تھا اور دوسرا اس کا بھتیجہ میر شمس الدین اس کا مخدوم تھا۔ یہ دونوں عراق سے سفر کرتے ہوئے پنجاب میں سلیم شاہ کے لشکر میں وارد ہوئے اور وہاں سے دہلی آ کر کسی محلّے میں رُکے۔ بہت ہی جلد لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ میر طالب کو فن طب میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اکثر مریض اس کے علاج سے شفایاب ہونے لگے۔ اس طرح ان کو لوگوں کی طرف سے خاصی فتوحات، نذر اور نیاز ملنے لگیں۔ لوگوں میں یہ بھی مشہور ہو گیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی انگوٹھی کا نگینہ ان کے پاس ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ جس کے دل میں کوئی میل ہو اس نگینے کے سامنے اس کی چہائی دھندلی پڑ جاتی ہے۔ محمد شاہ کی ان لوگوں سے پہلے کی جان پہچان تھی، سابقہ تعارف کی بنا پر اس نے اپنی بیٹی کا نکاح میر ابو طالب سے کر دینا چاہا۔ لیکن ابو طالب نے یہ رشتہ پسند نہ کیا، اس وجہ سے بھی لوگ شاہ محمد کے سید ہونے کے بارے میں اور بھی زیادہ بدگمان ہو گئے۔ شاہ محمد نے ان دونوں سیدوں کو اپنی ہی حویلی میں ایک محفوظ جگہ روک لیا اور ان کی خدمت میں لگا رہا۔

قتل کی واردات

چند دن بعد ایک اندھیری رات میں چند مسلح آدمی شاہ محمد کے بالا خانے سے اتر کر آئے اور ان دونوں کو جو اس وقت تہجد میں مشغول تھے، شہید کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور صبح حاکم شہر نے خود آ کر شاہ محمد سے تفتیش کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں قطعاً اس معاملے سے واقف نہیں ہوں اور نہیں جانتا کہ ان کے قاتل کون ہیں؟ پھر اس نے اسی مضمون کا ایک محضر نامہ دہلی کے بڑے بڑے لوگوں کی مہریں لگوا کر

سلیم شاہ کے پاس بھی بھیج دیا۔ سلیم شاہ نے شیخ الاسلام اور صدر الصدور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو واقعے کی تحقیقات کے لیے دہلی روانہ کیا اور ہر طرف فرامین بھیج کر اکابر علماء جیسے میاں حاتم سنبھلی اور میاں جمال خان مفتی وغیرہ کو بلوایا۔ دو ماہ تک برابر اس واردات کی تحقیق و تفتیش ہوتی رہی۔ آخر بڑی تلاش و سعی کے بعد قرینہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ محمد نے ہی قاتلوں کو ان کے قتل کے لیے لگایا تھا۔ غرض ان علماء نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ بادشاہ کے پاس روانہ کردی۔ شاہ محمد کو اتنے بلند مرتبے سے اس ذلت تک پہنچنے کا بڑا صدمہ تھا۔ اس نے بادشاہ کا جواب آنے سے پہلے ہی فصد کھلوائی اور اس حال میں دہی پی لیا جس کے اثر سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ بعض لوگ اس واقعے کے متعلق کچھ اور تفصیل بھی بتاتے ہیں۔ بہر حال شاہ محمد کا بہروپ سب پر کھل گیا کہ اس کی وضع قطع، عبادت و ریاضت سب مکر تھا اور یہ واقعہ 986ھ/1578ء میں پیش آیا۔

شیخ علائی کا واقعہ

دور سلیم شاہی کا دوسرا واقعہ بیانہ کے شیخ علائی مہدوی سے متعلق ہے اور وہ سیدی مولا کے واقعے سے ملتا جلتا ہے، جس کا ذکر ہم سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے حالات میں کر آئے ہیں۔ شیخ علائی کے باپ کا نام حسن تھا اور وہ بنگال کے مشائخ میں سے تھے وہ اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ نصراللہ جو بڑے صاحب علم شخص تھے زیارت کعبہ کے لیے گئے اور وہاں سے لوٹ کر بیانہ میں آکر مقیم ہوگئے۔ اس سال کی تاریخ ہے: وجاء نصراللہ والفتح بیانہ میں آکر بڑے بھائی پیری مریدی کے مشغلے میں اور چھوٹے بھائی درس و تدریس میں معروف ہوگئے۔ شیخ حسن کی اولاد میں سے شیخ علائی سب سے زیادہ نیک سیرت تھے۔ تقوی اور سلیم الطبعی کے آثار بچپن ہی سے ان کے چہرے سے جھلکتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنے باپ سے تمام علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کر لی۔ طبع اور سرعت ذہن فطرت نے ودیعت کیا ہی تھا، بہت ہی جلد تدریس وافادے میں نامور ہوگئے باپ کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ ترک کرکے سجادہ نشینی اختیار کرلی اور اپنے

اوقات زہد و عبادت، ارشاد و تلقین میں گزارنے لگے۔ اس علم و کمال اور پارسائی کے باوجود نفس امارہ کا ڈنک نہیں ٹوٹا تھا۔ اس لیے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کسی دوسرے شیخ کا رتبہ ان کے مرتبے سے بڑھ کر ہو جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک ریاکار صوفی کو پالکی سے اتار کر لوگوں میں خوب ذلیل کیا۔ اس وقت تک علائی کی دلی منشا یہ تھی کہ ”صرف میں ہی خاص و عام میں مقبول و مشہور رہوں۔ شیخ علائی کے دوسرے بھائی عمر میں گو ان سے بڑے تھے لیکن فضیلت کی وجہ سے سب نے ان کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور ان کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے۔

عبداللہ نیازی کا مسلک

اسی دوران شیخ سلیم چشتیؒ کے ایک خلیفہ میاں عبداللہ نیازی پٹھان اپنے شیخ سے اجازت لے کر حج کے سفر پر گئے۔ وہاں انھوں نے بڑی ریاضتیں کیں اور ہر قسم کے ذکر و اشغال پورے کیے۔ حرمین ہی میں وہ میر سید محمد جونپوری جن کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، معتقد ہو گئے اور مہدوی مسلک اختیار کر کے ہندستان واپس آئے۔ بیانہ میں آبادی سے دور باغ کے ایک گوشے میں حوض کے کنارے سکونت اختیار کی ان کا معمول تھا کہ خود پانی کے گھڑے بھر کر اپنے سر پر اٹھا کر لے جاتے تھے اور اس طرف کام کرنے والے لکڑ ہاروں، کسانوں وغیرہ کو اکٹھا کر کے نماز پڑھایا کرتے تھے جو کوئی پس و پیش کرتا اسے وہ اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ دے کر جماعت کی طرف راغب کرتے تھے۔ شیخ علائی نے ان کے طریقے کو بہت پسند کیا اور اپنے معتقدوں سے کہا، دیکھو دین اور ایمان اس کا نام ہے جو میاں عبداللہ نیازی کا سلوک ہے اور ہم لوگ جس روش پر ہیں وہ محض بت پرستی اور زنار داری ہے۔ غرض کچھ ہی دن میں علائی ان بزرگ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ باپ دادا کے طریقے کو ترک کر دیا۔ مشیخت اور پارسائی کی دکان بڑھا دی۔ سارا غرور و تکبر بالائے طاق رکھ دیا اور ان تمام لوگوں سے جن کو انھوں نے ناراض کر رکھا تھا منت و خوشامد کر کے معافی چاہی اور رضا مند کر لیا۔ خانقاہ اور لنگر کی بھیڑ بھاڑ چھوڑ کر

قلندرانہ روش اختیار کر لی اپنا سارا مال و اسباب یہاں تک کہ کتابیں بھی محتاجوں میں تقسیم کر دیں۔ بیوی سے کہا: ''اگر تجھے فقر و فاقہ منظور ہے تو بسم اللہ میرے ساتھ رہ، اگر نہیں تو اس مال میں سے اپنا حصہ لے لے، پھر تو خود مختار ہے جہاں چاہے گزر کر لے، وہ نیک بی بی اسی فقر و فاقہ پر بخوشی رضامند ہو گئی۔

شیخ علائی کی تحریک

اب کہیں جا کر نفس امّارہ کا سر کچلا گیا اور شیخ علائی طلب صادق کے ساتھ میاں عبد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا اور جس ذکر کا وہ شغل کرتے تھے خود بھی اس کا ورد رکھا۔ اس ریاضت سے کلام پاک کے رموز و معانی، نکات ودقائق بہت جلد ان پر کھل گئے۔ ان کے مرید اور خادم جن میں بعض غیر شادی شدہ اور بعض گھر بار والے تھے اللہ کے توکل پر ان کی خدمت میں لگے رہے اور ان سے ذکر و شغل کے طریقے سیکھنے لگے۔ ان کے مریدوں میں تین سو آدمی خانہ دار تھے۔ یہ لوگ کوئی پیشہ یا تجارت نہیں کرتے تھے کہیں سے کچھ مل جاتا تو آپس میں تقسیم کر لیتے۔ اگر ان میں سے کبھی کوئی کمائی کر بھی لیتا تو اس میں سے دسواں حصہ ضرور راہِ خدا میں دے دیتا۔ روزانہ دو وقت ایک تو فجر کے بعد اور ایک کسی اور نماز کے بعد سب چھوٹے بڑے ایک حلقے میں بیٹھ جاتے اور قرآن کے معانی و مطالب کا درس لیتے۔ شیخ علائی کا بیان ایسا اثر انگیز تھا کہ جو کوئی ایک مرتبہ بھی ان کو سن لیتا پھر وہ سارا گھر بار، بال بچوں کو چھوڑ کر ان کا ہو جاتا اور کسی مشغلے کی طرف رخ نہ کرتا۔ یہ سب ایسے قانع اور متوکل تھے کہ اگر بھوک کے مارے ان کا دم بھی نکلتا ہو تو ان میں سے کوئی دم نہ مارتا تھا۔ جو بھی اجنبی ان کی محفل میں چلا جاتا تو کم سے کم وہ اپنے گناہوں سے ضرور پچھتاوا کرتا۔ ان میں سے اکثر کا تو یہ حال تھا کہ رات میں اپنے کھانے اور استعمال کے برتن اوندھا کر کے رکھ دیتے تھے یہاں تک کہ نمک، آٹا اور پانی بھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا بس اس رزق دینے والے کی رزاقی پر توکل کر کے رات گزار دیتے تھے، صبح اللہ تعالی بہر حال کہیں نہ کہیں سے ان کا رزق ان کے

پاس پہنچا دیتا تھا۔ دنیاوی اسباب سے یہ بے نیازی تھی لیکن ہتھیار اور جنگ کا سامان دشمنوں کے مقابلے کے لیے ہر شخص کے پاس رہنا لازمی ہوتا تھا۔ اس لیے جو بھی ان کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ مالدار اور صاحب حیثیت لوگ ہیں محتاج نہیں۔ ان سب کا کام یہ تھا کہ شہر اور بازار میں جو بھی بات شریعت کے خلاف نظر آتی اسے وہ جبراً روک دیتے تھے اور اس معاملے میں سرکاری حکام سے ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہ ہوتے تھے اور ان کے مقابلے میں اکثر غالب ہی رہتے تھے چنانچہ شہر کے جو حاکم ان کے معتقد تھے وہ تو ان کی ہر طرح مدد کرتے تھے اور جو ان کو نہیں مانتے تھے وہ بھی ان کے ڈر سے دم نہیں مارتے تھے۔ شیخ علائی کی تحریک اس تیزی سے پھیلی کہ باپ بیٹے کو، بھائی بھائی کو، شوہر بیوی کو چھوڑ کر مہدوی دائرے میں شامل ہو گیا۔

شیخ علائی کا سفر

شیخ علائی کی اس تحریکی جدوجہد اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میاں عبداللہ کے اوقات میں خلل پڑنے لگا اور وہ اس ہنگامہ آرائی کے متحمل نہ ہو سکے۔ آخر کار ایک دن انھوں نے شیخ کو بلا کر نہایت نرمی کے ساتھ نصیحت کی کہ یہ رونق ہمیشہ نہیں رہتی اور اس زمانے کے لوگوں کو حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ تمھیں لوگوں کی روک ٹوک سے کیا غرض یا تو خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کرو یا حج کا ارادہ کر لو۔ شیخ علائی نے اپنے مددگار کے حسب منشاء اسی وضع اور حالت میں چھ سات سو آدمیوں کے ہمراہ گجرات کا اس ارادے سے قصد کیا کہ وہاں طریقہ مہدویہ کے کسی پیشوا کی صحبت سے فیض حاصل کریں۔ جب وہ بیانہ سے نکل کر قصبہ بساور میں پہنچے تو میرے والد (مؤلف منتخب التواریخ) مرحوم ان کی خدمت میں مجھے بھی لے کر گئے تھے۔ چونکہ میں اس وقت بہت کمسن تھا اس لیے مجھے ان کی صورت صرف خیالوں میں یاد ہے۔ اس سفر میں شیخ علائی جب جودھ پور کے قریب خواص پور میں پہنچے تو خواص خان جو اس جانب مامور تھا ان کے استقبال کے لیے آیا اور ان کا معتقد ہو گیا لیکن خواص خان نہ صرف یہ کہ صوفیوں کی محفل سماع میں شرکت کرتا تھا بلکہ اپنے سپاہیوں کا

حق بھی مار لیتا تھا اور شیخ علائی کسی خلاف شرع بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ان کی اور خواص خان کی نبھ نہ سکی اور کچھ دوسرے اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ شیخ علائی گجرات سے لوٹ کر پھر بیانہ آ گئے۔

علائی دربار شاہی میں

جب سلیم شاہ تخت نشین ہوا اور شیخ علائی کا شہرہ اس کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطان پوری کے بہکانے میں آ کر میر رفیع الدین محدث اور ابو الفتح تھانیسری9 اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو جمع کیا اور شیخ علائی کو بھی بیانہ سے بلوایا۔ شیخ علائی اپنے چند ہر دم ساتھ رہنے والے خاص خاص مریدوں کو لے کر جو ہمیشہ زرہ پہنے ہتھیار باندھے رہتے تھے، دربار میں آئے اور اس شان سے کہ انھوں نے شاہانہ آداب و مراسم کی کوئی پرواہ نہ کی اور مسنون طریقے پر بادشاہ کو السلام علیکم کہا۔ سلیم شاہ نے ان کے سلام کا بڑی حقارت و بیزاری سے جواب دیا۔ شیخ علائی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور امام مہدی چوں کہ تمام دنیا کے بادشاہ ہوں گے اس لیے لازمی طور پر شیخ کا ارادہ بھی بغاوت کا ہوگا۔ اس لیے یہ شخص قتل کے لائق ہے۔ عیسیٰ حجاب نے جو بڑا مقرب امیر تھا، شیخ علائی کو پھٹے کپڑوں، ٹوٹی جوتیوں کے ساتھ اس خستہ حالت میں دیکھا تو کہنے لگا۔ کیا اچھا ہے، ذرا اس کی ہیئت کذائی تو دیکھو ان پھٹے حالوں میں ہم سے بادشاہت لینا چاہتا ہے۔ کیا ہم پٹھان مر گئے ہیں؟

شیخ علائی کی تقریر

شیخ علائی نے دربار کی ان چبھتی ہوئی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا اور گفتگو کے شروع ہونے سے پہلے اپنے معمول کے مطابق قرآن کی چند آیتیں تلاوت کیں اور ان کی تشریح کرتے ہوئے دنیاداری کی مذمت، احوال قیامت اور علمائے زمانہ کی دنیا طلبی اور بے عملی پر ایسی موثر اور درد انگیز تقریر کی کہ سلیم شاہ اور اس کے درباریوں پر سکتہ چھا گیا اور باوجود

قساوت قلبی کے ان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔ یہ بیان سن کر سلیم شاہ محفل سے اٹھ کر محل سرا میں چلا گیا اور شیخ علائی اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانا وغیرہ بھجوا دیا۔ لیکن شیخ علائی نے اس کا کھانا نہ کھایا اور اپنے رفیقوں سے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ ضرور کھالے۔ جب سلیم شاہ لوٹ کر باہر آیا تو شیخ نے اس کی تعظیم بھی نہ کی۔ بادشاہ نے جب ان سے پوچھا کہ "تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟" تو انھوں نے بلا جھجک جواب دیا "تم نے جو اپنے حق سے زیادہ خزانے کا روپیہ خلاف شریعت جمع کر رکھا ہے وہ تمہاری ملکیت نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا حق ہے اور تمہارا کھانا بھی اسی قسم کا ہے"۔ سلیم شاہ کو یہ سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گیا۔

مہدویت پر مباحثہ

اب علماء نے شیخ علائی سے مسئلہ مہدویت پر گفتگو شروع کی لیکن شیخ کا یہ زور بیان تھا کہ سب کے لب سِل گئے ہوں۔ میر سید رفیع الدین صفوی نے جن کا انتقال 954ھ/1548ء میں ہوا، ان احادیث کو بیان کیا جن میں امام مہدی کی علامتوں کا ذکر ہے۔ شیخ نے ان کو جواب دیا کہ تم شافعی مذہب ہو اور ہم حنفی ہیں، ہمارے تمہارے اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ان لیے تمہاری توجیہیں اور تاویلیں ہم تسلیم نہیں کر سکتے، پھر ہم تمہارے استدلال کو کیسے مان لیں؟"۔ تو دنیا دار فاسق ہے، دائرہ عدل سے باہر ہے، اعلانیہ تیرے گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آتی ہیں اور حدیث صحیح میں ہے: "جو مکھی نجاستوں پر بیٹھتی ہے وہ اس عالم سے ہزار درجے بہتر ہے جو بادشاہوں اور امیروں کی خوشامد میں لگا رہتا ہے"۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے بے عمل عالموں کی خوب خبر لی اور اپنے سارے بیان کو آیتوں اور حدیثوں سے ثابت کیا، یہاں تک کہ ملا عبداللہ کو دم مارنے کی مجال نہ رہی اور وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

ملا جلال کا لطیفہ

مباحثے کے دوران ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ ایک دن اسی بحث کے سلسلے میں آگرے کے ملا جلال10 بیہم دانشمند نے وہ حدیث جس میں امام مہدی کے حلیہ کا ذکر ہے پڑھی اور اس میں لفظ "اجل الجبہۃ" پڑھا۔ "اجل" جلال سے مشتق اور "جلیل" کی تفضیل ہے۔ شیخ علائی سن کر مسکرائے اور کہا "عوام میں تو اپنے آپ کو بڑا عالم مشہور کرتا ہے اور حال یہ ہے عربی کی عبارت بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اس حدیث کی رموز و نکات، اشارہ و کنایہ کو کیا خاک سمجھے گا۔ یہ لفظ اصل میں "اجلی الجبہۃ" ہے اور اجلی "جلی" کی تفضیل ہے نہ کہ تیرے نام جلال کی"۔ وہ اس گرفت پر ایسا خفیف ہوا کہ پھر اس نے آخر تک دم نہ مارا۔

سلیم شاہ سے گفتگو

سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ شیخ کی تقریر پر عش عش کرنے لگا اور کچھ ایسا فریفتہ ہوا کہ ان سے کہا: "تم مجھ کو ہمیشہ قرآن کا وعظ سنایا کرو مگر مہدوی مذہب کو ترک کردو اور میرے کان میں چپکے سے اس مذہب سے انکار کے متعلق کہہ دو اگر تم کو یہ قبول ہو تو میں تمھیں اپنی سلطنت کا محتسب مقرر کردوں گا اور آج تک تم جو امر معروف اور نہی منکر میری اجازت کے بغیر کرتے رہے ہو۔ اب یہ سب میری اجازت سے کیا کرو گے، علماء نے تمہارے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے لیکن میں تمہارا لحاظ کرتا ہوں اور تمہارا خون بہانا نہیں چاہتا۔"

شیخ علائی کی جلاوطنی

شیخ اس بے کار سے ادعا پر جو ضروریات دین میں بھی شامل نہیں ایسے متعصب تھے کہ انھوں نے کسی بھی صورت میں بادشاہ کا کہنا نہیں مانا اور اسے بیباکانہ جواب دیا کہ "تمہاری باتوں میں آکر میں اپنا اعتقاد نہیں بدل سکتا۔" اسی دوران ہر روز سلیم کے سننے میں آتا کہ

آج فلاں سردار شیخ کا مرید ہو گیا اور فلاں امیر ان کے معتقدوں میں شامل ہو گیا اور دنیا کے معاملات چھوڑ دیے۔ ادھر ملا عبد اللہ برابر بادشاہ کو شیخ کے قتل پر ترغیب دے رہا تھا۔ آخر سلیم شاہ نے شیخ کو حکم دیا کہ "تم اس ملک سے نکل جاؤ اور دکن میں جا کر سکونت اختیار کر لو۔"

دکن میں مہدویت

دکن میں مہدوی مسلک کافی پھیل چکا تھا۔ خود شیخ عرصے سے وہاں جانے کے آرزومند تھے۔ یہ حکم تو ان کے لیے خوشخبری سے کم نہ تھا۔ چنانچہ وہ بے تامل دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ دکن کی سرحد پر جب وہ ھنڈیہ پہنچے تو وہاں کا حاکم بہادر خان جس کا لقب اعظم ہمایوں شروانی تھا، انکا معتقد ہو کر اس مسلک کا پیرو بن گیا۔ وہ ہر روز ان کا وعظ سنا کرتا تھا۔ اس کا آدھے سے بھی زیادہ لشکر شیخ کا معتقد ہو چکا تھا۔ مخبروں نے یہ خبریں بادشاہ تک پہنچائیں۔ یہ بات اسے بڑی ناگوار گزری۔ مخدوم الملک تو شیخ علائی سے خار کھائے بیٹھا تھا، انھوں نے جھوٹ سچ ملا کر بادشاہ کو اور بھڑکایا، یہاں تک کہ سلیم شاہ نے علائی کو واپس لانے کے لیے فرمان صادر کیا۔

عبد اللہ نیازی کا واقعہ

اسی دوران سلیم شاہ نیازی پٹھانوں کا فتنہ رفع کرنے کے لیے آگرے سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا۔ جب وہ اس سفر میں بیانہ کے قریب بساور میں پہنچا تو مخدوم الملک نے بادشاہ سے عرض کیا: "شیخ علائی کا تو معمولی فتنہ تھا جس سے نجات مل گئی سب سے بڑا فتنہ شیخ عبد اللہ نیازی ہے جو علائی کا مرشد اور سارے نیازیوں کا پیر ہے اور ہمیشہ وہ تین چار سو مسلح آدمیوں کو لے کر بیانہ کے پہاڑوں میں دنگا فساد کرتا رہتا ہے۔" یہ سن کر سلیم شاہ کو جو نیازیوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، اس کو تو آگ سی لگ گئی اسی وقت حاکم بیانہ میاں بھوہ

کے پاس فرمان بھیجا کہ "شیخ نیازی کو فوراً حضور میں روانہ کر دو۔" میاں بھوہ شیخ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اس نے خفیہ طور سے جا کر شیخ سے درخواست کی کہ: "اس وقت مصلحت یہی ہے کہ آپ یہاں سے کسی طرف کو نکل جائیں پھر بادشاہ کو آپ کا خیال بھی نہ رہے گا اور میں یہاں سے کوئی معقول عذر لکھ کر روانہ کر دوں گا۔ شیخ عبداللہ نے اس کی بات قبول نہ کی اور اس سے کہا۔ بادشاہ کے دل سے میرا خیال نہیں جائے گا۔ ویسے بھی مخدوم الملک ہمیشہ تاک میں لگا رہتا ہے، میں کہیں دور دراز چلا بھی جاؤں اور پھر بادشاہ مجھے وہاں سے طلب کرلے تو مجھے لیے سفر کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اس وقت جب کہ بادشاہ صرف دس کوس پر ہے میں اس سے جا کر مل لوں۔ خدا کا جو حکم ہے بہر حال وہ پورا ہو کر ہی رہے گا۔

شیخ نیازی لشکر شاہی میں

غرض یہ بزرگ راتوں رات چل کر شاہی لشکر میں پہنچ گئے اور صبح جس وقت سلیم شاہ کوچ کے لیے سوار ہو رہا تھا شیخ نے "السلام علیکم" کہا۔ میاں بھوہ نے زبردستی ان کی گردن یہ کہتے ہوئے جھکا دی" اے شیخ بادشاہوں کو اس طرح سلام کرتے ہو۔" شیخ نے بھوہ کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جو سلام سنت اور جو رسولؐ اپنے صحابہ کو کیا کرتے تھے اور صحابہ رسولؐ کو وہ یہی طریقہ ہے جو میں نے کیا اس کے سوا میں کسی اور سلام کو نہیں جانتا۔" سلیم شاہ نے غضبناک ہو کر پوچھا علائی کا پیر یہی ہے؟ ملا عبداللہ نے جو گھات میں لگا ہوا تھا فوراً کہا ہاں یہی ہے۔ بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے اس مرد حق کو لاتوں گھونسوں پر رکھ لیا، لکڑیوں اور کوڑوں سے خوب پٹائی کی۔ شیخ کو جب تک ہوش رہا وہ یہ آیت پڑھتے رہے۔ ربنا اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین سلیم شاہ نے پوچھا، کیا کہتا ہے"؟" ملا عبداللہ نے کہا: "مجھ کو اور آپ کو کافر کہہ رہا ہے" سلیم اور زیادہ غصہ ہو گیا اور ان کو اور زیادہ اذیت پہنچائی۔ غرض بادشاہ برابر ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں سوار کھڑا رہا

اور اس مظلوم کو بے گناہی کے گناہ میں سزا دیتا رہا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا دم نکل گیا ہے تب چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ شیخ میں جان باقی تھی، اسی وقت لوگوں نے ان کو چمڑے میں لپیٹ کر ایک رات ایک دن برابر آگ کی گرمی میں رکھا اور انھیں کچھ ہوش آیا۔ یہ حادثہ 955ھ/1548ء میں پیش آیا۔

شیخ نیازی کی مہدویت سے توبہ

کچھ عرصے بعد شیخ نے بیانہ چھوڑ سیاحت اختیار کی اور افغانستان کی پہاڑی میں جا کر کافی مدت قیام کیا۔ پھر عرصے تک پٹن میں بجوارہ کی سرحد پر انبیر اور امبرسر کے درمیان مقیم رہے۔ شیخ کہا کرتے تھے: ''اہل قیل وقال کی صحبت کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔'' آخر میں جب شیخ سہرند میں آکر رہے تو انھوں نے مہدوی مسلک سے توبہ کرلی اور اس عقیدے سے تمام مہدویوں کو باز رہنے کی تلقین کی۔ جس زمانے میں اکبر بادشاہ نے اٹک 11 کا سفر کیا تھا اس نے شیخ موصوف کو سہرند میں بلا کر ان کے بیٹوں کے نام بطور معاش کچھ اراضی مقرر کردی تھی شیخ عبداللہ نیازی نے نوّے سال کی عمر میں 1000ھ/1591ء میں انتقال کیا۔

مخدوم الملک کی فتنہ پردازی

جب سلیم شاہ نیازیوں کا قلع قمع کرکے آگرے واپس آیا تو مخدوم الملک ملا عبداللہ نے بادشاہ کو شیخ علائی کے خلاف پھر بھڑکانا شروع کیا اور کہا۔ شیخ علائی کو تو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ ھندیہ میں بدستور موجود ہے۔ بہادر خان اس کا مرید اور معتقد بن گیا ہے اور اس کا سارا لشکر شیخ کا مطیع ہو گیا ہے، اندیشہ ہے کہ وہ کوئی فتنہ برپا نہ کرے۔ سلیم شاہ نے دوبارہ شیخ علائی کو بلایا اور اس قضیے کو یکسر نمٹا دینے کا ارادہ کیا۔ سلیم شاہ بخوبی جانتا تھا کہ شیخ عبداللہ صاحب غرض ہے اور آگرہ اور دہلی میں کوئی عالم علائی سے بحث کرنے کے قابل نہیں اس لیے اس نے حکم دیا کہ شیخ علائی کو بہار میں شیخ بدھ طبیب دانش

مند کے پاس لے جاؤ اور وہ جو بھی حکم دیں اس کے مطابق عمل کرو۔ شیخ بدہ بڑے نامی گرامی عالم تھے۔ "ارشاد قاضی" پر ان کی شرح بڑی معتبر اور مشہور ہے۔ شیر شاہ تو انکا ایسا معتقد تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے ان کے آگے رکھا کرتا تھا۔

علائی شیخ بدہ کی خدمت میں

شیخ علائی جب وہاں پہنچے تو بدہ طبیب کے گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انھوں نے شیخ بدہ کی مجلس میں اور بھی خلاف شرع باتیں دیکھیں جن کا ذکر مناسب نہیں۔ ان سے بھلا کہاں رہا جاسکتا تھا، بے محابا وہ شیخ بدہ کو ان حرکتوں پر ملامت کرنے لگے۔ شیخ بدہ اس وقت کافی بوڑھے ہو چلے تھے، ان میں بات کرنے کی بھی قوت نہ تھی، ان کے بیٹوں نے جواب میں کہا: "ہندستان میں بعض رسمیں ایسی مروج ہو گئی ہیں اگر ان سے منع کیا جائے اور اتفاق سے اس اثناء میں جان و مال کا کوئی نقصان ہو جائے تو ہندستان کی بے وقوف عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ نقصان اس رسم کے روکنے کی وجہ سے ہوا اور اس صورت میں ان کے بالکل ہی منکر اور کافر ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے، کافر ہو جانے سے ان کا فاسق رہنا ہی غنیمت ہے۔" شیخ علائی نے کہا: "یہ ایک فاسد خیال ہے کیوں کہ جب پہلے ہی سے کہ عقیدہ ہو کہ گناہ کے چھوڑنے سے جان یا مال کا نقصان ہوتا ہے اور سنت کے موافق عمل کرنے سے آدمی مر جاتا ہے تو وہ پہلے ہی سے کافر ہے پھر ان کے اسلام کا لحاظ کرنا کوئی ضروری نہیں بلکہ اس صورت میں تو نکاح کی حالت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس تقریر سے شیخ بدہ کے بیٹے اور ہم نشین قائل ہو گئے اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگے اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ شیخ بدہ طبیب نے بھی منصف مزاجی سے کام لیا۔ ان کے اعتراض کو مان کر ان تمام باتوں سے توبہ و استغفار کر لیا۔

شیخ بدہ کا خط

شیخ بدہ نے ان کے متعلق بادشاہ کے نام پہلے جو خط لکھا تھا اس کا مضمون یہی تھا کہ: "مسئلہ مہدویت پر ایمان کا انحصار نہیں اور امام مہدی علیہ السلام کی علامات میں بھی بڑا اختلاف ہے، اس لیے قطعی طور سے شیخ علائی پر کفر یا فسق کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کو اس مسئلہ میں جو غلطیاں ہیں وہ دور کرا دی جائیں۔ یہاں کیاب ہیں وہاں کے علماء کے کتب خانوں میں بے شمار کتابیں ہوں گی اس لیے اس مسئلہ کی اسی جگہ بہتر طور پر تحقیق ہو سکتی ہے۔ شیخ بدہ نے اس خط میں اپنے طور پر شیخ علائی کے بچاؤ کے پہلو رکھے تھے۔ لیکن ان کے بیٹوں نے انھیں سمجھایا کہ ملا مخدوم صدر الصدور ہیں آپ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اس صورت میں لازماً بادشاہ آپ کو طلب کرے گا۔ اس ضعیفی میں یہ طویل سفر بہت دشوار ہوگا۔ بیٹوں کی اس گزارش پر شیخ بدہ نے وہ خط روانہ نہیں کیا اور انھوں نے دوسرا خط لکھا۔ لیکن ان کے بیٹوں نے باپ سے چھپا کر سلیم شاہ کو خط لکھا جس میں انھوں نے ملا عبد اللہ کی بڑی خوشامد کی تھی۔ انھوں نے خوشامد اس طرح کی تھی: "آج اگر کوئی بڑا محقق ہے تو وہ ملا عبد اللہ مخدوم الملک ہی ہیں وہ جو بھی فتویٰ دیں درست ہے۔"

شیخ علائی کی شہادت

یہ خط سلیم شاہ کو پنجاب میں ملا اور اس کے ساتھ ہی شیخ علائی بھی وہاں پہنچے۔ ان کی بادشاہ سے یہ ملاقات بن کے مقام پر ہوئی۔ بادشاہ نے خط پڑھنے کے بعد شیخ علائی کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ تم میرے کان میں مہدویت کے دعوی سے توبہ کر لو پھر جہاں چاہو چلے جاؤ۔ شیخ علائی نے اس مرتبہ بھی بادشاہ کے کہنے کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ملا عبد اللہ سے کہا: "اب تم کو اختیار ہے" پھر اس نے اپنے سامنے شیخ کو دُرّے لگانے کا حکم دیا۔ اتفاق سے شیخ علائی کی گردن میں طاعون کی گلٹی نکل آئی تھی اور دوا کے لیے اس پھوڑے میں ایک بتی رکھی جاتی تھی۔ ان دنوں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس پھوڑے کی تکلیف

کے علاوہ سفر کی تھکان سے بھی شیخ بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے تیسرے کوڑے ہی میں ان کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

سلیم شاہ کا بغض

بادشاہ کو اس پر چین نہ آیا۔ اس کے حکم سے اس مظلوم کی لاش کو ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر پامال کیا گیا اور ان کو دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ خدا کی عجیب شان ہے اسی وقت بڑی بھیانک آندھی اٹھی۔ یہ ایسی خوفناک آندھی تھی کہ لوگ سمجھنے لگے کہ اب قیامت آ گئی۔ سارے لشکر میں ان کا ماتم ہونے لگا اور سب کو یقین آ گیا کہ بس اب سلیم شاہ کی حکومت کی خیر نہیں۔ لوگوں نے ان کی جنازے پر اتنے پھول ڈالے کہ ان کا بدن پھولوں میں چھپ گیا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پھولوں کی قبر ہے۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے سیدی مولہ کو شہید کرا دیا تھا اور بہت جلد اس کو اس کی سزا مل گئی تھی یہ قصہ بھی اسی طرح کا ہے۔ سلیم شاہ کو تو اتنی بھی مہلت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس واقعے کے بعد دو سال بھی حکومت نہ کر سکا۔ یہ سارا فتنہ صرف ملا عبد اللہ کا برپا کیا ہوا تھا اس کو تو اہل اللہ سے بس دلی عداوت تھی۔ شیخ علائی کی شہادت 957ھ/1550ء میں ہوئی۔ میری عمر (مؤلف منتخب التواریخ) اس وقت دس سال تھی۔ اسی عمر میں میں نے ان کی شہادت پر یہ دو تاریخیں نکالی تھیں:

ایک: ذاکرالله

دوسری: سقاهم ربهم شرابا

خواص خان کا قتل

سلیم شاہ کے عہد کا ایک اور واقعہ خواص خان کے قتل کا ہے۔ جب خواص خان شکست کھا کر نیازیوں کے ساتھ پہاڑوں کی طرف چلا گیا تو سلیم شاہ نے اس کے پیچھے تاج خان

کرانی کو مقرر کیا۔ یہ تاج خان سلیمان کرانی کا بھائی تھا اور علم و فضل کی وجہ سے پٹھانوں میں نہایت ممتاز تھا۔ بادشاہ نے بن کی لشکرگاہ سے تاج خان کو لکھ بھیجا" اگر کسی اور طرح ممکن نہ ہو تو عہد و پیمان کر کے خواص خان کو بلاؤ اور دھوکے سے قتل کر دو"۔

حسب الحکم تاج خان نے بادشاہ کی طرف سے خواص خان کے پاس قول نامہ بھیج دیا۔ خواص خان سیدھا سادھا مسلمان سپاہی تھا اس قول و قرار پر بھروسہ کر کے تاج خان کے پاس آ گیا۔ تاج خان نے اسی وقت اسے قتل کر کے اس کا سر سلیم شاہ کے پاس قصبہ بن میں بھیج دیا۔ اس کی لاش پہلے تو سرتی میں جو سنبھل کے علاقے میں دفن کی گئی بعد میں اس کی لاش کو دہلی لا کر دفنایا گیا۔

خواص خان کے قتل کا واقعہ 959ھ /1551ء میں ہوا۔ اس کی تاریخ ہے: "معصیت بعالم شد" خواص خان نہایت بہادر اور کشادہ دل آدمی تھا۔ اس کا قصہ مشہور ہے کہ جس وقت وہ شیر شاہ کے ساتھ کالپی پہنچا تھا تو اس نے وہاں کے حلوائیوں کو دو لاکھ روپے پیشگی دیے تھے کہ وہ رتھنبور کو ہمیشہ مصری بھیجتے رہیں۔ اسی طرح بیانہ میں آم کے جتنے باغ تھے ان سب کے دام اس نے مالکوں کو اپنے پاس سے ادا کر کے انھیں حکم دیا کہ وہ ہمیشہ امیروں اور غریبوں کو آم بطور تحفہ دیتے رہیں، اسی اثناء میں شیر شاہ کا انتقال ہو گیا اور سلیم شاہ نے اسی حساب کے چوبیس ہزار روپے بقایا خواص خان سے وصول کر کے اپنے خزانے میں جمع کرا لیے تھے۔

اسی سال 959ھ/1551ء میں سلیم شاہ کے خاص مصاحب شیخ عبدالحی کا انتقال ہوا۔ شیخ جمالی کنبو کے بیٹے تھے، خود بھی بڑے عالم اور شاعر تھے، ان کی وفات پر آگرے کے شاہ میر نے یہ تاریخ لکھی تھی:

گفت نام حی شود تاریخ
بندہ وقتیکہ درمیان نبود

سلیم شاہ پر قاتلانہ حملہ

سلیم شاہ کا ایک اور مشہور واقعہ یہ ہے کہ سلیم شاہ قصبہ بن میں رکا ہوا تھا، ایک دن حسب عادت وہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی سواری پر تنہا قلعہ مان گڑھ کی سیر کے لیے جا رہا تھا، یہ قلعہ وہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر تھا راستے میں کوئی شخص فریاد کرتا ہوا سامنے آیا اور بادشاہ کا راستہ روک کر بغل سے تلوار کھینچی اور حملہ کر دیا۔ سلیم شاہ نے نہایت چستی سے اس وار کو اپنے کوڑے پر روک لیا کوڑے کا ہاتھ کی جانب کا حصہ کٹ گیا اور بادشاہ کو بھی کچھ زخم آیا۔ وہ شخص دوسرا وار کرنا چاہتا تھا کہ سلیم شاہ پہلو بچا کر اس سے لپٹ گیا اور اس سے تلوار چھیننے لگا۔ اسی وقت سزاول خان کا بیٹا دولت خان جسے سلیم شاہ نے اپنا چہیتا معشوق بنا رکھا تھا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے حملہ آور پر تلوار کا وار کیا اور بھی لوگ جمع ہو گئے اور اس کو پکڑ لیا تو سب اس سے پوچھنے لگے کہ تو نے یہ حرکت کس کے اشارے پر کی؟ سلیم شاہ نے لوگوں کو پوچھنے سے روکا اور کہا کہ نہ معلوم یہ بدمعاش بہت پیچ لگا کر کتنے گھروں کو برباد کر دے۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے اسے فوراً قتل کر دینے کا حکم دیا اس کی تلوار دیکھنے پر پتہ چلا یہ وہی تلوار ہے جو سلیم شاہ نے اقبال خان کو دی تھی۔ اقبال خان ایک کمینی فطرت والا آدمی تھا، عرصے تک وہ شیر شاہ کی خدمت میں رہا تھا۔ نہایت بدصورت اور انتہائی احمق اور نالائق تھا اس لیے لوگ اسے "رحمت الٰہی" کہہ کر چھیڑتے تھے۔ یہ کنایہ جولاہوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ سلیم شاہ نے خدمتگاری کے درجے سے اٹھا کر اسے اپنا مقرب بنا لیا تھا۔ اس کے اس تقرب پر نامی گرامی امرا تک حسد کرتے تھے۔ اس کی تلوار کو پہچاننے کے بعد سلیم شاہ نے اس کے مرتبے کو گھٹا دیا۔ لوگوں نے اسے قتل کر دینے کی ترغیب بھی دی لیکن بادشاہ نے کہا: "اپنے پروردہ کو مارنے میں مجھے شرم آتی ہے" سلیم شاہ پٹھانوں سے بدگمان تھا ہی، اس واقعے کے بعد وہ ان کا اور بھی دشمن ہو گیا اور انھیں ختم کر دینے کا عزم کر لیا۔

ہمایوں کے خلاف لشکر کشی

ان واقعات کے بعد سلیم شاہ اپنے دارالخلافہ گوالیار واپس ہوا، جب دہلی پہنچا تو خبر ملی ہمایوں ہندستان کے ارادے سے اٹک تک پہنچا ہے۔ اس وقت بادشاہ نے اپنے گلے پر جونکیں لگوائی تھیں، اس خبر کے سنتے ہی جونکوں کو نکلوا دیا اور جلدی میں نہایا بھی نہیں اور گلے پر کپڑا باندھ کر سو گیا۔ پھر وہ ہمایوں کے مقابلے کے لئے دہلی سے لوٹ کر شہر سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر جا کر رکا۔ اس وقت مسلسل سفر سے لشکری نہایت خستہ اور آشفتہ حال ہو چکے تھے۔ علم حاکم مرگ مفاجات کیا کرتے؟ اسی برے حال میں وہ اس کے پیچھے لگے رہے۔ خیر خواہوں نے بادشاہ سے عرض کیا "طاقت ور دشمن سے مقابلہ ہے یہاں لشکر کے سپاہی نہایت تباہ حال ہیں اگر ان کی پچھلی تنخواہیں دے دی جائیں تو مناسب ہوگا۔ سلیم شاہ نے جواب دیا اگر میں اس وقت تنخواہیں دے دوں تو میری غرض بھی جائے گی اس لیے فتح کے بعد دو سال کی تنخواہ ادا کروں گا۔ بیچارے پریشان حال لشکریوں نے یہ سن کر ایک آہ سرد کھینچی اور اسی بے سرو سامانی میں روانہ ہو گئے۔ امیروں نے عرض کیا توپیں تو لشکریوں کے ساتھ ہیں لیکن ان کو کھینچنے والے بیل گوالیار میں چھوڑ دیے گئے ہیں، اب کیا کیا جائے؟ بادشاہ نے کہا: "اتنے ہزار سپاہی آخر کس مرض کی دوا ہیں جو مفت تنخواہ پاتے ہیں۔" مجبور ہو کر افسروں نے پیادوں سے ہی بیل اور گدھوں کی طرح توپیں کھنچوائیں۔ بعض توپیں تو اتنی بھاری تھیں کہ ایک ایک کو ہزار ہزار بلکہ دو ہزار سپاہی کھینچتے تھے۔ اس مصیبت کے باوجود اتنی جلدی کوچ پر کوچ ہوئے کہ لشکر سات دن میں پنجاب پہنچ گیا۔ خبر یہ ہوئی کہ ہمایوں کسی مصلحت کی وجہ سے خود ہی کشمیر کی سرحد ہاتھا تک آ کر کابل لوٹ گیا۔

گوالیار کی جانب واپسی

ہمایوں کی واپسی کی خبر سن کر سلیم شاہ بھی گوالیار لوٹ آیا۔ اسی اثنا میں وہ شکار کے لیے قصبہ انتری گیا ہوا تھا۔ وہاں بعض امیروں کے اشارے پر کچھ مفسدوں اور اوباشوں

نے بادشاہ کا راستہ روک لیا۔ جب بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے سے شہر میں داخل ہوا۔ پھر اس سازش کے سرغنہ بہاء الدین، محمود اور عماد کو قتل کرا دیا۔ جن جن سے بادشاہ کو بدگمانی تھی ان میں سے بھی بعض قتل کر دیے گئے اور بعض کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس مرحلے کے بعد اس نے خزانہ کھلوا کر سپاہیوں کو دو سال کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے احکام جاری کر دیے اور اس حکم کو بذریعہ فرمان تمام پنج ہزاری اور دس ہزاری امیروں تک پہنچا دیا گیا۔ ابھی لشکر کے کچھ آدمیوں کو ہی تنخواہیں ملی تھیں کہ بادشاہ سخت بیمار پڑ گیا اور اکثر لوگ تنخواہ سے محروم رہ گئے۔

سلیم شاہ کی بیماری

کہتے ہیں سلیم شاہ کو بیٹھنے کی جگہ (مقعد) میں زخم نکلا تھا، بعض کہتے ہیں سرطان کا عارضہ تھا، اس درد سے بادشاہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ اس کی فصد بھی کھولی گئی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس بے قراری میں اس کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکل جاتا تھا۔ میں خدا کو اتنا غالب نہیں جانتا تھا (نعوذ باللہ) اس مرض کی بے قراری میں بھی یہ حال تھا کہ جب تک اس کے حواس ٹھکانے رہے اپنے معشوق یعنی دولت خان کو سامنے بٹھائے رکھتا تھا اور اس کی صورت دیکھتا جاتا تھا۔ جس وقت بھی غش سے چونکتا یہی کہتا: ''دولت خان کہاں ہے''؟

ضعف کی وجہ سے کروٹ لینا مشکل تھا لیکن اپنے محبوب کی یہ دلدہی تھی کہ اگر دولت خان دوسری طرف آ بیٹھتا تھا تو اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اسے اپنے سامنے آنے کی زحمت دے بلکہ لوگوں سے کہتا تھا میرا منھ اس کی جانب پھیر دو۔ ایک دن دولت خان موجود نہ تھا پوچھا وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا، کسی سے ملنے گیا ہے۔ سلیم شاہ سمجھا اس نے مجھے مرتا ہوا دیکھ کر اوروں سے پہلو جوڑ لیا ہے، اتنے میں دولت خان حاضر ہو گیا اس کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور سلیم شاہ نے یہ شعر پڑھا:

قدر من کی شناسی کہ چہانم بے وفا
باش تا صحبت یار ان دگر دریابی

میں نے (مؤلف منتخب التواریخ یعنی عبدالقادر بدایونی) معتبر آدمیوں کی زبانی سنا ہے کہ سلیم شاہ نے اپنے خزانچی کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر روز بغیر پوچھے دولت خان کو ایک لاکھ تنکہ تک ادا کر دیا کرو، اگر وہ اس سے زیادہ طلب کرے تو پوچھ لیا کرو۔

سلیم شاہ کی وفات

سلیم شاہ کا مرض نہ کم ہونا تھا نہ کم ہوا۔ معالج اور طبیب عاجز رہ گئے اور اسی طرح تڑپتے ہوئے وہ مر گیا۔ سلیم شاہ کی وفات 961/ 1553ء میں ہوئی۔ اس نے نو سال حکومت کی۔ اس کی میت بھی سہسرام لے جا کر شیر شاہ کے پہلو میں دفن کی گئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال گجرات کے خدا ترس عادل بادشاہ سلطان محمود گجراتی کو برہان نامی خدمتگار نے شہید کر دیا اور تو اور اسی سال دکن کے بادشاہ نظام الملک نے بھی انتقال کیا۔ یہ سال گویا بادشاہوں کی وفات کا سال تھا۔

حواشی

1 سور: افغانستان کے پہاڑی علاقہ روہ یا رن کے قبیلوں میں سور آباد تھے۔ یہ لوگ خود کو سلاطین غور سے منسوب کرتے تھے۔ اس قبیلہ کا مورث محمد سور تھا اور ابراہیم سور کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ اس کے بیٹے حسن خان سور نے نارنول (ہریانہ) میں انتقال کیا۔ اس کا مقبرہ وہیں ہے۔ اس کا بیٹا فرید خان (شیر شاہ) رجب 878ھ 1473ء میں پیدا ہوا۔ منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبد القادر بدایونی شیر شاہ کی ولادت کی تاریخ نہیں لکھتے ہیں۔

2 سہسرام: یہ ضلع بہار میں ہے۔ یہاں پر شیر شاہ کی پیدائش ہوئی تھی نیز اس کا مقبرہ بھی یہیں پر ہے۔ اس مقبرے کی عمارت تالاب کے وسط میں ہے جس کا طول گیارہ سو فٹ اور عرض ایک ہزار فٹ ہے۔ مقبرہ کی کرسی مربع، اوپر کی منزلیں ہشت پہلو، عمارت سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے۔ اس کا ہر پہلو ساٹھ فٹ لمبا ہے اور ہر پہلو میں ایک دروازہ ہے، اندر شیر شاہ کا مزار اور ایک مسجد ہے در و دیوار پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ درود شریف اور عمارت بننے کی تاریخ لکھی ہے۔ 957ھ/1550ء میں اس عمارت کو شیر شاہ کے بیٹے سلیم شاہ کی یادگار کہتے

ہیں۔ ہمایوں نے دوبارہ بادشاہ بن کر سہسرام کی ساری عمارتوں کو گرا دینے کا حکم دیا تھا۔ اس کی تعمیل کی گئی جب مقبرہ گرانے کی نوبت آئی تو حاکم نے بادشاہ کو لکھا کہ اس کے ساتھ مسجد بھی ہے۔ مقبرہ گرایا گیا تو وہ بھی شہید ہو جائے گی۔ ہمایوں نے مسجد کی وجہ سے مقبرے کو منہدم کرنے سے روک دیا۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ جب ہمایوں نے شیر شاہ کی بنوائی ہوئی تمام عمارات کو گرانے کا حکم صادر کیا تھا تو دلی کا پرانا قلعہ کیسے بچ گیا؟

3 حاجی پور: ابھی بھی یہ مقام حاجی پور کے نام سے معروف ہے مگر یہ ضلع ویشالی صوبہ بہار میں ہے۔

4 کچھ تو شوہر کے مرنے پر ستی ہو گئیں اور کچھ مردوں نے خودداری کے باعث جوہر کر لیا۔

5 عمرو بن لیث: ایران کے پہلے صفاری بادشاہ یعقوب لیث کا بھائی اور جانشین تھا۔ پایہ تخت اس کا خراسان تھا۔ بغداد کے خلیفہ معتضد نے اسے لشکر کشی کر کے شکست دی۔ جب وہ شیراز سے خراسان بھاگ کر آیا تو اسماعیل سامانی نے اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ یہاں وہ قید خانے میں رہا اور اسی قید خانہ میں مر گیا۔ وہ ایک آنکھ سے نابینا تھا اور تیرہ سال تک اس نے حکومت کی (بحوالہ Cambridge history of Iran vol III P. 217 -219).

6 کالنجر کے قلعے کے متعلق ابوالفضل اپنی معروف تصنیف آئین اکبری میں یوں لکھتا ہے "یہ سنگی قلعہ ہے جو سر بفلک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس میں بہت سے بت خانے ہیں۔ ایک بت کا نام" کال بھیروں ہے۔ یہ بت اٹھارہ ہاتھ لمبا ہے۔ قلعے میں متعدد چشمے اور بے شمار تالاب ہیں۔ قلعے کے اطراف میں گھنا جنگل ہے جس میں آبنوس کے درخت ہیں۔ ہاتھی اور شکاری جانور ملتے ہیں یہاں لوہے کی ایک کان بھی ہے آٹھ کوس کے فاصلے پر ہیروں کے ذرے بھی پائے جاتے ہیں۔

7 پنجاب یونیورسٹی اور نسخہ خدا بخش لائبریری نیز دیگر نسخوں میں سلیم خان کی جگہ پر

”اسلیم خان“ لکھا ہے شاید یہ کتابت کی غلطی ہے مگر اس کا نام سلیم خان تھا۔

8 مخدوم الملک: ان کا اصل نام عبداللہ سلطان پوری ہے ان کا تعلق سلطان پور، لاہور کے انصاری خاندان سے تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ خاص طور پر علم فقہ میں بڑی مہارت تھی۔ انھوں نے عربی لسانیات، فقہ، تاریخ اور دوسرے موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔

9 ابوالفتح: شیخ نصیر الدین اودھی دہلوی کے مریدوں میں سے گزرے ہیں تیمور کے حملہ کے بعد دہلی سے کالپی میں آکر مقیم ہو گئے تھے اور اسی جگہ وفات پائی ان کا مزار کالپی میں ہے حضور اکرم ﷺ کی نعت میں ان کا ایک فصیح و بلیغ قصیدہ ہے جس کے چند شعر شیخ المحدثین حضرت عبدالحق دہلوی نے ”اخبار الاخیار“ میں درج کیے ہیں۔ ان کا پورا نام شیخ ابوالفتح احمد تھانیسری تھا۔

10 ملا جلال: غالباً قاضی جلال الدین ملتانی سے مراد ہے یہ پہلے تاجر تھے بعد میں اکبر آباد (آگرہ) میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اکبر کے زمانے میں قاضی یعقوب کی معزولی پر عہدہ قضاوت پر مامور ہوئے۔ کہتے ہیں بہ لحاظ عدل و دیانت بہترین قاضی گزرے ہیں۔ اپنے بیٹے کی نازیبا حرکتوں کے خمیازے میں ان کو دکن کی طرف جلاوطن ہونا پڑا۔ دکن میں ان کی بڑی تعظیم ہوئی۔ دکن سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرما گئے۔

11 اٹک: حسن ابدال اور پشاور (پاکستان) کے درمیان واقع ہے کسی زمانے میں یہ شہر جنگی اہمیت رکھتا تھا 1581ء میں اکبر نے اس جگہ ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ قلعے کے کھنڈر اس کی گزشتہ رونق و آبادی کا پتہ دیتے ہیں۔

سلیم شاہ کی لطیفہ گوئی

سلیم شاہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اسے شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ ہر طرح کے اشعار اسے بکثرت یاد تھے۔ اکثر میر نعمت اللہ اشوئی سے شعر و سخن پر بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔ سمجھ بوجھ کے لحاظ سے نہایت ذہین تھا، اکثر لطیفے کہا کرتا تھا اور دوسروں سے لطیفے سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ بزرگ اور علماء کا بھی احترام کرتا تھا

کہتے ہیں پنجاب جاتے ہوئے جب وہ الور میں رکا تو ایک دن دور سے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کو آتے ہوئے دیکھا۔ مصاحبوں سے کہنے لگا: ''تم جانتے ہو یہ کون آ رہا ہے''؟ سب نے کہا ''حضور ہی بتلا دیں''! سلیم شاہ نے کہا: ''بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے چار تو ہندستان سے نکل گئے مگر پانچواں یہ باقی رہ گیا۔ سرمست خان نے کہا ''اس فتنہ کی جڑ کو آپ نے کیوں رہنے دیا''؟ سلیم شاہ نے کہا کیا کروں اس سے بہتر آدمی مجھے دوسرا نظر نہیں آتا''۔

جب ملا عبداللہ محفل میں پہنچے تو بادشاہ نے انھیں تخت پر بٹھایا اور ایک مروارید کی تسبیح جو تیس ہزار کی تھی اور اسی وقت کہیں سے پیش کش میں آئی تھی، ان کے حوالے کر دی۔

سلیم شاہ کو کسی نشہ کی عادت نہیں تھی، نماز کا ایسا پابند تھا کہ اس کی نماز کبھی جماعت سے نہیں چھوٹی۔

فیروز شاہ بن سلیم شاہ

سلیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا فیروز خان دس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا خطاب فیروز شاہ رکھا، لیکن اسے زیادہ عرصے تک حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔

سلیم شاہ کے سالے مبارز خان ولد نظام خان نے تیسرے ہی دن بھانجے کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جب اس کی بہن اور بادشاہ کی ماں بی بی بائی کو پتہ چلا تو وہ بھائی کے قدموں میں گر پڑی اور یہ منت کرنے لگی "بھیا خدا کے لیے اس معصوم کی جان کے پیچھے نہ پڑو بادشاہی تجھے مبارک، میں اسے لے کر کہیں چلی جاؤں گی کہ اس کا پتہ تک نہ چلے گا۔" لیکن ظالم ماموں نے ایک نہ سنی اور محل سرا میں گھس کر ماں کے سامنے اس کمسن کا سر کاٹ دیا۔ اس کی نسل بھی آگے نہ چل سکی۔

کہتے ہیں سلیم شاہ نے کئی بار مبارز خان کے قتل کا ارادہ کیا تھا اور اپنی بی بی سے کہا تھا "اگر تو اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو بھائی کا خیال چھوڑ دے اور اگر بھائی پیارا ہے تو اس بچے سے ہاتھ دھو لے"۔

اس نے ہمیشہ بھائی کی سفارش کر کے یہی جواب دیا کہ میرا بھائی عیش و عشرت میں لگا ہوا ہے۔ بادشاہی سے اس کا کیا سروکار؟ اس کا تو عدم اور وجود برابر ہے۔ سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ جس وقت بھی وہ مبارز خان کو دیکھتا تھا بی بی سے کہتا تھا دیکھو تو پچھتائے گی اور اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سلیم شاہ کا اندیشہ درست تھا وہی ہوا جو اس نے گمان کیا تھا۔

سلطان محمد عادل عرف عدلی

سلیم شاہ کا سالا مبارز خان سلطان محمد عادل کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تمام امراء اس کی بادشاہت پر رضامند ہوگئے۔ اس کا خطاب تو عادل تھا لیکن لوگوں میں عدلی کے لقب سے مشہور ہوگیا بلکہ اس کو بھی بگاڑ کر لوگ "اندھلی" کہنے لگے۔

مبارز خان سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ کے حالات سے بہت متاثر تھا اس لیے اس نے ہر بات میں اسی کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھا چنانچہ اپنے ابتدائی عہد میں خزانہ کھول کر اشرفی روپے خوب لٹائے اور اس عارضی سخاوت سے عام و خاص سب کو اپنا ہمنوا بنالیا لیکن یہ بہار صرف چند روز کی ہی تھی۔

اس نے وزارت کا منصب اپنے ایک غلام شمشیر خان کے حوالے کر دیا۔ یہ حضرت خواص خان کا چھوٹا بھائی تھا۔ وکالت کا عہدہ دولت خان تو مسلم کو ملا جس کی لوحانیوں نے پرورش کی تھی۔ ان کے ساتھ ہیمو بقال بھی ان مناصب میں شریک تھا۔ ہیمو میوات کے قصبہ ریواڑی کا رہنے والا تھا اور سلیم شاہ کے عہد میں بازار کی کوتوالی سے اونچے مراتب پر فائز ہوگیا تھا۔ محمد عادل نے اس بقال کو اس قدر عزت بخشی کہ وہ سلطنت کے ہر کام میں دخل دینے لگا۔

بغاوتوں کا آغاز

خود سلطان عادل عیش پسند تھا اس لیے اس کا زیادہ تر وقت راگ رنگ میں گزرتا تھا۔ سپہ گری اور مہم پسندی سے اس کو کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اس کی انہی عادتوں، شاہزادہ فیروز خان کے ظالمانہ قتل اور ہیمو کی سرپرستی کی وجہ سے لوگ اس سے سخت ناراض تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے منصب پر فائز پٹھان امیر اور سردار اپنی اپنی جگہ خود مختار ہونے لگے اور ابھی اس کی تخت نشینی کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہر طرف بغاوتیں شروع ہوگئیں اور ملک کا سارا نظم و نسق جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں کافی منظم اور مستحکم تھا، درہم برہم ہوگیا۔

دربار شاہی میں ہنگامہ

ایک دن محمد عادل گوالیار کے قلعے میں امرا کو جاگیریں تقسیم کر رہا تھا، اس موقع پر اس نے قنوج کی سرکار شاہ محمد فرملی سے لے کر سرمست کے حوالے کر دی، شاہ محمد کا بیٹا سکندر جو

ایک خوب رو اور بہادر نوجوان تھا اس تبدیلی پر ناراض ہو کر سخت لہجہ میں گفتگو کرنے لگا۔ شاہ محمد اس کا باپ اسے نرمی اور ملائمت کی نصیحت کرنے لگا اور اس گفتگو سے منع کرنے لگا سکندر نے باپ پر بھی بگڑ کر کہا۔ ”تم کو بھی شیر شاہ نے لوہے کے پنجرے میں قید کر دیا تھا۔ سلیم شاہ نے تم پر احسان کیا اور سفارش کر کے تم کو رہائی دلائی تھی، اب یہ سور پٹھان ہمیں نکالنے پر تل گئے ہیں، تم اس خطرے کو محسوس نہیں کر رہے ہو“۔ اسی طرح اس نے سرمست خان کو بھی سخت گالیاں دیں اور کہا ”یہ کتے بیچنے والا ہماری جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے“۔ سرمست خان طاقتور اور بلند قد والا تھا۔ اس نے سکندر کو گرفتار کرنا چاہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”اے فرزند اتنی تیزی کیوں دکھا رہا ہے“؟ سکندر اس کی نیت بھانپ گیا اور خنجر سے اس کے شانہ پر ایسا وار کیا کہ سرمست خان وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد سکندر نے جوش میں مجلس میں کئی امیروں کو قتل کر دیا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ جب سے ہندستان میں خنجر کا رواج ہوا ہے اس سے کسی نے اس طرح کام نہیں لیا جیسا کہ اس وقت سکندر نے لیا۔ اس ہنگامے کی وجہ سے بڑا شور و غل ہونے لگا اور عدلی شاہ بھاگ کر محل سرا میں گھس گیا۔ سکندر کچھ امیروں کو قتل کر کے اور کچھ کو زخمی بادشاہ کے پیچھے بھی لپکا اور اس پر تلوار سے وار کیا لیکن عدلی نے جلدی سے محل سرا کے دروازے بند کر لیے اور تلوار اس کے سر کے بجائے دروازہ پر پڑی۔ اس کے سب امیر پہلے تو بدحواس ہو کر تلواریں پھینک کر بھاگ گئے، پھر سب نے ہجوم بنا کر دونوں باپ بیٹوں کو گھیر لیا، دو تین گھنٹوں تک جنگ جیسی کیفیت بنی رہی۔ آخر کار سکندر، ابراہیم خان سور، شاہ محمد اور دولت خان لوحانی کے ہاتھ سے مارے گئے۔

اسی دن اس ہنگامے سے پہلے عماد اور سلیمانی کا بھائی تاج خان کرانی کے دیوان خانہ سے ناراض ہو کر قلعہ سے باہر آ گیا اور حضرت اعلیٰ اپنا خطاب رکھ کر بغاوت کے منصوبے بناتے ہوئے جا رہا تھا کہ راستہ میں شاہ محمد سے جو دربار کی جانب جا رہا تھا، اس کی ملاقات ہو گئی۔ دونوں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ تاج خان نے کہا: ”آثار کچھ اچھے نہیں، میں نے بغاوت کا ارادہ کر لیا ہے اگر تم بھی میرے ساتھ شریک ہو جاؤ تو ہماری طاقت دوگنی ہو جائے گی“۔ شاہ محمد نے اس کی بات نہیں مانی اور اس کی موت اسے عدلی کے دربار میں لے آئی۔

تاج خان کی سرکشی

تاج خان دن کے وقت ہی اعلانیہ گوالیار سے بنگال کی طرف کوچ کر گیا۔ بادشاہ نے اس کے پیچھے ایک فوج روانہ کی اور خود بھی پیچھے روانہ ہوا۔ چھپرامئو میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا سخت لڑائی کے بعد تاج خان کو شکست ہوئی اور وہ چنار کی طرف بھاگ گیا۔ راستے میں جہاں کہیں بھی عدلی کے خالصہ کے عامل ملتے ان کو گرفتار کر لیتا اور جو کچھ مال و دولت ہاتھ لگتی، قبضے میں لے لیتا۔ ای لوٹ میں اسے سو ہاتھی بھی کہیں سے مل گئے۔ یہ سب غنیمت لے کر تاج اپنے بھائیوں سلیمان، عماد اور الیاس کے پاس جو گنگا کے ساحلی پرگنوں کے حاکم تھے چلا گیا۔ اس کے تعاقب میں عدلی بھی چنار پہنچ گیا۔ کرانی اپنی جمعیت لے کر گنگا کے کنارے بادشاہی لشکر سے مقابلے پر آیا۔ بادشاہ کی طرف سے ہیمو نے سو ہاتھیوں کو لے کر ان پر حملہ کیا اور سخت لڑائی کے بعد انھیں ہرا دیا۔

ابراہیم خان کی بغاوت

جب عدلی چنار میں پہنچا تو اس کا ارادہ ہوا کہ غازی خاں کے بیٹے ابراہیم خان کو جو کہ شیر خان کے رشتے دار بھائیوں میں سے تھا گرفتار کر لے۔ عدلی کی بہن ابراہیم خان کے نکاح میں تھی، اس نے شوہر کو اس بات کی خبر دے دی۔ ابراہیم خان ہیئت بدل کر خفیہ طور پر قلعے سے باہر نکل گیا اور اپنے باپ کی جاگیروں بیانہ اور ہنڈون کا رخ کیا۔ عدلی نے عیسیٰ خان نیازی کو اس کے تعاقب پر مامور کیا۔ کالپی کی سرحد پر فریقین میں مقابلہ ہوا۔ ابراہیم خاں نے نیازی کو شکست دے کر بھگا دیا اور ایک بڑی جمعیت فراہم کر کے اپنی موروثی جاگیروں پر خود مختار ہو کر بیٹھ گیا۔

عدلی جب کرانیوں کے فتنے سے فارغ ہوا تو اس نے ابراہیم خان کے معاملے پر توجہ دی۔ جب شاہی لشکر جمنا کے کنارے پہنچا تو ابراہیم خان نے مصالحت کی خاطر پیغام بھیجا کہ "اگر رائے حسین جلوانی اور بہار خان شروانی جسے سلیم شاہ نے اعظم ہمایوں کا خطاب

دیا تھا اور دوسرے نامی امیر آ کر مجھے مطمئن کر دیں تو ان کے قول پر بھروسہ کر کے میں آپ کی اطاعت میں آ جاؤں گا"۔ عدلی نے ان امیروں کو اس سے گفتگو کے لیے روانہ کیا۔ ان امیروں نے وہاں جا کر اچانک ایک اور ہی فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے ابراہیم خاں کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس کو سلطان ابراہیم کا خطاب دے کر بادشاہ قرار دے دیا۔ اس دوران آگرہ اور دوسرے کئی ایک شہروں میں بھی سلطان ابراہیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

ابراہیم اور سکندر میں مقابلہ

عدلی کی دوسری بہن کا نکاح احمد خان سے ہوا تھا، وہ بھی شیر شاہ کے بھائیوں میں بڑا بہادر آدمی تھا۔ جو پنجاب میں وہاں کے امراء کو عدلی سے برگشتہ کر کے تاتار خان کاشی، حبیب خان ظفر چی کی مدد سے خود مختار ہو گیا اور سلطان سکندر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ پڑھوا دیا، پھر ایک بڑا لشکر لے کر دہلی اور آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے اس کے مقابلے پر ابراہیم بھی ایک بڑا لشکر لے کر آگرے سے نکلا اور دس کوس کے فاصلے پر فراہ کے مقام پر سکندر کے مقابلے میں صف آرائی کی۔ اکثر بڑے بڑے امیر جیسے حاکم الور خان سلطانی جس کی شان و شوکت بادشاہ جیسی تھی اور رائے حسین جلوانی، مسعود خان، حسین خان غلزئی وغیرہ ابراہیم کے طرف دار تھے۔ ابراہیم نے دو سو امیروں کو سراپردہ علم، طوق اور نقارہ عطا کیا تھا اور جو بھی امیر دس پندرہ سوار ساتھ لے کر اس کے پاس چلا گیا اسے بھی سرخ بانس کا جھنڈا مل گیا اور بادشاہ کی طرف سے منصب اور جاگیر کا فرمان بھی۔ اس تدبیر سے ابراہیم نے اسی ہزار کا لشکر جمع کر لیا۔ اس مرحلے میں جس دن الور سے حاجی خان اس کی ملازمت کے لیے حاضر ہوا، اس دن اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ ابراہیم نے حاجی خان کو ایک نہایت وسیع اور اونچا سراپردہ جو نیا نیا تیار ہوا تھا، جس میں باہر کی طرف پرتگالی سقرلاط اور اندر فرنگستانی مخمل لگی ہوئی تھی، عمدہ فرش اور سونے چاندی کے برتنوں کے ساتھ عطا کیا۔ حاجی خان نے فوراً ہی وہ سراپردہ کھڑا کر کے اس میں قیام کیا۔ اس کی اس شان کو دیکھ کر پٹھان امیر رشک کرنے لگے۔ ابراہیم کے مقابلے میں سکندر کے پاس صرف دس

بارہ ہزار آدمی تھے۔ جب اس نے غنیم کا یہ رنگ دیکھا تو صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ آخر کار دونوں کے درمیان عہد نامہ تحریر ہوا کہ: ”دہلی سے شمال کا جتنا علاقہ قبضے میں ہے یا آئندہ فتح ہوگا وہ ابراہیم خان کا ہوگا اور اُدھر پنجاب ملتان وغیرہ پر جہاں جہاں قبضہ ممکن ہو سکندر قابض رہے گا اور مغلوں کی فوج کشی کی روک تھام بھی اسی کے ذمے ہوگی۔

دونوں لشکروں میں جو پٹھان تھے وہ آپس میں رشتے دار بھی تھے۔ اس صلح پر سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ صلح کے معاہدے میں سکندر کا بھائی کالا پہاڑ اور ”پنج بھیے امیروں“ جس میں پانچ بہادر بھائی بھی شامل تھے۔ نیز یہ شرط لگائی کہ جب ابراہیم، عدلی کو شکست دے کر اس کے خزانے اور بھتہ کے علاقے پر قبضہ کر لے تو ان دونوں میں ہم کو بھی حصہ دار بنائے ورنہ صلح کو ختم مان لیا جائے گا۔ سکندر بھی اس شرط پر اصرار کرنے لگا۔ امیروں نے ابراہیم کو بھی یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ: ”اس بلا کو ٹالیے، جب عدلی کا ملک اور خزانہ فتح ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ سکندر لے سکے گا تو لے لے گا۔“ امیروں کے اس مشورے سے مسعود خان اور حسین خان غلزئی نے اختلاف کیا اور کہا: ”سکندر سے بھی آخر ایک دن لڑنا ہی پڑے گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ابھی اس قصیے کو چکا دیں، اس وقت صلح کر لینے میں ہماری کمزوری ظاہر ہوتی ہے اور اس سے دشمنوں کے حوصلے بھی بڑھ جائیں گے عدلی بھی مقابلے کے لیے چڑھ آئے گا۔

ابراہیم خان نے حاکم سنبھل میاں یحیٰ تارن کے آنے تک لڑائی ملتوی رکھی۔ یحیٰ تارن بہت بہادر اور دانشمند سردار تھا، 961ھ/1553ء میں اس نے عدلی کے جن امیروں کو جو سنبھل پر فوج کشی کے ارادے سے آئے تھے بدایوں کے میدان میں مقابلہ کر کے بھگا دیا تھا۔ پھر اس نے راجہ مترسین کھطریہ کو بھی، جو پہلے بھی سنبھل پر قابض تھا اور اب پھر قوت پیدا کر کے حملے کا ارادہ کر رہا تھا۔ قصبہ کندرکھی کے میدان میں لڑ کر بری طرح شکست دی تھی۔

فتحہا آسمانی شد

میں (مؤلف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدیونی) اس وقت اپنے والد کے ساتھ سنبھل میں تحصیل علم کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر بارہ سال تھی۔ اس فتح پر میں نے تاریخ نکالی تھی۔

"چہ بس خوب کردہ اند" (کیا اچھا کام کیا ہے)

میرے سنبھل میں آنے سے پہلے میاں حاتم سنبھلی بھی اس لڑائی کا قصہ سن چکے تھے۔ جب میں ان کے پاس "کنز" کا درس لینے گیا تو انھوں نے فرمایا: ہم نے فی البدیہہ تاریخ کہی ہے:

"فتحہا آسمانی شد"

ذرا حساب کرکے تو بتاؤ اس میں کتنے عدد ہوتے ہیں؟ جب میں نے حساب کیا تو نوسو ساٹھ عدد نکلے۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ اس میں ایک عدد کی کمی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔ اضافت کا ہمزہ قدماء کے املا کے مطابق بڑھادو اس طرح "فتحہاء آسمانی شد" مکمل تاریخ ہوگئی۔

اس تاریخ گوئی کے بعد انھوں نے دعائے خیر کرکے میرا سبق یاد کروایا اور کتاب "ارشاد قاضی" کے چند ورق جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے مجھے بطور یادگار عنایت فرمائے، پھر انھوں نے مجھے میاں شیخ ابوالفتح الہدیہ خیر آبادی کے سپرد کردیا۔ یہ بزرگ اس کتاب کی تصنیف کے وقت اپنے باپ کے سجادہ نشین ہیں۔

جس وقت میاں یحیٰی تارن نے کانت اور کولہ کے علاقے فتح کیے اور بدایوں سے گزر کر قصبہ آہار میں گنگا پر پل بندھوایا تو میں اپنے والد کے ہمراہ ان کے لشکر میں امروہہ تک گیا اور وہاں لشکر سے الگ ہوکر میر سید محمد میر عدل[1] کے یہاں جاکر پڑھنے لگا۔

ابراہیم خان کی شکست

ابراہیم خان نے میاں یحییٰ کے لشکر میں آنے کے بعد دوسری صبح کو ہی میدان میں لشکر ترتیب دیا۔ میاں یحییٰ مقابل میں تھا، حاجی خان دائیں جانب، رائے حسین جلوانی غلزیوں کے ساتھ بائیں جانب اور درمیان میں خود ابراہیم خان کا مقام تھا۔ دوسری طرف سکندر نے بھی صف آرائی کی، سکندر کے دائیں پہلو میں لشکر "پنج بھیہ امرا" کی کمان میں تھا۔ ابراہیم کے بائیں پہلو پر حملہ کر کے ان کو آگرے تک پیچھے کر دیا اور آگرہ میں داخل ہو کر شہر کو جی بھر کر لوٹا اور آگرے میں سکندر کے نام کی منادی کرا دی۔

ان کے مقابلے میں ابراہیم خان کے دائیں پہلو نے جو حاجی خان کے زیر کمان تھا سکندر کے بائیں پہلو کو دبا کر قصبہ ہوڈل اور پلول تک ان کا پیچھا کیا۔ اس لڑائی کے دوران حاجی خان اپنے سراپردہ کی طرف سے گزرا تو دیکھا کہ وہ شاندار سراپردہ غارت گروں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ وہ اسی وقت میدان جنگ سے نکل کر الور چلا گیا۔ یحییٰ تارن کچھ دیر تک لڑتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں زخم آ گیا اور ایک دو انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ وہ بھی کچھ دیر بعد کھسک کر سنبھل کی طرف چلا گیا۔ ابراہیم خان بس چار پانچ آدمیوں کے ساتھ نشیب میں سر جھکائے لٹیروں سے مقابلہ کر رہا تھا اور گولے اس کے سر پر سے گزر رہے تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مقابل کی فوج میں بذات خود سکندر موجود ہے تو باگ پھیر کر اٹاوہ کی طرف کوچ کر گیا۔ اس کا سارا اسباب اور شاہی چتر وغیرہ برباد ہو گیا۔ سکندر اس کا پیچھا کرتا ہوا اٹاوے تک گیا۔ وہاں یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں نے ہندستان پر دوبارہ حملہ کر دیا ہے اور پنجاب میں داخل ہو چکا ہے سکندر نے ابراہیم کا پیچھا چھوڑا اور تیزی سے پنجاب کا رخ کیا، سرہند میں ہمایوں سے اس کی لڑائی ہوئی اور وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ابراہیم اٹاوے سے سنبھل چلا گیا۔ جہاں اس نے سلطان عدلی کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے لیے ایک مرصع چتر بھی تیار کرایا۔ مہینہ بھر کی تیاریوں کے بعد وہ ایک ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ براہ کیتھی، کالپی کی طرف روانہ ہوا۔

* * *

ابراہیم کی ناکامی

عدلی نے ابراہیم کے مقابلے پر ہیمو بقال کو جو اس کا وزیر اور وکیل مطلق بنا ہوا تھا، مقرر کیا۔ ہیمو بقال چنار سے بہت عالی مرتبہ امیروں، پانچ سو ہاتھی اور بے شمار خزانہ لے کر آگرہ اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب دونوں میں مقابلہ ہوا تو ابراہیم نے ایسی بہادری دکھائی کہ ہفتخوان رستم کی یاد تازہ ہو گئی لیکن تقدیر نے ساتھ نہ دیا اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ویسے ابراہیم بذات خود شاہانہ شخصیت کا مالک تھا۔ خوب صورت، خوش کلام، خلیق، متواضع، سخی اور بہادر جیسی ساری خوبیاں اس کی ذات میں جمع تھیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑائی میں فتح اور کامیابی صرف عطیہ خداوندی ہے۔ انسان کی کوششوں کا اس میں کوئی دخل نہیں، چنانچہ ابراہیم خان نے دو سالوں میں سولہ لڑائیاں لڑیں، ہر بار اول اول وہ غالب رہا مگر آخر میں شکست کھا گیا۔

ہیمو کی یلغار

ابراہیم خان ہیمو کی فوج سے شکست کھا کر بیانہ کی طرف چلا گیا، ہیمو بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا بیانہ پہنچا۔ ابراہیم نے بیانہ کے پٹھانوں اور زمینداروں کو جمع کر کے دوبارہ ہیمو سے مقابلے کی تیاری کی اور رات کے حملے کے ارادے سے کوچ کیا لیکن صبح ہو گئی۔ اس وقت اس کا لشکر بیانہ سے دس کوس پر قصبہ خانوہ میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں لٹیروں سے ایک سخت لڑائی ہوئی لیکن بدقسمتی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ہیمو نے چالاکی سے گھیر کر اسے شکست دے دی اور وہ مجبوراً بیانہ کے قلعے میں بند ہو گیا۔ یہ ایک نہایت بلند اور مستحکم قلعہ تھا۔ ہیمو نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ میں آتش بازی کا کافی سامان موجود تھا۔ ابراہیم خان کا باپ غازی خان ہندوؤں سے بیانہ کے مغربی پہاڑی کے راستے برابر قلعے میں رسد پہنچا رہا تھا۔ ہیمو کی فوج ہر روز حملہ کرتی تھی اور گھمسان کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ ہیمو تین مہینے تک قلعے کا محاصرہ کیے رہا اور بیانہ کے سارے علاقے کو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیا۔ اسی غارت گری میں میرے

والد (مؤلف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی) کی جمع کی ہوئی کتابیں جو بیاور میں تھیں بیشتر لٹ گئیں اور ہندستان کے سارے مشرقی علاقہ میں قحط پھیل گیا۔

ہولناک قحط

خاص طور سے آگرہ، دہلی اور بیانہ میں تو ایسا سخت قحط پڑا کہ ڈھائی ٹکے 2 میں ایک سیر 3 جوار ملنے لگی اس دام پر بھی ملنا محال ہوگیا تھا۔ اکثر لوگ گھروں کو بند کر کے بیٹھ گئے اور ایک ایک گھر میں دس دس بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی بھوک اور فاقہ سے مرگئے، ان بے چاروں کو نہ کفن ملتا نہ قبر۔ ہندوؤں کا بھی یہی حال تھا۔ لوگ کیکر کے بیج اور مویشیوں کے چمڑے جن کو امراء ذبح کر کے فروخت کر دیتے تھے کھا کھا کر جان بچا رہے تھے ایسی چیزوں کو کھا جانے کے سبب تھوڑے دنوں میں ان کے ہاتھ پیر سوج جاتے تھے اور وہ مرجاتے تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (یعنی مؤلف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر) کہ آدمی، آدمی تک کا گوشت کھا جاتے تھے۔ ان لوگوں کی شکلیں ایسی ڈراونی ہوگئیں تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا، یہ سارا علاقہ اس قحط اور دوسال کی لڑائیوں کی وجہ سے بالکل تباہ و برباد ہوگیا، نہ کسان بچے، نہ عوام اور ہندو لٹیروں کی بن آئی اور ادھر اُدھر سے ہجوم بنا کر مسلمانوں کو لوٹنے لگے۔

آگرہ کے قلعہ میں آتش زدگی

962 ھ/1554 ء میں آگرہ کے قلعے میں آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ سکندر اور ابراہیم کی لڑائی کے وقت قلعہ عدلی شاہ کے لشکر سے خالی ہوگیا تھا۔ اس وقت غازی خان سور کے امراء نے قلعے میں غلہ اور سامان جنگ جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس غرض سے وہ قلعہ میں کوٹھریوں کو دیکھتے بھالتے پھر رہے تھے۔ ایک دن صبح سویرے ایک کوٹھری میں جس میں بارود بھری ہوئی تھی چراغ کا گل جھڑنے سے آگ لگ گئی، دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان کی

خبر لانے لگے اور ایسا زبردست دھماکہ ہوا کہ شہر میں زلزلہ سا آ گیا لوگ تو سمجھنے لگے بس اب قیامت آ گئی۔ قلعے کے ستون اور پتھر دھماکے سے اُڑ اُڑ کر جمنا کے پار کئی کوس تک جا کر گرے اور اس بلائے ناگہانی میں ہزاروں آدمی جاں بحق ہو گئے۔ آدمیوں اور جانوروں کے اعضاء بھی پانچ چھ کوس تک اڑ کر گرے، لوگ سوتے سے اٹھ کر توبہ واستغفار کرنے لگے۔

آگرہ کے قلعے کا اصل نام ''بدل گڑھ'' تھا۔ اس لیے اس حادثہ کی تاریخ نکالی گئی:

''آتش بدل گڑھ''

ہیمو کا دسترخوان

جیسا کہ ذکر ہوا ان دنوں قحط 4 اس درجہ شدید تھا کہ لوگ ایک ایک روٹی پر جان دے رہے تھے لیکن ہیمو کے لشکر میں پانچ سو ہاتھیوں کو روزانہ چاول شکر اور گھی ملا کرتا تھا۔ ہیمو تمام پٹھان امیروں کو روزانہ ایک وقت دسترخوان پر بلا کر کھانا کھلایا کرتا تھا اور کہتا تھا بڑے بڑے لقمے کھاؤ اگر کسی کو چھوٹا لقمہ کھاتے ہوئے دیکھتا تو اسے گالیاں دے کر کہتا تھا ''اے تو آج اتنا کم کھا رہا ہے کل اپنے مغل دامادوں سے کس طرح لڑے گا؟'' افغانوں کا ستارہ بس ڈوبنے ہی والا تھا۔ اس لیے ان کی غیرت وحمیت ایسی ماری گئی تھی کہ اس کی اس حرکت پر کسی کو انگلی اٹھانے کی جرات تک نہ تھی۔ اپنی طبعی جہالت اور جنگ جوئی کو بالائے طاق رکھ کر اس کی گالیوں کو خوف یا لالچ کے مارے حلوے کی طرح نگل لیتے تھے:

بخدمت منہ دست بر پائی من
مرا نان دہ و کفش بر سر بزن

محمد خان سور کی بغاوت

ہیمو قلعہ بیانہ پر ابراہیم خان کا گھیرا کیے ہوا تھا کہ اسے خبر ملی کہ بنگال کے حاکم محمد خان سور نے سلطان جلال الدین خطاب رکھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا ہے اور

جونپور تک کا علاقہ فتح کر کے اب آگرہ اور کالپی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسی اثنا میں عدلی کا فرمان بھی ہیمو کو بلانے کے لیے پہنچا کہ ایک طاقتور دشمن سے مقابلہ آن پڑا ہے تم جلد آؤ۔ ہیمو نے بیانہ کے قلعے سے گھیرا اٹھا لیا اور فوراً ہی روانگی اختیار کر لی۔ جب وہ آگرہ سے چھ کوس کے فاصلے پر موضع منڈاگر میں پہنچا۔ ابراہیم نے قلعے سے نکل کر ہیمو کی فوج پر حملہ کر دیا لیکن حسب معمول شکست کھا کر الور کی طرف چلا گیا۔ وہ وہاں حاجی خان سے مدد لے کر دوبارہ مقابلہ کی تیاری کرنا چاہتا تھا۔ ہیمو نے اس کا پیچھا کرنے کے لیے اپنے بھتیجے ہرپال کو کچھ فوج دے کر مقرر کیا۔

اس نے دو منزل تک اس کا تعاقب کیا اور پھر لوٹ کر اپنے لشکر میں آ گیا۔ ابراہیم الور پہنچا تو حاجی خان نہ تو اس کے آنے سے خوش ہوا اور نہ اس نے اسے کسی قسم کی مدد دی۔ وہاں سے مایوس ہو کر ابراہیم خان لوٹ آیا اور اپنے بھائیوں اور رشتے داروں کو منڈون میں چھوڑ کر ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ ٹھٹھہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔ کچھ عرصے بعد حیدر خان چغتا نے ابراہیم خان کے باپ غازی خان سے قول وقرار کر کے بیانہ بلایا لیکن اس کے آنے پر وعدے کے برخلاف اسے اور اس کے خاندن کو قتل کر ڈالا۔ اس کے خاندان کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا۔

ابراہیم خان ٹھٹھہ میں

ابراہیم خان کو لوگوں میں ہردل عزیزی حاصل تھی اس لیے بہت جلد اس کے پاس اچھا خاصا لشکر جمع ہو گیا۔ اس نے ٹھٹھہ کے حاکم رام چندر پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار بھی ہو گیا۔ راجہ نے اس سے بڑا اچھا سلوک کیا اور زمینداروں کے رواج کے مطابق اس کو کمان نذرانے میں پیش کی، اس کے لیے سراپردہ شاہی اور ساز و سامان مہیا کر دیا۔ وہ اس کو تخت پر بٹھا کر خود ملازموں کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ اس حال میں ابراہیم خان کافی عرصے تک ٹھٹھہ میں مقیم رہا۔

مالوہ کا حاکم باز بہادر

اسی دوران مالوہ کے حاکم باز بہادر [5] کی پٹھانوں سے لڑائی ہوگئی۔ پٹھانوں نے ابراہیم خان کو اپنا سردار بنا کر باز بہادر سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ کرہ کنگتہ کی رانی درگاوتی بھی ابراہیم خان کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر آئی، باز بہادر نے رانی سے مصالحت کی بات چیت کر کے اسے ابراہیم کی مدد سے روک دیا اور وہ اپنے علاقے کو واپس چلی گئی۔ ابراہیم بھی اس وقت مقابلے کو خلاف مصلحت جان کر اڑیسہ کی طرف چلا گیا اور وہاں کے زمینداروں کو اپنا حامی اور موافق بنالیا۔ اسی زمانے میں سلیمان کرانی نے وہاں کے راجہ کو شکست دی تھی۔ اس نے بڑے قول و قرار کے بعد ابراہیم خان کو اپنے پاس بلایا، پھر عہد شکنی کر کے اسے قتل کر ڈالا۔

گوریوں سے لڑائی

جب ہیمو دن رات کوچ کرتا ہوا عدلی کے یہاں پہنچا تو اس وقت عدلی اور محمد خان گور کالپی سے پندرہ کوس پر موضع چھپر گھٹہ میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے درمیان دریائے جمنا بہہ رہی تھی۔ محمد خان کافی ساز و سامان اور ایک بڑا لشکر لے کر آیا تھا، اس لیے لڑائی میں اس کا پلہ بھاری تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بس فتح ہونے ہی والی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہیمو دم دار ستارہ کی طرح میدان جنگ میں وارد ہوا لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ ہیمو کے آتے ہی لشکر نے آسانی سے جمنا کو پار کرلیا اور گوریوں کے لشکر پر جو خواب غفلت میں تھے رات میں چھپ کر حملہ کر دیا۔ اچانک حملہ سے محمد خان کے لشکری بدحواس ہوگئے اور غنیم کے مقابلے میں کچھ نہ کر سکے۔ اس معرکے میں محمد خان گور کے اکثر حامی اسیر قتل ہوگئے اور جو جان بچا کر بھاگ سکے، بھاگ گئے۔ محمد خان بھی وہاں سے بچ کر کسی طرح کسی جانب نکل گیا۔ اس کے بعد اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کا سارا ساز و سامان ہیمو کو غنیمت میں مل گیا۔

عدلی کی ہلاکت

اس فتح کے بعد عدلی نے چنار میں جا کر قیام کیا اور ہیمو کو بہت سا خزانہ، بے شمار ہاتھی اور بڑی فوج دے کر مغلوں کے مقابلے پر نامزد کیا جو آگرہ اور اٹاوہ تک پیش قدمی کر کے قبضہ کر چکے تھے۔ اسی دوران محمد خان گور کے بیٹے خضر خان نے باپ کا جانشین بن کر اپنا خطاب سلطان محمد بہادر رکھا اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا اور باپ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک بھاری لشکر کو عدلی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ اس مقابلے میں خلاف توقع عدلی نے بڑی بہادری دکھائی اور داد مردانگی دیتے ہوئے قتل ہو گیا۔ عدلی کے قتل کا حادثہ 962ھ/1554ء میں پیش آیا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے: گور بہ گشت

عدلی بہ حیثیت موسیقار

عدلی حکمرانی کے اعتبار سے کیسا بھی رہا ہو، فن موسیقی اور رقص میں بڑا ماہر تھا۔ چنانچہ تان سین کلاونت جو سارے ہندستان میں اس فن کا استاد تھا اس کی شاگردی کا اقرار کیا کرتا تھا۔ سزاول خان کا لڑکا باز بہادر بھی اس فن میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا۔ وہ بھی بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ میں نے یہ فن عدلی سے سیکھا ہے۔

ایک مرتبہ دکن کا ایک سازندہ (موسیقار) ایک بلند قد آدم پکھاوج لے کر آیا تھا۔ اس کے دونوں طرف کسی کے ہاتھ نہیں پہنچتے تھے اس لیے کوئی اس کو بجا نہیں سکتا تھا۔ یہ پکھاوج جب عدلی کی محفل میں آیا تو وہ اس کی ترکیب کو سمجھ گیا اور تکیہ لگا کر ایک طرف ہاتھوں سے اور دوسری طرف پاؤں سے بجانے لگا۔ سب لوگ حیران رہ گئے اور اہل ہنر بے ساختہ داد دینے لگے۔

مجاہد خان بھگت

عدلی نے اپنے زمانہ امیری میں جبکہ وہ بیس ہزاری جاگیردار تھا ایک بھگت لڑکے کو جو

نہایت خوب صورت اور نازک اندام تھا اور اپنے فن میں بھی ماہر و کامل تھا، اپنے یہاں نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ لڑکا بدایوں کے کسی گاؤں سے عدلی کی محفل میں تماشہ دکھانے آیا تھا اور عدلی اس کی صورت اور سیرت پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس وقت اس نے بھگت کو مجاہد خان کا خطاب عطا کیا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے اس لڑکے کو دس ہزاری منصب عطا کیا۔ یہ لڑکا اس قدر نازک مزاج تھا کہ ایک مرتبہ اجاون کے میدان میں چوگان کھیل کر لوٹا تو راستے میں غازی خان سور کے ڈیرے میں رکا اور کہا: ''مجھے بھوک لگی ہے'' غازی خان نے کہا آجاؤ کھانا تیار ہے، لیکن جب کھانا سامنے آیا تو قلیہ کی مہک سے ہی اسے غش آنے لگا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اس کے طہارت خانے میں اس قدر کافور ڈالا جاتا تھا کہ بھنگی روزانہ دو تین سیر کافور اٹھا کر لے جاتے تھے۔ حاجت سے فارغ ہونے کے بعد اس کا رنگ سرخ زرد اور سبز ہو جاتا تھا اور حالت غیر ہو جاتی تھی۔ اس نزاکت اور آرام طلبی کے باوجود وہ نماز کا بڑا پابند تھا۔ کبھی اس کی نماز اور روزہ قضا نہیں ہوا اور اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا۔ زمانہ کی کارستانیاں دیکھیے کہ جس وقت یہ نازک اندام لڑکا مرا، اسے دو گز کفن تک نصیب نہ ہوا اور اتنا بھی پتہ نہ چلا کہ اس کی لاش کس خاک میں جا کر ملی۔

عدلی کے بعد ہی ہندستان کی سلطنت پٹھانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغلوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔

ہمایوں کی دوبارہ ہندستان واپسی

ہمایوں نے کابل کے راستے دوسری بار ہندستان پر حملہ کیا اور سکندر سے ایک سخت لڑائی لڑ کر کامیابی حاصل کی۔ جس وقت ہندستان کی سلطنت ہمایوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس کے بھائیوں میں باہمی اختلاف حد سے زیادہ بڑھ گیا تو ہمایوں نے پنجاب سے رخصت ہو جانا ہی مناسب جانا۔ ہندستان سے نکل کر اس نے بھکر کی تسخیر کا ارادہ کیا اور اس سے قریب قصبہ روھڑی میں اپنی لشکر گاہ قائم کی۔ مرزا ہندال بھی سندھ سے نکل کر بھکر سے پچاس کوس کے فاصلے پر قصبہ پاتر میں غلّے کی فراوانی کے خیال سے جا ٹھہرا۔

یہاں پہنچنے کے بعد ہمایوں نے حاکم ٹھٹھہ مرزا شاہ حسین ارغون کے پاس خلعت اور گھوڑا روانہ کر کے یہ پیغام دیا کہ "بعض ضرورتوں کی بنا پر یہاں آنا ہوا اور اب گجرات کی فتح کا مصمم ارادہ ہے لیکن یہ مہم تمہارے مشورے اور تعاون پر منحصر ہے"۔

مرزا شاہ حسین نے باتوں باتوں میں پانچ مہینے ٹال دیے اور حیلے بہانے کر کے خود بادشاہ کو بھکر سے ٹھٹھہ آنے کی دعوت دی تا کہ بالمشافہ سارے معاملات پر گفتگو ہو سکے۔

بھکر کا محاصرہ

ٹھٹھہ کے حاکم سے یہ مراسلت 947ھ/1540ء میں ہوئی تھی اور اسی سال ہمایوں نے حمیدہ بانو بیگم سے نکاح کیا اور وہاں سے پاتر چلا گیا اور پاتر سے روہڑی پہنچا۔ مرزا ہندال قندھار کے حاکم قراچہ بیگ کے بلاوے پر اس کے پاس چلا گیا۔ یادگار ناصر مرزا نے بھی جو لشکر شاہی سے دس کوس پر ٹھہرا ہوا تھا قندھار چلے جانے کی ٹھان لی۔ ہمایوں نے ایک بزرگ عالم مرزا ابوالبقاء کو اس کے پاس بھیجا اور اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب ابوالبقاء کشتی کے ذریعے دریا پار کر رہے تھے، قلعہ بھکر میں سے ایک گروہ نے باہر نکل کر ان کی کشتی پر تیر چلانا شروع کیا۔ ایک تیر انھیں بھی لگا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ 948ھ/1541ء میں پیش آیا جس کا مادہ تاریخ "سرور کائنات" ہے۔ مرزا یادگار ناصر نے نصیحت و مشورہ قبول کر لیا اور بھکر ہی میں قیام کیا اور بادشاہ نے ٹھٹھہ کا ارادہ کیا لیکن شاہی لشکر کے بہت سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر مرزا یادگار کے پاس چلے گئے اور مرزا کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ چونکہ محاصل کی آمدنی بہت زیادہ تھی اس لیے یہ لوگ فارغ البالی سے بسر کر رہے تھے۔

ہمایوں نے دریا پار کر کے قلعہ بھکرو جی کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین کو مرزا حسین کی طرف سے برابر رسد پہنچ رہی تھی نہ صرف یہ بلکہ وہ خود بھی کشتیوں میں سوار ہو کر ہمایوں کے لشکر کی رسد کو روکنے لگا۔ شاہی فوج برابر سات ماہ تک قلعے کا محاصرہ کیے پڑی رہی لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ انھی دنوں شدت سے قحط بھی پڑا اور اہل لشکر بھوک کے مارے مرنے لگے۔ غلہ تو

میسر نہیں ہوتا تھا، ناچار جانور ذبح کر کر کے کھاتے رہے۔ آخرکار جانور بھی ختم ہو گئے۔ اس موقع پر ہمایوں نے بھکر سے مرزا یادگار ناصر کو بلایا تاکہ اس سے مدد لے کر وہ شاہ حسین کو پسپا کر کے قلعے کو فتح کر لے۔ مرزا یادگار خود تو مدد کے لیے نہیں آیا البتہ تھوڑی سی مدد بھیج دی جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

مرزا یادگار کے اس رویہ کی وجہ یہ تھی کہ مرزا شاہ حسین نے اندر ہی اندر اس کو ورغلایا تھا اور اس کو بادشاہ بنانے اور اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرنے کا وعدہ کیا تھا نیز اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کر دینے کا بھی اقرار کیا تھا۔ مرزا اس کے بہکانے میں آ گیا اور اعلانیہ ہمایوں کا مخالف بن گیا اور شاہی لشکر کی تمام کشتیوں کو قبضے میں لے لیا۔ ان کارروائیوں سے ہمایوں محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گیا۔ واپسی کے لیے کافی دن تک کشتیاں نہیں ملیں۔ آخر دو زمینداروں کی مدد سے ان کشتیوں کو جن کو مرزا یادگار نے غرق کر دیا تھا دریا سے نکلوایا گیا اور وہ ان کے ذریعہ ٹھٹو پہنچا۔

یادگار ناصر اپنی حرکتوں کی وجہ سے بادشاہ سے ملتے ہوئے شرما رہا تھا۔ اس نے اپنی شرمندگی کو مٹانے کے لیے شاہ حسین پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا اور شرمندگی کے ساتھ ہمایوں کی خدمت میں شرمسار حاضر ہوا بہت سے مقتولین کے سر اپنی وفاداری دکھانے کے لیے پیش کیے۔ ہمایوں نے اس کے سب سابقہ قصور معاف کر دیے لیکن پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ یادگار ناصر نے شاہ حسین کے ورغلانے سے دوبارہ بادشاہ سے مخالفت کا ارادہ کیا۔ اس دوران منعم خان بھی جسے بعد میں خان خانان کا خطاب ملا تھا لشکر سے بھاگ نکلنے کی فکر کرنے لگا لیکن یہ دونوں اپنے ان ارادوں سے باز رہے۔

راجہ مالدیو کا بلاوا

اس زمانے میں مارواڑ کے راجہ مالدیو نے ہمایوں کے پاس متعدد عریضے لکھ کر اسے آنے کی دعوت دی۔ ہمایوں نے بھی ان حالات میں بھکر اور ٹھٹھہ کا قیام مناسب نہ جانا اور جیسلمیر کے راستے مارواڑ چلا گیا۔ واپسی کے وقت راجہ جیسلمیر B نے اس کا راستہ روکنا چاہا

لیکن تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہی وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ جس جنگل سے لشکر گزر رہا تھا وہ ایسا بے آب وگیاہ صحرا تھا کہ پینے کے لیے میلوں تک پانی کا قطرہ بھی نہیں ملا اور سارے لشکر والے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی کنواں نظر آ جاتا تو سپاہی ؛ س طرح ہجوم بنا کر حملہ کرتے کہ اچھا خاصا دنگا وفساد ہو جاتا تھا اور پیاس کے مارے بہت سے تو کنویں میں کود پڑتے تھے اور کنواں ان گرنے والوں سے بھر جاتا تھا۔ ہمایوں نے اس حالت کو دیکھ کر یہ شعر کہا تھا:

چنان زد چاک ها گردون لباس دردمندان را
کہ نی دست آستین ی باید ونی سر گریبان را

۔ بچے تمام لشکریوں کے ساتھ ہمایوں جیسلمیر کے جنگلوں کو پار کر کے مارواڑ کے قریب پہنچا اور اتکہ خان کو راجہ مالدیو کے پاس بھیج کر اس کی واپسی کے انتظار میں جودھ پور میں ٹھہر گیا۔ اس لیے مالدیو ہمایوں کو بلا کر سخت پریشان اور پشیمان تھا۔ اس نے اتکہ خان کو عذر حیلے کر کے اپنے پاس کچھ عرصے تک روکے رکھا۔ آخر کار ایک فوج استقبال کے بہانے ہمایوں کو گرفتار کر کے لانے کے لیے بھیج دی۔ اتکہ خان راجہ کے ارادوں کو تاڑ گیا تھا۔ چنانچہ وہ اجازت لیے بغیر ہی کوچ کر کے لشکر میں پہنچ گیا اور ہمایوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ ہمایوں نے فوراً ہی امرکوٹ کی طرف کوچ کر دیا۔ اسی راستے میں مالدیو کے دو جاسوس بھی لشکر گاہ میں داخل ہو گئے تھے، جب وہ پکڑے گئے تو بادشاہ نے ان دونوں کے قتل کا حکم دیا۔ ان دونوں میں سے ایک کے پاس چھری تھی اور ایک کے پاس خنجر، چونکہ دونوں جان سے مایوس ہو گئے تھے اس لیے نڈر ہو کر انھوں نے حملہ کر دیا۔ مرد، عورت اور گھوڑا جو ان کے سامنے آیا اسے قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کے ہاتھوں بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس ہنگامے میں ہمایوں کا گھوڑا بھی ہلاک ہو گیا۔ ہمایوں نے سواری کے لیے تردی بیگ سے دو تین گھوڑے اور اونٹ مانگے۔ اس نے اس موقعے پر بڑی کنجوسی دکھائی اور سواری کے لیے کوئی جانور نہ دیا۔ مجبوراً ہمایوں ایک اونٹ پر سوار ہو گیا۔ یہ دیکھ کر

ندیم کوکہ سے نہ رہا گیا اور اس نے وہ گھوڑا جس پر اس کی ماں سوار تھی بادشاہ کو دے دیا اور اپنی ماں کو ہمایوں کے اونٹ پر سوار کر دیا۔ وہ خود اس تپتے ہوئے ریگستان میں جو آگ کا تنور تھا پیدل ہی سفر کرتا رہا۔ اس سفر کی یہ منزل بڑی مشکل تھی کیوں کہ مالدیو کی آمد کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ اس پریشان حال قافلے نے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر رات بسر کی۔

ہمایوں کا جنگل کا سفر

پوری رات مالدیو کے سپاہی ان کی تلاش میں جنگل میں بھٹکتے رہے، جب صبح ہوئی اور کوچ کیا گیا تو اتفاق سے ہمایوں اپنے بائیس آدمیوں کے ساتھ جن میں منعم خان اور روشن بیگ کوکہ بھی شامل تھے، لشکر سے کٹ کر جدا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں مالدیو کی فوج کا ایک دستہ ان کے سر پر آ پہنچا۔ ان بائیس آدمیوں نے بڑی ہمت کے ساتھ مقابلے کا عزم کر لیا، پہلے ہی حملہ میں مالدیو کے فوج کے سردار کو ایسا تیر لگا کہ وہ اسی وقت گر کر ختم ہو گیا۔ اس کی ہلاکت سے بھگدڑ سی مچ گئی اور بہت سے سپاہی مارے گئے۔ اس فتح سے ہمایوں کو کسی قدر اطمینان حاصل ہوا، غنیمت میں بہت سے اونٹ بھی ہاتھ آ گئے تھے۔ یہاں سے ہمایوں نے بہت سا پانی لشکر میں ذخیرہ کرا لیا اور آگے بڑھا۔

تیسرے دن ایک مقام پر پہنچے، وہاں ایک کنواں تھا لیکن پانی بہت زیادہ گہرائی میں تھا۔ لشکریوں کو تین منزل تک پانی نہیں ملا تھا، پیاس کے مارے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ اب جو پانی ملا تو لالچ کے مارے سب نے اتنا پی لیا کہ بہت سے آدمی، گھوڑے اور اونٹ مر گئے۔ بیابان ایسا خطرناک تھا کہ اس کی انتہا حد خیال سے بھی پرے معلوم ہو رہی تھی۔ مجبوراً ہمایوں نے امرکوٹ چلے جانے کا فیصلہ کیا جو ٹھٹھہ سے سو کوس کے فاصلے پر ہے۔

امرکوٹ میں قیام

امرکوٹ کا راجہ جس کا نام رانا تھا اپنے بیٹوں کے ساتھ استقبال کے لیے آیا اور

ہمایوں کی بڑی خاطر تواضع کی۔ یہاں پہنچ کر ہمایوں کو کچھ سکون نصیب ہوا، اس نے خزانے کا منہ کھول دیا اور جو کچھ روپیہ اور مال تھا وہ سب لوگوں میں تقسیم کر دیا جن کو نہ مل سکا انھیں ہمایوں نے تردی بیگ وغیرہ سے قرض لے کر دیا۔ کافی سونا، نقد، کمر پٹکے رانا کے بیٹوں کو انعام میں عطا کیے۔ رانا کے باپ کو مرزا شاہ حسین ارغون نے قتل کر دیا تھا اس انتقام کے لیے رانا نے ایک بڑی جمعیت فراہم کی اور ہمایوں کو اس پر فوجی حملے کی ترغیب دی۔ ہمایوں نے اپنا سارا ساز و سامان بیگم بادشاہ کے بھائی خواجہ معظم کو اپنا نائب بنا کر امر کوٹ میں چھوڑ دیا اور خود بھکر کی طرف کوچ کر گیا۔

اکبر کی ولادت

امر کوٹ میں بروز اتوار 5 رجب المرجب 949ھ/1542ء کو شاہزادہ اکبر پیدا ہوا۔ تردی بیگ نے اسی جگہ ہمایوں کو فرزند کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔ ہمایوں نے بچے کا نام اکبر رکھا اور جب وہ چول کے مقام پر پہنچا تو بیٹے کو بلوا کر اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ اس سفر میں ہمایوں کے لشکر میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک کر کے لوگ لشکر سے بھاگ رہے تھے، یہاں تک کہ منعم خان بھی ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ انھی دنوں گجرات سے بیرم خان آ کر ہمایوں کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

ان پریشان کن حالات میں ہمایوں نے ہندستان میں مزید قیام مناسب نہ سمجھا اور قندھار جانے کا ارادہ کر لیا۔ مرزا شاہ حسین سے اس سفر کے لیے کچھ کشتیاں اور اونٹ مانگے۔ اس نے بھی ہمایوں کے ٹل جانے کو غنیمت جانا اور فوراً تیس کشتیوں اور تین سو اونٹوں کا انتظام کر دیا اور ہمایوں سندھ پار کر کے ہندستان سے رخصت ہو گیا۔

بھائیوں کی سازش

اس زمانے میں مرزا کامران نے قندھار کو مرزا ہندال سے چھین کر مرزا عسکری کے

حوالے کر دیا تھا اور اس کے بجائے مرزا ہندال کو غزنی کی حکومت دے دی تھی۔ چند روز بعد مرزا ہندال کو بھی قندھار سے علیحدہ کر دیا تھا اور مرزا ہندال نے امور سلطنت سے کنارہ کشی کر کے درویشی اختیار کر لی تھی۔ جس وقت ہمایوں قندھار کی طرف چلا، مرزا کامران نے شاہ حسین کے بہکانے سے مرزا عسکری کو لکھا کہ "ہمایوں قندھار کی طرف آرہا ہے جس طرح ممکن ہو اسے گرفتار کرلو"۔ جب ہمایوں شال مشانگ کے مقام پر پہنچا تو مرزا عسکری نے اس کا راستہ روکنے کے لیے کوچ کیا اور ہمایوں کے لشکر کی مخبری کے لیے ایک اوزبک چولی بہادر نامی آدمی کو مقرر کیا۔ چولی بہادر نے آدھی رات کے وقت بادشاہ کے لشکر میں آکر بیرم خان کو سارے حالات سے آگاہ کیا۔ بیرم خان نے اسی وقت ہمایوں کو ساری کیفیت کی اطلاع دی۔ بھائیوں کی اس سازش کی وجہ سے ہمایوں نے کابل اور قندھار کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف بائیس آدمیوں کو ساتھ لے کر جن میں بیرم خان اور خواجہ معظم بھی شامل تھے عراق کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت ہمایوں نے تردی بیگ سے چند گھوڑے طلب کیے، بیگ نے بخل سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ گھوڑے نہیں دیے بلکہ ہمایوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔

اکبر کی گرفتاری

شاہزادہ اکبر کی عمر اس وقت ایک سال کی تھی۔ ان دنوں سخت گرمی پڑ رہی تھی اور راستے میں پانی نہ ملنے کا بھی خطرہ تھا، اس لیے ہمایوں نے شاہزادے کو اتکہ خان کے سپرد کر کے لشکر گاہ ہی میں چھوڑ دیا اور بادشاہ بیگم کو اپنے ہمراہ لے کر رخصت ہوگیا۔ ہمایوں کے جاتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس کے لشکر کو لوٹ لیا اور تردی بیگ کو گرفتار کر لیا۔ شاہزادہ اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے جا کر اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا۔ یہ واقعات 950ھ/1543ء میں پیش آئے۔

ہمایوں طہماسپ کی پناہ میں

اس سفر میں بھی ہمایوں کو عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہونا پڑا، اور وہ ہزار بدقت سے سیستان سے نکل کر خراسان پہنچا، جہاں شاہ طہماسپ کے بڑے بیٹے سلطان محمد مرزا سے ملاقات کی اور وہاں بادشاہی ساز و سامان اور اسباب سفر مہیا کر کے مشہد مقدس روانہ ہوا۔ شاہ طہماسپ کے حکم سے ہر منزل پر مقامی حکام ہمایوں کے استقبال کے لیے آتے تھے اور اس کی دعوت و خاطرداری کا انتظام کرتے تھے۔

ہمایوں نے پہلے ہی شاہ طہماسپ کی خدمت میں بیرم خان کو روانہ کر دیا تھا اس کے ذریعے طہماسپ نے ہمایوں کے نام خوش آمدید کا ایک خط ارسال کیا تھا۔ غرض بمقام ثیلاق ان دونوں بادشاہوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ گفتگو کے دوران طہماسپ نے ہمایوں سے شکست کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اصل وجہ بھائیوں کی مخالفت ہے۔ اس وقت طہماسپ کا بھائی بہرام مرزا بھی موجود تھا۔ ہمایوں کی یہ بات اسے بری لگی اور وہ اس وقت سے ہمایوں کا دشمن بن گیا۔ اس نے طہماسپ سے کہا کہ "یہ اس باپ کا بیٹا ہے جس نے اوزبکوں کے مقابلہ میں کئی ہزار قزلباشوں کو اپنے ہمراہ لے جا کر ہلاک کرا دیا تھا"۔

اس کا اشارہ اصل میں اس واقعے کی طرف تھا جبکہ بابر نے شاہ اسمٰعیل عجم اول سے سترہ ہزار قزلباش سوار اوزبکوں کے خلاف لڑنے کے لیے حاصل کیے تھے۔ اس مہم میں جب اس نے قلعہ نخشب عرف کش کا محاصرہ کیا تھا تو ایک تیر پر یہ شعر لکھ کر قلعے میں بھیجا تھا:

صرف راہ ازبکان کردیم عجم شاہ را
گر گناہی کردہ بودم پاک کردم راہ را

مزید سلمان کے ایک قطعہ پر تضمین بھی لکھ کر بھیجی:

از خدا امیدوارم شاہ بابا آن کند
آنچہ باسلمان علی درویشت ارزن کردہ است

یہ دونوں شعر طہماسپ کو بہت پسند آئے اس پر بہن کی حمایت اور سفارش کہ اس نے ڈے معقول دلائل سے بادشاہ کو ہمایوں کی حمایت اور اعانت پر آمادہ کر دیا تھا۔ غرض لہماسپ نے خوش ہو کر بڑے جشن منعقد کرائے اور ہمایوں کے لیے شاہانہ ساز و سامان تیار کرادیا اور اسے شیعہ مسلک قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس مسئلہ پر ہمایوں سے بڑے مباحثے ہوتے رہے۔ آخر ہمایوں نے کہا "اپنے سارے عقائد ایک کاغذ پر لکھ کر لاؤ"۔ حب بادشاہ کے آدمی لکھوا لائے تو ہمایوں نے اس کاغذ کے مضمون کو پڑھ کر سنا دیا اور خطبے میں نیعوں کے مسلک کے مطابق بارہ اماموں کے نام بھی دہرا دیے۔

مایوں کی مدد

ان تکلفات کے بعد طہماسپ نے دس ہزار سواروں کو اپنے بیٹے شاہ مراد کی سرکردگی بں ہمایوں کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ شاہ مراد چونکہ شیر خوار لڑکا تھا اس لیے بداغ خان زلباش کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ قزلباش اور ہمایوں جدا جدا راستوں ے جا کر قندھار پر حملہ کریں اور جب قندھار فتح ہو جائے تو اسے شاہ مراد کے قبضے میں ے دیا جائے۔

غرض ہمایوں طہماسپ سے رخصت ہو کر اردبیل اور تبریز کی سیر کرتے ہوئے تنہا شہد پہنچا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت اکیلا وہ روضہ مبارک میں گھوم رہا تھا کہ اسے دیکھ کر یک زائر نے دوسرے سے چپکے سے پوچھا "کیا ہمایوں بادشاہ بھی ہے"۔ دوسرے نے کہا "ہاں" پہلے زائر نے ہمایوں کے قریب ہو کر اس کے کان میں کہا "اب بھی خدائی کا دعویٰ کرے گا"۔ اس کا اشارہ اس طرز عمل کی طرف تھا جو ہمایوں نے بنگال میں اختیار کیا تھا۔ وہاں وہ چہرے پر نقاب ڈالا کرتا تھا، جب نقاب اٹھایا تو لوگ کہتے تھے تجلی

ہوگئی۔ جب کسی معرکے کے بعد تلوار کو دریا میں دھوتا تھا تو فخریہ کہا کرتا تھا "اب ہماری تلوار کا کون مقابل بن سکتا ہے"۔ وہاں سے آگرہ پہنچنے کے بعد اپنی تعظیم کے لیے زمین بوسی کی رسم شروع کرادی تھی۔ آخر امیر ابوالبقا اور دوسرے امیروں اور وزیروں نے تعظیم وتسلیم کے عام طریقے کو بحال کرادیا۔

قزلباشوں کا حملہ

وعدے کے مطابق قزلباش سرداروں نے تمام گرم سیر علاقوں پر فوج کشی کر کے قبضہ کرلیا۔ جب وہ قندھار کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑے تھے تو ہمایوں بھی پانچ دن بعد وہاں پہنچ گیا۔ مرزا عسکری محصور ہوگیا تھا۔ قزلباشوں سے اس کی برابر تین ماہ تک لڑائی ہوتی رہی، دونوں طرف کے بہت سے آدمی ان مقابلوں میں مارے گئے۔ اسی اثناء میں ہمایوں نے بیرم خان کو ایلچی بنا کر کابل کی طرف مرزا سلیمان بدخشی اور مرزا یادگار ناصر کے پاس بھیجا۔ یادگار ناصر کھنگو سے پریشان ہوکر وہاں پہنچ گیا تھا۔

قندھار کی فتح

قزلباشوں کو پہلے یہ غلط فہمی تھی کہ ہمارے جاتے ہی چغتائی امیر ڈر جائیں گے اور اطاعت قبول کرلیں گے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ محاصرہ برابر طویل ہوتا جارہا ہے اور اس دوران کافی آدمی ہلاک ہوچکے ہیں۔ عسکری کی مدد کے لیے مرزا کامران کے آنے کی خبر بھی اڑ رہی ہے تو وہ بددل ہوگئے اور واپس ہوجانے کا ارادہ کرلیا۔ قزلباش چلے جاتے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بعض امیر جیسے محمد سلطان مرزا، الغ مرزا اور مرزا حسین خان وغیرہ کامران سے ناراض ہوکر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ مؤید بیگ بھی جو قلعہ قندھار میں قید تھا کسی طرح چھوٹ کر بادشاہ کے پاس آگیا۔ ہمایوں نے اس پر خاص طور سے بڑی عنایت کی۔ مرزا عسکری نے جب لوگوں کو اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ہمایوں کے پاس

جاتے دیکھا تو گھبرا گیا اور خود بھی امان طلب کر کے حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کے قصور معاف کر دیے:

درعفو لذتی ست کہ درانتقام نیست

(معاف کرنے میں جو مزہ ہے وہ انتقام میں نہیں)

صورت حال کی اس تبدیلی کے بعد ہمایوں نے قزلباشوں سے کہا کہ چغتائی لشکر کے اہل و عیال اور شہر کے باشندوں سے تین دن تک کوئی مزاحمت نہ کرو تا کہ وہ سب شہر سے نکل جائیں۔ اس وقت ہمایوں کے قبضے میں کوئی ملک نہیں تھا لیکن مذکورہ معاہدے کے مطابق بداغ خان اور مرزا مراد کو قندھار کے قلعے میں لے جا کر سارا علاقہ انہی کے حوالے کر دیا۔ قندھار کے فتح کے بعد اکثر قزلباش امیر عراق لوٹ گئے۔ مراد کے ساتھ بداغ خان کے علاوہ دو چار امیر رہ گئے۔

جب سردیوں کا موسم شروع ہوا تو ہمایوں نے اپنے لشکر کے امیر کے لیے بداغ خان سے کسی محفوظ مقام دینے کا مطالبہ کیا۔ اس نامعقول شخص نے اس کے جواب میں نامناسب باتیں کہیں۔ اس اختلاف کی جب خبر پھیلی تو اکثر چغتائی امیر ڈر کر ہمایوں کے لشکر سے نکل بھاگے ان میں مرزا عسکری بھی شامل تھا لیکن اسے راستہ ہی میں گرفتار کر لیا گیا اور ہمایوں نے اسے قید میں ڈال دیا۔

قزلباشوں کی پسپائی کے اسباب

ہمایوں سے قزلباشوں کے اس اختلاف کے بعد متعدد ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ قندھار قزلباشوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اول تو یہ کہ چغتائی امراء نے ہمایوں کو مشورہ دیا کہ سردیاں گزارنے کے لیے فی الحال قزلباشوں سے قندھار چھین لیا جائے اور جب کابل و بدخشاں فتح ہو جائیں تو ان کو اس سے زیادہ علاقہ بطور تلافی عطا کر دیا جائے۔ دوسرا بڑا

سبب یہ ہوا کہ قزلباشوں کے شیر خوار شہزادے مرزا مراد کا اسی اثناء میں انتقال ہو گیا۔

تیسرا سبب قزلباشوں سے لوگوں کی وہ عام ناراضگی تھی جو انھوں نے شہر والوں پر مظالم ڈھا کر اور چغتائی امراء پر قلعے میں داخلہ بند کر کے مول لے لی تھی۔

چوتھا سبب وہ ہنگامہ تھا جو خود بخود اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

قزلباشوں پر حملہ

یہ واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ ایک مرتبہ ایک رافضی یادگار ناصر مرزا کے سامنے جو ہندال مرزا کو ساتھ لے کر کامران کے پاس سے یہاں بھاگ آیا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق صحابہؓ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ یادگار ناصر گستاخی برداشت نہ کر سکا اور اس نے رافضی کو ایسا تیر مارا کہ وہ اس کا سینہ توڑ کر نکل گیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ اس وقت حاجی محمد خان کوکہ اپنے دو نوکروں کے ہمراہ بار برداری کے اونٹ لے کر رسد لینے کے بہانے قلعے میں داخل ہوا اور دروازے کے محافظوں پر حملہ کر کے انھیں قتل کرنے لگا۔ اس کی مدد کے لیے دوسرے بہت سے چغتائی امیر بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان حملہ آوروں میں الغ بیگ اور بیرم خان بھی شامل تھے۔ اس اچانک حملے سے قزلباش بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور قلعے میں چغتائی لشکری داخل ہو گئے۔ قزلباشوں کی شیخی کی کرکری ہو گئی۔ جب ہمایوں بادشاہ قلعے میں داخل ہوا تو بداغ خان کو سخت مضطرب اور پریشان دیکھا، اسے جلد ہی عراق کی طرف رخصت کر دیا۔ قندھار کے شہریوں نے بہت سے قزلباشوں کو گلی کوچوں میں گھیر کر قتل کر دیا۔

کابل کی فتح

قندھار پر قبضے کے بعد ہمایوں نے وہاں کی حکومت بیرم خان کے حوالے کر کے کابل کی طرف کوچ کر دیا۔ ہمایوں کے مقابلے میں مرزا کامران بھی آ گئے تھے، بڑھ کر مقابل ہوا لیکن حال یہ تھا کہ لشکر میں سے ہر روز ایک دو نامی گرامی امیر بھاگ کر ہمایوں کے سایہ میں

آجاتے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مرزا کامران کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اس نے بہت سے علماء اور مشائخین کو واسطہ بنا کر بھائی سے اپنے قصور کی معافی چاہی۔ ہمایوں نے اس شرط پر کہ وہ لشکر شاہی میں حاضر ہو جائے اس کے سارے قصور معاف کر دیے۔ مگر کامران کے دل میں چور تھا اس لیے وہ ہمایوں کے سامنے آتے ڈر رہا تھا۔ چنانچہ بجائے حاضر ہونے کے وہ کابل کے قلعے میں بند ہو گیا اور وہاں سے راتوں رات غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ ں کی ساری فوج لشکر شاہی میں ملائی گئی۔ بادشاہ نے کامران کے تعاقب میں تو مرزا ہندال کو روانہ کیا اور خود کابل شہر میں داخل ہوا۔ ایک مدت کے بعد اپنے چہیتے شاہزادے کبر کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کیں۔

کابل کی فتح 10 رمضان المبارک 952ھ/1545ء کو ہوئی۔ اس کا مادہ تاریخ یہ ہے۔

“بی جنگ گرفت ملک کابل از وی”

(بغیر جنگ کیے ہی ملک کابل کو اس سے چھین لیا)

ہمایوں کے حملے کے سامنے کامران کے قدم غزنی میں بھی ٹک نہ سکے اور وہ جلد ہی قلو کی طرف بھاگ گیا۔ مرزا شاہ حسین نے جس کی بیٹی کامران کے نکاح میں تھی اس کی مدد کی۔ اس موقعے پر مرزا یادگار ناصر بھی فرار ہو جانے کی فکر میں تھا۔ ہمایوں کو جب اس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے اسے قتل کرا دیا۔

ہمایوں نے کابل سے بدخشاں کی تسخیر کے ارادے سے کوچ کیا۔ اس دوران کابل کو خالی پا کر کامران نے فوج کشی کی اور شہر پر قبضہ کر لیا اور ہمایوں کی بیگمات اور شاہزادہ اکبر کو قید کر لیا۔

کامران سے آخری جنگ

ہمایوں نے بدخشاں کی حکومت مرزا ہندال کو دی تھی، بعد میں اس سے لے کر

دوبارہ مرزا سلیمان کے حوالے کر دی اور خود نہایت تیزی سے کابل کی طرف لوٹ گیا۔ کابل سے باہر کامران کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ پسپا ہو کر قلعے میں بند ہو گیا۔ سخت محاصرے کی وجہ سے اس کے حالات خراب سے خراب تر ہو گئے۔ اس دوران اس نے انتہائی سنگ دلی سے کام لے کر چند بار شاہزادہ اکبر کو قلعہ کے اس کنگرہ پر جو بندوقوں اور توپوں کا نشانہ تھا بٹھا دیا، لیکن "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" اکبر کی جان ہر بار سلامت ہی رہی۔ دونوں بھائیوں کی اس لڑائی میں منافق امیروں اور سرداروں کی سرگرمیاں بس دیکھنے کے لائق تھیں، وہ کبھی اس طرف ہو جاتے تو کبھی دوسرے کے جھنڈے تلے پہنچ جاتے تھے۔ اس معرکے میں دونوں طرف سے بہت آدمی ہلاک ہوئے۔ جب کامران ہر طرح سے مجبور ہو گیا تو بھیس بدل کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ اس کے تعاقب پر حاجی محمد خان ایک جمعیت کے ساتھ نامزد کیا گیا تھا۔ جب وہ تعاقب کرتے ہوئے مرزا کے قریب پہنچا تو کامران نے اس سے کہا "تیرے باپ بابا قشقہ کو کیا میں نے ہی قتل کیا تھا؟" حاجی محمد خان پرانا تجربہ کار سپاہی تھا، یہ فقرہ سن کر اس نے کامران کو نکل جانے دیا اور واپس ہو گیا۔ کامران کے فرار ہو جانے کے بعد شاہزادہ اکبر صحیح سلامت باپ کو مل گیا۔

کامران مرزا نے یہاں سے بھاگ کر بلخ کے حاکم پیر محمد کے پاس پناہ لی اور اس سے مدد لے کر بغیر لڑے سلیمان مرزا اور اس کے بیٹے ابراہیم مرزا سے بدخشاں کے بعض علاقے چھین لیے۔ اسی زمانے میں قراچہ بیگ نے جو ان خاص مہمات میں نمایاں کارنامے انجام دے چکا تھا بعض احمق امیروں کے ساتھ مل کر بادشاہ سے مناسب مطالبے کرنے لگا لیکن جب ان امیروں کی غرض پوری نہ ہوئی تو یہ بدخشاں کی جانب چلے گئے۔

ان چند برسوں میں کابل شورشوں اور انقلاب کا مرکز بنا رہا۔

کامران کی وعدہ خلافی

اس دوران ایک سے زیادہ مرتبہ مرزا کامران نے مخالفت اختیار کی اور ہر مرتبہ حاضر ہو کر معافی چاہی۔ ہمایوں نہایت بامروت شخص تھا، اس نے ہر مرتبہ بھائی کے قصور کو معاف

کر دیا اور اپنا دل اس کی طرف سے صاف کر لیا۔ آخر میں کامران نے خود حاضر ہو کر مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت طلب کی لیکن ہمایوں نے اس کی درخواست قبول نہ کی اور اسے بدخشاں کی حکومت پر مامور کر کے خود بلخ کی طرف لشکر لے کر چلا گیا۔ وہاں پیر محمد اور شاہ اوزبک عبداللہ خان کے لڑکے عبدالعزیز خان کو شکست دی۔ اس کے اپنے امیروں میں اس وقت بڑی مخاصمت پیدا ہو گئی تھی اور کامران کی طرف سے بھی دل مطمئن نہیں تھا اس لیے ہمایوں وہاں سے جلد ہی کابل لوٹ آیا۔

کامران کی وفات

کامران نے حسب عادت پھر وعدہ خلافی کی لیکن شکست کھا کر ہندستان میں سلیم شاہ کے پاس مدد لینے کے لیے بھاگ گیا۔ یہاں سے بھی اسے مایوس ہو کر واپس ہونا پڑا۔ واپسی کے وقت وہ آدم گھکڑ کے ذریعہ گرفتار ہو کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ ہمایوں نے اس کی جان بخشی تو کر دی تھی لیکن اسے اندھا کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد کامران ہجرت کر کے مکہ چلا گیا وہاں اس نے چار حج کیے اور اسی جگہ فوت ہوا۔ مولانا قاسم کاہی[9] نے اس کی تاریخ وفات لکھی ہے۔

کامران آنکہ پادشاہی را
کس ندید ست ہمچو او در خورد
شد ز کابل بہ کعبہ و آنجا
جان بحق داد و تن بخاک سپرد

گفت تاریخ او چنین کاہی
بادشہ کامران بہ کعبہ مرد

اس کے متعلق اوسی 10 شاعر کی تاریخ ہے:

شہ کامران خسرو نامدار
کہ در سلطنت سر بہ کیوان رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال
بکل دل از قید عالم رہاند

مرزا کامران نہایت باہمت، بہادر، سخی، خوش مزاج اور خوش اعتقاد شخص تھا۔ ہمیشہ اس کی صحبتوں میں علماء اور فضلاء حاضر رہتے تھے، وہ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کے شعر کافی مشہور ہیں۔ ایک زمانے میں ایسا پرہیزگار ہو گیا تھا کہ اپنے ملک میں انگور کی کاشت تک کی ممانعت کرادی تھی، اگرچہ بعد میں خود بھی بکثرت مے نوشی کرنے لگا تھا۔ آخر میں تمام باتوں سے توبہ کر کے نہایت پارسائی کی حالت میں انتقال کیا اس کی وفات 924 ھ/1518ء میں ہوئی۔

کابل کی آخری لڑائی میں قراچہ خان مارا گیا اور مرزا عسکری گرفتار ہو گیا۔ خواجہ جلال محمود دیوان نے اسے بدخشان لے جا کر مرزا سلیمان کے حوالہ کر دیا وہاں چند روز قید میں رہنے کے بعد اسے رہائی ملی۔ مرزا سلیمان نے بعد میں اسے بلخ بھیج دیا تھا، وہاں سے وہ مکہ کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن شام اور مکہ کے درمیانی جنگل میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات کا مادہ تاریخ ہے:

"عسکری بادشاہ دریا دل"

ہندال کا قتل

مرزا ہندال کا انجام یہ ہوا کہ جب کامران نے آخری بار شکست کھائی اور ہندستان میں جا کر پٹھانوں کے پاس پناہ لی تو اسی دوران میں کسی موقعے پر کامران نے ہندال کے

لشکر پر رات میں حملہ کیا اور وہ اسی حملے میں قتل ہو گیا۔

یہ واقعہ 958ھ/1551ء میں پیش آیا۔ اس کی تاریخ لفظ "شب خون" سے نکلتی ہے۔

ہمایوں نے مرزا ھندال کا سارا مال واسباب شاہزادہ اکبر کو عطا کیا اور غزنی اور اس کے اردگرد کے علاقے بھی اس کو بطور جاگیر عطا کر دیا۔

اسی دوران سلیم شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہندستان میں اس کی وفات کے بعد بڑی بدامنی پھیل گئی تھی۔ جب ہمایوں کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے دوبارہ ہندستان پر حملہ کرنے کا ارادہ بنالیا۔

انہی دنوں لوگوں نے چغلیاں کھا کھا کر ہمایوں کو بہرام خاں کی طرف سے ناراض کردیا۔ چنانچہ ہمایوں نے بجائے ہندستان کے قندھار کی طرف پہلے چڑھائی کی۔ وہ بھی خود بادشاہ کے استقبال کے لیے حاضر ہو گیا۔ اس کی خیرخواہی بخوبی ظاہر ہو گئی اور معلوم ہوا کہ اہل غرض نے اس کے خلاف جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔

مولانا زین الدین محمود

اس مرتبہ ہمایوں جو قندھار گیا تو بیرم خان کی معرفت اس نے مولانا زین الدین محمود کمان گر بہدائی” سے ملاقات کی۔ مولانا ممدوح خراسان کے ایک موضع بہدا کے رہنے والے تھے۔ اکثر بزرگوں اور عالموں کی صحبت میں رہ چکے تھے، چنانچہ وہ مولانا جامی اور مولانا عبدالغفور سے بھی ملاقات کر چکے تھے۔ مولانا فن نقاشی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ لیکن وہ اپنے اس کمال کو لوگوں سے چھپائے رکھتے تھے۔ بیرم خان ان کا شاگرد تھا اور ہمیشہ ان کے درس میں حاضر رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یوسف زلیخا کے درس میں بیرم خان مداخلت کرنے لگتا تھا تو مولانا فرماتے تھے "بیرم خان کیا تو نے دنیا میں اپنے لیے کوئی اور یوسف زلیخا بنائی ہے"؟

ایک مرتبہ ہمایوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کھانا پکوایا اور مولانا کی دعوت کی۔ ہاتھ دھلانے کے وقت ہمایوں نے خود اپنے ہاتھ میں چراغ اٹھالیا اور طشت بیرم

خان نے سنبھالا۔ اس وقت مولانا نے سید جمال الدین محدث کے پوتے میر حبیب اللہ کی طرف اشارہ کر کے ہمایوں سے کہا "اس کو بھی جانتے ہو یہ کون ہے؟"۔ ہمایوں کو ان کے سامنے بھی چراغ لے جانا پڑا۔ میر صاحب گھبرا گئے اور تھوڑا سا پانی جلدی جلدی میں اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا۔ مولانا نے نہایت اطمینان کے ساتھ اچھی طرح اپنے ہاتھ دھوئے۔ اس موقعے پر ہمایوں نے مولانا سے پوچھا "کتنے پانی سے ہاتھ دھونا مسنون ہے؟" مولانا نے فرمایا: "جس قدر پانی سے ہاتھ اچھی طرح دھل جائیں"۔ اس مجلس کے باقی لوگوں میں سے کچھ کے ہاتھ بیرم خان نے اور بعض کے قاسم خان کے داماد حسین خان نے دھلوائے اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ہمایوں مولانا کی صحبت سے بہت خوش ہوا اور ان سے بہت کچھ استفادہ کرتا رہا۔ بعد میں اس نے کچھ نقدی بیرم خان کے ذریعے روانہ کی۔ مولانا کو کسی سے تحفہ لینے کی عادت نہ تھی اس لیے انھوں نے بہت انکار کیا لیکن بیرم خان نے بھی بڑے خلوص کے ساتھ اس قدر اصرار کیا کہ انھوں نے وہ رقم کراہت کے ساتھ قبول کر لی۔ لیکن اس کے عوض انھوں نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی بہت سی کمانیں جو اس رقم سے زیادہ قیمت کی تھیں بادشاہ کے پاس بھجوا دیں کہ ہدیہ ایک طرفہ نہیں دونوں جانب سے ہوا کرتا ہے۔

ایک دن بیرم خان ایک نہایت نفیس کشمیری شال ان کو تحفے میں دینے کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے یہ شال ہاتھ میں لی اور فرمایا: "کتنی اچھی چیز ہے؟" بیرم خان نے کہا: "یہ صوفیانہ شال ہے اس لیے آپ کی نذر کے لیے لے آیا ہوں"۔ آپ نے اپنی دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "میرے لیے تو اپنی دوہری بہت کافی ہے۔ ہاں اسے تم مجھ سے زیادہ کسی اور مستحق کو دے دو"۔

مولانا کی کرامتیں بھی بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس وقت ہمایوں کے لشکری تیر اندازی کی مشق کیا کرتے تھے تو وہ بھی خلاف عادت وہاں پہنچ جاتے تھے اور تیر اندازی کا فن سیکھنے کے لیے لوگوں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہتے تھے: "ایک دن یہ تیر اندازی کام آئے گی"۔ ماچھی واڑہ کی لڑائی میں جو پہلے ہی حملہ میں پٹھانوں کو شکست ہوئی تو وہ صرف ہمایونی لشکر کی تیر اندازی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ غالباً مولانا کا اشارہ اسی

معرکے کی طرف تھا۔

جس وقت بیرم خان قندھار کی حکومت علی قلی خان سیستانی کے بھائی بہادر خان کے سپرد کر کے کابل آیا تھا تو اس نے اپنی طرف سے ایک ظالم ترکمان کو گماشتہ مقرر کیا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی خبریں روزانہ مولانا کے پاس پہنچتی تھیں۔ اتفاقاً وہ ترکمان بیمار ہو گیا تو لوگوں کو کچھ دن کے لیے اس کی زیادتیوں سے نجات ملی۔ ایک دن کسی شخص نے مولانا کی مجلس میں کہا کہ: ''اب وہ تندرست ہو کر پھر اٹھ رہا ہے''۔ مولانا نے اس شخص کو تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جلدی سے فرمایا: ''شاید قیامت کے دن ہی اٹھے گا''۔ چنانچہ وہ چار دن بعد ہی وہ ظالم مر گیا۔

ہمایوں جب لوٹنے لگا تو اس نے قندھار کو بیرم خان کے بجائے منعم خان کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا، لیکن منعم خان نے کہا: ''اس وقت جب کہ آپ ہندوستان پر حملے کا عزم کیے ہوئے ہیں، کسی قسم کا رد و بدل لشکر کے لیے باعث بے رخی ہوگا۔ ہندوستان کی فتح کے بعد جس طرح چاہیے کیجیے''۔ ہمایوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور قندھار بیرم خان کے پاس اور داور بہادر خان کے پاس ہی رہا۔

ہندوستان کی جانب کوچ

ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے جنگ کا سامان تیار کیا اور ماہ ذی الحجہ 961ھ/1554ء میں کابل سے ہندوستان کے ارادے سے سوار ہو گیا۔ اس کی روانگی کا قطعہ تاریخ ہے۔

خسرو غازی نصیرالدین ہمایوں شاہ آنکہ
گوئی سبقت برد از شاہان پیش پیشکی
بہر فتح ہند از کابل عزیمت کرد و شد
سال تاریخ توجہ نہ صد و شصت و یکی

اس قطعہ میں لفظی اور معنوی دونوں تاریخیں موجود ہیں۔

جب شاہی لشکر پشاور پہنچا تو قندھار سے بیرم خان بھی آ کر شامل ہو گیا۔ یہاں سے لشکر نے روزانہ مسلسل کوچ کیا اور دریائے سندھ کو پار کیا۔ ہمایوں کی ہراول فوج پر بیرم خان، خواجہ خضر خان، تردی بیگ خان اور سلطان سکندر ازبک مامور تھے۔ ہمایوں کی آمد کی خبر کو سن کر رہتاس کے حاکم تاتار خان کاسی، قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس مرتبہ آدم کھوکر نے بھی لشکر میں حاضری نہ دی اور جب ہمایوں لاہور پہنچا تو وہاں کے پٹھان مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے۔ ہراول کے امیر لاہور، تھانیسر، جالندھر اور سرہند کی طرف بے روک ٹوک بڑھتے چلے گئے۔ دیپالپور کے قریب شہباز خان اور نصیر افغانی مقابلہ کے لیے آئے لیکن شاہ ابو لمعالی اور علی قلی شیبانی سے شکست کھا کر بھاگ گئے۔ اس وقت مغلوں کا ایسا ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ ہزار ہزار پٹھان بڑے پگڑ باندھے ہوئے دس سواروں کو بھی دیکھ لیتے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے تھے، چاہے وہ سوار لاہوری ہی کیوں نہ ہوں۔

جب ہمایوں سندھ کے اس پار ہی تھا سکندر سور نے ابراہیم سور کو شکست دینے کے بعد اٹاوہ سے عدلی شاہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر لی تھی۔ اس موقعے پر اسے خبر ملی کہ ہمایوں نے سندھ کو عبور کر لیا ہے۔ سکندر سخت پریشان تھا کیوں کہ پٹھانوں کا یہ حال تھا کہ ہر شخص ہمت ہار کر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان بچانے کی فکر میں لگا ہوا تھا اور سب یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ صرف سلیم شاہ کے بس کی ہی بات تھی کہ وہ مغلوں کے دانت کھٹے کر دیتا تھا اب ان سے مقابلہ کرنے والا کون رہ گیا ہے؟ اس عام پست ہمتی کے باوجود سکندر نے دوسرے تمام کام چھوڑ کر مغلوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

سکندر سور سے مقابلہ

ہمایوں کی کچھ فوج جالندھر میں پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سب سے پہلے اس محاذ پر حبیب خان، نصیب خان طغوچی اور تاتار خان کاسی کو روانہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے کوچ کر دیا۔ سکندر کی پیش قدمی کی وجہ سے چغتائی امیر ستلج کے اس پار چلے گئے۔

پٹھانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ شام ہوتے ہوتے دونوں فوجوں میں ایک سخت لڑائی ہوئی۔ مغلوں نے قدم جما کر تیر اندازی شروع کر دی۔ پٹھان اپنے خراب جنگی سازو سامان کی وجہ سے تیر اندازی کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور انھوں نے ایک ویران گاؤں میں جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد پٹھانوں نے ایک حماقت یہ کی کہ مغلوں کے لشکر کو بخوبی دیکھنے کے لیے بہت سی آگ جلائی جس سے قدرتی طور پر معاملہ الٹا ہو گیا کہ پٹھان روشنی میں آ گئے اور مغل لشکر اندھیرے میں محفوظ رہا۔ اس روشنی سے فائدہ اٹھا کر مغلوں نے تاک تاک کر تیر مارنا شروع کر دیے، جو تیر بھی ان کی کمان سے نکلتا تھا، کسی نہ کسی پٹھان کی جان لے کر ہی جاتا تھا۔ آخر پٹھان شکست کھا کر بھاگے اور مغلوں نے آسانی سے یہ معرکہ جیت لیا۔ ان کا بہت کم جانی نقصان ہوا اور غنیمت میں کافی سازوسامان، ہاتھی اور گھوڑے ہاتھ آئے اس فتح کی خبر ہمایوں کو لاہور میں ملی۔

جلدی ہی سارا پنجاب، سرہند اور حصار فیروزہ تک کا علاقہ مغل فوج کے قبضے میں آ گیا اور ہمایوں فاتحانہ کوچ کرتا ہوا دہلی کے قریب آ پہنچا۔ اسی دوران سکندر نے بھاگے ہوئے پٹھانوں کو چاروں طرف سے جمع کر کے اسی ہزار سواروں اور بہت سے ہاتھیوں اور توپ خانہ لے کر سرہند پر حملہ کیا اور شیر شاہ کے طریقے پر اپنے لشکر کے اطراف خندق اور حصار بنا دیا۔ مغل سرہند کے دروازے بند کر کے اندر سے لڑنے لگے اور ہمایوں کو مدد کے لیے لکھا۔ ان کی مدد کے لیے ہمایوں نہایت تیزی سے حملہ کرتے ہوئے سرہند پہنچ گیا۔ یہاں کافی عرصے تک لڑائی ہوتی رہی، ہر روز خون ریز مقابلہ ہوتا تھا۔

پٹھانوں کی شکست

جس دن شاہزادہ اکبر لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا اس دن بڑی سخت خونریز لڑائی ہوئی ایک طرف سے اکبر دوسری طرف سے بیرم خان، سکندر خان، عبداللہ خان اوزبک، شاہ ابوالمعالی، علی قلی خان اور بہادر خان آگے بڑھے اور مردانگی کے ساتھ پٹھانوں پر حملہ کیا پٹھانوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی اپنے حوصلے سے بڑھ کر انہوں نے بہادری دکھائی۔ تقدیر

میں فتح مغلوں کے ہاتھ لکھی تھی۔ پٹھان مغلوں کے حملے کی تاب نہ لا سکے اور شکست کھا کر میدان سے بھاگ گئے۔ مغلوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اس دن سارے راستے میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ غنیمت میں مغل فوج کو ہر طرح کا بے انتہا مال و اسباب بے شمار ہاتھی اور گھوڑے ملے۔ مقتول پٹھانوں کے سر اس کثرت سے ڈھیر تھے کہ ان کے مینار بن گئے۔ اسی مناسبت سے بیرم خان نے اس مقام کا نام "سرمنزل" رکھا تھا، یہی نام آج تک چلا آ رہا ہے اس فتح کی تاریخ ہے: "شمشیر ہمایون"

جب سکندر لڑائی ہار گیا تو مایوس ہو کر سوالک کی پہاڑی کی طرف بھاگ گیا اور سکندر خان اوزبک ایک بڑا لشکر لے کر سامانہ کے راستے دہلی جا پہنچا، جو پٹھان دہلی میں رہ گئے تھے وہ سب منتشر ہو گئے۔ ہمایوں نے سکندر کا پیچھا کرنے کے لیے شاہ ابوالمعالی کو روانہ کیا اور خود ماہ رمضان المبارک 962 ھ/1554ء میں دہلی میں داخل ہوا اور ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا۔ ہندوستان کے بادشاہوں میں بہت کم کو یہ قسمت نصیب ہوئی کہ ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد دوبارہ ان کو سلطنت مل جائے۔

اس سال ہمایوں نے بہت سے علاقے اپنے امرا کو جاگیر میں عطا کیے اور مصطفے آباد کا پرگنہ جس کا محصول سالانہ تیس چالیس ہزار تنکہ ہوتا تھا حضور اکرم کے نام پر وقف کر دیا۔ حصار فیروزہ اکبر کو جاگیر میں ملا۔ بابر نے بھی اپنی پہلی فتح کے وقت میں یہی مقام ہمایوں کو جاگیر میں دیا تھا۔ پنجاب کا صوبہ شاہ ابوالمعالی کے سپرد کر کے اسے سکندر کے مقابلے پر مقرر کیا گیا۔

جب سکندر نے بھاگ کر شمالی پہاڑی میں پناہ لی تھی تو ابوالمعالی کی مدد کے لیے جو دوسرے امیر مقرر کیے گئے تھے، سکندر نے ان کی جاگیروں پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ اس کی مداخلت سے سرکاری خزانہ اور خالصہ کے پرگنے بھی محفوظ نہیں تھے۔ اس کے مسلسل حملوں سے مذکورہ امیر بددل ہو چلے تھے اور سکندر کی قوت روزانہ بڑھتی جا رہی تھی۔

جب سکندر کی مداخلت اور حملے بہت بڑھ گئے تو ہمایوں نے شہزادہ اکبر کو بیرم خان کی سرپرستی میں سکندر کے مقابلے پر بھیجا اور شاہ ابوالمعالی کو حصار فیروزہ پر تبدیل کر دیا۔ اکبر کے

رخصت ہونے سے پہلے ہی بادشاہ نے آگرے پر قبا خان گنگ کو میرٹھ، سنبھل پر علی قلی خان کو، بدایوں پر قنبر دیوانہ کو اور بیانہ پر محمد خان آختہ بیگی کو مقرر کر کے رخصت کر دیا تھا۔

غازی محمد خان کا قتل

حیدر محمد خان نے بیانہ پر حملہ کیا تو ابراہیم سور کا باپ غازی محمد خان قلعہ بیانہ میں بند ہو گیا۔ اس محاصرہ سے پہلے بھی اور بعد میں بھی لوگوں نے غازی محمد خان کو بہت سمجھایا کہ وہ رنتھنبور اور پھر وہاں سے گجرات چلا جائے۔ لیکن اس نے کسی کا مشورہ قبول نہ کیا اور قلعے میں اس طرح گھر گیا جیسے مچھلی جال میں۔ بیانہ کے تمام زمینداروں نے معافی مانگتے ہوئے مغل لشکر میں حاضر ہو گئے۔ حیدر محمد خان نے وعدہ اور معافی کے ذریعے غازی خان کو مع اہل و عیال قلعہ سے باہر آنے پر راضی کر لیا اور اس کی رہائش کے لیے ایک محفوظ مقام کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن جب اس نے بیانہ کے خزانوں اور قیمتی چیزوں کے متعلق بخوبی تحقیقات کر لیں تو اپنے کیے ہوئے عہد سے مکر گیا اور غازی خان کو اس کے اہل و عیال بلکہ شیر خوار بچوں سمیت قتل کرا دیا۔ ان کے سر بادشاہ کے پاس بھجوا دیے۔ ہمایوں کو اس کے یہ عہد توڑنے پر غصہ آیا اور اس نے میر شہاب الدین نیشاپوری کو جس کا خطاب شہاب الدین احمد خان تھا غازی خان کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے بیانہ کی طرف روانہ کیا۔ حیدر محمد خان نے نفیس اسباب جواہرات وغیرہ کو چھپا لیا اور کم قیمت والا سامان معائنے میں پیش کر دیا۔

قنبر دیوانہ

قنبر دیوانہ نے سنبھل پہنچنے کے بعد کافی بڑی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ بعد میں جب سنبھل علی قلی خان کے حوالہ ہوا تو وہ کہا کرتا تھا: ''یہ تو وہی کہاوت ہوئی کہ پیڑ کسی کے اور گاؤں کسی کا'' علی قلی خان کے سنبھل آنے سے پہلے ہی قنبر بدایوں چلا گیا۔ وہاں اس نے

کانٹ اور کولہ کی طرف حملہ کر کے برکن خان پٹھان سردار سے مقابلہ کیا، اسے شکست دے کر ملانوہ تک کا علاقہ اپنے قبضے میں کرلیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد پٹھانوں کے مقابلے میں شکست کھا کر اور وہاں کے قلعہ میں خون بچا کر کے بدایوں لوٹ آیا۔ بدایوں میں بھی اس نے ظلم وستم پر کمر باندھ لی۔ علی قلی خان نے اسے اپنے پاس بلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ گیا اور کہلوایا: ''میں بادشاہ کے پاس تجھ سے زیادہ مقرب ہوں اور مرا سر شاہی تاج سے وابستہ ہے''۔ اس کی ان باتوں سے بگڑ کر علی قلی خان نے اس پر فوج کشی کی اور بدایوں کا محاصرہ کرلیا۔ قنبر دیوانہ اس محاصرے کے دوران بھی شہر والوں پر ظلم ڈھانے سے باز نہیں رہتا تھا۔ آج کسی کی بیوی کو اڑا لیا تو کل کسی کی بیٹی کا اغوا کیا، کسی کا مال واسباب زبردستی چھین لیا۔ اس کو اپنے کسی آدمی پر بھروسہ نہ تھا اس لیے راتوں میں بذات خود مورچوں کی گشت کیا کرتا تھا۔ اپنی دیوانگی کے باوجود لڑائی کی چالوں میں بڑا ہوشیار تھا۔

ایک دن قلعے کے ایک خالی مقام پر آدھی رات کے وقت پہنچ گیا، ایک جگہ چلتے چلتے رک گیا پھر دو چار قدم آگے بڑھ کر سوچنے لگا پھر اچانک پلٹ کر اسی پہلی جگہ آ گیا اور اسی وقت بیلداروں کو بلا کر زمین کو کھودنے کا حکم دیا اور کہا کہ: ''اس جگہ سے میرے کان میں کچھ آواز آ رہی ہے''۔ جب وہ جگہ کھودی گئی تو معلوم ہوا علی قلی خان نے قلعے کے باہر سے سرنگ لگا رکھی تھی۔ جن لوگوں نے یہ سرنگ دیکھی تھی ان کا بیان ہے کہ جب سرنگ کھودی جانے لگی تو معلوم ہوا کہ قلعہ کی بنیاد پانی کے اندر تک چلی گئی ہے اور اس میں لوہے کے پشتے اور سال کی لکڑی کے شہتیر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک جگہ خالی مل گئی تھی اس مقام سے سرنگ کھودی گئی تھی جس کا سراغ اس دیوانہ کی ہوشیاری سے بر وقت لگ گیا۔ علی قلی خان بھی قنبر کی اس دانائی پر حیران رہ گیا تھا۔

محاصرہ جاری تھا کہ بدایوں کے تمام شہریوں نے یکجا ہو کر علی قلی خان کے پاس کہلا بھیجا کہ: ''فلاں رات کو فلاں برج پر حملہ کرنا ہم قلعہ کے اوپر سے کمندیں اور سیڑھیاں لٹکا دیں گے''۔ اسی منصوبے کے مطابق علی قلی خان نے حملہ کیا اور اس کے سپاہیوں کو شیخ حبیب بدایونی نے اس برج کی طرف سے جو شیخ سلیم چشتی کے رشتے دار شیخ زادوں کا تھا

اوپر چڑھا لیا اور لشکریوں نے شہر میں داخل ہو کر آگ لگا دی۔ قمبر دیوانہ سے جب کچھ نہ بن پڑا تو وہ ایک کالا کمبل اوڑھ کر شہر سے نکل گیا لیکن لوگ پکڑ کر اسے علی قلی خان کے پاس لے آئے۔

علی قلی خان بڑی نرمی اور ملائمت سے پیش آیا اور کہا کہ: ”اگر تو اطاعت قبول کر لے تو میں تیری جان بخش دوں گا۔“ لیکن دیوانہ نہایت تلخ و ترش باتیں کرتا رہا اور کسی طرح قابو میں نہیں آیا۔ مجبور ہو کر علی قلی خان نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کی قبر بدایوں میں اب تک مشہور ہے (مؤلف منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی کے وقت کی بات تھی) قمبر کی عادت تھی کہ بہت سا کھانا پکوا کر لوگوں کی دعوت کرتا۔ اور کہتا تھا۔ ”کھاؤ مال خدا کا ہے۔ جان خدا کی اور قمبر دیوانہ خدا کا باورچی ہے۔“

جب علی قلی خان کا عریضہ قمبر کے سر کے ساتھ بارگاہ سلطانی میں پہنچا تو علی قلی خان کی یہ حرکت ہمایوں کو سخت ناپسند لگی۔

ہمایوں کی وفات

انہی دنوں 7 ربیع الاول 963ھ/1555ء کو ہمایوں بادشاہ کتب خانہ [11] کی چھت پر گیا جو دہلی کے قلعہ دین پناہ [12] میں بنایا گیا تھا جس وقت وہ وہاں سے اتر رہا تھا تو اذان کی آواز آنے لگی۔ اذان کے احترام میں وہ اسی جگہ بیٹھ گیا۔ جب وہاں سے اٹھنے لگا تو لاٹھی پھسل گئی اور ہمایوں بادشاہ کا پیر بھی پھسل گیا اور وہ چند سیڑھیوں پر سے پھسلتے ہوئے زمین پر آ گیا کچھ اطمینان ہونے کے بعد شیخ جولی کو پنجاب بھیجا جس نے شاہزادہ اکبر کو اپنے حالات سے مطلع کرا دیا۔

اس صدمے سے ہمایوں جانبر نہ ہو سکا۔ آخر کار اس حادثہ کے آٹھویں دن 15 ربیع الاول 963ھ/1555ء کو اس نے عالم فنا سے آنکھیں پھیر لیں۔

ہمایوں کی ذاتی خوبیاں

وفات کے وقت ہمایوں کی عمر اکیاون سال تھی۔ اس نے 25 سال سے کچھ زائد حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ امور سلطنت میں اس کی بڑی گہری نظر تھی۔ ظاہری اور باطنی بہت سے ہنر و کمال اسے حاصل تھے۔ وہ نجوم وہیئت کے علاوہ مروجہ علوم میں بھی ماہرانہ دستگاہ رکھتا تھا۔ علماء اور فضلاء، بزرگوں اور شاعروں کی دل سے قدر کرتا تھا اور خود بھی بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔

ہمایوں ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ خدا اور رسول اکرمؐ کا نام کبھی بغیر وضو کے نہیں لیتا تھا۔ اگر کسی ایسے نام کو دہرانے کی ضرورت پڑتی جو عبد اور اللہ سے مرکب ہو تو وہ صرف عبد کہا کرتا تھا۔ مثلاً عبدالحی کو فقط عبدل کہتا تھا۔ اپنے رقعات کے سرنامہ پر بجائے لفظ ''ھو'' کے اس لفظ کا عدد گیارہ لکھا کرتا تھا۔ غرض اس طرح کے تمام مذہبی آداب کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔

اس کی محفلیں رات رات بھر جمی رہتی تھیں، کبھی اس کی طرف سے تھکاوٹ اور سستی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ دل کا بڑا سخی تھا۔ اس کی فیاضی کے لیے سارے ہندستان کا خراج بھی کافی نہیں تھا۔ اس لیے محکمہ مالیات کے کارکن اس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لاتے تھے۔

اس کی زبان پر کبھی گالی نہ آئی، جب بہت غصہ میں آجاتا تو زبان سے: ''بے نادان'' کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ مجلس میں جب آتا تو بھولے سے بھی بایاں پیر پہلے نہ رکھتا تھا۔ اس کی مجلس میں کسی اور شخص کی بھی مجال نہ تھی کہ کبھی بایاں پاؤں پہلے رکھے۔ اگر کبھی کسی سے یہ چوک ہو جاتی تو وہ اسے دوبارہ پیچھے لوٹ کر جانے کے لیے کہتا تھا۔ اس کی حیا کا یہ عالم تھا کہ نہ کبھی قہقہہ مار کر ہنسا اور نہ کبھی کسی کی طرف گھور کر دیکھا۔

اس کا یہ قصہ کافی مشہور ہے کہ جب اس نے ہندستان پر دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو کابل کے مفسر قرآن شیخ حمید سنبھلی تک اس کے استقبال کے لیے گئے۔ ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا۔ ایک دن شیخ نے ہمایوں سے کہا: ''تمہارا پورا لشکر رافضی معلوم ہوتا ہے''۔ ہمایوں

نے پوچھا "کیسے"؟ انھوں نے کہا: "اس بار تمہارے تمام سپاہیوں کے نام یار علیؓ، نقش علیؓ، حیدر علیؓ وغیرہ وغیرہ ہیں دوسرے کسی خلیفہ کے نام پر کسی کا نام نہیں 13ہے" یہ بات سن کر ہمایوں کو بڑا طیش آ گیا اور ہاتھ میں جو قلم تھا وہ فرش پر پھینک کر کہا: "میرے دادا کا نام عمرؒ شیخ تھا"۔ اتنا کہہ کر محل سرا میں چلا گیا لیکن کچھ دیر بعد ہی باہر آ کر نہایت ملائم اور نرم لہجے میں اس نے شیخ کو اپنے صحیح عقائد سے آگاہ کیا۔

ہمایوں کی ذاتی خوبیاں اتنی ہیں کہ اس کو لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ہمایوں علم دوست اور نہایت قدرداں بادشاہ تھا اس کے عہد میں بہت سے صاحب کلام شاعر گزرے ہیں۔

عہد ہمایونی کے شعراء

جنوبی بدخشی

ہمایوں کے عہد کے شاعروں میں سے بدخشان کے ایک شاعر مولانا جنوبی بدخشی تھے۔ اس نے ہمایوں کی شاہزادگی کے زمانے میں اس کا قصیدے 38 اشعار پر مشتمل کہا تھا۔ اس قصیدے کا کمال یہ ہے کہ وہ مشکل صنائع جو خواجہ رشید قدر کے قصیدے میں ذوالفقار شروانی اور خواجہ غیاث کے قصیدے میں سلمان ساؤجی جیسے بڑے شاعروں نے چھوڑ دیے تھے جنوبی نے اس قصیدے میں سارے مشکل صنائع معماء، اظہار مضمر اور تاریخ وغیرہ حقیقت میں جنوبی نے یہ قصیدہ لاجواب لکھا ہے:

شہنشاہا رخ تو لالہ و نسرین لب تو جان
ھمی بنیم لب تو غنچہ رنگین شدہ خندان

اس قصیدے کی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کے ہر مصرعے کے شروع کا ایک ایک حرف لیا جائے تو یہ حروف مل کر مطلع بناتے ہیں۔

وفائی

ہمایوں کے عہد کے دوسرے شاعر شیخ زین الدین خان تھے جن کا تخلص وفائی تھا۔ بابر نے اپنے عہد میں ان کو پورے ہندستان کا مستقل صدر الصدور بنا دیا تھا۔ آگرے میں جمنا کے پار ایک مسجد اور ایک مدرسہ ان کی یادگار ہے۔ نظم و نثر کے تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی، خاص طور سے فن معما گوئی، تاریخ اور بدیہہ گوئی میں ان کی مثال نہیں تھی۔ وہ جب پہلی مرتبہ بابر کے پاس آئے تو بادشاہ نے پوچھا، تمہاری عمر کیا ہے؟ بس پانچ برس پہلے "چہل سالہ تھا اور اب "چہل سالہ" ہوں اور دو برس بعد "چہل" پورے ہوں گے۔

مشہور ہے کہ شیخ زین الدین ایک مرتبہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر گئے اور وہاں شیخ کی یہ حکایت سنی کہ "الصدایا مشترک وتنہا خوشترک" اس پر انھوں نے یہ قطعہ لکھا:

شیخا بادا ترا از حق صدایا بر دوام
آن کدام من کہ گویم الصدایا مشترک
گوئی تنہا مشترک زانسان کہ گفتی پیش ازین
مشترک سازار نگوئی کہ تنہا خوشترک

شیخ زین الدین نے ہندستان کی فتوحات اور اس سلسلے کے عجیب وغریب حالات پر مشتمل ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس سے ان کی سخنوری کا کمال جھلکتا ہے۔ ان کی وفات چنہار کے علاقہ میں 940ھ/1533ء میں ہوئی اور اپنے ہی بنائے ہوئے مدرسہ میں دفن ہوئے۔

نادری

ہمایونی دور کے ایک اور شاعر مولانا نادری سمرقندی گزرے ہیں جو اپنے زمانے کے بڑے فاضل اور جامع کمالات شخص تھے۔ ایک خوب صورت جوان جس کا نام نظام تھا وہ دل وجان سے فریفتہ تھے اسی کے لیے انھوں نے یہ "اظہار مضمر" لکھا تھا۔

من دل شکستہ گویم صفت نظام نامی
کہ نداشت پی وصالش دل ناتوان نظامی

مولانا نادری کا انتقال 966ھ/1558ء میں ہوا۔

فارغی

اسی زمانے کے ایک شاعر شیخ ابواحد فارغی تھے۔ بڑے درویش مزاج اور نہایت شیریں کلام شاعر تھے:

ازبس کہ آن جفاجو آزاری نماید
اندک ترحم او بسیار می نماید

ان کی وفات 940ھ/1533ء میں ہوئی۔ آگرہ میں شیخ زین کی خانقاہ میں ان کے مقابل دفن ہیں۔ یہ دونوں بڑے گہرے دوست تھے اور اتفاق دیکھیے کہ ایک ہی سال آگے پیچھے دونوں فوت ہوئے۔

جامی

ایک اور شاعر جامی تبانی تھے۔ تبان بخارا کے متعلقات میں سے تھا اس جگہ کی مناسبت سے تبانی کہلاتے تھے۔ جس زمانے میں ہمایوں کابل میں ہندستان پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا وہ دربار شاہی میں پہنچے اور الطاف شاہانہ سے معزز ہوئے۔ جس وقت ہمایوں نے کابل میں شاہ محمد خان شاپور کو بطور نگراں حاکم مقرر کیا تھا اس نے لوگوں کو بڑی ایذائیں دی تھیں اس کے معتوب افراد میں جامی بھی تھے۔ ملا جامی نے شاپور کی ہجو میں ایک ترکیب بند لکھا تھا:

شاعر شاہ ہمایونم و خاک درگہ
معزند گو کہہ شاعر یم طعنہ بہ
خسرو شعرم و ابیات خوشم خیل و سپہ
دیدم از محبہ زنی قلم نہ جرم نہ گنہ

حیدر تونی

اس دور کا ایک شاعر حیدر تونیائی بھی تھا۔ یہ بڑا صاحب علم و فضل اور فن موسیقی میں ماہر تھا۔ اس کی زیادہ تر زندگی ہندستان میں بسر ہوئی۔ اس کا یہ مطلع جو اس نے امام شہید کی تعزیت میں کہا تھا، عاشورہ کے دنوں میں اکثر مجالس میں پڑھا جاتا ہے:

ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین
گریم خون بیاد لب تشنہ حسین

حیدر تونی کا ایک لڑکا نہایت بزدل تھا۔

طاہر دکنی

ایک اور شاعر طاہر خواندی دکنی بھی تھا۔ عراق کے علمائے سلف نے خوندایوں کے نسب کے متعلق بڑی جرح و تنقید کی ہے۔ اس کا ایک بڑا اچھا قصیدہ ہے:

ہر آنکس کہ بر کام گیتی نہد دل
بنزدیک اہل خرد نیست عاقل

شاہ طاہر 952ھ/1545ء میں دکن میں فوت ہوئے۔

خواجہ ایوب

اس دور کا ایک شاعر خواجہ ایوب ابن خواجہ ابوالبرکات ہے۔ یہ ماورہ النہری بزرگوں کی اولاد میں سے تھا وہ اور اس کا باپ دونوں علم و فضل کے لحاظ سے بڑے عالی مرتبہ تھے۔ خواجہ اپنے اشعار میں کبھی ایوب اور کبھی فراقی تخلص کرتا ہے:

ای شاخ گل کہ ہمچو سہی قد کشیدہ ای
برگرد لب خطی ز زمرد کشیدہ ای
قدت بر آمدہ چو الف مدظلہ
وز ابروان فراز الف مد کشیدہ ای

حواشی

1. میر سید محمد: سید رفیع الدین محدث کے شاگرد، سید جلال سے بدایوں میں علوم کی تحصیل کی تھی۔ سوری حکمراں کے زمانے سے اکبر کے ابتدائی عہد تک وہ برابر دربار سے منسلک رہے اور "میر عدل" ان کا عہدہ اور خطاب تھا۔ انصاف کی کرسی پر نہایت عدل و دیانت سے آخر تک کام کرتے رہے۔ جب تک وہ دربار اکبری میں رہے اس وقت تک ابوالفضل جیسا دانشور بھی دین کے معاملے میں دخل کرنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ 984ھ/1576ء میں بھکر کی حکومت پر ان کا تقرر ہوا اور اسی جگہ وہ 986ھ/1578ء میں فوت ہوئے۔

(بحوالہ: تاریخ امروہہ، تالیف محمد احمد عباسی، جلد اول۔)

2. تنکہ کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک تولہ سونا اور چاندی کی ملاوٹ سے تیار ہوتا تھا اور ہر سونے کا تنکہ 50 چاندی کے جیتل کے برابر ہوتا تھا۔ فرشتہ آگے لکھتا ہے کہ اس کے وزن کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ فرشتہ جس تنکے کا حال بیان کرتا ہے وہ علاء الدین کے عہد حکومت میں مروج تھا جب مسلمان ہندستان آئے تو یہاں جو سکہ رائج تھا وہ "دلی والی" کہلاتا تھا۔ طبقات ناصری کا مصنف قاضی منہاج السراج جو اکثر بعد کی تاریخوں کا ماخذ ہے، جیتل اور

تنکہ دونوں کو استعمال کرتا ہے۔ 418ھ /1027ء کی مہر لگی سلطان محمود غزنوی کے سکوں پر عربی میں درہم کا لفظ ضرب ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ سنسکرت زبان میں تنکہ بھی ثبت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ "تنکہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اہل علم نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ تنکہ ترکی لفظ ہے۔ سلطان محمد تغلق کا ایک نقرئی تنکہ 80 رتی یعنی 140 گرین کا ملتا ہے۔ ابن بطوطہ اس تنکہ کو "درہمی دینار" کہتا ہے۔ نیز عام مروجہ نقرئی تنکہ کو دینار لکھتا ہے۔

مسالک الابصار کے مصنف نے لکھا ہے "طلائی تنکہ تین مثقال کا ہوتا تھا اور نقرئی تنکے کی آٹھ "ہشتکانیاں" آتی تھیں۔ ایک ہشتکانی مصر اور شام کے درہم کے برابر تھی۔ ایک ہشتکانی کی چار "سلطانیاں" ہوتی تھیں۔ ایک سلطانی یا دوگانی کے دو جیتل ہوتے تھے اور ایک جیتل کے چار فلوس ملتے تھے۔

طبقات اکبری کے مصنف نے تنکہ سفید (نقرئی) تنکہ سرخ (طلائی) کے علاوہ تنکہ سیاہ کا لفظ بھی لکھا ہے۔

بقول ابن بطوطہ: ان کے زمانے میں تین طرح کے تنکے تھے۔ 1۔ تنکہ سفید۔ خالص چاندی کا جس کا وزن سو رتی اور اسّی رتی کا تھا۔ اسّی رتی والے تنکہ کو "عدلی" کہتے تھے۔ 2۔ تنکہ سرخ۔ خالص سونے کا یہ 100 رتی کا بھی ہوتا تھا۔ 3۔ تنکہ سیاہ۔ چاندی اور تانبے کا 32 رتی کا ہوتا تھا۔

3 سیر: یہ وزن کا ایک پیمانہ تھا جو اس زمانے میں رائج تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں "دہلی کا رطل" لکھا ہے۔ رطل سے اس کی مراد من سے ہے وہ اس رطل کو مصر کے 25 رطل کے برابر لکھتا ہے۔ اس کو فرانسیسی مترجموں نے اس حساب سے من کا وزن 29 ¾ پونڈ لگایا ہے۔ اکبری سیر 52 تولہ 2 ماشہ 2 رتی کا ہوتا تھا۔ عالمگیری سیر 77 تولے کا تھا۔ محمد شاہ تغلق کے وقت کا من 14½ سیر کا تھا۔

4 قحط: ہندستان کی تاریخ کے قدیم ادوار میں بنگال کو چھوڑ کر پورا ہندستان قحط

سالی اور اس کے نتائج سے متاثر ہوتا رہا۔ ان قحطوں کے نتیجے میں کثرت سے اموات، بچوں کی خرید و فروخت، غلامی اور مردم خوری کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ بار بوسا جو ایک سولھویں صدی کا سیاح تھا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے: ''اگرچہ ملک میں ضروریات افراط کے ساتھ تھیں تاہم اگر بارش نہ ہو تو قحط کی بدولت سخت ہلاکت واقع ہوتی تھی اور بچے ایک ایک روپیہ سے کم دام پر بھی بکتے تھے۔ قحط سالی کے زمانے میں ملابار کے جہاز بھوکوں کے لیے خوراک لاتے تھے اور بدلے میں غلاموں کو بھر بھر کے لے جاتے تھے۔''

بدایونی، صاحب منتخب التواریخ سے لگ بھگ دس سال پہلے ایک سیاح جو کوریا سے ہندستان آیا تھا۔ اس نے بھی اسی عہد کے ہندستان کی ترجمانی کی ہے۔ اس نے اپنے سفرنامے میں اس تباہی کا نقشہ کھینچا ہے وہ بھی مردم خوری کا ذکر کرتا ہے۔

باز بہادر: یہ مانڈو کا بادشاہ تھا۔ مانڈو کی تاریخ دلاور خان کے عہد حکومت سے شروع ہوتی ہے۔ اس نے تیمور کے حملے کے بعد 804 ھ/1401 ء میں خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس کا تعلق غور سے آئے سرداروں سے تھا۔ اس نے دوبار کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ اس کے لڑکے الپ خان ہوشنگ نے مانڈو کو دارالخلافہ بنا کر ایک شاندار شہر بنا دیا اس کے بعد محمد غوری تخت نشین ہوا۔ پھر محمود خلجی اس کا جانشین بنا، اس کے بعد 1534ء میں ہمایوں نے قلعہ مانڈو کو فتح کر لیا، ہمایوں کی شیر شاہ سے شکست پر ملو خان ایک خلجی سردار نے قادر شاہ کے لقب سے 943 ھ/1554 ء میں حکومت کی اس کو شیر شاہ نے شکست دے کر اپنے ایک عزیز شجاع خان کو مالوہ اور مانڈو کی حکومت دے دی۔ 962 ھ/1536 ء تک وہ حکمراں رہا۔ باز بہادر اسی شجاع خان کا لڑکا تھا۔ اس کا اصلی نام بایزید تھا، اس نے اپنے بھائی دولت خان کو قتل کر کے سلطان باز بہادر اپنا خطاب رکھا اور 1555ء میں خود مختار حکومت قائم کر لی۔ یہ ایک ہمت ور اور شجاع بادشاہ تھا۔ پہلے پہل اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں آخر میں رانی

درگاوتی کے ہاتھوں اسے ایسی شکست ہوئی کہ اس نے جنگ سے توبہ کر لی۔ اس زمانے میں مالوہ موسیقی کا مرکز تھا۔ باز بہادر خود بھی اعلیٰ درجے کا موسیقار تھا۔ اس کی اور روپ متی کے عشق کی داستانیں بڑی مشہور رہی ہیں۔ 1556ء میں اکبر نے ادھم خان کو مالوہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ باز بہادر اس سے شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ روپ متی گرفتار ہو کر ادھم خان کے پاس لائی گئی۔ مگر اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ 1561ء میں جب محمد خان حاکم تھا، باز بہادر نے خاندیش کے میران مبارک خان کی مدد سے پیر محمد کو شکست دی۔ 1562ء میں عبداللہ خان نے حملہ کر کے باز بہادر کو گونڈوانہ کی پہاڑیوں میں بھگا دیا۔ اس نے میواڑ کے راجہ اودے سنگھ کے یہاں پناہ لی، وہاں سے گجرات چلا گیا، بعد میں اکبر نے اسے معاف کر کے دو ہزاری منصب پر بحال کر دیا۔

6 منتخب التواریخ کے ایک دوسرے نسخے میں یہ تاریخ 946ھ/1539ء درج ہے۔

7 قلعہ بھکر۔ ابن بطوطہ بھی اس جگہ گیا تھا وہ کہتا ہے "یہ شہر بہت خوبصورت تھا، یہاں دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے بیچ میں سے گزرتی ہے اس شاخ کے وسط میں ایک خانقاہ ہے۔ وہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔ اس خانقاہ کو کشلو خان بن محمد تغلق کے عہد میں تیار کرایا تھا۔

8 اس وقت جیسلمیر کا راجہ راول مون کرن تھا۔ 1543ء میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ راجہ نے کنوؤں میں ریت بھروا دی تھی تا کہ شاہی لشکر پریشان ہو۔ جب ہمایوں جیسلمیر کے تالاب کے نزدیک پہنچا تو راجپوتوں نے پانی لینے سے روکا۔ لشکر والوں نے حملہ کر کے انھیں بھگا دیا۔

9 قاسم کاہی: قاسم کاہی کا عرف کالے میاں تھا، ہمایوں کے عہد میں کابل سے ہندستان آئے تھے۔ تفسیر، کلام، تصوف، ہیئت، موسیقی اور شاعری میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں سادگی اور موسیقیت تھی۔ ہمایوں کی وفات پر ان کا ایک قطعہ بڑا مشہور ہوا تھا:

پی تاریخ اوکاہی رقم زد
ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

کاہی نے بوستان کے جواب میں ایک مثنوی "گل افشان" بھی لکھی تھی۔

10. یہ ہمایوں کا درباری امیر اور سخن سنج شاعر تھا۔ اس کے گھر پر شعر وسخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں، جہاں نامور شعرا جمع ہوا کرتے تھے۔

11. اکبر نامہ اور طبقات اکبری میں ہمایوں کے متعلق یوں لکھا ہے: ہمایوں علم دوست بادشاہ تھا چنانچہ اس نے دہلی کے شیر شاہی قلعے میں شیر منڈل کی سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل میں اپنا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اسے چونکہ نجوم میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اس لیے یہ اس کی رصد گاہ بھی تھی۔ اس شاہی کتب خانے کے مہتمم کا نام نظام المعروف بہ بازبہادر ملتا ہے۔ ہمایوں کا شوق کتب بینی اس درجے پر تھا کہ میدان جنگ میں بھی چھوٹا سا سفری کتب خانہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے کھمبایت کا محاصرہ کیا تھا تو اس کی اور کتابوں کے ساتھ تاریخ تیموریہ کا وہ نسخہ بھی تھا جس کو بہزاد نے مصور کیا تھا۔ ایک جنگلی قبیلے نے شاہی کیمپ پر چھاپہ مارا تو یہ نسخہ جاتا رہا لیکن جلدی ہی پھر یہ نسخہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ (اکبر نامہ۔ ص، 363) (طبقات اکبری، ص، 184 جلد دوم)

12. قلعہ دین پناہ: آج کل کا پرانا قلعہ ہے۔

13. شیخ نے دراصل یہ اشارہ اس بات کی طرف کیا تھا کہ ہمایوں نے شاہ طہماسپ صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد قبول کرنے سے صاف صاف انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کی مدد اور ان کی فوج لے کر بدخشان پر حملہ کیا تھا اس شبہ میں کہ وہ شیعہ ہو گیا ہے۔ شیخ موصوف نے یہ طنز کیا اور ہمایوں نے اپنے دادا "عمر شیخ" کے نام کا حوالہ دے کر شیعت سے برأت ظاہر کی۔

منتخب التواریخ

جلد دوم وسوم

مؤلف
ملاّ عبدالقادر بدایونی

مترجم
ڈاکٹر علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

منتخب التواریخ

جلد دوم وسوم

مؤلف

ملا عبدالقادر بدایونی

مترجم

ڈاکٹر علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2008
تعداد : 550
قیمت : -/555 روپے (سیٹ: -/890 روپے)
سلسلہ مطبوعات : 1297

Muntakhabut Tawareekh, Vol.II & III

ISBN : 81-7587-233-0
81-7587-234-9(set)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای-میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: گیتا آفسیٹ پرنٹرس، سی-90، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-1، نئی دہلی-110 020

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقہ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔

وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر علی جاوید
ڈائریکٹر

منتخب التواریخ

جلد دوم

فہرست

عرض مترجم
فن تاریخ کی اہمیت ۱
مصنف کے ماخذ 3

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ

تخت نشینی 4
بیرم خان کا قصیدہ 5
ابو المعالی کا فرار 6
سکندر سے مقابلہ 7
ہیمو بقال کا دہلی پر قبضہ 8
پانی پت میں فوجوں کی آمد 9
پانی پت کی دوسری لڑائی 10
مغل فوج کی کامیابی 11
سکندر افغان کی اطاعت 12
دہلی میں داخلہ 13

خان زمان اور شاہم بیگ کا معاملہ 14

شاہم بیگ کا انجام 16

پیر محمد خان کا عروج و زوال 18

شیخ گدائی کا اقتدار 20

میر عبداللطیف قزوینی 21

گوالیار کے قلعہ پر قبضہ 22

چنار کے قلعے پر قبضہ 23

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ 25

اکبر دہلی میں 26

بیرم خان کے خلاف سازشیں 27

بیرم خان کی مکہ کے لیے روانگی 28

بیرم خان کا تعاقب 29

بیرم خان کی شکست 30

بیرم خان کی فیاضی 31

منعم خان کی وزارت 32

بیرم خان کی اطاعت 33

بیرم خان کی شہادت 34

مالوہ کی فتح 35

اجمیر کی زیارت 36

باز بہادر کا انجام 37

سفیر ایران کی آمد 38

منعم خان کا فرار اور گرفتاری 39
گکھڑوں کی شکست 40
کابل کے ہنگامے 41
جوبک بیگم کا اقتدار 42
ابو المعالی کا کابل پر قبضہ 43
مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت 44
دہلی میں ہلچل 45
قاتلانہ حملہ 46
چنار کے قلعہ پر قبضہ 47
رانی درگاوتی 48
گجرات کا حاکم چنگیز خان 49
صدر الصدور کا عہدہ 50
کابل پر تیسرا حملہ 51
خواجہ حسن نقشبندی 52
آگرہ کے قلعہ کی تعمیر 53
ازبک سرداروں کی بغاوت 54
باغیوں پر اکبر کی فوجی کاروائی 55
جون پور میں چھاؤنی 56
رہتاس کا قلعہ 57
صلح میں کہاسنی 58
معز الملک کی فوجی کاروائی 59

معز الملک کی شکست 60

باغیوں کی اطاعت اور معافی 61

خان زمان کی وعدہ خلافی 62

اکبر کی واپسی آگرہ 63

مرزاؤں کی بغاوت 64

حسین خان کی مصاحبت 65

کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ 67

مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ 69

سیر و شکار 70

مہابھارت کی یادگار 71

باغیوں پر اکبر کا حملہ 73

بہادر خان کا قتل 75

چتوڑ کے قلعہ پر حملہ 78

قیامت خیز محاصرہ 79

اجمیر کا پیدل سفر 81

اکبر شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں 83

ایک دلگداز داستان عشق 84

کالنجر کے قلعہ پر قبضہ 86

شاہزادہ سلیم کی پیدائش 89

رافضیوں کو قتل کی سزا 90

سوالک پہاڑی کے بت خانے 91

حسین خان کی ناکام واپسی 92

شاہزادہ مراد کی ولادت 93

قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد 94

اسکندر خان اوزبک کی اطاعت اور وفات 95

شیخ سلیم چشتی کی وفات 96

بدایوں کی آتشزدگی 97

شاہزادہ دانیال کی ولادت 98

احمد آباد کی فتح 99

ابراہیم حسین مرزا سے مقابلہ 101

سورت کے قلعہ کی فتح 102

سورت کے قلعہ کی تعمیر کا سبب 104

باغیوں کے مشورے 105

گجرات سے واپسی 106

ابراہیم حسین مرزا کی بغاوت 107

خوفناک حملہ 108

حسین خان کا حملہ 109

امرائے سنبھل سے مشورے 110

مرزا کا لگاتار تعاقب 111

شیخ داؤد علی جھنی وال 112

مرزا ابراہیم کی گرفتاری 114

راجہ بیربر کی قدرومنزلت 116

نگرکوٹ پر حملہ 117

گجرات پر دوسرا حملہ 119

اونٹیوں پر بادشاہی حملہ 120

محمد حسین مرزا کی گرفتاری 122

اختیار الملک کا اکبر پر حملہ 123

گجرات کا نظم ونسق 124

اکبر کی اجمیر روانگی 125

جشن شاہانہ 126

بنگال پر فوج کشی 127

امیر الامرا لودھی کا قتل 128

دلچسپ دریائی سفر 129

الہ آباد میں قیام 130

شاہی بیڑہ چوسہ میں 131

حاجی پور کے قلعہ کی فتح 132

داؤد کا فرار اور پٹنہ کی فتح 133

بنگال سے واپسی 135

اکبر کی دہلی آمد 136

اجمیر کی زیارت کے لیے روانگی 137

دارالخلافہ کی جانب واپسی 138

خواجہ امینا خواجہ جہاں کی وفات 139

ایک دلچسپ لطیفہ 140

پیمائش اور کروڑیوں کا تقرر 141

داغ و محلّہ کا ضابطہ 142

داؤد کا تعاقب 144

پٹھانوں سے خونریز لڑائی 145

صلح کی بات چیت 147

داؤد اور خانخاناں کی ملاقات 148

شیخ ابوالفضل کا دربار میں داخل ہونا 149

بادشاہی عبادت خانہ 151

عبادت خانہ کی محفلیں 152

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری 153

شیخ عبدالنبی 154

شیخ عبدالنبی کا غرور و تکبر 155

منصب امامت پر تقرر 156

شادی کا مسئلہ 158

جزیہ اور اللہ اکبر 160

حکیم ابوالفتح گیلانی اور ملا محمد یزدی 161

چوتھے وید کا ترجمہ 162

مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد 163

مرزا سلیمان کا شاہانہ استقبال 165

فاتحہ خوانی کی بحث 166

منعم خانخاناں کی وفات 167

حسین خاں کا پہاڑی علاقہ پر حملہ	168
حسین خاں کا انتقال	170
حسین خاں کے اوصاف	171
تخت نشینی کا بائیسواں سال	175
جہاد کا شوق	176
چوگان بازی	177
کوکندہ پر فوجی حملہ	178
مہتر خاں کی ہوشیاری	179
رانا کیکا کا فرار ہونا	180
شاہی فوج کوکندہ میں	181
رام پرشاد ہاتھی	182
بارگاہ شاہی میں حاضری	183
بادشاہ کا ارادہ بنگال	185
اکبر کی اجمیر روانگی	186
شاہ طہماسپ کا انتقال	187
شاہ اسماعیل کا قتل	188
بادشاہ کی مالوہ روانگی	189
جلوس کا تئیسواں سال	190
راجا نارائن داس کی شکست	191
شریف آملی کی آمد	192
فتح پور واپسی	194

راجہ علی خاں سے مصالحت 195

حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی 196

منوہر پور کی تعمیر 197

پشاور کو روانگی 198

چوبیسواں سال جلوس 199

عبادت خانے میں علماء کے ہنگامے 200

اکبر کی بے دینی کا آغاز 201

بے دینی کے محرکات اور اسباب 202

وحدت ادیان کا تصور 203

عقیدۂ تناسخ کا اقرار 204

انسانِ کامل کا تصور 205

عقیدہ تثلیث کا اثبات 206

آفتاب پرستی کا آغاز 207

آتش کدے کا قیام 208

ابوالفضل کی ۔بے دینی 209

ابوالفضل کی گستاخی 210

دربار سے کنارہ کشی 211

آبی محل کی تعمیر 212

معصوم خاں کی آمد 213

خان جہان کا انتقال 214

اکبر کی خطبہ خوانی 215

بادشاہی عقائد پر عوام کی بے چینی 216

اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علما کا محضر 217

محضر نامے کا متن 218

بادشاہی کلمہ 220

غیرت مند حق گو امیر 221

علماء اور ائمہ کی بدحالی 222

جزیہ کی معافی 223

ملا محمد یزدی کا فتویٰ 224

صاحب زمان کی پیشین گوئی 225

وظائف و مدد معاش میں کمی 226

بنگال میں مظفر خاں کی سختی 227

قاقشالوں کی بغاوت 228

بنگال کی خود مختاری 229

راجہ ٹوڈرمل کی فوجی کارروائی 230

باغیوں کی حوصلہ شکنی 231

مالوہ کے حاکم کا قتل 232

مشائخین کی آزمائش 233

امامت و نبوت کا دعویٰ 234

شاہ منصور کی برطرفی 235

صلح کل کا تجربہ 236

نیابت خاں کی بغاوت 237

معصوم خاں کی بغاوت 238

اخلاص کے چار درجے 239

شاہ منصور کی سازش 240

مرزا عبدالحکیم کا فرار 241

اکبر کا کابل کے لیے عزم 242

مرزا عبدالحکیم کی شکست 243

اکبر کی واپسی 244

چند دن کی مستی 245

ترہت میں بغاوت 247

عیسائی سے مناظرہ 248

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال 249

دین الٰہی کا نفاذ 250

شیطان پورہ 251

گائے کے ذبیحہ پر ممانعت 252

داڑھی ترشوانے کا رواج 253

دین الٰہی کے اقرار نامے 254

غسل جنابت کی تحریم 255

سن الٰہی کا اجرا 256

عربی زبان کی مخالفت 257

چہل گانہ کی مجلس 258

جشن نوروز کی محفلیں 259

نقشِ قدم کا استقبال 260

مخدوم الملک کا انتقال 261

حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل 262

قاضی جلال ملتانی پر تہمت 263

اذان اور نماز کی موقوفی 264

میر فتح اللہ شیرازی کی حاضری 265

معراج نبوی ﷺ سے انکار 266

تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم 267

مہابھارت کا ترجمہ 269

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال 271

ٹانڈہ پر قبضہ 272

برہان الملک کی آمد 273

جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت 274

مہابلی اکبر کے درشن 275

گجرات کی بغاوت 276

مظفر شاہ کی بغاوت 277

شیر خاں فولادی کی واپسی 278

بڑودہ پر باغیوں کا قبضہ 279

مرزا خان کی کاروائی 280

مظفر شاہ کی شکست اور اس کا فرار ہونا 281

راجہ رام چند کی اطاعت 282

بادشاہ کی فتح پور واپسی 283
رامائن کے ترجمہ کا حکم 284
اکبر کی حکومت کا انتیسواں سال 285
شاہی امراء کا انتقال 287
اکبر کی حکومت کا تیسواں سال 288
دکن پر حملے کی تیاریاں 289
گجرات میں دوبارہ بغاوت 290
پیر روشن کی لوٹ مار 292
مرزا محمد حکیم کا انتقال 293
روشنیہ قبیلہ پر فوجی کارروائی 295
بیر بر کی ہلاکت 296
اکبر کے دور حکومت کا اکتیسواں سال 297
حاکم کشمیر سے صلح 298
شہزادہ سلیم کا عقد اور راجہ بھگوان داس کی خودکشی 299
روشنائی قبیلے کی فوجی کارروائی 300
محمد زماں میرزا کا کارنامہ 301
اکبر کی تخت نشینی کا بتیسواں سال 302
سلطان خسرو کی پیدائش 303
گجرات کے حالات کا اعادہ 304
دکن پر حملہ اور پسپائی 306
عربی علوم پر پابندی 308

مان سنگھ کا بیباکانہ جواب 309

حکومت کا چوبیسواں سال جلوس 310

رامائن کا ترجمہ 311

مکار قلندر کا فریب 312

رامائن کے ترجمے کا صلہ 313

شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات 314

حکیم ابو الفتح کا انتقال 315

ٹوڈرمل اور بھگوان داس کا انتقال 316

اکبر کی حکومت کا پینتیسواں سال 317

تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین 318

عرفی شیرازی کا انتقال 319

اکبر کی حکومت کا چھتیسواں سال 320

شاہی فرمان 321

اکبر کی علالت 322

شاہزادہ مراد کی فوج کشی 323

اکبر کی حکومت کا سینتیسواں سال 324

یادگار گل کی تخت نشینی 326

جامع رشیدی کے ترجمے کا حق 327

کشمیر کی سیر 328

لرزنے والا درخت 329

اکبر کی حکومت کا اڑتیسواں سال 330

امرائے گجرات کے تبادلے 331
شیخ مبارک کی وفات 332
اکبر کی حکومت کا انتالیسواں سال 333
لین دین کے قاعدے 334
تبدیلی مذہب کی آزادی 335
تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب 336
محمد قاسم خان میر بحر کا قتل 337
نل دمن داستان کی تصنیف 339
اکبر کی حکومت کا چالیسواں سال 341
ہندو مذہب میں جزائے اعمال کا تصور 342
اجمیر کی تولیت کی تجویز 343
بحر الاسمار کی تصنیف 344
حکیم عین الملک کا انتقال 345
صوفی احمد مطرب 346
ملک الشعرا فیضی کا انتقال 347
خاتمہ 348

عرض مترجم

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کا شاہکار منتخب التواریخ کا اردو ترجمہ مکمل ہوا۔ مترجم کو یہ بھی احساس ہے کہ ترجمہ ایک نہایت دشوار اور پیچیدہ کام ہے جس میں روح مطلب کا مفقود ہونا عام بات ہے۔ بہرحال یہ ترجمہ ہے نہ کہ اصل تالیف، مزید برآں یہ کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں ہے جو سہو، اشتباہات اور کمیوں سے مبرا ہو۔

مؤلف منتخب التواریخ کا نام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی ہے جو شاعر تھے اور قادری تخلص کرتے تھے نیز فن تاریخ گوئی میں بھی ان کا منفرد مقام ہے۔ خاص طور سے یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی عہد وسطیٰ کے معروف مورخ ابوالفضل کے معاصر ہیں۔ جن میں ایک کو دربار اکبری میں نہایت معتبر رتبہ ملا ہوا تھا اور دوسرا اپنی تمام کوششوں کے باوجود اس درجۂ اعتبار اور قربت کو حاصل نہ کر سکا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی ولادت 947 ہجری/ 1540-41 عیسوی میں ہوئی جس کے لیے شاید منتخب التواریخ میں یوں آیا ہے:

”مجھے خدا نے 60 سال کی عمر میں لڑکا عطا کیا جس کا نام محی الدین رکھا، جس کی ولادت پیاور میں ہوئی۔“

اسی طرح دوسری جگہ جلد اول میں عبدالقادر بدایونی رقم طراز ہیں:

’’اس منتخب کا جامع 961 ہجری/ 1553-54 عیسوی میں 12 سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ تحصیل علم کے لیے سنبھل گیا تھا۔‘‘ حالانکہ ان کی ولادت اور 12 سال کی عمر کے اعتبار سے سنین میں اختلاف موجود ہے۔

قرآن کی تعلیم سے متعلق یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ انھوں نے میر سید محمد مکی سے قرآن پڑھا تھا جو سات قرأتوں کے قاری تھے۔ عربی کی تعلیم اپنے نانا مخدوم اشرف سے حاصل کی۔ بقول ملا عبدالقادر ’’961 ہجری قمری میں 12 سال کی عمر میں میاں حاتم سنبھلی سے ’’قصیدۂ بردہ شریف‘ ‘اور فقہ کی کتاب ’’کنز‘‘ کے بھی چند اسباق پڑھے تھے۔‘‘ عبدالقادر بدایونی نے بہت سے علوم کے لیے ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری سے رجوع کیا اور باقاعدہ ان علوم کو اپنے استاد مبارک ناگوری سے حاصل کیا۔ میر غیاث الدین جو نقیب خاں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں وہ ملا عبدالقادر بدایونی کے ہم سبق رہے تھے۔ اُن کی شادی 975 ہجری میں بدایوں میں ہوئی تھی۔ جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک کی سفارش پر ملا عبدالقادر بدایونی کو 981 ہجری میں بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں جگہ ملی اور بقول اکبر: ’’یہ بدایونی عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا۔‘‘ کے مصداق دربار میں مامور ہوئے۔

قاضی علی کی سعی پیہم سے ملا عبدالقادر کو ہزار بیگھہ آراضی کی مدد معاش بھی دربار اکبری سے عطا ہوئی۔ دربار میں ملا عبدالقادر بدایونی کے ذمے ترجمہ، تصنیف اور تالیف کے علاوہ کتابوں کا انتخاب بھی تفویض ہوا۔ انھیں دربار سے ’’اتھربن وید‘‘ کے ترجمے کا کام ملا تھا مگر وہ اس کام میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ کام بعد میں ابوالفیض فیضی کے سپرد کیا گیا۔ بدایونی کی دوسری کتاب ’’الاحادیث‘‘ ہے جس میں تیر اندازی اور جہاد کے سلسلے کی 60 حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ ایک کتاب ’’تاریخ الفی‘‘ کے لیے ایک ٹیم کا قیام کیا گیا جو سات افراد پر مشتمل تھی جس کے ایک رکن ملا عبدالقادر بدایونی بھی تھے۔ نقیب خاں اور بدایونی نے باہمی اشتراک سے ’’مہابھارت‘‘ کا ترجمہ ’’رزم نامہ‘‘ کے نام سے انجام دیا اور

’’رامائن‘‘ کو عبدالقادر نے 8 سال کی مدت میں انفرادی طور پر ترجمہ کیا تھا۔ ’’جامع رشیدی‘‘ کو ابوالفضل کے حکم اور مشورے سے ترجمہ کیا ’بحرالاسمار‘‘ جو کشمیر کی تاریخ ہے اور اس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کرایا تھا وہ بھی مکمل نہ ہوسکی تھی اس کی تکمیل بھی ملا عبدالقادر بدایونی نے کی۔ ’’نجات الرشید‘‘ کو بدایونی نے ذاتی طور سے اور ’’انتخاب تاریخ کشمیر‘‘ بھی بادشاہی حکم کے مطابق مکمل کیا۔ ’’منتخب التواریخ‘‘ ملا عبدالقادر بدایونی کی ضخیم اور 3 جلدوں پر مشتمل تاریخ ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کو علوم معقول و منقول دونوں میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی و فارسی ان کی گھٹی میں تھی اور وہ فارسی کے صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ملا کو نجوم، ریاضی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں سے بھی شغف تھا۔ تاریخ گوئی میں ان کا سکہ چلتا تھا اور انھیں عہد اکبری کے نابغۂ روزگار میں شمار کرنا حق شناسی کہی جائے گی۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جلال الدین محمد اکبر کے 60 سالہ واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ مزید اس کی سب سے عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی حیات تک اس تالیف کا راز افشا نہیں کیا۔ غالباً قوی امکان ہے کہ اس میں جگہ جگہ پر جو حقیقت بیانی کا عنصر ہے وہ ملا عبدالقادر کے نزدیک مصلحت اندیشی اور دوربینی کے نظریے سے پوشیدہ رکھنا ہی زیادہ مناسب رہا ہوگا۔ مگر جب عہد جہانگیری میں اس تاریخ کا شہرہ ہوا تو جہانگیر نے ملا عبدالقادر بدایونی کے بچوں کو بلا کر عتاب کیا اور باز پرس کی تو انھوں نے کہا کہ ہم تو چھوٹے اور ناسمجھ تھے۔ ہمیں اس کا کیا علم ہوسکتا ہے۔ مزید اُن بچوں نے ایک مچلکہ لکھ کر جہانگیر کو دیا تھا کہ اگر یہ ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے مستحق ہوں گے۔ منتخب التواریخ کا ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ ہے اور آخر کے دو سالوں کے حالات کو ملا عبدالقادر بدایونی نے خود جمع کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کو میر سید مہدی جونپوری کے داماد شیخ ابوالفتح گجراتی سے یک گونہ محبت و عقیدت کے باعث کچھ حضرات ملا عبدالقادر بدایونی پر مہدوی ہونے کا بھی الزام عائد کرتے ہیں۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ عہد اکبری کے واقعات اور معاملات کو صحیح زاویۂ نگاہ سے

سمجھنے اور کوئی رائے قائم کرنے کے لیے جہاں اکبر نامہ از حد ضروری ہے وہیں منتخب التواریخ کے اندراجات کو بھی ''دیوانے کی بڑ'' کہہ کر خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مترجم کوئی مورخ نہیں ہے جو منتخب التواریخ کی تاریخی اہمیت اور خصوصیات پر رائے زنی کرے، البتہ فارسی زبان و ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاں تک اکبرنامے کا تعلق ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ ابوالفضل کی تاریخ کو سرکاری اور درباری تاریخ کا درجہ ملا ہوا تھا۔ اس لیے اکبر بذات خود ابوالفضل کے اندراجات کو پڑھوا کر سنتا تھا اور حسب مرضی اس میں رد و بدل بھی کیا جاتا تھا اس لیے کسی حد تک اکبرنامہ کو ہم ایک ایسی تاریخ کہہ سکتے ہیں جس میں بادشاہ وقت کی رائے اور مرضی و مزاج کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ غیر سرکاری اور شخصی و ذاتی نوعیت کی تاریخ ہے جس میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کو دخل نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں اگر بدایونی کو کسی بات سے اختلاف ہے تو شدید تنقید دیکھنے کو ملتی ہے جب کہ ابوالفضل کی تاریخ میں اس نوعیت کے اندراجات نہیں ہیں اور جو شاید ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اسی لیے ہمیں عہد اکبری کے معاملات کو معروضی طریقے سے درک و استفہام کے لیے جہاں اکبرنامہ کی ضرورت ہے وہیں منتخب التواریخ بھی اہم اور نہایت لازمی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ باتیں جنھیں ملا عبدالقادر بدیونی برملا نہیں کہہ سکتے تھے اسے انھوں نے خاتمہ میں نہایت اچھے پیرائے میں یوں بیان کر دیا ہے جو منتخب التواریخ کی سبب تالیف بھی کہی جاسکتی ہے۔ مُلّا رقم طراز ہیں:

''میرے اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرے کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہتے اور اسے پڑھ کر کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ بہرحال مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی

طرفداری میں ہے۔

ارباب تصنیف و تالیف کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتا کر کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف و تالیف کو منسوب کر کے اغراض و منافع کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی بھی طمع اور توقع کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانے کے حالات و حقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے اس کی گذشتہ ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ املاء و انشا کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنیاد پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات و حسنات جتلانے میں بھی اسے ذرہ برابر خوف نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے میں جو کہ اس گورکھ دھندے میں پھنسا رہا ہوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں، ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، مزید اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے۔"

ظاہر ہے یہ سب بیانات ملا عبدالقادر بدایونی کی مصلحت کوشی، دور بینی اور دور اندیشی کی طرف واضح اور مثبت اشارے ہیں اور یہی منتخب التواریخ کی سب سے اہم اور جداگانہ اہمیت بھی ہے۔

اس ترجمے میں مترجم نے یہ خیال رکھا ہے کہ ہر باب کے اختتام پر ہی حواشی ثبت کر دیے جائیں جس سے قارئین کو کتاب کے آخر میں رجوع کرنے کی زحمت سے بچایا جا سکے۔

مترجم اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی سے بخوبی آشنا ہے۔ اس ترجمے میں کئی جگہ اشتباہات اور کمیاں ضرور راہ پا گئی ہوں گی۔ مزید برآں مترجم کی خواہش تھی کہ اس ترجمے کے ساتھ ساتھ اس ترجمے کے آخر میں اشاریہ کتب، اشخاص اور اماکن بھی درج ہو جاتا مگر چونکہ ترجمہ پہلے ہی خاصا وقت لے چکا ہے اس لیے عملی طور پر اس کی گنجائش نہیں۔ مگر اس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ ممکن ہے دوسری اشاعت میں اس کام کو انجام دیا جا سکے۔ مزید اس کمی کو تفصیلی فہرست فراہم کر کے پُر کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ بہرحال جو بھی ہو سکا وہ پیش خدمت ہے۔ مترجم کی دلی خواہش ہے کہ صاحب علم و نظر اس ترجمے میں واقع کمیوں اور اشتباہات سے مترجم کو آگاہ فرمائیں گے تاکہ بعد میں اگر ممکن ہو تو اس کی اصلاح کی جا سکے۔

آخر میں مترجم پر لازم ہے کہ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ارباب حل و عقد کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرے۔ سب سے پہلے ادارہ ہذا کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر علی جاوید صاحب میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی ڈائریکٹرشپ میں فارسی کی ایک اہم تاریخی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ نیز محترمہ مسرت جہاں صاحب ریسرچ اسسٹنٹ کا شکریہ ادا کرنا بھی اس لئے لازمی ہے کہ ان کی انتھک کوششوں سے یہ کتاب منظر عام پر آ رہی ہے۔

8/ستمبر 2007ء

علیم اشرف خاں
ریڈر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی
دہلی 110007

سبب تصنیف منتخب التواریخ

فن تاریخ کی اہمیت

حمد و نعت کے بعد اس بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ایک با وقعت علم اور لطیف فن کا نام ہے جو صاحبان علم و خبر کے لیے سرمایۂ عبرت اور وارثان خرد و ہوش کے لیے ایک دوررس تجربے کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ ارباب قلم نے ابتدائے آفرینش سے زمانہ حال تک اس فن کے لیے زحمتیں برداشت کیں اور معتبر تصانیف اور مبسوط کتابیں وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ یہ علمی ذخیرہ فن تاریخ کی اہمیت اور فضیلت پر معقول دلائل فراہم کرتا ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے سلسلے میں ہم ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتے جو عقیدے کے کمزور اور شکوک و اوہام کے شکار ہیں اور جن کے متعلق یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ تاریخ کے مطالعے سے کتاب و سنت کی سیدھی راہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً بے دینی کی طرف میلان رکھتے ہیں، تاریخ ہی کیا خود کلام الٰہی کا مطالعہ بھی ان کو ابدی شقاوت میں مبتلا کر دیتا ہے حالانکہ کلام پاک شفا اور رحمت ہے۔

"واذ لم یهتدوا فیقولون هذا افک قدیم"

ہمارا خطاب تو ان لوگوں سے ہے جو سلامتی طبع، جودت ذہن اور شیوۂ انصاف سے مالا مال ہیں، جو لوگ منکر شرع ہیں، ہماری نگاہ میں وہ نہ تو قابل اعتبار ہیں نہ اہل بصیرت۔

امام بخاری اور قاضی بیضاوی سے لے کر اب تک کے اکثر علمائے حدیث وتفسیر اس علم کی تحریر وتدوین میں برابر دلچسپی رکھتے آئے ہیں اور انکے قول وعمل کو مشرق سے مغرب تک امت کے تمام گروہوں میں مستند تسلیم کیا گیا ہے، البتہ ایک مختصر سا گروہ ان بدعت پسند اشخاص کا ضرور رہا ہے جس نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے حقائق و واقعات میں تحریف و تخلیط سے کام لیا اور واقعات کی صحیح توجیہ اور تاویل کے بجائے ان کی نظر ہمیشہ صحابہ کرام کی معاصرانہ چشمک زنی پر رہی اور وہ صحابہ کے اس اختلاف کو بھی اپنے اختلافات پر محمول کرکے سادہ لوح اشخاص کے بہکانے اور اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگے رہے، یہ مشہور ہے:

اگر کوا کسی قوم کی رہبری کرنے لگے تو اس قوم کا ہلاک ہوجانا یقینی ہے” وہ لوگ جن کو اللہ تعالی نے نور یقین سے سرفراز کیا ہے اور توفیق الٰہی ان کے ہمراہ رہتی ہے، اس عالم کون وفساد میں رونما ہونے والے ہر سانحے اور حادثے کو صانع قدرت کی حکمت و قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم نظر تحقیق سے کام لیں تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ یہ دنیا بذات خود ایک قدیم صحیفہ ہے جس کا آغاز وانجام ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا ہر ورق افراد انسانی پر گزرنے والے احوال وحوادثات کا مرقع اور ان لوگوں کے کارناموں کا مجموعہ ہے جن کے ہاتھوں میں مخلوق خدا کی باگ ڈور رہی ہے۔

منتخب التواریخ کس طرح لکھی گئی؟

علم تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر راقم سطور، داعی اسلام عبد القادر بن ملوک شاہ بدایونی نے کشمیر کی تاریخ کے انتخاب سے فارغ ہونے کے بعد شاہان دہلی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ واضح رہے کہ کشمیر کی تاریخ کو اکبر بادشاہ کے حکم پر ہندوستان کے ایک فاضل شخص نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا مجھے ایک زمانے سے خیال تھا اور میں چاہتا تھا کہ ابتدائے اسلام سے اس زمانے تک کے حالات اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں آجائیں تاکہ ایک ایسا تاریخی مجموعہ بن جائے جس میں ہر بادشاہ کا اجمالاً تذکرہ ہو جو صاحبان علم کے لیے ایک ”اشاریہ“ کا کام دے سکے۔ میری آرزو تو بس

یہی ہے کہ اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے عبرت حاصل کریں اور ان کی نگاہیں اس سرائے فانی کے آئینے میں عالم ملکوت کی جھلک کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔

لیکن بدقسمتی سے میں اپنی مالی الجھنوں اور احباب و اقارب سے جدائی کے باعث ایسا پریشان رہا کہ یہ کام برابر ٹلتا ہی رہا یہاں تک کہ ایک مخیر دولت مند نے جس کو میرے ساتھ تعلق خاص تھا اور مجھے بھی اس سے وابستگی تھی، تاریخ نظامی کی تصنیف میں جو ایک ضخیم کتاب ہے دلچسپی لی۔ افسوس کہ اس مخلص دوست کا جلدی ہی انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں مجھے کچھ سکون و یکسوئی حاصل ہوئی اور مذکورہ ارادہ از سر نو تازہ ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس اہم کام کو شروع کر دیا۔

مصنف کے ماخذ

پیش نظر تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لیے میں نے شاہان ہند کے کچھ حالات تو تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی سے لیے ہیں اور کچھ اپنی معلومات کی بنا پر اضافے کیے ہیں۔ ان حالات کو لکھتے ہوئے میں (مؤلف منتخب التواریخ) نے نہایت اختصار سے کام لیا اور عبارتی تکلفات اور استعارہ بازی میں اپنے قلم کو الجھنے نہیں دیا۔ اس مجموعے کا نام منتخب التواریخ رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تالیف جو صرف شاہان اسلام کے بقائے نام اور دنیا میں اپنی ایک یادگار چھوڑ جانے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے، مؤلف کی مغفرت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

میری تمام تحریر تو راست بیانی پر مرکوز ہے پھر بھی اگر مجھ سے کوئی سہو رہ گیا ہو تو میں اللہ تعالیٰ سے معافی کا امیدوار ہوں:

بہ جد گفتن زبان من مگر دان
زبان من زیان من مگر دان

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ

تخت نشینی

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بیرم خان خانخاناں کے مشورے اور تائید سے ماہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ[1] 963ھ/1555ء میں باغ کلانور میں تخت نشین ہوا اور سرحد کے امراء کو اس نے تسلی آمیز فرامین بھیجے۔ دہلی میں بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اکبر کی تاریخ جلوس "از ہمہ شہزادہا اشرف" سے نکلتی ہے ایک اور تاریخ ہے

جلال الدین محمد اکبر آن شہزادۂ دوران   بتاریخ پدری گفت شاہنشاہ دورانم

"کام بخش" بھی اس کے جلوس کا مادۂ تاریخ ہے۔

تخت نشینی سے پہلے ہی بیرم خان نے پیر محمد خاں شروانی کو جو ایک لشکر لے کر سکندر کا تعاقب کرتا ہوا سوالک کی پہاڑی میں موضع دھمیری تک پہنچ گیا تھا، کسی نہ کسی طرح بہانے بنا کر واپس بلا لیا۔ غرض یہ تھی کہ ہمایوں کے مرنے کی خبر مشہور نہ ہونے پائے۔

ابوالمعالی کی سرکشی

تخت نشینی کے موقعے پر امرائے دربار نے ابوالمعالی کو بھی شرکت کے لیے بلایا، اس نے کہلوا دیا کہ مجھے اس وقت کچھ پریشانی ہے اس لیے میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ دوبارہ کہلوایا گیا

کہ ایک خاص مشورہ درپیش ہے اور اس میں تمہاری رائے نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے عذر معذرت کی اور کچھ ایسے مطالبات کیے جن کا پورا کرنا محال تھا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر بیرم خان نے اس کے تمام مطالبے قبول کر لیے، لیکن جب وہ دربار میں آیا تو بیرم خان کے اشارے سے تولک خان قورچی نے جو ایک طاقتور پہلوان تھا اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتا لیکن اکبر نے یہ کہہ کر کہ "پہلے ہی دن کسی بے گناہ کا خون مناسب نہیں"۔ اس کی جان بچائی البتہ اسے قید کر کے لاہور بھیج دیا۔

بیرم خان کا قصیدہ

ابوالمعالی کاشغر کا رہنے والا اور سید زادہ تھا۔ نہایت بہادر اور خوب صورت شخص تھا۔ اس سے ہمایوں کو بڑی محبت تھی چنانچہ اسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا۔ بیرم خان نے صنعت توشیح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ عظیم اور قدیم تھا۔ اس قصیدے میں چونتیس شعر تھے۔ خوبی یہ تھی کہ ہر شعر کے اول مصرعے کا ایک ایک حرف لیا جائے تو اس سے 'حضرت محمد ہمایوں بادشاہ' بن جاتا تھا اور اگر ہر شعر کے دوسرے مصرعے کا ایک ایک حرف لیں تو "شاہزادۂ جلال الدین محمد اکبر" نکلتا تھا۔ ہر شعر کے اول مصرعے کا آخری حرف جمع کر لیں تو "میرزا شاہ ابوالمعالی" کا نام بن جاتا ہے۔ اگر اس کے قافیہ کے سارے "میم" جمع کر لیے جائیں تو 961ھ/ 1553ء یعنی قصیدے کو نظم کرنے کی تاریخ نکل آتی ہے۔

ابوالمعالی کی جان بخشی

ابوالمعالی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جس زمانے میں ہمایوں دوسری مرتبہ قندھار آیا ہوا تھا، ابوالمعالی نے نشے کی حالت میں ایک خطیب کو قتل کر دیا۔ مقتول کے وارثوں نے بادشاہ کے پاس دعویٰ کیا۔ ہمایوں نے ابوالمعالی کو طلب کیا۔ ابوالمعالی نے سیاہ مخمل کی پوشاک زیب تن کر رکھی تھی جس کا استر سرخ تھا اور وہ تلوار جس سے اس نے قتل کیا تھا دامن میں چھپا رکھی تھی، مستی میں جھومتا ہوا دربار میں حاضر ہوا اور اس جرم سے صاف انکار کر دیا۔

بیرم خان نے اسی وقت یہ شعر پڑھا:

نشان شب روان دارد سر زلف پریشانش
دلیل روشن ایک چراغ زیر دامانش

ہمایوں کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ جرم چونکہ بخوبی ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ابو المعالی کی جان بچ گئی اور بیچارے مقتول کا خون رائیگاں گیا۔

ابوالمعالی کا فرار

ابو المعالی لاہور کے قید خانے سے بھاگ کر کمال خان گھکر کے پاس چلا گیا۔ وہ علاقہ اس زمانے میں کمال خان کے چچا آدم گھکر کے قبضے میں تھا۔ اس نے ابو المعالی کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک بڑی فوج تیار کر کے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

ابو المعالی یہ فوج لے کر گیا۔ 965ھ/ 1557ء میں کشمیر کے حاکم غازی خان چک سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں ابو المعالی بھیس بدل کر دیپالپور چلا گیا اور وہاں بہادر خان کے ایک افسر تولک نامی کے پاس پناہ لی۔ تولک نے اسے اپنے گھر میں چھپایا اور دونوں مل کر بغاوت کی سازش کر رہے تھے۔ بہادر خان اسی وقت سوار ہو کر آیا، تولک کو قتل کر دیا اور ابوالمعالی کو گرفتار کر کے بیرم خان کے پاس بھیج دیا۔ بیرم خان نے ابوالمعالی کو ولی بیگ ترکمان کی تحویل میں بھکر روانہ کر دیا۔ ولی بیگ راستے میں اس کو ایذا دیتا رہا اور وہاں سے گجرات روانہ کر دیا وہ علی قلی خان کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔ بیرم خان نے علی قلی خاں کو فرمان بھیجا کہ ابوالمعالی آگرہ پہنچ گیا تو خود بیرم خاں کے بعض قضیے پیدا ہو گئے اور اکبر اس سے بدگمان ہو گیا۔ بیرم خان نے بادشاہ کی بدگمانی رفع کرنے کے لیے ابوالمعالی کو چند روز بیانہ کے قلعے میں قید کر دیا اور جب خود حج کے ارادے سے روانہ ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مگر کچھ دن بعد ہی ابوالمعالی اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر کے پاس لوٹ آیا لیکن غرور و تکبر کی وجہ سے اس نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ بات اکبر کو بڑی ناگوار گزری اور اس نے ابوالمعالی کو دوبارہ قید کر دیا۔

سکندر سے مقابلہ

تخت نشینی کے بعد جب حکومت کا نظام بخوبی ترتیب پا گیا تو اکبر نے سکندر کے مقابلے پر پہاڑوں پر ایک فوج روانہ کی۔ سکندر اس فوج سے تین ماہ تک برابر لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر مغلوب ہو گیا۔ انہی دنوں نگرکوٹ سے راجہ رام چندر، بادشاہ کی ملازمت میں حاضر ہوا۔

اکبر نے برسات کا موسم گزارنے کے بعد جالندھر کی طرف کوچ کیا اور وہاں پانچ ماہ تک مقیم رہا۔ جس وقت دہلی کے حاکم تردی بیگ خان کو ہمایوں کی وفات اور اکبر کے جلوس کی خبر ملی تو اس نے کامران کے بیٹے میرزا ابوالقاسم کو شاہی اسباب و لوازمات اور بہترین ہاتھی دے کر خواجہ سلطان علی وزیر خان اور اشرف خان میر منشی کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں روانہ کر دیا تھا۔

اسی سال مرزا سلیمان نے ابراہیم مرزا کے ساتھ کابل کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ قلعہ کابل میں منعم خان محصور ہو گیا۔ اس نے اس حملے کی اطلاع کے لیے اکبر کے پاس متعدد عرضیاں بھیجیں۔ اکبر نے محمد قلی خان برلاس، اتکہ خان اور خضر خان ہزارہ کو بادشاہ بیگم اور دوسری بیگمات کو لانے کے لیے کابل روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے نہ تھے کہ مرزا سلیمان نے قاضی نظام بدخشی کو جو ایک بڑے عالم تھے اور بعد میں انھیں قاضی کا خطاب ملا تھا اپنا سفیر بنا کر منعم خان کے پاس بھیجا اور صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ منعم خان صرف ایک بار خطبے میں اس کا نام پڑھے۔ منعم خان نے مصلحتاً اس شرط کو قبول کر لیا اور مرزا سلیمان بھی اتنی بات پر خوش ہو کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

پٹھانوں سے مقابلہ

جلوس کے پہلے ہی سال علی قلی خان کو خان زمان کا خطاب عطا ہوا اور اس نے سنبھل پر فوج کشی کر کے عدلی کے ایک امیر شادی خان پٹھان سے مقابلہ کیا۔ دونوں کے درمیان رہب ندی کے کنارے سخت لڑائی ہوئی جس میں خان زمان کو شکست ہوئی۔ وہ از سر نو جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ دہلی اٹاوہ اور آگرے سے اس کے نام خطوط آئے کہ

عدلی کی طرف سے ہیمو بقال ایک بڑی فوج لے کر یلغار کر رہا ہے اور اکثر علاقے فتح کر کے وہ دہلی کے قریب پہنچ چکا ہے۔

ہیمو کے حملے کی خبر سنتے ہی آگرہ سے سکندر خان ازبک، اٹاوہ سے قیا خان گنگ، کالپی سے عبداللہ خان ازبک، بیانہ سے حیدر محمد خان اور بقیہ تمام امیر بھی اپنے اپنے علاقوں سے کوچ کر کے دہلی میں تردی بیگ خان کے پاس جمع ہو گئے۔ خان زمان کو جمن کے دوسرے کنارے پر ہی ٹھہر جانا پڑا، اور وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔

ہیمو بقال کا دہلی پر قبضہ

ہیمو سے مغل لشکر کا یہ مقابلہ تغلق آباد کے قریب ہوا۔ مغلوں کی کمان عبداللہ خان ازبک اور لعل خان بدخشی کے ہاتھ تھی۔ انھوں نے تیزی کے ساتھ ہیمو کی فوج پر حملہ کیا اسے پسپا کر کے ہوڈل اور پلول کے قصبوں تک اس کا تعاقب کیا اور کافی مال غنیمت اس سے چھین لیا۔

اس موقع پر ہیمو بہت سے ساتھیوں سمیت اپنے لشکر سے کٹ گیا تھا، اس نازک وقت میں اسے دور کی سوجھی اس نے مغلوں کو ستانے کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ اس کی مدد کے لیے الور سے حاجی خان بڑی فوج لے کر آ پہنچا ہے اور اسی وقت اچانک تردی بیگ خان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تردی بیگ خان کے پاس تھوڑی سی جمعیت تھی اس لیے ایک ہی حملہ میں ہیمو نے تردی بیگ خان کو شکست دے کر بھگا دیا۔ لیکن اس ڈر سے ان کا تعاقب نہیں کیا کہ کہیں مغل دھوکہ دے کر دوبارہ پلٹ نہ پڑیں۔ مغلوں کے وہ امیر جو ہیمو کے میمنہ کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے جب شام کے وقت لوٹ کر آئے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ ان کے چھوڑے ہوئے مورچوں پر ہیمو کی فوج قبضہ کیے ہوئے نظر آ رہی ہے تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ دہلی سے نکل کر بھاگ گئے۔ خان زمان بھی میرٹھ کے راستے کوچ کر کے ان لوگوں سے سرہند میں آ کر مل گیا۔

جب اکبر کو دہلی کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس نے سکندر کے مقابلے کے لیے خضر خان خواجہ کو مقرر کیا۔ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم اسی خضر خان کے نکاح میں تھی اور خود

ہیمو کی سرکوبی کے لیے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ جس وقت اس نے سرہند میں قیام کیا تو ہیمو سے شکست کھا کر آنے والے امیر شاہی لشکر سے آ کر مل گئے۔

تردی بیگ کا قتل

خانخاناں بیرم خان کو تردی بیگ خان سے سابقہ رنجش تھی اور وہ اسے دکھاوے کے لیے ''طوقان'' (بڑا بھائی) کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اسے موقع ملا تو اس نے اکبر کو یہ یاد دلایا کہ اس شکست کا ذمہ دار تردی بیگ ہے۔ تصدیق کے لیے خان زمان اور دوسرے امیروں سے شہادت بھی دلوادی اور بادشاہ کو مجبور کر کے اس کے قتل کی اجازت لے لی، پھر سیر کے بہانے تردی بیگ خان کے کیمپ میں جا کر اس کو اپنے خیمے میں بلا لایا۔ جب مغرب کا وقت ہوا تو طہارت کا بہانہ کر کے وہاں سے نکل گیا اور اپنے آدمیوں کو جنھیں اس نے اس غرض سے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا، اشارہ کر دیا ان لوگوں نے خیمے میں داخل ہو کر تردی بیگ کو قتل کر دیا۔ قتل کے دوسرے دن خانخاناں دربار میں حاضر نہ ہوا۔ اس نے اسی الزام میں تردی بیگ کے داماد خنجر بیگ اور خواجہ سلطان علی میر منشی کو بھی گرفتار کر لیا تھا لیکن یہ لوگ کچھ دن بعد رہا ہو گئے تھے۔

پانی پت میں فوجوں کی آمد

اس عرصہ میں ہیمو نے دہلی میں بڑی قوت پیدا کر لی اور اپنا خطاب راجہ بکرما جیت رکھ کر خود مختار حکمراں بن بیٹھا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ جب اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی تو ایک ہزار پانچ سو جنگی ہاتھی کافی مال و دولت اور کثیر لشکر لے کر پانی پت پہنچ گیا۔ اس کا توپ خانہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں آ چکا تھا۔ ادھر اکبر کے بھی چند امیر خان زمان، اسکندر خان وغیرہ بھی لشکر سے آگے نکل کر پانی پت پہنچ چکے تھے انھوں نے پہل کر کے ہیمو کے ہراول پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد اس کا توپ خانہ چھین لیا۔

ہیمو نے اپنے لشکر کے پٹھانوں کو جن کا سردار شادی خان میواتی تھا مناصب اور جاگیروں میں اضافے کا لالچ دے کر اور ان کو کافی روپیہ اور انعام و اکرام دے کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، لیکن یہ پٹھان ہیمو کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکے تھے اور دل سے اس کی شکست اور بربادی کے خواہاں تھے۔ بہر حال ہیمو اپنی کثیر فوج کو لے کر ہوائی نامی ایک ہاتھی پر سوار ہوا اور راتوں رات کوچ کرتے ہوئے پانی پت پیچھے چھوڑ کر موضع کمر سندہ میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

دس محرم 964ھ/ 1556ء جمعہ کے دن صبح خان زمان اور سکندر خان ہراول کے امیروں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اکبر بھی شاہی لشکر کے ساتھ معرکہ گاہ سے تین کوس کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا اور وہاں سے لشکر کے امراء کو مدد کر رہا تھا۔ ہیمو کے ساتھ جو امیر تھے وہ سب کے سب اس سے برہم اور بد دل ہو چکے تھے۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے ہیمو صرف ہاتھیوں کی لڑائی پر بھروسہ کیے ہوا تھا، چنانچہ اس نے پہلے حملے ہی میں ہاتھیوں کا ایک بڑا غول لے کر اکبری فوج پر حملہ کر دیا یہ حملہ بڑا سخت اور ہولناک تھا شاہی لشکر میں افراتفری سی پھیل گئی، لیکن جلد ہی اکبر کے امیروں نے اپنی اپنی صفوں کو سنبھال کر منظم طریقے سے تیروں کی بوچھار کر دی اور ہیمو کے ہاتھی بوکھلا گئے۔ اس حملے میں جب ہیمو فوری طور پر کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے اپنا رخ بدل دیا اور ہاتھیوں کو دوسرے حملے پر جہاں خان زمان کمانڈر تھا، پہنچا دیا۔ خان زمان نے بھی اس کی ہاتھی سوار فوج کو تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ اس موقعے پر ہیمو باؤلے کتے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا کبھی کچھ منتر پڑھنے لگتا اور کبھی مارو مارو کا غل مچانے لگ جاتا تھا۔ اسی دوران ایک تیر ایسا آ کر لگا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی فوج بدحواس ہو کر منتشر ہو گئی۔ شادی خان میواتی بھی اس معرکہ میں مارا گیا۔

مغل فوج کی کامیابی

ہیمو کی فوج کے پسپا ہوتے ہی شاہ قلی خان محرم یلغار کرتا ہوا ہیمو کے ہاتھی پر حملہ آور ہوا۔ فیل بان نے کہا مجھے مار کر کیا کرو گے، تمہارا دشمن ہیمو اسی ہاتھی پر عماری میں پڑا ہوا ہے۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں ہیمو کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس پیش کیا گیا۔ شیخ گدائی کنبوہ اور دوسرے امرا نے عرض کیا "چونکہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے اس لیے آپ بھی اس پر اپنی تلوار آزمائیں" اکبر نے ان کو جواب دیا "یہ مردہ پڑا ہوا ہے اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو میں تلوار آزماتا"۔ آخر خانخاناں نے سب سے پہلے ہیمو پر تلوار چلائی۔ اس کے بعد شیخ گدائی نے پھر دوسروں نے بھی اس فرض کو ادا کیا اور اس بد بخت کی لاش کے چیتھڑے اڑ گئے۔

اکبری فوج کو پانی پت کی اس فتح کے نتیجے میں ایک ہزار پانچ سو ہاتھی اور بے شمار خزانہ اور کافی مال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیمو نے شکست کھائی اور فوج کے تعاقب میں پیر محمد خان اور مہدی قاسم خان کا داماد حسین خان روانہ ہوئے۔ ہیمو کی بیوی ایک بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی نکل بھاگی تھی۔ پیچھا کرنے والے دستوں نے اس کو الور کے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر بجواڑہ اور کوہ کی پہاڑیوں میں جان بچا کر بھاگ گئی۔ اس کا خزانہ کچھ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل لشکریوں کے ہاتھ آیا۔ پھر بھی وہ اتنا تھا کہ سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اس کو بانٹ لیا۔ جس راستے سے ہیمو کی بیوی گزری تھی اس پر اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں اتنی گری تھیں کہ ایک عرصے تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔ یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ کے زمانے سے عدلی کے عہد تک جمع ہوتا رہا تھا زمانے کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا اور وہاں فتح کی خوشی میں پھولوں کا ایک مینار لگوایا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے بڑے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بادشاہ ایک مہینے تک دہلی میں مقیم رہا اور وہاں سے اس نے آگرہ اور سنبھل کی طرف امرا کو روانہ کیا۔ دہلی کے قیام ہی میں یہ خبر ملی کہ لاہور

سے بیس کوس پر موضع چھپاری میں اکبری امیر خضر خان کو سکندر نے حملہ کر کے شکست دے دی اور وہ بھاگ کر لاہور آ گیا ہے اس پر اکبر نے دوبارہ پنجاب کا رخ کیا، جب جالندھر پہنچا تو سکندر پھر کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر نے دیسوڑہ اور دھمیری تک اس کا پیچھا کیا۔

یہ واقعات ابتدائے جلوس سے متعلق تھے۔

سکندر افغان کی اطاعت

سکندر برابر اکبر کی فوج سے برسر پیکار تھا اسی سال وہ قلعہ مانکوٹ میں محصور ہو گیا۔ مغل لشکر روزانہ اس پر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں سے اس کی جان عذاب میں آ گئی تھی۔ اکبری فوج میں سے مہدی قاسم خان کے داماد محمد حسین خان نے ان معرکوں میں بڑی جاں نثاری اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کا بھائی حسن بیگ بھی اسی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اکبر نے حسین خان کے دلیرانہ کارناموں کی بڑی قدر کی اس کو روز بروز اونچے درجوں پر ترقی ملتی رہی اور اچھی سے اچھی جاگیریں بھی اسے ملتی گئیں آخر میں لاہور کی حکومت پر اسے فائز کیا گیا۔

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور قلعہ بند فوج غلے کی کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگی تو سکندر کے رفیق کھسکنے لگے، چنانچہ سید محمود بارہہ وغیرہ سکندر سے ٹوٹ کر اکبر سے آ کر مل گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سکندر نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور اپنے بیٹے عبد الرحمن کو غازی خان سور کے ہمراہ اتکہ خان اور پیر محمد خان کو وسیلہ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ سفارت 27 رمضان 964ھ/1556ء کو بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئی۔ اس نے بہت سے ہاتھی نذر گزارے اور قلعہ بھی سپرد کر دیا۔

اکبر نے شرائط صلح کے متعلق جو فرمان لکھوایا تھا اس کی رو سے جونپور عارضی طور پر سکندر کی جاگیر میں اس شرط پر دیا گیا تھا کہ جب وہ دوسرے اور علاقوں کو فتح کرے تو جونپور پر خان زمان اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس فرمان کے بدلے سکندر پہاڑوں کے راستے سے کوچ کرتے ہوئے جونپور پہنچ گیا۔ بعد میں جب خان زمان نے جونپور پر قبضہ کر لیا تو حسب

فرمان سکندر نے گوڑ پر لشکر کشی کی لیکن وہاں اسے ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا کہ گوڑ تو اس کے ہاتھ کیا آتا چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ خود وہ گور کی آغوش میں چلا گیا۔ اکبر نے جس زمانے میں قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کر رکھا تھا، محمد قلی خان اور دوسرے چند امرا کابل جا کر بادشاہ بیگم اور خانوادۂ شاہی کے دوسرے افراد و مستورات کو اپنے ساتھ لشکر میں لے آئے تھے۔

اکبر کی لاہور کو روانگی

بادشاہ نے دوسری شوال 964ھ/ 1556ء کو لاہور کا رخ کیا اسی سفر کے دوران خانخاناں اور اتکہ خان میں بدگمانی اور شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی منزل میں شاہی ہاتھی دوڑتے ہوئے خان خاناں کے سراپردہ پر سے گزر گیا خانخاناں کو شبہ ہوا کہ یہ حرکت اتکہ خان نے قصداً کی ہے۔ جب لشکر لاہور پہنچا تو اتکہ خان اپنے تمام بیٹوں کو لے کر خانخاناں کے پاس آیا اور کلام پاک کی قسم کھا کر اس نے اپنی بریت ظاہر کی اور خان خاناں کی بدگمانی رفع ہو گئی۔

اسی سال ملا عبد اللہ سلطان پوری کے توسط سے سلطان آدم گکھر لاہور آ کر اکبر کے حضور میں باریاب ہوا۔ لاہور میں خانخاناں کے ساتھ اس کا بڑا یارانہ ہو گیا اور اکبر نے اس قضیے کا فیصلہ کر دیا جو سلطان آدم اور اس کے بھتیجے کمال خان کے مابین جاری تھا۔ اسی طرح سلطان آدم بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا۔

دہلی میں داخلہ

برسات کا موسم ختم ہونے پر اکبر نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ جالندھر میں جب قیام ہوا تو ہمایوں کی بھانجی اور میرزا نور الدین محمد کی لڑکی سلیمہ سلطان بیگم کا نکاح خان خاناں بیرم خان کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوا اور ایک بڑا جشن شادی کی تقریب میں منعقد کیا گیا۔ دونوں طرف سے دل کھول کر روپے لٹائے گئے۔

25 جمادی الثانی 965ھ/1557ء کو اکبر دہلی میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں خان

خانان ہر ہفتے دو مرتبہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر دوسرے امراء کے تعاون سے مشورے اور انتظامی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

خان زمان اور شاہم بیگ کا معاملہ

اس زمانہ میں جو واقعات پیش آئے ان میں شاہم بیگ کے ساتھ خان زمانہ کی عشق بازی کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ہمایوں بادشاہ کے قورچیوں کے عملے میں دو خوبصورت اور خوش مزاج لڑکے شامل تھے ایک کا نام خوشحال بیگ اور دوسرے کا نام شاہم بیگ تھا۔ شاہم بیگ طہماسپ کے ساربان کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں لڑکے نہ صرف خوش خلق و پسندیدہ اطوار تھے بلکہ دلیری اور بہادری میں بھی ہم چشموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں جب کہ خان زمان کا سنبھل پر تقرر نہیں ہوا تھا اسے شاہم بیگ سے بڑا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حال شاعر کے اس مفہوم سے مختلف نہ تھا:

نشان برگشتۂ ہستی نبود از عالم و آدم
کہ جان در مکتب شوق از تمنائی تو میزد دم
کہ دارد این چنین عیشی کہ در عشق تو من دارم
شرابم خون کبابم دل ندیمم درد نقلم غم

ہمایوں کے انتقال کے بعد جب خان زمان اکبر بادشاہ کی خدمت سے وابستہ ہوا تو اس نے شاہم بیگ سے اس بات کا قول و قرار لیا کہ وہ شاہی ملازمت ترک کر کے اس کے پاس آجائے گا۔ چنانچہ اس نے لکھنؤ سے اپنے چند آدمی دہلی بھیجے کہ وہ شاہم بیگ کو بھگا کر لے آئیں۔

ماوراء النہر کے دوسرے عیاش امیروں کی طرح جو نوجوانوں کو شاہی مراتب کا لالچ دے کر بہار کا موسم عیش و نشاط میں گزارا کرتے ہیں۔ خان زمان بھی شاہم کی خاطر داری اور خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اسے "بادشاہ" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اس کے عشق میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا اور اکثر اوقات اس کی رکاب پکڑ کر خدمت گاروں کی طرح اس کی

خدمت میں گذرا رہتا تھا۔

میں (مؤلف منتخب التواریخ) نے ابو الغیث بخاری دہلوی کی زبان سے جن سے شاہم بیگ کو بڑی عقیدت تھی، یہ بھی سنا ہے کہ جس زمانہ میں شاہم بیگ لشکر شاہی سے جون پور گیا تھا، باجماعت نماز، درود خوانی اور تلاوت کلام پاک کا بڑا پابند تھا۔ ہمیشہ طہارت و پاکی کا خیال رکھتا تھا اور برائیوں کی طرف اس کا میلان نہ تھا۔ شاہم بیگ کی خاطر خان زمان بھی بڑا متقی اور پرہیز گار بن گیا۔ اپنے لشکر میں بھی اس نے غیر شرعی باتوں کی روک تھام کے لیے محتسبوں کا تقرر کر دیا تھا اور شاہم بیگ کی تعلیم کے لیے میر سید محمد مکی کو جو سات قرأتوں کے قاری تھے، مقرر کیا تھا۔ راقم نے بھی سلیم شاہ کے عہد میں سنبھل میں مکی صاحب کے سامنے اپنی قرأت کی اصلاح کی تھی۔ غرض خان زمان اس خوبرو لڑکے کی ہر طرح خاطر داری کرتا رہتا تھا۔ لڑکوں کی پاک بازی کم سنی تک ہی رہتی ہے، شاہم بیگ کے چال چلن بھی بہت جلد بگڑ گئے۔

آرام جان

آرام جان نامی ایک حسین اور دلربا طوائف تھی۔ شاہم بیگ کا اس پر دل آگیا اور وہ بھی دل و جان سے اس نوجوان پر فریفتہ ہوگئی۔ یہ طوائف پہلے سے خان زمان کے نکاح میں تھی۔ اس نے شاہم بیگ کو جب اس کی طرف مائل پایا تو اس طوائف کو اس کے حوالے کر دیا۔ شاہم بیگ نے چند دن اس کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منائیں۔ جب جی بھر گیا تو اسے اپنے ایک جانی دوست عبدالرحمن بن مؤید بیگ کو بخش دیا۔

عشق بازی کے یہ قصے جب بادشاہ سلامت کے سننے میں آئے تو غیرت سلطانی جوش میں آگئی اور شاہم بیگ کی حاضری کے فرمان آگرے اور دہلی سے جونپور پہنچے۔ اس علاقہ کے جاگیرداروں کے نام بھی فرمان صادر ہوا کہ اگر خان زمان تعمیل حکم میں پس و پیش کرے تو سب مل کر اس کو سزا دیں۔

خان زمان نے اپنے ایک معتمد آدمی برج علی کو اپنے قصوروں کی تلافی کے خیال سے

دہلی روانہ کیا۔ برج علی سب سے پہلے خان خانان کے نائب پیر محمد خان کے مکان پر گیا۔ برج علی پہنچا تو وہ ایک برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ برج علی نے خان زمان کے پیغام سے مطلع کیا۔ غالباً باتوں باتوں میں کوئی ناگواری پیدا ہوگئی اور پیر محمد خان نے برج علی کی کسی سخت بات پر اسے اس برج سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس صدمہ سے وہ بے چارہ مٹی کا ڈھیر بن گیا اور اس ظالم نے سنگ دلی کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہا" یہ کمینہ اب اسم با مسمّٰی بنا ہے"

خان زمان کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اس نے جدائی کا پتھر اپنے سینے پر رکھ کر شاہم بیگ کو سرہر پور کے پرگنے میں بھیج دیا، یہ پرگنہ جونپور سے اٹھارہ کوس پر اس کے دوست عبدالرحمٰن بیگ کی جاگیر میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شاہم بیگ کچھ عرصہ تک وہاں سیر و شکار میں معروف رہے، جب بادشاہ سلامت کا غصہ ٹھنڈا پڑے تو وہ لوٹ آئے۔

شاہم بیگ کا انجام

سرہر پور میں شاہم بیگ کی عبدالرحمٰن بیگ کے ساتھ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ آرام، وہ د خوبصورت مکان تھا جس کے ساتھ سرسبز و شاداب باغ جو خوش منظر تالاب کے کنارے تھا۔ دونوں دوست عیش و نشاط کے جلسے مناتے رہتے تھے۔ ایک دن جب کہ شراب و کباب کی مجلس جمی ہوئی تھی:

سرود و عاشقی و ی پرستی
سبب شد ہر سہ چیز بہر مستی

عالم مستی میں شاہم بیگ نے عبدالرحمٰن بیگ سے آرام جان کو بلانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے نکاح کر لینے کا بہانہ کر کے اس کی فرمائش ٹال دی۔ اس بات سے شاہم بیگ کو بڑا رنج ہوا اور دونوں کی دوستی دیکھتے ہی دیکھتے دشمنی میں تبدیل ہوگئی اور شاہم بیگ نے غرور اور مستی کی وجہ سے آدمیوں کو حکم دیا کہ عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لیں، پھر اس نے اس گھمنڈ میں کہ آرام جان پہلے اس کی تھی، عبدالرحمٰن کے مکان سے اپنے پاس بلوا لیا اور اس کے ساتھ خوش وقتی میں مشغول ہوگیا۔

عبدالرحمٰن کے چھوٹے بھائی مؤید بیگ کو اس کی اس حرکت پر بڑی غیرت آئی اور وہ ایک جمعیت لے کر اس بالاخانہ کی طرف گیا جس میں شاہم بیگ آرام جان کو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ شاہم بیگ بھی مقابلہ کے لیے آیا۔ دونوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی شاہم بیگ کو اس نشہ کی حالت میں ایک تیر ایسا آ کر لگا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

خان زمان کی معرکہ آرائی

ان چند سالوں میں خان زمان نے باوجود مختصر جمعیت کے افغانوں کی ایک بھاری فوج سے دلیرانہ جنگ کر کے فتح حاصل کی۔ اس سلسلے کی اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں وہ بلاشبہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ انہی لڑائیوں میں سے لکھنؤ کی جنگ بھی ہے جس میں حسن خان بچکوتی بیس ہزار سپاہیوں کو لے کر حملہ آور ہوا تھا۔ خان زمان کے پاس تین چار ہزار سے زیادہ کی جمعیت نہیں تھی۔

جب غنیم نے گروتی ندی کو پار کر کے بہادر خان کی فوج پر حملہ کر دیا تو خان زمان کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ جب لوگوں نے آ کر کہا کہ غنیم سر پر آ پہنچا ہے تو اس نے شطرنج لانے کا حکم دیا اور بڑے اطمینان سے شطرنج کھیلتا رہا۔ پھر لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ دشمن نے آدمیوں کو پسپا کر دیا ہے تو اس نے ہتھ . منگائے۔ جس وقت دشمن کے سپاہی سراپردوں کو لوٹتے پھر رہے تھے اور اس کا سارا لشکر منتشر ہو چکا تھا خان زمان نے بہادر خان کو رخصت کر دیا اور خود تھوڑے سے آدمیوں کو ساتھ لے کر نقارہ بجاتے ہوئے دشمن کے مقابلے پر آیا اور ایسا دلیرانہ حملہ کیا کہ غنیم کے پیر اکھڑ گئے اور پٹھان بھاگ نکلے۔ خان زمان نے سات آٹھ کوس تک اس کا پیچھا کیا اور بہت سارے پٹھانوں کو تہ تیغ کر دیا۔

لکھنؤ کی جنگ کی طرح جونپور کی لڑائی بھی اس کی بہادری کا ایک کارنامہ ہے۔

بنگالہ میں کوریہ نے سلطان بہادر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا، پھر وہ بنگال سے تیس چالیس ہزار سوار لے کر جونپور پر حملہ آور ہوا۔ مقابلے میں خان زمان کا

سارا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔ جس وقت غنیم پہنچا ہے خان زمان دسترخوان سے اٹھ کر بس گیا ہی تھا۔ حملہ آوروں نے دسترخوان کو اسی طرح جما ہوا پایا تو بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا۔ پھر خان زمان ایک مختصر سی جمعیت اکٹھی کر کے پٹھانوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑا اور انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔ بہت سے پٹھان قتل اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اس قدر مال غنیمت مغل لشکریوں کے ہاتھ لگا کہ انھیں اور کسی چیز کی آرزو نہ رہی۔

سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ کے اقبال سے اس نے اور اس کے بھائی نے اپنی فوج کے ساتھ مشرقی ہندوستان میں جیسی فتوحات حاصل کیں وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوں گی۔ اگر ان کا دامن معصیت سے داغدار نہ ہوتا تو کیا عجب کہ شاہی اعزاز سے نوازے جاتے۔ اپنی سرکشی کی وجہ سے انھوں نے اپنے سارے کارنامے خاک میں ملا دیے۔ ان کا باقی حال مناسب موقعے پر بیان کیا جائے گا۔

اسی سال خان خانان نے خواجہ کلاں بیگ کے لڑکے مصاحب بیگ کو جو نہایت شر پسند اور ظالم تھا، قتل کرا دیا۔

اکبر کا آگرے میں داخلہ

17 محرم 965ھ/1557ء کو جلوس کے تیسرے سال، اکبر کی شاہانہ سواری آگرے میں داخل ہوئی۔ یہی وہ سال ہے جس میں پیر محمد خان کو عروج بھی نصیب ہوا اور سال بھر کے اندر زوال بھی آ گیا۔ پیر محمد خان پہلے صرف ملّا تھا۔ ملّا گیری سے وہ امارت کے اس درجہ پر پہنچا کہ تمام امور مملکت میں وہ خانخاناں کی نیابت کرنے لگا تمام امرا اس کے دروازے پر حاضر ہوا کرتے تھے اور بہت کم لوگوں کو باریابی کا موقع ملتا تھا۔

پیر محمد خان کا عروج و زوال

اس کے جاہ و حشم کا یہ حال تھا کہ جس وقت لشکر دہلی سے آگرہ جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں

خان خاناں پیر محمد خان کے ساتھ شکار کے لیے نکل گیا۔ خان خاناں کو جب بھوک لگی تو اس نے اپنے رکاب داروں سے پوچھا کہ ہمارے ہمراہ کچھ کھانے کا سامان بھی ہے؟ پیر محمد خان نے عرض کیا: ''اگر آپ یہاں ٹھہر جائیں تو جو کچھ میرے ساتھ ہے خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ خانخاناں اپنی جمعیت کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پیر محمد خان رکاب خانہ سے اس وقت تین سو شربت کے پیالے اور سات سو کھانے کی رکابیاں دسترخوان پر چنی گئیں۔ اس کے اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر خان خاناں حیران رہ گیا۔ ظاہر تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن دل ہی میں بہت پیچ و تاب کھاتا رہا، اسی وقت سے خان خاناں کا دل اس سے پھر گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد پیر محمد خان کچھ دن تک بیماری میں مبتلا رہا۔ ایک دن خان خاناں اس کی عیادت کے لیے گیا تو اس کے ایک غلام نے اسے داخل ہونے سے روک دیا کیوں کہ پیر محمد خان نے امرا وغیرہ کے داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی اور خان خاناں سے کہا جب تک اجازت آجائے آپ تشریف رکھیے۔ خان خاناں کے لیے یہ بات جلتے پر تیل سے کم نہ تھی۔ جب پیر محمد خان کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مرض کی نقاہت کے باوجود دوڑا ہوا آیا اور خان خاناں سے معافی چاہی کہ ''دربان نے آپ کو پہچانا نہیں''۔ خان خاناں نے اس کے جواب میں صرف ایک معنی خیز جملہ کہا: ''اور تم نے بھی نہیں۔'' اس واقعہ کے باوجود پیر محمد خان کے دربانوں نے خان کے ملازموں میں سے کسی اور کو اندر نہ جانے دیا۔ صرف طاہر محمد سلطان، میر فراغت بڑی کوشش کے بعد اندر مجلس میں پہنچ سکے تھے خان خاناں کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا اور پیر محمد خان کے ہوش درست کرنے کا ارادہ کر لیا۔

دو تین دن بعد خان خاناں نے خواجہ امینا جو بعد میں خواجہ جہاں بنا اور میر عبد اللہ بخشی کو خدمت گاروں کی ایک جماعت کے ساتھ پیر محمد خان کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ ان دنوں کو تو بھول گیا ہے جب تو طالب علمی کے لباس میں نہایت خستہ حال قندھار پہنچا تھا۔ ہم نے اس وقت تجھ میں قابلیت اور خلوص کے جذبے کو دیکھ کر اور چند عمدہ خدمات

کے بجالانے کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور تجھے ملّا گیری سے امارت کے اعزاز پر پہنچنا نصیب ہوا، پھر ہم نے ترقی دے کر تجھے امیرالامرائی کا عہدہ عطا کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا ظرف دولت و مرتبے کی سمائی کے لائق نہیں اور تیری طرف سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو چلا ہے اس لیے ہم چند دن کے لیے وہ ساز و سامان تجھ سے چھین لیتے ہیں جو ترے اس غرور کا باعث ہے تا کہ تیرا دماغ ٹھکانے آجائے، تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تو فوراً ہی علم و نقارہ اور ساز و سامان سرکاری آدمیوں کے حوالے کردے"۔ پیر محمد خان نے خان خانان کے حکم کی تعمیل کی اور سارا ساز و سامان اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ پھر وہ امیر الامراء کے درجے سے دوبارہ ملا پیر محمد بن گیا بلکہ اس کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہو گیا۔

خان خانان نے چند دن بعد ہی اسے قلعہ بیانہ میں بھیج کر قید کر دیا۔ اسی قید کے زمانے میں اس ''برہان تمانع'' کی بحث پر جو "**لو کان فیهما الهة الا الله لفسدتا**" کی آیت پر مبنی ہے اور یہ متکلمین کے درمیان ایک مشہور بحث ہے پر چند رسالے لکھ کر خان خانان کے نام سے موسوم کیے تا کہ اس وسیلے سے اسے رہائی مل جائے، لیکن ایسی باتوں کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ چند دن بعد خان خانان کے حکم سے اسے مکہ معظمہ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ تقدیر اچھی تھی، جب وہ گجرات پہنچا تو خان خانان خود سازشوں کا شکار ہو گیا۔ یہ خبر جب پیر محمد خان کو ملی تو وہ گجرات سے لوٹ آیا اور اکبر کے پاس باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب عطا کر کے خان خانان کے پیچھے روانہ کر دیا۔ ان واقعات کے بعد خان خانان کی نیابت کا عہدہ پیر محمد خان کے بجائے خان خانان کے ہی ایک ملازم حاجی محمد خان سیستانی کو دیا گیا تھا۔

شیخ گدائی کا اقتدار

ایک اور شخص شیخ گدائی کنبوہ تھا۔ یہ دہلی کے شاعر جمالی کنبوہ کا لڑکا تھا۔ جب ہندوستان دوبارہ فتح ہوا تو سفر کی حالت میں شیخ گدائی گجرات کے مقام پر خان خانان کی خدمت

میں حاضر ہوا تھا اور اس سے اس کی اچھی راہ و رسم ہو گئی تھی۔ انہی سابقہ روابط کی بنا پر خان خانان نے اس کی سرپرستی کی اور اسے صدر الصدور کا عہدہ دے کر تمام ہندوستانی اور خراسانی امیروں میں اس کا مرتبہ بڑھا دیا۔ یہ شخص نہایت مکار اور ریاکار تھا۔ اس نے صوفیانہ وضع اختیار کر رکھی تھی اور اپنے گھر پر سماع کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا ان محفلوں میں خان خانان بلکہ خود بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اسلام کا آغاز ہی تھا اس لیے ایسے مکار لوگ جو غلامانہ ذہنیت اور پست فطرت رکھتے تھے اور ان کے نفاق و ریاکارانہ زہد کی وجہ درویشی ان پر جچتی نہیں تھی، مکر و تزویر سے بہ آسانی اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ شیخ گدائی بھی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ لوگوں کو تو اس کے عالی نسب ہونے میں بھی شبہ تھا۔ غرض اس کے اس بڑھتے ہوئے اعزاز و مرتبے کی وجہ سے اہل علم اور امرا کی محفلوں میں ماتم برپا ہو گیا:

در تنگنائی حیرتم از نخوت رقیب
یا رب مباد آنکہ گدا معتبر شود

شیخ گدائی نے قدیم امیر زادوں اور پیرزادوں کی جاگیریں ضبط کرا دیں۔ وہ صرف انہی کو جاگیر عطا کرتا تھا جو اس کے دربار میں جانے کی ذلت گوارا کر لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ایک گز زمین جاگیر میں حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد نہ کرتے ہوں ان میں ولایت (ایران) سے آنے والے معزز لوگ بھی شامل تھے۔

میر عبداللطیف قزوینی

انہی دنوں عراق سے میر عبداللطیف(2) جو قزوین کے معزز خاندان سادات سیفی کے سربرآوردہ آدمی تھے۔ 963ھ/1555ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بادشاہ نے لسان الغیب حافظ شیرازی کا دیوان ان سے سبقاً سبقاً پڑھنا شروع کیا۔

ان کے لڑکے کا نام غیاث الدین تھا جس کو نقیب خان کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ شخص نہایت ذہین اور جامع العلوم ہے چنانچہ علم سیرت، تاریخ اور اسماء الرجال اور دوسرے تمام

مروجہ علوم میں ان کی نظر بڑی گہری تھی وہ بلا شبہ اس دور میں باعث برکت، بلکہ صحیح معنوں میں ''ثانی لوح محفوظ'' تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس کے ساتھ ہم جماعتی، ہم عصری اور دینی اخوت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ان دنوں بادشاہ سلامت کی خدمت میں تاریخ نظم ونثر اور دوسرے علوم کی کتابوں کے پڑھنے پر مامور ہے۔

گوالیار کے قلعہ پر قبضہ

966ھ/1558ء میں گوالیار کا قلع فتح ہوا۔ گوالیار کے قلعے میں عدلی کا ایک غلام بھبل خان نامی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اس نے امان حاصل کر کے قلعے کی کنجی شاہی کارندوں کے حوالے کر دی۔

رنتھنبور کا قضیہ

اسی سال عدلی کے ایک اور غلام سنکرام خان نے رنتھنبور کا قلعہ رائے سرجن ہارا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے آگرہ میں آنے سے پہلے امیروں کی ایک جماعت کو جن میں ہندو بیگ اور دوسرے مغل امیر شامل تھے، قلعہ رنتھنبور کی تسخیر کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان امیروں نے سنکرام خان پر حملہ کر کے قلعے کے مضافات کو بری طرح لوٹا، لیکن ان سے قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ جب بیانہ کی جاگیر خان خانان کے ایک غلام حبیب خان کو دی گئی اور پیاور و تودہ و ترک علی جو تودہ بھون کے نام سے مشہور ہے چغتائی خان کے حوالے ہوا تو حبیب خان کو میر لشکر بنا کر رنتھنبور کی مہم پر مقرر کیا گیا۔ اس نے قلعے کو ایک سال تک محاصرے میں رکھا۔ اس طویل محاصرے سے قلعے والے تنگ آ گئے اور صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور ہو گئے سنکرام خان نے حبیب خان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنا ایک قاصد ہمارے پاس روانہ کریں تا کہ ہم اپنی شرائط اسے بتا دیں۔

مغل سرداروں نے میرے والد (صاحب تصنیف) کو حاجی بھکین پیاوری کے ساتھ اس سفارت کے لیے منتخب کر کے روانہ کیا۔ بڑی رد و کد کے بعد سنکرام خان چند شرطوں پر

قلعہ سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اسے نقد روپیہ اور مال واسباب دیا جائے، دوسری یہ کہ شاہی ملازمت میں اس کے معاش کی بھی کوئی سبیل نکالی جائے۔ امیروں نے اس کے ان مطالبوں کی پابجائی میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ ان کے پاس روپیہ بھی نہیں تھا جو اسے دیتے، اس لیے وہ قلعے پر زبردستی ہی قبضہ کر لینے کی فکر کرنے لگے تھے۔ امراء کے اس رویہ کو دیکھ کر اس نے رنتھنبور کا قلعہ رائے سرجن کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ شاہی لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لینے کی ہر طرح کوشش کر لی لیکن ان کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قلعے کو حوالے کر دینے کے بعد سنکرام خان تو حاجی خان الوری کے ساتھ گجرات کی طرف نکل گیا اور رائے سرجن نے قلعہ میں کافی رسد اور سامان جنگ پہنچا کر اسے اچھی طرح مستحکم کر لیا اور رسد و محصول کی وصولیابی کے بہانے قلعے سے متعلقہ بعض پرگنوں پر بھی قابض ہوگیا۔ غنیم کے اس تسلط کے بعد رجب علی خان اور دوسرے امیر کافی نقصان اٹھا کر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

چنار کے قلعے پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خان نے جو چنار پر قابض تھا ایک قاصد دربار میں بھیجا اور درخواست کی کہ اگر بادشاہ کسی تجربے کار لائق آدمی کو روانہ کریں تو میں قلعہ اس کے حوالے کر دونگا۔ اس کے عریضہ پر خان خانان نے مہر علی بیگ سلاصدوز کو جس نے بعد میں خانی کا اعزاز پایا تھا اور قلعہ چتوڑ کا حاکم مقرر ہوا تھا، جمال خان کے قاصد کے ساتھ روانہ کیا اور جمال خان کے نام ایک تسلی آمیز فرمان بھی بھیج دیا۔

اس زمانے میں، میں (صاحب تصنیف) پڑھنے کے ارادے سے وطن سے بیاور اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے اس سفر میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوریؒ اور والد مرحوم شیخ ملوک شاہ سے بھی سفارش کرائی،

یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں اس سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ دونوں بزرگوں نے معرفت و آشنائی کی وجہ سے مجھے اس سفر کی اجازت دے دی۔ میں بھی مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہم لوگ قنوج، لکھنو، جونپور اور بنارس کی سیر کرتے، جگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ 966ھ/1558ء میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا پار کر کے چنار پہنچے۔

جمال خان نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ مہر علی کو قلعے کے اندر لے گئے اور وہاں اسے شیر شاہی اور سلیم شاہی دور کی عمارتیں دکھائیں اور قلعے کے ساز و سامان کا معائنہ کرایا۔ قلعے والوں نے ہماری مہمانی اور ضیافت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ کی جس وقت جمال خان کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جونپور کے پانچ پرگنے دیے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خان نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعے میں روک لے جب تک کہ دربار سے اس کے عریضے کا جواب آ جائے۔

اس اثنا میں اس نے خان زمان سے علیحدہ بات چیت شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خان افغان پنی سے بھی جو اپنی جمعیت کے ساتھ رہتاس کے قلعے پر قابض تھا، قلعہ سپرد کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب مہر علی کو اس کے اس مکر و فریب کا علم ہوا تو اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خان اور جمال خان مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈال دیں اس ڈر کے مارے وہ ہمیں (صاحب تصنیف اور دیگر افراد جو ہمراہ تھے) اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعہ سے نکلا اور گنگا پار کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعے میں رہ گئے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خان سے چاپلوسی کی باتیں کیں اور اسے یہ یقین دلایا کہ میں کسی طرح مہر علی کو واپس لاتا ہوں تا کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی چنانچہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا پار کرنے لگا۔ اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی۔ یہ بھنور

قلعے کی دیوار کے قریب ہی تھا اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ اگر اس وقت اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو بلا شبہ کشتی اس بھنور میں چکراتی ہوئی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرخچے اڑ جاتے:

رسیدم من بہ دریائی کہ موجش آدمی خوار است

نہ کشتی اندر ان دریا نہ ملاحی عجب کار است

غرض بڑی مشکلوں سے کشتی ساحل سے جا لگی اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر پہنچے۔ یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحب دعوت بزرگ تھے اور اس ویرانے میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گزر بسر جنگل کے پھول اور درختوں کے پتوں پر تھی۔ دعوت دین کی برکت کی وجہ سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ عالی مرتبت بادشاہ خلوص وعقیدت کے ساتھ ان کے آستانے پر سر جھکاتے تھے۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعہ پر عدلی کے غلام فتو نے قبضہ کرلیا۔ 966ھ/ 1558ء میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے۔ اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور تفوق کی وجہ سے آگرہ میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا کیونکہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے اس کی مشیخت کی دکان پھیکی پڑ رہی تھی:

بہ نزد خرد این سخن روشن است

کہ ہم پیشہ ہم پیشہ را دشمن است

خان خاناں کے مزاج میں شیخ گدائی کا بڑا دخل تھا اس لیے خان خاناں بھی شیخ محمد غوث سے کھل کر نہیں ملا بلکہ اس نے کئی ایک مجلسیں منعقد کیں وہ ان مجلسوں میں شیخ کا ایک رسالہ پڑھ کر سناتا تھا جس میں شیخ نے اپنی معراج کا حال لکھا ہے کہ حالت بیداری میں مجھ سے خدا نے گفتگو کی اور حضور اکرم ﷺ پر مجھے ترجیح دی۔ ان مجلسوں میں یہ اور ایسی

دوسری خرافات کا تذکرہ کر کے شیخ کی ذات پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے اور وہاں ہدایت و رشد کی مہم میں مشغول رہے۔ ایک کروڑ کی جاگیر جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی صبر کر لی۔

اسی سال خان زمان کا بھائی بہادر خان سزاول خان کے لڑکے باز بہادر کے مقابلہ پر گجرات کی طرف مامور کیا گیا۔ وہ سیرنی کے قصبہ تک پہنچا تھا کہ خان خانان کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے چنانچہ وہ دربار میں واپس آ گیا۔

اسی سال ندری سے حسین خان آگرہ اور چندر سے باہر گئے امراء کو اپنے ساتھ لے کر رنتھنبور کی طرف گیا اور سوپر پہنچ کر اس نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیے اور پھر وہاں سے اس نے قلعہ رنتھنبور پر حملہ کیا اور رائے سرجن کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ قلعہ میں لے کر گیا اور اس نے قلعہ وری کا جائزہ لے لیا، لیکن وہ بھی خان خانان کے جھگڑے کی وجہ سے اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر گوالیار آ گیا اور وہاں سے مالوہ جانے کا ارادہ کیا تھا کہ خان خانان نے اسے آگرہ میں طلب کر لیا۔

اکبر دہلی میں

967ھ/1559ء میں اکبر نے شکار کے ارادے سے جمنا کو پار کیا۔ اس موقع پر مطلب پرستوں نے جن میں ادہم خان جو ماہم انگہ کی فرزندی کی وجہ سے سب سے زیادہ مقرب تھا اور صادق محمد خان پیش پیش تھے، خان خانان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے کیونکہ ان تمام امیروں کو خان خانان سے اس کی مستقل وکالت کی وجہ سے بڑا حسد تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خان خانان سلطنت پر اس طرح قابض تھا کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ آ چکا تھا۔ اس کی بادشاہت تو بس برائے نام تھی، سب کچھ خان خانان کے ہاتھ میں تھا۔ بعض وقت تو ضروری اخراجات کے لیے بھی بادشاہ کو خود بڑی تنگی ہو جاتی تھی۔ خزانہ بالکل ہی خالی تھا۔ بادشاہ کے عملہ کے جتنے لوگ تھے وہ سخت پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انھیں جاگیریں بھی بڑی خراب دی گئی تھیں۔ اس کے برعکس خان خانان کے

جتنے ملازم تھے وہ بڑے خوشحال رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہی امرا خان خاناں کے زوال کے آرزومند رہتے تھے۔

بیرم خان کے خلاف سازشیں

جب شہنشاہ کی سواری دہلی سے نصف مسافت پر سکندرہ راؤ میں پہنچی تو وہاں ماہم انکہ نے اطلاع دی کہ دہلی میں بیگم بادشاہ سخت بیمار ہیں اور بادشاہ سلامت کو بار بار یاد کرتی ہیں۔ یہ سن کر اکبر نے دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شاہی لشکر دہلی پہنچا تو دہلی کے حاکم شہاب الدین احمد خان نے استقبال کیا۔ دہلی میں تمام امیروں نے مل کر خان خاناں کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی اور رائی کا پہاڑ بنا کر بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکا دیا

خال و خط و زلف و ابرویت یک جا شدند
از برائی کشتن مسعود محضر می شود

ان لوگوں نے خان خاناں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی اور مظلومی دکھلانے کے لیے ایسا ڈھونگ رچایا کہ کہنے لگے حضور کی دہلی میں تشریف آوری پر خان خاناں یہی سمجھے گا کہ ہم لوگ ہی آپ کو یہاں لے کر آئے ہیں اور وہ یقیناً ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا۔ ہم چونکہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے مناسب یہی ہے کہ حضور ہمیں مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت دیں۔

اکبر کو ماہم انکہ کی جدائی گوارا نہیں تھی اس لیے اس نے تمام امیروں کی دلدہی کی اور خان خاناں کو پیغام بھیجا کہ ''ہم تمہاری اجازت بغیر دہلی چلے آئے اور اب ہمارے تمام ملازم تمہاری طرف سے خوفزدہ ہیں، تمہیں چاہیے کہ تم ان سب کو تسلی دو تاکہ یہ سب مطمئن ہو جائیں۔''

خان خاناں نے خواجہ امین، حاجی محمد خان سیستانی اور ترسون محمد خان کو شہنشاہ کے دربار میں بھیج کر اپنی طرف سے بڑی معذرت خواہی کی اور اپنی خیر خواہی اور خلوص کو جتلانا چاہا لیکن اکبر نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان لوگوں کو بھی واپسی سے روک دیا اور

تمام امور سلطنت شہاب الدین احمد خان اور ماہم انگہ کے ذریعے انجام پانے لگے۔ ان لوگوں نے اس بات کی خوب افواہ پھیلائی کہ: "بادشاہ سلامت خان خاناں سے ناراض ہو چکے ہیں" آگرہ میں جتنے امیر تھے سب ایک ایک کر کے دہلی پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے قیام خان گنگ آگرہ چھوڑ کر آیا۔ وہاں سے جو امیر بھی آتا تھا شہاب الدین احمد خان وغیرہ اس کی جاگیر اور منصب میں اضافہ کر دیتے تھے۔ ان امیروں نے دور اندیشی سے کام لیا اور قلعہ کی مضبوطی کا بخوبی انتظام کر لیا۔

بیرم خان کی مکہ کے لیے روانگی

خان خاناں نے جب بساط(3) الٹی ہوئی دیکھی تو اپنے مصاحبوں وغیرہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی وغیرہ نے رائے دی کہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر دہلی جا کر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے، لیکن خان خاناں نے یہ تجویز پسند نہ کی اور کہا کہ اکبر کا مزاج میری طرف سے پھر گیا ہے، اس لیے اب میرا اور اس کا نباہ ہونا مشکل ہے اس سے قطع نظر میری ساری عمر خیر خواہی میں گزری ہے اب بڑھاپے میں نمک حرامی کا داغ لگا کر میں بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔

خان خاناں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر حج کا ارادہ کیا اور بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔ آگرہ کے تمام سرداروں اور امراء کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کر کے دہلی رخصت کر دیا۔ مالوہ سے بہادر خان کو بھی بلا کر ان لوگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بیانہ کے قید خانہ سے محمد امین دیوانہ کو بھی رہا کر دیا۔

دہلی میں امراء نے اکبر کو سمجھایا کہ خان خاناں پنجاب کا عزم کیے ہوئے ہے اور اس کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ اکبر نے میر عبد اللطیف قزوینی کے ذریعے خان خاناں کو پیغام بھیجا کہ اب ہم نے سلطنت کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھ لیا ہے تم عرصہ سے حج پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے، اس لیے تم کوئی علاقہ اپنی جاگیر کے لیے تجویز کر لو، تمہارا نمائندہ اس کی آمدنی مکہ میں تمہارے پاس بھیجتا رہے گا۔

خان خاناں پہلے ہی سے یہ عزم کیے ہوئے تھا، یہ فرمان قبول کر کے وہ میوات سے ناگور کی طرف چلا گیا۔ سرداروں میں سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ البتہ ولی بیگ ذوالقدر، حسن قلی خان جو بعد میں خان جہاں بنا، اسمٰعیل قلی خان اور اس کے بھائی شاہ قلی خان اور حسین خان خویش اور مہدی قاسم خان اس کے ہمراہ ناگور تک آئے۔ ناگور پہنچ کر خان خاناں نے سارا سامان، جلوس، نقارہ اور علم وغیرہ حسن قلی خان کے ہاتھ دربار میں بھیج دیا۔ جب وہ بیکانیر کی حد میں پہنچا تو شیخ گدائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر نکل گیا۔

ابوالمعالی کی گرفتاری

اکبر نے دہلی سے پنجاب جانے کا ارادہ کیا۔ جس دن اس نے قصبہ جھجھر میں قیام کیا حسن قلی خان مع ساز و سامان کے حاضر ہوا۔ اسی قیام میں شاہ ابوالمعالی بھی خدمت شاہی میں حاضر ہوا لیکن اس نے یہ گستاخی کی کہ سواری کی حالت میں بادشاہ کو تسلیمات ادا کی۔ اکبر کو اس کی یہ جرأت سخت ناگوار گزری اور اسے گرفتار کر کے شہاب الدین احمد خان کے سپرد کر دیا۔

بیرم خان کا تعاقب

اسی قیام میں پیر محمد خان شیروانی بھی، جو خان خاناں کا حال سن کر گجرات سے لوٹ آیا تھا، باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب اور سرداری کا سامان دے کر خان خاناں کے پیچھے روانہ کیا تاکہ وہ جا کر خان خاناں کو جلد از جلد مکہ روانہ کر دے اور ہندوستان میں ٹھہرنے کی مہلت نہ دے۔ پیر محمد خان فوراً ہی شاہی لشکر گاہ سے رخصت ہو گیا اور ناگور کے قریب پہنچ کر قیام کیا اور ایک دو منزل کی مسافت پر یہ شعر ایک رقعہ میں لکھ کر خان خاناں کے پاس بھیج دیا:

آیدم در دل اساس عشق محکم ہم چناں
با غمت جان بلا فرسودہ ہمدم ہم چناں

خان خاناں نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

"آمدن مردانہ، اما نزدیک رسیدہ توقف کردن نامردانہ"

(تم آئے یہ تمہاری بہادری تھی لیکن قریب آکر ٹھٹک گئے یہ تمہاری نامردی ہے۔)

خان خاناں کو پیر محمد خان[4] کے تعاقب سے بہت رنج ہوا اور وہ ناگور سے کوچ کر گیا۔ چونکہ جودھپور کے راجہ مالدیو نے بڑی جمعیت کے ساتھ گجرات کا راستہ روک رکھا تھا اسی لیے وہ بیکانیر کی طرف چلا گیا۔ یہاں بعض لوگوں نے اسے بہکایا اور اس نے گجرات کے بجائے پنجاب کا رخ کیا۔ اپنے تمام اہل و عیال کو اپنے تین سال کے لڑکے مرزا عبدالرحیم سمیت جو اس وقت خان خانی اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز تھے شیر محمد خان دیوانہ کی جاگیر میں تبر ہندہ کو روانہ کر دیا۔ خانخاناں نے شیر محمد خان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا اسی بھروسے پر اس نے اس کی پناہ میں اپنے خاندان کو بھیج دیا، لیکن شیر محمد خان نے اس کی سابقہ مہربانیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور اس کے خاندان کی ہر طرح سے توہین کی۔ خان خاناں دیپالپور پہنچا تھا کہ اسے یہ حال معلوم ہوا، اس نے شیر محمد خان کی فہمائش کے لیے خواجہ مظفر علی دیوانہ اور درویش محمد ازبک کو روانہ کیا تاکہ یہ لوگ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیں۔ شیر محمد خان نے ان کی کچھ نہ سنی بلکہ اس نے خواجہ مظفر علی کو قید کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ خان خاناں کو سب سے زیادہ صدمہ شیر محمد خان کی اس طوطا چشمی سے ہوا۔

بیرم خان کی شکست

خان خاناں نے اب جالندھر کا رخ کیا۔ یہاں اکبر کے اشارہ سے پنجاب کے امیر ولی شمس الدین خان اتکہ، اس کے بیٹے یوسف محمد خان اور شہاب خان کے داماد حسین خان وغیرہ نے اس کا راستہ روک دیا، موضع کنور پھلور پرگنہ دکھدار میں سخت مقابلہ ہوا[5] خانخاناں کی طرف سے مہدی قاسم خان کے داماد حسین خان نے بڑی مردانگی دکھائی، لیکن زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اسے ولی بیگ اور اس کے بیٹے اسماعیل قلی خان کے ہمراہ بادشاہ کے حضور بھیج دیا گیا۔ خان خاناں یہاں سے شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اس لڑائی میں اس کا

جو کچھ مال واسباب تھا سب کا سب لٹ گیا۔ لوٹ کے اس مال میں ایک مرصع علم بھی تھا جس پر موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اسے خان خاناں نے ایک کروڑ کے خرچ سے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کے مزار پر چڑھاوے کے لیے مشہد مقدس روانہ کرنے کے لیے تیار کرایا تھا۔ اتکہ خان نے مال غنیمت کے ساتھ یہ علم بھی بادشاہ کے پاس بھجوایا۔

اکبر نے پنجاب سے دہلی واپس ہونے کے بعد کابل سے منعم خان کو وکالت کا عہدہ دینے کے لیے بلوایا تھا۔

بیرم خان کی فیاضی

اسی سال خان خاناں نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے مشہور کر دی تھی اور اس کے عوض اس نے شاعر کے پاس ساٹھ ہزار تنکہ روانہ کر کے اس سے پوچھا تھا: ''یہ رقم کم تو نہیں؟'' شاعر نے بطور لطیفہ لکھا کہ کم ہے اور ساٹھ بہت کم ہے۔ خان نے چالیس ہزار تنکہ مزید روانہ کر کے ایک لاکھ پورے کر دیے۔ وہ غزل یہ ہے:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ
وز دست دل بہ راہ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در سر کوہ گشتۂ
بی اختیار سر بہ بیابان نہادۂ

خان خاناں نے اسی طرح باوجود خزانہ خالی ہونے کے رام داس لکھنوی کو ایک مجلس میں ایک لاکھ تنکہ نقد وجنس کی صورت میں بطور انعام دیا تھا۔ رام داس سلیم شاہ کے گویوں میں سے تھا۔ موسیقی میں اسے تان سین ثانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ گویا خلوت وجلوت میں خان خاناں کا ہمدم تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے اپنی آنکھیں سینکا کرتا تھا۔

اسی طرح مجاز خان بدایونی کو خان خاناں کے نام پر ایک قصیدہ لکھنے کے صلے میں ایک لاکھ تنکہ نقد خان خاناں کے خزانہ سے دیے گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے سرہند کی پوری سرکار کا امین بنا دیا گیا تھا۔ مجاز خان کو علم اور نقارہ کا امیرانہ اعزاز تھا اور وہ پہنچے

افغانی امرا کے زمرے میں شامل تھا۔ آخر عمر میں اس نے سپاہ گری ترک کر کے معمولی معاش پر صبر کرلیا اور زہد و عبادت کی روش اختیار کر لی تھی جس قصیدہ پر خان خاناں نے اسے یہ گراں بہا صلہ دیا تھا اس کا مطلع یہ ہے:

چون مہرۂ نگین سما شد فرو بہ آب
پرکار رخانمش بہ زمین داد حل تاب

یہاں خواجہ کلاں بیگ کی یہ بات پوری صادق آتی ہے کہ عالم بالا کی شعر شناسی کا حال بھی کھل گیا۔ بہر حال خان کی ہمت بلند کے سامنے ایک لاکھ بس ایک کے برابر تھے۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں پنجاب پر اتکہ خان کے تقرر کے بعد دربار شاہی سے خواجہ عبدالمجید ہروی کو آصف خان کا خطاب ملا اور وہ دہلی کی حکومت پر فائز ہوا۔ حسین قلی خان کو اس بنا پر کہ اس کا باپ ولی بیگ اور اس کا بھائی اسماعیل قلی خان خان خاناں کے ہمراہ تھے، آصف خان کے سپرد کر دیا گیا اور بادشاہ کی سواری پنجاب کی طرف روانہ ہوئی۔

منعم خان کی وزارت

اسی سفر کے دوران حسب الحکم منعم خان کابل سے تردی بیگ خان کے بھانجے مقیم خان کے ساتھ جس کو بعد میں شجاعت خان کا خطاب ملا تھا، آکر لدھیانہ کے سفر میں حاضر ہوا۔ اسے خان خاناں کا خطاب اور قلمدان وزارت سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اتکہ خان کے فتح پانے اور خان خاناں کے سوالک کی پہاڑی کی طرف فرار ہونے کی خبر بھی اسی سفر میں موصول ہوئی تھی اور بادشاہ نے اسیران جنگ کا معائنہ کر کے ان کو قید خانہ میں بھجوا دیا، ولی بیگ جو بری طرح زخمی ہو گیا تھا قید خانہ ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا اور اس کا سر کاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا، حسین خان کو اس کے سالے ملک محمد خان ولد ملال قاسم خان کے حوالے کر دیا گیا، آخر میں بادشاہ کی نظر عنایت اس پر ہوئی اور اسے پٹیالی کا قصبہ بطور جاگیر عنایت ہوا۔ پٹیالی دریائے گنگا کے کنارے ہے اور امیر خسرو کی جائے پیدائش ہے۔(6)

بیرم خان کی اطاعت

شکست کے بعد خان خانان بیرم خان تلوارہ میں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ تلوارہ شمالی پہاڑی کے دامن میں ایک بلند اور مستحکم مقام ہے اور راجہ گوبند چند کی عمل داری میں ہے۔ شاہی فوج نے بھی تلوارہ پر حملہ کر کے جنگ چھیڑ دی۔ بادشاہی لشکر میں سے سلطان حسین جلائر جو نہایت خوش قامت اور بہادر نوجوان تھا ہلاک ہو گیا۔ لوگ جب مبارکباد دیتے ہوئے اس کا سر خانخانان کے پاس لے گئے تو اس نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا اور اس کی حسن خدمت کو یاد کر کے ہائے ہائے کر کے رونے لگا اور کہا "میری زندگی پر ہزار لعنت کہ میرے نفس کی خاطر ایسے ایسے جوانوں کی زندگی خاک میں مل رہی ہے"۔ اس علاقہ کے ہندوؤں نے خان خانان کو بڑا حوصلہ دلایا، لیکن مسلمانوں کا غم اس کے دل میں ایسا لگا تھا کہ سارے ارادے ترک کر کے اپنی عاقبت کے ڈر سے اپنے قصوروں کا معافی نامہ ایک غلام جمال خان نامی کے ہاتھ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا اور خدمت شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، ملا عبد اللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو اس کو لانے اور دلاسہ دینے کے لیے روانہ کیا گیا۔ دونوں طرف سے قاصد آ جا رہے تھے اور ساتھ ہی حملہ کا بازار بھی گرم تھا۔ منعم خان چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دلیرانہ خان خانان کے مقام پر جا پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جب خان خانان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بادشاہ کے حکم سے تمام امیر اس کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ حسب سابق کورنش بجالا کر اس کی تعظیم کی گئی۔ شہنشاہ نے اس کے قصور(٦) معاف کر دیے اور خاص خلعت اور گھوڑا عطا ہوا۔ منعم خان اسے اپنے ٹھکانہ پر لے گیا اور اس کے لیے تمام ساز و سامان کے ساتھ سراپردہ وغیرہ کا انتظام کر دیا۔ شایان شان سفر خرچ اسے دے کر مکہ معظمہ کو رخصت کر دیا گیا۔ چھوٹے بڑے تمام امیروں اور مصاحبوں نے اس کی مدد کے لیے نقد اور جنس کا چندہ کر کے جسے ترک "چدوغ" کہتے ہیں اس کی خدمت میں پیش کیا۔ حاجی محمد خان سیستانی کو اس کی رہبری کے لیے نامزد کر کے دہلی کی طرف روانہ کیا گیا اور بادشاہ سلامت وہاں سے سیر و شکار کے ارادہ سے حصار فیروزہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چار ربیع الاول 968ھ

1560ء کو شاہانہ سواری دہلی پہنچی، وہاں سے بذریعہ کشتی 2 ربیع الثانی کو دارالخلافہ آگرہ میں یہ قافلہ اترا۔

خار مغیلان

کہتے ہیں خان خانان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناگور کے راستے سے گجرات کی طرف جا رہا تھا ایک جنگل میں ببولوں کے جھنڈ میں سے گزرنا پڑا، وہاں اس کی دستار کانٹوں میں الجھ کر گر پڑی۔ یہ ایک برا شگون تھا اس لیے خان خانان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

بیرم خان کی شہادت

جس وقت خان خانان پٹن سے گجرات پہنچا تو پٹن کے حاکم موسیٰ خان فولاد اور حاجی خان الوری نے اس کی تعظیم و تکریم کی اور اس کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ قیام کے دوران ایک دن خانخاناں سہنس لنگ نامی ایک تالاب کی سیر کے لیے گیا۔ مغرب کی نماز کے لیے جب وہ کشتی سے اترا تو ایک پٹھان مبارک خان نامی کہ خان خانان نے ہندوستان کی فتح کے زمانے میں اس کے باپ کے قتل کا حکم دیا تھا اوباشوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر آیا، بہانہ ملاقات کا تھا اور نیت قتل کی، چنانچہ اس نے اچانک خنجر سے بھرپور وار کیا اور بوڑھا خان اسی جگہ شہید ہو گیا۔ اس کی تاریخ شہادت ہے:

بیرم بہ طواف کعبہ چون بست احرام
در راہ شہید گشت تا یافت کام
تاریخ شہادتش زول پرسیدم
گفتا کہ شہید شد محمد بیرام

خان خانان بڑا رقیق القلب انسان تھا۔ بزرگوں اور مشائخوں کا نہایت احترام کرتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ اللہ رسول کا ذکر رہتا تھا۔ ایک دن سیکری میں وہ ایک گوشہ نشین درویش کی ملاقات کے لیے گیا اور ان سے آیت **"وتعز من تشاء و تذل من تشاء"** کا مطلب پوچھا، چونکہ اس درویش نے تفسیر نہیں پڑھی تھی اس لیے اس کا جواب نہ دیا۔

خان خاناں نے خود آیت کی وضاحت کی۔ ''تو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے قناعت کے ذریعے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے سوال کے ذریعے''

بیرم خان(8) بڑا پابند اوقات تھا، کبھی جماعت اور جمعہ کی نماز قضا نہ ہوئی، لیکن عقائد میں تفضیل کی طرف میلان رکھتا تھا۔ حافظ محمد امین خطیب سے کہا کرتا تھا دوسرے صحابہ کی نسبت حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں تعظیم کے چند کلموں کا اضافہ ہونا چاہیے۔

مالوہ کی فتح

اسی سال 12 رجب کو حاکم مالوہ باز بہادر ولد سزاول خان بڑا لاؤ لشکر اور ہاتھی لے کر ادہم خان اور پیر محمد خان کے مقابلہ پر سارنگ پور سے سات کوس کے فاصلہ پر آیا، یہاں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باز بہادر کو شکست ہوئی۔ اس کا سارا ساز و سامان غنیمت میں آیا اور اس کے حرم کی عورتیں بھی گرفتار ہوگئیں۔

جس دن یہ فتح ہوئی مذکورہ دونوں سردار اپنے خیموں میں بیٹھے ہوئے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے پیش کر کے قتل کر دیا جاتا تھا، اس وقت پیر محمد خان طنز سے فقرے چست کر رہا تھا۔ ''اس مقتول کی گردن کتنی موٹی تھی''۔ ''اوہ اس لاش میں سے تو ڈھیروں خون نکلا''۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خلقت الٰہی کی اساس ہے، اس سنگ دل کی نظر میں اس دن انسان کھیرے ککڑی نظر آ رہے تھے وہ انسانی جان کا اس طرح مذاق اڑا رہا تھا۔ مالوہ کے سید اور مشائخ قرآن اٹھائے ہوئے جان کی سلامتی مانگتے ہوئے آئے۔ ظالم نے ان بے قصوروں کو بھی قتل کرا دیا۔

ادہم خان نے فتح کی ساری روداد شہنشاہ کے پاس لکھ کر روانہ کی اور غنیمت میں ملنے والے چند ہاتھی صادق محمد خان کے ذریعے حضور میں روانہ کر دیے۔ جتنے عمدہ عمدہ ہاتھی تھے اپنے لیے اور باز بہادر کی حرم کی(9) عورتوں اور طوائفوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ بہ نفس نفیس 21 شعبان 968ھ/1560ء کو آگرہ سے سارنگ پور پہنچا اور ادہم خان سے سارا مال(10) وصول کر کے 29 رمضان کو آگرہ واپس آ گیا۔

خان زمان سے بدگمانی

اسی سال عدلی کے بیٹے شیر خان نے جو باپ کے مرنے پر چنہار میں اس کا قائم مقام بنا ہوا تھا ایک بڑی فوج لے کر جونپور پر حملہ کر دیا۔ خان زمان نے ابراہیم خان اوزبک، مجنوں خان قاقشال اور شاہم خان جلایر کی مدد سے اسے شکست دی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس واقعہ کے بعد ہی اکبر کو خان زمان کے متعلق بدگمانی ہوگئی اور وہ خود جونپور کے ارادے سے عازم سفر ہوا۔ جب کالپی پہنچا تو وہاں کے حاکم عبداللہ اوزبک نے بادشاہ کی مہمانی کا شرف حاصل کیا۔ یہاں سے سواری کڑہ کی طرف گئی۔ کڑہ میں خان زمان اور بہادر خان بھی جونپور سے آکر حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے میں عمدہ ہاتھی اور نفیس تحائف پیش کیے۔ بادشاہ نے ان دونوں کو خلعتیں اور گھوڑے دے کر ان کی جاگیروں پر رخصت کر دیا۔

اسی سال 17 ذی الحجہ کو بادشاہ سلامت آگرہ واپس تشریف لے آئے۔

اجمیر کی زیارت

969ھ/ 1551ء میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات عطا کیے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانبھر کے قصبہ میں پہنچا تو انبیر کے حاکم راجہ پہاڑمل اور اس کا بیٹا رائے بھگوان داس حاضر ہوئے۔ راجہ نے اپنی ایک بیٹی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی۔

اکبر نے مرزا شرف الدین حسین کو جس کی جاگیر اجمیر کے علاقے میں تھی، میرٹھ کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ قلعہ اجمیر سے بیس کوس پر تمکل راجپوت کے قبضے میں تھا۔ اس مہم کے انتظام کے بعد اکبر دارالسلطنت واپس ہوگیا۔

میرٹھ کے قلعہ پر چڑھائی

مرزا شرف الدین میرٹھ کے قلعہ پر چڑھائی کر کے محصور کی اس شرط پر جان بخشی کہ وہ

سب قلعہ خالی کرکے نکل جائیں اور مال و اسباب قلعہ ہی میں چھوڑ دیں۔ محصور صلح کی شرائط کے مطابق قلعہ کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن اس کے ایک سپاہی دیوداس نے قلعہ سے نکلتے وقت کچھ لوگوں کی مدد سے سارے مال و اسباب میں آگ لگادی اور شرف الدین کے لشکر پر حملہ کرکے بہت سے آدمیوں کو قتل کردیا۔ آخر خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس کے ساتھ جو دوسو آدمی تھے وہ بھی ہلاک ہوگئے۔ قلعہ، شاہ بداغ خان اور اسکے بیٹے عبد المطلب خان اور دوسرے امیروں کی کوشش سے فتح ہوا۔

باز بہادر کا انجام

جب ادہم خان دربار میں چلا گیا تو مالوہ میں پیر محمد خان حاکم ہوگیا اور وہاں اس نے ایک بڑا لشکر جمع کرکے برہانپور اور بیجا گڑھ کے قلعوں کو فتح کیا۔ نربدا ندی کے دوسرے ساحل تک فوجی کاروائی کرکے اس طرح قتل عام کیا کہ وہ سارا علاقہ بے چراغ ہوگیا۔

باز بہادر شکست کھانے کے بعد اس علاقہ کے کئی اور حاکموں کے ساتھ یہاں سے وہاں پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پیر محمد خان اپنے لشکر سے جدا ہوگیا۔ باز بہادر نے موقع پاکر اس پر حملہ کردیا۔ پیر محمد خان گھبراکر مندو کی طرف بھاگا، دشمن کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے نربدا میں گھوڑے ڈال دیے۔ اس وقت کچھ اونٹ بھی دریا پار کررہے تھے۔ ایک اونٹ بدحواس ہوکر اس کے گھوڑے پر آگرا اور وہ اس کے ساتھ ہی ڈوب کر مرگیا۔ پیر محمد خان کی وفات کے بعد مالوہ پر متعینہ سردار وہاں ٹھہر نہ سکے اور دربار میں واپس چلے آئے حسب الحکم انھیں قید کردیا گیا چند روز بعد انکو رہائی ملی۔

مغل سرداروں کی واپسی کے بعد باز بہادر نے اپنے وطن پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ بعد میں عبد اللہ خان اوزبک نے معین الدین احمد خان فرنخودی کی مدد سے دوبارہ حملہ کرکے اسے پھر مالوہ سے بے دخل کردیا۔ باز بہادر چند روز تو رانا اودے سنگھ کی پناہ میں چتوڑ اور اودے پور میں رہا۔ چند دن اس نے گجرات میں گزارے، آخر مجبور ہوکر دربار شاہی حاضر ہوکر اکبر کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ چند دن اسے قید میں رکھا گیا تھا بعد میں رہا کردیا

گیا۔ لیکن موت سے چھٹکارا کہاں؟ رہائی کے چند دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مالوہ کی مہم کے بعد عبداللہ خان اوزبک باجزیہ کو اور اس کے معاون امیر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے اور معین الدین احمد خان دربار میں حاضر ہوگیا۔

اسی سال خواجہ عبداللہ مروارید (جو ایک مشہور وزیر گزرا ہے) کا پوتا خواجہ محمد صالح صدارت کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اسکو صرف دیوان کے اختیارات حاصل تھے انعامات، اراضی کے عطیات اور امداد و وظائف دینے کا اسے اختیار نہیں دیا گیا تھا۔

سفیر ایران کی آمد

اسی سال شاہ طہماسپ کی طرف سے ایک سفیر سید بیگ ولد معصوم بیگ ہمایوں بادشاہ کی تعزیت کے سلسلے میں شاہی مکتوب لے کر آیا۔ دربار میں اس سفیر کی تعظیم و تکریم کی گئی اور بادشاہ نے اسے سات لاکھ تنکہ انعام دیا اور خلعت اور گھوڑا عطا فرمایا۔ امرا نے بھی اس کی ضیافت کی اور تحفے دیے۔ وہ ہندوستان سے بے شمار تحائف لے کر لوٹا۔

ادہم خان کی بغاوت

بادشاہ نے اتکہ خان کو جس کا لقب اعظم خان تھا، پنجاب سے بلا کر مملکت کا وزیر مطلق بنا دیا تھا۔ ادہم خان کو بادشاہ کے تقرب پر بڑا ناز تھا اور وہ اس بات سے سخت ناراض بھی تھا کہ ماہم انکہ سے وکالت کا عہدہ چھین کر اتکہ خان کو دے دیا گیا۔ اس پر چند حاسد امیروں نے خاص طور سے منعم خان اور شہاب الدین احمد خان نے اسے اتکہ خان کے خلاف اس قدر ورغلایا کہ اس نے غضب ناک ہوکر عین دربار میں اتکہ خان پر حملہ کرکے اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور اسی طرح سے تلوار لے کر حرم شاہی کے دروازہ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ شاہنشاہ بھی تلوار کھینچے ہوئے باہر نکلے اور اس سے پوچھا ''یہ آخر تو نے کیا کیا''؟ اس نے بے باکی سے جواب دیا ''ایک غدار کو میں نے کیفر کردار تک پہنچا دیا''۔ شہنشاہ کے حکم(۱۱) سے ادہم خان کے ہاتھ پیر باندھ کر محل کی چھت پر سے نیچے گرادیا گیا۔ اس کے

جسم میں چونکہ جان باقی رہ گئی تھی اس لیے شہنشاہ نے حکم دیا "اسے دوبارہ گراؤ"۔

ادہم خان کے چالیسویں کا کھانا کھلانے کے بعد اس کی ماں ماہم انگہ(12) بھی بیٹے کی غم میں مر گئی۔ اسی سال میرے والد (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) شیخ ملوک شاہؒ بھی 27 رجب کو آگرہ میں انتقال فرما گئے۔ میں نے ان کی میت بیاور میں لے جا کر دفن کی تھی۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ پنجو سنبھل جن کے ساتھ مرحوم کی بڑی عقیدت و ارادات تھی اسی سال وہ محبوب حقیقی سے جا ملے۔

منعم خان کا فرار اور گرفتاری

منعم خان خانخاناں اور محمد قاسم خان میر بحر اس خوف کے مارے کہ کہیں وہ ادہم خان کو بہکانے کے الزام میں پکڑے نہ جائیں اور دوسری بعض وجوہات کی بنا پر بھی سیر کے بہانے سے کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گئے اور وہاں کے بعض زمینداروں کی مدد سے دو تین سوار ساتھ لے کر روپڑ اور بجوارہ کے راستے پہاڑ کے دامن کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے ان کا ارادہ کابل چلے جانے کا تھا کیونکہ وہاں منعم خان کا لڑکا غنی خان حاکم تھا لیکن جب وہ دوآبہ میں سرت کے پرگنہ پہنچے جو میر محمد منشی کی جاگیر میں تھا تو قاسم علی خان سیستانی نے جو پرگنہ کا شقدار تھا، جنگل میں ان کو دیکھ لیا اور ان کے انداز کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ بھاگے ہوئے ہیں اُس نے وہاں کے اوباشوں کی ایک جمعیت لے کر انھیں گھیر لیا اور دونوں کو باندھ کر سید محمود بارہہ کے آدمیوں کو جو اس علاقہ میں ٹھہرے ہوئے تھے مطلع کیا۔ سید محمود نے اپنے عزیزوں اور لڑکوں کو ان دونوں کے ہمراہ کر کے ان کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ آگرہ بھیج دیا۔ جب ان کے واپس آنے کی خبر ملی تو شاہنشاہ نے افسروں کی ایک جماعت کو ان کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور دوبارہ وکالت کا عہدہ پہلے سے کہیں زیادہ اعزاز کے ساتھ منعم خان کے حوالے کر دیا تا کہ وہ اس ذمہ داری کو شہاب خان اور خواجہ جہان کی مدد سے سرانجام دے۔

گکھڑوں کی شکست

اسی سال خان کلاں میر محمد خان اتکہ نے کمال خان گکھڑ کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج لے کر گکھڑوں کے وطن پر چڑھائی کی اور سخت جنگ کر کے کمال خان کے چچا سلطان آدم کو اسیر کر لیا اس کا لڑکا لشکری کشمیر کی جانب بھاگ گیا لیکن بعد میں گرفتار ہو گیا اور دونوں باپ بیٹے اپنی موت مر گئے۔ خان کلاں وہ سارا علاقہ کمال خان گکھڑ کے حوالے کر کے آگرہ واپس آ گیا۔

ایک روز شاہنشاہ نے ایک بڑا جشن منعقد کیا تھا۔ اس محفل میں خان کلاں میر اتکہ نے ایک قصیدہ جسے وہ اپنے خیال میں بڑا کارنامہ سمجھ رہا تھا، پڑھنا چاہا۔ محفل میں تمام امراء، سردار، اہل علم اور بڑے بڑے شاعر جمع تھے۔ جب خان کلاں نے اپنے قصیدہ کا مطلع اٹھایا اور یہ مصرع پڑھا:

بحمد اللہ کہ دیگر آدم فتح گکھر و کردہ

اچانک اس کا رشتہ دار عبدالملک خان اٹھ کر آگے آیا۔ اس وقت شاہنشاہ پوری توجہ سے اس کا قصیدہ سن رہے تھے، بلکہ یہ مجلس اسی قصیدہ کے لیے منعقد کی گئی تھی اور خان کلاں کو بادشاہ سے بھاری صلے کی امید تھی، عبدالملک خان نے سامنے آ کر بلند آواز سے کہا:

میرے خان ”دیگر آدم، نہیں بلکہ ”دیگر آدمیم“ کہو، کیونکہ دوسرے بہت سے بد نصیب بھی تمہارے ساتھ تھے۔ عبدالملک کی اس اصلاح پر ساری مجلس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خان کلاں نے اپنی پگڑی زمین پر رکھ دی اور فریاد کی۔

”اس بد تمیز مسخرے سے حضور ہی میرا انصاف کریں گے اس نے تو میری ساری محنت خاک میں ملا دی“۔

عبدالملک بڑا پر مذاق آدمی تھا، چنانچہ اس نے اپنے نام کا سجع بھی بڑا مضحکہ خیز بنایا تھا:

عبد را چون با ملک افزون کنی
پس الف لامی درو اندرون کنی

ملا شیری ہندی شاعر نے اپنا مشہور قصیدہ "مدح وقدح" اسی کے نام پر لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

اگر گوار بیاید مقابل تو گریز
کہ صاحبی و مقابل نمی شوی بگوار

مدرسۂ خس

اسی سال مولانا علاؤالدین لاری جنھوں نے شرح "عقائد نسفی" پر حاشیے لکھے ہیں، خان زماں کے پاس جونپور گئے۔ یہاں انھوں نے ایک جھونپڑ ڈال کر مدرسہ قائم کیا اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ اس مدرسہ کی تاریخ بناء ہے:

"مدرسۂ خس"

بعد میں وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کے لیے کمر باندھ لی۔

کابل کے ہنگامے

اسی سال کابل کے حالات بھی خراب ہوگئے اور ایک مختصر سی مدت میں کابل پر کئی ایک حاکموں کا تقرر و تبادلہ ہوگیا۔ منعم خان جب کابل سے ہندوستان آیا تھا تو اس نے حیدر خان آختہ بیگی کو وہاں اپنا نائب بنا دیا تھا، لیکن اس کی بدسلوکی کی وجہ سے اس کی جگہ اپنے بیٹے غنی خان کو قائم مقام بنادیا، وہ بھی نالائقی میں حیدر خان سے کچھ کم نہیں تھا چنانچہ اس نے کابل کے ایک صاحب اقتدار میر تولک خان قوچین کو بے سبب ہی قید کر دیا۔ بعد میں تولک خان نے قابو پا کر غنی خان کو قید میں ڈال دیا۔ غنی خان بڑے وعدے وعید کے بعد اس قید سے رہائی پائی، پھر اس نے تولک خان سے بدعہدی کی اور اس پر حملہ کر دیا۔ تولک خان نے اس سے مقابلہ نہ کیا اور اپنی جاگیر چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا۔ ہمایوں بادشاہ کی بیوی جوبک بیگم نے جو ہمایوں کے دس سالہ لڑکے مرزا حکیم بیگ کی والدہ تھی، شاہ ولی بیگ اتکہ اور منعم خان کے بھائی فضائل بیگ (مرزا کامران نے اسے اندھا کر دیا تھا اس

لیے اس کو کور کہتے تھے) اور اس کے لڑکے ابو الفتح بیگ کی مدد سے کابل کے قلعہ کے دروازے بند کر لیے اور غنی خان کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ غنی خان بھی مجبور ہو کر ہندوستان آ گیا چونکہ باپ (منعم خان) اس سے ناراض تھا اس لیے یہاں اس کی سرخروئی کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا اور وہ جونپور میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسی حال میں وہ اپنے دن پورے کر گیا۔

فضائل بیگ مذکور تو بیگم کی جانب اور ابو الفتح بیگ باپ کی جانب سے کابل کے نائب بن کر گئے اور وہاں انھوں نے اپنے لیے اچھی جاگیریں مخصوص کر لیں اور مرزا کی عمل داری میں کمزور جاگیریں چھوڑ دیں۔ شاہ ولی اتکہ کو ان کی یہ کارروائی بڑی ناگوار گزری اس نے علی محمد اسپ کی مدد سے بیگم کے اشارے پر ایک رات ابو الفتح بیگ کو جب کہ وہ نشے میں چور تھا، قتل کر دیا۔ اس کا باپ اپنا سارا مال متاع لے کر ہزارہ کی طرف کوچ کر گیا میرزا کے آدمیوں نے اس کا پیچھا کر کے اسکو تہ تیغ کر دیا۔

جوبک بیگم کا اقتدار

شاہ ولی بیگ نے بیگم کی تائید و مدد سے کابل کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا خطاب عادل شاہ رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اس کی مرمت کے لیے شہنشاہ نے منعم خان کو کابل کی حکومت اور میرزا حکیم بیگ کی اتالیقی پر مقرر کر کے چند امراء کے ساتھ روانہ کیا۔ منعم خان کے مقابلے پر جوبک بیگم میرزا کو ہمراہ لے کر کابل کے پورے لشکر کے ساتھ جلال آباد پہنچ گئی۔ بیگم کے مقابلہ میں منعم خان اور اس کے تمام مدد گار امیروں محمد قلی خان برلاس، شہاب خاں کے بھائی حسن خان وغیرہ کو پہلے ہی حملہ میں بری طرح شکست کھانی پڑی۔ یہ لوگ سارا لاؤ لشکر تباہ کر کے بڑی بری حالت میں بادشاہ کی خدمت میں واپس آئے۔ اس فتح کے بعد بیگم(13) نے شاہ ولی کو غداری کے الزام میں گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

شاہ ابو المعالی کی بغاوت

اسی سال شاہ ابو المعالی مکہ سے واپس آیا، اسی زمانہ میں میرزا اشرف الدین حسین آگرہ سے بھاگ گیا تھا اس کے تعاقب میں بادشاہ نے حسین قلی خان اور صادق محمد خان وغیرہ کو مقرر کیا تھا۔ جب شاہ ابو المعالی راستے سے وہاں پہنچا تو میرزا اشرف الدین کے بہکانے سے اس نے بھی بغاوت کا رخ اختیار کر لیا اور فتنہ و فساد مچاتے ہوئے ہر جگہ لوٹ مار کرنے لگا۔ حسین قلی خان کے رشتہ دار اسماعیل قلی خان احمد بیگ اور اسکندر بیگ اسکا پیچھا کرنے لگے۔ اس تاخت و تاراج میں شاہ ابوالمعالی نے نارنول کے قلعہ کے سرکاری خزانے کو لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔

محمد صادق خان اور اسماعیل قلی خان نے حملہ کر کے نارنول کے علاقے میں ابوالمعالی کے بھائی خان زادہ کو جسے شاہ سوندان بھی کہتے تھے، گرفتار کر لیا۔ بھائی کی گرفتاری سے ابو المعالی بے چارہ ہو گیا اور مجبوراً اس نے ہندوستان کو چھوڑ کر کابل کی راہ لی۔ پنجاب میں اس نے اسکندر بیگ اور احمد بیگ کو جو اپنے ساتھی امیروں سے جدا ہو گئے تھے۔ ان کے ملازموں سے سازش کر کے گھیر لیا اور اسے قتل کر دیا۔ ماہ جوچک بیگم والدۂ میرزا محمد حکیم کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے مرحوم ہمایوں بادشاہ کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا اظہار کیا تھا اور اس کے سرنامے پر یہ شعر لکھا تھا:

ما بدین در نہ پی حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ این جا بہ پناہ آمدہ ایم

جوچک بیگم نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ابو المعالی کا کابل پر قبضہ

جب شاہ ابو المعالی وہاں پہنچا تو بیگم نے اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح بھی کر دیا اور کابل کا سارا نظم و نسق ابو المعالی کے ہاتھ میں آ گیا۔ کچھ دن بعد ہی ابو المعالی نے بعض شر

پسندوں جیسے شوکون ولد قراچہ خان وغیرہ کے بہکانے سے بیچاری بیگم کو قتل کرا دیا۔ حیدر قاسم کوہ بر کو بھی جو شاہ ولی بیگ کے بعد کچھ عرصے تک کابل کا وزیر مطلق رہا تھا شہید کر دیا اور اس کے بھائی محمد قاسم کوہ بر کو قید میں ڈال دیا۔

شاہ ابو المعالی کے اس خون خرابے پر لوگ بگڑ گئے اور ایک بڑی جماعت بیگم کے انتقام کے لیے مقابلہ پر آ گئی۔ کابل کے قلعہ میں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ ان لوگوں نے محمد قاسم کو قید خانہ سے نکال لیا۔ محمد قاسم یہاں سے نکل کر بدخشاں چلا گیا اور وہاں مرزا سلیمان کو شاہ ابو المعالی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے آمادہ کیا۔ میرزا محمد حکیم نے اپنے قاصد بھیج کر اس کو کابل آنے کی دعوت دی۔

مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت

میرزا شرف الدین حسین نے بادشاہ کا بخوبی اعتماد حاصل کر لیا تھا اور ناگور سے دار الخلافہ آگرہ آ گیا تھا۔ میرزا کا خاندانی تعلق چار واسطوں سے خواجہ عبید اللہ احرار سے ملتا ہے شرف الدین حسین ولد خواجہ معین الدین ولد خواجہ خاوند ولد خواجہ یحییٰ ولد خواجہ احرار۔ آگرہ میں رہتے ہوئے ان دنوں جب کہ اس کے والد مکہ معظمہ کی زیارت سے واپس آ چکے تھے۔ شرف الدین حاسدوں کے بہکاوے میں آ کر بغیر کسی ظاہری وجہ کے بادشاہ کی طرف سے بدگمان ہو گیا اور ناگور واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کے تعاقب میں صادق محمد خان اور ایک جمعیت کو حسین قلی خان کے ہمراہ کر کے روانہ کیا اور انھیں ہدایت کی کہ پہلے تو اسے تسلی اور دلاسہ دے کر سیدھی راہ پر لائیں اور اگر نہ مانے تو کام تمام کر دو۔ مرزا شرف الدین ناگور جاتے ہوئے اجمیر کا قلعہ ترخان دیوانہ کے حوالہ کرتا گیا، لیکن دیوانہ بھی قلعہ خالی کر کے اس کے پیچھے چلا گیا۔ جالور کے مقام پر مرزا شرف الدین حسین کی شاہ ابو المعالی سے ملاقات ہوئی تھی، ان دونوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہ ابوالمعالی تو حسین قلی خان کی فوج پر جو حاجی پور میں رکی ہوئی تھی حملہ کرے گا، اس کے آنے تک مرزا شرف الدین اسی جگہ شاہی فوج کو پریشان کرتا رہے گا۔ اس منصوبے پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا

کیونکہ جب شاہ ابو المعالی کو خبر ملی کہ صادق محمد خان اور دوسرے امراء اس کے مقابلے پر بڑی فوج لے کر آ رہے ہیں تو وہ اس قرار داد کو چھوڑ کر پہلے نارنول گیا اور وہاں کے حاکم یعنی گیسو شقدار کو گرفتار کر کے اس سے کچھ روپیہ وصول کیا۔ پھر سیدھا کابل کی طرف نکل گیا۔ شاہی لشکر سے احمد بیگ، اسکندر بیگ، صادق محمد خان اور اسمٰعیل قلی خان الگ ہو کر اس کا پیچھا کرنے لگے۔

احمد بیگ اور اسکندر بیگ نے مرزا شرف الدین کے چند آدمیوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا اور ان پر کافی بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ان ملازموں نے ایک شخص زمانہ قلی نامی کے ذریعے شاہ ابو المعالی کو یہ پیغام بھیجا کہ تم فلاں جگہ رکے رہو، جس وقت یہ دونوں سردار وہاں پہنچیں گے ہم ان کا کام تمام کر دیں گے۔ اس سازش کے مطابق جب یہ دونوں مقررہ مقام سے گزرے تو شاہ ابو المعالی نے اچانک گھات سے نکل کر ان پر حملہ کر دیا اور ان مفسد نوکروں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مقتول سرداروں کے باقی ساتھی بھاگ گئے۔

دہلی میں ہلچل

جب اس واقعے کی تفصیلات اکبر کو معلوم ہوئیں تو وہ اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے خود دہلی آیا۔ بادشاہ کی آمد کے بعد دہلی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد بادشاہ کے دل میں آیا کہ وہ دہلی کے امرا اور شرفاء کی بیٹیوں سے نکاح کر لے، چنانچہ بادشاہی خواجہ سرا اور مشاطہ عورتیں لڑکیوں کے انتخاب کے لیے دہلی کے گھرانوں میں آنے جانے لگیں اور دہلی والوں میں بڑی کھلبلی سی مچ گئی۔ اکبر کو اس بات پر شیخ بدھ اور آبرو کے امرائے بہرہ نے آمادہ کیا تھا۔ بادشاہ کا دل دہلی کی ایک عورت پر آ گیا تھا۔ وہ عورت عبد الواسع کی زوجہ تھی۔ بادشاہ کی خواہش اور مطالبے پر عبد الواسع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اسے شاہی حرم سرا میں داخل کر دیا گیا اور بیچارہ عبد الواسع اس شرم کے مارے دہلی چھوڑ کر دکن میں بیدر جا کر بس گیا۔

قاتلانہ حملہ

دہلی کے قیام کے دوران ایک دن بادشاہ سیر کرتے ہوئے بیگم کے مدرسہ کی طرف جا نکلا، مدرسہ کی چھت پر سے فولاد نامی ایک لڑکے نے جو مرزا شرف الدین حسین کا غلام تھا، بادشاہ کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑ دیا، نشانہ چوک گیا اور تیر بادشاہ کے جسم کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ خوش قسمتی سے بادشاہ کی جان بچ گئی۔ امراء نے مجرم کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کرنے اور مقدمہ چلانے کی رائے دی تا کہ ان سب لوگوں کا پتہ چل جائے جو اس قاتلانہ حملہ کی سازش میں شریک ہیں، لیکن بادشاہ نے اس بات کو قبول نہ کیا اور اس لڑکے کو اسی وقت قتل کرا دیا وہاں سے سوار ہو کر قلعہ دین پناہ میں آ کر ٹھہر گیا۔ طبیبوں کے علاج سے چند دن میں ہی وہ زخم اچھا ہو گیا۔ صحت پانے کے بعد بادشاہ دہلی سے لوٹ کر 970ھ/1562 میں آگرہ واپس آ گیا۔

مرزا سلیمان کی کابل پر فوجی کاروائی

اسی سال شاہ ابو المعالی کا معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ محمد قاسم کوہ بر کی تحریک پر مرزا سلیمان نے بدخشاں سے کابل پر فوجی کاروائی کی۔ ابو المعالی میرزا حکیم کو ساتھ لیکر مقابلہ کے لیے آیا۔ دونوں میں یہ لڑائی غوربند کے کنارے پر ہوئی۔ سخت مقابلہ کے بعد شاہ ابو المعالی کی فوج کا ایک پہلو پسپا ہونے لگا۔ اس محاذ کو سنبھالنے کے لیے ابو المعالی خود اس طرف روانہ ہوا اور سلیمان مرزا کے مقابلہ پر مرزا محمد حکیم کو چھوڑ گیا۔ اس کے پیٹھ پھیرتے ہی مرزا محمد حکیم نے اپنے خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر دریا پار کیا اور سلیمان مرزا سے جا کر مل گیا۔ اس صورت میں ابو المعالی کے قدم اکھڑ گئے، وہ میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہو گیا لیکن سلیمان مرزا کے آدمیوں نے اس کا پیچھا کر کے جاریکاروں کے قصبہ میں اسے گرفتار کر لیا۔ کابل میں سلیمان مرزا کے سامنے اسے لایا گیا۔ سلیمان مرزا نے اسے اسی طرح مرزا محمد حکیم کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ نے اسی وقت اسے پھانسی پر چڑھا کر اپنی ماں کے قتل کا انتقام لے لیا۔ یہ واقعہ 17 ماہ رمضان 970ھ/1562ء میں پیش آیا۔

ان واقعات کے بعد سلیمان مرزا نے اپنی بیٹی کا عقد مرزا محمد حکیم سے کر دیا اور اپنے ایک معتمد ملازم امید علی کو اس کا وکیل مقرر کر کے بدخشاں واپس چلا گیا۔

چنار کے قلعہ پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خان نے چنار کا قلعہ ایک دوسرے غلام فتو نامی کے سپرد کر دیا۔ فتو نے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بادشاہ کے دربار میں عریضہ روانہ کیا، جس کے جواب میں بادشاہ نے فتو کے پیر شیخ محمد غوث اور آصف خان خواجہ عبدالحمید ہروی کو فتو کے پاس روانہ کیا ان لوگوں نے شرائط صلح طے کر کے فتو سے قلعہ کا قبضہ لے لیا اور قلعہ داری حسن خان ترکمان کو دے دی۔ فتو کو اپنے ہمراہ دربار شاہی میں لے آئے۔ یہاں اس نے بڑی عزت اور مرتبہ پایا۔ اسی دوران میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہوگیا۔

اسی سال میرے نانا (صاحب منتخب التواریخ) مخدوم اشرف نے 20 رمضان کو رحلت کی۔

خواجہ اور راجہ کی نوک جھونک

971ھ/ 1563ء خواجہ مظفر علی تربتی کو خان کا خطاب اور وزارت کا عہدہ ملا۔ اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ ''ظالم'' ہے۔ خواجہ کی راجہ ٹوڈرمل سے نہ نبھ سکی ان دونوں کے درمیان ذرا ذرا سی بات پر ہر روز ہی جھگڑا رہتا تھا۔ کسی ظریف نے ان دونوں کے متعلق اس ضرب المثل کو

سگ کاشی بہ از صفاہانی   گرچہ صد بار سگ زکاشی بہ

اس طرح بدل کر کہا ہے:

سگ راجہ بہ از مظفر خان   گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ

امرائے دربار نے راجہ ٹوڈرمل کے خلاف محاذ سا بنا لیا اور انھوں نے بادشاہ سے اس کی شکایتیں کیں۔ اکبر نے جواب دیا ''تم سب اپنی اپنی جاگیروں میں ہندوؤں کو ملازم رکھتے

ہو، یہ ہماری سرکار کا بندہ ہے، پھر کیوں ناراض ہوتے ہو؟''
ایک شخص نے راجہ کی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

آنکہ شد کار ہندو از و مختل
راجۂ راجہاست ٹوڈرمل

اسی سال بادشاہ نے قاضی لال کو جو بڑا ظریف آدمی تھا کسی جرم میں برن سے طلب کر کے قتل کرادیا تھا۔

رانی درگاوتی

اسی سال عدلی کے ایک بڑے امیر غازی سور نے بغاوت کی۔ یہ شخص کئی بار بادشاہی دربار میں حاضر ہوا اور ہر مرتبہ سرکش ہو کر بھاگ گیا، اس مرتبہ اس نے کترہ کے علاقے میں اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی اور آصف خان پر حملہ کر دیا۔ آصف خان نے اسے شکست دی وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس فتح سے آصف خان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا اور اس نے قوت حاصل کر کے کترہ اور کنخلہ کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ اس علاقہ میں اس وقت ستر ہزار گاؤں آباد تھے اور اس کا صدر مقام قلعہ چوڑا گڑھ تھا۔ وہاں کی رانی بڑی خوبصورت اور حسین عورت تھی اس کا نام درگاوتی تھا۔ آصف خان کے مقابلہ پر رانی بیس ہزار سوار پیادے اور سات سو جنگی ہاتھی لے کر آئی۔ فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی، آخر ایک محاذ پر رانی تیر لگنے سے بری طرح زخمی ہوئی۔ اپنی ناموس کے خیال سے اس نے فیل بان کو حکم دیا کہ وہ اسے قتل کر دے، فیل بان نے ایک خنجر مار کر اس کا کام تمام کر دیا، لیکن حملہ آوروں میں سے ایک اوباش سپاہی نے رانی کے لاشہ سے ہی اپنی ہوس نکالی۔ رانی کو شکست دینے کے بعد آصف خان نے چوڑا گڑھ پر حملہ کر دیا، وہاں رانی کے لڑکے سے کچھ مقابلہ ہوا لیکن وہ مارا گیا۔ آصف خان کو مال غنیمت میں اتنا خزانہ ملا جو شمار سے باہر تھا۔ اسی مال کا غرور تھا کہ آصف خان میں بڑی نخوت پیدا ہوگئی لیکن جلدی ہی اس کا غرور خاک میں مل گیا۔

ہاتھیوں کا شکار

اسی سال 12 ذی قعدہ کو عین موسم برسات میں بادشاہ نے ہاتھیوں کے شکار کے ارادہ سے نرور کی طرف کوچ کیا اور اس شکار میں اس نے ہاتھیوں کو گرانے اور پکڑنے کے لیے چند نئے طریقے ایجاد کیے۔ نرور سے شاہی سواری سارنگ پور ہوتی ہوئی مندو کے علاقے میں پہنچی۔ عبد اللہ خان اوزبک اپنے بعض جرائم کی وجہ سے خوف زدہ تھا اس لیے وہ مندو سے بھاگ کر گجرات چلا گیا۔ مقیم خان نے جس کو اس مہم میں شجاعت خان کا خطاب ملا تھا اوزبک کو جا کر بہت کچھ سمجھایا اور اسے دلاسہ دیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ بادشاہی ہراول سے اس نے کچھ مقابلہ بھی کیا۔ جب اکبر قریب پہنچ گیا تو وہ اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو چھوڑ کر چند آدمیوں کے ساتھ گجرات میں چنگیز خان کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ کے آدمی گجرات کی حدود تک عبد اللہ خان کا پیچھا کرتے رہے اور اس کے حرم اور ہاتھیوں وغیرہ کو پکڑ لائے۔ جو بچ گئے انھیں جاٹوں نے دھر لیا۔

گجرات کا حاکم چنگیز خان

چنگیز خان سلطان محمود گجراتی کا غلام تھا۔ سلطان کے مرنے کے بعد گجرات کا حاکم بن گیا تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس کے عہد میں گجرات ایسا آباد تھا کہ پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ علم وفضل کا وہاں بڑا دور دورہ تھا۔ جو بے سہارا بھی خان کا سپاہی بن جاتا تھا وہ ہر طرح سے خوشحال ہو جاتا تھا۔ چنگیز خان بڑا فیاض شخص تھا، وہ ہر روز اپنے پہننے کے پانچ چھ جوڑے لوگوں میں تقسیم کرا دیتا تھا اور اس کا ہر جوڑا پچاس، ستر یا اسی اشرفی سے کم دام کا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی سخاوت کا ایک معمولی واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اپنے غلاموں کے ساتھ سیر کر رہا تھا، عبد اللہ خان اوزبک بھی اس کے ساتھ تھا، اتفاق سے اسی وقت نقدی اور اسباب سے بھری ہوئی دو تین کشتیاں اس کے نذرانے میں پیش کی گئیں، اس نے اسی وقت وہ کشتیاں عبد اللہ خان کو بخش دیں۔

شاہ عارف ایک عامل، جنوں کی تسخیر کے عمل میں بہت مشہور تھا۔ میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ وہ لوگوں میں خزانے کے خزانے لٹایا کرتا تھا۔ یہ ساری دولت اسے گجرات ہی سے ملی تھی کیوں کہ اس کی اشرفیوں پر بھی چنگیز خان کا ہی سکہ کندہ تھا۔

اسی سفر کے دوران برہان پور کے میران مبارک شاہ نے قاصد بھیج کر اطاعت کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے اپنے خواجہ سرا اعتماد خان کو ان قاصدوں کے ہمراہ بھیجا اور وہ جا کر میران شاہ کے بیٹے کو بڑے تحفوں اور نذرانوں سمیت اپنے ساتھ لے آیا۔

اسی سال دکن کے ایک نامی امیر مقرب خان نے بھی آکر اطاعت قبول کی۔

محرم 972ھ/1554ء میں بادشاہ نے مندو سے قصبۂ ناچہ کا رخ کیا اور اس علاقہ کی حکومت قرا بہادر خان کو عطا کی۔ یہاں سے شکار کھیلتے ہوئے اجین، سارنگ پور اور گوالیار کے راستے سے بادشاہ 3 ربیع الاول کو آگرہ واپس آگیا۔

اسی سال محل شاہی میں کسی حرم کے بطن سے حسن اور حسین نامی دو توام لڑکے پیدا ہوئے لیکن ایک مہینہ زندہ رہ کر دونوں مر گئے۔

نگر چین نامی شہر کی تعمیر

اکبر بادشاہ نے شہر نگر چین کو اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی۔ ابو الفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ (یعنی مصنف منتخب التواریخ) سے لکھوائی تھیں اب اس شہر اور اسکی عمارتوں کا کوئی نشان تک نہیں رہا۔

صدر الصدور کا عہدہ

اسی سال یا سال گذشتہ بادشاہ نے اندری کرنال کے قصبہ سے شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ[14] کے پوتے شیخ عبد النبی محدث کو بلا کر صدر الصدور بنایا اور انھیں یہ اجازت دی کہ مظفر خان کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں۔ چند دن بعد ہی وہ مستقل طور پر صدر الصدور ہو گئے۔ شروع شروع میں انھوں نے لوگوں کو اس قدر انعامات اور

روزینے عطا کیے کہ اگر سابقہ بادشاہوں کے تمام عطیوں کو بھی جمع کیا جائے تو اس کے برابر نہ ہوں، بعد میں ان کا طرز عمل بالکل ہی برعکس ہو گیا۔

اسی سال خواجہ معظم سے جو رشتے میں بادشاہ کا خالو ہوتا تھا بعض نامناسب حرکتیں سرزد ہوئیں۔ اکبر اسے نصیحت کرنے اور ان باتوں سے منع کرنے کے لیے ان کے گھر گیا لیکن وہ بادشاہ کے آنے کی خبر سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ اکبر نے اسے گرفتار کر کے سزا دی۔ پانی میں غوطے دلائے اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں وہ مر گیا۔

کابل پر تیسرا حملہ

اسی سال تیسری مرتبہ مرزا سلیمان نے کابل کا رخ کیا۔ اس مرتبہ اس کے یہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ شاہ ابوالمعالی کے سدباب اور میرزا محمد حکیم کو حاکم بنانے کے بعد واپس ہو رہا تھا تو اس نے کابل کے اکثر علاقے اپنے لشکریوں میں بطور جاگیر تقسیم کر دیے تھے۔ اس کے آدمیوں اور مرزا کے درمیان ان بن ہو گئی اور مرزا نے بدخشانی امیروں کو کابل سے بے دخل کر دیا اس کا انتقام لینے کے لیے مرزا سلیمان نے ایک بھاری لشکر لے کر کابل پر چڑھائی کر دی۔ مرزا محمد حکیم میں اس سے مقابلہ کی قوت نہ تھی، اس لیے وہ باقی قاقشال اور چند معتمد سرداروں کو کابل میں چھوڑ کر جلال آباد چلا گیا۔

جب مرزا سلیمان نے اس کا پیچھا کیا تو وہ جلال آباد میں نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے دریائے نیلاب کے کنارے پہنچ کر اس نے اکبر بادشاہ کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا۔ مرزا سلیمان نے جلال آباد میں اپنے ایک سردار قنبر نامی کو تھوڑی سی فوج دے کر رکوا دیا اور خود پشاور سے کابل واپس چلا گیا۔ اکبر کے حکم کے بموجب پنجاب کے تمام امیر جیسے محمد قلی خان برلاس، اتکہ خان اپنی تمام جمعیت سمیت اور ملا قاسم خان، کمال خاں گکھر وغیرہ مرزا محمد حکیم کی مدد پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے جلال آباد پر حملہ کر کے قنبر کو تین سو آدمیوں سمیت تہ تیغ کر دیا اور قنبر کا سر فتح کی خوشخبری کے ساتھ کابل میں باقی قاقشال کے پاس

بھیج دیا۔ اب مرزا سلیمان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ بدخشاں کی طرف بھاگ گیا اور مرزا حکیم فاتحانہ کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بادشاہ نے اس کی اتالیقی کے لیے خان کلاں کو مقرر کیا۔ وہ تو وہاں رہ گیا اور دوسرے امرائے لشکر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

خواجہ حسن نقشبندی

کچھ عرصہ بعد مرزا محمد حکیم نے اپنی بیوہ بہن کو جو شاہ ابو المعالی کے نکاح میں تھی، خان کلاں سے مشورہ کیے بغیر خواجہ نقشبندی کی اولاد میں سے خواجہ حسن نقشبندی کے نکاح میں دے دیا۔ خواجہ حسن کا مرتبہ اس رشتہ کی وجہ سے بڑھ گیا اور وہ کابل کا وکیل مطلق بن گیا۔ تمام امور سلطنت اس کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ اس کے دور حکومت پر ظریفوں نے یہ پھبتی کسی ہے:

گر خواجۂ ما خواجہ حسن خواہد بود
مارا نہ جوال دلی رسن خواہد بود

خواجہ حسن کے اثر ورسوخ کی وجہ سے خان کلاں کے ہاتھ بندھ گئے اور وہ معطل ہو کر رہ گیا۔ یہ صورت حال جب ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ لاہور چلا آیا اور کابل کے سارے حالات بارگاہ شاہی میں لکھ کر روانہ کر دیے۔

شیخ الاسلام فتح پوری

اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو 971ھ/1563ء میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے، ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس کی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہوگی آمد پر میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور انکے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ پہلی تاریخ یہ ہے:

شیخ الاسلام مقتدای انام
رفع اللہ قدرہ السامی

از مدینہ چو سوی ہند آمد
آن ہدایت پناہی نامی
ہند از مقدم ہمایونش
یافت از سر بہجت فر جای
گیر حرفی و ترک کن حرفی
بہر سالش ز شیخ الاسلامی

دوسری تاریخ ہے:

شیخ اسلام ولی کامل　　آن مسیحانفس و خضر قدم
لامع از جبہہ او سر ازل　　طالع از چہرۂ او نورقدم
از مدینہ چوسوی ہندوستان　　آن مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفی و مشمر حرفی　　بہر تاریخ زخیر المقدم

جس خانقاہ کا ذکر کیا گیا، وہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

انھی دنوں آگرہ میں بنگالی محل اس کے علاوہ ایک اور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس تعمیر کے سلسلے میں قاسم ارسلان نے یہ تاریخ کہی ہے:

چون ازپی عشرت شد زیبا منظر　　فرمود بنا در خانہ فیض اثر
تاریخ یکی از عشرت آمد بیرون　　شد خانہ بادشاہ تاریخ دگر

بادشاہ سلامت نے 982ھ/ 1574ء میں ہاتھیوں کے شکار(15) کے لیے نرور اور کرہرہ کا ارادہ کیا اور وہاں شکاریوں کو ہاتھی پکڑنے کے لیے مقرر کر کے شاہانہ سواری گوالیار پہنچ گئی۔ گوالیار میں گرمی کی وجہ سے بادشاہ کو بخار آ گیا۔ جب بادشاہ صحت یاب ہوئے تو دارالخلافہ لوٹ آئے۔

آگرہ کے قلعہ کی تعمیر

اکبر نے اسی سال آگرہ کے قلعہ کا ارادہ کیا اور وہاں کے خشتی قلعہ کو ڈھا کر سنگین قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ قلعہ کی تعمیر کے اخراجات کے لیے بادشاہ کے حکم سے فی جریب تین سیر

غلہ کا محصول لگایا گیا۔ یہ محصول سارے ملک میں امراء اور جاگیرداروں سے تحصیل کے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہوگیا، اس کی دیوار کا عرض دس گز اور بلندی چالیس گز ہے۔ فصیل کے گرد جو گہری خندق ہے اس کے دونوں اطراف پتھر اور چونے کے پسے ہوئے گارے سے بنا ہوا ہے۔ اس خندق کا عرض بیس گز اور پانی کی سطح تک گہرائی دس گز ہے۔ خندق میں دریائے جمنا سے پانی لایا گیا ہے۔ قلعہ ہر لحاظ سے ایسا ہے کہ دنیا میں اس کا ثانی نہ ہو۔ اس کے دروازے کی تاریخ شیخ فیضی نے "بنائی در بہشت" کہی ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ جب قلعہ مکمل ہوگیا تو اس میں ہندوستان کی تمام مالیات کا صدر خزانہ قائم کیا گیا اسی مناسبت سے یہ تاریخ نکالی گئی۔

"شد بنائی قلعہ بہرزر"

جو روپیہ اس قلعہ (16) میں پڑا ہوا ہے نہ معلوم کب اپنی بربادی کی داستان سنائے وہ اپنے زبان سے حال اس طرح بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ "اخرجت الارض القالہا"

زراز بہر خوردن بود ای پسر
زبہر نہادن چہ سنگ و چہ زر

اوزبک سرداروں کی بغاوت

اسی سال خان زمان، ابراہیم خان اور اسکندر خان اوزبک نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا قصہ یہ ہے کہ عبداللہ خان اوزبک کی سرکشی کی وجہ سے اکبر تمام اوزبکوں کی طرف سے بدگمان ہوگیا تھا۔ سکندر خان اوزبک اودھ کا جاگیردار تھا۔ اکبر نے زور سے اشرف خان میر منشی کو بلا کر سکندر خان کو لانے کے لیے اودھ روانہ کیا۔ ابراہیم خان اوزبک تمام اوزبکوں کا سردار، جاگیردار اور حاکم بھی تھا، اودھ پہنچنے کے بعد تمام اوزبک سرداروں نے اکٹھا ہو کر مشورہ کیا اور سب نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر کے اشرف خاں کو قید کر لیا اور خود جونپور میں خان زمان کے پاس چلے گئے۔

اوزبکوں نے دو مقامات سے بغاوت شروع کی۔ لکھنؤ میں بغاوت کی ابتدا اسکندر خان اور ابراہیم خان کی سرکردگی میں ہوئی اور کڑہ مانک پور میں بغاوت کے سرگروہ خان زمان اور بہادر خان تھے۔ کڑہ پر باغیوں نے شاہم خان جلائیر اور شاہ بداغ خان پر حملہ کر کے شکست دے دی اور یہ دونوں نیم کہار کے قلعہ میں بند ہو گئے۔ محمد امین دیوانہ اسی بغاوت میں باغیوں کے ساتھ شہید ہو گیا۔ مجنون خان قاقشال بھی باغیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور وہ مانک پور کے قلعہ میں بند ہو گیا اور آصف خان کڑہ اور کنتلہ کا علاقہ ایک جمعیت کی حفاظت میں دے کر کافی بڑے خزانے اور بھاری لشکر کے ساتھ مجنون خان کی مدد کے لیے پہنچ گیا اور خزانے کا منھ کھول دیا اس نے لشکریوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے لشکر میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے خان زمان کے مقابلہ میں ایک مضبوط محاذ بنا لیا اور بارگاہ شاہی میں عریضے روانہ کیے، ثانی خان نے اپنے عریضے میں یہ شعر لکھا تھا:

ای شہسوار معرکہ آرائی روز رزم
از دست رفت معرکہ پا در رکاب کن

باغیوں پر اکبر کی فوجی کاروائی

جس وقت بادشاہ سلامت مالوہ کے سفر سے لوٹے تو انھیں اس بغاوت کی اطلاع ملی بادشاہ نے اسی وقت منعم خان خانخاناں کو آگے روانہ کر دیا تاکہ وہ دریائے گنگا کو قنوج کے گھاٹ سے پار کر کے باغیوں کے مقابلہ میں صف آرائی کرے۔ اس کی روانگی کے بعد اکبر ماہ شوال 970ھ/1562ء میں میدان جنگ کے لیے سوار ہوا۔ جب سواری قنوج پہنچی تو قیا خان گنگ جو باغیوں کے ساتھ ہو گیا تھا خانخاناں کی سفارش پر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے اس کے جرم معاف کر دیے، وہاں سے شاہی لشکر حملہ آور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا۔ سکندر خان کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ لڑے بغیر پسپا ہو گیا نیز خان زمان اور بہادر خان سے جا کر مل گیا۔ یہ سب لوگ آصف خان اور مجنون خان کے مقابلہ کو ترک کر کے جونپور

کی طرف فرار ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ زربن ندی کو پار کر کے خیموں میں رہنے لگے۔

جون پور میں چھاؤنی

ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے شاہی لشکر سے یوسف محمد خان ولد اتکہ خان کو نامزد کیا گیا اس کے پیچھے بادشاہ نے بھی کوچ کیا اور جون پور کے سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ اسی جگہ آصف خان، مجنون خان کے ہمراہ پانچ ہزار تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ لشکر میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ جمعہ کے دن 975ھ/1562ء میں اکبر جونپور کے قلعہ میں داخل ہوا۔ آصف خان کو لشکر کی کمان دے کر باغیوں کے مقابلہ پر رخصت کیا۔ اس نے زربن کے راستہ پر خان زمان کے مقابل اپنا کیمپ لگا دیا۔ بادشاہ نے اس دوران حاجی محمد خان سیستانی کو بنگالہ کے حاکم سلیمان کرانی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ سلیمان کی خان زمان سے بڑی دوستی تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ باغی خان کی مدد کرے گا۔ اس سفارت کی غرض یہ تھی کہ اسے خان زمان کی مدد سے روک دیا جائے۔ لیکن جب حاجی محمد خان رہتاس کے قلعہ پر پہنچا تو وہاں کے پٹھانوں نے جو خان زمان سے ملے ہوئے تھے اسے گرفتار کر کے خان زمان کے پاس بھیج دیا۔ خان زمان نے قدیم روابط اور آشنائی کی وجہ سے حاجی محمد خان کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی والدہ کو اس کے ہمراہ کر کے بادشاہ کے پاس اپنے قصور معاف کرانے کے لیے روانہ کیا۔

جون پور کے قیام کے دوران اکبر نے حسن خان خزانچی اور مہاپاتر بھاٹ کو جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے دربار کا رکن تھا اور ہندی شاعری و موسیقی میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا، اوڑیسہ کے راجہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نہ تو خان زمان کی مدد کرے اور نہ ہی اسے اپنے یہاں پناہ دے بلکہ اپنے اثر سے کام لے کر سلیمان کو بھی مخالفانہ حرکتوں سے روک دے۔ سلیمان نے اس بات کو مان لیا اور بادشاہ کے لیے نفیس تحفے اور عمدہ ہاتھی روانہ کر کے اطاعت اختیار کر لی۔ یہ دونوں سفیر لوٹ کر آگرہ میں ملے۔

آصف خان کا فرار ہونا

انہی دنوں مظفر خان اور دوسرے چند با اثر سردار آصف خان کے مخالف ہو گئے ان کو آصف خان سے بھاری انعام و تحائف کی توقع تھی اور وہ مارے لالچ کے ان مطالبات کو کسی نہ کسی طرح سے ظاہر کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سے صاف صاف چورا گڑھ کے مال غنیمت کا مطالبہ کر دیا۔ آصف خان زمن کی سڑک پر خان زمان کے مقابلہ میں محاذ جمائے ہوئے تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں کے مطالبوں اور مخالفتوں سے وہ سخت پریشان ہو گیا اور آدھی رات کے وقت اپنے چھوٹے بھائی وزیر خان کو لے کر اپنی جمعیت کے ہمراہ کلفلہ کے راستے کنڑہ کو چلا گیا۔ جب اس کے محاذ چھوڑ کر چلے جانے کی اطلاع بارگاہ شاہی میں پہنچی تو لشکر کی کمان منعم خان خانخاناں کو دے دی گئی اور شجاعت خان کو آصف خان کے تعاقب پر مقرر کیا۔

رہتاس کا قلعہ

شجاعت خان مانک پور سے کشتیوں پر سوار ہو کر آگے بڑھا تھا کہ اس کی آنے کی خبر آصف خان کو ملی اور وہ لوٹ کر دریا کے کنارے مقابلہ کے لیے آ گیا اور دونوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی اور اس نے شجاعت خان کی کشتیوں کو گنگا پار کرنے سے روک دیا۔ مجبوراً شجاعت خان رات کے وقت پیچھے ہٹ کر گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گیا اور آصف خان نے فوجی کاروائی کر کے اس طرف کے سارے علاقے کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ شجاعت خان دوسرے راستہ سے کنڑہ چلا گیا اور وہاں سے دشمن کا پیچھا شروع کیا لیکن آصف خاں کافی دور نکل گیا تھا اس لیے وہ جون پور آ کر رکا۔

انہی دنوں رہتاس کے قلعہ کے حاکم فتح خان افغان بتی نے اپنے بھائی حسن خان کو بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ 972ھ/1564ء میں سلیمان کرانی[17] نے اس قلعہ پر حملہ کیا تھا لیکن جب اس نے شہنشاہ کے آنے کی خبر سنی تو محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ غرض حسن خان نے حاضر ہو کر مناسب نذرانے گزارے اور درخواست کی کہ کسی سردار کو مقرر کر دیا

جائے تاکہ ہم قلعہ اس کے سپرد کریں۔ بادشاہ نے جون پور سے خلیج خان کو اس کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بعد میں فتح خان اپنے بھائی کو اس سفارت پر بھیجنے سے پشیمان ہوا اور قلعہ میں کافی رسد کا سامان جمع کر کے اپنے بھائی کو لکھ کر بھیجا کہ تم جلد از جلد لوٹ آؤ کیوں کہ اب قلعے میں رسد وغیرہ کا ذخیرہ ہو چکا ہے اور قلعہ سپرد کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ حسن خان نے اس خط کے ملنے پر خلیج خان کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی، بظاہر وہ اس کی بڑی اطاعت کرتا رہتا تھا لیکن خلیج خان جلد اس کی منافقت سے آگاہ ہو گیا اور قلعہ کا خیال چھوڑ کر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

رہتاس کا یہ قلعہ بہار کے صوبہ میں چودہ کوس کے طول اور تین کوس کے عرض میں واقع ہے۔ اس کی بلندی پانچ کوس ہے۔ قلعہ کے اندر زراعت ہوتی ہے۔ پانی کی اتنی فراوانی ہے کہ جہاں کیل گاڑو پانی نکل آتا ہے۔ جب سے شیر شاہ نے یہ قلعہ فتح کیا تھا پٹھانوں کے قبضہ میں چلا آ رہا تھا یہاں تک کہ فتح خان اس کا حاکم بنا اور اس نے سلیمان کے سامنے ہار نہ مانی، آخر کار فتح خان سے شاہی لشکر نے یہ قلعہ چھین لیا۔

صلح میں کھاسی

جونپور میں بادشاہ چھاؤنی ڈالے ہوئے مقیم تھے اور انھوں نے منعم خان کو مقدمۃ الجیش کا سردار بنا کر خان زمان کے مقابلہ میں بھیجا تھا اور خود امور سلطنت کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب منعم خان نرہن گھاٹ پر اسکے مقابلہ کے لیے پہنچا تو خان زمان نے بہادر خان کو سردار بنا کر سرور کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اس علاقہ میں شورش برپا کر کے جہاں تک ممکن ہے قبضہ کر لیں۔ باغیوں کی اس کاروائی کو روکنے کے لیے بادشاہ نے معز الملک مشہدی کو جو قطعاً سردار کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، مقرر کیا۔ اس کے ساتھ لشکر کے بڑے امرا جیسے شاہ بداغ خان، اس کا لڑکا عبدالمطلب خان، سعید خان اور محمد معصوم خان قرنخودی وغیرہ کو بھی نامزد کیا گیا۔

اسی دوران منعم خان نے خان زمان سے سابقہ روابط کی بنا پر سفارت و مراسلت جاری

رکھی اور اسی میں اس نے چار پانچ مہینے گزار دیے اور باغیوں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ آخر بادشاہ نے صلح یا جنگ کے قطعی فیصلہ کی خاطر خواجہ جہاں اور دربار خان کو جون پور سے زمانیہ روانہ کیا۔ ان لوگوں کے آنے پر صلح کی باقاعدہ گفتگو ہوئی باغیوں کی طرف سے خان زمان دو تین آدمیوں کے ساتھ اور لشکر شاہی کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے ملے۔ آخر کار صلح اس شرط پر طے پائی کہ خان زمان اپنی والدہ کو اپنے چچا ابراہیم خان کے ہمراہ دربار میں بھیج دے اور جتنے مشہور اور عمدہ ہاتھی اسکے پاس ہیں وہ شاہی کارندوں کے سپرد کردے۔ جب اسے معافی مل جائے تو سکندر اور بہادر بھی دربار میں حاضر ہوجائیں۔ جب صلح طے پاگئی تو دربار خان واپس چلا گیا اور بادشاہ کو اسکی اطلاع دی۔

دوسرے دن خانخاناں اور خواجہ جہاں خان کی والدہ اور ابراہیم خان کو ہمراہ لے کر مع ہاتھیوں کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور دونوں نے خان زمان کے قصور کو معاف کر دینے کی سفارش کی، شاید اسے معافی مل جاتی، لیکن اسی وقت سرادار سے میر معزالملک کی شکست اور فرار کی اطلاع پہنچی جسے سنتے ہی شہنشاہ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ صلح ادھوری رہ گئی۔

معزالملک کی فوجی کاروائی

معزالملک کی شکست کا قصہ یہ ہوا کہ جب سکندر اور بہادر کے مقابلہ پر شاہی فوج پہنچی تو یہ دونوں اسی جگہ رک گئے، جہاں تک کہ وہ پیش قدمی کرچکے تھے اور معزالملک کو پیغام دیا کہ تم ہمارا واسطہ بن کر دربار سے ہمارے جرم کو معاف کرادو تاکہ جو کچھ ہاتھی اور مال غنیمت ہم نے جمع کر رکھا ہے وہ سب ہم دربار میں روانہ کردیں۔ جب ہماری خطائیں معاف ہوجائیں گی تو ہم خدمت میں حاضر ہوجائیں گے۔ میر معزالملک ایک فرعون صفت آدمی تھا اور یہ غرور شاید مشہدی سیدوں کو وراثت ہی میں ملا ہے اس لیے مشہور ہے:

اہل مشہد بجز امام شما
لعنۃ اللہ بر تمام شما

ان کی شان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

روی زمین گر چہ زمردم خوش است
مشہدی از روی زمین گم خوش است

چنانچہ اس نے بڑے تکبر اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور اسکے اظہار اطاعت پر کہلا بھیجا کہ اب صرف تلوار ہی تمہارا فیصلہ کرے گی۔ ابھی معاملہ اسی نوبت پر تھا کہ بادشاہ کی طرف سے لشکر خان میر بخش اور میر ٹوڈرمل پہنچے تاکہ صلح یا جنگ کوئی ایک بات جلد از جلد طے پاجائے اگر مناسب ہو تو جنگ کریں ورنہ سکندر اور بہادر کو تسلی اور دلاسہ دے کر اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

جنگ کی پیشکش

بہادر خان خود شاہی لشکر کی چھاؤنی کے قریب آیا اور اس نے میر معز الملک کو چند امیروں کے ساتھ بلا کر صلح کی گفتگو چھیڑی اور کہا کہ ”خان زمان اپنی والدہ اور ابراہیم خان کو صلح کے لیے دربار میں بھیج رہا ہے بلکہ اب تک وہ بھیج بھی چکا ہوگا، اس لیے ہم کو اپنے قصوروں کی معافی کی امید اور توقع ہے، ہم اس سفارت کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک یہ معاملہ ٹھیک نہیں ہو جاتا ہم لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتے تم بھی دربار سے جواب آنے تک کچھ دن تک لڑائی کو ملتوی رکھو تو بہتر ہے“۔

معز الملک کی شکست

جنگ کے لیے بہادر خان کا یہ مطالبہ نہایت معقول تھا لیکن میر معز الملک کو اتنی سمجھ کہاں؟ وہ تو بس آگ بنا ہوا تھا اور راجہ ٹوڈرمل تیل سے کم نہیں تھے، وہ برابر اس آگ کو بھڑکاتے رہے، چنانچہ انھوں نے بہادر خان کو منھ توڑ جواب دیا ان کے اس رویہ سے بہادر خان اور اسکندر خان مایوس ہو گئے اور مقابلے کے لیے صف آرا ہوئے۔ میر معز الملک نے اس کے مقابلے پر محمد امین دیوانہ کو لشکر کی رہبری پر مقرر کیا اور آگے بڑھایا اور خود لشکر کے بیچ رُکا رہا۔ اپنے ساتھ تجربہ کار سپاہیوں اور عبدالمطلب خان، سلیم خان، کاکر علی خان، بیگ

نورین خان سرداروں کو مقرر کر کے دوسرے امیروں کو میمنہ اور میسرہ پر لگا دیا۔ دوسری طرف باغیوں کے ہراول پر تو سکندر خان اور اس کا داماد محمد یار تھا، قول بہادر خان خود کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ جلد ہی محمد یار قتل ہو گیا اور اسکندر خان گھبرا کر کالی ندی میں کود پڑا اور تیر کر نکل گیا۔ اس کے اکثر ہمراہی ندی میں غرق ہو گئے۔ جو بچے وہ دشمن کی تلوار کا نشانہ بن گئے۔ ساری فوج لوٹ مار میں منتشر ہو گئی۔ میدان میں میر معز الملک اپنے چند سرداروں کے ساتھ ساتھ تنہا رہ گیا۔ بہادر خان ابھی تک اپنے مورچے پر جما ہوا تھا، اس نے جب میر کو تنہا پایا تو اچانک اس پر حملہ کر دیا اور ایک ہی حملہ میں اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سے جنگجو جوانوں نے خاص طور سے حسین خان خویش، مہدی قاسم خان اور باقی محمد خان وغیرہ نے جو میر معز الملک کی سرداری اور راجہ ٹوڈرمل کے حکم چلانے سے رنجیدہ تھے جس قدر جد و جہد کرنی چاہیے تھی، نہیں کی۔ البتہ شاہ بداغ خان نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ لڑتے لڑتے وہ گھوڑے سے گر پڑا، اس کے بیٹے عبد المطلب خان نے اس کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا آخر اپنی جان بچا کر نکل گیا اور اس کا باپ ازبکوں کے ہاتھ قید ہو گیا۔ راجہ ٹوڈرمل اور خان کا لشکر پسپا ہو گیا، رات میں ان لوگوں نے ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لیے باغیوں پر حملہ کیا لیکن کچھ نہ کر سکے، باغیوں نے انکو منتشر کر کے بھگا دیا۔ دوسرے دن یہ سب اکٹھا ہو کر شیر گڑھ کی طرف چلے گئے اور ساری روداد دربار میں لکھ بھیجی۔

باغیوں کی اطاعت اور معافی

جب خان خاناں، خان زمان کی والدہ ابراہیم خان اور خان زمان کے معتمد آدمیوں میر ہادی صدر اور نظام آغا کو دربار میں لے کر آیا اور جنگی ہاتھی بھی حضور میں پیش کیے تو ابراہیم خان سر برہنہ گردن میں تلوار لٹکائے اور بجائے چادر کے کفن لپیٹے ہوئے زبان حال و قال سے کہہ رہا تھا:

''خواہی بدار خواہی بکش رائی رائی تست''

خان خاناں بھی ان لوگوں کی سفارش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کر رہا تھا، بادشاہ نے ان سب کے جرم معاف کردیے، ان کی جاگیریں بحال کردیں اور حکم دیا کہ جب تک لشکر یہاں ہے یہ لوگ دریا پار نہ کریں اور ان کے نمائندے آگرہ میں آکر فرامین حاصل کرکے حسب فرمان اپنی جاگیروں کو سنبھال لیں۔ خان زمان کی والدہ نے یہ خوشخبری اپنے بیٹوں کے پاس بھیج دی اور بہادر وسکندر نے کوہ پارہ اور صف شکن ہاتھیوں کو جن کی وجہ سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا تھا۔ نذرانوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ عین اسی مرحلہ پر ٹوڈرمل اور لشکر خان کا عریضہ جس میں لڑائی اور شکست اور امرا کی منافقت کا ذکر تھا پہنچا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا، ہم نے خانخاناں کی خاطر سے خان زمان اور دوسروں کو معافی دے دی ہے اب تمام امیر دربار میں لوٹ آئیں۔ اسی سلسلے میں میر معز الملک اور راجہ ٹوڈرمل پر شاہی عنایات نازل ہوئیں جن لوگوں نے منافقت سے کام لیا تھا وہ عرصہ تک کورنش و تسلیمات سے محروم کردیے گئے بعد میں پھر ان کو اپنے اپنے اعزاز دوبارہ مل گئے۔

خان زمان کی وعدہ خلافی

اسی زمانہ میں بادشاہ نے کوچ کیا، چنار کے قلعہ کی سیر کی اور اس قلعہ کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کرنے کے بعد لشکر میں لوٹ آئے۔ جس زمانہ میں چنار کے قلعہ میں چھاؤنی تھی خان زمان نے عجلت کرکے دریائے گنگا کو پار کیا اور معاہدۂ صلح کے خلاف قصبۂ مئو کے ملحقہ دیہات محمد آباد میں آگیا اور اپنے گماشتوں کو جون پور اور غازی پور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ شہنشاہ کو اس کی حرکت ناگوار گزری، انھوں نے اشرف خان میر منشی کو جون پور بھیجا تاکہ خان زمان کی والدہ کو قلعہ میں نظر بند کرکے باغیوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ پھر بادشاہ نے لشکر کو خواجہ جہان اور مظفر خان کی تحویل میں چھوڑا اور خود خان زمان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب بادشاہ سروار ندی کے کنارے پہنچے تو غنیم کی مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں بادشاہی آدمیوں کے ہاتھ آگئیں۔ بادشاہ نے ندی کے کناروں پر چوکیاں قائم کرکے گھنے جنگلوں کو طے کیا۔ جب معلوم ہوا کہ خان زمان سوالک

کی پہاڑی کی طرف بھاگ گیا ہے تو اس کا پیچھا چھوڑ کر لوٹ آئے۔

اسی اثنا میں بہادر خان چند بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کے ساتھ جون پور پہنچا اور کمندوں کے ذریعے قلعہ پر چڑھ کر اپنی والدہ کو چھڑا لایا اور اشرف خان کو قید کر لیا لیکن جب اس کو بادشاہ کے لوٹ آنے کی خبر ملی تو وہ سکندر خان کے ہمراہ نرہن گھاٹ کے ذریعہ گنگا کو پار کر کے بھاگ گیا۔

بادشاہ کی سالگرہ کا جشن

پانچ رجب 973ھ/1565ء کو جون پور کے ملحقہ پرگنہ نظام آباد میں اکبر کی سالگرہ ہوئی۔ معمول یہ تھا کہ سالگرہ پر بادشاہ کو تولنے کا جشن منعقد ہوتا تھا جس میں شمسی اور قمری تاریخوں کے حساب سے سال میں دو بار سونے چاندی اور ہر قسم کے اجناس سے بادشاہ کو تولا جاتا تھا پھر یہ تول برہمنوں اور دوسرے محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اس رسم کی مناسبت سے شعراء نے بڑے اچھے اشعار بھی کہے ہیں۔

اکبر کی واپسی- آگرہ

سالگرہ کے جشن کے بعد بادشاہ جون پور کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ جب خان زمان کو بادشاہ کے قیام کی اطلاع ملی تو اس نے میرزا میرک کو جسے بعد میں رضوی خان کا خطاب ملا تھا خان خاناں کے پاس سفارش کروانے بھیجا وہ خان زمان کی والدہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا، خان زمان کا پیغام اطاعت پیش کیا۔ خان خاناں نے میر عبد اللطیف قزوینی، ملا عبد اللہ مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی صدر کے ساتھ دوبارہ خان زمان کے قصور معاف کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے یہ درخواست قبول کر لی۔ خواجہ جہان مرتضیٰ شریفی(18) اور مخدوم الملک کو خان زمان کو توبہ کرانے اور معافی کی خوش خبری سنانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ خان زمان نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور قسمیں کھا کر اطاعت کا عہد کیا اور اپنے عزیزوں کو دربار میں کورنش بجالانے کے لیے کہا۔ خان زمان کے معاملہ کو سلجھانے کے بعد

بادشاہ نے 973ھ/1565ء کے آخر میں آگرہ واپس پہنچ کر آرام کیا۔ پھر وہاں سے نئے شہر نگر چین میں جا کر چوگان بازی، کتوں کی دوڑ اور جانوروں کے شکار میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر بادشاہ نے ایک آتشیں گولہ ایجاد کیا جسے اندھیری رات میں چھوڑا جاتا تھا۔ انہی دنوں محمد یوسف خان ولد اتکہ خان کی کثرت شراب نوشی سے موت ہو گئی تھی۔

اسی سال بادشاہ نے آصف خان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مہدی قاسم خان اس کے داماد حسین خان اور خالدی خان کو چند اور امراء کے ساتھ تین چار ہزار کی جمعیت دے کر گڑہ کٹنگہ کی طرف روانہ کیا۔ آصف خان نے چوراگڑھ کے قلعہ کو خالی کر دیا اور دربار میں معافی کے لیے عریضہ روانہ کیا لیکن اس کی درخواست قبول نہ کی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے خان زمان کو ایک خط لکھا اور خود بھی اپنے بھائی وزیر خان کو لے کر جون پور میں خان زمان کے پاس آ گیا۔ لیکن خان زمان نے پہلی ملاقات میں ہی اس سے ایسی لاپروائی برتی کہ وہ یہاں آنے پر سخت پشیمان ہو گیا۔

اس عرصہ میں مہدی قاسم خان نے گڑہ کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر جاگیرداروں میں تقسیم کر دیا اور آصف خان کے تعاقب کو چھوڑ کر بندریہ کے راستہ سے مکہ معظمہ کے ارادہ سے چلا گیا۔ حسین خان اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کو چھوڑنے کے لیے دکن کے قریب ستواس کے قلعہ تک گیا تھا۔

مرزاؤں کی بغاوت

اسی زمانہ میں اچانک سلطان محمد مرزا کے بیٹوں ابراہیم حسین مرزا، شاہ مرزا اور محمد حسین مرزا نے بغاوت کر دی۔ سلطان محمد مرزا کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے تو امیر تیمور صاحبقران اور ماں کی طرف سے سلطان حسین مرزا سے ملتا ہے اور اب وہ کافی بوڑھا ہو چکا ہے، بادشاہ نے اعظم پور کا پرگنہ اس کو جاگیر میں دیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے سنبھل کے علاقہ میں بغاوت کا رخ اختیار کیا تھا۔ اس وقت بادشاہ، خان زمان کے قصہ سے فارغ ہونے کے بعد محمد حکیم مرزا کی بغاوت کو دبانے کے لیے پنجاب گئے ہوئے تھے۔ منعم خان نے ان

بھائیوں کی مدافعت کی۔ وہ منعم خان کے مقابلے سے بھاگ کر دوآبہ میں چلے گئے اور دہلی سے گزر کر مالوہ جا پہنچے۔ وہاں سے تو دو بھائی شاہ میرزا اور محمد حسین مرزا تو ہندیہ چلے گئے اور ابراہیم حسین مرزا نے ستواس کا رخ کیا جو دس کوس کے فاصلے پر تھا۔ حسین خان دکن کے ایک امیر مقرب خان کی مدد سے قلعہ ستواس میں قلعہ بند ہو گیا۔ قلعہ میں کافی ذخیرہ نہ تھا اس کے لشکری گھوڑے، اونٹ اور بیل تک کاٹ کر کھا گئے، فاقہ اور بھوک سے ان کا برا حال تھا اور کسی طرف سے کوئی مدد نہیں پہنچ رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے میرزا ابراہیم حسین کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اور قلعہ میں بند فوج نے لڑنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا ابراہیم حسین نے ہندیہ میں مقرب خان کے بھائی برق دم خان کو قتل کر دیا تھا اور اس کے اہل وعیال کو بھی قید کر لیا تھا۔ جب مقرب خان اور حسین خان صلح پر راضی نہیں ہوئے تو اس نے برق دم خان کا سر نیزہ پر بلند کر کے مقرب خان کو دکھایا اور اس کی ماں کو بھی اس کے سامنے لا کر کہا کہ ھندیہ فتح ہو چکا ہے، تمہارے عزیز رشتہ دار اور وہاں کے سارے لوگ گرفتار ہو چکے ہیں اب تم کس کے بھروسہ لڑائی پر کمر باندھے ہوئے ہو؟ یہ دیکھ اور سن کر مقرب خان کے ہوش اڑ گئے اور وہ اطاعت قبول کر کے مرزاؤں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ انھوں نے اسے سلامتی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ جب 975ھ/1567ء میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خان دربار میں حاضر ہوا تھا، اس موقع پر اس کی جاگیر میں پٹیالی کے ساتھ شمس آباد کا پرگنہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔

حسین خان کی مصاحبت

میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) اس سے ایک سال پہلے پٹیالی گیا تھا وہاں حسین خان سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے نہایت با اخلاق، منکسر مزاج، درویش صفت، بہادر، سخی، خوش اخلاق، پکا سُنی، علم پرور اور علم دوست پایا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا، چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اس گوشہ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت

میں گزار دیے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا، ہماری آپس میں کچھ ایسی رنجش ہوگئی کہ جدائی کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خفگی کو دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی، یہاں تک کہ بدایوں جاکر والدۂ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا، لیکن میرا دل ایسا پھرا تھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا:

دل کہ رنجید کسی خورسند کردن مشکل است
شیشۂ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است

آصف خان کا فرار

خان زمان نے آصف خان اور بہادر خان کو پٹھانوں کے علاقوں پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا اور وزیر خان کو کسی بہانے اپنے پاس روک کر نظر بند کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے آپس میں خط و کتابت کرکے فرار ہو جانے کی ٹھانی۔ چنانچہ ایک مقرر رات کو وزیر خان تو خان زمان کے پاس سے بھاگ گیا اور اس کا بھائی آصف خان، بہادر خان کے پاس سے بھاگ کر آگرہ اور مانک پور کے راستے پر تین کوس تک چلا گیا۔ بہادر خان نے آصف خان کا پیچھا کرکے راستہ روک دیا اور دونوں میں جون پور اور مانک پور کے درمیان ایک سخت جنگ ہوئی جس میں آصف خان کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ بہادر خان اسے ہاتھی پر عماری میں بیٹھا کر اپنے ساتھ لے چلا۔ اسی اثنا میں وزیر خان جون پور سے بھائی کو چھڑانے کے لیے وہاں پہنچ گیا اس وقت بہادر خان کی جمعیت مال غنیمت لوٹنے کے لیے منتشر ہوگئی تھی اس لیے وزیر خان کے اچانک حملہ کی بہادر خان مدافعت نہ کرسکا اور اسی حال میں اس نے حکم دیا کہ آصف خان کو عماری میں ہی قتل کردیں۔ لوگوں نے آصف خان پر حملہ کردیا۔ تلوار کا ایک زخم اسکی ناک پر آیا اور اس کی دو تین انگلیاں بھی کٹ گئیں، عین اس موقع پر وزیر خان نے تیزی سے بڑھ کر آصف خان کو قاتلوں کے گھیرے سے چھڑا لیا اور دونوں بھائی وہاں سے بھاگ کر کڑہ کی طرف چلے گئے اور بہادر خان کو خالی ہاتھ لوٹ جانا پڑا۔ جس زمانہ میں اکبر بادشاہ مرزا محمد حکیم کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کے

علاقے میں پہنچے تھے اور وہاں شکار میں مصروف تھے، وزیر خان خدمت سلطانی میں حاضر ہوگیا۔ مظفر خان کے وسیلہ سے اسے باریابی نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے آصف خان کے نام معافی اور مہربانی کا فرمان لکھ دیا۔

کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ

اسی سال مرزا محمد حکیم بھی لاہور پہنچا تھا اس کے لاہور آنے کا سبب یہ تھا کہ جب تیسری مرتبہ مرزا سلیمان کابل سے واپس ہوگیا اور کابل پر مرزا حکیم کا پوری طرح قبضہ ہوگیا تو اس نے بادشاہی امیروں کو ہندوستان واپس کر دیا اور خواجہ حسن نقشبندی کو اپنی وکالت کے عہدہ پر مستقل کر دیا۔ اس کی اس کارروائی سے رنجیدہ ہوکر خان کلاں کابل چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ مرزا سلیمان کے لیے اس سے اچھا کیا موقع ہوسکتا تھا چنانچہ اس نے میدان کو صاف دیکھ کر چوتھی بار اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کی مدد و تائید سے کابل پر چڑھائی کر دی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس موقع پر مرزا حکیم نے کابل محمد معصوم کوکہ کے حوالہ کر دیا اور خود خواجہ حسن نقشبندی کے ساتھ غور بند کی طرف چلا گیا۔ یہ محمد معصوم وہی شخص ہے جس نے بعد میں ہندوستان پہنچ کر بڑے فتنے اور بغاوتیں برپا کیں، ویسے یہ نہایت بہادر اور دلیر شخص تھا۔

جب مرزا سلیمان کابل پر بزور تلوار قبضہ نہ کر سکا تو اس نے اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کے ذریعہ مکر و فریب سے کام لینا چاہا، چنانچہ بیگم وہاں سے قراباغ پہنچی جو کابل سے دس کوس پر غور بند کی سرحد پر واقع ہے۔ وہاں اس نے مرزا سے صلح کا سلسلہ بنایا اور بڑی سخت قسمیں کھا کر اسے صلح کی گفتگو کے لیے بلایا۔ میرزا چند آدمیوں کے ساتھ اس کے لیے روانہ ہوگیا۔ خواجہ حسن بھی مصالحت پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن باقی مسلے پر آمادہ نہیں ہوا تھا اس نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ یہ عورت نہایت مکار اور چالباز ہے اس کے مکر سے میں نہیں آنا چاہیے۔ اس کا خیال صحیح تھا کیوں کہ ابھی مرزا محمد حکیم قراباغ پہنچے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا سلیمان ایک بھاری جمعیت لے کر حملہ کرتا ہوا کابل سے وہاں پہنچ گیا اور گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مرزا محمد حکیم کے چند آدمیوں کی مرزا سلیمان کے

لشکریوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انھوں نے فوراً اس کی اطلاع مرزا حکیم کو پہنچادی اور وہ وہاں سے الٹے پاؤں غوربند بھاگ گیا۔ حملہ آوروں کے ڈر سے وہاں بھی اس کے قدم نہیں رکے اور وہ ہندوکش کی پہاڑی کے راستہ پر چلا گیا۔ خواجہ حسن تو چاہتا تھا کہ اسے حاکم بلخ پیر محمد خان کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے لے جائے لیکن باقی قاقشال نے اس ارادہ کی سختی سے مخالفت کی اور مرزا کو اکبر بادشاہ کے حضور میں لے جانے کے لیے پنجشیر کے راستے جلال آباد پہنچا۔ وہاں سے یہ لوگ دریائے نیلاب کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور دریائے سندھ کو پار کرکے بارگاہ شاہی میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ تو ادھر آئے اور خواجہ حسن اپنی جمعیت کو لے کر بلخ چلا گیا۔ کچھ مدت بعد وہاں وہ ایسی پریشانیوں میں گھر کر رہ گیا کہ زندگی اس پر عذاب بن گئی۔

مرزا حکیم فرار ہوا تو مرزا سلیمان نے کوتل کے سنجد درے تک اس کا تعاقب کیا اور اس کے لشکر کے پیچھے والے حصہ کو گھیر لیا۔ اس کا سارا مال واسباب لوٹ کر اسی جگہ اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔

مرزا سلیمان کی واپسی

جب مرزا سلیمان، مرزا حکیم کی فکر میں کابل سے ہٹا تو محمد معصوم کابلی نے قلعہ سے نکل کر اس کے لشکر پر حملہ کردیا اور اس کے سردار محمد قلی شغالی کو شکست دے کر چار باغ میں چھپ گیا۔ جب سلیمان کو یہ اطلاع ملی تو اس نے قاضی خان بدخشی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ محمد معصوم پہلے تو صلح پر بالکل راضی نہ ہوا۔ قاضی خان چونکہ اس کا استاد تھا۔ اس لیے بعد میں وہ اس کا کہا ماننے پر راضی ہوگیا اور مرزا اس سے تھوڑی بہت پیش کش لے کر بدخشاں واپس چلا گیا۔

خوش خبر خان کی فتنہ پردازی

اس سے پہلے کہ مرزا محمد حکیم کا ایلچی دربار میں پہنچے اکبر نے کابل کے اس نئے ہنگامہ کا حال سن کر خوش خبر خاں سزاول کے ذریعہ مرزا حکیم کے لیے سونے کے مرصع لگام والا گھوڑا

ہندوستان کے نفیس تحائف کافی رقم اور امرائے پنجاب کی امدادی فوجیں ایک فرمان کے ہمراہ روانہ کردی تھیں مرزا محمد حکیم نے فرمان شاہی کا بڑھ کر استقبال کیا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا۔ اسی اثناء میں وہاں فریدوں خان(۱۹) پہنچ گیا، جسے بادشاہ نے کابل کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے نگر چین سے روانہ کیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر مرزا کو الٹی پٹی پڑھائی اور سارے معاملہ کو ایک دوسرے ہی رخ پر ڈال دیا۔ مرزا کو بہکانے میں شہاب خان کے بھائی حسن خان کا جو اس زمانہ میں کابل ہی میں تھا اور سلطان علی نامی خبرنویس کا جو ہندوستان سے بھاگ کر ایسے ہی کسی واقعہ کا انتظار کررہا تھا، بڑا ہاتھ ہے۔ ان دونوں نے فریدون خان کی ہاں میں ہاں ملاکر مرزا حکیم کو مطمئن کردیا کہ لاہور پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن خوش خبر خان کے حامیوں نے اس کی مخالفت کی آخرکار سب نے خوش خبر خان کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا۔ مرزا حکیم طبعاً بڑا با مروت آدمی تھا، اس نے خوش خبر خان کو علیحدہ بلا کر اسے وہاں سے رخصت کردیا۔ یہ خوش خبرخان اُس زمانہ میں جبکہ بادشاہ لاہور کے علاقہ میں شکار میں مصروف تھے، دریائے راوی میں ڈوب کر مرگیا۔

مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ

مرزا محمد حکیم نے بہرحال بغاوت پر کمر باندھ لی اور لوٹ مار کرتا ہوا بھیرہ تک پہنچ گیا اور وہاں سے غارت گری اور مسلسل کوچ کرکے لاہور کے سامنے دریائے راوی کے کنارے مہدی قاسم خان کے باغ میں اپنا کیمپ لگا دیا۔ اس کے مقابلے کے لیے میر محمد خان اور تمام اتکہ کے امرا نے پوری تیاری کرلی اور قلعہ میں بند ہوگئے۔ مرزا حکیم نے فصیل پر حملہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان امیروں نے اس کو حصار کے قریب تک پھٹکنے نہ دیا۔

جب ان امیروں کے عریضے بارگاہ سلطانی میں پہنچے تو بادشاہ نے آگرہ کو خان خاناں اور مظفر خان کی حفاظت میں دے کر 3 جمادی الاول 974ھ/1566ء میں خود کوچ کیا اور دہلی و سرہند کے راستے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ مرزا محمد حکیم کو جیسے ہی بادشاہ کے

حملہ کی اطلاع ملی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے کابل واپس چلا گیا۔

لاہور سے مرزا کے تعاقب میں قطب الدین محمد خان اور کمال خان گکھر کو روانہ کیا گیا یہ لوگ کچھ دور تک جا کر بھیرہ سے واپس چلے آئے۔ انہی دنوں سندھ کے حاکم محمد باقی ترخان ولد مرزا محمد عیسیٰ کا عریضہ دربار میں پہنچا جس میں اس نے اپنی اطاعت کا اظہار کیا تھا، اور بھکر (20) کے حاکم سلطان محمود کی شکایت کی تھی کہ اس نے سندھ اور لاہور کے علاقے میں مداخلت کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ بادشاہ نے اسکے حسب مدعا سلطان محمود کے نام فرمان لکھ دیا۔ لاہور میں قیام کے دوران خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ معز مرزا اور شاہ مرزا نے جن کو سنبھل اور اعظم پور کے توابعات میں ہنکور کی جاگیر دی گئی تھی اپنے چچا ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے بہکانے سے بغاوت کر دی ہے۔ خالصہ کے بعض پرگنوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جب ان کا پیچھا کیا گیا تو یہ مالوہ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

سیر و شکار

انہی دنوں بادشاہ نے ہانکے کا شکار کھیلا۔ اس شکار کے لیے تقریباً چالیس کوس سے جانوروں کو ہنکا ہنکا کر گھیرے میں لایا گیا اور بتدریج اس گھیرے کو تنگ کر دیا گیا۔ اس گھیرے میں ہر قسم کے تقریباً ہزار جانور آ گئے تھے۔ بادشاہ نے خاص و عام کو درجہ بدرجہ شکار کرنے کا حکم دیا۔ شکار سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریائے راوی میں ڈال دیا۔

سوائے ایک دو آدمیوں کے جن میں خوش خبر خان بھی تھا باقی سارے ہمراہی سلامتی کے ساتھ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

اسی شکار کے دنوں میں مظفر خان وزیر خان کو اپنے ہمراہ لایا تھا اور بادشاہ نے آصف خان اور مجنون خان کے نام فرمان جاری کر دیا تھا کہ دونوں مل کر گڑھ اور مانک پور کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔

خان زمان کی دوبارہ بغاوت

اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ خان زمان، بہادر خان اور سکندر خان نے وعدہ خلافی کر کے بغاوت کر دی ہے اور اپنے کچھ آدمی مرزا محمد حکیم کے پاس اس کو حملہ کرنے کی دعوت دینے بھیجے ہیں۔ جونپور میں میرزا حکیم کے نام کا خطبہ و سکہ بھی جاری کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملا غزالی مشہدی نے مرزا حکیم کے متعلق یہ تجع نکالا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم وارث ملک است محمد حکیم

مہا بھارت کی یادگار

بادشاہ کو جب اس بغاوت کی خبر ملی تو انھوں نے خان زمان کے نمائندہ میرزا مبارک رضوی کو خان باقی خان کی حراست میں دے دیا اور پنجاب کے تمام معاملات خان کلاں اور اٹک کے امرا کے سپرد کر کے 12 ماہ رمضان 974ھ/1566ء کو آگرہ کا ارادہ کیا۔ راستہ میں قصبۂ تھانیسر کی سیر کی جو قدیم دور کا بہت بڑا مذہبی مقام تھا۔ تھانیسر میں کرکھیت کا تالاب ہے جس میں آج سے چار ہزار سال پہلے کوروں اور پانڈوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے قول کے مطابق اس لڑائی میں تیرا کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس جگہ ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس زیارت گاہ میں ہندو سونا، چاندی، جواہرات، قیمتی کپڑے اور نفیس چیزیں چڑھاتے اور خیرات کرتے ہیں اور پوشیدہ طور پر روپے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس تیرتھ میں سنیاسی اور جوگی، کورو اور پانڈو کی لڑائی کی یادگار میں ایک دوسرے سے جنگ بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی جنگ کا تماشا بھی دیکھا اور بادشاہ کے اشارہ پر کچھ سپاہیوں نے اپنے بدن پر راکھ مل کر سنیاسیوں کا بھیس بنایا اور سنیاسیوں کی طرف سے لڑنے لگے، کیوں کہ سنیاسی بیچارے صرف تین سو تھے اور ان کے مقابلے میں جوگی پانچ سو سے زیادہ تھے، لڑائی بڑی دلچسپ تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ لوگ مارے گئے، آخرکار سنیاسوں کو فتح ہوئی۔

جب اکبر نے دہلی میں قدم رکھا تو مرزا میرک رضوی خان، باقی خان کی قید سے

چھوٹ کر اپنے آقاؤں کے پاس چلا گیا۔ خان باقی خان بھی سزا کے خوف سے باغیوں سے جا کر مل گیا۔

دہلی کے قیام میں حاکم دہلی تتار خان کی سعی سے پرگنہ بھوجپور کا جاگیردار شاہ فخر الدین مشہدی، شہاب خان ترکمان گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا اور اسے اس جرم میں کہ محمد امین دیوانہ جب لاہور سے بھاگ کر اس کے پرگنہ میں گیا تھا تو اس نے پناہ دی تھی اور اسے گھوڑا اور سفر خرچ دے کر باغیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے سزا کا حکم واپس لے لیا۔

باغیوں کے خلاف اکبر کی فوجی کاروائی

جب سواری آگرہ پہنچی تو خبر ملی کہ خان زمان نے شیر گڑھ عرف قنوج پر حملہ کر کے یوسف خان مشہدی کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اکبر نے آگرہ کو خان خاناں کی نگرانی میں چھوڑا اور 26 شوال 974ھ/ 1566ء میں جون پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت اتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی کہ ہڈیوں میں گودا تک حرارت کے مارے جلا جا رہا تھا۔

جب سکیتہ کے قصبہ میں چھاؤنی قائم ہوئی تو معلوم ہوا خان زمان مانک پور کی طرف جہاں اس کا بھائی بہادر خان تھا، بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے قصبہ بھوجپور پہنچ کر چھے ہزار تجربہ کار سواروں کی جمعیت کو محمد قلی خان برلاس، مظفر خان، راجہ ٹوڈر مل، شاہ بداغ خان اور اس کے لڑکے عبد المطلب خان اور حسین خان کی سرداری میں اسکندر خان پر حملہ کرنے کے لیے اودھ کی جانب مقرر کر دیا۔

لشکر کے ہراول کی کمان داری پر پہلے حسین خان کو مقرر کیا تھا، لیکن وہ قلعہ بندی کی مصیبتیں اٹھا کر پریشان حال اور بدحال ہو کر آیا تھا اور اپنے لشکر کے اخراجات کی وصولی کے لیے پرگنہ شمس آباد کی طرف جو اسے ابھی ابھی جاگیر میں ملا تھا، گیا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے واپس آ کر لشکر کے ساتھ ہمرکاب ہونے میں کچھ دیر ہو گئی اس لیے بادشاہ نے اس کی جگہ ہراول پر قیاخان کو مقرر کر دیا۔

ان دنوں میں حسین خان مذکور کے ساتھ وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کوچ کر گیا تھا، اس لیے میں اسی قصبہ میں ٹھہر گیا۔ وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا جس کی شہر کے معتبر لوگوں نے شہادت دی تھی کہ کچھ ہی دن پہلے ایک دھوبی کا چھوٹا بچہ گنگا کے کنارے گھاٹ پر سو گیا تھا۔ اچانک وہ دریا میں گر پڑا اور تیز موج نے اسے وہاں سے بہا کر دس کوس کے فاصلے پر قصبہ بھوجپور کے کنارے ڈال دیا۔ وہاں اسکے رشتہ دار دھوبیوں نے بچہ کو پہچان لیا اور صحیح ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

باغیوں پر اکبر کا حملہ

جب رائے بریلی میں شاہی کیمپ لگا تو خبر آئی کہ خان زمان اور بہادر خان گنگا پار کر کے کالپی کی طرف جا رہے ہیں اسلئے بادشاہ نے لشکر کو خان جہاں کی سرکردگی میں کڑہ کی طرف روانہ کر دیا اور خود نہایت تیزی کے ساتھ مانک پور پہنچ کر ہاتھی پر سوار ہو کر دریا پار کیا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ پندرہ سولہ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے، مجنون خان اور آصف خان جو ہراول پر مقرر تھے ہر گھڑی باغیوں کی خبر پہنچا رہے تھے، انھوں نے خبر دی کہ خان زمان اور بہادر خان جن کے سروں پر قضا منڈلا رہی تھی، رات بھر شراب پینے اور رنڈیوں کا ناچ دیکھنے میں مشغول رہے ہیں اور اب ان کی سرکشی کا پیمانہ بس لبریز ہو چلا ہے۔ خان زمان وغیرہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ بادشاہ خود انکے سر پر آ پہنچا ہے کیونکہ یہ لوگ میدان جنگ کی ہر آنے والی خبر کے متعلق یہی خیال کیے ہوئے تھے کہ یہ صرف مجنوں خان کی پیش قدمی سے متعلق ہے، چونکہ وہ مجنون خان کو گھاس کے تنکے کے برابر بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اس لیے انکو اس حملہ کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

خان زمان کی ہلاکت

بادشاہ اس دن سندر نامی ہاتھی پر سوار تھے اور اپنے ساتھ عماری میں انھوں نے مرزا کوکہ اعظم خان کو بٹھا رکھا تھا، شاہی سواری تو لشکر کے قلب میں تھی۔ آصف خان اور امرائے

اتکہ میمنہ میں تھے۔ مجنون خان کچھ اور لوگوں کے ساتھ میسرہ پر مقرر تھا۔ ادھر خان زمان خان صبح کے وقت اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے کر سو گیا تھا کہ اچانک موت کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ جب اس نے اچھی طرح دیکھا تو لشکر کی سج دھج دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ خود شہنشاہ لشکر میں موجود ہیں، چنانچہ اس نے اپنی فوج کو فوراً بلا لیا اور صف آرائی کر لی۔ ایک بہادر جمعیت کو شاہی ہراول کے مقابلہ پر آگے بڑھایا۔ جب یہ دستہ آگے آیا تو بابا خان قاقشال اوچیوں کے سردار نے اسکو تیروں کی زد پر لے لیا اور پیچھے دھکیل کر خان زمان کی لشکر گاہ تک پہنچا دیا۔ اس موقع پر بھاگنے والوں میں سے کسی کا گھوڑا پوری قوت سے جا کر خان زمان کے گھوڑے سے ٹکرا گیا اس صدمے سے خان کی پگڑی اس کے سر سے اتر کر کمند کی طرح اس کے گلے میں لپٹ گئی۔ بہادر خان نے جب یہ حال دیکھا تو بڑی بہادری کے ساتھ اس نے بابا خان پر حملہ کر دیا اور سے دھکیلتے ہوئے مجنون خان کی صفوں تک پہنچا دیا اس بھگدڑ میں مجنون خان اور بہادر خان ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نہایت دلیری اور بہادری کے ساتھ جنگ کی۔ عین اس وقت ایک تیر بہادر خان کے گھوڑے کو لگا اور وہ بدک کر زمین پر گر پڑا بہادر خان کو لوگوں نے گھیر کر گرفتار کر لیا۔ اس وقت بادشاہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حسب الحکم کوہ پیکر ہاتھیوں کے حلقہ کو خان زمان کے لشکر پر دوڑا دیا گیا۔ ہیرانند نامی بادشاہی ہاتھی باغیوں کے ہاتھی اودیا سے جا کر بھڑ گیا اور اسے اتنی زور کی ٹکر ماری کہ وہ میدان میں ڈھیر ہو گیا۔ اس ہنگامہ میں ایک تیر خان زمان کے گھوڑے کو بھی لگا۔ وہ اسے نکالنے لگا تھا کہ گھوڑے کو ایک اور تیر آ کر لگا اور گھوڑے کے بھڑک جانے سے خان زمان نیچے گر پڑا۔ اسی وقت نرسنگھ نامی ہاتھی کے ہاتھی بان نے خان زمان کی طرف رخ کیا خان زمان نے اس سے بہت کچھ کہا کہ میں ایک بڑا سردار ہوں اگر تو زندہ بادشاہ کے پاس پکڑ کر لے جائے تو تجھے بڑا انعام ملے گا، لیکن اجڈ ہاتھی بان نے اس پر ہاتھی کو دوڑا دیا۔ خان زمان ہاتھی کے پیروں کے نیچے اس طرح پامال ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں تک سرمہ ہو گئیں۔

بہادر خان کا قتل

جب جنگ کا میدان ٹھنڈا پڑا تو نظر بہادر، بہادر خان کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے پوچھا کہ "بہادر کہو کیا حال ہے؟ اس نے جواب میں کہا: "الحمد لله علی کل حال" جب اس نے پانی مانگا تو بادشاہ نے اپنے خاصہ میں سے پانی کا پیالہ اسے دیا۔ امراء اس کے زندہ رہنے کو خطرناک سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اصرار کر کے اس کو قتل کرا دیا۔ کچھ دیر بعد خان زمان کا سر بھی ملاحظے میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ پس و پیش میں تھا کہ یہ خان زمان کا سر ہے یا نہیں؟ اسی وقت خان زمان کا وکیل رائے ارزانی جو اسیروں کی صف میں کھڑا تھا، آگے آیا اور مقتول کے سر کو اٹھا کر اپنے سر سے لگایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے علاوہ خواجہ دولت سرائے جو خان زمان کی ملازمت چھوڑ کر بادشاہ کی ملازمت میں آ گیا تھا اور اسے دولت خان کا خطاب ملا تھا اس نے کہا "خان زمان کے سر کی علامت میں بتاتا ہوں۔ وہ چونکہ ہمیشہ پان سیدھے گلے میں رکھا کرتا تھا، اس لیے اس کی سیدھی جانب کے دانت سیاہ ہو گئے تھے"۔ یہ لڑائی بروز پیر یکم ذی الحجہ 974ھ/1566ء کو پیاگ عرف الہاباس کے مضافات میں منکر وال کے قصبہ میں جلوس کے بارہویں سال میں ہوئی تھی۔

اس معرکہ میں جو لوگ قتل ہوئے ان میں ایک مرزا خوشحال بیگ بھی ہے، میں (صاحب منتخب التواریخ) نے مرزا کو مالوہ کے لشکر میں ادہم خان اور پیر محمد خان کے ساتھ ایک محفل میں دیکھا تھا۔ بلا شبہ وہ حسن صورت اور حسن سیرت کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت دل سے بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔

اسی سال علامہ عصر میر مرتضی شیرازی اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو پہنچے۔ انکو پہلے دہلی میں امیر خسرو کے قریب دفن کیا گیا تھا، بعد میں جب صدر الصدور قاضی اور شیخ الاسلام نے عرض کیا کہ امیر خسرو ہندوستانی اور سنی تھے اور میر مرتضی عراقی اور رافضی ہیں اس لیے امیر خسرو کو ان کی قربت سے اذیت ہوگی۔ اس گزارش پر بادشاہ نے دوسری جگہ

دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ بات دونوں مرحومین کے بارے میں ہے بہر حال افسوس ناک تھی۔

اسی سال میرے ایک شناسا شیخ ابوالفتح جو شیخ سعد اللہ ولد شیخ بدھ کے بھائی ہوتے تھے اور بیانہ کے معززین میں سے تھے انتقال کر گئے۔

آگرہ میں افواہیں

میرزا نظام الدین سے میرے (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا اور اس واقعہ کو اپنی تصنیف ''تاریخ نظامی'' میں بھی درج کیا ہے کہ خان زمان کی جنگ کے موقع پر افواہ باز خاص طور سے یوتی اڈھوتی طرح طرح کی وحشت ناک خبریں پھیلاتے رہتے تھے۔ ایک دن چار احباب بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے تفریحاً ہم نے بھی سوچا بڑا مزا آئے گا اور ہم نے یہ افواہ پھیلا دی کہ بادشاہی فوج خان زمان اور بہادر خان کا سر لے کر آرہی ہے چنانچہ یہ خبر ہم نے چند لوگوں کو سنائی اور یہ سارے شہر میں پھیل گئی۔ اتفاق دیکھو کہ جس دن یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی اس دن خان زمان اور بہادر خان قتل کئے گئے تھے اور تیسرے دن مراد بیگ کا باپ عبد اللہ ان دونوں کے سر لے کر آگرہ میں آیا اور وہاں سے دہلی، لاہور اور کابل لے کر گیا۔

اس فتح کے بعد جس کا باغیوں کو گمان بھی نہیں تھا اکبر الٰہ آباد آیا اور ان لوگوں کو جو بارگاہ سے بھاگ گئے تھے یا باغیوں کا ساتھ دے رہے تھے گرفتار کر کے سرکاری افسروں کے سپرد کر دیا۔ میرزا میرک رضوی کو جو دہلی سے بھاگ گیا تھا ہاتھی کے تلے دے دیا گیا مگر ابھی ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ سے رگیدنا شروع ہی کیا تھا کہ بادشاہ نے اس کے سید ہونے کا خیال کر کے معافی عطا کر دی۔ چند دوسرے باغی بھی اپنی سزا کو پہنچے۔ خان زمان کے کچھ آدمیوں کی جنھوں نے اطاعت اختیار کر لی تھی جان بخشی کر دی گئی۔

دو دن بعد بادشاہ بنارس اور وہاں سے جون پور پہنچے اور اس شہر میں تین دن تک قیام کیا اس کے بعد تین چار دن میں حمنہ کرتے ہوئے چار پانچ اشخاص کے ہمراہ کڑہ اور

مانک پور کی سڑک پر گنگا کے کنارے پہنچے شاہی لشکر اسی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کڑہ کے قلعہ میں سواری پہنچی۔

قاضی طوائسی کی حق گوئی

جس وقت خان زمان کے آدمیوں کو قتل کیا جا رہا تھا، قاضی طوائسی لشکر کے قاضی نے جو نہایت دیانت دار اور حق گو آدمی تھا، عرض کیا کہ ان لوگوں کو شکست دینے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ بادشاہ کو اس کی یہ بات بری لگی اس لیے اس کو قضاوت سے معزول کر کے کڑہ کے قاضی یعقوب کو جو علم فقہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور شیر شاہ کے قاضی فضیلت کا جسے لوگ قاضی فضیحت کہا کرتے تھے، داماد تھا۔ ان کو منتخب کر کے طوائسی کی جگہ قاضی بنا دیا۔ یہ شخص علم و فضیلت کے باوجود مسخرہ پن اور ہزل گوئی کا عادی تھا۔ دس سال بعد اُسے بھی معزول کر دیا گیا اور اس عہدہ پر قاضی جلال الدین ملتانی کا تقرر ہوا۔

اکبر نے خان خاناں کی طلبی کے لیے فرمان روانہ کر دیا تھا چنانچہ خان خاناں اسی منزل میں آگرہ سے آ کر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے بہادر خان اور خان زمان کی ساری جاگیر جون پور اور بنارس سے غازی پور اور قلعہ چنار تک اور ادھر زمانیہ سے لے کر چوسہ ندی کی گزرگاہ تک اس کو عطا کر دی اور گھوڑا و خلعت عطا فرمایا اور اس کام پر رخصت کر دیا۔ اس انتظام کے بعد اکبر نے ماہ ذی الحجہ کی 974ھ/1566ء میں عین بارش کے موسم میں کوچ کیا اور محرم 975ھ/ 1567ء میں پایہ تخت پہنچ گیا۔

سکندر اوزبک کے خلاف فوج کشی

محمد قلی خان برلاس اور مظفر خان کی جمعیت کو اودھ میں سکندر اوزبک کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا ان لوگوں نے سکندر کو اودھ کے قلعہ میں گھیر لیا۔ جب اس کو خان زمان اور بہادر خان کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ بھی بدحواس ہو گیا اور امیروں سے صلح کے

مذاکرات کرتا رہا۔ مصالحت کا تو بہانہ تھا امرائے شاہی کو دھوکہ میں رکھ کر وہ کشتی میں سوار ہوگیا اور سریو ندی کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔ پھر وہاں سے اس نے مصالحت کی دوبارہ بات چھیڑی، چنانچہ شاہی لشکر کے چند امیر اس سے گفتگو کے لیے گئے۔ وہ بھی اپنے تین چار آدمیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر آیا اور دونوں فریقوں نے صلح کا عہد و پیمان کرلیا۔ طے یہ پایا تھا کہ امرائے مذکور اسے بارگاہ شاہی میں لے جائیں گے اور سفارش کریں گے مگر اسے کچھ ایسا ہول تھا کہ اس عہد پر قائم نہیں رہ سکا اور پٹھانوں کے علاقہ میں چلا گیا۔ امیروں نے گورکھ پور تک اس کا پیچھا کیا اور سارا ماجرا دربار میں لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے بذریعہ فرمان امراء کو طلب کیا اس وجہ سے اودھ میں محمد قلی خان برلاس کو مقرر کرکے یہ لشکر دارالسلطنت کی جانب چلا گیا۔

چتوڑ کے قلعہ پر حملہ

975ھ/1567ء میں چتوڑ کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا اور بادشاہ نے بیانہ کو حاجی محمد خان سیستانی سے لے کر آصف خان کی جاگیر میں دے دیا، اس کے علاوہ اسے لیاور، وزیر پور اور ماندل گڑھ کی جاگیریں بھی عطا کی گئیں، تاکہ وہ پہلے جاکر لشکر کا ساز وسامان تیار کرلے۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے کوچ کیا اور باری کے راستے سے شکار کھیلتے ہوئے متو، میدات اور پھر وہاں سے سوپر کی طرف گیا۔ لشکر شاہی کی آمد پر رائے سرجن کے آدمیوں نے سوپر کے قلعہ کو خالی کردیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ پر نظر بہادر کو اور کوتہ جلایہ کے قلعہ پر شاہ محمد خان قندھاری کو مقرر فرمایا۔ یہاں سے لشکر قلعہ کا کرون پہنچا اور شہاب الدین احمد خان اور شاہ بداغ خان کو مالوہ کا علاقہ جاگیر میں دے کر ان کو بادشاہ نے محمد سلطان کے بیٹوں میرزا الغ اور شاہ میرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا یہ دونوں باغی ہوکر گجرات میں سلطان محمود کے غلام چنگیز خان حاکم گجرات کے پاس چلے گئے اور مالوہ کا سارا علاقہ بغیر کسی جنگ کے محروسہ کے علاقے میں شامل کرلیا گیا۔

اکبر کی فوج کشی پر رانا اودے سنگھ[21] نے چتوڑ کے قلعہ پر اپنے ایک بہادر

اور دلیر سردار رائے جے مل کو جو قلعہ مرٹہ میں میرزا شرف الدین حسین سے جنگ کر کے بھاگ نکلا تھا، مقرر کر دیا اور خود اودے پور کی طرف کوہ کملو کے گھنے جنگلوں اور بلند پہاڑوں میں جا کر چھپ گیا۔ آصف خان نے بہرام پور پر جو اس علاقہ کا آباد اور بارونق شہر ہے حملہ کیا اور تلوار کے زور پر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ راجہ کا سارا علاقہ پامال ہو گیا۔ حسین قلی خان نے اودے پور کوہ کملو پر فوج کشی کی اور بڑی تباہی مچائی راجا مجبور ہو کر وہاں سے دوسرے مقام پر منتقل ہو گیا۔

قیامت خیز محاصرہ

بادشاہ قلعہ چتوڑ(22) کا محاصرہ کیے ہوئے تھے حکم شاہی کے مطابق قلعہ پر چڑھائی کے لیے سرنگیں کھدوائی گئیں۔ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ دس سوار اس میں اچھی طرح سے آ جا سکتے تھے اور بلندی اتنی تھی کہ ہاتھی سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ قلعے والوں کی آتش باری اور سنگ اندازی سے لشکر کے بہت سے آدمی ہلاک ہو رہے تھے۔ ان کی لاشیں سرنگ میں پتھر اور اینٹ کی جگہ لگا دی جاتی تھیں کافی عرصہ میں جا کر سرنگ اور نقب قلعے کی بنیادوں تک پہنچی۔ قلعہ کے دو متصل برجوں کو نیچے سے کھوکھلا کر کے بارود سے بھر دیا گیا اور بہادر مسلح سواروں کی ایک جمعیت ان برجوں کے قریب پہنچ کر سرنگ کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگی کہ جیسے ہی یہ برج گرے وہ اس راستے سے قلعہ میں داخل ہو جائیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں نقبوں میں جب آگ لگائی گئی تو ایک نقب جس کا فتیلہ نسبتاً چھوٹا تھا، جلد پھٹ گئی دوسری نقب کا فتیلہ کچھ لمبا تھا اس لیے اس کے پھٹنے میں دیر لگی۔ پہلی نقب کے پھٹتے ہی ایک برج بنیاد سے اکھڑ کر فضا میں بکھر گئی اور حصار میں ایک بہت بڑا شگاف پیدا ہو گیا۔ منتظر سواروں نے جن کو دوسرے فتیلہ کا خیال نہیں رہا تھا بے محابا حملہ کر دیا اور قریب پہنچ کر اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگے عین اسی وقت دوسرا فتیلہ سلگ اٹھا اور دوسرے برج کو بھی جہاں غیر اور اپنے تھے اڑا دیا۔ چنانچہ لشکر کے اکثر غازی، بہادر سب کے سب سو سو، دو دو سو من وزنی پتھروں کے نیچے دب کر رہ

گئے۔ ہر طرف ہنگامہ مچ گیا:

این بہ جنت داد آب و آن بدوزخ بردجون
گرچہ خون گبر و مومن ہردو یک جائی دوید

انسانی لاشوں پر کوے اور گدھ کافی دنوں تک جشن مناتے رہے۔ ایسے پانچ سو سپاہی جن میں سے اکثر کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اس حادثہ کی نذر ہوگئے۔ ہندوؤں کے مقتولین تو شمار سے باہر تھے۔ محصورین نے راتوں رات زور لگا کر ان برجوں کی درمیانی دیوار کو دوبارہ تعمیر کرلیا اور محاصرہ میں کم وبیش تقریباً چھ مہینے لگ گئے۔

چتوڑ کے قلعہ کی فتح

25 شعبان975ھ/1567ء منگل کی رات کو شاہی لشکر نے ہر طرف سے حملہ کرکے قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈال دیے۔ اس موقع پر مسلمان حملہ آوروں کی توپوں اور بندوقوں کے شراروں سے جو روشنی پھیلی تو جے مل کی شکل اس روشنی میں دکھائی دی تو ایک بندوقچی نے اس کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور وہ اسی جگہ سرد ہوگیا۔ اس کے گرتے ہی یہ عالم تھا جیسے چڑیوں کی ڈل پر پتھر آن گرا ہو۔ قلعہ بند فوج اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئی اور لوگ اپنے اہل وعیال سمیت آگ میں کود گئے۔ اس طرح آگ میں جل کر مرنے کو ہندوستان میں "جوہر" کہا جاتا ہے۔ جو بچ گئے وہ اکبری تلوار کی نذر ہوئے اور تھوڑی سی تعداد قید ہوگئی۔ اس ہولناک رات میں ساری رات جنگجوؤں کی تلوار نیام سے باہر ہی رہی۔ دوسرے دن قیلولہ کے وقت تک مقتول راجپوتوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس خونی واقعہ کی تاریخ ہے:

دل گفت کہ بکشاد بزودی چتوڑ

دوپہر کے بعد قتال وجدال کا یہ سلسلہ بند ہوا اور سپاہی اپنے ٹھکانے پر لوٹ کر آگئے۔ بادشاہ تین دن تک چتوڑ میں ٹھہرے رہے اور ہر طرف فتح نامے روانہ کیے اور آصف خان کو وہاں کی حکومت سپرد کرکے بروز منگل 25 شعبان کو شاہانہ سواری نے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔

اجمیر کا پیدل سفر

جیسا کہ بادشاہ نے منت مانی تھی، اجمیر جانے کے لیے پیدل جانے کا ارادہ کیا اور بروز اتوار 7 رمضان کو اجمیر پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی اور وہاں صدقہ، خیرات اور نذر گزار کر دس دن بعد واپسی کے لیے سوار ہوئے۔ اجمیر سے بادشاہ نے الور کا رخ کیا اور وہاں شیر کا شکار کیا۔ اس شکار میں شاہ محمد خان نے جو بہادری میں ایک دوسرا شیر تھا، شیر سے تنہا مقابلہ کیا۔ نتیجہ میں دونوں شیر مارے گئے بادشاہ یہاں پر لشکر سے علیحدہ ہو گئے اور نارنول پہنچے۔ نارنول میں شیخ نظام نارنولی بڑے پایہ کے بزرگ تھے اکبر نے انکی زیارت کی اور اپنے لئے ان سے دعا کرائی پھر مسلسل کوچ کرتے ہوئے دارالخلافہ لوٹ آیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی۔ اسی سال اولیاء و مشائخ میں برگزیدہ شیخ عبدالعزیز دہلویؒ نے آخری سفر اختیار کیا۔

976ھ/1567ء میں بادشاہ نے پنجاب سے تمام امراء، اتکہ خیل، کمال خان گکھر کو دربار میں بلالیا اور ان کی جاگیریں حسین قلی خان اور اس کے بھائی اسماعیل قلی خان کے سپرد کر کے انھیں اس صوبہ پر نامزد کر دیا۔ حسین قلی خان اور اس کا بھائی ناگور سے آئے اور رنتھنبور کی فتح کے بعد آگرہ سے پنجاب کی صوبہ داری کے لیے رخصت ہوئے۔ سنبھل اور بریلی کی سرکار خان کلاں کو دے دی گئی۔

باغی مرزاؤں کا تعاقب

محمد سلطان مرزا کے لڑکے گجرات میں چنگیز خان کی پناہ میں چلے گئے تھے۔ گجرات کے حاکم سے بھی ان کی بنھ نہ سکی اور وہ یہاں کی جاگیروں میں مداخلت کر کے بھاگ کر مالوہ آ گئے۔ ان کے مقابلے میں محمد مراد خان اور مرزا عزیز اللہ مشہدی اجین کے قلعہ میں محفوظ ہو گئے۔ اشرف خان میر منشی اور صادق محمد خان ایک بھاری لشکر کے ساتھ رنتھنبور کی مہم پر بھیجے گئے انکو جب مرزاؤں کی حملے کی خبر ملی تو انھوں نے بادشاہ سے اجازت لے کر قلیچ

خان کے ساتھ جسے ان کے بعد اس قلعہ کو تسخیر پر مقرر کیا گیا تھا۔ مرزاؤں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے اجین کا رخ کیا۔ سرونج میں شہاب الدین احمد خان اور سارنگ پور میں شاہ بداغ خان بھی ان امیروں سے آ کر مل گئے، اس طرح ایک بڑی فوج منظم ہوگئی۔ مرزاؤں کو جیسے ہی اس لشکر کشی کی اطلاع ملی وہ اجین سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہی امیروں نے ان کا پیچھا کیا جب مرزاؤں نے نربدا ندی کو پار کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ جھجار خاں حبشی نے ترپولیہ کے میدان میں چنگیز خان کو غافل پا کر قتل کر دیا ہے اور گجرات ترکتازیوں کے لیے خالی پڑا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی ان لوگوں نے گجرات کا رخ کیا اور پہلے ہی حملہ میں چمپانیر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے بڑھ کر بھڑوچ کے قلعہ کو گھیر لیا اور کچھ عرصہ بعد محصور قلعہ دار رستم خان رومی کو سازش اور حیلہ سے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اس قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ قلیچ خان اور صادق محمد خان دوسرے شاہی امیروں کے ساتھ نربدا کے کنارے سے لوٹ کر دربار میں آ گئے اور مندو کے جاگیردار اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔

رنتھمبور کے قلعہ کی فتح

اسی سال 976ھ/1567ء کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے اور چند دن پالم کے پرگنے میں ہانکے کا شکار کھیلتے رہے یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ رنتھمبور پہنچا۔ تھوڑی مدت میں سرنگیں قلعہ کی دیواروں تک کھود لی گئیں۔ قلعہ کے مقابل رن کی نہایت دشوار گزار پہاڑی تھی۔ شاہی حکم پر سات آٹھ سو کہاروں نے مل کر پندرہ بڑی بڑی توپیں جو پانچ پانچ سات سات من کا گولہ پھینکتی تھیں اس پہاڑی پر پہنچا دیں۔ ان توپوں کی گولہ باری سے پہلے ہی دن قلعہ کے اندر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ قلعہ کے حاکم رائے سرجن نے قلعہ چتوڑ کی بربادی اور وہاں کی تباہی و ذلت دیکھ کر اس کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی لڑکیوں دودا اور بھوج کو بعض زمینداروں کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور جان بخشی کی اجازت طلب کی۔ حسین قلی خان جہاں اس کی تسلی کے لیے روانہ کیا گیا جو رائے سرجن کو دربار میں لے آیا۔ اس نے قلعہ کی کنجی سپرد کر دی۔ اسی طرح بدھ کے دن 3

شوال کو یہ قلعہ فتح ہو گیا۔

اکبر نے دوسرے دن چند آدمیوں کے ہمراہ قلعہ کی سیر کی اور قلعہ مہتر خان سلطانی کے سپرد کر دیا اور خود حضرت خواجہ اجمیریؒ کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجمیر سے بادشاہ کی سواری بہت جلد 24 ذی قعدہ 976ھ/ 1567ء کو آگرہ واپس ہو گئی اسی سال آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ چیاپول بن کر مکمل ہو گیا۔

اکبر شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک لڑکے ہوئے تھے لیکن وہ کمسنی ہی میں اس دنیا سے گزر گئے اس سال بادشاہ کی ایک بیوی(23) حاملہ ہوئی۔ بادشاہ نے شیخ سلیم چشتی سیکری(24) سے دعا کرائی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر پر بجھوا دیا۔ شیخ نے اس سے پہلے ہی شاہزادہ کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور شاہنشاہ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ اکثر شیخ کے گھر پر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدہ کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ سے اس تعلق و ربط و ضبط کی وجہ سے بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت(25) کا سنگ بنیاد رکھا اور ایک نئی خانقاہ بنوائی جو وسعت و بلندی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے اور دنیا میں ایسی مسجدیں کم ہی ہوں گی۔ یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی اس بستی کا نام فتح پور(26) رکھا گیا اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔ امیروں نے بھی وہاں محل، باغات اور عمارتیں تیار کرائیں۔

شیخ سلیم چشتی نے اپنے گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کر دیا تھا، ان کے عزیزوں اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔(27) شیخ نے جواب دیا، تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے۔ دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے، دوسری بیویاں کر لو، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے:

یا مکن با فیلبانان دوستی
یا بنا کن خانہ در خورد فیل

ایک دلگداز داستان عشق

اس سال کا دلچسپ وعجیب واقعہ سید مکری گرم میری کے لڑکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات گھرانے کا نوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا۔ وہ آگرہ میں ایک سنار کی لڑکی موہنی نامی پر عاشق ہوگیا اور دونوں میں عشق و محبت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ جس وقت رنتھنبور پر لشکر کشی ہوئی تھی وہ لشکر کے ساتھ نہیں گیا اور آگرہ کے قلعہ کے پاس جمنا ندی کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا۔ اس کا عشق جنون تک جا پہنچا تھا۔ چنانچہ اپنے بھروسے کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دوبار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا۔ لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ سپاہیوں نے یا سناروں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس طرح کوئی دوسال چار مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں یہ عاشق و معشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرلیتے تھے۔ لیکن عشق تو روکے نہیں رُکتا اور یہ درد آخر کب تک؟ ایک رات موہنی کے اشارہ پر وہ کمند لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا اور وہ رات دونوں نے ایک دوسرے کی ہم آغوشی میں گزاری لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے۔

رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کرکے اور ننگ وناموس کا خیال چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے۔ غرض وہ دونوں اس محلّہ سے نکل کر بھاگ کر موسیٰ کے ایک دوست کے گھر پر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کرکے ایک فتنہ مچادیا۔ سید موسیٰ جس کا میرے ساتھ بڑا یارانہ تھا۔ موسیٰ نے سناروں کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر رخصت کردیا۔ جب موہنی کو اس ہنگامہ کی اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر ہوئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعہ اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے چاہنے والے کو رخصت کردیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ گئی۔ گھر جاکر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا

کہ "اس رات میں بے خبر سو رہی تھی ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو موجود پایا اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پہ جواہرات جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس نے میرے چہرے پر کوئی افسون پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اس نے اپنے پروں میں چھپالیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ وہاں لے جا کر اس نے مجھے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار محل میں رکھا۔

جاہل سناروں نے اس افسانہ کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ اس واقعہ کو چھپاتے، لیکن غصہ کے مارے انھوں نے چند دن تک موتی کو بالا خانہ میں قید کر دیا۔ سید موسیٰ بے چارہ دردِ فراق میں تڑپتا رہا۔ موتی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہی ہو گیا۔ ان دونوں کی عشق بازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی، پھر جس کے منھ جو بات چڑھتی کوٹھوں پہنچ جاتی، آخر کار موتی نے ایک مشاطہ کے ذریعہ موسیٰ کے پاس کہلوا بھیجا اور اسے تسلی دی کہ میں نے بڑی مشکل اور حیلہ گری سے کام لے کر ان لوگوں کے ہاتھ سے نجات حاصل کر لی ہے اور ہر طرح مطمئن ہوں۔ سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ دونوں نے رو دھو کر ایک دوسرے کو الوداع کیا۔ ایک راز دار کو وہاں چھوڑ کر وہ اپنی ملازمت پر رتھنبور چلا گیا۔

موتی نے موسیٰ کو خود سے دور بھیج تو دیا لیکن اس کے چلے جانے پر دن گزارنا اور رات کاٹنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا جب فراق کے صدمے سہے نہ جا سکے تو چند دن بعد اس نے اس راز دار سے مل کر کہا رات کے وقت تم ہمارے گھر آ کر فقیروں کی طرح صدا لگانا اور میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤں گی، پھر تم مجھے اس شہر سے نکال کر لے جانا چنانچہ مقررہ وقت پر وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل آئی۔ اس خادمہ کو جو اس کی نگرانی پر مقرر تھی کسی کام کے بہانے بھیج دیا اور راز دار کے ساتھ بھاگ گئی۔

ان لوگوں نے سفر کی تیاری پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں چھپے رہے۔ جب ہر طرح اطمینان کر لیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن خدا کو

منظور نہ تھا۔ اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستہ پر آنکلا اور اس نے موہنی کو پہچان کر پکڑ لیا۔

اس زمانہ میں آگرہ کا کوتوال پہلوان جمال تھا۔ اس کے سپاہی موقع پر آپہنچے۔ انھوں نے موہنی کو تو اس کے رشتہ داروں کے حوالہ کیا اور بھگا لے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ وہ بیچارا کافی عرصہ تک قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا رہا آخر بڑی مشکل سے رہائی نصیب ہوئی۔

جب بے چارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ پہلے ہی درد و فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ بس مرنے کے قریب آگیا۔ وحشت و جنون کے عالم میں آگرہ جانا چاہتا تھا، لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بجھا کر، ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ جب لشکر دار الخلافہ کو لوٹ آیا تو سید موسیٰ کا حال اور برا ہوگیا۔ چونکہ موہنی کو ایک محفوظ مقام پر رکھا تھا اس لیے ہزار کوشش کے باوجود وہ غریب اپنی محبوبہ کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔ سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا۔ یہ شخص کالپی کے علاقے میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی، جرأت سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اُس مکان پر جا پہنچا جہاں پر موہنی نظر بند تھی اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز گھوڑے پر سوار کر لیا اور دریائے جمنا کے چڑھاؤ کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگا دیا۔ موہنی کے رشتہ دار اس کا پیچھا کرنے لگے اور سامنے سے شہر کے لوگ بھی دوڑ کر پہنچ گئے۔ گھوڑا بہت تیز تھا مگر راستہ میں بہت نالے اور گڑھے تھے اس لیے بچ کر نکل نہ سکا۔ جب موہنی نے یہ حال دیکھا تو اس نے خود کو گھوڑے سے نیچے گرادیا اور قاضی سے کہا کہ تم بچ کر نکل جاؤ میرا سلام اس بے چارے تک پہنچا دینا۔

جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو وہ بالکل ہی مایوس ہوگیا، آگرہ کے قلعہ میں اپنے دروازے کو بند کر بیٹھ رہا اور اس صدمے کے مارے جلد ہی اس کی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی۔ مرتے وقت اس نے انتہائی یاس و محرومی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا:

ازیار دلم ہزار جان یافت
یاری بہ از و نمی توان یافت

پھراس نے کہا" اے اللہ اس درد کو مجھ بدنصیب کی روح کے ساتھ وابستہ رکھنا"

بزن بر سینہ ام خنجر جدا کن سر از تن ہم
درین خانہ تاریک رابکشای در و روزن ہم

جب وہ مرگیا تو اس کی میت کو دفنانے کے لیے اٹھایا گیا۔ لوگ اس جوان مرگ کی موت پر ماتم کرنے لگے، اس کا جنازہ موہنی کے گھر کی طرف سے نکالا گیا۔ موہنی کو اس کے گھر والوں نے پیروں میں زنجیر ڈال کر قید کر رکھا تھا۔ اس نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا، تو جس حال میں تھی اسی حال میں مبہوت و متحیر رہ گئی۔ اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کوٹھے پر کھڑی بے قرار نگاہوں سے اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازہ کو سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ آخر کار اس کی یہ بے حسی ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہوکر اسی حالت میں ایک چیخ مار کر اونچے کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور پیروں کی زنجیر توڑ نے لگی نتگے پیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے بدنصیب عاشق کے محلے میں جا پہنچی۔ اس کی حالت برابر بگڑتی چلی گئی۔ کبھی تو بے حس و حرکت مدہوش رہتی اور کبھی خاموش و حیرت زدہ نظر آتی۔ ماں باپ نے اس کا یہ حال دیکھا تو صبر کر کے بیٹھ رہے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

جلد ہی اس بے چاری کا برا حال ہو گیا دیوانوں کی طرح اپنے آپ میں الجھتی رہتی۔ سینہ پیٹتی اور سید موسیٰ کے نام کا ورد کرتی رہتی۔ اسی حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانہ پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قد سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔ قارئین مجھے معاف کریں (صاحب تصنیف) میں نے اختصار کا وعدہ کیا تھا لیکن کیا کروں عشق کی اس دل گداز داستان نے میرے قلم کو بے قابو کر دیا۔

شیخ زادہ محبت کے جال میں

عشق و محبت کا ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ گوالیار میں شیخ محمد غوث کے

عزیزوں میں ایک نوجوان شیخ زادہ تھا جو پاک بازی اور نیک چال چلن میں مشہور تھا۔ آگرہ میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہوگیا۔ یہ خبر شاہنشاہ کو ملی تو انھوں نے اس گانے والی کو ایک مصاحب مقبل خان کے حوالہ کر دیا۔ اس شیخ زادے نے جان ہتھیلی پر لے کر اس محل پر کمند لگائی جس میں اس کی محبوبہ کو چوکی پہرہ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے اسے نکال کر لے گیا۔ بادشاہ نے شیخ محمد غوث کے لڑکے شیخ ضیاء الدین کو جو اس وقت اپنے باپ کے گدی نشین تھے ان دونوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر ان دونوں کو بادشاہ کے رو برو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کا نکاح کر دینا چاہا لیکن شیخ ضیاء الدین اور کچھ دوسرے لوگوں نے بادشاہ کو اس ارادے سے روک دیا۔ نوجوان شیخ زادہ اس مخالفت کی تاب نہ لا سکا اور خنجر کھینچ کر اپنا کام تمام کر لیا۔

اس کی تجہیز و تکفین پر علماء میں بڑا اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین کا کہنا تھا کہ حدیث شریف "من عشق و عف و کتم ثم مات مات شہیداً" کے مطابق وہ شہید عشق ہے اس لیے اس کو شہید کی شان و شوکت سے دفنانا چاہیے۔

ان کے علی الرغم شیخ عبد النبی اور دوسرے عالم اور قاضی کہتے تھے وہ ناپاک مرا ہے آلودۂ فسق ہے نہ کہ آسودۂ عشق واللہ اعلم۔

اپنے عاشق کے پیچھے اس مطربہ کا برا حال ہوگیا چنانچہ اس نے سب کچھ چھوڑ کر ایک کفنی گلے میں ڈال لی اور عاشق کے مزار پر مجاور بن کر جا بیٹھی۔ چند ہی دن بعد اپنے چاہنے والے سے جا ملی۔

اسی سال شیخ گدائی کنبوہ دہلوی جو معزول کوتوال کی طرح بے آبرو جی رہا تھا اور جو زمانہ کی ڈھیل کی وجہ سے نہایت متکبر و مغرور ہو چکا تھا، فوت ہوگیا۔

کالنجر کے قلعہ پر قبضہ

977ھ/1569ء میں جب چتوڑ اور رنتھمبور کے قلعوں کی فتح کی خبریں ملک میں ہر جگہ پہنچیں

اور ہندوستان کے سارے قلعے شاہی حملے کی بدولت زمین بوس ہوتے ہوئے نظر آئے، تو بھٹہ کے حاکم چندر نے بڑی دوراندیشی سے کام لیا، اس سے پہلے کہ ذلیل وخوار ہونا پڑے، اس نے کالنجر کا قلعہ، جسے اس نے خوانده بہادر خان شروانی کے لڑکے بجلی خان سے بھاری قیمت دے کر خریدا تھا، بادشاہ کے سپرد کردینے کا فیصلہ کیا اور قلعہ کی کنجی نفیس تحائف کے ساتھ دربار میں بجھوادی۔ بادشاہ نے کالنجر کی کنجی مجنون خان قاقشال کو جس کی جاگیر قلعہ سے قریب تھی عطا کردی اور راجہ رام چندر کے نام تسلی آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے جھوی اور پریاگ کے قریب پرگنہ اریل بشمول تمام عمارتوں کے جاگیر میں عطا کیا۔

شاہزادہ سلیم کی پیدائش

17 ربیع الاول 977ھ/1569ء، دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتی کے مکان پر (28) شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی۔

شہنشاہ آگرہ سے نہایت تیزی سے ساتھ فتح پور پہنچے اور انتہائی خوشی کے عالم میں انھوں نے تمام قیدیوں کو رہا کردینے کا حکم دیا۔ شہزادہ کی ولادت کی مسرت میں سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر شاعروں نے مبارک بادی کے قصیدے کہے۔ خواجہ حسین مروی نے جو قصیدہ کہا تھا اس کے ہر مصرع سے بادشاہ کی تاریخ جلوس اور دوسرے مصرع سے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ اس قصیدہ کے صلے میں بادشاہ نے اسے دولاکھ تنکہ کا انعام دیا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

للہ الحمد از پئی جاہ جلال شہریار
گوہر مہد از محیط عدل آمد برکنار

آخری شعر ہے:

شاہ ما پایندہ باد و باقی آن شہزادہ ہم
روزہای بی حساب و سالہای بی شمار

آخر میں تاریخ کے متعلق مروی نے کہا ہے:

پادشاہا سلک لولوئی نفیس آوردہ ام　　ھدیہ کان آمد باز جوئی گو شمار
کس ندارد ہدیہ زین بہ اگر دارد کسی　　ہر کہ دارد گو بیا چیزی کہ دارد گو بیار
یک بہ یک اشعار مروی بسکہ بی عیب آمدہ　　ہر یکی جوئی زدی مقصود در پای دربار

مصرع ازل زدی سال جلوس بادشاہ
از دوم مولود نور دیدۂ عالم بر آر

شیخ یعقوب صیرفی کشمیری نے بھی اسی اسلوب میں ایک قصیدہ کہا تھا لیکن کیا فائدہ جس کو صلہ ملنا تھا مل چکا۔

جمعہ 12 شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادے کی ولادت کے شکرانے میں آگرہ سے پیدل اجمیر کا سفر کیا۔ ہر روز چھ سات کوس طے کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی(20) کی زیارت کرنے کے بعد رمضان المبارک میں وہاں سے واپس آئے اور دہلی میں قیام فرمایا۔ چند دن دہلی کے اولیاء اللہ کی زیارت کی پھر جمنا کے دوسرے کنارے پر شکار کھیلا اور وہاں سے دارالخلافہ لوٹ آئے۔

رافضیوں کو قتل کی سزا

اس سال بادشاہ نے میرزا مقیم اصفہانی اور ایک شخص میر یعقوب کشمیری کو رافضی ہونے کے جرم میں فتح پور میں قتل کرا دیا۔

مرزا مقیم لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک حسین خان کی ملازمت میں رہا تھا۔ حسین خان سیدوں کا بڑا معتقد تھا اس لیے وہ مرزا کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا اس نے مرزا کو اپنی سرکار کا وکیل بھی بنا دیا تھا۔ حسین خان کے عزیزوں اور بھائیوں نے خان کو بتلایا کہ یہ مرزا کٹر رافضی ہے اس لیے خان اس سے نفرت کرنے لگا، مرزا بھی حسین خان کی ملازمت چھوڑ کر بارگاہ شاہی میں جا پہنچا۔ بادشاہ نے اس پر مہربانی کی اور اسے کشمیر کے حاکم حسین خان کے پاس وکیل بنا کر بھیج دیا۔ اس زمانہ میں کشمیر میں چند

متعصب رافضیوں نے قاضی حبیب کو جو پکے سنی تھے، مذہبی تعصب میں حملہ کرکے زخمی کردیا۔ قاضی ابھی زندہ ہی تھے کہ کشمیر کے حاکم حسین خان نے مفتیوں کے فتوے کے مطابق قاتل کو سزائے موت دے دی۔ مرزا مقیم نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور اپنے اثر سے کام لے کر ان مفتیوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا؟ ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کردیا اس نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا، ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کردیا اس نے تین چار مفتیوں کو قتل کردیا۔ اس معاملے کے کچھ عرصہ بعد ہی مرزا مقیم اور حسین خان کا وکیل میر یعقوب حسین خان کی لڑکی کو بادشاہ کے پاس پیش کش کی رسم کے لیے لے آئے۔ اس موقع پر یہ واقعہ بادشاہ کے علم میں لایا گیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو شیخ عبدالنبی اور اس کے رشتہ دار دوسرے چند علماء کے فتوے پر فتح پور کے میدان میں قتل کرادیا۔ اس واقعہ کا ذکر کشمیر کی تاریخ میں بھی جیسا میں (صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی) نے مرتب کیا ہے درج کیا گیا ہے۔

سوالک پہاڑی کے بت خانے

مہدی قاسم خان حج سے واپس آکر قلعہ رنتھمبور میں حاضر ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے لکھنؤ کا پرگنہ حسین خان سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کارروائی سے حسین خان کو بہت رنج ہوا۔ مہدی قاسم خان کی لڑکی اس کے نکاح میں تھی، اس سے خان کو محبت بھی تھی لیکن محض انتقام کے مارے اس نے اپنے چچا غضنفر بیگ کی لڑکی سے نکاح کرلیا اور مہدی قاسم خان سے تعلقات منقطع کرلیے۔ کچھ عرصے بعد اس نے مہدی قاسم خان کی لڑکی کو خیرآباد میں اس کے بھائیوں کے پاس بھیج دیا اور جہاد کا ارادہ کرکے لکھنؤ سے اودھ کے راستے سوالک کی پہاڑی کا رخ کیا۔ پہاڑی کے بت خانوں کے متعلق یہ جھوٹی شہرت تھی کہ وہاں بت کدوں کی اینٹیں سونے اور چاندی کی ہیں اور بڑے بڑے خزانے جمع ہیں۔ سوالک کی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں اس نے اس مہم کا راستہ اختیار کیا تھا۔

حسین خان کا سوالک پر حملہ

پہاڑیوں کا طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی ان کے علاقہ پر حملہ کرتا ہے تو وہ تھوڑا بہت مقابلہ کر کے پہاڑوں کے اندر چھپ جاتے ہیں اور وہاں اونچی اونچی خطرناک پہاڑیوں پر مضبوط مورچہ بندی کر لیتے ہیں۔ حسین خان بھی انکو پسپا کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچا جہاں پر محمد خان کا بھانجہ سلطان محمود شہید ہوا تھا۔ اس جگہ شہیدوں کی بہت سی قبریں تھیں۔ حسین خان نے شہدا کے لیے فاتحہ پڑھی اور ان کی شکستہ قبروں پر چبوترے کی تعمیر کرائی اور پھر وہاں پہاڑوں کے اندر اور آگے تک پیش قدمی کی اور وہاں کے ایک بہت بڑے زمیندار راجہ رنگا کے علاقہ پر حملہ کر کے قصبہ و جرائکل کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کر دیا۔ وہاں سے اجمیر تک جو راجہ رنگا کا پایہ تخت تھا اور تبت کے مال و اسباب، مشک، ریشم اور سونے چاندی کی بہت بڑی منڈی تھی وہاں تک، صرف دو دن کا راستہ رہ گیا تھا، لیکن جیسا کہ ان پہاڑوں کی خصوصیت ہے کہ گھوڑوں کے ہنہنانے، نقارہ کی آواز اور آدمیوں کے شور کی وجہ سے سخت بارش ہونے لگی اور جلد ہی غلہ اور گھاس کا قحط پڑ گیا، لشکری بھوک سے مرنے لگے۔ حسین خان نے اپنے لشکر کو، شہر فتح کرنے کی بہت ترغیب دی اور وہاں کے سونے جواہر اور خزانوں کا بڑا لالچ دیا لیکن لشکری ایسے بد حواس ہو چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی اقدام کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ واپسی کے وقت ہندوؤں نے حسب معمول راستے روک دیے اور لشکریوں پر تیروں کی بوچھار کر دی ان کے تیروں میں زہر آلود ہڈیوں کے پھل لگے ہوئے تھے لشکر کو جگہ جگہ پر گھیر گھیر کر سنگ باری کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین خان کے اکثر تجربہ کار اور جنگ آزما بہادر، ان پہاڑوں میں شہید ہو گئے اور جو لوگ زخمی ہو کر واپس آئے وہ بھی پانچ چھ ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔ زہر کے اثر سے وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اس واقعہ کی تاریخ ''تیغ بی مزہ'' نکالی گئی۔

حسین خان کی ناکام واپسی

حسین خان سوالک کی پہاڑی سے ناکام و نامراد دربار میں لوٹ کر آیا۔ اس نے پہاڑیوں

سے انتقام لینے کے لیے بادشاہ سے کانت وگولہ کی جاگیر کے لیے جو اس پہاڑ کے دامن میں واقع ہے درخواست کی، بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس نے وہاں جا کر کئی بار پہاڑ کے دامن کے علاقوں پر حملہ کیا اور ان کو تہ وبالا کر دیا لیکن پہاڑ کے اندرونی علاقوں میں داخل نہیں ہو سکا۔ اس کے لشکر کے بہت سے آدمی جو پہلی مرتبہ موت کے پنجے سے بچ کر نکل آئے تھے اس مرتبہ وہاں کے زہریلے پانی کے اثر سے بغیر جنگ کے ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ چند سال بعد حسین خان نے جان ہتھیلی پر لے کر پہاڑی علاقے پر بھی جان سے حملہ کیا اور دور تک اندر چلا گیا، لیکن اسے ان خونی پہاڑوں میں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

بھائی اور بیٹے کا انتقال

اس سفر کے موقع پر میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبد القادر بدایونی) حسین خان سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایوں آ گیا تھا۔ بدایوں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا، ایک اچھے گھرانے میں شادی کروا دی۔ یہ شادی، شادی نہیں بلکہ بربادی تھی کیوں کہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمد اور میرا لڑکا عبد اللطیف بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔

ہمایوں کے مقبرہ کی تعمیر

اسی سال دہلی میں جمنا کے کنارے میرک مرزا غیاث کے زیر نگرانی ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ اٹھ نو سال بعد مکمل ہو گیا۔ یہ عمارت واقعی نہایت حیرت انگیز اور پر فضا ہے۔

شاہزادہ مراد کی ولادت

جمعرات کے دن تیرہ ماہ محرم978ھ/1570ء کو شیخ سلیم” کے مکان پر شاہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ نے سابقہ جشن کی طرح ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔

قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد

فتح پور میں بادشاہ نے بارہ دن قیام کیا۔ اس کے بعد نذر گزارنے کے لیے اجمیر تشریف لے گئے اس مرتبہ وہاں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور امراء کو عمارتوں کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ جمعہ کے دن 4 جمادی الآخر کو وہاں سے کوچ ہوا اور بادشاہ ناگور پہنچے۔ اس شہر کے بڑے تالاب کو کھدوانے کے لیے امیروں کو مامور کیا گیا اور اس کا نام "شکر تلاؤ" رکھا گیا۔

اسی زمانہ میں حاکم مارواڑ مالدیو کا لڑکا چندر سین دربار میں حاضر ہوا۔ بیکانیر کا راجہ رائے کلیان مل بھی اپنے لڑکے رائے سنگھ کے ساتھ آیا، کلیان مل اپنی لڑکی کو پیش کش کے لیے لایا تھا چنانچہ وہ حرم میں داخل کر لی گئی، باپ کو تو بیکانیر واپس جانے کی اجازت مل گئی لیکن بیٹے کو خدمت شاہی میں ہمراہ رہنے کا حکم ہوا۔ راستہ میں بادشاہ نے گورخر کا شکار کیا۔ یہ شکار اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بادشاہ شیخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کے لیے اجودھن کی طرف جو پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے، گئے۔ وہاں مرزا عزیز کوکہ اعظم خان جاگیر دار تھا، اس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑا پرتکلف جشن منعقد کیا اور بادشاہ کے نذرانے میں نفیس اور قیمتی تحفے دیے ایسی ضیافت کم ہی دیکھنے میں آئے گی۔

پٹن سے بادشاہ لاہور تشریف لائے اور حسین قلی نان کے مہمان رہے، پھر حصار فیروزہ کے راستے دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں سے مسلسل کوچ کر کے فتح پور لوٹ آئے۔

ٹھٹھہ کی فتح

میر خلیفہ کا لڑکا محب علی خان پیشہ سپاہ گری ترک کر کے مدت سے بیٹھا ہوا تھا، اس کی بیوی ناہید بیگم کی سفارش پر جس کی ماں مرزا عیسیٰ خان حاکم ٹھٹھہ کے عقد میں تھی، بادشاہ نے اسے علم ونقارہ عطا کیا اور ملتان میں جاگیر عطا فرمائی۔ حاکم ملتان سعید خان مغل کو اس کی مدد کے لیے فرمان لکھا اور اسے اس کے پوتے مجاہد خان کے ساتھ جو ایک دلیر اور بہادر نوجوان تھا ٹھٹھہ کو فتح کرنے کے لیے مقرر کر دیا وہ دارالخلافہ سے ملتان آیا اور اپنی جاگیر

کے انتظام کے لیے چار سو سوار مقرر کر کے بھکر کے حاکم محمد سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ "تم نے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اگر تم جیسلمیر کے راستے سندھ کی فتح کا ارادہ کرو تو میں تمہارے لیے مدد روانہ کروں گا ورنہ میں بھکر سے اس فوجی مہم کی اجازت نہیں دونگا کیوں کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے"۔ اس کے اس انکار پر محب علی خان اور مجاہد خان کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور بھکر کی فوج شکست کھا کر ماتیلہ کے قلعہ میں محصور ہوگئی۔ آخر وہ قلعہ بھی صلح اور امان کی شرط پر محب علی خان کو مل گیا۔ سلطان محمود نے بھکر کے قلعہ سے اپنے بقیہ لشکر کو توپچیوں اور تیر اندازوں کے ساتھ مقابلہ پر بھیجا۔ وہ بھی شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ میں بند ہو گئے اس حملہ کے وقت قلعہ میں لوگوں کا ہجوم سا ہو گیا تھا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے قلعہ کی ہوا خراب ہوگئی اور قلعہ والوں میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا ایسی سخت تھی کہ روزانہ کم و بیش ہزار آدمی جان سے جا رہے تھے۔ 983ھ/1575ء میں اسی معرکہ کے دوران سلطان محمود جو کافی بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا فوت ہو گیا اور بھکر کا قلعہ بادشاہی فوج کے قبضہ میں آگیا۔ بادشاہ نے قلعہ کے ذخیروں اور مال و اسباب کی تحقیق کے لیے میر گیسو کو فتح پور سے روانہ کیا تھا۔

اسکندر خان اوزبک کی اطاعت اور وفات

اسکندر خان اوزبک پٹھانوں کو چھوڑ کر منعم خان خان خاناں کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے سبب آگیا۔ چنانچہ منعم خان جون پور سے اس کو لے کر اسی سال دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دونوں کو مرصع تلوار، چہار پارچہ خلعت اور سنہری زین والا گھوڑا انعام میں دیا نیز اسکندر خان کو لکھنؤ کی جاگیر عطا فرمائی۔ اسے خان خاناں کی مدد پر مقرر کر کے جونپور رخصت کر دیا۔ اسکندر خان نے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی دس جمادی الاول 980ھ/1572ء میں وفات پائی۔

میرا ایک دوست جمال ولد شیخ منگن بدایونی جو نہایت حسین و جمیل شخص تھا، سنبھل میں عید قربان کے دن تیر اندازی کر رہا تھا، اسے ایک اجنبی شخص نے پان کا بیڑا دیا۔ جیسے

ہی اس نے یہ پان کھایا وہ مر گیا۔

979ھ/ 1571ء میں آگرہ میں ایک شاندار محل اور اس طرح فتح پور کے نئے شہر میں دوسرا محل بن کر تیار ہوگیا۔

شیخ سلیم چشتی کی وفات

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخر میں شیخ سلیم چشتی فتح پوری نے جو ہندوستان کے برگزیدہ شیخ اور بلند مرتبہ بزرگ تھے، رحلت فرمائی۔

عشق کا خمیازہ

اس سال مجھے (صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی) ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہے کہ جس وقت محمد حسین خان کو کانت وگولہ کی جاگیردی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصہ تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبہ کی صدارت اور فقرا کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے علاقے میں بمقام مکن پور حضرت شاہ مدار[30] کا مزار ہے میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا ہوا تھا۔ انسانوں کی کمزوری آدم سے چلی آرہی ہے۔ آخر میں نے بھی انسان کا دودھ پیا ہے، خطا و نسیان سے بالا تر نہیں ہوں میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور یہاں ایک خوبرو کی کرشمہ دار ادا نے مجھے محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ میں اس حرص و ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ گزری گزری، اس درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہوگئی تو اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس دنیا میں ہی مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا چنانچہ میرے سر ہاتھ کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے مگر دوسرے تمام زخم تو مندمل ہوگئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ کر انگلی لٹکنے لگی تھی بس صرف جان رہ گئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثہ کو جھیل گیا۔ قصبۂ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا

اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری اور مصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں تو حج کروں گا، لیکن افسوس ہے میں نے ابھی تک اپنے وعدے کو پورا نہیں کیا ہے۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد میں وہاں سے کانت و گولہ چلا گیا، غسل صحت کے بعد ہی میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خان کو خدا جنت عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز(131) کا مرہم اور کھانے کے لیے گز کا حلوا تیار کرا دیا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا آیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منھ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں، وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے جس میں دیوانی کے کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں اور چوکیداروں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور مودب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا پھر اس نے کہا "یہ وہ شخص نہیں" اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی اور میں بہت شرمندہ ہوا۔ میں نے بچپن میں جو افواہ(132) سن رکھی تھی اس موقع پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔

بدایوں کی آتشزدگی

اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثہ میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی، چنانچہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے، بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور

بلند ہوتے جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں (صاحب منتخب التواریخ یعنی ملا عبد القادر بدایونی) نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس کی لپٹیں میرے کان تک پہنچ چکی تھیں۔ اس حادثہ سے پہلے کا قصہ ہے کہ دو آب کا ایک مجذوب بدایوں آیا تھا میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا ”اس شہر سے نکل جاؤ“۔ میں نے پوچھا ”کیوں؟“ مجذوب نے جواب دیا ”یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے“۔ وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا اس لیے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا

چہ پرسی از بداؤن و ز احوال پریشانش   کہ آیات عذاب النار نازل گشتہ در شانش

گجرات پر فوج کشی

980ھ / 1572ء میں گجرات فتح ہوا۔ گجرات میں بڑا انتشار اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے گجرات پر حملہ کی تیاریوں کا حکم دے دیا اور فوج کو حاضر ہو جانے کے لیے فرمان جاری کر دیے۔ گجرات کی مہم کے لیے 20 صفر کو پایہ تخت سے روانگی عمل میں آئی۔ 15 ربیع الاول کو اجمیر میں لشکر نے چھاؤنی قائم کی۔ اجمیر میں بادشاہ نے پہلے تو حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی پھر دوسرے دن وہ میر سید حسین خنگ سوارؒ کی زیارت کے لیے پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے میر موصوف کی شان میں یہ شعر مشہور ہے:

شکر اللہ بدل تافتہ انوار علی   از حسین ابن علی ابن حسین ابن علی

ان زیارتوں سے فارغ ہو کر بادشاہ نے ہراول میر محمد خان کلاں کی سرکردگی میں آگے روانہ کر دیا اور شاہی سواری مسلسل کوچ کر کے نویں جمادی الاول کو ناگور پہنچی۔

شاہزادہ دانیال کی ولادت

اجمیر کے قیام کے دوران میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی)

جمعرات کی رات کو دوسری ماہ جمادی الاول کو ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر میں شاہزادہ دانیال کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ کو یہ خوشخبری ناگور کی دوسری منزل میں پہنچائی گئی شیخ دانیال کی نسبت سے شاہزادہ کا نام دانیال تجویز کیا گیا۔

سروہی کی جنگ

جب لشکر شاہی میرٹھ پہنچا تو خبر ملی کہ سروہی کے مقام پر ایک راجپوت نے ایلچی گری کے بہانے خان کلاں پر جمدھر(۱) سے حملہ کر دیا۔ جمدھر خان کے سینہ میں اندر تک گھس گیا اور اس کی نوک شانہ کی پیچھے نکل آئی۔ لوگوں نے حملہ آور کو اسی وقت مار ڈالا۔ خان کلاں کو گہرا زخم آیا تھا، لیکن خیریت ہوئی کہ وہ زخم دس پندرہ دن میں بھر گیا۔ جب لشکر سروہی پہنچا تو سو ڈیڑھ سو راجپوتوں نے اپنی رسم کے مطابق کچھ نے نوبت خانہ میں اور کچھ نے راجہ سروہی کے محل میں جان دے دینے کا اقرار کیا اور مقابلہ کرنے کے لیے نکل آئے۔ سب کے سب مارے گئے۔ دہلی کے حاکم تاتار خان کا لڑکا دوست محمد جسے ''تاتار چہ'' کہا جاتا تھا اسی جنگ میں شہید ہو گیا۔

اسی جگہ بادشاہ نے بیکانیر کے رائے سنگھ کو جودھ پور پر مقرر کیا تاکہ گجرات کا راستہ محفوظ رہے اور گولکنڈہ اور کوہمنیر کے حاکم رانا کیکا کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔ راجہ بھگوان داس کے لڑکے مان سنگھ کو ایک تیار شدہ فوج کے ساتھ ایدر کی طرف مقرر کیا گیا تاکہ وہ شیر خان فولادی کے لڑکوں کا پیچھا کرے جو اپنے اہل و عیال سمیت اس جانب جا رہے تھے۔

احمد آباد کی فتح

پہلی رجب کو پٹن شہر کے سامنے شاہی لشکر نے کیمپ لگا دیا۔ پٹن سید محمود کے بھائی سید احمد خان بارہہ کو جاگیر میں ملا تھا۔ اسی مقام پر پٹھانوں کا پیچھا کرنے کے بعد مان سنگھ کافی مال غنیمت لے کر حاضر ہوا۔ بشیر خان افغان، سلطان محمود گجراتی کے غلام اور وزیر مطلق

اعتماد خان کے ساتھ تقریباً چھ ماہ سے احمد آباد[54] کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اصل میں اعتماد خان نے سلطان محمود گجراتی کے لڑکے مظفر کو قید کر رکھا تھا اور اس کے نام سے خود حکمرانی کر رہا تھا۔ جب اسے اکبر کے فوجی مہم کی اطلاع ملی تو محاصرہ اٹھالیا اور پٹھانوں کی جمعیت پریشان ہوگئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بروز اتوار 9 رجب کو سلطان مظفر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے اسے شاہ منصور وزیر کے، جس کا حال آگے آئے گا، سپرد کردیا اور اس کے خرچ کے لیے ماہانہ تیس روپے کی رقم منظور کی۔ بعد میں وہ شاہی قید سے بھاگ گیا، لیکن راجہ سورت کے ہاتھوں قید ہوگیا۔ جس وقت راجہ نے اس کو گرفتار کرکے جوناگڑھ میں اعظم خان کے پاس روانہ کیا تو اس نے راستہ میں استرے سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔

دوسرے دن اعتماد خان، شاہ ابو تراب، سید حامد بخاری، اختیار الملک حبشی، ملک الشرق، وجیہ الملک، الغ خان حبشی، جھجھار خان حبشی اور گجرات کے دوسرے تمام امراء بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے۔ اعتماد خان احمد آباد شہر کی کنجی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ بادشاہ نے بڑی ایک جرم کا لحاظ کرکے حبشیوں کو معتمد امرا کے سپرد کردیا۔

جمعہ کے دن 14 رجب کو احمد آباد کے ساحل پر خیمہ گاہ بنائی گئی اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی مہینہ کی 20 تاریخ کو سید محمود خان بارہہ اور شیخ محمود بخاری نے شاہی بیگمات کو لشکر میں پہنچایا۔ پیر کے دن دوسری شعبان کو لشکر نے احمد آباد سے کھنبایت کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوجی مہم ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے خلاف کی گئی تھی ان لوگوں نے عرصہ سے بھڑوچ، بڑودہ اور سورت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی موقع پر اختیار الملک حبشی جو گجرات کا نامی گرامی سردار تھا احمد آباد سے احمد نگر کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے بے اعتباری کی وجہ سے اعتماد خان کو شہباز خاں کنبوہ کے حوالے کردیا۔ شعبان کی 6/ تاریخ کو کھنبایت کی بندرگاہ پر قیام ہوا اور 14/ تاریخ کو لشکر بڑودہ کے قصبے میں پہنچا۔ بادشاہ نے گجرات کا سارا نظم ونسق میرزا عزیز کوکہ کے سپرد کرکے اس کو احمد آباد رخصت کردیا۔

ابراہیم حسین مرزا سے مقابلہ

17 ماہ شعبان کو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین میرزا نے قلعۂ بھڑوچ میں رستم خان رومی کو قتل کرایا ہے اور اب وہ اس راستے سے بھاگنا چاہتا ہے جو لشکرگاہ سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ بادشاہ نے شاہزادہ سلیم کی کمان میں لشکر کو اسی جگہ ٹھہرا لیا۔ خواجہ جہان اور دوسرے امراء کو بھی لشکر کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا۔ شہباز خان کو سورت پر متعینہ امیروں سید محمود بارہہ اور شاہ قلی خان محرم کو بلانے کے لیے روانہ کر دیا اور ملک الشرق گجراتی کو بدرقہ پر مقرر کر کے میرزا ابراہیم حسین کے بغاوت کو کچلنے کے لیے حملہ کیا۔ جب وہ مہندری ندی کے کنارے پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ چالیس سواروں نے ندی پار کی اور دوسری طرف کی خبر لے کر آئے کہ میرزا ابراہیم حسین دوسرے کنارے پر قصبہ سرتال میں ٹھہرا ہوا ہے۔ امرائے شاہی نے ہتھیار سجا لیے۔ سورت پر متعینہ امیر بھی اسی رات آ کر لشکر سے مل گئے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کو ہراول پر مقرر کیا اور ایک سو سپاہیوں نے ندی پار کر لی۔

مرزا ابراہیم حسین کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے۔ اسے شاہی لشکر کے حملے کی خبر ملی اور وہ سرتال کے قصبہ سے ایک دوسرے راستہ سے نکل گیا اور ایک جنگل میں پہنچ کر مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔ مہندری ندی کے کٹاؤ اور راستہ کی خرابی کی وجہ سے مان سنگھ ایک طرف نکل گیا اور بادشاہ کسی اور راستہ پر جا پہنچے۔ آخرکار دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی اور ابراہیم حسین نے بابا خان قاقشال پر حملہ کر کے اگلے دستہ کو کافی دور تک پسپا کر دیا۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے گئے اور انھوں نے بادشاہ کی جمعیت پر حملہ کر دیا۔ اس وقت بادشاہ ایک ناہموار تنگ مقام پر جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا، ٹھہرے ہوئے تھے۔ حملہ آوروں میں سے تین شخص آگے بڑھے، ایک نے راجہ بھگونت داس کا رخ کیا۔ راجہ نے جھاڑی کے پیچھے سے اس پر نیزہ پھینک کر مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ بادشاہ سب سے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے شخص نے ان پر حملہ کر دیا۔ لیکن وہ بادشاہ کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور بھاگ گیا۔ مقبول خان، غلام سرخ بدخشی اور دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوا پھر

چاروں طرف سے بادشاہی لشکر نے میرزا ابراہیم حسین کی جمعیت کو گھیر لیا اور وہ مغلوب ہوکر جنگ کے میدان سے بھاگ گیا۔ اسی معرکہ میں اس کے بے شمار آدمی مارے گئے اور چونکہ فتح ہو چکی تھی اس لیے بادشاہ نے لوگوں کو پیچھا کرنے سے روک دیا اور میرزا ابراہیم حسین چند گنتی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد نگر کے راستہ سرونج کی طرف چلا گیا وہاں سے وہ ناگور پہنچا۔ جب امرائے شاہی نے اسے شکست دے کر وہاں سے بھگا دیا تو دہلی کے راستے سنبھل کے علاقے میں چلا گیا۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم آگے بیان کریں گے۔

سورت کے قلعہ کی فتح

بادشاہ اس معرکہ سے 18 شعبان کو رخصت ہوکر بڑودہ میں لشکر سے آکر مل گئے اور وہاں سے سورت کے قلعہ کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ اس قلعہ کو گجرات کے وزیر خداوند خان نے فرنگیوں کی روک تھام کے لیے سمندر کے کنارے 947ھ/ 1540ء میں تعمیر کرایا تھا چنگیز خان کے مرنے کے بعد باغی مرزاؤں نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب گجرات فتح ہو گیا تو مرزاؤں نے اپنے اہل و عیال کو اس قلعہ میں ٹھہرایا اور وہاں کا نظم و نسق ہمایوں بادشاہ کے قورچی ہم زبان نامی کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص شاہی ملازمت میں تھا اور غداری کرکے مرزاؤں سے جا ملا تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ سارے ملک میں فساد مچاتے پھر رہے تھے۔ جب مرزا ابراہیم حسین کی شکست کی خبر قلعہ والوں کو ملی تو کامران مرزا کی لڑکی گلرخ بیگم جو ابراہیم حسین مرزا کی بیوی تھی اپنے لڑکے میرزا مظفر حسین کو ساتھ لے کر دکن کی طرف رخصت ہو گئی۔ میرزا مظفر حسین کو اس وقت بادشاہ کی دامادی کا شرف حاصل ہے۔ شاہ قلی خان محرم اور صادق محمد خان نے میرزا کے خاندان کا پیچھا کیا اور تھوڑا بہت مال غنیمت چھین کر لوٹ آئے۔

بادشاہ اپنے پہنچنے سے پہلے راجہ ٹوڈرمل کو قلعہ میں آمد و رفت کے راستوں اور دوسرے حالات کی تحقیق کے لیے روانہ کر دیا تھا اس نے تمام حالات کا جائزہ لے کر بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ قلعہ تھوڑے وقت میں بہ آسانی فتح ہو جائے گا۔ اس رپورٹ پر شاہی

لشکر 7 ماہ رمضان کو قلعہ کے دروازے پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ مورچے لگادیے گئے اور حملہ کر کے قلعہ والوں کو بُری طرح تنگ کردیا۔ دو ماہ کے عرصہ میں اونچے اونچے پشتے بنا کر توپیں اور بندوقیں اس غضب کی آتش باری کرنے لگے کہ قلعہ والوں میں سے کسی کو اٹھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، بادشاہ نے دوسری جانب ایک تالاب کے کنارے قیام کیا اور مورچے آگے بڑھا کر پانی کا راستہ بند کردیا۔ اب قلعہ والے ہر طرح مجبور ہوگئے۔ ہمزبان اور دوسرے محصور امیروں نے ایک طالب علم مولانا نظام الدین کو جو ایک اچھا مقرر تھا جان کی معافی کے لیے بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ اسے امرا کی سفارش پر باریابی کی اجازت ملی اور بادشاہ نے قلعہ والوں کی درخواست قبول کرلی اور اسے معافی دیے جانے کے لیے ”قلعے والوں کو تسلی اور دلاسہ دے کر حضور میں لے آئے۔ دیانت دار محرر بھی مقرر کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کے نام لکھ لیں اور قلعہ کے مال و اسباب ضبط کرلیں۔ ہمزبان اور اس کے ساتھی جب حاضر کیے گئے تو بادشاہ نے ہمزبان کی اور اس کے چند ساتھیوں کو جنھوں نے محاصرے کے دوران نہایت گستاخانہ کلمے کہے تھے تنبیہ کی اور ان کو سرکاری کارندوں کے حوالہ کردیا۔ بقیہ دوسرے امیروں کو معاف کردیا۔ یہ فتح 23 ماہ شوال 980ھ/1572ء کو حاصل ہوئی۔

دوسرے دن بادشاہ قلعہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔ اس معائنہ کے دوران چند بڑی، بڑی دیگیں اور توپیں نظر سے گزریں، جس وقت سلیمان سلطان خواندکار روم نے گجرات کی بندرگاہوں کو فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا تو اس نے یہ سامان سمندر کے راستہ روانہ کیا تھا۔ چند وجوہ کی بنا پر اس کی فوج واپس چلی گئی تھی اور اس وقت سے وہ دیگیں سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ جب خداوند خان نے سورت کا قلعہ بنوایا تو وہ ان سے چند دیگوں کو قلعہ میں اٹھوالایا تھا جو باہر رہ گئی تھیں۔ انھیں بعد میں جوناگڑھ کے حاکم نے قلعہ میں پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ اس قلعہ میں جب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آگرہ کے قلعہ میں پہنچا دی جائیں چنانچہ وہ وہاں پہنچادی گئیں۔

سورت کے قلعہ کی تعمیر کا سبب

کہتے ہیں کہ خداوند خان نے یہ قلعہ فرنگیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بنایا تھا، کیوں کہ یہ فرنگی مسلمانوں کو بہت ستانے لگے تھے اور مسلمانوں کے شہروں پر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ جس وقت قلعہ بننے لگا تھا تو انھوں نے جہازوں پر سے آتش باری کر کے تعمیر کے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ ماہر انجینئروں نے سمندر کے اندر تک قلعہ کی دیواریں پہنچا دیں اور قلعہ کے اطراف میں گہری خندق کھود کر خشکی کے دونوں جانب پتھر، چونا اور پکی اینٹوں کی مستحکم دیوار بنادی۔ اس فصیل کے ہر دو پتھروں کے درمیان لوہے کے قلابے لگائے گئے ہیں اور دروازوں میں سیسہ پگھلا کر سنگ پتھر جمائے ہیں اس دیوار کی بلندی خندق کی چوڑائی کے برابر 20 گز اور طول 35 گز ہے۔ چاروں دیواروں کا عرض 15 گز ہے۔ قلعہ اس قدر بلند اور خوش منظر ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے۔ سمندر کی جانب قلعہ کے جو برج ہیں ان میں فرنگیوں، خاص طور سے پرتگالیوں کے طرز تعمیر کی طرح جھروکے بنائے گئے ہیں۔ فرنگیوں نے اس قلعہ کی تعمیر کے وقت بڑی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور جنگ پر آمادہ ہوگئے تھے۔ آخر کار وہ مصالحت پر مجبور ہوگئے اور یہ شرط پیش کی کہ سمندر کی جانب جو احاطہ ہے اسے ڈھادیا جائے تو ہم ایک کثیر رقم دینے کو تیار ہیں۔ خداوند خان نے اسلامی حمیت کی بنا پر ان کی پیش کش کو قبول نہ کیا اور ان کی ضد میں اس حصہ کو بہت جلد مکمل کرادیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کی حکومت قلیچ خان کے لڑکے کو سپرد کی اور ۱۱ ذی قعدہ کو وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔

اس محاصرہ کے دوران چند قابل ذکر واقعات پیش آئے تھے، پہلا یہ کہ میرزا شرف الدین حسین جو دس سال سے برابر باغی ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا ولایت بگلانہ کے راجہ بہارجیو کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا۔ حاضر ہونے میں اس نے بے ادبی اور خودسری کا مظاہرہ کیا اس لیے اسے تنبیہ کر کے شاہی کارندوں کے حوالے کر دیا گیا۔ بھڑوچ کی منزل میں چنگیز خان کی والدہ نے جھجھار خان حبشی کے خلاف چنگیز خان کو ناحق قتل کرنے کے الزام میں فریاد کی اور خون کے بدلے کا مطالبہ کیا۔ اس معاملہ کی تحقیقات

کرائی گئی۔ چونکہ قاتل نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا، اس لیے اس کو ہاتھی کے پیر کے نیچے ڈال دیا گیا۔

باغیوں کے مشورے

اسی سورت کے محاصرہ کے دنوں میں ابراہیم حسین میرزا شکست کھا کر سرنال سے پٹن گیا اور وہاں محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا سے جا کر مل گیا اور سورت کے قلعہ کو بادشاہی فوج سے چھین لینے کے لیے ان مرزاؤں نے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ ابراہیم حسین مرزا ہندوستان جا کر وہاں فتنہ برپا کرے اور محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا شیر خان فولادی کے ساتھ مل کر پٹن کا محاصرہ کرلیں تاکہ بادشاہ ان کے مقابلہ کے لیے سورت چھوڑ کر احمد آباد آجائیں۔

شیر خان فولادی کی بہادری

حسب قرارداد جب مرزاؤں نے حملہ کیا تو سید احمد خان بارہہ پٹن میں محصور ہوگیا اور بڑی دلیری سے لڑتا رہا۔ اس کی مدد کے لیے قطب الدین محمد خان مالوہ اور چندیری کے جاگیرداروں کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ رستم خان، عبدالمطلب خان، شیخ محمود بخاری دہلوی وغیرہ بھی احمد آباد سے اعظم خان کے ساتھ پٹن پہنچ گئے۔ مدد پر آنے والی فوج سے مقابلہ کے لیے محمد حسین مرزا، شاہ مرزا اور شیر خان فولادی نے محاصرہ اٹھا لیا اور پٹن سے پانچ کوس کے فاصلہ پر آگے بڑھ کر بادشاہی فوج پر حملہ کردیا اور ایسی سخت لڑائی کی کہ تاریخ میں یادگار رہ گئی۔ انھوں نے بادشاہی لشکر کی اگلی صف کو اعظم خان کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا اور صف بندی نیز فوج کے بائیں بازو کو بھی منتشر کردیا۔ شاہی امرا نے بھی بڑی ثابت قدمی سے ان کی مدافعت کی، آخرکار میدان بادشاہی لشکر کے ہاتھ رہا اور مخالف فوج منتشر ہوگئی۔ اس وقت لشکری غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہوگئے اور خان اعظم چند ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں ٹھہر گیا۔ شیر خان فولادی افیون کھاتا تھا، افیونیوں کو ہمیشہ قبض رہتا ہے

جس وقت جنگ ہو رہی تھی وہ طہارت خانہ چلا گیا تھا، اس لیے افیون کی پینک اور قبض کی وجہ سے وہ اپنے دو تین ہزار آدمیوں کو لیکر اس وقت پہنچا جب کہ اس کے ساتھی بھاگ چکے تھے اور میدان خالی پڑا تھا اس نے آتے ہی شیخ محمد بخاری کے دستے پر حملہ کر دیا۔ شیخ محمد بخاری نے آخر تک جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اعظم خان نے اپنی جگہ سے حرکت کی، اس کی فوج نے چاروں طرف سے حملہ آوروں کو گھیر لیا۔ شیر خان فولادی بھی مجبور ہو کر بھاگ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا کر مل گیا، جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنے ہی پیرزادہ شیخ محمد بخاری کو کیوں شہید کر دیا؟ تو اس نے جواب دیا ''ہم نے یہ سنا تھا کہ تمام مغل سرداروں میں شاہ بداغ خان اور ایک دوسرا سردار نہایت جم کر مقابلہ کر رہے ہیں انہی کے گمان میں ہم نے شیخ محمد پر حملہ کیا اگر ہم کو اس کا یقین ہوتا کہ وہاں شیخ محمد ہے تو ہرگز اس کے قتل کا ارادہ نہ کرتے''۔

اس شکست کے بعد محمد حسین میرزا دکن کی جانب چلا گیا اور شیر خان جونا گڑھ کے حاکم امین خان غوری کی پناہ میں چلا گیا۔ یہ فتح 18 ماہ رمضان 980ھ/1572ء میں حاصل ہوئی۔ اعظم خان نے سید احمد خان بارہہ کو بدستور سابق قلعہ پٹن پر ہی مقرر رکھا اور خود سورت میں جا کر حاضر ہوا۔

اختیار الملک حبشی سرکاری محافظوں کی قید سے احمد آباد میں بھاگ گیا تھا۔ اس کی گرفتاری کے لیے قطب الدین محمد خان اور دوسرے چند امیر مقرر کیے گئے تھے۔ اختیار الملک بھاگ کر باغیوں سے جا ملا اور لڑ بھڑ کر بعض مقامات پر اس نے قبضہ کر لیا۔ امرائے شاہی نے اس پر حملہ کر کے اسے وہاں کے قلعوں اور جنگلوں سے بھگا دیا اور سارے علاقہ میں تھانے قائم کر کے محافظ دستے مقرر کر دیے۔ اس انتظام کے بعد یہ لوگ اس وقت جب کہ لشکر سورت سے لوٹ کر محمود آباد پہنچا تھا دربار میں حاضر ہو گئے۔

گجرات سے واپسی

آخر ماہ ذی قعدہ میں بادشاہ احمد آباد پہنچے، دس دن تک وہاں قیام رہا۔ احمد آباد کی حکومت

بادشاہ نے اعظم خان کے سپرد کی۔ امرائے اتکہ کو گجرات میں جاگیریں عطا کیں۔ مظفر خان کو ڈھائی کروڑ کی جاگیر عطا ہوئی اور اسے مالوہ کا سارا علاقہ اجین اور سارنگ پور کی حکومت بھی عطا ہوئی۔ اس انتظام کے بعد بادشاہ عید قربان کے دن احمد آباد سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے محرم 981ھ/1573ء کو اجمیر واپس آئے۔ اس اثنا میں سعید خان کا عریضہ آیا کہ مرزا ابراہیم گرفتار ہوا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی سال 2 صفر کو شاہانہ سواری دارالخلافہ پہنچی۔

ابراہیم حسین مرزا کی بغاوت

مرزا ابراہیم حسین گجرات سے ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لیے سب سے پہلے میرٹھ گیا۔ وہاں ایک قافلہ کو جو آگرہ جا رہا تھا لوٹ لیا اور ناگور چلا گیا۔ یہاں خان کلاں کا لڑکا فرخ خاں گھر گیا۔ مرزا نے شہر کے باہر بستیوں کو لوٹ لیا اور ایک دن وہاں ٹھہر کر نارنول چلا گیا ابھی وہ نارنول سے 20 کوس کے فاصلے پر تھا کہ اتفاق سے رام رائے اور رائے سنگھ جو گجرات کے راستہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیے گئے تھے، تقریباً ایک ہزار سواروں کے ساتھ جودھ پور سے حملہ کرتے ہوئے ناگور پہنچے اور فرخ خان نے ان کے ساتھ میرزا کا پیچھا کیا اور موضع کھتولی کے علاقے میں جا کر کیمپ لگا دیا۔ ان کے آنے پر مرزا وہاں سے بھاگ گیا اور شاہی فوج کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا ہے اور کہاں ہے؟ فوج میں جو مسلمان روزہ دار تھے وہ افطار کے ارادہ سے ایک تالاب کے کنارے ٹھہر گئے۔ مرزا کچھ دور تک جانے کے بعد لوٹ آیا اور دوسری ماہ رمضان 980ھ/1572ء کو ان پر رات میں چھپ کر حملہ کر کے، دو طرف سے ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ ان لوگوں نے بھی مورچہ سنبھال لیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مرزا کے ساتھ 700 سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ جب بادشاہی دستے نے دلیری سے حملہ کیا تو یہ مقابلہ پر ٹھہر نہ سکے اور منتشر ہو گئے۔ مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، اندھیری رات میں اس کی فوج گاؤں اور دیہاتوں میں منتشر ہو گئی اور اس کے سپاہی جگہ جگہ گرفتار اور قتل ہو گئے۔ ان میں

سے ایک سو سپاہی فرخ خان کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور تہہ تیغ کردیے گئے۔ ان میں سے بعض زخمی ہوکر بہ مشکل مرزا سے جا کر مل گئے۔ مرزا نے تین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ مار کرتے ہوئے گنگا اور جمنا کو پار کیا اور اپنی سابقہ جاگیر پرگنہ اعظم پور پہنچ گیا۔ اب اس نے سوچا اگر میں سنبھل کے قلعہ میں جس کے پیچھے کماؤں کا پہاڑ ہے اور آگے گنگا جیسی گہری ندی ہے وہاں چلا جاؤں اور ایک فوج جمع کرلوں تو بہت سے لوگ میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہوجائیں گے لیکن اس کا خیال بس خیال ہی رہا کیوں کہ بادشاہی امیروں نے ہر طرف سے اس کے راستے روک دیے تھے۔

راجہ اودیسر سے لڑائی

مہدی قاسم خان، ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خان اپنی جاگیر کانت و کولہ اور پٹیالی کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور راجہ بھاڑا مل نے جو وکیل اور وزیر مطلق تھے۔ فتح پور سے اس کے پاس خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا دوجگہوں پر شکست کھا کر دہلی کے علاقے میں آیا ہوا ہے اور پایہ تخت بالکل خالی پڑا ہے اس لیے تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ۔ حسب طلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہوگیا جس وقت وہ موضع اودھ سے کوچ کر رہا تھا پرگنہ جلیسر سے اس کے پاس خبر آئی کہ راجہ اودیسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے برابر اب تک آگرہ کے علاقے میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کرتا رہا ہے بادشاہی امرا کے خلاف حملہ کردیا ہے اور مردانہ وار حملہ کرکے بعض بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر رہا ہے اور اب وہ پرگنہ جلیسر میں موضع نوراہی کے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔

خوفناک حملہ

ماہ رمضان کی چودھویں دوپہر کو جب کہ اکثر لوگ روزہ سے متفرق ہوکر راستہ طے کر رہے تھے کہ اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاً لڑائی چھڑ گئی۔ راجہ اودیسر نے

گنواروں کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھوا کر مچانیں بنائی تھیں، وہاں سے اس نے شاہی رسالے پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کر دی۔ اس اچانک حملے سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے۔ ایک گولی حسین خان کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زین سے جھک کر گھوڑے کی گردن پر ضعف کے مارے بے ہوش ہو گیا، وہ گر پڑتا لیکن بڑے حوصلے سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور زین پر بیٹھ گیا میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ آس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم تک نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزہ کی وجہ سے غشی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے جانا چاہا تاکہ تیروں کی بوچھار سے پناہ مل جائے۔ اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور خلاف عادت مجھے غصے سے گھور کر دیکھا۔ جھنڈے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا باگ پکڑنے کا یہ کونسا موقع ہے؟ پھر اس نے فوج کو گھوڑوں سے اتر آنے کا حکم دیا۔ اسے اسی جگہ چھوڑ کر سب لوگ گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گئے۔ اس کے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ ان کی گنتی محال تھی۔ آخر کار شاہی فوج کے مٹھی بھر سپاہیوں کو فتح نصیب ہوئی اور مقابل مقابلے سے بھاگ کھڑے ہوئے لڑتے لڑتے سپاہیوں کے بازو ایسے شل ہو گئے تھے کہ تلوار مارنے اور تیر چھوڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس گھنے جنگل میں کچھ اس طرح اژدہام ہو گیا تھا کہ دونوں فریق بکھر گئے تھے اور دوست دشمن میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا، کمزوری اور ضعف کے مارے سپاہیوں میں شناخت و تمیز کا فرق نہ رہا تھا۔ بعض خدا کے ایسے بندے بھی تھے کہ اس سخت اور دشوار دن میں بھی اپنے روزہ کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ (ملا عبدالقادر) میں اتنی برداشت نہیں تھی، چنانچہ جب میں بالکل ہی بے طاقت ہو گیا تو میں نے ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کر لیا۔ بعض تو پانی نہ ملنے کی سبب پیاس سے مر گئے۔

حسین خان کا حملہ

اس فتح کے بعد حسین خان نے کانت و گولہ کا رخ کیا اور ان مقامات پر جنگی احکامات عمل

میں لائے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبھل سے پندرہ کوس پر لکھنؤ کے پرگنہ میں پہنچا ہوا تھا۔ حسین خان زخمی ہونے کے باوجود پالکی میں سوار ہوکر میرزا کے مقابلہ پر بانس بریلی پہنچ گیا۔ مرزا حسین خان ابراہیم حسین مرزا کی بہادری سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس سے لڑکر وہ کسی حال میں بھی سرخرو نہیں ہوسکتا اس لیے وہ امروہہ کے راستہ لوٹ گیا۔ لکھنؤ کے علاقے میں ہمارے اور اس کے لشکر کے درمیان سات کوس کا فاصلہ تھا۔ اگر اس وقت مقابلہ ہو جاتا تو اس صورت میں جب کہ حسین خان زخمی تھا نہ معلوم کیا نتیجہ برآمد ہوتا؟ مرزا سے اس موقع پر بڑی فاش غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اس حال میں کہ حسین خان کے لشکر کا نظام درہم برہم تھا اس پر حملہ نہ کیا۔

امرائے سنبھل سے مشورے

سنبھل کے قلعہ میں وہاں کا حاکم معین الدین خان فرنخودی اور دوسرے جاگیردار امرا ایک بڑی فوج کے ساتھ قلعہ میں بند ہوگئے۔ جب آدھی رات کو انھوں نے حسین خان کے نقارہ کی آواز سنی تو یہ سمجھ کر کہ مرزا ابراہیم حسین نے حملہ کردیا، بدحواس ہوگئے۔ جب جب لوگوں نے قلعہ کے نیچے جاکر آواز دی کہ حسین خان مدد کے لیے پہنچا ہے تو اس وقت دم میں دم آیا اور لوگ استقبال کے لیے دوڑے۔ دوسرے دن سب امیر شیخ الاسلام فتح پوری کے خلیفہ شیخ فتح اللہ ترین کے مکان پر جمع ہوئے اور طے پایا کہ سب لوگ گنگا کے کنارے تولک خان، توچمن بیگ، نورین خان، رحمان قلی خان، کاکر علی خان اور دہلی کے ان تمام امیروں سے جاکر ملیں جو مرزا سے مقابلہ کے لیے گنگا کے کنارے آہار کے پرگنہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے مشورہ کے بعد جو کچھ طے پائے اس پر عمل کیا جائے۔ اس موقع پر حسین خان نے کہا خدا کی شان، یہاں مرزا چند گنتی کے سواروں کے ساتھ پہنچا ہے اور سنبھل کے قلعہ میں تمہاری تعداد اس کے مقابلے میں دوگنی ہے پھر تم میں بیس تیس کے قریب قدیم تجربہ کار امیر اور سردار موجود ہیں اور تم لوگ مرزا سے ڈر کر آہار کے قلعہ میں جو ایک چوہے دان کی طرح ہے جاکر چھپنا چاہتے ہو۔ اس طرح تو مرزا دلیر ہوکر

سارے حدود سرکار میں افراتفری پھیلا دے گا۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو تم لوگ گنگا کو پار کر کے ان چند پرانے قلعوں پر جو مرزا کے راستے میں ہیں قبضہ کرلو اور اسے گنگا پار نہ کرنے دو اور میں اس کے پیچھے سے تیزی سے جاتا ہوں، پھر جو بھی ہو گا سامنے آجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے پہلے گنگا پار کر کے اس کا راستہ روک دیتا ہوں اور تم پیچھے سے حملہ کر دو، بس وفاداری کا یہی تقاضا ہے حسین خان کے اس دلیرانہ مشورے کو کسی نے قبول نہ کیا، مجبوراً حسین خان ان سواروں کو لے کر جو اس کے ساتھ تھے آہار کے امیروں کے پاس چلا گیا اور ان کو بھی اس نے اس چھوٹے سے قلعہ میں آکر بند ہو جانے پر سخت لعنت ملامت کی اور ان کے سامنے بھی اپنی وہی تجویز رکھی اور کہا کہ اس وقت دشمن سرکار کے حدود میں اس طرح آگیا ہے جس طرح لومڑی خرگوش لشکر کے درمیان گھر جائے۔ اگر ہم تیزی سے نقل و حرکت کریں تو اس مہم کو سر کر سکتے ہیں اور اس کو زندہ گرفتار کر سکتے ہیں اور اس فتح کا سہرا لازماً ہمارے ہی سر رہے گا۔ لشکریوں نے جواب دیا کہ ہم مخدوم الملک اور راجہ بہارمل کے حکم کے مطابق مرزا کو دہلی کے علاقے سے بھگا کر سنبھل تک لے آئے ہیں، اب یہاں سے ساری ذمہ داری سنبھل کے صوبہ دار معین الدین احمد خان اور اس علاقے کے جاگیرداروں کی ہے ہمیں تو صرف دہلی کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، مرزا سے جنگ کرنے کا نہیں۔

مرزا کا لگاتار تعاقب

اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امروہہ پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کر دیا اور اب وہ گنگا پار کر کے لاہور کی طرف حملہ کر رہا ہے۔ حسین خان نے امیروں کو اس طرح ٹال مٹول کرتے دیکھا تو فوراً ہی ان سے الگ ہو گیا اور حملہ کرتے ہوئے گنڈہ مکتیشور پہنچ گیا تاکہ مرزا کو بغیر مقابلہ کیے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ بادشاہی امیروں میں سے ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ ہی ایسے امیر تھے جنھوں نے حسین خان کا ساتھ دیا تھا لیکن جب وہ اس منزل پر پہنچا تو آہار کے امیروں نے خط بھیجا کہ تم جلدی نہ کرو ہم بھی تمہارے ساتھ

آ رہے ہیں چنانچہ وہ سب آ کر حسین خان سے مل گئے لیکن ان کے دل اندر ہی اندر چھٹے ہوئے تھے۔ ادھر مرزا بساط خالی پا کر بڑی بے خوفی سے اپنا مہرہ آگے بڑھائے جا رہا تھا اور راستہ میں جو بھی شہر پڑتا تھا اُسے بری طرح لوٹ لیتا تھا۔ چنانچہ سننے میں آیا کہ اس نے پائل کے قصبے میں مسلمان گھرانوں کو بری طرح تاخت وتاراج کر دیا اور اس قصبہ میں بارہ کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ دوسرے شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ حسین خان مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے یہاں تک کہ سب آگے پیچھے سرہند جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر دوسرے تمام امیروں نے اپنے خیمے لگا دیے اور ٹھہر گئے لیکن حسین خان بھلا کہاں رکنے والا تھا، وہ اپنے آدمیوں کو لے کر جو پورے سو بھی نہیں تھے مذکورہ دو امرا کے ساتھ سرہند سے حملہ کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔

وہاں خبر ملی کہ مرزا لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے اور وہاں کے لوگ قلعہ میں بند ہو گئے ہیں

میرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ اور جھنی وال تک جا پہنچا۔ اس وقت حسین قلی خان نگر کوٹ اور قلعہ کانگڑہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے ہندوؤں سے صلح کر لی اور نگر کوٹ والوں سے پانچ من سونا اور بادشاہی خطبہ پڑھنے کی شرط پر صلح کر لی اور وہاں سے میرزا یوسف خان عدلی کے غلام فتو مسند عالی، اسماعیل قلی خان، راجہ بیربر اور دوسرے امیروں کے ہمراہ مرزا کے تعاقب میں حملہ کرتے ہوئے شکرہ پہنچ گیا۔

شیخ داؤد علی جھنی وال

حسین خان دیوانہ سہی لیکن وہ ان تمام احمقوں سے زیادہ عقل مند تھا اس کو جب حسین قلی خان کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اس نے قسم کھالی کہ جب تک میں حسین قلی خاں سے جا کر نہ ملوں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا، چنانچہ اس نے وہاں سے کوچ کیا، تلونڈی کے راستہ میں دریائے بیاہ (بیاس) کو پار کیا اور حملہ کرتے ہوئے شیر گڑھ میں جھنی کے قریب پہنچا۔ وہاں اس نے حضرت غوث قطب الاقطاب شیخ داؤد قادری جھنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب محفل میں دستر خوان بچھایا گیا تو حسین خان نے اپنی قسم کا حوالہ دے کر

کھانے سے معذرت چاہی حضرت نے فرمایا: "قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دکھانا بڑی نادانی ہے"۔ خان نے اس وقت ایک غلام کو آزاد کر کے کفارہ ادا کیا اور کھانا تناول کیا نیز حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ وہ رات اس نے اسی جگہ بسر کی اس وقت اس کے سارے لشکر کی مہمانی حضرت کے لنگر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھانس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خان نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے اور جن کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا میں نے اس سلسلے میں فی البدیہہ چند شعر کہے تھے جسے حضرت نے پسند فرمایا وہ شعر یہ ہیں:

ای منزہ نسبت ایجاد تو از ماء و طین   ذات پاک چون پیمبر رحمة للعالمین
ہست اسم اعظمت داؤد از تاثیر آن   چون سلیمان جن و انس آمد ترا زیر نگین
شمع وجہ اللہ یقین من نمی شد ساطعا
روی تو دیدم عیان شد نکتہ عین الیقین

میرا تو ارادہ (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) ہو گیا تھا کہ میں ترک دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ کی صفائی کا کام کرنے لگوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ! مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا خانقاہ سے نکلتے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں جب حضرت کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے باوجود اس معمول کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی اور مزید افادات عطا فرمائے اور جو باتیں بتائیں ان کی لذت سے دل اب تک مسرور ہے:

می روم سوی وطن زین درد دل بی اختیار   نالہ دارم کہ چنداری بغربت می روم

مرزا ابراہیم حسین کا فرار

حسین خان ازبک جب طلنبہ پہنچا تو اس نے حسین قلی خان کے نام خط بھیجا کہ چونکہ میں 400 کوس سے حملہ کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں اگر آپ مجھے بھی اس فتح میں شامل کریں اور ایک دن لڑائی میں توقف کریں تو یہ آپ کی محبت سے بعید نہیں ہے۔ حسین قلی خان نے خوش آمدید کیا اور اس کے جلو دار کو رخصت کر دیا۔ لیکن وہ اسی دن تیزی سے طلنبہ کے قصبے کے باہر ملتان سے چالیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت مرزا اس کے حملہ سے بے خبر تھا، اور شکار پر گیا ہوا تھا۔ میرزا کے کچھ آدمی تو کوچ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور بعض ادھر ادھر منتشر تھے۔ اس حال میں حسین قلی خان نے ان پر حملہ کیا لیکن ناہموار زمین پر اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ اسے اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ جب مرزا ابراہیم حسین شکار سے لوٹ کر آیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور دلیرانہ حملے کیے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً لگام پھیر کر فرار ہو گیا۔ فتح کے دوسرے دن طلنبہ سے حسین خان اپنے 80،90 سواروں کو لیے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے پہنچا۔ حسین قلی خان نے جنگ کی ساری تفصیل اسے بتائی اور جس نے جو کچھ کارنامے انجام دیے، ایک ایک کر کے سنائے۔ حسین خان نے کہا یہ تو سب ٹھیک ہوا لیکن دشمن زندہ بچ کر نکل گیا تم کو اس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا۔ جب تک وہ گرفتار نہ ہو مہم ادھوری ہی رہے گی۔ حسین قلی خان نے جواب دیا ہم نگرکوٹ سے مسلسل حملہ کرتے ہوئے آئے ہیں اور پہاڑی علاقہ پر ہمارے لشکریوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے اور ساری فوج تھکی ہوئی ہے چونکہ یہ فتح ہر حیثیت سے مکمل فتح تھی اس لیے ہم نے مزید اقدام نہ کیا۔ اب دوسرے حوصلہ آزمائی کریں ان کی باری ہے۔

مرزا ابراہیم کی گرفتاری

حسین خان نے اس امید میں کہ اس کی یہ پانچ سو کوس کی مسلسل دوڑ دھوپ ٹھکانے لگ جائے اور کامیابی کا سہرا سر بندھ جائے۔ حسین قلی خان سے رخصت ہو کر آگے کوچ کر دیا۔

جو لوگ بہت زیادہ تھک گئے تھے ان کو اس نے ہاتھی اور نقارہ کے ساتھ لاہور واپس بھیج دیا اور اپنے چار سو سواروں کے ساتھ بیاس اور ستلج کے کنارے پر قیام کیا۔

اس وقت چھتپل قوم کے آدمیوں نے جو ملتان کی پس ماندہ رعیت ہیں اس پر شب خون مارا اور پتھر برسانے لگے میرزا نے اپنے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ جن میں سے بعض زخمی اور اپاہج ہو چکے تھے اور بری طرح تھکے ہوئے تھے قوم سے مقابلہ کیا، لیکن چھتپل اس پر غالب آ گئے۔ اسی دوران ایک تیر مرزا کی گدی میں لگا اور منہ کو پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ جب معاملہ الٹ گیا تو اس کے آدمی میرزا کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ نکلے لیکن وہ جہاں بھی گئے موت سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہی۔ میرزا کو دو قدیم غلاموں نے فوراً ہی قلندروں کا لباس پہنا دیا اور ایک طرف لے کر چلے گئے۔ مرزا نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اسے لے کر ایک گوشہ نشین درویش شیخ زکریا کے ٹھکانے پر رات گزارنے کے لیے پہنچے۔ شیخ نے بظاہر بڑی مہربانی کا سلوک کیا لیکن خفیہ طور پر ملتان میں سعید خان کے پاس اس کی اطلاع بھیج دی۔

ہر کجا گوشہ نشینی است درو مکرے ہست
(جہاں کہیں گوشہ نشینی ہے اس میں مکر و فریب ہے)

سعید خان نے اپنے غلام دولت خان ناظر کو اسے گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کر دیا اور بادشاہ کے پاس اس گرفتاری کی اطلاع ایک عریضہ کے ذریعہ بھیجی جو بادشاہ کو گجرات سے اجمیر واپسی کے وقت ملی۔ حسین خان کو جب مرزا کی گرفتاری کی خبر ملی تو وہ ملتان پہنچا اور سعید خان سے ملاقات کی۔ اس نے مرزا سے ملنے کے لیے کہا تو حسین خان نے کہا ”اگر ملاقات کے وقت میں تسلیمات بجا لاؤں تو بادشاہ کی وفاداری کے خلاف ہوگا، اگر ایسا نہ کروں تو مروت کے خلاف ہے۔ مرزا دل میں کہے گا اس کجی کو دیکھو کہ ستو اس کے محاصرے میں امان پانے پر تو اس نے جھک جھک کے سلام کیے تھے اور اب جب کہ ہم مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بے نیازی دکھا رہا ہے“۔ جب مرزا کو اس کی بے تکلفانہ گفتگو کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا ”وہ آئے اور بغیر تسلیمات کے کلام کرے اس کو سب کچھ معاف

ہے۔" غرض حسین خان ملنے کے لیے گیا اور باوجود اجازت کے وہ تسلیمات بجالایا۔ مرزا نے اس سے افسوس کرتے ہوئے کہا" ہم بغاوت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن جب جان پر بن گئی تو ہم اپنی جان ہتھیلی پر لے کر ایک غیر ملک میں چلے گئے وہاں بھی ہمیں چین سے رہنے نہ دیا گیا، تقدیر میں بہر حال یہ شکست لکھی تھی لیکن کاش ہم تیرے ہاتھوں شکست کھاتے کہ تو ہر حال میں اپنوں میں سے ہے لیکن یہ ذلت حسین قلی خان کے ہاتھوں اٹھانی پڑی جو دین و مذہب کے اعتبار سے غیر ہے"

حسین خان اس ملاقات کے بعد اپنی جاگیر کانت وگولہ کو واپس چلا گیا اور میرزا اسی قید میں کچھ عرصہ بعد زندگی کے بندھنوں سے رہا ہو گیا۔ کانت وگولہ سے حسین خان دربار شاہی میں حاضر ہوا اور پنجاب سے حسین قلی خان، مسعود حسین مرزا کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے جنگ بندیوں کے ساتھ فتح پور لایا۔ یہ قیدی لگ بھگ 300 کی تعداد میں تھے، ان کے منھ پر گدھے، سور اور کتوں کی کھال کی پٹیاں باندھ کر حضور میں لایا گیا تھا۔ ان میں سے چند کو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ قتل کرادیا گیا اور باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ مرزا کے تقریباً 100 سرداروں نے جن کو خان کا خطاب حاصل تھا، شکست کے بعد ملتان کے راستے میں حسین خان کے پاس جان کی معافی کی درخواست کی تھی۔ حسین خان ان سب کو اپنے پرگنوں پر لے کر چلا گیا تھا، پھر اس نے ان کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

حسین قلی خان نے ان لوگوں کا بادشاہ کے سامنے ذکر چھیڑ دیا۔ حسین خان نے فوراً کہا چونکہ اسیروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اس لیے میں نے اس جماعت کو بادشاہ پر تصدق کر کے چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے اس بات کو درگذر کر دیا اور اس سے کوئی پوچھ تاچھ نہ کی۔ انہی دنوں سعید خان ملتان سے میرزا ابراہیم حسین کے سر کو جسے مرنے کے بعد جسم سے جدا کر دیا گیا تھا لے کر بارگاہ میں حاضر ہوا۔

راجہ بیربر کی قدر و منزلت

980ھ/1572ء میں حسین قلی خان نے نگرکوٹ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اکبر کو بچپن ہی سے

برہمنوں، مسخروں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بڑی موافقت اور ربط و ضبط تھا، چنانچہ تخت نشینی کے آغاز میں ایک بھکاری برہمن برہمداس نامی جو مسخرہ اور گیت گو تھا اور ہندوؤں کی مداحی کرکے زندگی بسر کیا کرتا تھا، کالپی سے بادشاہ کی خدمت میں آیا، یہ شخص چونکہ کافی چالاک اور ہوشیار تھا اور بادشاہ کا مزاج بھی اس سے ملتا تھا اس لیے بہت جلد اچھے مناصب پر پہنچ گیا اور بادشاہ کا ندیم خاص بن گیا۔ پہلے اسے "کب رائے" یعنی ملک الشعراء کا خطاب ملا بعد میں راجہ بیربر(۱) یعنی نامور بہادر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

جب اکبر نگرکوٹ کے حاکم راجہ جے چند سے جو شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ناراض ہوا اور اسے قید کر دیا تو اس نے نگرکوٹ کا قلعہ راجہ بیربر کو جاگیر میں دے دیا اور لاہور کے حاکم حسین قلی خان کو فرمان بھیجا کہ نگرکوٹ پر قبضہ کرکے اسے راجہ بیربر کے حوالے کر دیا جائے۔ حسب فرمان حسین قلی خان نے پنجاب کے تمام امیروں مرزا یوسف خان، قزاق خان کے لڑکے جعفر خان اور فتو مسند عالی وغیرہ کو ساتھ لے کر نگرکوٹ کی طرف کوچ کیا اور پہلے دھمیری گوالیار اور کوٹلہ کو جو نہایت بلند قلعہ ہے، تلوار کے زور پر فتح کرلیا اور ملحقہ سارے علاقے پر قبضہ کرکے وہاں محافظ مقرر کر دیے۔

نگرکوٹ پر حملہ

ان قلعوں کی فتح کے بعد حسین قلی خان نے ایک دشوار گزار راستے سے نگرکوٹ پر فوج کشی کی اس راستے کو میں (مؤلف منتخب التواریخ) 998ھ/1580ء میں دیکھا ہے، جب کہ میں نگرکوٹ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ بلاشبہ یہ راستہ اس قدر خراب اور دشوار ہے کہ اگر کہا جائے کہ اس پر چڑھتے ہوئے چیونٹی کے پیر بھی پھسل جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خان نے اس راستے سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، ساز و سامان، بڑی بڑی توپیں اور دیگیں اوپر چڑھائیں اور قلعہ کانگڑہ کا محاصرہ کر لیا۔

جے چند کا لڑکا بدھی چند یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ قید میں مر چکا ہے، قلعہ میں بند ہو گیا۔ نگرکوٹ کا مندر شہر کے باہر واقع ہے۔ یہ ہندوؤں کی بہت بڑی زیارت گاہ ہے،

چنانچہ دور دراز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندو تہوار کے دنوں میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھیروں سونا، روپیہ پیسہ، کپڑے اور دوسری قیمتی اور نفیس چیزیں وہاں چڑھاوے کے لیے لاتے ہیں۔ حسین قلی خان نے پہلے ہی حملہ میں اس مندر کو فتح کر لیا اور بہت سے پہاڑیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مندر کے گنبد پر سونے کا ایک چتر چڑھا ہوا ہے، اُسے لشکریوں نے تیر مار مار کر چھلنی کر دیا اب تک وہ تیر اس چتر میں لگے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو سو کالی گائیں اس بت خانے کے نام پر چھوڑی ہوئی تھیں۔ ہندو گائے کی بڑی تعظیم اور پرستش کرتے ہیں۔ اس بت خانہ کو انھوں نے دارالامان سمجھ کر یہ گائیں وہاں چھوڑ رکھی تھیں مسلمانوں نے ان گایوں کو ذبح کر دیا اور عین تیروں کی بارش میں ان گایوں کے خون کو اپنے موزوں میں بھر بھر کر دینی حمیت اور تعصب کی وجہ سے مندر کی دیواروں پر چھڑک دیا۔ اس معرکہ میں مندر کے برہمن اور مجاور تو اتنے مارے گئے کہ شمار سے باہر تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے یا بیگانے تمام ہندو بیربر کو جو بزعم خود ہندوؤں کا پیر بنا ہوا تھا بڑی لعنت و ملامت کرتے ہیں، کیونکہ یہ آفت اس کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

شاہی لشکر نے بیرونی شہر پر قبضہ کر لیا اور اونچے اونچے مورچے بنا کر بڑی توپوں سے راجہ بدھی چند کے محل پر گولے برسانے شروع کر دیے۔ گولہ باری سے تقریباً 80 آدمی ہلاک ہوگئے۔ بدھی چند اس ہلاکت سے بمشکل بچ سکا، پھر اس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی، قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے کہ میرزا ابراہیم حسین کی بغاوت کی خبر ملی نیز وہ لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کے علاوہ حسین قلی خان کے لشکری بہت شکستہ ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے خان نے صلح کی پیش کش کو منظور کر لیا اور اکبری وزن کے مطابق پانچ من سونا جو اس مندر کی سال کی آمدنی کے مساوی ہے اور بہت سے قیمتی کپڑے اور ہر جنس کی نفیس چیزیں نذرانہ میں وصول کر کے مسجد کے محراب کو تعمیر کرا دیا تھا۔ اس کے بعد ہی حسین قلی خان میرزاؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

جب وہ بھاری کے قصبہ میں پہنچا تو مشہور بزرگ خواجہ عبد الشہید نبیرۂ خواجہ احرار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ نے اسے فتح کی بشارت دی اور اپنا خاص کپڑا بھی عنایت فرمایا

یہ اسی دعا کی تاثیر تھی کہ یلغار کرتے ہوئے قصبہ طلنبہ میں پہنچا اور باغی مرزا پر فتح پائی۔

بنگالہ کے حاکم کا انتقال

سلیمان کرانی بنگالہ کا حاکم، جس نے اپنا خطاب ''حضرت اعلیٰ'' رکھا تھا، کافروں کے مرکز کٹک اور بنارس کو فتح کیا تھا، جگناتھ کو دارالاسلام بنا دیا تھا اور کامروپ سے اڑیسہ تک کا علاقہ اس کی عملداری میں تھا، اسی سال فوت ہو گیا۔ اس کا لڑکا بایزید اس کی جگہ تخت پر بیٹھا لیکن پانچ چھ مہینے کے اندر ہی پٹھانوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد بن سلیمان اس علاقہ پر قابض ہو گیا۔

اسی سال مشہور بزرگ شیخ نظام الدین انبیٹھیؒ نے وصال فرمایا۔

گجرات پر دوسرا حملہ

981ھ/1573ء میں بادشاہ نے گجرات کی شورشوں کو دبانے کے لیے دوبارہ سفر کیا۔ یہ سفر بادشاہ نے سانڈنی پر سوار ہو کر کیا۔ نو دن میں وہ یلغار کرتے ہوئے فتح پور سے احمد آباد پہنچ گئے اور اس گروہ سے جس نے اعظم خان کو محصور کر رکھا تھا سخت لڑائی لڑ کر فاتح و مظفر جلد ہی دارالخلافہ واپس تشریف لے آئے۔

گجرات جانے کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے گجرات کو پہلی مرتبہ فتح کیا تو احمد آباد، خان اعظم کے سپرد کر دیا تھا۔ بادشاہی لشکر کی واپسی کے بعد وہاں ہر مقام پر سرکشوں نے فتنہ و فساد مچانا شروع کیا یہاں تک کہ اختیار الملک گجراتی نے حبشیوں کی جمعیت فراہم کر کے احمد نگر اور اس کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ محمد حسین مرزا بھی دکن سے لوٹ کر آ گیا تھا اور سورت کو فتح کر لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا چونکہ قلیج خان سورت میں قلعہ کے اندر بند ہو گیا تھا اس لیے اس نے کھمبایت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اعظم خان نے اختیار الملک کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ دونوں فریقوں میں احمد نگر اور ایدر کے درمیان کئی ایک لڑائیاں ہوئیں، اعظم خان نے قطب الدین محمد خان کے لڑکے نورنگ

خان کو سید حامد کے ہمراہ محمد حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے کھمبایت کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج سے محمد حسین مرزا کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اس نے پوری بہادری اور مردانگی سے حریف پر حملے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر وہ شکست کھا کر اختیار خان کے پاس چلا گیا۔ شیر خان فولادی کے لڑکے جھجار خان حبشی کا لڑکا بھی اس سے آ کر مل گیا تھا اس لیے اختیار خان کی فوجی طاقت بڑھ گئی اور اعظم خان کے مقابلہ میں اس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ سب ایک دوسرے راستہ سے حملہ کر کے احمد آباد پہنچنا چاہتے تھے، لیکن اعظم خان تیزی سے کوچ کر کے احمد آباد پہنچ گیا اور بھڑوچ سے قطب الدین احمد خان کو بھی بلا لیا۔ چونکہ اس کو اپنے بعض آدمیوں پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لیے وہ احمد آباد میں قلعے کے اندر بند ہو گیا۔ گجرات کے تمام باغی بیس ہزار کا لشکر لے کر جس میں مغل، گجراتی، پٹھان، حبشی اور راجپوت شامل تھے، احمد آباد پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا ہر روز دونوں طرف سے سخت لڑائی ہو رہی تھی، خان کلاں کا لڑکا فاضل محمد خان اسی معرکہ میں مارا گیا۔ خان اعظم ہر روز جنگی صورت حال لکھ کر دربار میں بھیج رہا تھا اور اس نے متعدد عریضے بادشاہ کی تشریف آوری کے لیے لکھے۔

بادشاہ نے دیوانی کے عمال کو حکم دیا کہ ان امیروں کے لیے جو گجرات کی پہلی مہم میں شامل نہیں تھے۔ اس مہم کا سازو سامان فراہم کر دیں اور ان جنگجو سپاہیوں کو جنھوں نے گزشتہ پورا سال سفر کی زحمتوں میں گزارا تھا اور خستہ حال ہو رہے تھے، نقد و روپیہ ادا کریں۔ پھر بادشاہ نے حسین قلی کو خان جہان کا خطاب عطا کیا اور اسے پنجاب کے امیروں کے ساتھ اسی صوبہ پر اور سعید خان کو ملتان پر متعین کر دیا اور شجاعت خان کو پیش خیمہ کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دیا۔

اونٹنیوں پر بادشاہی حملہ

بادشاہ 24 ربیع الثانی کو تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر بیادر اور تودہ کے راستہ روانہ ہوئے۔ 100 کوس کی مسافت صرف دو دن میں طے کی۔ اسی مہینہ کی 26 تاریخ کو سواری اجمیر پہنچی

گئی، وہاں مزار کی زیارت کر کے اسی دن شام کو آگے کوچ کر دیا اور قصبہ بالیانہ میں پہنچ کر لشکر کا معائنہ کیا اور مختلف سمتوں پر فوجوں کو نامزد فرمایا۔ خان خاناں بیرم خان مرحوم کے لڑکے میرزا خان کو جو اب خانخاناں بن چکا ہے دکن کی مہم پر مقرر کیا گیا ہے اس کی مدد کے لیے سید محمود خان بارہہ، صادق محمد خان اور امرا کی ایک جماعت کو متعین کیا گیا۔ میمنہ کی سرداری میر محمد خان کلاں کے سپرد ہوئی، میسرہ پر وزیر خان کو مقرر کیا گیا، ہراول پر محمد قلی خان اور ترخان دیوانہ متعین ہوئے۔ بادشاہ کے جلوس میں تجربہ کار سوار تھے جنھیں ہزاروں سواروں میں سے منتخب کیا گیا تھا۔

تیسری جمادی الاول بروز منگل بادشاہی لشکر احمد آباد سے 20 کوس کے فاصلہ پر کری کے قصبہ میں جا کر اترا۔ باغیوں کی ایک فوج قلعہ سے نکل کر راستہ روکنے کے لیے مقابلہ پر آئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاہی فوج کی یلغار کی نذر ہوگئی، چونکہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لیے لشکر وہاں سے پانچ کوس اور آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے اس جگہ ستانے کے لیے قیام فرمایا۔ نویں دن اس منزل سے کوچ ہوا اور احمد آباد سے 3 کوس کے فاصلے تک بغیر باگیں کھینچے لشکر حملہ کرتا رہا۔ اس جگہ بادشاہ نے اسلحہ خانہ خاص سے لوگوں کو ہتھیار تقسیم کیے اور سب لوگ پوری طرح ہتھیاروں سے آراستہ ہوگئے۔ بادشاہ نے اعظم خان کو بلانے کے لیے پہلے ہی آصف خان کو روانہ کر دیا تھا۔ اس وقت مخالف غافل تھے، جب انھوں نے کرنا بجتا ہوا سنا تو پریشان ہو کر گھوڑوں کی طرف دوڑے اور محمد حسین مرزا دو تین سواروں کے ہمراہ تحقیق کے لیے دریا کے کنارے پہنچا۔ اس طرف سے ترک سبحان قلی بھی دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کنارے پر آیا ہوا تھا، مرزا نے پوچھا ''بہادر یہ کس کی فوج ہے؟'' اس نے کہا ''شہنشاہ کی فوج ہے'' میرے قاصدوں نے بادشاہ کو 14 دن پہلے فتح پور میں چھوڑا ہے، اگر یہی بادشاہی فوج ہے تو وہ ہاتھی جو ہمیشہ آگے رہتے ہیں کہاں ہیں؟ اس کو جواب دیا گیا کہ نو دن کے اندر بھلا ہاتھی چار کوس کی یلغار کیسے کر سکتے ہیں۔

باغیوں کا زبردست حملہ

محمد حسین مرزا ایک آراستہ فوج کے ساتھ مقابلہ پر آیا اور اختیار الملک کو پانچ ہزار سوار دے کر اس نے خان اعظم کے مقابلہ پر بھیجا تا کہ وہ اسے قلعہ پر چڑھائی کرنے سے روک دے۔ بادشاہی فوجوں نے دریا کو پار کر لیا۔ محمد حسین مرزا نے بڑھ کر ڈیڑھ ہزار جان نثار مغلوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک کو خان کا خطاب حاصل تھا اور وہ بڑے بڑے مناصب اور جاگیروں کے امیدوار تھے، بادشاہ کے ہراول پر جس کی کمان محمد قلی خان اور ترخان دیوانہ کے ہاتھ میں تھی حملہ کر دیا اور اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ اسی وقت حبشیوں اور پٹھانوں نے یک لخت وزیر خان کے میسرہ پر حملہ کر دیا، جوااگری کے مقام پر فریقین میں سخت خون ریز معرکہ ہوا۔

محمد حسین مرزا کی گرفتاری

ان دنوں اکبر ہر وقت "سورن یا معین" کا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا۔ جب اس نے اپنے ہراول کو درہم برہم دیکھا تو وظیفہ چھوڑ کر خود ہراول کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور دشمنوں کی صفوں کو زیر و زبر کر کے منتشر کر دیا۔ اس حملہ میں بہت سے آدمی مارے گئے سیف خان کوکہ بہادری سے بڑھ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن جس کا نمک کھایا تھا وہ آخر چھوٹ کر نکلا، اس کا گھوڑا زخمی ہو گیا اور مجبوراً اسے میدان کارزار سے منہ موڑنا پڑا۔ جب وہ فرار ہو رہا تھا، تھوہر کی ایک جھاڑی اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے ایڑ لگا کر پھلانگ جانا چاہا لیکن موت نے اس کی باگیں تھام لی تھیں چنانچہ زین سے پھسل کر زمین پر آ رہا۔ ایک ترک سپاہی گدائی علی نامی اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا، اس نے اپنے گھوڑے پر سے اسی وقت جست لگائی اور اس کو دبوچ لیا اور گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے نرمی اور ملائمت سے فہمائش کی اور اسے رائے سنگھ کے حوالہ کر دیا۔

وزیر خاں حبشیوں اور گجراتیوں کے مقابلہ میں بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا، لڑائی کا پلہ اسی وقت ڈانواڈول ہی تھا کہ مخالفوں کو محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا کی شکست کی خبر ملی۔ اس

خبر کو سنتے ہی ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ اسی طرح خان کلاں نے شیر خان فولادی کے لڑکے کو شکست دے کر بھگا دیا اور میدان دشمنوں کے وجود سے پاک ہو گیا۔

اختیار الملک کا اکبر پر حملہ

فتح کے بعد میدان کے کنارے ایک ٹیلے پر بادشاہ نے قیام فرمایا اور بہادروں کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے لگے، اس موقع پر خلاف توقع اختیار الملک گجراتی 5000 سواروں کو جو خان اعظم کا راستہ روکنے کے لیے متعین کیے گئے تھے شہر سے لے کر نکلا اور جنگل کا راستہ کاٹ کر اچانک سامنے آ گیا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ سخت بدحواس ہو گئے اور افراتفری مچ گئی۔ اکبر نے ایک دستہ کو تیر اندازی کا حکم دیا اور ''سورن یا معین'' کے نعرے لگانے لگا۔ بہادروں نے غنیم کی پہلی صف کو جو سب سے آگے تھی تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ جو لوگ بہادری کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے حسین خان ان میں سب میں آگے تھا۔ بادشاہ نے اپنی خاص ہلالی تلوار، جو ایک مشہور تلوار تھی اسے عطا فرمائی۔ اختیار الملک ایک ہی حملہ میں پسپا ہو کر بھاگ نکلا، اس کا گھوڑا بھی تھوہر کی جھاڑیوں میں جا کر پھنس گیا۔ سہراب بیگ ترکمان اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے بڑھ کر اختیار الملک کو گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر اختیار الملک نے سہراب بیگ سے کہا'' اے جوان تو ترکمان معلوم ہوتا ہے اور ترکمان حضرت علی مرتضی کے غلام اور ان کے فدائی ہوتے ہیں، میں بخاری سید ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دے۔ سہراب بیگ نے جواب دیا میں تجھے کس طرح چھوڑ دوں تو اختیار الملک ہے اور میں نے تجھے پہچان کر ہی تیرے تعاقب میں خون پسینہ ایک کیا ہے، پھر وہ گھوڑے سے اتر آیا اور ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے گھوڑے کو کوئی دوسرا لے اڑا تھا، اس لیے وہ اس کے سر کو اپنے دامن میں چھپا کر حاضر ہوا اور بادشاہ کے سامنے یہ سوغات رکھ دی۔ بادشاہ نے اسے کافی انعام واکرام عطا کیا۔ اس لڑائی میں تقریباً ایک ہزار سوار مارے گئے بادشاہ نے عبرت کے لیے ان سروں کو جمع کرا کے وہاں مینار لگوا دیا۔

محمد حسین مرزا کا قتل

جس وقت اختیار الملک کا یہ ہنگامہ برپا تھا، رائے سنگھ کے کارندوں نے محمد حسین مرزا کو ہاتھی سے اتار کر دستی نیزوں سے اس کا کام تمام کر دیا اس کا اور اختیار الملک کا سر آگرہ بھیج دیا گیا۔

اعظم خان سے ملاقات

اسی دوران اعظم خان قلعہ سے نکل کر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس سے بغل گیر ہوئے اور اس سے دوسرے امیروں کا حال احوال پوچھتے رہے۔ اعتماد خان کے مکان میں بادشاہ نے پانچ دن قیام فرمایا اور قطب الدین محمد خان کو اس کے لڑکے نورنگ خان کے ساتھ بھڑوچ اور چنپانیر کی طرف شاہ میرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ خان کلاں کو پٹن کی حکومت دی گئی اور وزیر خان کو دولقہ اور دندوقہ کے علاقہ پر نامزد فرمایا۔ شاہ قلی خان محرم راجہ بھگونت داس اور خان بخشی کے لشکر کو ایدر کے راستہ سے آگرہ اور فتح پور جانے کا حکم ملا کہ یہ لوگ اودے سنگھ کے علاقہ کو پامال کرتے ہوئے جائیں۔ اسی حملہ میں بدنگر کا شہر ان لوگوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔

گجرات کا نظم و نسق

بادشاہ نے 16 جمادی الاول کو احمد آباد سے کوچ فرمایا اور محمود آباد میں جا کر سلطان محمود گجراتی کے محل میں قیام فرمایا۔ دولقہ سے خان اعظم اور دوسرے تمام گجرات کے امرا کو اپنے اپنے مقام پر جانے کی اجازت عطا فرمائی۔ مرزا غیاث الدین علی قزوینی بخشی کو آصف خان خطاب عطا کیا۔ گجرات کی دیوانی اور بخشی گری کا عہدہ اس کے سپرد کیا گیا۔ 3ر جمادی الثانی کو بادشاہ اجمیر پہنچے، سانگا نیر کی جگہ راجہ ٹوڈرمل کو جو آگرہ میں 1000 جہازوں اور کشتیوں کی تیاری کے سلسلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے گجرات کے مال غنیمت اور حساب کتاب کے لیے مقرر فرمایا۔ 7ر جمادی الآخر کو شاہانہ سواری پایہ تخت پہنچی۔ اس ساری

مہم میں ڈیڑھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔

اس ماہ کی 25 تاریخ کو شاہزادوں کی ختنہ کرائی گئی۔ رجب کی دوسری تاریخ کو شاہزادہ سلطان سلیم کو مولانا میر کلاں محدث ہروی کے پاس بسم اللہ کے لیے بٹھایا گیا۔ مولانا میر کلاں مشہور محدث میرک شاہ بن میر جمال الدین کے شاگرد تھے۔

اسی سال بادشاہ نے مظفر خان کو سارنگ پور کی حکومت سے واپس بلا کر وزیر مطلق کے عہدہ پر مامور فرمایا۔ اس کے القاب میں جملۃ الملک کے خطاب کا بھی اضافہ ہو گیا۔ شیخ محمد بخاری جنگ پٹن میں اور سیف خان احمد آباد کی آخری لڑائی میں مارا گیا تھا۔ ان دونوں کے قرضے تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے تھے۔ بادشاہ نے یہ قرض شاہی خزانے سے ادا فرما دیے۔

اکبر کی اجمیر روانگی

اسی سال بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو جو گجرات کی مالی رپورٹ تیار کر کے لایا تھا، تلوار عطا فرمائی اور اسے لشکر خان بخشی کے ساتھ جسے ہندوستان میں اکثر لوگ ''شرخان'' کہا کرتے تھے، بنگال کی مہم کا ساز و سامان کرنے کے لیے منعم خان خانخاناں کے پاس بھیج دیا۔ شہر اللہ کنبوی لاہوری کو شہباز خان کا خطاب عطا فرمایا اور اسے میر بخشی کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ انہی دنوں میر محسن رضوی جو دکن کی سفارت پر گیا ہوا تھا وہاں کے فرمانرواں کے عمدہ تحائف لے کر دربار حاضر ہوا۔ اکبر نے بنگال کی فتح کی دعا مانگنے کے لیے اجمیر کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب وہ فتح پور سے چار کوس پر موضع وائز میں پہنچا تو خواجۂ احرار کے پوتے خواجہ عبدالشہید میرزا شرف الدین کو رہائی دلانے کے لیے پہنچے اور اس کی سفارش کی، بادشاہ نے ان کی سفارش کو قبول نہیں کیا، اگرچہ تعظیم و تکریم میں کوئی کوتاہی نہ برتی، خواجہ نے بھی فاتحہ پڑھ کر بادشاہ کو رخصت کیا، لیکن دل میں رنجش تھی۔ اس لیے آزردہ خاطر واپس ہوئے۔ بادشاہ نے اجمیر سے سات کوس پہلے ہی پیادہ سفر شروع کیا اور 12 ذی القعدہ مزار مقدس کی زیارت فرمائی۔

جشن شاہانہ

اسی مہینہ کی 17 تاریخ کو آفتاب برج حمل میں داخل ہوا۔ جیسا کہ ہر سال اس خاص دن کی تعظیم میں عید منائی جاتی تھی، بادشاہ نے اس بار بھی ایک بڑا جشن منعقد کیا اور حاضرین محفل میں سے ہر گروہ کو ایک ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا۔ 23 ذی قعدہ کو بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر پایہ تخت پہنچے اور بنگالہ کے سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ کشتیاں تیار کرنے کا حکم صادر کیا گیا، ان میں سے ایک کشتی، شیر کے سر اور ایک دوسری مگرمچھ کے سر کی وضع کی تھی۔ یہ دونوں سمندری جہاز کی طرح بڑی اور بلند تھیں۔

دربار اکبری میں رسائی

اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخر میں، میں (صاحب تصنیف) حسین خان کی ملازمت ترک کرکے بدایوں سے آگرہ پہنچا اور جمال خان قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلے سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ان دنوں علم کی بڑی قدرو قیمت تھی، پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا اور ہم نشینوں میں داخل کرلیا گیا۔ بادشاہی محل کے علماء کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے اور بحث مباحثہ کرکے اس کو نیچا دکھانے اور خود، سر بلند ہونے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا، اللہ کی عنایت سے قوت طبع، ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے میں (صاحب تصنیف) جلد ہی ان میں سے اکثر علماء پر چھا گیا۔

جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا، بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبدالنبی صدرالصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی، اس لیے وہ مجھ سے کچھ ناخوش ہی تھا۔ وہ اس مناظرہ کے وقت میرے فریق کی ہی طرف داری کر رہا

تھا اور وہی شکل سامنے آگئی: سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا

بعد میں عبدالنبی کے ساتھ یہ پرخاش ختم ہوگئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔

ان دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم وعقل کا ستارہ اوج پر تھا، باریاب ہوا اور بڑے اعزاز واکرام سے نوازا گیا۔

ہرن مینار

اسی سال اجمیر کے راستہ میں بڑی عمدہ اور بلند عمارتوں کی تعمیر انجام کو پہنچی۔ چونکہ اکبر درگاہ کا نہایت معتقد تھا اور ہر سال لازما اجمیر جاتا تھا، اس لیے اس نے آگرہ سے اجمیر تک ہر منزل پر ایک محل بنانے کا حکم دیا تھا اور ہر کوس پر ایک ایک منارہ اور کنواں بھی بنوایا۔ بادشاہ نے اپنی زندگی میں جتنے ہرنوں کا شکار کیا تھا ان سب کے ہزاروں سینگ رکھے ہوئے تھے۔ یہ سینگ ہرن منار پر بطور یادگار لگوا دیے۔ ان میناروں کی تاریخ ”میل شاخ“ ہوتی ہے۔ کاش اس کے بجائے باغ یا سرا بنوائی جاتی!

اسی سال شہباز خان کمبو کی رائے پر ”داغ“ اور ”محلّہ“ کی رسم کا آغاز ہوا۔ تمام ممالک محروسہ میں تحصیل کے ”کروڑیوں“ کا تقرر کیا گیا اور بادشاہ نے تمام ملک کے خالصہ ہونے کا حکم صادر فرمادیا۔

بنگال پر فوج کشی

982ھ/1574ء میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادہ سے کوچ کیا اور ”مہتک سر“ نامی کشتی میں سوار ہوا۔ بنگال میں جو حالات پیدا ہوگئے تھے وہ اس سفر کا سبب بنے۔ وہاں سلیمان افغان کرانی جس نے سلیم شاہ کے عہد سے بنگالہ کے سارے علاقے پر قبضہ کرکے خودمختار حکومت قائم کر رکھی تھی، فوت ہو چکا تھا۔ اس کا لڑکا بایر جو چند دن تک اس کا جانشین رہا، لیکن اپنی بدسلوکی کی وجہ سے اپنے بہنوئی ہنسو اور دوسرے امیروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد سلیمان کا چھوٹا لڑکا داؤد جو اس کا ولی عہد تھا، بادشاہ بن گیا۔

اس نے بادشاہ بننے کے بعد اطاعت کی وہ روش ترک کردی جس پر سلیمان کاربند تھا۔ دربار میں عریضے بھیجنے بھی بند کردیے۔

بادشاہ کو سلیمان کے انتقال کی خبر سورت کے قلعہ میں ملی تھی۔ بادشاہ نے اس وقت خان خاناں منعم خان کو جو اس زمانہ میں جونپور میں تھا فرمان بھیجا تھا کہ وہ داؤد کی خبر لے اور بہار کے علاقے کو فتح کرلے۔ خانخاناں نے ایک بھاری لشکر لے کر حملہ کردیا اور دو لاکھ روپیہ نقد اور قسم قسم کے نفیس تحفے پیش کش میں وصول کرکے مصالحت کرلی اور واپس آگیا۔

امیر الامراء لودھی کا قتل

اس وقت داؤد حاجی پور میں تھا۔ اس کا ایک سردار لودھی جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اور اڑیسہ کی حکومت پر اسے مقرر کیا گیا تھا، باغی ہوگیا تھا اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کرکے خود مختاری کا دعوی کررہا تھا۔

جگناتھ کے حاکم قتلو خان کی مدد سے داؤد نے دو ہاتھی عطا کرنے کا اسے لالچ دیا اور بڑی تدبیر سے اس پر قابو پا کر قید کردیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ داؤد چند ساتھیوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس وقت لودھی نے سلیمان کے ملازمین میں سے دس ہزار سوار اپنے ساتھ لیے اور داؤد کو ختم کردینے کا ارادہ کرلیا۔ داؤد اسی وقت شہر میں لوٹ آیا اور فوج کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان میں تفرقہ پیدا کردیا اور لودھی کو حسن تدبیر سے گرفتار کرکے سارے مال و اسباب کو ضبط کرلیا۔ لودھی کو اپنے قتل کا کامل یقین ہوگیا تھا لیکن اس آخر وقت میں بھی اس نے داؤد کو خیر خواہی کے طور پر نصیحت کی اور کہا ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کو میرے قتل کے بعد بڑی پشیمانی ہوگی اور اس وقت پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں ایک تدبیر سمجھاتا ہوں اگر تم اس پر عمل کروگے تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔ اس سے پہلے دو لاکھ روپیہ دے کر مغلوں سے میں نے صلح کرادی ہے اور اس صلح کے بھروسے پر اطمینان سے بیٹھے نہ رہو کیوں کہ مغل اس

تھوڑی سی رقم پر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اس لیے خود پہل کر کے مغلوں کے خلاف دلیرانہ فوج کشی کر دو، یاد رکھو جو بھی پہل کر جائے گا وہی کامیاب رہے گا”۔

داؤد نے اس کی باتوں کو غرض آمیز سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور خان خاناں کی اس گرگ آشتی پر جو فقط دکھاوا تھی، بھروسہ کر کے اس نے اپنے خیرخواہ لودھی کو قتل کرا دیا اس کو قتل کر کے اس نے اپنے پیر پر کلہاڑی چلا دی تھی۔ اس کی حکمرانی پر بس اسی وقت سے زوال آ گیا۔ خان خاناں کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے پٹنہ اور حاجی پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت داؤد کو لودھی کی قدر معلوم ہوئی اور وہ اس کے قتل پر بڑا نادم ہوا، لیکن اب اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

بادشاہی فوجوں کے مقابلہ پر داؤد نے پٹنہ کے قلعہ کی مرمت کرائی اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ قلعہ میں بند ہو گیا لیکن اس کی بدمستی اور بے تدبیری کی وجہ سے اس کے اکثر امیر اس سے علیحدہ ہو کر منتشر ہو گئے۔

دلچسپ دریائی سفر

بادشاہ نے مذکورہ تاریخ پر میرزا یوسف خان کو لشکر کی سرداری پر مقرر کر کے خشکی کے راستے روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خان کو آگرہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود دریا کے راستے روانہ ہو گئے۔

اس مہم میں بڑا شاہزادہ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا، اس وقت دربار کی سطح پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر نہیں آ رہی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے، ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے اتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا اور رات میں جب لنگر ڈال دیے جاتے تو علمی مباحثے اور شعر گوئی کی محفلیں ہوتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

الہ آباد میں قیام

23ماہ صفر کو پریاگ یعنی الہ آباد میں جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے، قیام ہوا۔ یہاں کے مندر میں ہندو حصول ثواب اور مشاہدۂ تناسخ کے لیے طرح طرح کی سخت ریاضتیں کرتے ہیں۔ بعض تو اپنے سر آرے کے نیچے دے دیتے ہیں۔ بعض اپنی زبان کٹوا لیتے ہیں اور بعض تو کسی اونچے درخت سے دریا میں گر کر جان دے دیتے ہیں۔ یہاں پہنچنے پر بادشاہ نے ایک عالی شان عمارت کی تعمیر کا حکم دیا اور شہر کا نام الہ آباد رکھا۔ بنارس پہنچنے کے بعد شیر بیگ تورچی کو ایک تیز رفتار کشتی میں بٹھا کر خانخاناں کے پاس بھجوا دیا۔

دوسری ماہ ربیع الثانی کو تکی پور کے موضع سے جو جونپور کے مضافات میں ہے اور جہاں گودی ندی گنگا میں آکر ملتی ہے، شاہزادہ، حرم شاہی، صدر الصدور اور قاضیوں کی کشتیاں گودی کے چڑھاؤ پر جونپور کی طرف روانہ ہوگئیں۔ بادشاہ بھی دو تین منزل تک ان کے ساتھ جا کر لوٹ آئے۔ اسی منزل میں سلطان محمود بھکری کے فوت ہونے اور اس کے علاقہ پر محب علی خان کے قابض ہو جانے کی اطلاع ملی، پھر خان خاناں کے حسب التماس بادشاہ نے گنگا میں تیزی سے سفر شروع کیا۔ اسی ماہ کی چھ تاریخ کو لشکر خشکی کے راستے سے چل کر غازی پور شہر میں شاہی قافلہ سے آملا۔ اسی منزل میں خان خاناں کے پاس سے اعتماد خان خواجہ سرا حاضر ہوا اور خان خاناں کے لشکر کے تمام حالات تفصیل سے سنے اور عجلت سے روانگی کی استدعا کی۔

سید میر منجم کی پیش گوئی

اس ماہ کی ساتویں تاریخ کو سید میر اصفہانی منجم نے جو خان زمان کی شکست کے بعد سے جونپور ہی میں مقیم تھا، نقیب خان کی فرمائش پر نجوم کی کتاب ’’اعظم‘‘ کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا:

بزودی اکبر از بخت ہمایون   برد ملک از کف داؤد بیرون

حسن اتفاق کہ جو کچھ پیش آیا اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جونپور میں

بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تھا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا، پھر نجوم سے فال نکالی۔ اس وقت یہ شعر بر آمد ہوا:

مژدۂ فتح بناگاہ رسید   مہر داؤد بدر گاہ رسید

میری (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) اس ماہر نجومی سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی، میں نے اس علم کو سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کر لیا اور کہا "یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے"۔ آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسرے فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسے فال بر آمد کر سکتا ہے۔ اس کا مجھے (صاحب تصنیف) مشاہدہ بھی ہوا، بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا اور انہی دنوں سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقہ کو سیکھ لیا۔

شاہی بیڑہ چوسہ میں

20 ماہ ربیع الثانی کو چوسہ میں قیام کیا گیا، یہاں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ پٹھانوں کے سربر آوردہ امیر عیسیٰ خان نیازی نے جو بہادری اور شجاعت میں کافی مشہور ہے، پٹنہ کے قلعہ سے جنگی ہاتھی اور ایک بھاری جمعیت لے کر شاہی فوج پر حملہ کر دیا تھا، لیکن بادشاہ کے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دنوں شہاب الدین احمد خان کا بھائی معصوم بن ہاشم خان خان خاناں کے لشکر میں تھا اور اس کا لڑکا بادشاہ کی خدمت میں کشتی پر رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس روزانہ لشکر کے حالات معلوم کرا کے بادشاہ کو سنایا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بادشاہ کی خدمت میں بڑا تقرب حاصل کر لیا تھا یہاں تک کہ اس کو نیابت خان کا خطاب مل گیا، لیکن بعد میں چل کر کون سی ایسی بغاوت تھی جو اس نے نہیں کی اور بغاوت کا کون سا ایسا پھل تھا جو اسے چکھنا نہ پڑا۔

حاجی پور کے قلعہ کی فتح

اس مہینہ کی 16 تاریخ کو شیخ پہاڑی کے مقام پر جو کہ پٹنہ سے دو تین کوس پر واقع ہے، قافلہ پہنچا۔ یہاں پانچ بلند گنبد ہیں جن کو پہلے زمانہ میں غیر مسلمانوں نے پکی اینٹوں سے بنوایا تھا۔ بادشاہ نے اس جگہ خان خاناں کے مکان میں قیام فرمایا۔ خان خاناں نے اس موقع پر مروارید سے بھرے ہوئے تھال نچھاور کیے اور بے شمار نفیس تحائف قیمتی کپڑے نذر میں گزارے۔ یہاں سے بادشاہ نے تین ہزار بہادر سوار عین طغیانی کے وقت کشتیوں میں بٹھا کر حاجی پور کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیے۔ اسی قلعہ سے پٹنہ والوں کو مدد پہنچائی جاتی تھی۔ یہ جنگی کشتیاں تمام جنگی سامانوں سے لیس تھیں اور قلعہ شکنی کے سارے آلات ان میں رکھے گئے تھے۔ دیکھنے میں اتنی پر شکوہ اور شاندار تھیں کہ بس آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ یہ جمعیت خان عالم کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، راجہ گجپتی کو خان عالم کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ راجہ گجپتی اس علاقہ کا بڑا با اثر آدمی تھا، اس کی قوت اور جمعیت ایسی تھی کہ اس نے خان زماں جیسے بہادر سردار کو دو سال تک ان جنگلوں میں سرگرداں رکھا تھا، ابھی تک وہاں کے جنگل جیسا کہ چاہیے پاک و صاف نہیں ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں بکثرت حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے حملہ کر کے خشکی اور تری دونوں طرف سے حاجی پور کو گھیر لیا۔ بادشاہ بھی محاذ پر پہنچے اور دریا کے اس طرف ایک بلند مقام پر ٹھہر کر جنگ کا نقشہ دیکھنے لگے دوری اور دھندلکے کی وجہ سے جنگ کی صورت حال واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی تھی، اس لیے تجربہ کار جوانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر عصر کے وقت حاجی پور کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ صحیح خبر لے کر آئیں۔ قلعہ والوں نے جب ان کو آتے دیکھا تو اٹھارہ کشتیوں میں سپاہی بھر کر ان کے مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ جب مقابلہ ہوا تو اس مختصر سی جماعت نے اس بڑے گروہ پر نمایاں کامیابی حاصل کی اور اکثر راستے سے ہٹ کر خان عالم کے بیڑے سے جا ملے۔ دشمن کی طرف سے فتح خان بارہہ بہت سارے پٹھانوں کے ساتھ بڑی سخت لڑائی کے بعد مارا گیا اور قلعہ تلوار کی زد پر

فتح ہو گیا۔ مقتول سرداروں کے سر ایک کشتی میں رکھ کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ اس کشتی کو بادشاہ نے حفاظت سے داؤد کے پاس بھجوا دیا تاکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرے۔ دوسرے دن بادشاہ پنج پہاڑی کے اوپر تشریف لے گئے اور قلعہ پٹنہ کا سرسری معائنہ کر کے اس کے اطراف و اکناف کے علاقہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اس وقت پٹھان بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے کہ ان کے گولے تین کوس کے فاصلے سے لشکر میں آ کر پھٹتے تھے۔ میں بیانہ اور بجوانہ کے حاکم سید عبداللہ خان جوکان بیگی کے خیمے میں رہتا تھا ایک گولہ میرے سر پر سے دندناتا ہوا گزرا۔ اللہ نے بچا لیا اور زندگی کی یہ مہلت مل گئی ورنہ نہ معلوم میں کہاں پہنچ گیا ہوتا۔

داؤد کا فرار ہونا اور پٹنہ کی فتح

حاجی پور کے فتح ہو جانے سے مخالفین کی کمر ٹوٹ گئی۔ داؤد کے پاس بیس ہزار سوار اور بے شمار جنگی ہاتھی تھے اور ایک بہت بڑا توپ خانہ بھی تھا لیکن اس سارے خدم و حشم کے باوجود شاہی حملہ سے ڈر کر اس مہینہ کی 21 تاریخ کو ایک کشتی میں بیٹھ کر قلعہ سے بھاگ گیا۔ سرہر ہندی بنگالی جس کا خطاب بکر ماجیت تھا اور جس نے لودھی کے قتل پر داؤد کو آمادہ کیا تھا۔ ایک کشتی میں خزانہ رکھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ گوجر خان کرانی جس کا خطاب رکن الدولہ تھا، ہاتھیوں کو لے کر جنگل میں نکل گیا۔ بہت سارے لوگ تو مارے خوف کے دریا میں غرق ہو کر مر گئے۔ بعض سراسیمہ ہو کر قلعہ کے برج اور فصیل پر سے نیچے کود پڑے اور خندق ان کی لاشوں سے پٹ گئی۔ کچھ لوگ گلی کوچوں میں ہاتھیوں کی لپیٹ میں آ کر ہلاک ہو گئے۔ قلعے کی بھاگی ہوئی فوج جب پن پن ندی پر پہنچی تو گوجر خان ہاتھیوں کو اس پل پر سے جسے ندی پر باندھا گیا تھا گزار کر نکل گیا اور اس کے پیچھے لوگوں کا پل پر اس قدر ہجوم ہوا کہ پل بوجھ برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر بہت سے پٹھان سردار مال اسباب چھوڑ کر ندی میں کود پڑے اور اس میں غرق ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ کو رات کے آخری حصے میں داؤد کے فرار ہو جانے کی خبر ملی اور وہ شہر پٹنہ میں داخل ہوئے۔ شہر میں

56 ہاتھی لشکر کے ہاتھ آئے اور فتح نصیب ہوئی۔

بادشاہ نے پٹنہ کی حفاظت اور انتظام پر خان خاناں کو مقرر کیا اور خود گوجر خان کے تعاقب میں جو داؤد کے تمام ہاتھیوں کو لے جارہا تھا روانہ ہو گیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر پُن پُن ندی کو پار کر کے دریاپور تک جو پٹنہ سے 36 کوس پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے حملہ کر کے تقریباً چار سو مشہور ہاتھیوں کو پکڑ لیا۔ گوجر خان البتہ اپنی جان سلامت لے کر نکل گیا۔ شہباز خان، میر بخشی اور مجنون خان نے دریاپور سے آگے بڑھ کر سات کوس تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے لوٹ آئے۔ انھوں نے آکر بادشاہ کو اطلاع دی کہ گوجر خان بلھوندی پار کر کے نکل گیا ہے، لیکن اس کے بہت سے آدمی پانی میں غرق ہو کر ہلاک ہو چکے ہیں۔

اسی مہینے کی 21 تاریخ کو خان خاناں بھی دریا کے راستے سے دریاپور میں آیا۔ وہ اپنے ساتھ کشتیاں بھی لے کر آیا تھا۔ بادشاہ نے 6 دن وہاں قیام کیا اور خان خاناں کی مدد کے لیے اپنے ساتھ کے امراء کو دس ہزار سواروں کے ساتھ مقرر کیا اور اس پورے لشکر کی تنخواہ اور مراتب میں دس سے تیس تک اور دس سے چالیس تک کا اضافہ فرمادیا اور خان خاناں کو بنگالہ کا پورا ملک اور کشتیوں کا سارا بیڑا عطا کر کے وہاں سے غیاث پور کی طرف جو گنگا کے کنارے ہے بادشاہ واپس ہوا۔

اسی سال دوسری جمادی الاول کو یوسف خان کو لشکر کی سرداری پر مقرر کر کے مظفر خان کو فرحت خان کے امراہ رہتاس کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ فرمایا تاکہ وہ فتح کے بعد رہتاس کی حکومت فرحت خاں کے کے سپرد کر کے دربار میں چلا آئے۔

اسی مہینے کی تیسری تاریخ کو بادشاہ کی سواری پٹنہ میں داخل ہوئی۔ وہاں بادشاہ نے سارے معاملات کا مناسب انتظام کیا اور داؤد کی عمارتوں کا سرسری طور پر معائنہ کیا۔ پٹنہ میں عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہاں بعض چھپر کے مکان تھے تھیں، چالیس چالیس ہزار میں تیار ہوتے ہیں حالانکہ وہ تمام کے تمام لکڑی سے ہی بنائے جاتے ہیں۔

بنگال سے واپسی

چھٹی تاریخ کو بادشاہ جونپور پہنچے اور ایک مہینہ تک وہاں قیام فرمایا۔ جونپور اور بنارس کو خالصہ میں شامل کرلیا اور اس کا نظم ونسق میرزا میرک رضوی اور شیخ ابراہیم سیکری وال کے سپرد کرکے نویں جمادی الثانی کو جونپور سے دہلی کے لیے کوچ فرمایا۔ جب موضع خان پور میں کیمپ لگایا گیا تو قاضی نظام بدخشی فیروزہ کابلی کے ساتھ خدمت شاہی میں پہنچے۔ یہ صاحب بدخشاں اور ماوراء النہر کے بہت بڑے عالم تھے، تصوف و طریقت میں ان کا بڑا مرتبہ تھا، فیروزہ کابلی مرزا محمد حکیم کے گھرانہ کا لڑکا تھا یہ نہایت ذہین طالب علم تھا۔ خطاطی اور موسیقی کے فن میں بھی اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔

بادشاہ نے قاضی نظام کو ایک مرصع شمشیر اور پانچ ہزار روپیہ نقد عطا فرمایا، انھوں نے بتدریج اپنی استعداد و عالی ظرفی کی وجہ سے قاضی خان کا خطاب اور بعد میں ''غازی خان'' کا خطاب حاصل کرلیا اور سہ ہزاری کے عہدے تک ترقی کی، البتہ فیروزہ کا معاملہ کچھ اس کے برعکس ہی ہوا، وہ اپنے مقام سے برابر تنزل ہی کرتا رہا۔ اسی جگہ خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ داؤد پٹنہ سے نکل کر گڑھی چلا گیا تھا وہاں اس نے قلعہ کو مستحکم کرکے اپنے معتمد سرداروں کے سپرد کردیا اور وہاں سے ٹانڈہ کی طرف چلا گیا۔ جب شاہی فوجوں نے گڑھی کی طرف پیش قدمی کی تو قلعہ والے مرعوب ہوکر جنگ کیے بغیر ہی قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ

جمادی الآخر میں جب شیر گڑھ عرف قنوج میں قیام ہوا تو بادشاہ نے مجھے (صاحب تصنیف) مخاطبت سے نوازا اور مہربانی کے باعث حکم دیا کہ میں طوطی نامہ(36) کی طرح سنگھاسن بتیسی(37) کا ترجمہ کرکے اس کی نظم و نثر کو مرتب کروں اس کتاب میں بتیس حکایتیں ہیں جو مالوہ کے حاکم راجا بکرماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کردوں اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھادوں۔ ایک صاحب علم برہمن کو اس کی ترجمانی کے لیے مقرر فرمایا، اسی دن میں نے جب ایک کہانی

کا پہلا صفحہ لکھ کر پیش کیا تو بادشاہ نے بڑی تحسین اور تعریف کی جب اس کتاب کا ترجمہ ہوگیا تو اس کا نام "خردافزا" تجویز ہوا۔ اس میں اس کا تصنیفی پس منظر اور تاریخ بھی شامل کردی گئی۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا اور تعریف کر کے اسے شاہی کتب خانہ میں داخل کرادیا۔

خواجہ عبدالشہید کی بددعا

اسی دوران جب کراؤلی کے مقام پر شاہی قافلہ پہنچا تو خواجہ عبدالشہید، سمرقند واپس جانے کا ارادہ کر کے رخصت ہونے کے لیے آئے اور اکبر سے کہا "میں اپنی ہڈیوں کو اسی سرزمین (سمرقند) میں پہنچانا چاہتا ہوں، پھر انھوں نے بادشاہ کی کمر سے ایک تلوار باندھی اور دوبارہ میرزا اشرف الدین حسین کی رہائی کے لیے درخواست کی"۔ اس بار بھی جب بادشاہ نے قبول نہ کیا تو انھوں نے نہایت رنجیدہ ہوکر فرمایا "اب میں مزید کیا کہوں، یہ بات امن و امان کے لیے بہرحال مضر ہے، بس اپنے خدا سے یہی چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ایمان کو قائم کرے"۔ جیسا کہ انھوں نے کہا تھا وہ سمرقند پہنچتے ہی اپنے بزرگوں سے جا ملے"۔

20 جمادی الثانی کو اسکندر پور کے قصبہ میں قیام ہوا تو یہ خبر پہنچی کہ داؤد نے ٹانڈہ کو بھی جو گنگا کے اس طرف گوڑ کے مقابل واقع ہے بغیر جنگ کیے چھوڑ دیا ہے اور صحرا نوردی کرتے ہوئے اڑیسہ کو چلا گیا ہے اور ٹانڈہ پر خانخاناں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

اکبر کی دہلی آمد

اگرچہ وہ تین منزل پر تھا، لیکن بادشاہ نے آگرہ کے بجائے دارالملک دہلی کا رخ کیا اور پہلی ماہ رجب کو دہلی میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوا۔ چند دنوں تک مقدس مزاروں کی زیارت کی۔ انھی دنوں حسین خان پٹیالی بھون گاؤں سے قریب حاضری کے لیے آیا، لیکن اسے باریابی کی اجازت نہ ملی بلکہ بادشاہ نے شہباز خان میر بخشی کو حکم دیا کہ

اُسے دولت خانہ کے احاطہ سے باہر نکال دیا جائے۔ حسین خان کو اس توہین کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے ہاتھی اونٹ، گھوڑے اور جنگی سازوسامان ہمایوں بادشاہ کے مقبرے کے طالب علموں، مستحقوں اور مجاوروں، مدرسوں اور خانقاہوں کو عطا فرمائے اور سب کچھ ترک کرکے "الف وار" قلندری اختیار کرلی:

این ہمہ طمطراق کن فیکون
شمہ نیست پیش اہل جنون

جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس پر عنایت مبذول کی اور اپنی شال اتار کر اسے اوڑھائی۔ اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر بطور پروانگی عطا فرمایا اور حکم دیا کہ کانت، گولہ اور پٹیالی اور دوسرے علاقے جو ایک کروڑ بیس لاکھ کی جاگیر تھی، حسب سابق ایک فصل تک اس کے سپرد کی جائے اور سرکار کا کروڑی اس جاگیر میں مداخلت نہ کرے۔ جب وہ سواروں کا" داغ و محلّہ" کرالے تو اسے مناسب تنخواہ پر جاگیر عطا کردی جائے گی۔ حسین خان اپنی فیاضی اور کشادہ دستی کی وجہ سے اس قدر قلاش ہو چکا تھا کہ دس سوار رکھنے کی بھی اس میں طاقت نہیں تھی۔ اس قصہ کو رفع دفع کرنے کے لیے وہ مجبوراً اپنی جاگیر پر چلا گیا اور شمالی کوہستان کو فتح کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس مرتبہ وہ دربار سے ایسا گیا کہ پھر اسے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا:

زر بدہ مرد سپاہی را تا سر بدہد
ورش زر ندہی سر بنہد در عالم

اجمیر کی زیارت کے لیے روانگی

اوائل شعبان میں بادشاہ نے دہلی سے اجمیر کا قصد کیا۔ نارنول کی منزل میں حسین قلی خان جہان مبارکباد کے لیے حاضر ہوا اور خان اعظم یلغار کرتے ہوئے احمد آباد سے حاضر خدمت ہوا۔ رمضان المبارک کے آغاز میں حسب سابق اجمیر سے 7 کوس کے فاصلہ پر بادشاہ پیدل زیارت کے لیے چلے اور درگاہ پر پہنچ کر داؤد کے لشکر کے نقاروں کی ایک

جوڑی جس کو درگاہ پر پیش کرنے کی بادشاہ نے منت مانی تھی، نذرانہ میں دی۔ حسب معمول ہر روز درگاہ میں راتوں کے وقت اہل اللہ اور صالحین کی محفل جمتی اور سماع کی مجلسیں منعقد ہوتیں، جن میں بادشاہ برابر حاضر رہتے۔ موسیقار اور قوال جو اپنے فن میں ایک سے ایک بڑھ کر تھے، دل سوز نغمے گا گا کر سناتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر روپے پیسے کی بارش ہونے لگتی۔

دارالخلافہ کی جانب واپسی

اجمیر سے بادشاہ نے مالدیو کے لڑکے چندر سین کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک تجربہ کار فوج کو مقرر کیا اس فوج کی سرداری محمد طاہر خان میر فراغت حاکم دہلی کے لڑکے طیب خان کے سپرد کی گئی۔ اس فوجی حملہ کا سبب یہ تھا کہ چندر سین کے بارے میں بادشاہ کو مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ جودھپور اور سیوانہ کے علاقہ میں سرکشی اختیار کر کے مسلمانوں کو پریشان کر رہا ہے۔ جب یہ فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے پہنچی تو وہ گھنے جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گیا اور فوج کی روانگی کے بعد ماہ رمضان کے وسط میں خان اعظم کو گجرات پر جانے کی اجازت عطا فرمائی گئی اور بادشاہ مسلسل کوچ کر کے رمضان کی آخری تاریخ تک فتح پور واپس تشریف لے آئے۔

سیوانہ کے قلعہ کی فتح

بادشاہ نے اسی سال شاہ قلی خان محرم، جلال خاں قورچی اور چند دوسرے امیروں کو سیوانہ کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ یہ قلعہ مالدیو کے پوتوں کے قبضے میں تھا۔ جلال خان قورچی بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ نہایت ظریف اور خوش طبع آدمی تھا۔ مصاحبوں اور ندیموں میں بادشاہ کے مزاج میں کسی کو اتنی دسترس نہ تھی، جتنی جلال خان کو حاصل تھی۔ اس معرکہ میں اس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ اس طرح اسے دنیا بھی ملی اور عاقبت بھی ہاتھ سے نہیں گئی۔ اس کے بعد اس مہم پر شہباز

خان کنبوہ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

اسی سال بادشاہ نے میر گیسو بکاول کو سلطان محمود بھکری کے مال و دولت کی تحقیقات اور قلعہ بھکر کے انتظامات کے لیے مقرر فرمایا۔

اسی سال گجرات میں بڑی سخت وبا پھیلی اور غلہ اس قدر مہنگا ہوگیا کہ ایک من جوار کے دام ایک سو بیس تنکہ سیاہ تک چڑھ گیا، وبا اور قحط سے بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔

خواجہ اینا خواجہ جہاں کی وفات

اسی سال خواجہ اینا(38) خواجہ جہاں کا لکھنؤ میں اس وقت انتقال ہوگیا جبکہ بادشاہی لشکر پٹنہ سے لوٹ کر وہاں پہنچا تھا۔ خواجہ اینا کی کنجوسی ضرب المثل بنی ہوئی تھی، چنانچہ وہ رات کا بچا ہوا کھانا کھاتا تھا، لیکن یہ کفایت اس کی اپنی ذات تک محدود تھی، کیوں کہ وہ حاجت مندوں کی بہت امداد و اعانت کیا کرتا تھا، بلکہ اس معاملہ میں شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے۔

اس کا معمول تھا کہ ملازمت دلانے کے لیے ایک مقررہ رقم بطور رشوت لیا کرتا تھا اور بادشاہ کے پاس سفارش کر کے، جاگیر، نقارہ، خان یا سلطان کا خطاب دلایا کرتا تھا۔ جو لوگ ماوراء النہر، خراسان اور عراق سے ہندوستان آتے تھے وہ ان کو شاہی خزانہ سے معقول رقمیں دلایا کرتا تھا اور کوشش کر کے دوسرے امیروں سے بھی خاصا روپیہ فراہم کردیتا تھا اور دوسروں کی طرح خود بھی اپنے شایان شان انکی مدد کرتا رہتا تھا۔

ملا حسام الدین ابراہیم اسفرؔ کے ایک شاگرد حافظ تاشکندی تھے جو عربی کے مشہور عالم ہیں انھوں نے سورۂ محمدؐ پر ایک تفسیر لکھی ہے ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس تفسیر سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ وہ جب ہندوستان آئے تو خواجہ اینا نے بادشاہ سے اور دوسرے امیروں سے تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کر کے انکو دلایا وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ منعم خان خاناں کے پاس گئے اور وہاں سے بھی مالا مال ہوکر مکہ معظمہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ انھوں نے 977ھ/1569ء میں اپنے وطن پہنچ کر انتقال فرمایا۔

ایک دلچسپ لطیفہ

انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبری مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی تھا جو ہمیشہ علماء سے الجھتا رہتا اور اپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔ جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھ لیا کہ ''موسیٰ'' کون سا صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے؟ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا کہ دینا چاہیے تھا، نہ دے سکے اور عوام نے یقین کر لیا تھا کہ حاجی ابراہیم علم کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ بڑی ناانصافی کی بات تھی۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی بنایا تھا کہا تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا ''اگر حاجی ابراہیم مجھ سے ''عیسیٰ'' کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب دے سکوں گا؟ بلاشبہ اس نے بڑی عمدہ بات کہی تھی۔

یادِ رفتگان

اس تاریخ سے اب تک(39) کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں کی جماعت میں سے جو 100 سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل تھی محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اُڑھا چکی ہے، بے شک "کل نفس ذائقة الموت"

زخیل درد کشان غیر ما نماند کسی   بیار بادہ کہ ماتم بخیتم بسی

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں(40) سوگوار رہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غمزدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہرحال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں۔ اب کس سے بات کریں؟ تبادلہ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ

ہی چلی گئی۔ اب مجھ ناکارہ[41] کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ انکی جدائی سے جلا اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند　　دریای اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر　　یک لحظہ ز ما پیشتر مست شدند

پیمائش اور کروڑیوں کا تقرر

اس سال اکبر نے ملک کی خوشحالی اور زرعی ترقی کی طرف توجہ فرمائی اور ملک کے سارے زرخیز و بنجر پرگنوں کی پیمائش کرائی[42] شہری، پہاڑی علاقوں، دریاؤں، میدانوں، جنگلوں، تالابوں اور کنوؤں کی تفصیلات جمع و مرتب کی گئیں اور جگہ جگہ کروڑیوں کو مقرر کرکے ہر ایک کروڑی کی تحویل میں اتنی اراضی دے دی کہ زراعت کے بعد اس سے ایک کروڑ تنکہ کا محصول وصول ہو سکے۔ وہی ملازم کروڑی بنائے گئے جن پر پورا بھروسہ تھا اور جو مخلص تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ تین سال کے عرصہ میں غیر مزروعہ خطوں کو قابل کاشت بنادیں تاکہ سرکاری خزانہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ ہر کروڑی سے اس رقم پر ضامن لیے گئے۔

اس پیمائش کی ابتدا فتح پور سے کی گئی۔ اس کے پہلے کروڑ کو آدم پور، دوسرے کو شیث پور اور اسی طرح ایوب پور وغیرہ کے نام دیے گئے اور ہر خطے پر سرکاری عامل تعینات کیے گئے، لیکن بندو بست کا یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا اور ممالک محروسہ کے اکثر علاقے ان کروڑیوں کے مظالم کی وجہ سے بجائے آباد ہونے کے ویران ہو گئے، یہاں تک کہ لوگ اپنے بال بچوں کو بیچ بیچ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور آمدنی کا تناسب بہت زیادہ گر گیا۔ ان کروڑیوں کے احتساب کے لیے راجہ ٹوڈرمل کو مقرر کیا گیا، اس نے ان سب کو اس طرح شکنجہ میں کسا کہ اکثر سخت سزاؤں کی وجہ سے مرگئے اور بیشتر کچہری کے قید خانہ میں کسی سزا کے بغیر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دنیا سے بے گور و کفن رخصت ہوئے۔ ان گرفتاران بلا کا حال بعینہ ان ہندو فدائیوں کی طرح ہو گیا تھا جو کامروپ کے علاقہ میں خود کو ایک بت کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور ایک سال تک جو من میں آتا ہے، کرتے رہتے ہیں۔ وہ

چاہے کتنا ہی بڑا گناہ اور جرم کریں انکے لیے سب کچھ معاف ہوتا ہے۔ لیکن سال گزرتے ہی ان میں سے ہر ایک کو پکڑ کر اس بت خانہ میں اکٹھا کرلیا جاتا ہے اور اس بت کے آستانہ پر ان کے سر قلم کردیے جاتے ہیں۔

داغ و محلّہ کا ضابطہ

کروڑیوں کی یہ حالت تھی اور امرائے شاہی کے یہ ٹھاٹھ تھے کہ خالصہ کے علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک ان کی جاگیروں میں تقسیم تھا اور یہ لوگ رات دن عیش و عشرت میں مبتلا رہتے تھے ان کے گھرانوں کے خرچ اتنے تھے کہ ان کو روپے بٹورنے کے سوا اور کام نہ تھا۔ عیش پسندی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ سپاہیوں کی نگہداشت اور رعایا کی طرف توجہ کرسکیں۔ جب کسی لڑائی پر جانا پڑتا تو بجائے مقررہ فوج کے چند غلاموں اور اپنے شاگرد پیشہ مغل سپاہیوں کے ساتھ میدان میں حاضر ہوجاتے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی کارآمد مضبوط فوج تیار نہ تھی۔

شہباز خان میر بخشی نے ''داغ و محلّہ''[43] کا طریقہ جو سلطان علاؤالدین خلجی اور بعد میں شیر شاہ کے ضابطوں میں شامل تھا، از سرنو مرتب کرکے پیش کیا۔ اس قاعدہ کی رو سے طے پایا کہ پہلے امیروں کو بیسی کا عہدہ دیا جائے اور جب وہ اپنے عہدہ کے شایان شان بیس سوار بھرتی کرکے ان کا معائنہ کرادے اور اس کے حسب استعداد بادشاہ مزید ترقی دینا پسند فرمائیں تو اسے ''صدی'' کا عہدہ دیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے لازم ہوگا کہ سپاہیوں کے علاوہ گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور دوسرے لوازمات فراہم کرکے حاضر خدمت کرے۔ اس تیاری کے بعد وہ ہزاری پھر دوہزاری اور پانچ ہزاری تک اس طرح ترقی کرتا چلا جائے۔ پنج ہزاری سے اونچا کوئی عہدہ نہیں تھا اور اگر کوئی امیر اس ضابطہ پر پورا نہ اترے تو اس کا زوال ہوجاتا تھا۔

فوج کے امراء کی چالبازیاں

داغ و محلّہ کا یہ ضابطہ اسی لیے نافذ کیا گیا تھا کہ امیر مقررہ تعداد میں فوج رکھنے کے پابند

ہو جائیں، لیکن امیروں نے اس ذمہ داری سے بچنے کی تدبیر نکال لی، چنانچہ وہ حاضری اور معائنہ کے وقت اپنے آدمیوں اور بارگیروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے تھے اور اپنے عہدہ کی مقررہ تعداد پوری کر لیتے تھے۔ جب ترقی مل جاتی تو ان کرایہ کے سپاہیوں کو رخصت کر دیتے تھے۔ لڑائی کے موقع پر حسب ضرورت نئی فوج بھرتی کر کے پہنچ جاتے تھے اور جنگ کے ختم ہونے پر خدا کی پناہ مانگتے ہوئے اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کا خزانہ، روپیہ پیسہ بہرحال محفوظ ہی رہتا تھا اور ساری خاک بے چارے سپاہیوں کے سر پر پڑتی تھی کہ انھیں دوبارہ کمر باندھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ان امیروں کے پاس پیشہ ور لوگ جولاہے، دھنیے، بڑھئی، بقال، ہندو اور مسلمان گھوڑا اور ساز کرائے پر لے کر او پٹی بنے داغ کے لیے پہنچ جاتے تھے اور ملازمت حاصل کر کے ان میں سے کوئی، احدی، کوئی "داخلی" بن جاتا تھا۔ خدمت ملنے کے چند دن بعد ہی ان کے پاس نہ وہ گھوڑا نظر آتا تھا اور نہ سامان سپاہ گیری، مہم آن پڑی تو انھیں پیادہ ہی گھسیٹنا پڑتا تھا۔

معائنہ کے وقت اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ نے سپاہیوں کو دیوان خانہ میں بلا کر اسی طرح وردیوں اور ہتھیاروں سے لیس ہاتھ پاؤں بندھوا کر ترازو میں تلوایا تو ان کا وزن کم و بیش ڈھائی من اور تین من تک نکلا۔ جب پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ سارا ساز و سامان اور ہتھیار عاریتاً لیے ہوتے تھے۔

بادشاہ اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو دیدہ و دانستہ یہ رعایتیں دیتے ہیں تا کہ وہ اپنی گزر بسر کرتے رہیں۔

کچھ عرصہ بعد دو اسپہ، یک اسپہ، نیم احدیوں کا تقرر کیا گیا۔ نیم اسپہ کا مطلب یہ تھا کہ دو سوار مل کر ایک گھوڑے کی پرورش کریں اور فی گھوڑا جو چھ روپیہ ماہوار ملتا تھا اس میں دونوں تین تین روپے لے لیں:

ایک در روزگار من بین و مپرس

یہ رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں تھے۔ باوجود اس بد انتظامی کے یہ اکبر کی اقبال مندی ہی تھی

کہ اس کے تمام دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ بعد میں اتنے سپاہیوں کی بھی ضرورت نہ رہی اور امیروں کو بھی شاہی کارندوں کی ناز برداریوں سے چھٹکارا مل گیا۔

داؤد کا تعاقب

اسی سال بادشاہ سلامت نے داؤد کے تعاقب کے لیے منعم خان خانخاناں اور راجہ ٹوڈرمل کو اڑیسہ کی طرف روانہ کیا اور مجنون خاں قاقشال کا وہاں کے جاگیردار سلیمان منگلی سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان کے پاس بڑا لاؤ لشکر جمع تھا اور وہ شان و شوکت اور بہادری میں بھی کافی مشہور تھا۔ اس مقابلہ میں سلیمان منگلی ہلاک ہو گیا اور قاقشال کی فوج کے ہاتھ اتنا مال غنیمت آیا کہ وہ اسے اٹھانے سے عاجز تھی۔ اس حملہ میں بہت سے پٹھان قیدی بن کر آئے۔ مجنون خان نے سلیمان کی لڑکی کا نکاح اپنے لڑکے جباری سے کر دیا۔ جباری ان دنوں بادشاہی امیروں میں شامل ہے! سلیمان کی شکست کے بعد مجنون خاں قاقشال کی لڑائی جلال الدین سور کے لڑکے سے ہوئی۔ جلال الدین کسی زمانہ میں اس علاقہ کا خود مختار حکمران تھا۔ یہ لڑائی گھوڑا گھاٹ کی حدود میں ہوئی۔ قاقشال نے اس علاقہ کے زمینداروں کی مدد سے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور ٹانڈہ تک اس کا تعاقب کیا، اسی حملہ میں اس نے گوڑ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مجنون خان اور معین الدین فرنخودی نے ٹانڈہ کی ناکے بندی کر دی اور خان خاناں کی کامیابی کی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

جب داؤد کو شکست ہوئی اور خان خاناں کی واپسی کی خبر اڑی تو سارے پٹھان جو جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے اکٹھا ہو کر موقع کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ ٹوڈرمل، داؤد کے تعاقب پر لگا ہوا تھا وہ محمد قلی خاں برلاس، محمد قلی خان توقبائی اور مظفر مغل کو ساتھ لے کر متواتر کوچ کرتے ہوئے بنگال کے علاقہ کوالیاڑ تک پہنچ گیا۔ داؤد خاں وہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر رین کساری نامی مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ایک بھاری فوج جمع کر کے وہ ہرپور میں قلعہ کے اندر چھپ گیا۔ داؤد کا ایک چچیرا بھائی جنید بہادری اور دلیری میں مشہور تھا، وہ پہلے شہنشاہ کی ملازمت میں تھا، ملازمت چھوڑ کر وہ آگرہ سے گجرات پھر وہاں سے

بنگالہ چلا گیا، اسی دوران وہ داؤد سے ملنے کے لیے رین کساری کے علاقے میں پہنچا۔ راجہ ٹوڈرمل نے میرزا ابو القاسم کو سالہ کو جس کا لقب نمکین ہے، نظر بہادر کیساتھ اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ یہ دونوں جنید سے شکست کھا کر راجہ کے پاس لوٹ آئے۔ اب راجہ خود اس کے مقابلہ پر گیا۔ جنید مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور جنگل میں جا کر پناہ لے لی۔ یہاں سے راجہ کی فوج مدن پور جا کر کچھ وقت کے لیے ٹھہر گئی اسی جگہ محمد قلی خان برلاس بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔

بادشاہی فوج میں اس کی وفات سے بڑا انتشار پھیل گیا اس لیے لشکر میدنی پور سے پیچھے ہٹ کر مدارن میں آگیا۔ اس جگہ قیا خان گنگ امرائے لشکر سے ناراض ہو کر کسی جنگل میں چلا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ ساری صورت حال خانخاناں کو لکھ بھیجی۔ خان خاناں نے راجہ کی مدد کے لیے شاہم خاں جلائر اور لشکر خاں بخشی کو جسے عسکر خان اور استر خان بھی کہا جاتا تھا کچھ دوسرے افسروں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ بردوان میں راجہ سے جا کر ملے۔ راجہ نے اس جگہ تمام امرا کو چھوڑا اور خود قیا خاں کے پاس تنہا جا کر اسے منا کر واپس لے آیا، پھر وہاں سے کوچ کر کے مدارن کے راستہ سے جھورہ پہنچا۔ جب لشکر برچین میں پہنچا تو خبر آئی کہ داؤد نے اپنے اہل و عیال کو تو گنگ بنارس میں چھوڑ دیا ہے اور لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی ہیں۔ جب خانخاناں کو یہ خبر ملی تو اس نے تیز رفتاری سے کوچ کیا اور راجہ سے جا کر مل گیا۔

پٹھانوں سے خونریز لڑائی

پٹھانوں نے اپنی لشکرگاہ کے اطراف خندق کھود کر اچھی خاصی قلعہ بندی کر لی تھی۔ 20 ذی قعدہ 982ھ/1574ء کو کھتورہ کے علاقے میں دونوں فوجوں کے درمیان بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف منگلوی ہاتھی پر باندھے کھڑے تھے۔ داؤد کے ہاتھی چارہ گھاس کھا کر تر و تازہ اور مست تھے۔ اس نے ہاتھیوں کو بادشاہی لشکر پر دوڑا دیا۔ خان خاناں نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ بندوقیں اور توپیں جو گاڑیوں پر رکھی ہوئی تھیں وہ ہاتھیوں کی صف پر چھوڑی

جائیں۔ توپوں کے چلتے ہی ہاتھی گھبراہٹ کے مارے پلٹ پڑے۔ اس موقع پر بندوقوں کی ضرب سے بہت سے پٹھان ہلاک ہوئے۔ داؤد کے مقدمۃ الجیش پر گوجر خان کماں دار تھا۔ اس نے بادشاہی ہراول پر حملہ کر دیا۔ ہراول کی کمان خان عالم، خواجہ عبداللہ، کجک خواجہ، سید عبداللہ چوگان بیگی اور میرزا علی عالم شاہی کر رہے تھے۔ گوجر خان کا یہ حملہ اس غضب کا تھا کہ ان امیروں کے قدم اکھڑ گئے اور دشمن نے انھیں دھکیل کر التمش کی فوج تک جس کی سرداری قیاخان کنک کر رہا تھا، پہنچا دیا۔ ہراول کے کمان دار خان عالم نے جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ التمش کی فوج منتشر ہوگئی اور اس نے خان خاناں کی جمعیت میں آ کر پناہ لی۔ اسی بھگدڑ کی وجہ سے خانخاناں کی جمعیت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ خان خاناں نے نظم قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ایک مرتبہ منتشر ہونے کے بعد اس کی فوج جم نہ سکی۔ عین اسی حالت میں گوجر خان سر پر آ پہنچا۔ خان خاناں کے مقابل آکر اس نے پے در پے تلوار کے کئی وار کیے۔ خان خاناں نے بڑے حوصلے سے کام لیا اور گوجر خان کے ہر حملہ کو اس نے اپنے تازیانہ پر روک لیا۔ اس نازک موقع پر ہاتھیوں سے گھبرا کر خانخاناں کا گھوڑا بھڑک گیا اور سنبھالے نہ سنبھلا۔ مجبور ہوکر خان خاناں نے حملہ سے باگ پھیر لی اور بھاگی ہوئی فوج کو جمع کرنے کے بہانے سے تین چار کوس تک پیچھے ہوتا چلا گیا۔ پٹھانوں نے کافی دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اس موقع پر قیاخاں کنک اور دوسرے چند سرداروں نے پٹھانوں کے لشکر پر دونوں جانب سے تیر چلانے شروع کیے اور تیر بازی سے اس کے لشکر کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ یہ مقابلہ اتنا سخت اور بھاری تھا کہ دونوں فریق لڑتے ہوئے تھک گئے۔ دونوں میں مزید نقل و حرکت کی طاقت نہ رہی۔ حسن اتفاق سے اسی وقت ایک تیر گوجر خاں کو ایسا لگا کہ وہ اسی وقت گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے گرتے ہی پٹھان میدان چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ بھاگ نکلے جن میں بہت سے مارے گئے۔ اسی وقت خان اعظم کا علم دار اس کا جھنڈا لے کر جیسے ہی خان خاناں کے پاس پہنچا اسے گوجر خان کے قتل کی خبر بھی مل گئی۔ اس اطلاع پر خان خاناں نے اپنی باگیں پھیر لیں اور چند ساتھیوں کے ساتھ خیمہ میں لوٹ کر آ گیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی پٹھانوں پر تیر

چلانے شروع کر دیے۔

راجہ ٹوڈرمل اور لشکر خاں شاہی میمنہ پر متعین تھے۔ انھوں نے بھی پیش قدمی سے دشمن کے منتشرہ پر جس کا سردار اسماعیل خاں آبدار تھا اور اسے داؤد نے خان خاناں کا خطاب دے رکھا تھا، حملہ کر دیا۔ اسی طرح شاہم خاں جلائر اور پائندہ محمد خان مغل اور دوسرے سرداروں نے جو شاہی میسرہ پر تھے پٹھانوں کے میمنہ پر جس کا سردار حاکم اڑیسہ خان جہاں تھا، حملہ کر دیا۔ دونوں پہلوؤں سے غنیم کی فوج کو دباتے ہوئے یہ لوگ داؤد کی خاص جمعیت تک جا پہنچے اور اس کے نامی گرامی ہاتھیوں پر تیروں کی بوچھار کر کے انھیں منتشر کر دیا۔ اس حملہ سے داؤد کی جمعیت میں افراتفری مچ گئی۔ اس وقت خان خاناں فتح کے پھریرے لہراتا ہوا دور سے نمودار ہوا۔ گوجر خان کے مارے جانے کی خبر داؤد کو ملی۔ اس غیر متوقع صورت حال سے داؤد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس کے وہ سارے ہاتھی برباد ہو گئے۔

صلح کی بات چیت

فتح کے بعد خانخاناں نے اسی جگہ پر زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کے لیے کچھ دن تک قیام کیا۔ اسے بھی کافی زخم آئے تھے، جن کا علاج کیا گیا۔ لشکر خان بری طرح زخمی ہو چکا تھا اس لیے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس اثنا میں داؤد بھاگ کر کٹک بنارس جا پہنچا تھا۔ خانخاناں نے اسی منزل سے راجہ کو شاہم خان جلائر، قیاخاں، سید عبد اللہ، محمد قلی خان توقبائی اور سعید خان بدخشی کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود بھی زخموں کے ٹھیک ہو جانے کے بعد ان کے ساتھ آ کر شامل ہو جائے گا۔ یہ فوج وہاں سے رخصت ہو کر کل قل گھاٹی پہنچ گئی اور ادھر داؤد اور تمام پٹھانوں نے کٹک بنارس کے قلعہ کو مقابلہ کے لیے مستحکم کر لیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ غنیم کی تیاریوں کا حال سن کر خان خاناں بھی کٹک بنارس آ پہنچا اور دریائے مہندری کے کنارے کیمپ لگا دیا۔ خان خاناں کے پہنچنے کے بعد صلح کی کہا سنی شروع ہوئی اور بڑی رد و کد کے بعد امرا کے مشورے سے طے پایا کہ

داؤد خانخاناں سے آ کر ملے اور حلف اٹھا کر مصالحت کا عہد کرے۔ بنگال کا ایک وسیع علاقہ اسے عطا کر دیا جائے گا۔

داؤد اور خان خانان کی ملاقات

مقررہ دن شاہانہ انداز میں مجلس کو سجایا گیا۔ تمام امرا بہ لحاظ مراتب اپنے اپنے مقام پر بیٹھے۔ سراپردہ اور بارگاہ کے سامنے فوج کے دستے داؤد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے، بنگال کا حکمران نہایت شان وشوکت کے ساتھ افغان سرداروں کے ساتھ بنارس کے قلعہ سے باہر نکلا اور خان خاناں انتہائی تواضع کے ساتھ اس کی تعظیم بجالایا اور ادب کے ساتھ پیشوائی کرتے ہوئے اسے سراپردہ میں لے کر آیا۔ ملاقات کے وقت داؤد نے اپنی تلوار میان سے باہر نکال کر خان : ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "جب سے تم جیسا عزیز دوست زخمی ہوا ہے میں ایسی سپاہ گری سے ہی بیزار ہو گیا ہوں"۔ خان خانان نے وہ تلوار لے کر ایک محافظ کے سپرد کر دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب مسند پر بٹھالیا۔ باپ کی طرح مشفقانہ انداز میں مزاج پرسی کی۔ اس موقع پر طرح طرح کے کھانے، حلوے اور شربت تیار کیے گئے تھے۔ خان خانان نے اپنے معزز مہمان کو نہایت اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اہم امور پر گفتگو شروع ہوئی اور عہد نامہ کی تکمیل کی گئی۔ اس سے فارغ ہونے پر خان خانان نے ایک تلوار اپنے خاص اسلحہ خانہ سے منگائی۔ اس تلوار کا دستہ اور بندھن قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ یہ تلوار اس نے داؤد کی کمر سے باندھتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ آپ بادشاہ کے دولت خواہ بن چکے ہیں، یہ تلوار شہنشاہ کی طرف سے باندھ لیجیے، بنگال کے علاقہ کے متعلق میں بادشاہ سے درخواست کرونگا، حسب منشاء اس سلسلہ میں فرمان پہنچ جائے گا۔ غرض طرح طرح کے تکلفات کے بعد قیمتی تحائف دے کر خان خانان نے داؤد کو رخصت کیا اور یہ شگفتہ اور بارونق محفل برخاست ہوگئی۔ خان خاناں اس مہم سے 10 صفر 983ھ/1575ء کو ٹانڈہ کے صدر مقام پر لوٹ آیا اور وہاں سے اس نے سارے حالات کے متعلق عریضہ لکھ کر

بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق فرمان، بھاری خلعتیں، جڑاؤ تلوار اور مع ساز و سامان اور ایک عربی گھوڑا روانہ کر دیا۔ بنگالہ کے معاملات خان خانان کو عطا کر کے اسے وہاں کا مطلق العنان حاکم بنا دیا۔ 982ھ/1574ء میں بتاریخ 6 جمادی الثانی میاں شیخ داؤد جھنی وال نے وصال فرمایا۔ ان کی تاریخ وفات "یا شیخ داؤد ولی" ہے۔

جب بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر آئے تو ماہ ذی قعدہ 982ھ/1574ء میں فتح پور کے پاس ایک عبادت خانہ کی بنیاد رکھی جو چار ایوانوں پر مشتمل تھا۔

شیخ ابوالفضل کا دربار میں داخل ہونا

انہی دنوں شیخ ابوالفضل ولد شیخ مبارک ناگوری جسے علامی بھی لکھا جاتا ہے اور اسی نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے "آیۃ الکرسی" کی تفسیر پیش کی، جس میں بہت سے قرآنی رموز و نکات درج تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر دراصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسند فرمایا، اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" نکالی گئی۔ بادشاہ نے مغرور اور متکبر ملاؤں کے خاتمہ کی توقع مجھ[44] سے لگا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے اب انہیں موزوں آدمی مل گیا۔ ابوالفضل کو پہلے ہی سے علما کے ساتھ بڑی نا اتفاقی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں اہل بدعت کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور میر حبش جیسے لوگ قتل کیے گئے تھے۔ شیخ عبدالنبی مخدوم الملک اور دوسرے تمام علماء نے متفقہ طور پر عرض کیا تھا کہ شیخ مبارک مہدی بھی بدعتی اور سخت گمراہ ہے۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اجازت لے کر شیخ کو حاضر کرنے کے لیے حاکم کو روانہ کر دیا تھا۔ شیخ مبارک اپنے بیٹوں کو لے کر کہیں چھپ گیا اور لوگوں نے اس کی مسجد کے منبر کو توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اسی لیے شیخ مبارک نے ان کے ذریعہ سفارش کرانی چاہی۔ شیخ سلیم نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ کچھ رقم سفر کے خرچ کے لیے اس کے پاس بھیج دی اور کہلوایا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے

بھاگ کر گجرات چلے جاؤ۔ جب شیخ مبارک کو ان کی طرف سے نا امیدی ہوئی تو انھوں نے میرزا عزیز کوکہ کو وسیلہ بنایا۔ اس نے بادشاہ سے شیخ مبارک کی علمیت اور درویشی کی بڑی تعریف کی اور اس کے لڑکوں کے علم و فضیلت کو بھی سراہا اور کہا کہ اس کے پاس سرکاری انعام کی زمین نہیں ہے اور وہ ایک بھروسہ کرنے والا شخص ہے۔ ایسے درویش صفت آدمی کو آزار پہنچانا کچھ مناسب نہیں۔ کوکہ کی سفارش پر بادشاہ نے ان باپ بیٹوں کو سزا دینے کا خیال ترک کر دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کے دن ایسے پھرے کہ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمات زمانہ سازی، بدذاتی، مزاج شناسی اور خوشامد کے ذریعہ بادشاہ کا بہت زیادہ تقرب حاصل کر لیا اور جیسے ہی موقع ملا اس نے بادشاہ کی پشت پناہی سے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے اس کے خاندان کے خلاف چغلیاں کھائی تھیں اور ایذا رسانی کی ناکام کوشش کی تھی طرح طرح سے رسوا کیا اور مدتوں پہلے گزری ہوئی باتوں کا ایک ایک کر کے انتقام لیا۔ اس کے انتقام کی لپیٹ میں صرف ان کے مخالف ہی نہ آئے بلکہ وہ عام و خاص ہر ایک کی ایذا رسانی پر اتر آیا، چنانچہ اس کی وجہ سے کتنے ہی مشائخین، صالحین اور صاحب احتیاج اشخاص کی معاش اور وظیفے بند ہو گئے ان لوگوں کو وہ طرح طرح سے ایذائیں دیتا تھا اور زبان حال وقال سے مزے لے لے کر کہا کرتا تھا:

یا رب بہ جہانیان دلیلی بفرست   نمرودان راچو پشہ فیلی بفرست
فرعون و شان وست برادر دستند   موسیٰ و عصا و رود نیلی بفرست

ان کی ان کارگزاریوں سے جب لوگ ہائے ہائے کرنے لگے تو وہ ان پر طنز کرتے ہوئے اکثر یہ رباعی پڑھا کرتا تھا:

آتش بدو دست خویش درخرمن خویش

چون خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش

ای وائی من ودست من و دامن خویش

بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا

تھا فلاں حلوائی، فلاں موچی اور فلاں حجام قریش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علماء کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

بادشاہی عبادت خانہ

983ھ/1575ء میں تین عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ان کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ جب گزشتہ چند سالوں میں اکبر کو بڑی بڑی فتوحات نصیب ہوئیں اور روز بہ روز مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملک کا سارا نظم ونسق حسب منشا قائم ہوگیا اور ملک میں کوئی مخالف اور دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان زیادہ تر عبادت اور ریاضت کی طرف مائل ہوا، چنانچہ اجمیر کی درگاہ معینیہ کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ صحبتیں رہنے لگیں اور اس کے زیادہ تر اوقات اللہ و رسولؐ کے تذکرے میں گزرنے لگے۔ ان محفلوں میں وہ اکثر تصوف کی باتوں، فقہی مسئلوں اور علمی مباحثوں میں مصروف نظر آنے لگا۔ راتیں بھی اللہ کی عبادت میں گزرنے لگیں۔ کسی نے ''یاہو'' اور ''یا ہادی'' کا وظیفہ بتا دیا تھا۔ وہ عموماً راتوں میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بڑا اثر تھا چنانچہ ان نعمتوں کے شکرانے میں جو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا کی تھیں تقریباً ہر روز ایک پرانے حجرہ میں جو آبادی سے دور شاہی محلات کے قریب واقع تھا، پتھر کے فرش پر مراقبہ میں بیٹھا رہتا تھا۔ حاکم بنگالہ سلیمان کرانی کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پچھلی رات کو اٹھ کر 150 مشائخین اور علماء کے ساتھ تہجد کی نماز با جماعت ادا کرتا تھا اور فجر کی نماز تک ان عالموں کی مجلس میں تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا تھا، فجر پڑھنے کے بعد ملکی معاملات، فوج اور لشکر کے حساب کتاب میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا، اکبر نے بھی اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ ان دنوں مرزا سلیمان کے آنے کی بھی خبر تھی۔ مرزا سلیمان صوفی منش، صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا، لوگ اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت کیا کرتے تھے، لہٰذا اکبر نے کچھ تو شوق عبادت میں اور کچھ آنے والے اس معزز مہمان کی خاطر شیخ عبداللہ نیازی کے حجرہ پر ایک بڑی

عبادت گاہ تعمیر کرائی۔ عبد اللہ نیازی کے حالات ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ پہلے شیخ الاسلام چشتی کے مرید تھے بعد میں مہدوی سلسلہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس عبادت گاہ کے چاروں طرف ایک وسیع ایوان اور انوپ تلاؤ نامی حوض تیار کرایا گیا اور اس حجرہ کو "عبادت خانہ" نام دیا گیا جو بعد میں "عبادت خانہ" ہو گیا۔ ملا شیری نے اسی کے بارے میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر ہے:

درین ایام دیدم جمع با سوال قارونی
عبادت ہای فرعونی عمارت ہای شدادی

عبادت خانہ کی محفلیں

اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانہ میں آکر مجلس منعقد کرتا تھا اس محفل میں نامی گرامی علماء، مشائخین اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسرے کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔

اسی محفل میں ایک دن جلال خان قورچی نے جو میرا محسن اور کرم فرما تھا، اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث سے ملنے آگرہ گیا تھا۔ ان کا مفلسی کے مارے ایسا برا حال ہے کہ ایک دن انھوں نے چند سیر چنے منگائے جس میں سے کچھ تو خود کھائے کچھ مجھے دے دیے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں کے لیے بھیج دیا۔ یہ سن کر اکبر بہت متاثر ہوا اور شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ سے بلوا کر اسی عبادت خانہ میں ان کے قیام کا انتظام کرا دیا۔

مذکورہ عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو بھی محفل منعقد ہوتی تھی جس میں سادات، مشائخ، علماء اور امراء بھی حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے۔ اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا کہ امرا تو مشرقی جانب بیٹھیں،

سادات مغربی جانب، علما کی نشست جنوبی حصے میں اور مشائخین شمال میں بیٹھا کریں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جاکر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس موقع پر طرح طرح کی خوشبوؤں سے پوری مجلس مہک اٹھتی تھی اور بادشاہ مستحق لوگوں کی جو مقربان دربار کے وسیلہ سے وہاں پہنچ جاتے تھے، حسب مدارج مالی امداد بھی کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خان گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری نفیس اور قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علماء میں تقسیم کیا۔ مجھے[145] بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک "انوار المشکوۃ" تھی، جس میں "مشکوۃ الانوار" کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا جو کتابیں بچ گئیں وہ امراء کو دوسرے تحفوں اور اشیاء کے عوض عطا کیں۔ مال غنیمت کو اکبر "ارباس" یعنی زوال دشمن کہا کرتا تھا۔

ایک رات اسی محفل میں علما کی مجلس میں بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا اور وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور وغل سے بادشاہ نے برہم ہوکر مجھ[146] سے کہا "اس کے بعد جو شخص بھی نا شائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا، میں اس کو مجلس سے اٹھا دونگا"۔ میں نے اس وقت چپکے سے آصف خاں کو کہا" اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھوانا پڑے گا"۔ اکبر نے مجھے یہ کہتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے پوچھا کیا کہہ رہے ہو؟ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ دھرا دیا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری

اس محفل میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کے لیے اکثر بلایا جاتا تھا۔ اس بزرگ عالم کو شیخ ابوالفضل جو اب ایک نئے دین کا مجتہد بنا بیٹھا ہے اور اس جیسے دوسرے نئے نئے باریافتہ لوگ بحث ومباحثہ میں الجھا کر کھلونا بنالیتے اور اس کی ہر بات کو غلط ملط کر دیا کرتے تھے۔ ان مباحثوں کے دوران اکبر کا اشارہ پاکر بعض مصاحب اور امیر بھی الٹی سیدھی فرضی باتیں بنا بنا کر اس پر فقرے کستے تھے اس کا

بڑھاپا ان سب کے ہاتھوں میں اچھا خاصہ کھیل بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ اسی شام کی محفل میں خان جہاں نے کہا مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں، بلکہ ایک طرح سے گناہ ہے۔ جب لوگوں نے وجہ دریافت کی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو گجرات اور عراق کا ہے جو قزلباشوں کی لوٹ مار کی زد میں ہے اور اگر سمندر کے راستہ جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہداری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے ان کے پروانہ راہداری پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویر چھپی رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے، اس لیے یہ دونوں حج کے راستے بند ہو گئے ہیں۔

اس کے متعلق خان زمان نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ بہانہ کرتا ہے کہ ہر سال کے اختتام پر سارا مال متاع اپنی بیوی کے نام کر دیتا ہے اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام پر واپس لے لیتا ہے۔ غرض خان زمان نے مخدوم الملک کی کنجوی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیاداری کے بہت سے قصے سنائے اور اس نے علما و مشائخین، خاص طور سے پنجاب کے مستحق لوگوں پر جو زیادتیاں کی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے بتائیں۔ بس پھر کیا تھا بہت سے لوگوں کی زبانیں کھل گئیں اور لوگ اس کی اہانت اور مذمت کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر قصے سنانے لگے آخر میں یہ طے پایا کہ اسے حج کے لیے زبردستی مکہ معظمہ روانہ کر دیا جائے۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ ”تم پر حج فرض ہے تو اس نے جواب دیا نہیں“۔

شیخ عبدالنبی

ان دنوں مخدوم الملک کا ستارہ زوال میں آ چکا تھا اور دربار میں شیخ عبدالنبی کا سورج چمکنے لگا تھا۔ چنانچہ بادشاہ تعظیم و احترام کی وجہ سے کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے خود ان کے گھر پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو اکبر نے اُن کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعظیم کے لیے انہی کے حجرہ میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ عموماً مولانا عبدالرحمٰن جامی کی ”چہل حدیث“ کا درس دیا کرتے تھے۔

شیخ عبدالنبی کو محدثی، حافظی اور امامی کا بڑا دعویٰ تھا، لیکن علمیت کا یہ حال تھا کہ ''الحزم سوء ظن'' کی حدیث جب بھی سناتا تو ہمیشہ ''الحزم'' کو ''الخرم'' ح کے بجائے ''خ'' اور ''ز'' کے بجائے ''ر'' پڑھا کرتا تھا۔ مدتوں تک اس کو اپنی اس غلطی کا احساس نہ ہوا۔ جس وقت بادشاہ اس سے برداشتہ خاطر ہوگئے تھے اور ملاؤں کا گروہ دربار سے نکل گیا تھا، مرزا عزیز کوکہ نے بادشاہ کو بتایا تھا کہ علم حدیث میں اس کی یہ قابلیت ہے جس پر وہ ناز کیا کرتا ہے، آپ نے اس کو سر چڑھا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا مزاج عرش پر جا پہنچا۔

شیخ عبدالنبی کا غرور وتکبر

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ جب تک کہ ممالک محروسہ کے تمام ائمہ اپنے وظائف اوقات اور معاش کے فرامین پر صدر (شیخ عبدالنبی) کی مہر نہ لگوائیں'' کروڑی ان کی رقمیں اجرا نہ کریں''۔ اس فرمان کی وجہ سے ہندوستان کے مشرقی کنارے سے لے کر بھکر تک کے اہل غرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی سفارش کسی امیر اور مقرب نے کردی تو اس کا کام حسب منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کا وسیلہ نہیں ملا وہ بیچارے سید عبدالرسول اور شیخ کے دوسرے کارندوں کے پاس دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ شیخ کے فراشوں، دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھاری بھاری رشوتیں دے کر ان غریبوں نے اپنا کام بنایا اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ بہت سے بدنصیب اس ہجوم میں گرمی کی تاب نہ لا کر وہیں جاں بحق ہوگئے۔ اس کی بادشاہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اس صدر عالی قدر کی تعظیم کے متعلق کچھ سوچ نہیں سکتا تھا، اس لیے بادشاہ نے اس کے منہ پر کوئی بات نہ کی۔

جس وقت وہ اپنی مسند جاہ وجلال پر نشین ہوتا تھا اور عالی مرتبہ امیر اہل علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کے پاس جاتے تھے تو اس کے تیور بس دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ تعظیم وتکریم کا کیا سوال وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے پر اتر آتا تھا اور جب بیچارا بڑی عاجزی اور خوشامد کرتا تو ان عالموں کے لیے جو ہدایہ اور دوسری فقہی

کتابیں پڑھا سکتے تھے سو بیگھے کے لگ بھگ کی آراضی منظور کر کے باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض تھے قلمزد کر دیتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ غیر مسلمان کو اچھی اچھی زمینیں خود عطا کر دیتا تھا۔ اس طرح اسکے ہاتھوں علم کی بھی اور عالموں کی بھی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اپنے اجلاس پر دو پہر کے بعد جب وہ نہایت غرور و تکبر سے کرسی پر بیٹھا ہوا وضو بنا رہا تھا تو اس کے استعمال کیے ہوئے پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گر رہے تھے اور اس کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی اہل علم اور فقراء کا کام نکالنے کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے اور خوشامد، چاپلوسی اور اس کی دلجوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھا رہے تھے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدر الصدور کا یہ اثر اور دبدبہ نہیں رہا جتنا کہ شیخ عبدالنبی کو حاصل ہو گیا تھا:

روستائی اگر شود قاضی　　حکمہای کند کہ بلخندش

منصب امامت پر تقرر

انہی دنوں بادشاہ نے مجھے (46) امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا بیستی عہدہ کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ کرالو۔ اسی زمانہ میں شیخ ابو الفضل بھی دربار میں نیا نیا پہنچا تھا اور جیسا کے شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ "ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں" میرا اور ابوالفضل کا معاملہ یکساں ہی تھا، لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی جب بادشاہ نے بیستی کے عہدہ کے لیے گھوڑے داغ کرانے کے متعلق فرمایا تو اس نے فوراً ہی داغ اور محلّہ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کرلی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے ملازمت کی اس پیشکش کو قبول نہ کیا، اس وقت مجھے مزاحیہ شعر یاد آ گیا تھا جو کسی سید نے اپنے بارے میں کہا تھا:

مرا داخلی سازی و تستی
مینماد مادر بایں نیستی

میں بس اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مدد معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی آراضی وغیرہ عنایت فرمادیں تو ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمات میں مصروف رہوں گا کیونکہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہوسکتی:

جاہ دنیا مطلب دولت فانی بگذار
جاہ دین بس بود و دولت اسلام ترا

لیکن میری بدنصیبی دیکھو، مجھے وہ بھی میسر نہ ہوا، آخر ماہ شوال 983ھ/ 1575ء میں میں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا اور مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بیگھہ آراضی عطا فرمائی جو اس زمانہ میں بیس گھوڑوں کے مقررہ رتبے کے لیے کافی ہوجاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مدد معاش کے ضمن میں رکھا گیا تھا میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر آراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہوگا، لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی بادشاہ نے صرف یہ فرمایا، لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمہیں دیا جاتا رہے گا اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا ہم نے تمہارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔ جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وقت تک اس وعدے کو 22 سال ہو چکے ہیں بجز ایک دوبار کے پورا نہیں کیا گیا۔ وہ وعدہ تو بس ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض خواہ مخواہ ان بیہودہ بندشوں اور لاحاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات ملے:

یا وفا یا خبر وصال تو یا مرگ رقیب
بازی چرخ ازین یک دو سہ کاری بکند

بہرحال جس طرح گزری اور گزر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہئے:

بہ ہمہ حال شکر باید کرد
کہ مبادا ازین بتر گردد

جن فضول مشغلوں میں یہ عمر گئی ان کے حسب حال فضولیؔ بغدادی کا یہ قطعہ ہے جو اس نے حیرتیؔ سمرقندی پر شاہ طہماسپ کے التفات وتوجہ کے بارے میں کہا تھا:

من زخاک عرب و حیرتیؔ از ملک عجم   ہر دو گشتیم باظہار سخن کام طلب
یافتیم از دو کرم پیشہ مراد دل خویش   اوز شاہ عجم و من نظر از شاہ عرب

شادی کا مسئلہ

اس زمانہ میں اکبر نے علما سے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ کتنی آزاد عورتوں کا نکاح میں رکھنا درست ہے۔ علماء نے کہا چار سے زائد آزاد عورتوں کو بہ یک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔ اکبر نے کہا "ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟" اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا" ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے" علما نے کہا "ہاں ایک مجتہد ابن لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے تو آیت پاک۔ "**فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و ربع**" کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں ان پر عمل درست نہیں ہوگا بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے بھی دریافت کرایا، اس نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا ظاہر کرنا مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا"۔ عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے کہا "اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منافقت برتی کہ اس وقت تو کچھ کہا تھا اور اب وہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل کھٹک گیا۔

بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علماء نے بڑے ردّ و بدل اور اختلافی روایتوں کو جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دے دیا کہ ''متعہ'' کے طریقے پر جتنی عورتیں چاہیں نکاح میں رکھنا حلال ہے۔ یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، حالانکہ اہل سنت کا یہ رویہ نہیں ہے۔ غرض اس معاملہ میں بڑی بحثیں اٹھیں، ان کا خلاصہ ''نجات الرشید'' میں بیان کیا گیا ہے۔ نقیب خان نے امام مالک کی ''موطا'' دکھائی کہ اس میں تو ایک حدیث سے صراحتاً متعہ کی ممانعت نکلتی ہے۔

ایک رات ''انوپ تلاؤ'' کے حجرہ میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت شیخ ابوالفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کر کے دی تھیں بیان کیا۔ بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا، تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا'' ان تمام مختلف روایتوں اور طرح طرح کے مسلکوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے۔ متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک باتفاق مباح ہے اور امام شافعی اور امام اعظمؒ کے نزدیک حرام ہے اور جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی بلا اتفاق حلال ہو جاتا ہے۔ بس یہی ایک کاٹنے کی بات ہے، اس کے علاوہ قیل و قال اور جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں''۔ بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے اس وقت مجھ سے بحث کی۔ میں نے اس سے جواب دیا کہ ''جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے''۔ اپنے اس دعویٰ پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ کو اور دوسری مثالوں کو میں نے بطور دلیل پیش کیا، نیز میں نے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد پہنچے، تو انھوں نے شافعی مذہب کے طریقہ پر سورۂ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل پر علما نے بڑے طعنے دیے تھے لیکن دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز بلکہ مستحسن ہونے تک کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ کہیں تو قاضی یعقوب کو قائل ہونا پڑا اور اس نے عاجز ہو کر کہا'' میں کیا کہوں متعہ

کا مباح ہونا مبارک ہو"۔ بادشاہ نے فرمایا" اس مسئلہ میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں"۔ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے موافق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بوڑھے عالموں میں صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ تک کے لیے یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی، اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہوگیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے ان کی معاش روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر سارے ملک کا قاضی بنا دیا اور قاضی یعقوب کو گوڑ (بنگال) کی قضاوت پر بھیج دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آگئی۔

جزیہ اور اللہ اکبر

اسی سال شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک کو بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ پوری طرح تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ(47) لگائیں۔ اس سلسلہ میں سب جگہ فرامین بھی جاری کر دیے گئے لیکن جلد ہی یہ حکم اٹھا لیا گیا اسی زمانہ میں بادشاہ نے دریافت کیا کہ اگر ہم اپنے سکہ اور مہر میں "اللہ اکبر" درج کروائیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ اکثر نے تو جواب دیا کہ یہ بہت بہتر اور اچھا ہے لیکن حاجی ابراہیم نے مخالفت کی کہ اس سے تو کچھ اور باتوں کا احتمال ہوتا ہے اگر آیت ولذکر اللہ اکبر کو نقش کرا لیا جائے تو یہ احتمال رفع ہو جائے گا۔ اکبر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور کہا "یہ تو قطعی بات ہے کہ بندہ سے اس عاجزی کے باوجود خدائی کا دعویٰ سرزد نہیں ہو سکتا، ہمارا مقصد تو صرف لفظی مناسبت ہے اس بات کو دوسری طرف لے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟"

اسی سال بادشاہ نے مسئلہ متعہ کی تحقیق سے پہلے ہی سید محمد میر عدل کو جس کا بادشاہ بڑا لحاظ کیا کرتے تھے۔ بھکر کی طرف نامزد کر دیا تھا۔ ان کو شمشیر خاصہ، گھوڑا اور پوشاک عطا کی گئی۔ ان کا وہاں جانے کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد "میر عدلی" کے اہم

منصب پر ان جیسا کوئی نامور شخص نہیں ہو سکا۔ کہتے ہیں ایک دن حاجی ابراہیم سرہندی نے سرخ اور زعفرانی لباس کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا اور ایک حدیث بھی پیش کی۔ میر عدل مرحوم نے بھرے دربار میں اسے بدبخت اور ملعون کہا اور گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھا لیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

حکیم ابو الفتح گیلانی اور مُلّا محمد یزدی

اسی سال حکیم ابو الفتح گیلانی اور حکیم ہمایوں جس کا نام بدل کر پہلے ہمایوں قلی پھر حکیم ہمام رکھا گیا تھا اور نورالدین قراری، تینوں بھائی گیلان سے دربار میں حاضر ہوئے۔ بڑے بھائی نے آتے ہی ہاتھ پیر نکالے اور خوشامد اور جی حضوری کر کے وہ بادشاہ کے مزاج پر حاوی ہوگیا۔ دین و مذہب میں اختراعات کر کے بہت جلد اس نے بڑا تقرب حاصل کرلیا۔

کچھ عرصہ بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر ''یزیدی'' کہا جاتا تھا، ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا، چنانچہ وہ صحابہ پر تبرے کی طرح زبان دراز کرتا تھا اور بادشاہ سے مہمل اور جھوٹے قصے بیان کرتا رہتا تھا۔

پیر بہ حرام زادہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح تو اس یزیدی سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کر دیا اور وحی، نبوت، معجزہ، کرامت اور شریعت کے مطلق انکار پر لے آئے۔ میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا ان بدبختوں کا جو انجام ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔

بے دینی کے یہ سارے اسباب جب جمع ہوگئے تو اکبر نماز، روزہ اور دوسرے مسائل سے منحرف ہوگیا اور ان کا نام اس نے ''تقلیدیات'' رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں غیر معقول ہیں۔ پھر ''نقل'' کے بجائے ''عقل'' پر دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فرنگیوں(**) کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کرلیا:

ہر خیالی کہ عقل شان بندد
چرخ بر عقل اہل آن خندد

شیخ بدرالدین کی عظمت

اسی سال شیخ الاسلام چشتی کے صاحبزادہ شیخ بدرالدین نے جو صاحب سجادہ تھے، شاہی ملازمت سے توبہ کی اور اپنے باپ کی طرح گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور تلاوت و تلقین کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ ایک رات بادشاہ نے ان کو عبادت خانے میں بلایا وہ آئے تو پہلے کی طرح آداب بجا نہ لائے بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے نشست و برخاست کے انداز اور گفتگو سے ان کو بڑی اذیت پہنچائی۔ کچھ تو یہ قصہ اور کچھ اور اسباب ایسے ہوئے کہ وہ تین چار سال بعد ہی غیرت کے مارے بلا اطلاع اجمیر اور وہاں سے گجرات چلے گئے، پھر تنہا ایک کشتی میں بیٹھ کر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت اللہ میں وہ اکثر وصال روزہ رکھا کرتے تھے اور تپتی دھوپ میں ننگے پیر طواف کرتے رہتے تھے اسی حال میں وہ اپنے رب سے جا ملے:

کمال از کعبہ رفتی بر در یار
ہزاران آفرین مردانہ رفتی

چوتھے وید کا ترجمہ

اسی سال شیخ بھاون جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ "بید اتھربن" کا جو ہندوؤں کا چوتھا مشہور وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں، ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو پنڈت مقرر تھا وہ اس کی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا، اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے جب مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ

کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس کا ترجمہ نہ کر سکا۔ اس بید کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک کہ ایسی عبارت جس میں ''لام'' بہت آتے ہیں جیسے کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ" نہ پڑھی جائے کیوں کہ نجات نہیں ہوگی۔ ایک اور حکم ہے چند شرائط پر گائے کا گوشت کھانا مباح ہے، دوسرے یہ کہ میت کو دفن کیا جائے۔ جلایا نہ جائے۔ اسی بید کے احکام کو پیش کر کے شیخ بھاون نے ہندوستان کے اکثر برہمنوں کو بحث میں لاجواب کر دیا اور اسی کی وجہ سے اس نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

گلبدن بیگم کی حج پر روانگی

اسی سال ماہ شعبان میں بابر بادشاہ کی صاحبزادی گلبدن بیگم جو بادشاہ کی پھوپھی ہوتی ہیں، نورالدین محمد مرزا کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم کے ساتھ جو پہلے بیرم خان خانخاناں کے عقد میں تھیں، بعد بادشاہ کے نکاح میں آگئی تھیں، حج کے لیے روانہ ہوئیں انھیں ایک سال تک گجرات میں ٹھہرنا پڑا۔ پھر انھوں نے حجاز پہنچ کر چار حج کیے۔ واپسی کے وقت ان کا جہاز ٹوٹ گیا اس لیے عدن میں ایک سال تک قیام کرنا پڑا۔ یہ دونوں ہندوستان کو 990ھ/ 1582ء میں لوٹ کر آئیں۔ اس وقت سے پانچ چھ سال تک بادشاہ کا یہ معمول رہا کہ وہ دربار کے کسی امیر کو ''امیر الحاج'' بنا کر لوگوں کو حج پر جانے کی عام اجازت دیتے تھے اور حاجیوں کو سفر کے خرچ، نقد روپیہ اور بھاری تحائف دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ طریقہ برخواست کر دیا گیا۔

مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد

مرزا سلیمان بابر کے زمانہ سے بدخشان کا مستقل حاکم تھا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا، آخر میں جب اس کا مقابلہ پیر محمد خاں اوزبک اور اس کی بیوی ولی نعمت بیگم کی فوجوں سے ہوا تو اس کا لڑکا ابراہیم مرزا مارا گیا اور مرزا سلیمان

سخت مشکلات میں پھنس گیا۔ اسی اثنا میں ابراہیم مرزا کا لڑکا شاہرخ مرزا باغی بن بیٹھا اور اس نے سارے بدخشان پر قبضہ کرلیا۔ مرزا سلیمان کے لیے بدخشان میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر پہلے تو کابل میں مرزا محمد حکیم کے پاس مدد لینے آیا، لیکن جب دیکھا کہ مرزا حکیم مدد دینے پر راضی نہیں تو اس نے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ ایک رہنما فوج کردی جائے تاکہ وہ اسے نیلاب (اٹک) کے کنارے تک خطرناک مقامات سے بہ حفاظت پہنچادے۔ مرزا نے بڑے ناز نخروں کے بعد اس کے ساتھ ایسے آدمیوں کو کردیا جو پہلی ہی منزل پر اسے تنہا چھوڑ کر کابل کو بھاگ گئے۔

مرزا سلیمان تن تنہا بے سرو سامان اپنی ایک لڑکی کو لیے ہوئے ہندوستان کے راستہ پر سفر کرتا رہا۔ بعض مقامات پر پٹھانوں نے اس کا راستہ بھی روکا، مرزا سلیمان بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا ان سے بچ کر نکل آیا۔ اسی مقابلہ میں اسے ایک تیر کا زخم بھی لگا غرض وہ نہایت پریشانی کی حالت میں نیلاب (اٹک) کے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے دو تین ذاتی گھوڑے عرضی کے ساتھ اکبر کے دربار میں روانہ کیے۔ بادشاہ نے آغا خاں خزانچی کے ذریعہ پچاس ہزار روپیہ، قیمتی تحفے اور چند عراقی گھوڑے مرزا کے استقبال کے لیے روانہ فرمائے۔ اس سے پہلے ہی راجہ بھگوان داس حاکم لاہور حسب فرمان پیشوائی کے لیے پہنچ چکا تھا اور ہر روز شاہی مہمانوں کی ضیافت و خاطر داری کررہا تھا، راستہ میں بھی جتنے حکام اور امراء تھے وہ بھی مہمانداری کے فرائض انجام دیتے رہے تھے، غرض مرزا سلیمان کو پورے، اعزاز و احترام کے ساتھ دارالخلافہ لایا گیا۔

اسی دوران اکبر نے گجرات سے خان اعظم کو بھی بلالیا اس جشن میں شرکت کے لیے وہ نہایت تیزی سے حملہ کرتے ہوئے، 4 رجب 983ھ کو فتح سے باریاب ہوا۔ ایک دن خان اعظم نے موقع پاکر داغ کے قانون اور کروڑیوں کے مظالم، فوج کے مالی معاملات، رعایا کی عام بدحالی اور بادشاہ کی بدعتوں کے متعلق کھری کھری باتیں سنائیں اور ان امور کے متعلق بڑی جرات کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکبر کو اس کی باتیں بڑی تلخ معلوم ہوئیں اور وہ اس سے ناراض ہوگیا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اس حق بات کو

برداشت نہ کر سکا اور اسے حکما کورنش سے روک دیا اور اس پر بادشاہی محافظ بھی مقرر کر دیے نیز دوسرے امیر بھی اس سے ملنے نہ پائیں۔ چند دن بعد اکبر نے خان اعظم کو آگرہ بھیج دیا، وہاں اسے اس کے باغ میں نظر بند کر دیا گیا۔

مرزا سلیمان کا شاہانہ استقبال

مرزا سلیمان جب متواتر کوچ کرتے ہوئے لاہور سے متھرا پہنچا تو بڑے بڑے امراء اور قاضی نظام بدخشی جس کو مرزا سلیمان نے قاضی کا خطاب دیا تھا اور اکبر کے دربار سے اسے غازی کا خطاب عطا ہوا تھا، استقبال کے لیے لے گئے۔ مرزا سلیمان اسی سال 15 رجب کو فتح پور کے قریب پہنچا۔ اس کی پیشوائی کے لیے دربار کے مصاحبین اور معزز افراد بھیجے گئے پھر خود بادشاہ تمام امرا کے ساتھ پانچ کوس تک اس کو لانے کے لیے تشریف لے گئے۔

مرزا سلیمان کا استقبال بڑی دھوم دھام کے ساتھ کیا گیا چنانچہ اس دن راستے کے دونوں طرف پانچ ہزار ہاتھی کھڑے تھے جن میں سے بعض پر تو فرنگی مخمل کی اور بعض پر رومی زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ سونے اور چاندی کی زنجیروں سے آراستہ تھے۔ ان کے سروں پر اور ان کی گردنوں میں سیاہ اور سفید جھالریں لٹک رہی تھیں، ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ سنہری زین والے عربی گھوڑے بھی صف بستہ تھے۔ ان گاڑیوں کے جو بیل تھے ان میں سے ہر ایک کے سر پر زردوزی کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اس ساز و سامان کی سنہری رو پہلی جھلمل سے جنگل میں بس آگ لگ گئی اور دشت وکہسار لالہ زار بن گئے۔ جب مرزا سلیمان کی نظر دور سے بادشاہ کی سواری پر پڑی تو وہ بے تکلف ہو کر گھوڑے سے اتر کر دوڑنے لگا اور قریب پہنچ کر تسلیمات بجا لایا۔ شہنشاہ بھی ادبا گھوڑے سے اتر آئے اور اسے ان رسمی تکلفات کو ادا کرنے سے روک دیا، تپاک سے بغل گیر ہو گئے۔ ملاقات کے بعد دونوں سوار ہو کر باتیں کرتے ہوتے چلے۔ مرزا سلیمان کی مہمانی کا انتظام انوپ تلاؤ کے دولت کدہ میں کیا گیا تھا۔ اس وقت انوپ تلاؤ کے در و دیوار اور

صحن کو منقش اور زریں سائبانوں سے سجایا گیا تھا۔ زرکار فرش بچھا ہوا تھا اور ہر قسم کا شاہانہ ساز و سامان سلیقہ سے جمایا گیا تھا۔ تخت سلطنت پر اکبر نے مرزا سلیمان کو اپنے پاس بیٹھا لیا اور شاہزادہ کو بلا کر مرزا سے ملایا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے بدخشاں کی تسخیر کے لیے روپیہ اور فوج سے مدد دینے کا وعدہ کیا مرزا نے ٹھہرنے کے لیے ہتیاپول کے برج میں جہاں نقار خانہ تھا ایک مکان کا انتظام کرا دیا تھا۔

فاتحہ خوانی کی بحث

مرزا سلیمان کبھی کبھی راتوں میں عبادت خانہ میں آتا تھا اور علما و مشائخین کی محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس پر وجد و حال طاری رہتا تھا اور بڑی اونچی اونچی باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی اس کی نماز باجماعت فوت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، میرزا نے اعتراض کیا کہ تم نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی؟ میں نے کہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے بعد فاتحہ پڑھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نے کہا: ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے علماء نہیں ہیں، وہاں تو فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ میں نے کہا، ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے ہم کو کیا سروکار، بادشاہ نے فرمایا ”بحث چھوڑو آئندہ پڑھ لیا کرو“۔ میں نے بادشاہ کے ارشاد کو قبول کر لیا، لیکن میں نے فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کے بارے میں جو روایت تھی وہ ان کے سامنے بیان ضرور کر دی۔

تورۂ چنائی

انہی دنوں اکبر نے تورۂ ”چنائی“ کی قدیم رسم کو جو متروک ہو چکی تھی۔ محض مرزا سلیمان کو دکھانے کے لیے دوبارہ رواج دیا۔ دیوان خانہ میں ایک بڑا دسترخوان بچھایا جاتا تھا اور لشکریوں کو رسماً اس دسترخوان پر کھانے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ جب مرزا چلا گیا تو یہ رسم بھی بند ہو گئی۔ اکبر نے مرزا سلیمان کی مدد کے لیے حاکم پنجاب خان جہان کو فرمان لکھ دیا

کہ وہ پانچ ہزار مسلح سوار لے کر میرزا کے ساتھ بدخشان کو جائے اور میرزا شاہرخ سے بدخشان چھین کر میرزا سلیمان کے سپرد کردے پھر لاہور لوٹ آئے، لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا، چنانچہ معاملات نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کرلی۔

منعم خان خانخاناں کی وفات

منعم خان خان خانان بنگال پر مقرر تھا۔ جب داؤد سے صلح ہوگئی تو وہ ٹانڈہ سے جہاں کی آب و ہوا معتدل تھی کوچ کرکے لشکر کو گنگا کے اس پار گوڑ کے علاقہ میں لے گیا۔ گوڑ پہلے بنگالہ کا دارالسلطنت تھا، وہاں کی آب و ہوا نہایت خراب اور متعفن تھی۔ منعم خاں نے وہاں پہنچ کر شہر کی تعمیر کا حکم دیا۔ امرا نے اس کو اس ارادہ سے روکنا بھی چاہا لیکن موت ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک لے آئی تھی اس لیے وہ باز نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی خراب آب و ہوا سے لشکر میں طرح طرح کی بیماریاں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا پھیل گئیں۔ روزانہ بے شمار آدمی ان بیماریوں کا شکار ہوکر مرنے لگے۔ اس علاقہ میں ہزار ہا آدمی مقرر تھے ان میں سے بہ مشکل چند سو اپنے اپنے وطن کو لوٹ کر آسکے باقی سب وہیں پیوند خاک ہوگئے۔

کثرت اموات کا یہ حال تھا کہ مردوں کو دفن کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ مجبوراً ان کو پانی میں بہادیا جاتا تھا اور ہر گھڑی کسی نہ کسی امیر کے فوت ہوجانے کی خبر خان خانان کو مل رہی تھی، لیکن نہ معلوم اس کے کانوں میں کس غفلت کی روئی بھری تھی کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا اور اُس کی نازک مزاجی سے ڈر کر امرا کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس سے سختی کے ساتھ واپسی کا مطالبہ کریں۔ آخر موت نے آکر اسے چونکایا، لیکن اب مہلت کہاں رہی تھی؟ خانخاناں بھی ان وباؤں کا شکار ہوکر بستر مرگ پر اس طرح گرا کہ پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کا انتقال 10/ رجب 983ھ/1555ء میں ہوا۔

خان خانان نے اپنے پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا تھا اس لیے اس کا برسوں سے جمع کیا ہوا مال و متاع اور سرمایہ بحق سرکار ضبط کرلیا گیا:

چہ خوش گفت این نکتہ را نکتہ سنج
کہ زر زر کشد عاقبت گنج گنج

اس کے مرنے پر بنگال میں متعینہ امرا نے شاہم خاں جلائر کو اپنا سردار بنا لیا۔ جب خان خاناں کی موت کی خبر پہنچی تو دربار سے خان جہاں کو خانخاناں کا قائم مقام بنایا گیا۔ بادشاہ نے اسے زردوزی کی قبا اور چار سنہری تھال، مرصع شمشیر، سنہری زین والا گھوڑا عطا فرما کر بنگالہ کی حکومت پر مقرر کر دیا۔

خان خاناں کی وفات سے جو نئی صورت حال پیدا ہوگئی اسکے سبب میرزا سلیمان کی مدد کا ارادہ پیدا ہوا اور اکبر نے یا تو خود سلیمان کی درخواست پر یا سیاسی مصالحت کی بنا پر مرزا کو سمندر کے راستے حجاز روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے سرکار کے خزانہ سے پچاس ہزار روپیہ اور گجرات کے خالصہ سے مزید بیس ہزار روپیہ دلوا کر قلیچ خان کے آذوقہ میں حج کے لیے رخصت کر دیا کہ وہ اسے سورت کی بندرگاہ سے جہاز پر چڑھا کر لوٹ آئے۔ مرزا سلیمان نے اسی سال حج کی سعادت حاصل کی، پھر وہ وہاں سے عراق کے راستے واپس ہوا اور دوبارہ بدخشاں کی حکومت حاصل کر لی.

تو راہ نرفتہ ازاں نمودند   ورنہ کہ زد این در کہ برونکشودند

مرزا سلیمان نے ہندوستان سے لوٹتے وقت اپنی لڑکی کا نکاح قندھار کے حاکم مظفر حسین مرزا سے جو اسی زمانہ میں لاہور آیا ہوا تھا، کر دیا۔ دوسری لڑکی کو کسی اور شخص سے بیاہ دیا تھا۔

حسین خاں کا پہاڑی علاقہ پر حملہ

حسین خان مرحوم جس سے میرے قدیم مراسم بلکہ دلی لگاؤ تھا۔ داغ محلّہ کے قانون سے سخت عاجز ہوگیا تھا اس سلسلہ میں اسے بڑی پریشانیاں لاحق رہیں۔ جب وہ بہت تنگ آگیا تو اس نے اپنے خاص ساتھیوں کی جمعیت سے کرکانت وگولہ سے کوچ کیا اور بدایوں اور سنبھل سے گزر کر گنگا کا عبور کیا اور دوآبہ پہنچ گیا۔ اس علاقے کے باغی زمیندار عرصے

سے مالگزاری ادا نہیں کر رہے تھے کروڑی بے چارہ کا کیا ذکر؟ وہ سرکاری مطالبوں پر جاگیردار تک کو جواب نہیں دیتے تھے۔ حسین خان نے ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ہی یہ فوجی حملہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ ان باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کرتے ہوئے شمالی پہاڑی کے دامن تک پہنچ گیا۔

حسین خان پر ایک مدت سے اس پہاڑی کو فتح کرنے کی دھن سوار تھی۔ اس کے تصور میں ہمیشہ یہاں کے بت خانوں میں سونے چاندی کی اینٹیں ہی جمی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں کسی بھاری لشکر کو لئے بغیر ہی اس نے بسنت پور کا محاصرہ کر لیا۔ بسنت پور پہاڑی میں نہایت دشوار گزار بلندی پر واقع ہے۔ اسے اس مہم میں مصروف دیکھ کر کروڑیوں کو اس سے نپٹنے کا موقع مل گیا چنانچہ تھانیسر کے کروڑی ملک الشرق گجراتی اور دوسرے کروڑی اپنے اپنے قلعوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے اور حسین خاں کے متعلق یہ جھوٹی خبر اڑا دی کہ وہ باغی ہو چکا ہے۔ دربار شاہی میں بھی عریضے بھیج کر اس کی اطلاع کرا دی۔

سعید خاں مغل کی حسین خاں کے ساتھ بڑی گہری اور دیرینہ دوستی تھی، وہ انہی دنوں ملتان سے دربار میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس سے حسین خاں کے حالات اور اس کی بغاوت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے اس کی تردید کر دی۔ بادشاہ نے اس سے رعایا کی تلف شدہ مویشیوں اور مالی نقصانات کے سلسلہ میں حسین خاں کی طرف سے ضمانتی تحریر بھی مانگی تھی اور اس نے حسین خاں کی طرف سے ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کی وجہ سے ان کی آپس میں جو دوستی تھی وہ جاتی رہی:

این دغل دوستان کہ می بینی مگسانند گرد شیرینی
پیش تو از موافق ترانند در عقب از سایہ منافق ترانند

حسین خاں کو قابو میں لانے کے لیے بادشاہ نے سید ہاشم ولد محمود بارہہ اور میر سید محمد عدل کے لڑکوں کو امرا کی ایک جمعیت کے ساتھ کھکر کی جانب رخصت کیا اور روانگی سے پہلے ہی حسین خاں کے لڑکے کو ان کی نگرانی میں دیا۔

حسین خاں کا انتقال

حسین خاں بسنت پور کی پہاڑی میں لڑتے ہوئے زخمی ہوگیا۔ ایک گولی اس کے شانہ کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور اس مہم میں اس کے بہت سے تجربہ کار آدمی بھی ضائع ہوئے۔ جب وہ ہر طرف سے مجبور ہوگیا تو ناکام اور نامراد پہاڑی علاقہ سے لوٹ آیا اور کشتی میں سوار ہوکر دریائے گنگا کے راستہ پٹیالی کی طرف جہاں اس کے اہل وعیال مقیم تھے روانہ ہوا، لیکن جب گڑھ مکتیشور پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اس زخمی حالت میں اسے گرفتار کرلیا اور آگرہ لے جاکر حسب الحکم صادق محمد خاں کی حویلی میں نظر بند کردیا۔ صادق محمد خاں سے ہندوستان کی فتح بلکہ قندھار کے زمانے سے ہی دینی تعصب کے سبب اس کی ان بن رہتی تھی اور آج اسی کے گھر رہنے کی ذلت اسے برداشت کرنی پڑی۔ بادشاہ کے حکم سے شیخ بینا طبیب اس کے علاج کے لیے فتح پور سے آگرہ آیا، اس نے معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ حسین خان کا زخم نہایت خطرناک ہے۔ بادشاہ نے معالجہ کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا۔ قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر عین الملک کے ساتھ گیا۔ عرصہ بعد اس سے میری ملاقات ہوئی اور دو بچھڑے ہوئے دوست گزرے ہوئے زمانہ کی یادوں کو سنبھالے نہایت رقت وحسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے:

هر جا من و معشوق بهم باز رسیدیم   از بیم بداندیش لب خویش گزیدیم
بی واسطۂ گوش ولب از راه دل وچشم   بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہے تھے کہ بادشاہی جراح آگئے اور انھوں نے ایک بالشت لمبا نشتر زخم میں ڈال کر اسے چیر دیا۔ مجھے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس بہادر نے اس نشتر زنی پر اف نہ کی، نہ اس کی پیشانی پر کوئی بل آیا بلکہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا ہی رہا۔ وہ منظر قیامت کے نظارے سے کچھ کم نہ تھا۔ جب میں اس سے مل کر رخصت ہوا تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری بس آخری ملاقات ہے۔ چنانچہ فتح پور پہنچے کے تین چار دن بعد اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے۔ اسی عارضہ میں آخر

کارد وہ گھل گھل کر مر گیا۔ بلا شبہ وہ شہید تھا کیوں کہ کافروں کے لگائے ہوئے زخم ہی کے باعث وہ فوت ہوا:

نماند کسی در جہان کو بماند
مگر آن کزو نام نیکو بماند

حسین خاں نہایت فیاض تھا۔ مستحقوں اور محتاجوں کے لیے مٹھی بھر بھر کر روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس کی یہ سخاوت اور دردمندی آخر اس کے کام آئی اور اس کا کفن دفن خواجہ محمد یحییٰ نقشبندی جیسے پایہ کے بزرگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ وہاں سے اس کی میت کو پٹیالی کے گورستان میں جو اس کا خاندانی مقبرہ تھا، لے جا کر سپرد خاک کیا گیا۔

جس وقت میں بھکر کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس تونگر دل درویش کی وفات کی داستان میر عدل کو سنائی۔ وہ اس خبر کو سن کر زار زار رونے لگا اور اس کی پاک دلی، دلیری اور چستی کی بڑی تعریف کرتے رہے اور فرمایا جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے تو اسے اسی طرح زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہونا چاہیے جیسا کہ حسین خان نے کہا اور جس طرح وہ دنیا سے رخصت ہوا اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی بس آخری ہی تھی۔ انھوں نے بھی اس موقع پر خود فرمایا تھا کہ "ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں"۔ ان کی بات سچ نکلی اور وہ بھی جلدی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حسین خان کے اوصاف

میں تقریبا نو سال تک اس پیارے دوست حسین خان کی خدمت میں رہا، سپاہ گری اور دنیا داری کی ظاہری وضع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانہ کے بیشتر پیشواؤں اور مرشدوں میں ان کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا، وہ نہایت درست عقیدہ کا سنی تھا، ہمت اور شجاعت میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ منکسر مزاج ایسا کہ چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا۔ دنیا سے بے نیازی میں اس جیسا کسی کو نہ پایا۔

لوگوں کی خدمت میں ہر دم کوشاں رہتا تھا، توکل اور زہد میں اس کے پایہ کا کوئی دوسرا نہیں تھا، اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو دین اور مذہب کی یہ بے قدری دیکھنی نہ پڑتی جیسی دیکھنے پر زمانہ نے مجبور کر دیا ہے۔

سادگی اور انکساری

جس زمانہ میں وہ لاہور کی حکومت پر فائز تھا، میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سنا کہ اس کی غذا حضور اکرمؐ کی متابعت میں صرف جو کی روٹی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے وہاں کی ہزارہا پرانی مسجدوں اور مقبروں کی مرمت اور تعمیر کرائی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی ہندو مسلمانوں کے بھیس میں اس کی مجلس میں آ کر بیٹھ گیا وہ اسے مسلمان سمجھ کر بڑی تواضع اور انکساری کے ساتھ ملاقات کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس نے عام حکم دے دیا کہ آج سے تمام ہندو اپنی آستینوں کے کنارے پر کسی نہ کسی رنگ کی پٹی سی لیا کریں تا کہ ہندو مسلمان میں تمیز ہو سکے۔ اسی حکم کی وجہ سے لوگوں میں اس کا نام 'ٹکریہ' پڑ گیا۔ ٹکری پیوند کو کہتے ہیں جیسے عربی میں غیار، بروزن دیار، کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ حکم بھی کیا تھا کہ حکم شرعی کے مطابق غیر مسلمان زین کی سواری نہ کریں بلکہ جانوروں پر پالان باندھا کریں۔

اس کی امرائی میں ہمیشہ سید اور اہل علم رہا کرتے تھے، ان کا ادب و لحاظ اس کو اس قدر تھا کہ محض اسی خیال سے کوئی بے ادبی نہ ہو جائے، سفر میں وہ کبھی سواری کی حالت میں نہیں سویا۔ تہجد کی نماز اس کی کبھی فوت نہ ہوئی۔ لاکھوں کروڑوں کے باوجود اس کے طویلہ میں ایک گھوڑے سے زیادہ کبھی نہ رہا۔ وہ بھی بعض اوقات چاہے سفر میں ہو یا حضر میں کسی نہ کسی مستحق کو بخش دیتا تھا اور خود پیدل ہو جاتا تھا۔ اس کے آدمیوں اور غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس دو دو گھوڑے کوتل میں لگے رہتے تھے:

"خان مفلس غلام با سامان"

دنیا سے بے نیازی

اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کبھی مال جمع نہیں کرے گا۔ جب بھی اس کے سامنے سونا روپیہ لایا جاتا تو کہتا تھا کہ یہ تیر یا نیزہ ہے جو میرے پہلو میں چبھا جا رہا ہے۔ جب تک وہ مال بخش نہیں دیتا اس کو چین نہیں پڑتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ پندرہ ہزار سے تیس چالیس ہزار روپیہ تک لوگوں نے پرگنوں کے حساب میں دبا لیا اور اس نے کوئی دھیان دیے بغیر فوج کے مصارف اور دوسرے اخراجات کی عرضی پر دستخط کر دیے اور اس کے پاس صرف رسد کا حصہ رہ گیا۔ اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ جو بھی غلام اس کے ہاتھ آئے گا وہ بس اسی دن سے آزاد ہو جائے گا۔ کبھی تین سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں نہیں رکھا۔

ایک دن شیخ الہدیہ نے جو اس وقت کے بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ حسین خاں کے اس بے ہنگام اخراجات اور آڑے وقتوں کے لیے پونجی نہ رکھنے پر اعتراض کیا اور اس کو اس عادت کو چھوڑنے کی نصیحت کی۔ ان کی یہ بات بڑی ناگوار گزری اور طیش میں آ کر کہا کہ اگر مال کو جمع کرنا جس کا ماتم کر رہے ہو سنت رسول ہے تو سرتابی کی مجال نہیں اور اگر ایسا نہیں تو ہم لوگ تم جیسے رہبران دین سے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ اگر ہم میں دنیا کی حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی رہ گیا ہے تو اسے تم دور کرنے کی کوشش کرو، نہ یہ کہ تم اس جہان فانی کی متاع حقیر و بے مایہ کو ہماری نگاہوں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرو اور اس طرح ہم کو اس کا لالچی بنا دو کہ ہم بخل و خست کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں

قرار بر کف آزادگان نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غزل

بہادری اور سخاوت

میں اس کے ساتھ کسی میدانی حملہ میں شریک نہیں رہا، لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا ہے۔ ان لڑائیوں میں میں نے ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس کا ذکر بس داستانوں کے حملوں کے متعلق ہی سننے میں آتا

ہے وہ نہایت قوی ہیکل اور انتہائی دلیر تھا۔ جنگ کے دن بس ایک ہی کلمہ زبان پر رہتا تھا، ''یا شہادت یا فتح'' لوگ بہت کہتے تھے کہ حضور دعا میں فتح کو مقدم رکھیے لیکن وہ یہ جواب دیتا کہ مجھے زندہ لوگوں کی نسبت گزرے ہوئے لوگوں کے دیدار کا زیادہ اشتیاق ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو وہ پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرض دار ہو جاتا، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چالیس پچاس عراقی اور ترکی گھوڑے کسی سوداگر کو اس کی بتائی مجموعی رقم پر یہ کہہ کر اکٹھے خرید لیے کرتو جانے اور تیرا خدا! پھر وہ سب ایک ہی نشست میں اپنے رفیقوں کو بخش بھی دیے، جن کو نہیں ملے ان سے عذر خواہی کرتا رہا۔

میں اس سے پہلی بار اس وقت ملا تھا جب کہ گڑھ کٹنگر پر لشکر کو مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے آگرہ میں ایک عراقی گھوڑا 500 روپے میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا۔ کہتے ہیں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمہ قرض تھی۔ قرض خواہوں کے ساتھ اس کی ایسی خوش معاملگی تھی کہ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے قرضہ کے دستاویز پھاڑ دیے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور اس کے ورثہ سے قرضوں کا کوئی مطالبہ اور جھگڑا نہ کیا۔

میں اپنی اس چھوٹی زبان سے حسین خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں، اب جب کہ میں پیری کی ذلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی جوانی کے شروع کا زمانہ اس کی خدمت میں گزرا اور یہ اس کی ہی توجہات کا طفیل ہے کہ میری نشو ونما نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی کہ آج میں دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کر دیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کرا دے۔

تخت نشینی کا بائیسواں سال

انہی دنوں خواجہ امین الدین محمود کا جو خواجہ امینا کے نام سے مشہور ہے، انتقال ہو گیا اور اس کا چھوڑا ہوا کافی بڑا سرمایہ خزانہ عامرہ میں داخل کر لیا گیا۔ اسی سال کی 17 ذی قعدہ کو بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا۔ بدستور سابق ایک منزل سے پیادہ جا کر مزار مبارک کی زیارت کی۔ اس مہینہ کی نویں تاریخ کو سورج برج حمل میں داخل ہوا اور جلوس شاہی کے بائیسویں سال کا آغاز ہوا۔

خان جہان کے نام فرمان

اس موقع پر یہ خبر ملی کہ منعم خاں خان خانان کے انتقال کے بعد بادشاہ میر داؤد کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکے گوڑ اور ماڈو سے پسپا ہو کر حاجی پور اور پٹنہ آ گئے ہیں اور خان جہان کا لشکر چونکہ ابھی تک لاہور میں رکا ہوا ہے اس لیے وہ تیزی سے کوچ نہیں کر رہا ہے۔ اکبر نے ترک سبحان قلی کے ہاتھ خان جہان کو تیزی سے روانہ ہونے کے لیے فرمان روانہ کیا۔ چنانچہ خان جہان نے بائیس دن میں ایک ہزار کوس کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی بادشاہ اجمیر ہی میں تھے کہ دوسری اطلاع ملی کہ خان جہان نے کڑی پہنچ کر داؤد کی پٹھان فوج سے ایک سخت جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار پٹھانوں کو قتل اور زخمی کر کے اب وہ آگے بڑھ چکا ہے۔

رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کا تقرر

اوایل محرم 984ھ/ 1576ء میں اکبر مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتی کے روضہ میں ساتھ لے کر گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے گوکندہ اور کونبھل میر کے دارالحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا، فوج کشی کے لیے مقرر کیا۔ اس کی مدد کے لیے خاصہ کے اور دوسرے صیغوں کے پانچ ہزار سواروں کو امراء کی سرکردگی میں متعین فرمایا۔ اس مہم پر مان سنگھ کے ساتھ آصف خاں میر بخشی، غازی خان بدخشی، شاہ غازی خان تبریزی، مجاہد خاں، سید احمد خاں، سید ہاشم بارہہ، خاصہ خیل اور دوسرے امرا بھی مقرر کیے گئے تھے۔

جہاد کا شوق

لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی قاضی خاں اور آصف خاں کو رخصت کرنے کے لیے ان کے ہمراہ دو تین کوس تک جہاں ان امیروں کی چھاؤنی تھی، گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ الاسلام شیخ عبد النبی صدر کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے حامی تو بھر لی لیکن میرے معروضے کو اپنے وکیل سید عبدالرسول کے ذمے کر دیا۔ یہ صورت بالکل بے کار تھی اور معاملہ میں تاخیر کا اندیشہ تھا۔ نقیب خاں کے ساتھ میرا اچھا خاصا یارانہ تھا، میں نے اس کو وسیلہ بنایا، پہلے تو اس نے مجھے روکنا چاہا اور کہا اگر ہندو اس لشکر کا سردار نہ ہوتا تو سب سے پہلے تم کو اجازت دلوا دیتا۔ میں نے خان کو بخوبی سمجھایا کہ ہم تو بادشاہ سلامت کو اپنا سردار مانتے ہیں، مان سنگھ وغیرہ سے ہم کو کیا غرض؟ اور یہ معاملہ تو نیت کی درستی پر منحصر ہے۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جبکہ بادشاہ مزار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میرا معروضہ پیش کیا۔ پہلے تو انھوں نے فرمایا اسکے ذمہ تو امامت کے فرائض ہیں، وہ کس طرح جا سکتا ہے؟ نقیب خاں نے عرض کیا اس نے جہاد کی نیت کر لی ہے۔ بادشاہ نے مجھے بلا کر پوچھا ”مصمم ارادہ ہے؟“ میں نے عرض کیا، ہاں۔ فرمایا، ”کیوں؟“ میں نے کہا، میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہوں“۔ اس پر فرمایا ”انشا اللہ تعالیٰ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔ اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبہ میں چلے گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے رہے اور جب میں نے چبوترہ پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنے پیر کھینچ لیے۔ جس وقت میں دیوان خانہ سے رخصت ہوا تو مجھے دوبارہ بلوایا اور دونوں ہاتھوں سے بھر کر 56 اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ اس زمانہ میں شیخ عبد النبی سے سابقہ رنجش دور ہوگئی تھیں اور وہ مجھ پر مہربان ہوگیا تھا اس لیے میں اس سے بھی رخصت لینے کے لیے گیا، اس نے مجھ سے کہا ”یاد رکھنا جس وقت دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو چونکہ حدیث نبوی کے بموجب یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے تم مجھے دعائے خیر میں یاد کرنا اور بھولنا نہیں“۔

میں نے وعدہ کیا اور فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی۔ پھر میں گھوڑا تیار کرکے اس لشکر میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوشگوار اور مبارک ثابت ہوا۔ آخر کار ہم فتح نامہ اور اس ہاتھی کو لے کر جو رانا کیکا سے اس جنگ و جدال کا باعث ہوا تھا، فتح پور لوٹ آئے۔

داؤد کی دوبارہ بغاوت

اسی سال 20 محرم کو کوکندہ کے لشکر کا انتظار کرنے کے بعد بادشاہ فتح پور واپس ہوئے اور وہاں پہلی ماہ صفر کو پہنچ گئے۔ انہی دنوں مخبروں نے خبر پہنچائی کہ گرہی سے خانجہاں کے آگے بڑھنے کے بعد داؤد ٹانڈو سے نکل کر آک محل کے موضع میں جس کے ایک طرف تو دریائے گنگا اور دوسری طرف پہاڑ ہے، آگیا ہے اور وہاں قلعہ اور خندق بنا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبد اللہ اس خندق کی لڑائی میں مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے ہیں۔ دوسری طرف پٹھانوں کا سردار خانخاناں بھی قتل ہوگیا ہے۔ اس اطلاع پر بادشاہ نے پٹنہ و بہار کے حاکم ظفر خاں کو لکھا کہ ساری فوجیں اکٹھی کرکے خان جہاں کی مدد پہ چلا جائے۔

چوگان بازی

ربیع الاول کے مہینہ میں بادشاہ میرزا محمد شریف کے ساتھ فتح پور میں چوگان کھیل رہے تھے۔ مرزا شریف نہایت ذہین، خوش مزاج اور خوش آواز نوجوان تھا اچانک وہ کھیل کے دوران گھوڑے سے گر پڑا اور اسی وقت مر گیا۔ شہنشاہ اس ناگہانی حادثہ پر دنگ رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کریں؟ قطب الدین محمد اتکہ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑی اور کہا خداوند آپ کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ یہاں سے تشریف لے چلیں، تب وہ چونکے اور محل کو واپس آگئے۔ اس حادثہ کے متعلق شہر بلکہ سارے ملک میں کچھ اور افواہ اڑ گئی، اس لیے بادشاہ نے اپنی صحت و عافیت کے متعلق فرامین ہر جگہ

روانہ کیے اور اس خبر سے جو شورش سی اٹھنے لگی تھی دب گئی۔ یہ فرمان کوکندہ میں مان سنگھ اور آصف خاں کے نام بھی گیا اور لشکر میں جو رنج و ملال پھیل گیا تھا مسرت و خوشی میں تبدیل ہوگیا۔

کوکندہ پر فوجی حملہ

کوکندہ ماہ ربیع الاول984 ھ/1576 ء کے شروع میں فتح ہوا۔ مان سنگھ اور آصف خاں اجمیر کی فوج کے ساتھ ماندل گڑھ کے راستے متواتر کوچ کرتے ہوئے بلدہ تک جا پہنچے۔ یہ مقام رانا کیکا کے صدر مقام کوکندہ سے سات کوس پر واقع ہے۔ رانا بھی مقابلے کے لیے نکل کر آیا۔ مان سنگھ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے ساتھ بادشاہی امرا جیسے محمد رفیع بدخشی، شہاب الدین گرو، پاینده قزاق، علی مراد اوزبک، راجہ لون کرن حاکم سانبھر اور دوسرے راجپوت قول (قلب لشکر) پر مقرر تھے اور بہادر نوجوانوں کی ایک جمعیت ہراول پر لگائی گئی تھی۔ انہی میں سے 80 سے زائد لشکریوں کو سید ہاشم بارہہ کی کمان میں ہراول سے آگے روانہ کیا گیا۔ اس قسم کے دستے کو ''جوزہ ہراول'' کہتے ہیں۔ میمنہ پر سید احمد خاں بارہہ اور دوسرے امیر تھے اور میسرہ پر قاضی خاں اور اس کے ساتھ سیکری کے شیخ زادے جو شیخ ابراہیم چشتی کے عزیز اور رشتے دار ہوتے ہیں، مقرر تھے۔ چنداول پر متھر خاں سردار تھا۔

رانا کیکا کا زبردست حملہ

جب رانا کیکا درہ کے پیچھے سے نکل کر آیا تو اس کا لشکر دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کی ایک فوج جس پر حکیم سور افغان سردار تھا ہراول کے مقابلے میں پہاڑ کی مغربی سمت سے آگے بڑھی۔ اس وقت پیچ دار راستے کے کٹاؤ، ناہمواری اور جھاڑ جھنکار کی وجہ سے ''جوزہ ہراول'' اور ''ہراول'' ایک ہی راستے میں خلط ملط ہوگئے اور دشمن کے مقابلے میں مدافعانہ جنگ کرتے ہوئے پسپا ہوئے۔ لشکر میں جو راجپوت تھے اور ان کی کمان راجہ لون کرن سانبھری

کررہا تھا وہ بھیڑوں کی طرح بائیں جانب بھاگ نکلے اور ہراول سے گزر کر انھوں نے میمنہ میں جاکر پناہ لی۔ اس وقت میں بھی ہراول کے سرےآوردہ سرداروں کے ساتھ تھا۔ میں نے آصف خاں سے کہا "اس وقت ہم راجپوتوں میں اپنوں اور غیروں کی بھلا کس طرح تمیز کرسکتے ہیں؟" اس نے حکم دیا برابر تیراندازی کرتے رہو یہ مت سوچو کہ کون زد میں آتا ہے چنانچہ ہم برابر تیروں کی بوچھار کرتے رہے اور اس پہاڑ جیسے انبوہ اور ہجوم میں ہمارا کوئی نشانہ خطا نہ ہوا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تیر صحیح نشانے پر لگ رہے ہیں اور مجھے یقین سا آگیا کہ مقصود حاصل ہوگیا اور جہاد کا ثواب لازما مل گیا۔ سادات بارہہ اور غیور نے اس موقعے پر ایسی داد شجاعت دی جو رستم کے کارناموں کی یاد دلادے۔ دونوں طرف سے بہت سے آدمی اس محاذ پر کام آگئے۔ دشمن کی دوسری فوج جس کی کمان خود رانا کیکا کررہا تھا، گھاٹی میں سے نکل کر آئی اور قاضی خاں کو جو گھاٹی کے دہانے پر لڑ رہا تھا، آگے سے ہٹا کر اسے پسپا کرتی ہوئی سیدھی قلب لشکر پر حملہ آور ہوئی۔ سیکری کے شیخ زادے ایک ہی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار کے وقت شیخ ابراہیم کے داماد شیخ منصور کے سرین پر، جو اس دستے کی کمان کررہا تھا ایک تیر آکر لگا۔ اس زخم سے وہ کافی عرصہ تک تکلیف اٹھاتا رہا۔ اس کے مقابلے میں قاضی خاں باوجود ملاگیری کے دشمن کے سامنے دلیری سے جما رہا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک تلوار لگی جس سے اس کا انگوٹھا زخمی ہوگیا۔ جب مقابلے کی تاب نہ رہی تو وہ بھاگ کر قول میں آگیا۔ وہ جمعیت جو دشمن کے پہلے حملے ہی میں لشکر سے نکل بھاگی تھی دریا پار کرکے پانچ چھ کوس تک برابر بھاگتی چلی گئی اور انھوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

مہتر خاں کی ہوشیاری

اس نازک صورت حال میں مہتر خان نے بروقت کام کیا۔ وہ اپنے چنداول کو یکبارگی لے کر نقارہ بجاتے ہوئے آگے بڑھا اور اعلان کردیا کہ خود بادشاہ سلامت حملہ کرتے ہوئے آپہنچے ہیں، اس کی یہ چال کام کرگئی اور بھاگتی فوج کے قدم میدان میں جم گئے۔ مشہور

راجہ مان کا پوتا راجہ رام گوالیاری جو رانا کیکا کے آگے بڑھا چلا آرہا تھا اس نے راجا مان سنگھ کے راجپوت دستے کے مقابلے میں ایسی بہادری دکھائی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ مان سنگھ ہی وہ راجپوت تھے جو ہراول کے بائیں بازو سے بھاگ کر آصف خاں کی پسپائی کا باعث بنے تھے اور میمنہ کے سید زادوں کے پاس جاکر پناہ لے لی تھی۔ اگر اس وقت سادات ثابت قدمی سے جمے نہ رہتے تو سب کو رسوائی اٹھانی پڑتی۔

ہاتھیوں کی خوف ناک لڑائی

رانا نے بادشاہی ہاتھیوں کے مقابلے پر اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا اور دو مشہور مست ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ ہاتھیوں کا فوجدار حسین خاں جو مان سنگھ کے پیچھے ایک دوسرے ہاتھی پر سوار تھا، اس ریل پیل میں گر پڑا اور مان سنگھ اپنے ہاتھی پر مہاوت کی جگہ پر آگیا۔ اس نے حیرت انگیز ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ جو دو ہاتھی لڑ رہے تھے ان میں سے ایک تو بادشاہ کے خاصے کا ہاتھی تھا اور دوسرا رانا کا ہاتھی "رام پرشاد" نامی تھا جو نہایت قوی ہیکل تھا، دونوں میں بڑے غضب کا مقابلہ اور دونوں پوری قوت سے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ اتفاق سے رانا کے ہاتھی کے مہاوت کو ایک تیر لگا اور وہ ہاتھیوں کی ٹکر کے صدمے سے زمین پر گر پڑا۔ عین اس وقت بادشاہی ہاتھی کا مہاوت نہایت تیزی کے ساتھ کود کر رانا کے ہاتھی کے سر پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ ایسا حیرت انگیز کارنامہ دکھایا تھا کہ کوئی دوسرا اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

رانا کیکا کا فرار ہونا

جب رانا نے میدان کا اس طرح رنگ بدلا ہوا دیکھا تو مقابلہ چھوڑ کر نکل گیا اور رانا کے لشکر میں بڑی افراتفری سی مچ گئی۔ شاہی محافظ دستے کے جوانوں نے جو مان سنگھ کی محافظت کر رہے تھے، اس موقعے پر آگے بڑھ کر ایسی لڑائی کی جو یادگار رہے گی۔ مان سنگھ نے بھی اس دن جس بہادری اور خوبی سے سرداری کے فرائض انجام دیے۔ اس سے ملا

شیری کے اس مصرعے کی تصدیق ہوئی

"کہ ہندوی زند شمشیر اسلام"

اس معرکے میں جے مل چتوڑی کا لڑکا اور گوالیار کا راجہ رام ساہ اپنے بیٹے سالباہن کے ساتھ جو نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا، مارا گیا۔ گوالیار کے راجاؤں کے خاندان میں کوئی دوسرا قابل جانشین نہ رہا "خس کم جہان پاک"۔ رانا کیکا بھی جو مادھو سنگھ کے مقابل تھا، تیر کھا کر زخمی ہو گیا۔ حکیم سور سادات کے مقابلے سے بھاگ کر رانا کے پاس آ گیا اور دونوں کی فوجیں یکجا ہو گئیں۔ رانا میدان میں ٹھہر نہ سکا اور مقابلہ ترک کر کے اونچے پہاڑوں پر جہاں وہ چتوڑ کی فتح کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا، محصور ہو گیا۔

یہ لڑائی سخت گرمی کے موسم میں ہوئی تھی، گرمی کے مارے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ ہم صبح سے دوپہر تک برابر لڑتے رہے اور تقریباً 500 آدمی اس حصے میں ہلاک ہوئے۔ ان میں سے 120 مسلمان اور باقی مرنے والے ہندو تھے۔ زخمیوں کی تعداد 300 سے زائد تھی۔ تیز دھوپ کی وجہ سے میدان جنگ تنور کی طرح دہک رہا تھا اور گرمی کی وجہ سے سپاہیوں میں نقل و حرکت کی قوت نہ رہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ رانا پہاڑ کے پیچھے گھات میں چھپا ہوگا اسی لیے لشکر نے اس کا تعاقب نہ کیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گیا، جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔

شاہی فوج گوکنڈہ میں

دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے ہم میدان کارزار میں گئے۔ لاشوں کی دیکھ بھال اور سب کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے کے بعد درے میں داخل ہوئے اور گوکنڈہ پہنچ گئے وہاں رانا کے چند فدا کار رہ گئے تھے جو اس کے محل کی حفاظت کر رہے تھے۔ چند معذور اور ضعیف لوگ بھی تھے اور یہ سب مل کر کل بیس آدمی تھے۔ ہندوؤں کی پرانی رسم کے مطابق کہ وہ شہر خالی کرتے وقت اپنی آبرو اور ناموس کی خاطر خودکشی کر لیتے ہیں یہ بھی گھروں اور بت خانوں میں جمع ہوئے اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے کے بعد انھوں نے تلواروں سے

اپنے آپ کو ہلاک کرلیا اور سیدھے دوزخ میں چلے گئے۔

اندیشہ تھا کہ رانا شب خون مارے گا، اس لیے امرائے شاہی نے شہر کی کوچہ بندی کردی اور خندق کھدوا کر اتنی اونچی دیوار بنوادی کہ سوار بھی اس پر چڑھ نہ سکے۔ جب لشکر شہر میں ٹھہر گیا تو مقتولین جنگ کی اور ہلاک ہونے والے گھوڑوں کی تفصیلی فہرست تیار کی گئی تاکہ وہ عریضے کے ساتھ منسلک کردی جائے۔ اس وقت سید احمد خاں بارہہ نے کہا ہمارا نہ تو کوئی آدمی مارا گیا نہ کوئی گھوڑا ضائع ہوا۔ ان کے نام بادشاہی دفتر میں پہنچانے سے کیا حاصل یہ لکھت پڑھت چھوڑو اور سب سے پہلے غلے کی فکر کرو، وہ پہاڑی نہایت بنجر تھی چنانچہ لشکر میں اناج کی قلت ہوگئی۔ کوئی بنجارہ غلہ بھی لے کر نہ آیا اور فوج بڑی تنگی میں مبتلا ہوگئی۔ امراء نے مجلس مشاورت منعقد کی اور امراء میں سے باری باری ایک ایک کو سردار بنا کر غلہ لانے کے لیے مواضعات کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے بلند ٹیکروں اور چوٹیوں پر پہنچ کر جہاں جہاں شکست کھائی ہوئی فوجوں کی ٹکڑیاں جمع تھیں سب کو قیدی بنا لیا اور ان کے مویشی پکڑ کر لے آئے، انہی مویشیوں کے گوشت پر گزر اوقات ہوتی رہی، البتہ پہاڑیوں میں آم اتنی کثرت سے تھے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کے غریب لوگ عموماً صبح کے وقت کھانے کے بجائے بھی آم کھایا کرتے تھے اور رطوبت کی وجہ سے اکثر بیمار ہوجاتے تھے، وہاں کے آم کا وزن تقریباً اکبری سیر کے برابر تھا اس کو چھلکا بھی پتلا ہوتا تھا لیکن میٹھا اور مزے دار نہیں تھا۔

اسی اثنا میں دربار سے محمود خاں خواص حسب الحکم حملہ کرتے ہوئے کوکندہ آیا اور جنگ کی روداد معلوم کر کے دوسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ ہر ایک کی کارگزاری بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے فوج کی کارکردگی کی تعریف کی لیکن یہ بات کہ رانا کا تعاقب نہیں کیا گیا اور اسے زندہ بچ کر جانے دیا بادشاہ کو پسند نہ آئی۔

رام پرشاد ہاتھی

امراء فتح نامے کے ساتھ "رام پرشاد" ہاتھی کو جو غنیمت میں ہاتھ آیا تھا بادشاہ کے پاس بھیجا

چاہتے تھے۔ اس ہاتھی کو بادشاہ نے متعدد بار رانا سے مانگا تھا اور وہ اپنی بدبختی سے اسے دینے پر کبھی راضی نہ ہوا تھا۔ آصف خان نے میرا نام لے کر کہا کہ ''یہ محض دوستی اور ہمراہی کی خاطر اس لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ فتح نامہ اور ہاتھی اس کے ذریعہ بھیج دیا جائے۔'' مان سنگھ نے جواب دیا ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکے کے وقت صفوں کی امامت کرنا چاہیے۔ میں نے کہا ''یہاں امامت کا اب کیا کام ہے؟'' اس وقت تو مجھے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔ میری بات پر وہ مسکرایا اور میرے ساتھ 300 سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی کو روانہ کر دیا۔ خود مان سنگھ بھی سیر وشکار اور تھانے قائم کرنے کے ارادے سے ہمارے ساتھ قصبہ موہن تک جو کہ گوکندہ سے 20 کوس کے فاصلے پر ہے آیا اور سفارش نامہ لکھ کر مجھے وہاں سے رخصت کیا۔

میں باگھور اور مانڈل گڑھ کے راستے سے مان سنگھ کے وطن قصبہ انبیر پہنچا۔ ہمارا جہاں بھی گزر ہوتا تھا لوگ مان سنگھ کی جنگ اور کامیابی کا حال سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے اور لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ انبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہم پہنچے تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا جس قدر وہ آگے بڑھتا تھا اسی قدر اندر دھنستا جا رہا تھا۔ میرے ذمے اس قسم کی یہ پہلی ہی خدمت تھی۔ اس لیے میں سخت پریشان ہوا۔ آخر وہاں کے رہنے والے پہنچے انھوں نے بتایا کہ گزشتہ سال بھی اس جگہ سرکاری ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اب ہاتھی کے نکلنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں کنجال اور پتلا کیچڑ کافی مقدار میں پھیلا دو تا کہ دلدل کچھ نرم ہو جائے اور ہاتھی آسانی سے نکل آئے۔ سقوں نے اسی طرح کیا، جب انھوں نے بہت سا پانی لا کر ڈالا تو ہاتھی آسانی سے نکل آیا اور ہم انبیر میں داخل ہوئے۔ انبیر والے تو اس فتح کی وجہ سے بڑا فخر کرنے لگے۔

بارگاہ شاہی میں حاضری

ہم انبیر میں تین چار دن رہے اور قصبہ ٹوڈہ کے راستے سے جو میری جائے پیدائش ہے وہاں سے بیاور جہاں میرا خاندان مقیم ہے، گئے اور وہاں سے اوائل ماہ ربیع الآخر میں فتح

پور پہنچ گئے۔ میں مان سنگھ کے والد راجہ بھگوان داس کے وسیلے سے فتح پور کے بادشاہی دیوان خانے میں باریاب ہوا اور کورنش بجالا کر امراء کے عریضے اور ہاتھی کو پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا "رام پرشاد" فرمایا چونکہ یہ سب پیر کے طفیل میں حاصل ہوا ہے اس لیے اس کا نام اب "پیر پرشاد" ہوگا۔ پھر مخاطب کیا کہ "امراء نے تیری تو بہت تعریف لکھی ہے سچ بتانا کہ تو کون سی فوج میں تھا اور کیا کارنامہ تو نے انجام دیا؟" میں نے کہا "یہ ناچیز بادشاہوں کے سامنے لرزاں و ترساں سچ ہی بیان کرنے کا عادی ہے، بھلا جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے اور جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ بادشاہ نے پوچھا تم نہتے تھے یا مسلح؟ میں نے کہا، ایک زرہ اور تلوار میرے پاس تھی۔ فرمایا یہ سامان تم کو کہاں سے مل گیا؟ عرض کیا، سید عبد اللہ خاں سے میں نے لیا تھا۔ بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ ان دنوں ہمیشہ بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا، چنانچہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو کل 96 تھیں مجھے انعام دیا۔ پھر پوچھا "شیخ عبدالنبی سے ملاقات کی ہے؟" میں نے کہا راستے کی گرد جھاڑتے ہوئے سیدھے خدمت میں حاضر ہوا ہوں اُن سے کیسے مل سکتا تھا؟ پھر بادشاہ نے ایک اعلیٰ قسم کا نخودی دوشالہ اٹھا کر مجھے دیا کہ یہ لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو اور اُن سے کہنا کہ یہ دوشالہ ہم نے تمہارے لیے اپنے خاص کارخانے میں تیار کرایا ہے، اسے اوڑھ لو"۔ میں وہ دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گیا اور اسے بادشاہ کا پیغام دیا۔ شیخ بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھا کہ رخصت کرتے وقت میں نے تم سے کہا تھا مقابلہ کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا۔ میں نے کہا اس وقت تو میں نے یہ دعا "**اللھم اغفر اللمومنین واللمومنات وانصر من نصر دین محمد و اخذ من خذل دین محمد علیہ الصلوٰۃ و السلام**" پڑھی تھی۔ شیخ نے کہا یہ بھی کافی ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر جائے عبرت ہے کہ یہی وہ شیخ عبدالنبی ہے کہ وہ جب دنیا سے رخصت ہوا تو ایسے بُرے حال میں کہ خدا کسی کو نہ دکھائے نہ سنوائے اور سب کو اس سے عبرت ہو:

ہر کرا پرورد گیتی عاقبت خوش بر یخت
حال آن فرزند چون باشد کہ خصمش مادر است

اسی سال بادشاہ نے سید عبد اللہ خاں کے ذریعہ خان جہاں کے پاس فرمان بھیجا اور اسے بہ نفس نفیس وہاں پہنچنے کی خوشخبری دی۔ اس وقت خاں جہاں کہل گاؤں کے قریب داؤد کے مقابلے میں مورچے جمائے مظفر خاں اور بہادر حاجی پور کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے لشکر کی مدد کے لیے ڈاک چوکی کے ذریعے پانچ لاکھ روپیہ بھیجا اور غلے سے بھری ہوئی بہت ساری کشتیاں آگرہ سے روانہ کرنے کا حکم دیا۔

بادشاہ کا ارادہ بنگال

اسی دوران خبر پہنچی کہ حاجی پور کے علاقے کے زمیندار گجپتی نے جو باغی ہوگیا تھا، فوج اکٹھی کر کے تھانہ آرہ پر جہاں فرحت خاں اور اس لڑکا میرک روائی مامور تھے، حملہ کر دیا اور دونوں کو شہید کر دیا ہے اور اس کی فوج کشی کی وجہ سے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ اس اطلاع پر بادشاہ سن مذکور میں 25 ربیع الآخر کو فتح پور سے مشرقی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور پانچ کوس طے کر کے منزل کی اور اس منزل پر سید عبد اللہ خاں داؤد کا سر لے کر حاضر ہوا اور سید میر کی فال جفر کا وہ شعر جو اس نے پٹنہ سے واپسی کے وقت جونپور میں نکالا تھا صحیح ثابت ہوا۔ وہ شعر تھا:

مژدہ فتح بہ ناگاہ رسد
سر داؤد بدرگاہ رسد

داؤد کی شکست اور قتل

جس دن سید عبد اللہ خاں کہل گاؤں کے قریب خاں جہاں کے لشکر میں پہنچا تو حملے کی تیاری کی گئی اور دوسرے دن کہ جب ربیع الآخر کی 15 تاریخ تھی خان جہاں اور مظفر خاں نے صف آرائی کی اور تمام امراء کو ان کی ذمے داریاں سپرد کیں۔ اس وقت داؤد بڑے نخوت و غرور کے ساتھ اپنے چچا جنید کرانی اور دوسرے سرداروں کو لے کر قلعے سے باہر آیا اور جنگ چھیڑ دی۔ پہلے ہی حملے میں توپ کا ایک گولہ جنید کو آ کر لگا اور اس کے چیتھڑے

اڑ گئے۔ جب دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی تو پٹھان شکست کھا کر بھاگ نکلے، اور داؤد کا گھوڑا ایک دلدل میں پھنس گیا۔ حسین بیگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، وہ داؤد کی مشکیں کس کر اسے خان جہاں کے پاس لے آیا۔ داؤد سخت پیاسا ہو رہا تھا، اس نے پانی مانگا۔ لوگوں نے اسی کے جوتے میں پانی بھر کر اس کو پیش کیا۔ جب اس نے نہ پیا اور منہ پھیر لیا تو خانجہاں نے اپنے خاص پیالے سے اسے پانی پلایا۔ داؤد نہایت خوبصورت اور حسین تھا اس لیے خان جہاں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا، آخر امراء نے کہا کہ اس کو زندہ چھوڑنے میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے۔ خان جہاں نے مجبور ہو کر اس کی موت کا حکم دے دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر گھاس سے بھر کر خوشبو میں بسایا گیا اور عبد اللہ خاں کے حوالے کر کے روانہ کر دیا۔ اس فتح میں شاہی لشکر کو بہت سے ہاتھی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔

اکبر کی اجمیر روانگی

بادشاہ اس فتح کے شکرانے میں اسی سال 23 جمادی الثانی کو دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور ماہ رجب کی 6 تاریخ کو جس دن کہ خواجہ صاحب کا عرس تھا، وہاں پہنچے۔ خواجہ خاوند محمود کے لڑکے سلطان خواجہ کو "امیر الحاج" بنا کر چھ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرا سامان حرمین شریفین کے مستحق لوگوں کے لیے اور حرم مبارک میں ایک عمارت بنوانے کے لیے روانہ کیا۔ جس وقت سلطان خواجہ رخصت ہونے لگا، بادشاہ بھی زائروں کی طرح ننگے سر ننگے پیر احرام باندھے حاجیوں کا لباس پہن کر اور تھوڑے بال ترشوا کر کچھ دور تک اس قافلے کے ہمراہ گئے۔ بادشاہ کو اس حال میں دیکھ کر لوگوں کو بڑی رقت ہوئی اور لوگ چیخیں مار کر نالہ وفریاد کرنے لگے۔ سلطان خواجہ کے بدرقے کے لیے قطب الدین محمد خاں، قلیچ خاں اور آصف خاں کو مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ امراء اس قافلے کو گوگندہ سے بخیر وخوبی آگے پہنچا کر رانا کے سارے علاقے کو پامال کر دیں اور اس کا جہاں بھی پتہ چلے گھیر کر زندہ نہ چھوڑیں۔

شاہ طہماسپ کا انتقال

اس موقعے پر خبر آئی کہ ایران میں شاہ طہماسپ فوت ہو گیا ہے اور شاہ اسماعیل ثانی اس کا جانشین ہوا ہے۔ اس قافلے کی روانگی پر تاریخ نکالی گئی:

"اول دولت و فتح وظفر است"

اس وقت بادشاہ نے عام منادی کرادی کہ جو شخص چاہے قافلے کے ساتھ حج پر جا سکتا ہے، اس کا سفر سرکار سے ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ بے شمار لوگ اس سال حج کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ایک زمانہ وہ تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ کوئی شخص حج کا نام بھی نہیں لے سکتا اور حج کی اجازت کی درخواست پر ہی لوگ واجب القتل مجرم بن جاتے ہیں۔ "تلک الایام نداولھا بین الناس"۔

ان دنوں جب کوکندہ کے لشکر کی عسرت و تنگی کی شکایتیں پہنچنے لگیں تو بادشاہ نے مان سنگھ، آصف خاں اور قاضی خاں کو وہاں سے طلب کر لیا۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان کو بعض قصوروں پر چند دن کے لیے کورنش سے محروم کر دیا اور غازی خاں بدخشی، مہتر خاں، علی مراد اوزبک، خنجری ترک اور دوسرے ایک دو افسروں کو جن میں میں بھی شامل تھا، ان سے مستثنیٰ کر کے شاہانہ عنایت سے نوازا گیا اور ان کے مناصب میں ترقی ہو گئی۔ باقی تمام لوگوں کا تنزل ہو گیا، اگرچہ بعد میں ان کو بھی بادشاہ نے معاف کر دیا۔

خواجہ شاہ منصور کی حاضری

رانا کیکا شکست کھانے کے بعد اودے پور اور خان پور وغیرہ کے پہاڑوں میں قزاقی کرتا پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی سرکشی کے لیے اسی مہینے کی 19 تاریخ رانا کے علاقے کی جانب کوچ فرمایا۔

اس زمانے میں خواجہ شاہ منصور شیرازی خدمت میں آیا بہت پہلے وہ کچھ عرصے بادشاہی خوشبو خانے کا مہتمم رہا تھا لیکن مظفر خاں سے دشمنی ہو جانے کی وجہ سے شاہی خدمت سے بھاگ کر جون پور میں منعم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ منعم خاں نے اس کی

بڑی قدر و منزلت کی اور خواجہ منصور ترقی کر کے دیوانی کے عہدے پر مامور ہوا۔ جب منعم خاں کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ نے فرمان بھیج کر اسے دربار میں بلالیا۔ خواجہ منصور چونکہ نہایت تجربہ کار کاروان اور سنجیدہ آدمی تھا، اس لیے بادشاہ نے اسے تمام ممالک محروسہ کا دیوان بنادیا اور وہ امور ملکی میں راجہ ٹوڈرمل کا با اختیار شریک ہوگیا۔

مشہور ہے، اول حق بعد میں ظلم، آدمی اقتدار پانے کے بعد ظلم و ستم پر اتر آتا ہے اور خواجہ کے ساتھ تو یہ بھی اتفاق پیش آیا کہ اسی سال دُمدار ستارہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوا۔ چونکہ خواجہ منصور دنبالہ دار پگڑی باندھا کرتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کا نام ستارۂ دنبالہ دار یعنی" جھاڑو تارا" رکھ دیا خواجہ فوج کا حساب کتاب نہایت سختی کے ساتھ کرنے لگا اور اس کی بے جا پکڑ دھکڑ سے لوگ ایسے تنگ آئے کہ وہ راجہ اور مظفر خاں کی سختیاں بھول گئے اور اس پر لعنتیں بھیجنے لگے۔

شاہ اسماعیل کا قتل

اسی سال خبر پہنچی کہ عراق کے بادشاہ شاہ اسماعیل ولد شاہ طہماسپ کو اس کی بہن پری خانم نے امراء کے ساتھ ساز باز کر کے قتل کرا دیا ہے۔ میر حیدر معمائی نے اس کی تاریخ جلوس ''شہنشاہ روی زمین'' اور اس کی تاریخ وفات ''شہنشاہ زیر زمین'' نکالی۔ جو دمدار ستارہ طلوع ہوا تھا اس کا اثر عراق میں ظاہر ہوا اور وہاں اس واقعے سے بڑا انتشار پھیل گیا۔ تبریز، شروان اور مازندران پر رومیوں نے زبردستی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سلطان محمد خدابندہ جو شاہ طہماسپ کی دوسری بیوی سے تھا، تخت پر بیٹھا۔ اس لیے بادشاہ کے دور میں وہاں ایک بڑی اچھی تبدیلی ہوئی۔ مدت سے وہاں کی حکومت کے زیر سایہ جو صحابہ کے خلاف تبرا ہوتا تھا اور خلفائے بنو امیہ پر لعنت کی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی۔ لیکن وہاں کی بے دینی ہمارے ملک ہندوستان میں سرایت کرگئی:

نفاق آمدہ در ہند از بلاد عراق
عراق قافیہ میدان بہ رہگذار نفاق

قلعہ ایدر پر حملہ

جس وقت قصبہ موھتی میں سرا پردۂ شاہی نصب ہوا تو قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کے نام فرمان جاری کیا گیا کہ دونوں سردار کوکندہ میں ٹھہرے رہیں اور قلیج خان دوسرے امرا کے ساتھ حاجیوں کے قافلے کو لے کر ایدر تک جو احمد آباد سے چالیس کوس پر ہے، جائے اور وہاں کے زائرین کو بھی قافلے کے ساتھ احمد آباد روانہ کرنے کا انتظام کرے۔ قافلے کو رخصت کر کے ایدر کے قلعے کا محاصرہ کرے اور راجہ نرائن داس کی بغاوت کو پوری طرح کچلنے کے لیے قلیج خان نے حکم کی تعمیل کی اور حاجیوں کے قافلے کو تیمور خاں بدخشی کے ہمراہ 500 سواروں کی حفاظت میں منزل تک پہنچا دیا۔ اس کے فوجی حملے سے ایدر کا راجہ بھی رانا کیکا کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر چھپ گیا۔

بادشاہ کی مالوہ روانگی

اسی جگہ شہاب خاں اور شاہ بداغ خاں اپنے لڑکے عبد المطلب خاں کے ساتھ اور شاہ فخرالدین خاں اور مالوہ کے دوسرے جاگیر دار دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے غازی خاں بدخشی کو ہزاری کا منصب عطا کر کے شریف محمد خاں اتکہ، مجاہد خاں اور ترک سبحان قلی اور تین ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ قصبہ موھتی میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ مداریہ کی پہاڑیوں میں عبدالرحمٰن ولد مؤید بیگ کو پانچ سو آدمیوں کی چوکی پر مقرر فرمایا۔ قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کو بھی کوکندہ سے لشکر میں طلب کیا گیا اور اودے پور پر شاہ فخرالدین اور جگناتھ کو مامور کیا۔ سید عبداللہ خان اور راجہ بھگوان داس کو اودے پور کے درہ پر مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ کوچ کر کے بانس والہ اور ڈونگر پور پہنچے۔

اسی مقام پر بنگالہ سے راجہ ٹوڈرمل وہاں کا مال غنیمت اور 500 ہاتھی لا کر حاضر ہوا۔ اسی جگہ پر قلیج خاں کو ایدر سے بلا کر اس کی جگہ آصف خاں کو لشکر کا سردار بنا دیا اور قلیج خاں کو کھمبایت کے کلیان رائے بقال کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پر بھیج دیا تا کہ وہ فرنگیوں سے پروانہ راہداری لے کر سلطان خواجہ کے جہاز کو اس پروانے کے نہ ملنے کی وجہ سے جو

وہاں لنگر ڈالے پڑا تھا روانہ کرادے اور مالوہ میں شاہی لشکر سے آکر مل جائے۔

جلوس کا تیئسواں سال

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں نوروز کا انعقاد ہوا اور جلوس کا تیئسواں سال شروع ہوا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن مالوہ کے قریب دیپالپور کے قصبے میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہوگیا تھا اور بیاور ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے جشن میں شرکت کے لیے بانس والہ کے راستے سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ ھنڈون میں سید عبداللہ خاں سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے اس راستے کو خطرناک بتایا اور مجھے لوٹا کر بجونہ لے آیا۔ چند دن شاہی امامت کی ذمے داریوں کا خیال کر کے رضوی خاں کے ساتھ گوالیار، سارنگ پور اور اجین ہوتے ہوئے 12 ذی الحج کو میں دیپال پور مالوہ پہنچا اور دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حمائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں صنائع بدائع سے مرصع نہایت عمدہ خطبے درج تھے، پیش کیے۔ یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین قندھاری کی تھیں۔ حافظ جیسا خوش الحان شخص اس زمانے میں میں نے کسی اور کو نہیں پایا۔ جس وقت بیاور کے محل کروحہ میں منزل کی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چور اڑا لے گئے تھے۔ بعد میں عبداللہ خاں نے تفتیش کر کے ان کو حاصل کیا تھا اور انھیں میرے سپرد کر دیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو یہ نذرانے میں پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر مذاقاً فرمایا ایک حمائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفے میں آئی ہے میں وہ تمھیں عطا کرتا ہوں۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اُسے نئی زندگی مل گئی ہو، جھک جھک کر تسلیمات بجالایا اور شکرانے کا سجدہ ادا کر کے عرض کیا۔ حضرت نے اسی دن عبداللہ خاں کو فرمایا تھا کہ اسے انشاء اللہ تو ہی تلاش کر کے لائے گا، آپ کی وہ بات پوری ہو کر رہی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان شخصوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت بیاور کے قصبوں میں حوض اور کنوؤں کے کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی کرتی ہے۔ انکی

مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑ کر سید عبد اللہ خاں کے پاس مخبری کر دی۔ خاں نے سب کو پکڑ لیا اور انھوں نے اپنی چوریوں کا اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے حافظ کو مخاطب کر کے کہا مطمئن رہو انشاءاللہ تمہارا دوسرا سامان بھی نکل آئے گا۔ اس نے عرض کیا میں تو صرف اس مصحف اور بیاض کے لیے فکر مند تھا، یہ آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہیں اور ان کے بغیر میں خطبے مرتب کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ بقیہ سامان کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس سفر سے واپسی میں جیسا کہ بادشاہ نے فرمایا تھا اس کا وہ سارا سامان جوں کا توں انہی بیلداروں کے پاس سے برآمد ہو گیا۔ عبد اللہ خاں نے یہ سامان فتح پور میں لا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

اسی جگہ بادشاہ نے از سر نو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتے میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کر دیا کرے معاملہ اسی قسم کا تھا کہ: "تنہا کتب میں نہیں جاتا بلکہ اسے تو لے جایا جاتا ہے۔" اس علاقہ کے انتظامات کے لیے چند دن تک دیپالپور میں قیام کیا گیا اور بعض بڑے امراء کو جیسے شہاب الدین احمد خاں وغیرہ کو مالوہ کے جاگیرداروں کے ساتھ راجہ علی خاں پر حملہ کرنے اور اس کے ملک فتح کرنے کے لیے برہانپور کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کے داغ و محلہ کا کام شہباز خاں بخشی کے سپرد کیا گیا۔ اسی منزل سے راجہ ٹوڈرمل کو اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ گجرات کی جمع بندی کی تحقیقات اور وہاں کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

راجا نارائن داس کی شکست

اسی اثنا میں خبر آئی کہ آصف خاں نے ایدر کو فتح کر لیا ہے اور راجہ نرائن داس کو شکست ہوئی ہے۔ جب قلیج خاں کو علی مراد اوزبک کے ساتھ ایدر سے دربار میں بلا لیا گیا تھا اور آصف خان کو لشکر کی سرداری پر نامزد کیا گیا تھا تو راجہ ایدر، رانا کیکا اور دوسرے زمینداروں کی مدد سے فوج اکشی کر کے ایدر سے دس کوس کے فاصلے پر تھانہ پر حملہ آور ہوا اور رات کو حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو آصف خاں، میرزا محمد مقیم تیمور بدخشی، میر ابو

الغیث بخاری اور میر محمد معصوم بھکری وغیرہ نے مشورہ کیا کہ تقریبا 500 سواروں کو تھانہ کی حفاظت پر چھوڑ کر پیش قدمی کی جائے اور راجہ پر حملہ کر دیا جائے، چنانچہ چار ذی الحج 984ھ/ 1588ء کی صبح کو یہ لوگ سات کوس کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ دوسری طرف سے راجہ نارائن داس پوری تیاریوں کے ساتھ بڑھ آیا اور دونوں فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ میرزا محمد مقیم نے جو ہراول پر مقرر تھا سب سے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور شہید ہو گیا لیکن اس کے زبردست حملے نے غیر مسلموں کے پیر بھی میدان سے اکھاڑ دیے اور وہ بُری طرح شکست کھا کر بھاگے اور پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ جب آصف خاں کا عریضہ بارگاہ میں پہنچا تو اس لشکر کے سرداروں کے نام عنایت آمیز فرمان روانہ کیے گئے۔

اسی سال میر سید محمد میر عدل نے جو بھکر کی حکومت پر مقرر ہوئے تھے میر سید ابو الفضل اور اپنے دوسرے بیٹوں کو سیہون پر حملہ کرنے بھیجا۔ ان لوگوں نے تھوڑی کی مدت میں اس قلعے کو فتح کر لیا۔ میر سید ابو القاسم ولد میر سید صفائی جو بھکر کے سربرآوردہ آدمی ہیں۔ دربار میں حاضر ہوئے ان کو احدیہ کا منصب عطا کیا گیا۔

شریف آملی کی آمد

انہی دنوں شریف آملی دیپال پور کے علاقے میں آکر باریاب ہوا۔ یہ مردود اور نابکار پاگل کتے کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا پھرتا تھا اور ہمیشہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تھا۔ بڑے مباحثے اور مجادلے کرتا رہتا تھا، انجام کار اس نے سارے اعتقادات ترک کر کے الحادو بے دینی کو اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ عرصے تک صوفیوں کے بھیس میں بلخ میں مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے پوتے مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا۔ اس کو درویشی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا اس لیے وہ وہاں ہمیشہ درویشوں کو اپنی ہرزہ سرائی اور نوک جھونک سے پریشان کرتا رہتا تھا تنگ آکر ان لوگوں نے اسے خانقاہ سے نکال دیا۔

بلخ سے نکلنے کے بعد وہ سیر و سفر کرتے ہوئے دکن جا پہنچا، وہاں کے لوگ بھی جب

اس کی خباثتوں سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس کا قصہ ہی پاک کر دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن ترس کھا کر اسے بس اتنی سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے بڑی رسوائی کے ساتھ اس کی تشہیر کرا دی۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں، ہر شخص جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے اس لیے وہ بھی دکن سے نکل کر آزادی کے ساتھ گھومتا پھرتا اسی زمانے میں مالوہ پہنچ گیا اور لشکر سے پانچ کوس کے فاصلے پر اپنا ٹھکانا بنایا اور طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا اور نہایت زہریلے خیالات پھیلانے لگا۔ اس کی مجلس میں جاہل عوام حاضر ہونے لگے، خاص طور سے عراقیوں کا اس کے پاس مجمع لگا رہتا تھا۔ یہ عراقی تو ایمان سے ایسے نکلے ہوئے ہیں جیسے مکھن سے بال نکل آتا ہے، دجال نکلے گا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرنے والے بس یہی عراقی ہوں گے۔ اس بدبخت نے ان عراقیوں کے ذریعے یہ شہرت کی کہ وہ دسویں صدی کا مجدد ہے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اس کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے ایک رات اسے اپنی مجلس میں بلا بھیجا اور قناتوں کی بنی ہوئی اس طویل مسجد میں جس میں پانچ وقت نماز ادا کی جاتی تھی اکبر نے اس سے خلوت میں باتیں کیں۔ جب وہ آیا تو اپنی مضحکہ خیز شکل، ناگوار ہیئت کذائی اور ٹیڑھی گردن کے ساتھ جھک کر کورنش(49) ادا کی اور کافی دیر تک ہاتھ باندھے ہوئے اپنی کنجی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے جو حضور اکرمؐ کی دشمنی کی نشانی ہے کھڑا رہا۔ اس کے سراپا سے جھوٹ، ریاکاری اور منافقت نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب بادشاہ نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو سجدہ کر کے اونٹ کی طرح دوزانو بیٹھ گیا۔ اکبر اس کے سامنے جا بیٹھا اور تنہائی میں باتیں کرنے لگا۔ سوائے حکیم الملک کے اس جگہ کسی اور کو کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دور سے کبھی کبھی اس کی آواز بلند ہوتی تھی۔ میں نے بس "علم" کا لفظ سنا۔ غرض اس نے بڑی خرافات بکیں اور انھیں حقائق اور اصل الاصول بتاتا رہا:

قومی نہ ز ظاہر نہ ز باطن آگاہ　　آنکہ ز جہالت بہ لطافت آگاہ
مستغرق کفرند و حقیقت گویند　　لا حول و لا قوۃ الا باللہ

شریف آملی کا مسلک محمود پسی خوانی کے مسلک کی نقل تھا۔ اس محمود نے امیر

تیمور صاحبقران کے زمانے میں گیلان کے ایک گانو پسی خوان میں ظہور کیا تھا۔ اس نے 13 منحوس رسالے لکھے تھے جو ہر طرح کے زندقے سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک رسالہ کا نام "خیال" تھا، جسے اس نے "علم لفظ و حال" کا نام دیا ہوا تھا۔ اس بد بخت کی تمام تصانیف کا خلاصہ "بحر و کوزہ" نامی ایک کتاب تھی۔ جو غلاظت اس کتاب میں اس نے جمع کی ہے اس کو سن کر ہی قے ہونے لگتی ہے۔ اگر شیطان اس کو سن لے تو مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ اس شریف کثیف نے بھی کمالات کا ایک مجموعہ بنا رکھا تھا جسے "ترشح ظہور" کا نام دیے ہوئے تھا۔ اس کتاب کی ترتیب اس نے میر عبد الاول کے مجموعے کی طرح رکھی تھی کہ اسکے ہر نامربوط عام فریب فقرے کا عنوان اس لفظ کو رکھا گیا ہے جس سے وہ فقرہ شروع ہوتا ہے۔ غرض یہ کتاب نہایت مضحکہ خیز تھی۔

خدا کی شان دیکھیں کہ باوجود اس جہالت کے اس مکار نے اس طرح لوگوں پر اپنی فضیلت کا سکہ جمایا کہ اب وہ ہزاری منصب دار بنا بیٹھا ہے اور بنگالہ میں "مذہب حق" کا داعی مقرر ہوا ہے۔ بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے شاہی مراتب کی نیابت کرتا ہے۔ ان مراتب کا ذکر آگے آئے گا:

یار بودم قطبک امسال قطب الدین شدم
گر بمانم سال دیگر قطب دین حیدر شدم

فتح پور واپسی

جب اس علاقے کے سارے انتظامات حسب منشا تکمیل پا گئے تو بادشاہ وہاں سے مسلسل کوچ کرکے سیر و شکار کرتے ہوئے رتھنبور کے راستے سے 23 صفر 985ھ/1576ء کو فتح پور پہنچے۔ اس موقعے پر شیخ فیضی نے جس کو اب ملک الشعراء کا خطاب مل چکا ہے، ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے:

نسیم خوش دلی از فتح پور می آید
کہ پادشاہ من از راہ دور می آید

مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ

دو تین ماہ بعد گجرات میں غدر کی اطلاع ملی۔ اس مرتبہ جب راجہ ٹوڈرمل گجرات کے لیے مقرر ہو کر گیا تو مظفر حسین ولد ابراہیم حسین مرزا جو مرزا کامران کا نواسا تھا اور اس کو اس کی ماں گلرخ بیگم سورت کے محاصرے کے وقت دکن لے کر چلی گئی تھی۔ چند اوباشوں کی جمعیت لے کر گجرات میں فتنہ و فساد مچانے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ سولہ سال تھی، اسے بہکانے والا اصل میں مہر علی نامی ایک شخص تھا جس نے میرزا ابراہیم کے پاس پرورش پائی تھی۔

مرزا مظفر حسین نے گجرات پہنچ کر بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اس کے مقابلے پر شریف محمد خاں اتکہ کا لڑکا باز بہادر اور گجرات کا دیوان بابا بیگ پرگنہ چکلاد میں پہنچے۔ مرزا نے ان کو شکست دی اور کھمبایت تک جا پہنچا۔ اب اس کے پاس دو تین ہزار سوار تھے وزیر خان حاکم گجرات کے پاس بھی تین ہزار سوار تھے لیکن اسے اپنے سپاہیوں پر پورا بھروسہ نہ تھا، اس لیے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے وہ قلعے میں بند ہو گیا اور راجہ نے احمد آباد کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کی آمد پر میرزا احمد آباد سے ہٹ کر دولقیہ کی طرف چلا گیا۔ وزیر خاں اور راجہ نے اس کا پیچھا کیا۔ اس مقام پر فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ باغی شکست کھا کر جوناگڈھ کی طرف نکل گئے۔ اسی زمانے میں راجہ فتح پور واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کی خبر سن کر مرزا مظفر حسین نے دوبارہ جوناگڑھ سے نکل کر احمد آباد پر حملہ کیا اور وزیر خاں پہلے کی طرح قلعے میں محصور ہو گیا۔ میرزا نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی فوج قلعے کی دیوار پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ لوگ قلعے کو فتح کر لیتے لیکن عین اس وقت ایک گولی مہر علی کے سینے میں آ کر لگی۔ مہر علی، مرزا کا وکیل مطلق اور روح رواں تھا۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی میرزا بدحواس ہو کر میدان سے بھاگ نکلا اور سلطان پور اور ندر آباد کی طرف چلا گیا۔

راجہ علی خاں سے مصالحت

بادشاہی فوج کے ان امیروں نے جو شہاب الدین احمد خاں کی سرداری میں برہان پور پر

فوج کشی کے لیے بھیجے گئے تھے حملہ کر کے راجہ علی خاں کو قلعے میں محصور کر دیا تھا اور اس کی ساری مملکت کو تاراج کر دیا تھا۔ قلعے کے فتح ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن محاصرے کے دوران قطب الدین محمد خاں کا امراء سے اختلاف ہو گیا اور وہ ناراض ہو کر اپنی جاگیر بھڑوچ اور بڑودہ کی طرف چلا گیا، جہاں مرزا مظفر نے غارت گری کر کے بڑا انتشار پھیلا دیا تھا۔ اس کے اس طرح محاذ سے چلے جانے کی وجہ سے برہان پور کی مہم میں بڑی دقتیں پیدا ہو گئیں۔ امرائے شاہی نے مصلحت یہی سمجھی کہ راجہ علی خاں سے معقول نذرانے وصول کر کے دربار میں بھیج دیں اور اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ جائیں۔

حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی

انہی دنوں حکیم عین الملک شیرازی جو 983ھ/1575ء میں حاکم دکن عادل خاں کے وکیل کے ہمراہ سفارت پر گیا تھا، واپس آ گیا اور عادل خاں کے دیے ہوئے عمدہ ہاتھی اور قیمتی تحائف نذر میں پیش کیے۔ جب بانس بریلی کی فوجداری سے دیپ چند راجہ منجھولہ کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنا دیا گیا، اس نے وہاں سے ایک طویل عریضہ لکھا اور باتوں کے علاوہ اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ: ''جب سے میں دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس جنگل بیابان میں میرے ساتھ کوئی ہم خیال دوست نہیں ہے، اگر جناب والا فلاں شخص کو (یہاں اُس نے میرا نام لکھا تھا، یعنی مؤلف منتخب التواریخ) جو اس علاقے کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہاں کے لوگوں کو اس پر بھروسہ و اعتماد بھی ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمے کوئی اہم خدمت نہیں ہے، میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندہ درگاہ پر بھی احسان ہوگا''۔ بادشاہ کے حکم سے خواجہ شاہ منصور اس خط کے ایک ایک فقرے کو پڑھتا جاتا تھا اور حسب تجویز اس کا جواب لکھتا جاتا تھا۔ جب وہ مذکورہ فقرے پر پہنچا تو بادشاہ نے ''ہاں'' کہا یا ''نہ'' پتہ نہیں۔

حج کے لیے قافلے کی روانگی

985ھ/1577ء، رجب ماہ میں خواجہ صاحب کے عرس کا زمانہ ہے، بادشاہ نے اجمیر کا عزم

کیا۔ جب سواری توڈہ پر پہنچی تو شاہ ابوتراب جو شیراز کے بڑے بزرگ اور سلاطین گجرات کے پیر تھے، ملنے کے لیے آئے اور راجہ ٹوڈرمل بھی جو مرزا مظفر حسین کو شکست دینے کے بعد واپس ہو رہا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ میرٹھ کے قریب بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرا دی کہ جو بھی چاہے اس قافلے کے ساتھ حج کے لیے جا سکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی صدر سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی آپ بادشاہ سے اجازت لے لیجیے تو اس نے پوچھا ”کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟“ میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تمہارا کوئی بھائی بند ایسا ہے جو ان کی خدمت کرتا رہے، میں نے کہا: ”نہیں“ صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ شیخ نے فرمایا اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہوگا۔ غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں:

نکرد لطف تو کاری و وقت کار گزشت
نشد وصال تو روزی و روزگار گزشت

منوہر پور کی تعمیر

انبیر کے موضع سولتان میں جو ایک قدیم شہر ہے اور اس وقت بالکل کھنڈر بنا ہوا تھا، بادشاہ کی سواری پہنچی تو اس نے وہاں شہر کی اور ایک بلند قلعے کی تعمیر کا حکم دیا قلعے کے دروازے اور باغ کی تعمیر کی ذمہ داریاں امرا کے سپرد کی گئیں۔ بادشاہ نے اس کی تعمیر میں اس توجہ سے اہتمام کیا کہ سانبھر کے حاکم رائے منوہر ولد رائے لونکرن کے نام پر اس کا نام منوہر پور تجویز کیا گیا۔ رائے منوہر کو مرزا منوہر بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے شاہزادوں کے ساتھ تربیت پاتا رہا تھا، ایسا ہنرمند اور باکمال نکلا کہ اب بڑے اچھے شعر کہہ لیتا ہے اس کا تخلص توسنی ہے۔

یہاں سے بادشاہ سلامت نے نارنول کے راستے دہلی کا ارادہ کیا اور شیخ نظام نارنولی

سے جو مشائخین عظام میں سے ہیں، ملاقات کی۔ دہلی میں پہلے تو بادشاہ نے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی پھر پالم میں شکار کھیلتے رہے۔

بساور کو روانگی

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں میرے پاس بساور سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرفی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا تیرے باپ اور دادا کا نام کیا ہے؟ عرض کیا ملوک شاہ ولد حامد، بادشاہ نے فرمایا: ''اپنے اس بچے کا نام عبدالہادی رکھو''ہادی'' کا کلمہ اس زمانے میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا''۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے۔ انھوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ یہ فضول خیال چھوڑ دو اور حافظوں کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچے کی درازی عمر کے لیے قرآن کا ختم کراؤ۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ آخرکار وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس جگہ سے پانچ مہینے کی رخصت لی اور بساور چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جا سکا اور بساور میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور لوگوں کی مخالفتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بادشاہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے اور اب جب کہ اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں اسی معمولی خدمت سے چمٹا ہوا ہوں کہ نہ رہتے بنے نہ بھاگے:

صبری نہ کہ   از عشق بپرہیزم من
بختی نہ کہ   با دوست در آمیزم من
دستی نہ کہ   با قضا در آمیزم من
پائی نہ کہ   از میانہ بگریزم من

جس وقت بادشاہ پنجاب کی طرف متوجہ تھے، ہانسی کے علاقہ میں شیر بیگ تواچی کا عریضہ پہنچا کہ مظفر حسین مرزا گجرات سے بھاگ کر دکن چلا گیا ہے، وہاں اسے راجہ علی خاں نے

گرفتار کر کے قید کر دیا ہے۔ بادشاہ نے یکم ذی الحج 985ھ/1577ء کو مقصود جوہری کے ہاتھ رشید علی خاں کے نام ایک فرمان بھیجا کہ وہ میرزا کو دربار میں روانہ کر دے۔

چوبیسواں سال جلوس

پہلی محرم 986ھ/1578ء کو نوروز ہوا اور جلوس اکبری کا چوبیسواں سال شروع ہو گیا۔

اکبر پر ایک خاص کیفیت کا ظہور

بادشاہ نے پٹن میں حضرت گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور نندنہ کے نواح میں قمرغہ کے شکار کا ارادہ کیا۔ چار دن تک برابر جانوروں کو ہانکا گیا، جس وقت دونوں طرف سے ہانکے کے جانور شکارگاہ میں آ کر جمع ہو گئے اور بادشاہ شکار کے لیے چلے تو اچانک بادشاہ پر ایک عجیب غیر معمولی حالت طاری ہو گئی اور ان کی ظاہری حالت کچھ اس طرح متغیر ہو گئی کہ اس کی تعبیر کسی طرح ممکن نہیں لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی وقت بادشاہ نے شکار بند کر دینے کا حکم دے دیا:

ہشدار کہ فیض حق بنا گاہ رسد
ناگاہ رسد بر دل آگاہ رسد

بادشاہ نے اس درخت کے نیچے جہاں یہ کیفیت وارد ہوئی تھی فقیروں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی اور وہاں ایک عمدہ عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ سر کے بال ترشوائے۔ بہت سے مصاحبین اس کیفیت و حالت کی بڑھ چڑھ کر تصدیق و تائید کرنے لگے۔ جب یہ خبر مشرقی ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور رعایا میں بڑی ہلچل سی پیدا ہو گئی لیکن کچھ عرصے بعد حالات اعتدال پر آ گئے۔

مدد معاش کا نیا قانون

بہیرہ کی اقامت میں دارالخلافہ سے بیگم بادشاہ لشکر میں تشریف لائیں۔ بادشاہ نے پنجاب

کی حکومت سعید خاں مغول کو تفویض کی۔ میر قاضی حسین میبدی کے پوتے علی بغدادی کو پنجاب کے اماموں کی مدد معاش سے متعلقہ آراضیات کے عمل دخل اور اس سلسلے کے دوسرے کاموں پر مقرر کیا گیا، نیز قدیم محالات کو منسوخ کر کے باقاعدہ پیمائش کی جائے اور تمام اماموں کو ایک ہی گاؤں کی آراضیات میں حصہ دار بنا دیا جائے۔ اس نئے انتظام سے تمام ممالک محروسہ کے اماموں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ یہ سب شیخ عبدالنبی کی ضد میں ہوا اور اس میں اس کے کارندوں کی بد دیانتی کا بھی بڑا دخل ہے۔

بادشاہ کی فتح پور کو واپسی

یہاں سے بادشاہ نے فتح پور کو واپسی کے لیے کوچ کیا اور 3 جمادی الثانی کو خضر آباد سادھورہ کے قریب بادشاہ کشتی پر سوار ہوگئے۔ امرا اور عہدے دار بھی ان کے ساتھ کشتیوں پر ہی روانہ ہوئے۔ لشکر نے خشکی کے راستے کوچ کیا۔ اسی مہینے کی 29 تاریخ کو سواری شاہانہ دہلی میں داخل ہوئی اور یکم ماہ رجب کو کشتی سے اتر کر بادشاہ اونٹ پر سوار ہوئے۔ اسی مہینے کی چھ تاریخ کو اجمیر پہنچ کر عرس میں شرکت فرمائی اور دوسرے ہی دن دارالخلافہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ اس تیزی سے سفر کیا کہ روزانہ پچاس کوس کا دھاوا مارتے ہوئے نویں رجب کو بروز جمعہ صبح کے وقت تودہ کی منزل پر آ کر قیام فرمایا۔ میں بساور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں حاضر ہوا اور ایک کتاب "چہل حدیث"۔ (50) جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی ہے، خدمت عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانے میں داخل کرادی اور میری وعدہ خلافی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ فتح پور پہنچ گئے۔

عبادت خانے میں علماء کے ہنگامے

فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانے میں علما کی محفل میں گزرتے تھے، خاص طور سے جمعہ کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں اور دینی مسائل کی تحقیق

اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں علما کی زبانیں ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواروں کی طرف خوب اپنے جوہر دکھاتی تھیں۔ مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہوگئے کہ ایک دوسرے کی تکفیر دھڑلے سے کی جانے لگی۔ سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہہ وحکیم کے موازنے و مقابلے سے گزر کر اصول و مہمات دین پر بھی زبانوں کی چھریاں بے باکی سے چلنے لگیں۔

علما کے جھگڑے اور اکبر کی بے دینی

انھی دنوں مخدوم الملک نے شیخ عبد النبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ دیا تھا جس میں خضر خاں شروانی کو جس پر حضور اکرمؐ کے خلاف بد زبانی کا الزام لگایا گیا تھا اور میر حبش کو جس پر رفض کا الزام تھا، ناحق قتل کرادیا۔ لہٰذا اس کے پیچھے نماز نہیں ہوسکتی، اس لیے بھی کہ اس کے باپ نے عاق کردیا تھا اور وہ خود خونی بواسیر کے عارضے میں مبتلا ہے۔ شیخ عبدالنبی نے بھی اس کی جہالت اور گمراہی ثابت کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ درباری ملاؤں میں سے کچھ اِس طرف اور کچھ اُس طرف ہوگئے اور ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بتانے لگے۔ علما کے ان اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حقائق کو مسخ کرکے بادشاہ کو، جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا، لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علماء کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا، اصل دین ہی سے پھیر دیا اور دین و شریعت کی بنیادوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ان پانچ چھ سالوں میں اسلام کا نام تک نہیں رہا اور وہ ساری بساط چوپٹ ہوکر رہ گئی۔

اکبر کی بے دینی کا آغاز

جیسا کہ بیان ہوچکا ہے علما کے باہمی اختلافات اور ملحدوں کی مداخلت کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں اسلام اور علمائے اسلام کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔ کچھ تو اکبر کی طبیعت اور کچھ

حالات کا تقاضا، بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ بادشاہ نے بہت جلد سارے مسلمہ اعتقادات سے منکر ہوکر الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کرلی۔ بچپن سے عہد جوانی اور جوانی سے اس پختہ عمری تک اکبر کی کچھ ایسی ہی ڈانواڈول روش تھی وہ کبھی ایک نظریہ اور اعتقاد کا پابند نہیں رہا۔ طبیعت میں تحقیق و تجسس کا جذبہ تھا جسے بدعقیدہ مصاحبوں نے غلط رخ پر پھیر دیا۔ ابتدا میں تو صرف طلب حق کا سچا جذبہ تھا، چنانچہ اسی جذبے کے تحت اکبر ہر دین اور مذہب کے معتقدات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس موقعے پر علما نے اپنی ناسمجھی کا ثبوت دیا کہ بجائے یہ کہ وہ بادشاہ کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے اپنے اعزاز و مرتبے کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنے لگے۔ ایک ہی مسئلے کو جب علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا تو بادشاہ نہایت حیران اور اُن کی بحثوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔ دربار میں مختلف مذاہب و مسالک کے جو گمراہ کن عناصر جمع ہوگئے تھے انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کرکے اس کے ذہن کو انکار و انحراف کی طرف مائل کردیا۔ یہ سب کس طرح ظہور میں آیا اس کی بڑی تفصیلات ہیں۔

بے دینی کے محرکات اور اسباب

اس زمانے میں دربار شاہی میں تقریبا ہر ملک کے اہل علم اور مفکر موجود تھے اور مختلف مذاہب کے عالم اور رہنما بھی جمع ہوگئے تھے۔ یہ لوگ رات دن مختلف علوم و نظریات پر تبادلہ خیال اور طرح طرح کی نکتہ چینی میں معروف رہتے تھے۔ بادشاہ کو بھی فتوحات و مہمات کی طرف سے پوری فرصت تھی، اس لیے وہ بھی مشغلوں میں اپنے اوقات صرف کیا کرتا تھا اور جو اصول و کلیات اسے پسند آجاتے خواہ وہ مسلمانوں کے معتقدات کے موافق ہوتے یا مخالف، انھیں وہ دل و جان سے قبول کرلیتا تھا اور جو باتیں اس کی نگاہ میں نہیں بھاتی تھیں، ان کو وہ ترک کردیتا تھا۔ اس طرح اس نے ترک و اختیار اور ردّ و قبول کے ایک خاص شعور اور جداگانہ معرفت کو اپنا معیار بنالیا اور عجیب طرح کے ہیولائی اعتقادات نے اس کے ذہن پر غلبہ پالیا۔

وحدت ادیان کا تصور

مجموعی طور پر ایک خیال اسکے ذہن پر پتھر کی لکیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم و دانش تمام مذاہب میں موجود ہیں اور ہر قوم و ملت میں عبادت گزار صاحبان کشف و کرامت کی کی نہیں رہی ہے اس لیے حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس لیے حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں محدود و منحصر کر دینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور نو پیدا ہو اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس صورت میں ایک دین کا انکار اور دوسرے کا اقرار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول و مناسب نہیں ہوسکتا۔

بادشاہ کے اس خیال کو وہ ملحد اور برہمن حسب موقع پختہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ان دنوں شاہی محفلوں اور خلوتوں میں پیش پیش نظر آتے تھے اور بہ لحاظ علم و دانش علوم رسمی اور انسانی احوال و نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات پر عقلی اور نقلی استدلال کر کے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور نظریات کو اس طرح بدیہیات بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبر کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ حشر و نشر اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے، معتبر اور قابل قبول نہ رہیں۔ دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین میں شدید اختلافات ہیں علم کلام کی کتابوں میں ان کے معارضے اور مجادلے درج ہیں۔ حریفوں نے چن چن کر ان کو ایک خاص زاویے سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اپنے اپنے مسلک و مذہب کی طرف اسے کھینچ لے جانے کی کوشش کی:

میداد رقیب آن سہی قد را پند — کاندر رخ ہر کس چو گل از باد خند
از حد چو بشد نصیحت آن شوخ گرہ — بر گوشہ ابرو ز دو سر پیش افگند

عقیدۂ تناسخ کا قرار

سب سے پہلے اکبر نے پرکھوتم(51) نامی برہمن کو جو "نامہ خرد افزا" کی ترجمانی پر مقرر تھا، تنہائی میں بلا کر موجودات اور اشیاء کے ہندی اسماء معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں حاضر ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ایک چارپائی کو رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکے کے برابر لگا دیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنی دیو مالا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دیوی برہمن ان مترجمین میں ملازم تھا جو "مہابھارت" پر کام کر رہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی کے طریقے، آگ اور آفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے اور مشرک بادشاہوں اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی (جن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں) کی عظمت و احترام پر دلیلیں پیش کیں۔ اس کے اپدیش بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے اور وہ عقیدہ تناسخ پر عقیدہ لے آیا۔ خوشامدی درباری کہاں پیچھے رہتے وہ بھی تناسخ کے اثبات و صحت پر رسائل لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں دوڑ لگانے لگے۔ بادشاہ ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیق کی طرف جن کے ہندوستان میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک فرقہ بے شمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے باوجود بدبخت اہل کتاب نہیں ہیں بہت زیادہ قائل ہو گیا۔ ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز منظر عام پر آنے لگے۔

وحدت الوجود کا اثر

انہی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجودھنی دہلوی بھی جن کو اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے ہیں۔ خلوت گاہ میں بار یاب ہوئے، وہ شیخ زمان(52) پانی پتی کے شاگرد تھے جو بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شرح لوائح" کافی مشہور ہے۔ کتاب "نزہۃ الارواح" پر بھی انھوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ علم تصوف اور علم توحید میں وہ ثانی

شیخ ابن عربی سمجھے جاتے تھے۔ تاج الدین بھی راتوں میں معلق چارپائی پر اوپر جا کر رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور مزعومات سنایا کرتا، وہ چونکہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود کا پکا معتقد تھا جس کا نتیجہ سوائے الحاد اور اباحت کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ اس نے وحدت الوجود کے اس خطرناک نظریے اور ''فصوص الحکم'' کے دوسرے مسائل مثلاً ترجیح رجا بر خوف اور ''ایمان فرعون'' وغیرہ بخوبی بادشاہ کے ذہن نشین کرا دیے۔ تصوف کے ان نظریات کا بھی اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بیزاری میں بہت بڑا دخل ہے، چنانچہ اس کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوگا۔ شیخ تاج الدین نے اس مسئلہ کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے خوب تاویلیں کر کے بخوبی باور کرا دیا تھا اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کو ان بھول بھلیوں میں اچھی طرح سرگشتہ کرا دیا تو اس نے اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا نکال کر سامنے رکھا۔

انسان کامل کا تصور

شیخ نے اکبر کے سامنے ''انسان کامل'' کا ایک تصور پیش کیا اور پھر اس انسان کامل کو خلیفہ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا۔ انسان کامل کے درجہ تو صرف عین واجب یعنی ذات خداوندی کا ہی ہے، اس لیے شیخ کی کمند انسان کامل سے گزر کر عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی ناچتے کو نچانے والے تھے۔ انھوں نے باتوں کے طوطا مینا بنائے اور خوب شگوفے چھوڑے۔ بس کیا تھا طرح طرح کی خرافات اور اختراعات شروع ہو گئیں چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام ''زمین بوس'' رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو ''کعبہ مرادات'' اور قبلہ حاجات قرار دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی بھی تو ہندوستان کے بعض مشائخین کے ساتھ ان کے مریدوں کے عمل کو پیش کر کے اس کا منھ بند کر دیا گیا۔

خیر وشر کی وضاحت

ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہمنوا بھی اس تگ وتاز میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ شیخ یعقوب بھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے عہد کے مقتدا اور پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے قاضی ہمدانی کی ''تمہیدات'' سے بعض باتیں لے کر ان سے یہ فلسفہ ترتیب دیا کہ محمد ﷺ، اللہ کے اسم ''الہادی'' کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم ''المضل'' کا مظہر ہے۔ اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انھی دو اسماء کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ (مفہوم یہ تھا کہ چونکہ خیر و شر من جانب خدا ہیں اس لیے دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے)

شیعیت کی چھاپ

مذکورہ بالا ''خلوت معلق'' کے بلند پروازوں میں ملا محمد یزدی بھی تھا وہ اپنے اعتقاد کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے خلاف طنز وطعن کر کے اور عموم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف و علمائے خلف سب کو کافر بتاتا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گھٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ بجز شیعہ کے، سب کو اس نے گمراہ کر کے دکھادیا اور اکبر کے خیالات پر شیعیت کی بھی اچھی خاصی چھاپ پڑ گئی۔

اس صورت حال سے پہلے اکبر کے دل پر علما کا بڑا اثر تھا، یہاں تک کہ وہ ان کو بلحاظ رتبہ وعظمت امام غزالیؒ اور رازیؒ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا لیکن جب ان عالموں کی رکیک حرکتیں اس کی نظر میں آئیں اور ان کے تحریم وتکفیر کے مناقشوں سے وہ سخت متنفر ہوا تو اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ ان جھگڑالو عالموں اور قاضیوں کی عظمت ہی گر گئی بلکہ ان پر قیاس کر کے وہ بزرگان سلف کا بھی منکر ہوگیا۔

عقیدۂ تثلیث کا اثبات

اسی زمانے میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد ورفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو

پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو "پاپا" کہتے ہیں، جسے مصلحت اور وقت کے لحاظ سے امور دین میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائی پادری بھی بادشاہ کی عنایت کی نظر سے نوازے گئے تو انھوں نے انجیل پیش کی اور عقیدہ ثالث ثلاثہ (عقیدۂ تثلیث) کے حق ہونے پر مباحثے کرتے رہے۔ اکبر نے جو اپنے زعم حق پرستی میں دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، نصرانیوں کو بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیا۔ ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسوی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شاہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابوالفضل کو انجیل کے ترجمے کے لیے حکم دیا گیا، اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا!

"ای نامی وی ژژو کرستو"

شیخ فیضی نے قافیہ پر ردیف چڑھائی اور دوسرا مصرع کہا:

"سبحانک لا سواک یا ھو"

ان ملعون عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے دجال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم ﷺ کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ (اے اللہ معاف کر، یا اللہ پناہ دے)

آفتاب پرستی کا آغاز

بیربر ملعون بھی ایک وس کی گانٹھ تھا، اس نے آفتاب پرستی سے اکبر کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کیا کہ آفتاب ہی مظہر کامل اور سرچشمہ سعادت ہے اس کی تاثیر سے غلہ پکتا ہے، کھیتیاں لہلہاتی ہیں، پھلوں میں رس اور سبزہ میں تراوت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی روشنی اور دنیا والوں کی زندگی آفتاب ہی سے وابستہ اور متعلق ہے۔ اس لیے وہی ایک ایسا وجود ہے جس کی عبادت اور تعظیم ہونی چاہیے۔ پرستش کے لیے اس کے طلوع کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غروب کی طرف جو زوال کی نشانی ہے۔ آفتاب پرستی کے ذیل میں

اس نے آگ، پانی، پتھر، درخت اور تمام مظاہر عالم یہاں تک کہ گائے، اس کے گوبر، قشقہ اور زنار کے تقدس کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بادشاہ جب ان باتوں کی طرف مائل نظر آئے تو دربار کے بدبخت حکما اور فضلا بھی چراغ دکھانے لگے کہ آفتاب ”نیر اعظم“ ہے۔ ”عطیہ بخش ہمہ عالم ہے، مربی بادشاہان ہے“۔ غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نوروز جلالی کی تعظیم بڑے اہتمام سے کی جانے لگی چنانچہ ہر سال اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا اور سات سیاروں میں سے ہر سیارے کے رنگ کے مطابق روزانہ ایک رنگ کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ برہمنوں نے تسخیر آفتاب کا ایک عمل بتا دیا تھا وہ اس کا وظیفہ نصف شب کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔ اس نے گائے کا ذبیحہ بند کرا دیا۔ اس کے گوبر کو پاک سمجھنے لگا اور گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا۔ گاؤ کشی کی سزا میں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کرا دیا گیا۔ طبیبوں نے بھی گاؤ کشی کے خلاف نسخہ آرائی کے جوہر دکھائے اور گاؤ زبانی کی کہ علم طب کی رو سے گائے کا گوشت طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہے اور ہاضمے کو خراب کرتا ہے۔

آتش کدے کا قیام

دربار میں گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کی راہ و روش کے قصے بیان کر کے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطین عجم کی طرح جو اپنے آتش کدے کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتا تھے، ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہنی چاہیے۔ کیونکہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا پرتو ہے۔ اس آتش کدے کا انتظام شیخ ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

اکبر اپنی جوانی کے زمانے ہی سے ہندوستانی راجاؤں کی لڑکیوں کی صحبت میں ہوم (ہون) کیا کرتا تھا جو ہندوؤں کی آتش پرستی کی ایک پوجا ہے۔

آفتاب اور آگ کی پرستش

حکومت کے پچیسویں سال کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کے سجدہ کا اعلان کیا۔ مصاحبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے۔ سنبلہ کی آٹھویں عید کے دن اکبر ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ (تلک) لگا کر دولت خانے میں آیا اور جواہرات پروئی ہوئی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ پر تبرک کی خاطر بندھوائی اور امراء نے حسب مدارج مروارید اور جواہرات اس دن نذر گزارے اور اس توہم پرستی کی عملاً وقولاً تائید و حمایت کی۔ بادشاہ نے راکھی بندھوانی بھی شروع کردی۔ غرض اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے تھے اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا تھا اور امت مسلمہ کے تمام احکام خلاف عقل تھے جن کو عرب کے سرپھروں اور رہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان احکام کو ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو گئے تھے۔ کیا کہا جائے مختصر یہ کہ **"یریدون یسطفو و بافواھھم و اللہ متم نورہ و لو کرہ الکافرون"** (وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، اللہ نے اپنے نور کی تکمیل کردی ہے اگرچہ کافروں کو یہ بات بڑی ناگوار ہے)

بتدریج یہ بے دینی اور بد اعتقادی اس انتہا پر پہنچ گئی کہ احکام شریعت اور اسلام کی تردید و تنسیخ کے لیے کسی دلیل اور تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہی، جب جی چاہتا کسی بھی حکم کو اعلانیہ ترک کردیا جاتا۔

ابوالفضل کی بے دینی

مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانۂ خاص میں شیخ ابوالفضل سے میری[53] گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ "مجھے تمام مصنفوں سے ایک شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے واقعات تو نہایت تفصیل سے سن وار لکھے ہیں اور پچھلے پیغمبروں کا حال اس تفصیل سے نہیں لکھا۔ میں نے جواب دیا "نبیوں کے تذکرے میں متعدد "قصص الانبیاء" لکھی گئی ہیں۔ اس نے کہا "نہیں وہ بہت مختصر ہیں

تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی"۔ میں[54] نے کہا اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ انبیا کے زمانے کو کافی طویل عرصہ گزر گیا تھا اس لیے مفسرین ارباب تاریخ و سیر نے وہی باتیں لکھیں جو ان کے نزدیک تحقیق شدہ تھیں، جن کا ثبوت ان کو نہیں ملا اسے چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے کہا "یہ کوئی جواب نہیں ہوا"۔ پھر اس نے ایک بات چھیڑ دی کہ "تذکرۃ الاولیا" اور "نفحات الانس" اور ان جیسی دوسری کتابوں میں ہر پیشہ اور گروہ کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن معلوم نہیں اہل بیت سے کیا قصور ہوا تھا کہ ان کتابوں میں ان کا ہی تذکرہ نہیں ہے۔ کیا یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے"۔ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ مناسب تھا کہا لیکن سمجھتا کون ہے؟ آخر میں نے اس سے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟ اس نے کہا "میں تو ابھی چند دن الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں"۔ میں نے مذاقاً چھیڑتے ہوئے کہا: "نیک ارادے ہیں، بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو"۔ جیسا کہ مشہور ہے:

برداشت عقل شرع بتائید ایزدی
از گردن زمانہ علی ذکرہ السلام

میری بات پر وہ ہنس پڑا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ابوالفضل کی گستاخی

ابوالفضل کو شاہی حمایت حاصل تھی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے "یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ" جسے پیا چاہے وہ سہاگن" والا معاملہ تھا۔ اس لیے وہ ان بد اعتقادیوں کے بارے میں شیخ صدر، قاضی، حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے بوڑھوں کو بڑی جسارت سے چھیڑ چھیڑ کر بحثیں کیا کرتا تھا اور ان کی بے عزتی کرنے میں ذرہ برابر بھی نہیں جھجکتا تھا۔ بادشاہ اس کی لن ترانیوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔

بوڑھے علما نے عاجز آ کر ایک مرتبہ آصف خاں میر بخشی کے ذریعے خفیہ طور پر ابوالفضل کو کہلوایا کہ "تم آخر کس وجہ سے ہمارے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے رہتے ہو؟" اس

نے جواب دیا، بس یہ مثل سمجھو "میں بیگن کا نہیں بادشاہ کا نوکر ہوں"۔ غرض اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ان عالموں کو اپنی ذہانت، باپ کی معاونت اور بادشاہ کی پشت پناہی اور بخت کی یاوری سے ایک ایک کرکے ذلیل و خوار کردیا اور کوئی مسلمان عالم سوائے حکیم ابو الفتح اور ملا محمد یزدی کے جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے، اس کے سامنے فروغ نہ پاسکا اور اہل علم کی ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

دربار سے کنارہ کشی

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشۂ عزلت اختیار کرلیا اور درباداری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا۔ بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں اور غیریت کا پردہ درمیان میں آگیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس حال ہی میں خوش رہا ہوں:

دل در تگ و پو نشد نیکو شد کہ نشد　　جز در تو فرو نشد نیکو شد کہ نشد
سعی کہ بہ نجم از نیکو شد کارت　　دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

میں اپنے آپ کو کسی رعایت کے قابل سمجھتا تھا نہ ان کی خدمت کے لائق:

بیا تا تکلف بہ یک سو نہیم
نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی دور ہی سے آستانے پر کورنش بجالاتا تھا اور اہل محفل کا تماشا دیکھتا رہتا تھا:

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است
صحبت گذاشتم ز تماشائیان شدم

میں نے اوپر جتنے حالات بیان کیے ہیں ان کی جزئیات اور تفصیلات سن وار ترتیب سے بیان کرنا ممکن نہیں، اس لیے اتنے ہی پر یہ قصہ ختم کرتا ہوں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ہر حالت میں بندہ کا نگہبان اور محافظ ہے حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ان حالات کو قلمبند نہ کرتا، لیکن خدائے برتر گواہ ہے کہ دین کے درد اور ملت مرحومہ اسلام کی دلسوزی میں میرا قلم رک نہ سکا اور یہ باتیں زبان قلم پر آگئیں۔ اس میں نہ تو مقصود کسی قسم کا طعن و طنز کرنا

ہے نہ اس کے پیچھے حسد و تعصب کا کوئی جذبہ کام کر رہا ہے۔

صرف ہوائی کا عمل

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ مبارک سے ''صرف ہوائی'' کا عمل سیکھنا شروع کیا۔ شیخ مبارک سے ملاقات سے پہلے ایک دن شیخ فیضی نے اکبر سے کہا'' ہمارے شیخ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے'' بادشاہ نے فوراً جواب دیا'' ہاں انھوں نے اپنے سارے تکلفات تمہارے سپرد کر دیے ہیں''۔

اکبر نے شیخ بنجھو، میاں تان سین(55) اور دوسرے تمام موسیقاروں کو شیخ مبارک کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان میں سے ایک دوسرے پر ترجیح دیں۔ شیخ مبارک نے میاں تان سین سے اس موقع پر کہا تھا۔ ہم نے سنا ہے تم بھی کچھ گا لیتے ہو اور جب اس نے گا کر سنایا تو شیخ نے اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دی اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

آبی محل کی تعمیر

اسی سال فتح پور میں ایک حکیم آیا تھا اس نے ایک ایسے گھر کی تجویز پیش کی جس کے چاروں طرف پانی ہو اور غوطہ لگائے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہ ہو، خوبی یہ کہ پانی گھر میں کسی طرح سے بھی سرایت نہ کر سکے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور دولت خانے کے صحن میں بیس گز چوڑا، بیس گز لمبا اور تین گز گہرا ایک حوض بنایا گیا۔ اس کے اندر ایک شخمین کمرہ تعمیر ہوا جس کی چھت پر ایک بلند مینارہ تھا۔ اس کمرے کے چاروں طرف پل بنائے گئے لیکن حکیم کا دعوی قرابادین کی طرح غلط ہی ثابت ہوا اور وہ چھپ کر کہیں بھاگ گیا۔ ایسا ہی ایک حوض سترہ سال کے بعد حکیم علی گیلانی نے لاہور میں بنایا تھا اس حوض کی تاریخ ''حوض حکیم علی گیلانی'' نکالی گئی تھی۔

بادشاہ نے اس نامکمل حوض کو زر سیاہ سے جس کی قیمت بیس کروڑ روپیہ ہوتی تھی بھردایا۔ اور وہاں پر موسیقی کی ایک محفل منعقد کی۔ شیخ بنجھو ایک خوش آواز قوال تھا، صوفیانہ

وضع قطع میں رہتا تھا اور شیخ ادھن جون پوری کا مرید تھا۔ اس کی تاریخ وفات اس کے نام ہی سے نکلتی ہے۔ اس محفل میں شیخ بجھو نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ بادشاہ نے اس کو بہت داد دی اور بڑے خوش ہوئے۔ محفل میں میاں تان سین اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے دھن سرے گویے بھی بلائے گئے تھے بادشاہ نے شیخ بجھو کو ان سب پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ اس حوض کا سارا سونا شیخ اٹھا لے جائے وہ بیچارا اس کو بھلا کس طرح اٹھا سکتا تھا اس لیے اس نے تھوڑے سے سونے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کے عوض ایک ہزار روپیہ اسے عطا فرمادیا اور وہ باقی سونا تین سال کی مدت میں جا، بے جا اخراجات میں صرف ہوتا رہا۔

معصوم خان کی آمد

اسی سال میرزا محمد حکیم کا کوکہ معصوم خاں نہایت بہادر نوجوان تھا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکا تھا میرزا سے ناراض ہوکر بادشاہ کے پاس آ گیا تھا۔ اکبر نے اسے پانصدی کا عہدہ دے کر بہار کی حکومت پر روانہ کردیا۔ معصوم خاں نے وہاں کے مشہور پٹھان سردار کالا پہاڑ سے جنگ کرکے فتح حاصل کی۔ بادشاہ نے اس کارنامے پر فتح پور سے ہزاری کا فرمان اور خاصہ کا گھوڑا اس کے لیے روانہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خواب میں حضرت علیؑ کو دیکھا تھا کہ انھوں نے اس کی پیٹھ پر اپنا پنجہ مبارک رکھا تھا اسی برکت سے اس نے کسی جنگ میں بھی پیٹھ نہیں دکھائی اور اس پنجے کا نشان اس کی پیٹھ پر نظر آتا ہے

”چہ باک از موج بحر آن را کہ باشد نوح کشتیبان“

اسی سال ماہ شوال میں ایک نہایت کمینہ اور ذلیل آدمی ملا طیب کو کیتھل سے بلا کر دربار میں نوازا گیا، بادشاہ کی اکثر نوازشیں بس کچھ اسی قسم کی رہتی تھیں۔ ملا طیب کو صوبہ بہار اور حاجی پور کا دیوان مقرر کیا گیا اور رائے پرکوتم (56) کو جو اسی قبیل کا آدمی تھا بخشی کا عہدہ ملا اور ملا مجدی سرہندی کو جو پہلے سلیم شاہ کے عہد میں پرچہ نویس تھا، امین بنایا گیا اور شمشیر خاں خواجہ سرا کو خالصہ کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان کمینے لوگوں نے

خوب ہاتھ پیر نکالے۔ ان کو نہ تو خدا کا خوف تھا نہ بادشاہ کا لحاظ تھا وہ من مانی حکومت کرنے لگے اور اس وقت اور موقعے کو غنیمت جان کر ایسی ایسی کاروائیاں کیں کہ سارے لشکری ان کے ہاتھوں تنگ آ گئے اور زبردستی معصوم خاں کو باغی بنا دیا جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اسی مہینے مرزا مظفر حسین، راجہ علی خاں کے نذرانوں کو خاندیس سے لا کر حاضر خدمت ہوا۔ اکبر نے کچھ عرصہ بعد میرزا کے قصور معاف کر دیے اور انہی دنوں اس کو اپنا داماد بنا کر اسے عزت و مرتبہ عطا فرمایا۔

اسی سال بادشاہ نے شہباز خاں بخشی کو غازی خاں بدخشی اور شریف خاں اتکہ کے ساتھ رانا کیکا پر فوجی حملے کے لیے مقرر فرمایا۔ رانا کیکا کونبھل میر کے مستحکم قلعے میں محصور ہو گیا تھا بادشاہی فوجوں نے حملہ کر کے قلعے کو فتح کر لیا اور اس کے سارے ملک کو تہہ و بالا کر دیا اور رانا راتوں رات قلعے سے بھاگ کر دوسرے پہاڑی علاقے میں چلا گیا۔ اسی سال سلطان خواجہ مکہ معظمہ سے لوٹ کر آیا اور وہاں سے بادشاہ کے لیے عربی نسل کے گھوڑے، حبشی غلام اور دوسرے نفیس تحفے لا کر پیش کیے، اسے صدارت کا عہدہ عطا کیا گیا۔

حاجیوں کے قافلے کی روانگی

986ھ/1578ء میں امیر حاج کا اعزاز حضرت خواجہ احرار کے پوتے خواجہ محمد یحییٰ کو ملا۔ اکبر نے انکو چار لاکھ روپیہ دیا اور اسی سال شوال کے مہینے میں حاجیوں کے قافلے کو اجمیر سے روانہ کیا گیا۔ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی جن کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اکبر اسلاف سے متنفر اور احکام دین سے منحرف ہو گیا تھا، اسی قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال حج کا فریضہ ادا کیا۔ ان کے سفر کی تاریخ "ھسو غوبز قوم ذلو" نکالی گئی تھی۔

خانِ جہاں کا انتقال

983ھ/1575ء کے آغاز میں حاکم بنگالہ خاں کے انتقال کی خبر ملی، اس کے بھائی اسمٰعیل قلی

خاں کے نام عنایت آمیز فرمان صادر کیا گیا۔ مظفر خاں جو اس وقت دیوان کے عہدے پر فائز تھا بنگالہ کا حاکم مقرر ہوا۔ رضوی خاں بخشی بنایا گیا اور فتح پور سے حکیم ابوالفتح کو صدر اور رائے پتر داس کو میر ادہم کی شرکت میں دیوان بنا کر روانہ کیا گیا۔

19 ماہ صفر کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔ اس کا نام میں نے محی الدین رکھا، یہ لڑکا پشاور میں پیدا ہوا تھا۔

تحائف اور نذرانے

بادشاہ نے ملا عشقی کو جسے خاں کا خطاب حاصل تھا اور شاعری میں اس کا ایک دیوان اور مزاحیہ مثنوی بھی ہے، کشمیر میں وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ اسی سال وہ قاضی صدرالدین لاہوری کے ساتھ دربار میں واپس آیا۔ اس کے ہمراہ حاکم کشمیر کا ایلچی محمد قاسم نامی بھی آیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے بہت سا زعفران، مشک، عود، شال اور کشمیر و تبت کے دوسرے تحائف بطور پیش کش لے کر آئے۔

اس زمانے میں حکیم الملک گیلانی کے داماد حکیم علی کو جو حکمت و طب اور دوسرے علوم میں بے مثل مہارت رکھتا تھا، عادل خاں دکنی کے قاصدوں کے ہمراہ بیجانگر روانہ کیا گیا۔

اسی زمانے میں میرزا شاہرخ کا بہنوئی میر نظام بدخشاں سے سفیر بن کر آیا اور بدخشی گھوڑے، قیمتی لعل اور بہت سے اونٹ نذرانے میں پیش کیے۔

اکبر کی خطبہ خوانی

اس زمانے میں اکبر پر دنیاوی اقتدار کے ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جمانے کی دھن سوار ہوگئی تھی اور اسے کسی دوسرے کی پیروی و متابعت گراں گزرنے لگی تھی۔ اس نے یہ سن رکھا تھا، حضور اکرم خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور بعض دوسرے سلاطین جیسے امیر تیمور صاحبقران، میرزا الغ بیگ گورکانی وغیرہ خود خطبہ پڑھا کرتے تھے، اکبر نے بھی بظاہر اسلاف کی پیروی میں لیکن درحقیقت اپنے حق اجتہاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے

یکم جمادی الاول 987ھ/ 1589ء کو فتح پور کی جامع مسجد میں جو بادشاہی محل کے قریب تھی، جمعہ سے پہلے خطبہ پڑھنا چاہا، لیکن جب وہ منبر پر چڑھا تو گھبرا گیا اور لرزنے لگا بڑی مشکل سے شیخ فیضی کے یہ تین شعر وہ بھی ادھورے پڑھ کر اتر آیا۔ یہ شعر بھی اس صورت میں ادا ہوئے کہ دوسرے برابر سے بتاتے جاتے تھے۔ اس خطبے کے بعد حافظ محمد امین کو امامت کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے جو شعر پڑھنا چاہے تھے وہ یہ ہیں:

خداوندی کہ مارا خسروی داد   دل دانا و بازوی قوی داد
بعدل و داد مارا رہنمون کرد   بجز عدل از خیال ما برون کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر   تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

بادشاہی عقائد پر عوام کی بے چینی

بادشاہ کی بد اعتقادی کو دیکھ کر لوگوں کی جراتیں بڑھ گئیں اور اسلامی عقائد اور فروعی مسائل کا اعلانیہ مضحکہ اڑنے لگا۔ بد بخت ہندو اور ہندو مزاج مسلمان نبوت کے بارے میں زبان درازیاں کرنے لگے۔ علمائے سوء نے اپنی کتابوں میں نعت کی جگہ تبرا شروع کر دیا۔ توحید کے ذکر کے بعد وہ حسب قاعدہ نعت کے بجائے بادشاہی القاب لکھنے لگے۔ انھیں ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مقتدر دروغ باتوں کے مقابلے میں حضور اکرمؐ کا نام بھی لیں۔ ان باتوں پر عوام میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگوں میں بادشاہ اور بادشاہ پرستوں کی بدنامی اور رسوائی عام ہوگئی۔ ملک میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ عوام و خواص میں جو لوگ سفلہ طبیعت اور پست فطرت تھے وہ ان بے ادبیوں کے باوجود خود کو بادشاہ کا مرید کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور لالچ یا خوف سے بادشاہ کے مرید ہو جاتے تھے۔ کسی کا بس نہ تھا کہ حق بات زبان پر لائے۔

اسی زمانے میں حاکم بنگالہ مظفر خاں نے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحائف، ہاتھی اور کپڑے وغیرہ کافی تعداد میں نذرانے کے لیے دربار میں بھیجے۔ محمد معصوم کابلی کے بھیجے ہوئے 39 ہاتھی بھی خدمت شاہی میں پیش کیے گئے۔

خیرات کا مظاہرہ

اسی مہینے کے دوسرے جمعہ کو چوگان بازی کے میدان میں فقیروں اور مستحقوں کو جمع کیا گیا اور بادشاہ خود وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت احاطے میں تقریباً ایک لاکھ مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ سلطان خواجہ صدر اور قلیچ خاں نے ایک ایک کو روپیہ تقسیم کیا۔ وہ دن بھی محشر سے کچھ کم نہ تھا۔ ہجوم کی ریل پیل میں 80 عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے۔ بعض عورتوں کے پاس سے جن کے شوہر بنگال میں مر چکے تھے، اشرفیوں اور روپیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اس انکشاف سے بادشاہ کا دل فقراء کی طرف سے بھی بیزار ہو گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے بعد تھوڑے سے لوگ حاضر کیے جائیں کچھ عرصے کے بعد خیرات کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

شاہزادہ سلیم کی اتالیقی

بڑے شاہزادہ کی اتالیقی پر قطب الدین محمد خان اتکہ کو مقرر کیا گیا۔ اس تقریب کے لیے ایک بڑی محفل منعقد ہوئی اور قطب الدین نے عمدہ ہاتھی اور اپنے عہدے کے شایان شان نذرانے پیش کر کے رسم و قاعدے کے مطابق شاہزادہ کو کاندھے پر بٹھا کر سونا اور جواہر کے تھال نچھاور کیے۔

اسی سال ماوراءالنہر سے عبداللہ خاں اوزبک کا ایلچی چاپلوسی کا خط لے کر آیا۔ اکبر نے میرزا فولاد برلاس کو خواجہ خطیب کے ہمراہ جو بخارا کا باشندہ تھا، تحفے اور ہدیے دے کر اوزبک کے ایلچی کے ساتھ بھیجا۔ بادشاہ کے خط کے آخر میں یہ شعر درج کیا گیا تھا:

چو مادوست باشیم با یکدگر
بود بحر و بر ایمن از شور و شر

اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علما کا محضر

بادشاہ کی دینی سیادت کو تسلیم کرانے کے لیے ان دنوں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں مجتہد

شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی تھی اور امام عادل (حکمران وقت) کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے سکتا ہے اور اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس محضر نامے پر مخدوم الملک شیخ عبد النبی صدر الصدور، قاضی جلال الدین ملتانی (قاضی القضاۃ)، صدر جہاں مفتی اعظم، مشہور عالم شیخ مبارک اور غازی خاں بدخشی نے جو معقولات کا بہت بڑا عالم تھا اپنے دستخط کیے تھے اور اس پر ان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

اس محضر کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ جو بھی تجویز اور حکم دیں خواہ وہ امور مملکت ہوں یا مسائل شرع اس سے انحراف و اختلاف کی کسی شخص کو مجال نہ رہے اور جو ایسا کرے وہ اس محضر کی رو سے خود ہی مجرم بن جائے۔

اس محضر سے متعلق بڑی بحثیں ہونے لگیں۔ ان مباحث کا موضوع یہ تھا کہ اجتہاد اور مجتہد کی اصطلاحوں کا آخر کس پر اطلاق ہوتا ہے؟ اور ایسے امام عادل کو جو امور مملکت میں صاحب تدبر ہو اور بلحاظ مراتب مجتہدین سے بلند مرتبہ ہو اس بات کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کرے۔

یہ بحث و تمحیص تو ہوتی رہی لیکن عملاً یہی ہوا کہ اس محضر نامے پر بعض نے خوشی سے اور بعض نے جبراً مہریں لگا کر اس کی تصدیق کر دی۔

محضر نامے کا متن

اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف تدبر و انتظام سے دارالامن بن چکا ہے اور ہر جگہ کے خواص و عوام خاص طور سے عرب و عجم کے علما و فضلاء یہاں آ کر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنا بریں تمام علماء نے بڑے غور و فکر کے بعد اس آیت کریمہ کے پیش نظر کہ "**اطیعو اللہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم**" اور اس حدیث صحیح کی روشنی میں کہ "**ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطیع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذلک** نیز عقلی اور نقلی

دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا کہ ''سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے پاس مجتہد کے مرتبے سے بڑھ کر ہے''۔

لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر اگر دین کے وہ مسائل جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام کا اجرا فرمائیں تو ان کی تجویز و حکم متفق علیہ متصور ہوگا اور اس کی اطاعت اور پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی۔

جب بھی سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہو اور نصوص شرع کے مغائر نہ ہو اس پر عمل درآمد ہر شخص پر لازم و قطعی ہوگا اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی و دنیاوی پر مستلزم ہوگی۔

یہ سطور حقوق اسلام کے اجرا کی خاطر علمائے دین اور فقہائے مجتہدین کے محضر سے ماہ رجب 987ھ/ 1589ء میں ضبط تحریر میں لائی گئی۔ اس محضر کا مسودہ شیخ مبارک نے مرتب کیا تھا دوسرے علما نے کراہتاً اس کی نقلیں کیں۔ شیخ مبارک نے بڑے انشراح قلب کے ساتھ محضر کے ذیل میں یہ فقرہ لکھا کہ ''میں اس بات کا دل و جان سے خواہش مند تھا اور سالہا سال سے اس کا منتظر تھا''۔ اس محضر کی صورت میں بادشاہ کو کلی اختیارات مل گئے۔ بس پھر کیا تھا جلد ہی اجتہاد کا دروازہ کھل گیا اور کسی کو کسی قسم کی مجال نہیں رہی۔ تحلیل و تحریم کا جھگڑا مٹ گیا اور شریعت کے مقابلے میں امام کی رائے کو فوقیت حاصل ہوگئی۔ بادشاہ نے کھلم کھلا اسلام کو تقلید کا نام دے کر پس پشت ڈال دیا۔ شیخ ابوالفضل کا معاملہ سمرقند کے حیرتی شاعر کے مماثل تھا کہ جب اس نے ماوراء النہر کے سرد مزاج لوگوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائیں تو ان کی ضد میں عراق کے جگادری مومنوں کے ساتھ اس نے یارانہ کر لیا اور ان کے ساتھ بھٹکتا پھرا۔ ابوالفضل نے بھی اس بے دینی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور منھ دیکھے کی شرم میں آخرت کے انگارے سمیٹ لیے۔

اجمیر کا آخری سفر

اسی سال 16 ماہ رجب کو بادشاہ اجمیر تشریف لے گئے۔ یہ بس اجمیر کا آخری سفر تھا، اس کے بعد سے آج تک کہ چودہ سال گزر گئے۔ عنان شاہی اس طرف پھیری نہیں گئی۔ حسب دستور اجمیر سے پانچ کوس پر پیادہ ہو کر سفر کیا اور مزار مبارک کی زیارت کی۔

ان دنوں لوگ بادشاہ پر پھبتی کہتے تھے کہ ”کیا خوب خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ تو یہ عقیدت اور اس اصل اصول سے جس کے طفیل دنیا کے ہر گوشے میں خواجہ صاحب جیسے ہزاروں کامل ولی پیدا ہوئے یہ انحراف و سرتابی“

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است
دریں چمن گل بے خار کس نچید آری
چراغ مصطفوی باشرار بولہبی است

بادشاہی کلمہ

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی ہزار بے وقعت سہی لیکن ان کے ہوتے ہوئے دینی معاملات میں اکبر کی جسارتیں رکی رکی اور سہمی سہمی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد گویا پاؤں کی بیڑیاں کٹ گئیں اور اس نے دھڑلے سے عقائد و مسائل میں نئی نئی اختراعات شروع کر دیں۔ چنانچہ قرآن کو مخلوق قرار دے دیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے بارے میں شکوک پیدا کیے، جن فرشتے اور دوسرے تمام امور غیبی، معجزوں اور کرامتوں کا انکار کر دیا۔ قرآن کے تواتر اور اس کے کلام الٰہی ہونے پر بھی اعتراضات وارد کیے، مرنے کے بعد بقائی ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا اور اپنے ان خیالات کے لیے مندرجہ ذیل اشعار کو سند بنالیا

از حقیقت بدست کوری چند
مصحفی ماند و کہنہ گوری چند

گو ہر کس سخن نمی گوید
ہز قرآن کسی نمی جوید

یا

عید آمد وکارہا نکو خواہد کرد چون روی عروس
ساقی می ناب در سبو خواہد کرد چون خون خروس
افا و نماز و پوز بند روزہ یک بار دگر
از گردن این خران فرو خواہد کرد افسوس افسوس

بے دینی کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کا خاص کلمہ "لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" اعلانیہ پڑھا کریں، لیکن اسی خیال سے کہ یہ حکم عام ہو تو ملک میں شاید خلل برپا ہو جائے، اس کلمہ کے پڑھنے کا لزوم صرف اپنی حرم سرا تک ہی محدود کر دیا۔

اکبر کی اس بے دینی کی تاریخ "قطبای امت" سے نکلتی ہے۔

غیرت مند حق گو امیر

بادشاہ نے جب قطب الدین محمد خاں اور شہباز خاں اور اس پایے کے دوسرے امیروں کو بھی اسلام کی تقلید چھوڑ کر اس نئے دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امیروں نے بڑی جرأت سے اس مطالبے کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا "شاہان ولایت خلیفہ روم وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے؟ وہ سب بہرحال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ تقلیدی ہو یا کچھ اور..." اکبر نے اس پر چڑھ کر کہا۔ "تو روم کے فرمانروا کی خاطر ہمارے ساتھ اس درشتی سے بات کر رہا ہے تو اس طرح ان کے پاس اپنا ٹھکانا بنانا چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز و مرتبہ حاصل کر لے"۔

شہباز خاں نے بھی بڑی سختی سے مخالفت کی اور جہنمی کتے بیربر کو جو اعلانیہ اسلام پر طعنے کرتا رہتا تھا سب کے سامنے گالی دے کر کہا "اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا، ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔ غرض

دربار میں بڑی بدمزگی پیدا ہوگئی اور اکبر نے غصّے میں آکر شہباز خاں اور دوسرے امراء کو کہا "چپ رہو ورنہ ہم تمہارے منھ پر نجاست بھری جوتیاں مارنے کا حکم دیں گے"۔

علماء اور ائمہ کی بدحالی

انھی دنوں پٹن کا حاکم ترسون محمد خان گجرات سے آکر حاضر ہوا اور قاضی علی بغدادی کو شیخ عبدالنبی کی جگہ مدد معاش اور آراضیات کی تحقیق و ضبطی کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ ہزاری، پانصدی اور صدی کے مرتبہ رکھنے والے ائمہ کو بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کرتا تھا۔ ان کی اکثر زمینیں ضبط کرلی جاتی تھیں۔ کٹ کٹا کر بہت تھوڑی سی زمین ان کے پاس رہ گئی۔ اس طرح بڑے بڑے علماء و ائمہ اور مشاہیر کے خاندانی اعزاز و اعتبار کو گھٹا دیا گیا اور شریفوں کی اولاد مفلسی کی وجہ سے آوارہ ہوگئی، مدرسے اور مسجدیں ویران ہونے لگیں اور اکثر لوگ جلاوطن کردیے گئے۔

مدارس از علما آن چنان بود خالی
کہ ماہ روزہ زمیخوارہ خانۂ خمار
برند تختۂ لوح ادیب از پی مزد
کنند مصحف قاری گرو بوجہ قمار

ان معاملات میں حکیم الملک اور شیخ ابوالفضل میں بڑی مخالفت رہتی تھی۔ حکیم اس کا نام بگاڑ کر "فضلہ" کہا کرتا تھا۔ اکبر ابوالفضل کے کافی قریب تھا۔ اس لیے حکیم الملک پر اس نے بڑی سختی کی، آخرکار مکہ معظمہ کی طرف اس کے اخراج کا حکم صادر کردیا۔

خدمت شاہی پر دوبارہ تقرر

اسی سال ماہ رمضان میں اجمیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی، کہ میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہوکر گھر پر بیٹھا تھا، بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری مدد معاش کے سلسلے میں ہزار بیگھہ زمین کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی خیال ہے کہ "اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی" قاضی علی نے کہا ہاں بشرط خدمت ان کو زمین دی

گئی تھی۔ اکبر نے کہا اس سے پوچھو" کیا کوئی ضعف و عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کردی"۔ غازی خاں بدخشی نے فی البدیہہ کہا: "قسمت کا ضعف تھا"۔ اس موقعے پر تمام مقربوں نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر، سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کردی گئی تھی، میرے لیے سفارشیں کیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم کسی کو ملازم رہنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی"۔ میں نے فوراً ہی اس بات کو قبول کرلیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے مکرر عرض کیا کہ آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے، تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا "شیخ عبدالنبی، جو اس وقت تک لشکر میں موجود تھا، سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر زمین کا حقدار ہوسکتا ہے۔" شیخ نے مولانا الہداد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوایا کہ "ملا عبدالقادر عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں۔ میں حسب الحکم اس لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھ زمین تجویز کرتا ہوں"۔ مصاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی عرضداشت مناسب نہ ہوگی اور وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے، مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا، جس سے بہ مشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے بھگتنا پڑا کہ میں نے بادشاہ کے بارہا حکم دینے کے باوجود پہلے ہی داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی اور زبان حال وقال سے یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

شاہم کہ یک سوار ندارم پیادہ ھم
فارغ زقید شاھم و از شاہزادہ ھم

جزیہ کی معافی

اسی سال بادشاہ نے تمغا اور جزیے کا قانون جس کے ذریعہ کروڑھا روپے کی آمدنی ہوتی تھی معاف کردیا اور اس کے لیے تاکیدا فرامین صادر کیے گئے۔

اسی سال محمد معصوم خاں ولد معین الدین احمد خاں فرنخودی جو جونپور کی حکومت پر فائز

تھا دربار میں حاضر ہوا اور جونپور کی رخصت پا کر لوٹ گیا۔ ملا محمد یزدی جونپور کا قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ دہلی کی حکومت محب علی خاں ولد میر خلیفہ کو عطا ہوئی۔

ملا محمد یزدی کا فتویٰ

ملا محمد یزدی نے جونپور جانے کے بعد بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ اس کے فتوے پر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم خاں فرنخودی، میر معز الملک نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیر تلواریں کھینچ کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے بڑی سخت لڑائیاں لڑیں۔ اس زمانے میں ائمہ کہا کرتے تھے بادشاہ نے ہماری مدد معاش کی، زمینوں پر ہاتھ ڈالا تو اللہ نے اس کے ملک کو تاڑ لیا۔

علماء کا اخراج اور تبادلے

جب مہتر سعادت جسے پہلے خاں کا خطاب حاصل تھا معصوم خاں جونپوری کے پاس جا کر واپس آیا تو اس نے ملا محمد یزدی کے فتوے اور وہاں کی صورتحال سے متعلق تفصیلات بادشاہ کو بتائیں اکبر نے کسی بہانے سے میر معز الملک اور محمد یزدی کو جونپور سے بلا بھیجا۔ جب یہ لوگ فیروز آباد جو آگرے سے دس کوس پر ہے، پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ سواروں کو ان سے علیحدہ کر کے دونوں کو کشتی میں بٹھا کر جمنا کے راستے گوالیار لے جائیں اس کے پیچھے ہی دوسرا حکم آیا کہ دونوں کو ختم کر دیا جائے۔ ''محافظ دوسری کشتی میں سوار ہو جائیں اور ان کو کسی پرانی کشتی میں بٹھا کر عین دریا میں پہنچنے پر ملاحوں کو حکم دیں کہ ان کی کشتی کو غرق کر دیا جائے۔ چند دن بعد ہی قاضی یعقوب بنگال سے وہاں آئے گا اس کو بھی ان کی طرح ختم کر دیا جائے''۔

اس طرح اکبر نے ان تمام علماء کو جن کے بارے میں اسے اندیشے تھے، ایک ایک کر کے راستے سے ہٹا دیا اور لاہور کے علماء کو جلا وطن کر کے جگہ جگہ منتشر کر دیا۔ ان میں قاضی صدر الدین لاہوری کو جن کا علمی مرتبہ مخدوم الملک سے زیادہ تھا بھڑوچ، گجرات کی قضاوت پر، عبدالشکور گول دار کو جونپور کی اور ملا محمد معصوم کو بہار کی حکومت پر مقرر کیا۔ شیخ

منور کو مالوہ کی طرف جلاوطن کر کے اس صوبے کی صدارت اس کو عطا کر دی۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین جو مشہور واعظ تھے، رہ گئے۔ بادشاہ نے ان کو کبر سنی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ یہ بزرگ 995ھ/ 1587ء میں فوت ہوئے۔

صاحب زمان کی پیشین گوئی

حاجی ابراہیم سرہندی کا تقرر گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لے کر کافی روپیہ اور ذخیرہ جمع کر لیا اگر وہ بیچارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ ان کی مدد معاش کو روک دیتا تھا۔ اس کی حرکتیں بادشاہ کے علم میں بھی آئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ دکن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کر دیا۔ شاہانہ مجلسوں میں اس کو بھی بلایا جاتا تھا اس نے اسی زمانے میں بزرگان دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا، لیکن اس کی پول بہت جلد کھل گئی۔ اصل میں اس نے ایک کرم خوردہ کتاب جو غیر معروف خط میں شیخ ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ صاحب زمان بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا، داڑھی منڈا ہو گا اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقربوں میں شامل کر لیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پرانا رسالہ فراہم کیا گیا جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ "ایک صحابی کا لڑکا داڑھی منڈا کر جب حضور اکرم ﷺ کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا اہل جنت کی یہی وضع ہو گی" یہ حدیث بھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم، شاہ فتح اللہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح کے ساتھ بڑی بے باکی کے ساتھ مباحثے کرتا تھا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ اس لیے اس کو اکبر نے رنتھمبور کے قلعے میں بھیج دیا وہ اسی جگہ فوت ہوا۔ اس کی لاش قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دی

گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس لیے یہ مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعے سے نیچے گرادیا۔ یہ حادثہ 994ھ/1586ء میں پیش آیا تھا۔

وظائف و مدد معاش میں کمی

اہل علم کے لیے ان کا علم ہی وبال بن گیا تھا۔ آئے دن ان بچاروں کو طرح طرح کی سرکاری کارروائیوں کا سامنا رہتا تھا۔ بادشاہ نے ممالک محروسہ کے تمام علما اور مشائخین کو فرمان بھیج کر دربار میں بلایا اور خود بہ نفس نفیس انکی مدد معاش، انعام و وظائف کی تحقیق کی۔ سب علما کو درباری آئین کے مطابق تعظیم و تسلیمات بجالانا پڑتا تھا۔ بادشاہ ان عالموں سے خلوت و جلوت میں گفتگو کر کے اپنے حسب مرضی ہر ایک کے لیے مختصری زمین مقرر کردیتا تھا اور جس کسی کے متعلق یہ رپورٹ ہوتی کہ وہ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہے یا مجلس سماع منعقد کرتا ہے یا کسی نہ کسی طرح کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ اس کے مشغلوں کو دکانداری کا نام دے کر اسے یا تو کسی قلعے میں قید کردیا جاتا تھا یا بنگال اور بھکر کی طرف جلا وطن کردیا جاتا تھا۔

علماء کے خلاف یہ کارروائیاں برابر ہوتی رہتی تھیں، بوڑھے اور معمر پیروں اور شیوخ کا حال اور بھی برا تھا۔ صاحب سماع، اہل ذوق صوفیوں کی معاش کے فرامین کی جانچ پڑتال ہندو کارندوں کے ذمے تھی اور ان کا اجرا اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک ان پر ہندو افسران کی مہر نہ لگ جاتی۔ اس معاشی بدحالی کی وجہ سے بچارے صوفی اپنے حال وقال کو فراموش کر بیٹھے اور وطن چھوڑ کر کسی نہ کسی جائے پناہ میں جا چھپے۔ ان کا سارا تصوف دھرا کا دھرا رہ گیا

چنان قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاران فراموش کردند عشق
چنان آسمان بر زمین شد بخیل
کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

کیوں نہ ہو ان ظاہر پرست صوفیوں کی بے روح مجلسیں ان کی بے حسی اور جمود، شرمناک اعمال اور بے جا تکلیفات کا یہی خمیازہ ہوتا تھا۔ ان بے فیض صوفیوں میں اکثر اسی لائق تھے کہ اس برے انجام سے دوچار ہوتے:

آن نہ صوفی گری و آزادویست   بلکہ کیدی گری و قوادویست
دزدی و راہزنی بہتر ازین   کفن از مردہ کشی بہتر ازین

موضوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن کیا کروں، قلم بے اختیار دوسری طرف بھٹک جاتا ہے بیان کا سمند چھوڑ کر زمانے کی اس نئی چال، اس نئے مذہب اور اس نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے۔ کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا لیکن آہ مجبوری:

خطائی با فلک کردم کہ از تیغ جفا کشتی   شہان مجلس آرائی و جوان مردان بر کف را
زمام حل و عقد نباری در کف قومی   کہ از روی کرم باشد بر ایشان شرف سگ را
جہان در گوش جانم گفت فارغ باش خوش منزل
کہ سیلت بر کند ایام بیہودہ روز یک یک را

بنگال میں مظفر خاں کی سختی

اسی سال مظفر خاں بنگال کی وصولی پر گیا۔ اس نے وہاں کے معاملات میں بڑی سختی سے کام لیا اور بنگال میں متعینہ امرا اور دوسرے سرداروں کو سخت ایذائیں دیں۔ اکثر امیروں کی جاگیر ضبط کر کے دربار کے طریقے پر داغ و محلّہ اور محاسبے کے پرانے طریقے نافذ کر دیے۔

بابا خاں قاقشال اور خالدی خاں نے جو مملکت کے با اقتدار امیر اور نفس ناطقہ تھے داغ کے قانون سے معافی اور جاگیروں کی بحالی کے لیے بڑی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مظفر خاں نے خالدی خاں کو اس الزام میں قید کر دیا کہ اس نے داغ و محلّہ کے بغیر ہی جاگیر کی رقمیں وصول کر لی تھیں اور اسے واپس نہیں کیا تھا۔

اتفاق سے انہی دنوں مظفر خاں کے پاس شاہی فرمان آیا کہ مرزا محمد حکیم کا ایک آدمی

روشن بیگ نامی کابل سے بنگالہ گیا ہوا ہے، اسے گرفتار کر کے سزا دی جائے۔ مظفر خاں نے اسے تلاش کرایا تو وہ قاقشالوں کے پاس سے پکڑا گیا اس نے بہ سر دربار بابا خاں سے بڑے سخت لہجے میں پوچھ گچھ کی اور شاہی فرمان دکھا کر روشن بیگ کے قتل کا حکم دیا۔

قاقشالوں کی بغاوت

مظفر خاں کے ان سخت احکام سے سپاہی بڑے خوفزدہ ہو گئے اور سب نے مل کر اپنے سر منڈوا لیے، مغلوں کا بانا پہن لیا اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ شہر گوڑ جسے پہلے لکھنوتی کہا جاتا تھا۔ مظفر خاں کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کو لوٹ لیا۔ اس نے باغی قاقشالوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہت سی کشتیاں تیار کرائیں اور حکیم ابو الفتح اور پتر داس کو گوڑ کی طرف روانہ کیا۔

حکیم ابو الفتح بزم کا یکہ تاز تھا، رزم کا شہسوار نہیں اور پتر داس ایک ہندو دفتری تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ جنگجو قاقشالوں کے مقابلے میں کون سا تیر مار سکتے تھے۔ جب قاقشال ان فوجی کارروائیوں سے دبتے نظر نہ آئے تو مظفر خاں نے ان کے نام ہمدردانہ فرمان بھیج کر پیغام دیا کہ ”تمہاری جاگیریں بحال کر دی جائیں گی۔ تمہارے پاس رضوی خاں اور پتر داس کو اس سخت کہا سنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے تاکہ وہ معاملات کو اچھے ڈھنگ سے طے کرا دیں“۔ اس کے بعد ہی مذکورہ بالا دونوں اشخاص کو میر سید رفیع الدین محدث کے لڑکے میر ابو اسحاق کے ساتھ قاقشالوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ قاقشالوں نے کسی قسم کی گفتگو سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کو قید کر کے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

بہار کے امراء کی بغاوت

اسی دوران ملا طیب اور رائے پرکھوتم بخشی نے معصوم خاں کابلی، عرب بہادر اور بہار کے تمام امیروں کی جاگیروں کو بہ یک قلم ضبط کر لیا۔ اس کارروائی نے ان امیروں کو بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے یہ دونوں ندی کو پار کر کے معصوم

خاں کے مقابلے پر پہنچے۔ عرب بہادر نے ان کو غفلت میں رکھ کر اچانک حملہ کردیا اور رائے پرکھوتم کو قتل کر کے شاہی لشکر کا بہت سا مال لوٹ لیا۔

بہار کے ان باغیوں نے بابا خاں قاقشال سے مراسلت کی اور قاقشالوں کا ساتھ دینے کے لیے گرہی کی طرف پیش قدمی کردی۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے مظفر خاں نے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کو جو اب دیوان کل کے عہدے پر مامور ہے، روانہ کیا۔ معصوم خاں نے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور قاقشالوں کو ساتھ لے کر دریائے گنگا پار کی اور مظفر خاں کے مقابلے میں صف آرائی کرلی۔

مظفر خاں کا قتل

باغیوں کی مدافعت کے لیے مظفر خاں ٹانڈہ میں جو اس وقت ایک پرانی چار دیواری سے بڑھ کر نہیں تھا، محصور ہوگیا۔ اس وقت وزیر خاں جمیل بیگ نے جو ایک پرانا امیر تھا۔ جان محمد خاں بہبودی کو ساتھ لے کر مظفر خاں پر حملہ کردیا نیز حکیم ابوالفتح اور خواجہ شمس الدین اور دوسرے سرداروں کو گرفتار کرلیا۔ یہ دونوں اور چند اس کسی نہ کسی طرح باغیوں کی قید سے نکل بھاگے اور مظفر خاں کی مدد کے لیے اپنے زمینداروں کو حاجی پور میں بھیج دیا۔ انہی معرکوں میں حکیم نورالدین قراری بھی مارا گیا اور باغی قاقشالوں اور معصوم خاں نے مظفر خاں کو قول نامہ دے کر ٹانڈے کے قلعے سے باہر آنے پر مجبور کردیا پھر اسے گرفتار کرکے اذیتیں دے کر مروا ڈالا۔

بنگال کی خودمختاری

اب باغیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے مظفر خاں سے چھینا ہوا کافی مال و اسباب ان کے پاس تھا، انھوں نے اچھی خاصی جمعیت فراہم کرلی اور پورے بنگال اور بہار پر قبضہ کرلیا۔ ایک بڑی پیدل اور سوار فوج بنالی۔ میرزا شرف الدین حسین ان دنوں نظر بند تھا۔ اسے بادشاہ نے کالپی کے حاکم قاسم علی خاں بقال کے پاس سے بنگالہ بجھوا دیا تھا۔ باغیوں

نے میرزا کو قید خانے سے نکال کر اپنا سردار بنا لیا۔ بنگال میں ایک خود مختار حکومت قائم ہو جانے سے سارے ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

راجہ ٹوڈرمل کی فوجی کاروائی

اکبر نے بنگال کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے راجہ ٹوڈرمل، صادق محمد خاں، ترسون محمد خاں اور دوسرے تمام امرا کو فتح پور سے روانہ کیا۔ راجہ کی مدد کے لیے محمد معصوم خاں فرنخودی حاکم جون پور اور اس علاقے کے دوسرے جاگیرداروں کو مقرر کیا۔

ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ شاہم خالد بدخشی سے جنگ کر کے اسے قتل کر دیا۔ محمد معصوم جونپوری نے تین ہزار مسلح اور تیار سواروں کو راجہ کے ملاحظے میں پیش کیا، لیکن اس کی حرکات و سکنات سے راجہ بھانپ گیا کہ وہ بھی بغاوت کی فکر میں ہے اسی لیے بظاہر اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا رہا لیکن ساری صورت حال دربار میں لکھ کر بھیج دی۔

شاہی لشکر سے مقابلے کے لیے محمد معصوم خاں کابلی، میرزا شرف الدین حسین اور قاقشالوں کی فوج تیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی، بے شمار کشتیاں اور توپ خانہ لے کر مونگیر کے قصبے میں پہنچ گیا۔ راجہ کو اپنے لشکر پر پورا بھروسہ نہ تھا وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ یہ سب موقعے کے منتظر ہیں، اس لیے اس نے دشمن سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور مونگیر کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا۔ دشمن کی طرف سے ہر روز سخت لڑائی ہوتی تھی اور شاہی لشکر رسد کے نہ ملنے کی وجہ سے نہایت تنگ ہو گیا۔ اسی اثناء میں شہباز خاں کے داماد زین الدین کنبو نے دریا کے راستے ڈاک چوکی کے ذریعے ایک لاکھ روپیہ راجہ کے پاس بھجوا دیا جو کچھ دن تک ضرورت میں استعمال ہوتا رہا۔ بادشاہ اسی طرح وقفے وقفے سے کبھی تو دریا خاں آبدار کے ذریعے کبھی سردی کے ہاتھ اور کبھی سیٹھ بھگوان داس خزانچی کے بیٹے کی معرفت رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔

ڈاک چوکی پر جو لوگ مقرر تھے ان میں قاضی زادہ عبد الحی خواص ولد قاضی

صدرالدین سنبھلی بھی تھا جو نہایت حسین اور خوبصورت نوجوان تھا، لیکن جتنا خوبصورت تھا اتنا احمق بھی تھا۔ وہ بھی ان خطیبوں میں شامل تھا جو مذہب وملت کے بارے میں زبان درازیاں کرتے رہتے تھے۔ اس مہم کے دوران وہ بھی عین عالم جوانی میں مارا گیا۔

راجہ کی فوج کے ساتھ شاہ فرملی کا لڑکا ہمایوں فرملی بھی تھا۔ جسے ہمایوں نے قلی خاں کا خطاب دیا تھا۔ وہ نئے بادشاہی دین کے ہنگاموں کو اور اجمیر میں لوگوں کے ابتلا وآزمائش کے ہولناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ چکا تھا اور سخت متنفر تھا۔ مونگیر کے محاصرے کے وقت موقع پا کر وہ اور ترخان دیوانہ شاہی لشکر سے بھاگ کر باغیوں سے جا کر مل گئے۔

باغیوں کی حوصلہ شکنی

مونگیر کا محاصرہ کافی طویل ہو گیا۔ اسی دوران بابا خان قاقشال سخت بیماری میں قریب مرگ ہو گیا اس کے ضعف و بیماری کو دیکھ کر مجنوں خان قاقشال کا لڑکا جباری جو باغیوں کا سرکردہ تھا اور اب وہ دربار شاہی میں خدمت پر مقرر ہے، محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔ باغیوں کا لشکر منتشر ہو گیا۔ معصوم خاں کابلی بھی مجبور ہو کر بہار کی طرف بھاگ گیا اور عرب بہادر نے پٹنہ پر قبضہ کرنے اور بادشاہی خزانہ لوٹ لینے کے ارادے سے پٹنہ پر حملہ کر دیا۔ بہادر خاں خاص خیل جو سید عارف کے نام سے مشہور تھا پٹنہ کے قلعے میں بند ہو گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے معصوم خاں فرنخودی کو بہادر خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ عرب بہادر ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے وہ مشہور زمیندار گجپتی کے پاس چلا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل، صادق خاں اور دوسرے شاہی امیروں نے معصوم خاں کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہار کی طرف کوچ کر دیا۔ معصوم خاں نے شاہی لشکر پر اچانک رات میں چھپ کر حملہ کیا اور صادق خاں کے کیمپ پر جا پڑا۔ اس اندھیری رات میں کیمپ کی نگرانی اور قراولی کے لیے ماہ بیگ جو ایک نامی سردار تھا اور الغ خاں حبشی مقرر تھے۔ ماہ بیگ مارا گیا اور الغ خاں جان بچا کر نکل گیا، صادق خاں نے ثابت قدمی کے ساتھ حملہ آوروں

کا مقابلہ کیا۔ معصوم خاں نے بڑی بہادری دکھائی، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور پسپا ہوکر بھاگ گیا۔ اس وسیع علاقے میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے عرصے تک سرگرداں رہا، آخرکار اڑیسہ کے زمیندار عیسی خاں کے پاس جاکر پناہ لی جس نے اس زمانے میں ڈھائی سو ہاتھی اور چار لاکھ روپے کے نفیس تحفے، سونا، قیمتی آلات، اگر، پوشاکیں اور بے شمار کپڑے سعید خاں مغول کے ذریعے دربار میں روانہ کیے تھے۔ معصوم خاں ابھی تک اڑیسہ ہی میں ہے۔ باغیوں کے شکست کے بعد صوبہ کرہی تک کا علاقہ دوبارہ شاہی قبضے میں آگیا۔

مالوہ کے حاکم کا قتل

انھی دنوں شجاعت خاں اور اس کے بیٹے قائم خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ قائم خاں بڑا اچھا موسیقار، حسین و ظریف نوجوان تھا۔ بادشاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو سارنگ پور سے دربار میں بلایا تھا۔ یہ دونوں حسب طلب فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے نوکروں نے ان کی بدمعاملگی، بدعہدی، بدسلوکی اور ذلت کی وجہ سے، کہ آج کل کے سرداروں کا بس یہی کچھ وطیرہ ہے۔ دونوں کو راستے میں قتل کردیا اور بھاگ گئے۔ کہتے ہیں ایک دن ایک سائل نے شجاعت خاں اور دوسرے امرا سے جو دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ طلب کیا۔ اس نے اُن سے کہا" بابا کیا کریں خیرات کی مد ہماری آمدنی میں شامل نہیں کی گئی ہے"۔

شجاعت خاں کی جگہ بادشاہ نے مالوہ پر شریف خاں اتکہ کو مقرر کیا۔ اس کے مکان پر خود بادشاہ کی سواری گئی۔ اتکہ نے زبردست ضیافت و مہمانی کی اور بادشاہ نے اسے مالوہ پر رخصت کیا۔

بنگال پر اعظم خاں کا تقرر

اسی سال خاں اعظم کو جو عرصے سے نظر بند تھا بادشاہ نے آگرہ سے بلا بھیجا اور اس کو نوازش شاہانہ سے سرفراز کرکے پانچ ہزاری کا عہدہ عطا فرمایا، پھر بنگالہ کی حکومت پر مقرر کردیا۔

شہباز خاں کو رانا کے علاقے سے بلا کر لشکر اور فوج دے کر خان اعظم کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ اس نے حاجی پور کی سرحدوں پر فوجی کارروائی کی اور کھچی کا جنگل کٹوا کر عرب بہادر کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال بادشاہ نے حکیم الملک گیلانی کو اپنے نئے مذہب کا مخالف سمجھ کر مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اسے بادشاہ نے وہاں کے شریف اور محتاج لوگوں کی امداد کے لیے پانچ لاکھ روپے بطور انعام بھی عطا کیا تھا۔ حکیم آخر عمر تک مکہ ہی میں مقیم رہا:

از سر کوئی تو نمی جنبم
آسمان نیستم زمینم من

اس کو واپس بلانے کے لیے بادشاہ نے متعدد بار فرمان بھیجے تھے، لیکن وہ وہاں سے لوٹ کر نہ آیا اور اپنے رب سے جا ملا۔

مشائخین کی آزمائش

اس سال اکبر نے تمام علاقوں کے بڑے بڑے مشائخین کو بلا کر فتح پور میں جمع کیا اور ہر ایک کے ساتھ مجلس منعقد کر کے مختلف باتوں کی تحقیق کرتا رہا۔ ان مشائخین میں سے اکثر محض خوشامدی اور چند بیگھہ زمین کے لالچی تھے۔ بادشاہ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان میں سے کسی کی کوئی خرق عادت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خرق عادت کے کرتب ان کو کیا آتے وہ تو دشمنوں ہی کے حصے میں لکھے گئے ہیں اور جہاں تک علو اخلاق کا معاملہ تھا کہ اس سے مطلب ترک دنیا، تجرد، توکل، استغنیٰ اور عالی حوصلگی ہے وہ سب ان اوصاف سے نا آشنا تھے۔ بادشاہ نے جب ان میں بجز خوشامد اور چاپلوسی کے کوئی اور جوہر نہیں پایا تو ان سے اور دین حق سے اس کی بدگمانی پہلے سے کہیں زیادہ اور دو چند ہو گئی:

پوشیدہ مرقعہ این خامی چند بگرفتہ بطامات الف لامی چند
نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند بدنام کنندہ نکو نامی چند

ان مشائخین میں شیخ عبد العزیز کے بڑے خلیفہ شیخ جالکیدہ بھی تھے جن کو اکبر نے

عبادت خانے میں ٹھہرایا تھا وہ دکھاوے کے لیے نماز معکوس پڑھا کرتے تھے اور اپنے زہد و عبادت کا بڑا مظاہرہ کرتے تھے۔ اکبر کی کسی حرم کے متعلق یہ کہا کہ اس کو لڑکا ہوگا اس کو بجائے لڑکے کے لڑکی ہوئی۔ ان کی اور بھی قابل اعتراض حرکتیں دیکھنے میں آئیں۔ اسی طرح سید ہاشم فیروز آبادی نے بڑے ٹھاٹھ اپنی مشیخیت کی دکانداری شروع کر دی۔ ان لوگوں کی یہ حرکتیں بھی بادشاہ کی بد اعتقادی میں اضافہ کا سبب بن گئیں۔

شیخ مبھی افغان کاسی کو پنجاب سے بلایا گیا تھا وہ حسب الحکم قاصدوں کے ساتھ خانقاہ سے پیدل ہی چلا اور اس کی پالکی اس کے پیچھے خالی ہی لائی گئی وہ فتح پور میں شیخ جمال بختیار کے مکان میں آکر ٹھہرا اور پیغام بھجوایا کہ "میری ملاقات کسی بھی بادشاہ کے لیے مبارک نہیں رہی ہے"۔ اکبر نے اس سے ملاقات نہیں کی اور جلد ہی اسے رخصت کر دیا۔

شیخ الہدیہ خیر آبادی بھی جو توکل و فقر میں بڑے نامور تھے، انھوں نے بادشاہ سے کوئی اراضی قبول نہیں کی تھی، دربار میں تشریف لائے۔ ان کا سلسلہ طریقت بھی بڑا وسیع تھا۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے شیخ ابو الفتح بھی آئے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے میں نے سلیم شاہ کے آخری عہد میں اپنے استاد علامہ میاں حاتم سنبھلی کے حسب الحکم" ارشاد قاضی" اور حاشیہ پڑھا تھا اور اب وہ اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔ اپنے علم احوال و معاملات میں نہایت کھرے اور بے لاگ ہیں۔

جب شیخ الہدیہ دربار میں آئے تو اکبر ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب بادشاہ نے حال احوال پوچھا تو انھوں نے اپنے کان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں، بادشاہ نے ان کو مزید زحمت نہیں دی اور جلد ہی رخصت کر دیا۔

امامت و نبوت کا دعویٰ

اسی سال دربار کے کمینے اور ذلیل علماء نے جو درحقیقت جاہل محض تھے، من گھڑت دلیلیں دے کر بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ اس عہد کے صاحب زماں "خود حضور والا" ہیں۔ آپ کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔

شریف نے محمود پسی خانی کے رسالوں سے یہ شہادت بھی نکال دکھائی کہ اس نے صراحتاً کہا ہے کہ "990ھ/1582ء میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا"۔ پھر اس نے بتایا کہ "صاحب دین حق" کے کلمے کے "جمل" کے حساب سے 990 عدد ہوتے ہیں اور اس کے مصداق صرف حضور والا ہی ہیں۔

خواجہ مولانا شیرازی ملا نجومی مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آیا جس میں درج تھا کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہو چکی ہے اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آ گیا ہے۔ اس کی مزید دلیل میں خود اس نے بھی ایک رسالہ مرتب کر کے پیش کیا۔ ایسی ہی خرافات شیعوں نے بھی حضرت امیر المومنین علیؓ سے منسوب کر کے پیش کیں۔ بعض یہ رباعی پڑھ پڑھ کر سناتے تھے جو حکیم ناصر خسرو سے منسوب ہے

در نہ صد و ہشتاد و نہ از حکم قضا
آیند کواکب از جوانب یکجا
در سال اسد ماہ اسد روز اسد
از پردہ بروں خرامد آں شیر خدا

یہ سب باتیں نبوت کے دعوے کا سبب بنیں اور اکبر نے صراحتاً و لفظاً نہیں مجملاً و معناً نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

شاہ منصور کی برطرفی

اس زمانے میں راجہ ٹوڈرمل کا عریضہ پہنچا کہ "میں نے اب تک بڑے تدبر و حسن سلوک سے معصوم خاں فرنخودی کو اپنے ساتھ لگائے رکھا ہے، لیکن خواجہ منصور دیوان اس سے اور ترسون محمد خان سے بقایا کا بڑی سختی سے تقاضا کرتا رہتا ہے اور ان کو بہت ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے۔ اس کے رویے سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ اس نازک وقت میں ایسی باتیں لشکر میں تفرقے کا باعث ہو جاتی ہیں"۔

شاہ منصور کی تخت گیریوں کی اس سے پہلے بھی بار بار خبریں مل چکی تھیں اس لیے بادشاہ نے اس کو بے دخل کر کے مصلحتاً چند دن کے لیے اسے شاہ قلی خان محرم کی نگرانی میں دے دیا اور اس کی جگہ آصف خاں ہروی کے بھائی وزیر خاں کو دیوان کل بنا دیا اس کا مددگار قاضی علی بغدادی جیسے منحوس دل آزار چند قسم کے آدمی کو مقرر فرمایا کہ یہ دونوں مل کر معاملات کو سرانجام دیں۔ اس تدبیر کے کیا کہنے؟

بغیر کان کا آدمی

اس زمانے میں بادشاہ کے پاس ایک ایسے آدمی کو لایا گیا جس کے کان سرے سے تھے ہی نہیں اور نہ سماعت کے لیے کوئی سوراخ تھا، لیکن وہ جو کچھ کہا جائے بخوبی سن لیتا تھا اس کے کانوں کی جگہ بالکل صاف اور سپاٹ تھی۔

گونگے محل کا تجربہ

اسی سال بادشاہ کو ایک اور خبط ہوا کہ چند شیر خوار بچوں کو آبادی سے دور ایک مکان میں رکھا جائے وہ کسی آواز کو سن نہ سکیں اور ان کی نگہداشت کے لیے تربیت یافتہ دایہ مقرر کی جائیں اور ان کو کوئی بات نہ سکھائی جائے تاکہ اس حدیث "**کل مولود علی الفطرۃ**" (ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے) کی تحقیق ہو جائے اور دیکھیں کہ یہ بچے کس دین اور مذہب کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے پہلے کون سا کلمہ ادا ہوتا ہے۔ اس عجیب و غریب تجربے کے لیے 20 شیرخوار نو مولود بچوں کو روپیہ پیسہ دے کر ان کے والدین سے جدا کیا گیا۔ ایک خالی ویران محل میں ان کو رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس محل کا نام "گنگ محل" رکھا۔ تین چار سال بعد معلوم ہوا کہ وہ سب بچے گونگے ہو گئے ہیں۔ محل کی وجہ تسمیہ پوری اتری۔ اکثر معصوم بچے تو اسی گنگ محل سے آغوش لحد میں جا پہنچے:

مادرم خاک است و من طفل رضیع
میل طفلان نیست بر مادر بدیع

زود باشد کہ رسیدہ ز اضطراب
درکنار مادر افتم مست خواب

اسی سال بادشاہ نے شاہزادہ دانیال کو اس کے استاد شیخ فیضی، شیخ جمال بختیار اور امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ اجمیر روانہ کیا اور وہاں کے فقراء کے لیے پچیس ہزار روپیہ بھی بھیجا۔

معصوم خاں کا تبادلہ

راجہ ٹوڈرمل اور دوسرے تمام بادشاہی امراء نے اس سال حاجی پور میں برسات کا موسم گزارا اور معصوم خاں فرنخودی جو لشکر سے سخت ناراض ہو گیا تھا، امراء سے اجازت لیے بغیر جونپور چلا گیا اور وہاں جا کر باغی بن بیٹھا۔ بادشاہ نے پیشرو خاں عرف مہتر سعادت داروغہ فراش خانہ کے ہاتھ اس کی تسلی اور دلاسے کے لیے ایک عنایت آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے اودھ کا علاقہ دے کر جونپور پر ترسون محمد خاں کو مقرر کر دیا۔ معصوم خاں نے اس تبادلے پر الٹی سیدھی باتیں کیں پھر اس خیال سے کہ اودھ ایک سرحدی علاقہ ہے جو اس کے لیے نسبتاً بہتر رہے گا وہاں چلا گیا اور جنگ و بغاوت کے منصوبے باندھتا رہا۔

مہتر سعادت نے دربار میں واپس آ کر جونپور وغیرہ کے حالات تفصیل سے بتائے اور اس فتوے کا بھی تذکرہ کیا جو ملا محمد یزدی نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کے متعلق دیا تھا۔ دراصل اسی سبب سے ملا محمد یزدی اور میر معز الملک کو دربار میں بلایا گیا تھا۔

نیابت خاں کی بغاوت

اسی زمانے میں ہاشم خاں نیشاپوری کے لڑکے نیابت خاں نے بغاوت کر دی جسے بادشاہ نے پٹنہ کے سفر کے وقت جوسی اور پیاگ کی جاگیر عطا کی تھی۔ نیابت خاں نے کنترہ پر حملہ کر دیا۔ وہاں اس وقت اسماعیل قلی خاں کی جانب سے الیاس خاں نامی ایک پٹھان حاکم تھا۔ اس جنگ میں الیاس خاں مارا گیا اور نیابت خاں نے کنترہ کے قلعے کا محاصرہ کرتے

بڑی لوٹ مار مچائی۔ بادشاہ نے اس کے مقابلے پر اسماعیل قلی خاں، وزیر خاں، مطلب خاں، شیخ جمال بختیار اور دوسرے امرا کو نامزد کیا اور مسخرے بیربر کو معصوم خاں فرنخودی کو اطمینان و دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا۔ وزیر خاں کے رخصت ہونے کے بعد خواجہ شاہ منصور کو قید سے رہائی دے کر دوبارہ دیوانی کے عہدے پر مقرر کر دیا۔

جب نیابت خاں کو شاہی امرا کے حملے کا پتہ چلا تو وہ کڑہ کا محاصرہ چھوڑ کر قصب ہوتے ہوئے پٹنہ کی طرف چلا گیا۔ شاہی لشکر نے بھی دریا پار کر کے اس کا تعاقب کیا۔ ان کو قریب دیکھ کر نیابت خاں بھی پلٹ پڑا اور اس نے ان تمام امیروں کے ساتھ تنہا ایسی سخت لڑائی لڑی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پے در پے حملوں سے اس نے بادشاہی فوج کو زیر و زبر کر دیا۔ معرکۂ کارزار میں شیخ جمال کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا، لیکن اسے جلد ہی رہا بھی کر دیا۔ باوجود اس دلاوری کے اسے امرا نے شکست دے دی اور وہ اودھ میں معصوم خاں کے پاس چلا گیا۔ عرب بہادر بھی اس موقعے پر شہباز خاں کے مقابلے میں شکست کھا کر اودھ چلا گیا۔ شہباز خاں عرب بہادر کا تعاقب کرتے ہوئے جونپور اور اس کے بعد اودھ پہنچا۔

معصوم خاں کی بغاوت

اودھ میں معصوم خاں نے کافی ساز و سامان مہیا کر لیا تھا۔ اس کی تیاریاں اتنی تھیں کہ اگر کچھ مبالغے سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت ایران و توران کے بادشاہوں سے بھی جنگ کر سکتا تھا۔ تیس چالیس جھنڈے، نشان، نقارے اور دوسرا سارا سامان جنگ پوری طرح تیار تھا۔ اس نے اپنی آراستہ و پیراستہ فوج کے ساتھ شہباز خاں پر حملہ کیا اور ایک ہی حملے میں اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ شہباز خاں ایک دن میں 40 کوس راستہ طے کر کے جونپور واپس چلا آیا۔ ترسون محمد خاں شہباز خاں کے کمینے پر مقرر تھا وہ لڑائی کے وقت ایک جنگل میں چھپا ہوا تھا۔

جب شہباز خاں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور معصوم خاں کی فوج مال غنیمت لوٹنے

میں منتشر ہوگئی اور میدان میں معصوم خاں کے ساتھ مختصر سی جمعیت رہ گئی تو ترسون محمد خاں نے اچانک حملہ کر کے اس کو شکست دے دی۔ جب شہباز خاں کو یہ خبر ملی تو وہ الٹے پاؤں لوٹ کر دوسرے دن ترسون محمد خاں سے آکر مل گیا پھر دونوں نے مل کر معصوم خاں پر حملہ کر دیا۔

اودھ کے قریب دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی اور معصوم خاں شکست کھا کر بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ گیا۔ اس کی ماں، بہن، بیوی، بچے اور سارا مال و اسباب شاہی لشکر کے ہاتھ آ گیا۔ معصوم خاں نے سوالک کی پہاڑی تک پلٹ کر نہیں دیکھا اور بادشاہی علاقے سے نکل گیا۔ یہ واقعہ 988ھ/ 1580ء میں پیش آیا۔

ارغنون باجے کی نمائش

ارغنون باجا جو ایک عجیب و غریب چیز ہے، حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لے کر آیا تھا۔ انہی دنوں اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ باجا ایک قد آدم صندوق میں بنا ہوا ہے۔ ایک فرنگی اس میں بیٹھ کر اس کے تار چھیڑتا ہے، اس کے باہر مور کے پانچ پر اور دوسرے تال سُر لگے ہوئے تھے جن کو وہ اور آدمی انگلیوں سے بجاتے تھے۔ دیکھنے والے نہایت لطف اندوز ہو رہے تھے اور بجانے والے فرنگیوں کا چہرہ ہر لحظہ سرخ و سپید ہوتا جاتا تھا اور وہ خوب مست ہو ہو کر اسے بجاتے جاتے تھے۔ اس عجوبے کو دیکھ کر اہل محفل حیران رہ گئے۔ اس کی تعریف و توصیف حد بیان سے باہر ہے۔

اکبر نے اس محفل میں لوگوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ اس زمانے میں سب سے عقلمند کون ہے؟ بادشاہوں کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں"۔ ہر شخص جس جس پر اعتقاد رکھتا تھا اس کا نام لینے لگا۔ حکیم ہمام نے کہا "میں تو اپنے آپ ہی کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہوں۔ شیخ ابوالفضل نے اپنے باپ کا نام لیا۔

اخلاص کے چار درجے

ان دنوں بادشاہ کے ساتھ اخلاص کے چار درجے قرار دیے گئے تھے۔ ترک مال، ترک جان، ترک ناموس اور ترک دین۔ جو شخص بھی ان چاروں مدارج کو طے کر لیتا اس کا

چہارگانہ اعزاز ہوتا اور جو کسی ایک درجے تک پہنچا تھا اس کا اعزاز اسی مناسبت سے مقرر ہوتا، ویسے سب کے سب بادشاہ کے مرید سمجھے جاتے۔

مرزا محمد حکیم کا ہندوستان پر حملہ

989ھ/1581ء میں خبر پہنچی کہ مرزا محمد حکیم نے معصوم خاں فرنخودی کے حسب الطلب اپنے ماموں فریدون خاں کے بہکانے سے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس کا ایک سردار شادماں نامی دریائے نیلاب(۲۷) (اٹک) کو پار کر آیا لیکن مان سنگھ ولد بھگوان داس نے اس پر فوج کشی کی اور اسے قتل کرا دیا۔ جب مرزا کو یہ خبر ملی تو وہ دریا پار کر کے سید پور کے علاقے میں آ گیا۔

مرزا حکیم سے مقابلے کے لیے بادشاہ نے فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہیں ادا کیں۔ شاہزادہ دانیال کو سلطان خواجہ صدر اور شیخ ابراہیم چشتی کے ساتھ اپنی نیابت کے لیے دارالخلافہ میں چھوڑا اور خود فتح پور سے پنجاب روانہ ہو گئے۔ فتح پور سے 15 کوس پر سرائے باد میں شہباز خاں کی فتح کی خبر پہنچی۔

مان سنگھ نے جب شادمان کے اسباب کی تلاشی لی تو اس کے خزدان سے مرزا محمد حکیم کے تین فرمان برآمد ہوئے جو اس نے حکیم الملک گیلانی، شاہ منصور دیوان اور محمد قاسم خاں میر بحر کے نام لکھے تھے۔ اس کے وہ فرمان بادشاہ کے پاس بھیج دیے گئے۔ بادشاہ نے انھیں پڑھ لیا لیکن ان کا راز افشا نہ کیا۔ دہلی میں خبر ملی کہ مرزا لاہور پہنچ چکا ہے اور وہاں وہ مہدی قاسم خاں کے باغ میں ٹھہر گیا ہے اور لاہور کے قلعے میں راجہ بھگوان داس مان سنگھ اور سعید خاں محصور ہو گئے تھے۔

شاہ منصور کی سازش

جب لشکر پانی پت میں پہنچا تو مرزا محمد حکیم کا وزیر ملک ثانی کابلی جس کا خطاب وزیر خاں تھا اس سے ناراض ہو کر لشکر شاہی میں آ گیا اور شاہ منصور کے پاس اس نے قیام کیا اور اس

کے ذریعے خدمت شاہی میں حاضر ہونا چاہا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی سابقہ ربط و ضبط نہ تھا، اس لیے اکبر کو خیال ہوا کہ یہ بھی مرزا کی کوئی چال ہے کہ اس کا وزیر اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑ کر شاہ منصور کے پاس آ کر ٹھہرا ہے۔ اس واقعے سے شاہ منصور کے متعلق بادشاہ کی بدگمانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اسے قید کر کے فرامین جاری کر دیے گئے۔ اس نے بہت کچھ قسمیں کھائیں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا کیوں کہ یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ معاملات میں قسم کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

جب سواری شاہ آباد پہنچی تو قاضی علی کے بھائی ملک علی نے جو اب لاہور کا کوتوال ہے، تو اس نے دو خط پیش کیے۔ ایک شاہ منصور کے نام تھا جسے شاہ منصور کے ملازم شرف بیگ نے لکھا تھا، دوسرا گمنام تھا۔ ان خطوط میں پہلے فریدون خاں سے بعد میں مرزا سے ملاقات کا ذکر تھا اور یہ کہ میرزا نے پرگنہ کی معافی عطا کر دی ہے، پرگنہ کا نام شاید درج تھا یا نہیں تھا۔ دونوں خط ایک تھیلی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط سے قیاس کیا گیا کہ شاہ منصور کا ملازم شرف بیگ پرگنہ فیروزپور کا جو لاہور سے 30 کوس پر ہے، شقدار تھا اس نے اپنے مالک کو اطلاع دی کہ میں نے فریدون کے توسط سے میرزا سے ملاقات کی۔ میرزا نے ہر جگہ اپنے عاملوں کو مقرر کر دیا ہے لیکن ہمارے پرگنے کو معافی دے دی ہے۔

ان خطوط سے بادشاہ کی بدگمانی یقین میں بدل گئی۔ اس موقعے پر اکثر بلکہ تمام امیروں نے جو شاہ منصور کے ہاتھوں بڑی اذیتیں اٹھا چکے تھے اور اس کی تباہی کے دل و جان سے خواہاں تھے اس کے قتل پر متفقہ طور سے اصرار کیا، چنانچہ بادشاہ نے دوسرے دن صبح خدمت رائے کو حکم دیا کہ اس کو کچھوکوٹ کی منزل میں گلا کاٹ کر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ شاہ منصور نے خلق خدا پر جو ستم ڈھائے تھے وہ خالی نہیں گئے، مظلوموں کی فریاد اس کے گلے کا ہار بن کر رہی۔

خوش باش کہ ظالم نبرد رہ بہ سلامت

مرزا عبدالحکیم کا فرار

بادشاہی لشکر سرہند کے راستے سے کلانور اور رہتاس پہنچا اور وہاں سے نیلاب پر جا کر

ڈیرے ڈال دیے۔ مرزا کو یہ خبر ملی تو وہ لاہور کے دریا کو پار کر کے فرار ہو گیا اور کابل تک اپنی باگ نہ کھینچی۔

اسی سال ماہ ربیع الثانی میں بادشاہ نے نیلاب کے کنارے جو سندھ ساگر کے نام سے مشہور ہے، کٹک بنارس، کی طرح ایک قلعہ ''کٹک بنارس'' تعمیر کروایا۔ وہاں سے شاہزادہ سلطان مراد کو قلیج خاں اور دوسرے امرا کے ساتھ کابل پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ ان کے آگے سنگھ کو سرداروں کی جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف بھیجا۔

انھی دنوں مرزا عبدالحکیم نے خواجہ ابوالفضل نقشبندی اور محمد علی دیوانہ کو اپنے قصور معاف کرانے کے لیے ایلچی بنا کر بھیجا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ حاجی حبیب اللہ کو بھیج کر پیغام دیا کہ اسے معافی اس شرط پر مل سکتی ہے کہ اپنے کیے پر ندامت ظاہر کرکے آئندہ منحرف نہ ہونے کی قسم کھائے اور اپنی بہن کو جو خواجہ حسن کے نکاح میں ہے بارگاہ میں روانہ کردے۔ مرزا نے حاجی سے کہا کہ بہن کو بھیجنے کے لیے خواجہ حسن راضی نہیں ہے اور وہ اسے لے کر بدخشاں چلا گیا ہے البتہ میں اپنے قصوروں پر پشیمان ہوں

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیمان شدہ ام
کافرم باز نگوئی کہ مسلمان شدہ ام

اکبر کا کابل کے لیے عزم

15 جمادی الثانی کو بادشاہ نے نیلاب کو پار کر کے خواجہ نظام الدین احمد کو حملہ کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے پاس جلال آباد جانے کا حکم دیا اور امرا کو کہلا بھجوایا کہ وہ اپنے مشورے سے اطلاع کریں۔ انھوں نے جواب بھیجا کہ حضور کا حملہ کرتے ہوئے یہاں آنا ہی مناسب ہے۔ نظام الدین احمد اور حاجی حبیب اللہ ایک ساتھ پشاور پہنچے اور اپنے اپنے پیغام خدمت میں پیش کیے۔

نظام الدین احمد نے کہا اگرچہ امرا کہنے کو تو کہہ رہے ہیں کہ اس مہم کے لیے ہم لوگ کافی ہیں لیکن درحقیقت وہ سب فتح کو حضور کی تشریف لانے پر ہی منحصر سمجھتے ہیں۔

اب بادشاہ نے بھی پیش قدمی کا فیصلہ کرلیا اور لشکر میں شاہزادہ سلطان سلیم کو راجہ بھگوان داس اور قاضی علی میر بخشی کے ساتھ چھوڑ کر خود اپنی خاص جمعیت کے ساتھ کوچ کیا اور روزانہ 20 کوس کی مسافت طے کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے لشکر سے 15 کوس پر موضع سرخاب میں پہنچ گیا۔

مرزا عبدالحکیم کی شکست

مرزا محمد حکیم نے کابل سے 7 کوس کے فاصلے پر خورد کابل نامی موضع میں اپنے بھتیجے کے ساتھ شاہزادہ مراد کے لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری سے جنگ کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ خاں اوزبک کے پاس بھاگ جائے کہ شاہزادہ مراد کابل میں داخل ہو گیا۔

اس جنگ سے ایک دن پہلے فریدون خاں نے شاہزادہ کے چند اول پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ جس وقت یہ لوٹ مار ہو رہی تھی، حاجی محمد نام کا ایک احدی بادشاہ کے پاس سے ڈاک چوکی کے سلسلے میں وہاں پہنچا تھا اس نے یہ سارا حال دیکھا اور لوٹ کر سرخاب میں اس واقعے کی بادشاہ کو خبر دی۔ اس خبر سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی دوسرے دن جب وہاں سے کوچ ہونے لگا تھا کہ فتح کی خبر پہنچ گئی۔

کابل میں شاہانہ شان و شوکت سے داخلہ

10 رجب کو بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی۔ بادشاہ نے اس شہر کے باغوں کی سیر و تفریح میں ایک ہفتہ بسر کیا۔ بادشاہ نے کابل میں مرزا محمد حکیم کے معتمد آدمیوں سے شاہ منصور کے موسومہ خطوط کے بارے میں بڑی تحقیق و تفتیش کی اور پتہ چلا کہ یہ سب اس کے خلاف ایک سازش تھی جو شہباز خاں کے بھائی کرم اللہ نے بعض امیروں سے ساتھ مل کر کی تھی اور وہ آخری خط بھی اس کے سبب سے امیروں کا لکھا ہوا تھا۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو بادشاہ کو شاہ منصور کے قتل پر بڑا رنج و افسوس ہوا۔ لیکن اب اس پشیمانی سے کیا حاصل ہوتا؟

بادشاہ نے میرزا کے پاس لطیف خواجہ میر شکار کو بھیج کر اس کو قصوروں کی معافی کی خوش خبری پہنچائی اور اسے اوزبکوں کی پناہ میں جانے سے منع کر دیا۔ مرزا حکیم نے اطاعت اور وفاداری کا عہد و پیمان کیا اور علی محمد اسپ کے ساتھ وہ خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے کابل اس کے حوالے کر دیا اور وہاں لشکر کو مقرر کر کے حملہ کرتے ہوئے جلال آباد واپس چلے آئے جہاں لشکر کا بڑا کیمپ تھا۔

اکبر کی واپسی

اس موقعے پر محمد قاسم خاں میر بحر کا بھائی خواجگی محمد حسین جو میرزا کا بڑا معتبر امیر تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے جلال آباد سے کافروں کے علاقے کوہ فتور پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج کو مقرر کیا اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے 12 شعبان کو سند ساگر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک ہی دن میں دریا کے پل پر سے سارے لشکر کو پار کرائے مسلسل کوچ کرتے ہوئے رمضان کی آخری تاریخ کو لاہور آ گئے۔ پنجاب کی حکومت دوبارہ سعید خاں، راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ کے سپرد کر دی اور دوآبہ پنجاب کے اماموں کے معاملات کی تحقیق و تصفیہ کے لیے ملا الہداد امروہی، ملا الہداد سلطان پوری اور ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور ملا شیری شاعر کو صدارت کے عہدے پر مقرر کیا۔ ان میں سے پہلے اور چوتھے صدر نے نیکی اور عدل میں شہرت پائی۔ دوسرے اور تیسرے صدر اپنی بدنیتی کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ ملا شاہ محمد نے تو شیخ اسحاق کاکول جیسے پاکباز متقی اور پرہیزگار عالم کو پروانہ میں یہ فقرہ لکھ بھیجا تھا۔ "یا قومنا اجیبوا داعی الله" دوآبہ ہند میں شیخ فیضی کو صدر مقرر کیا گیا، گنگا پار کے علاقے پر حکیم ابو الفتح کو صدارت ملی اور دار الخلافہ کا صدر میر فتح اللہ کو مقرر کیا گیا۔

جب سواری پانی پت میں پہنچی تو اس جگہ شہباز خاں جس نے بادشاہ کے غائبانے میں کرہی سے لے کر پنجاب تک سارے ممالک محروسہ کو اپنے طور پر لوگوں کی جاگیروں میں تقسیم کر دیا تھا اور جس کو بھی چاہے عہدے عطا کر دیے تھے، بڑے تزک و احتشام کے

ساتھ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ جب بادشاہ نے اس خود اختیاری اور جرات کے متعلق باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں فوج کی اس قدر دل دہی نہ کرتا تو سب کے سب برگشتہ ہو جاتے۔ اب ملک تمہارا ہے، لشکر تمہارا ہے، جسے چاہو دے دو اور جس سے چاہو منصب اور جاگیر واپس لے لو

ز ہر کہ خواہی بستان بہ ہر کہ خواہی بدہ

25 شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے، پیچھے سے شاہزادوں اور بیگموں نے بادشاہ کا استقبال کیا۔ یہاں سے بادشاہ نے کوچ کیا اور 5 ذی قعدہ کو دارالخلافہ پہنچ گئے۔

چند دن کی مستی

اس سفر میں میں ساتھ نہ جا سکا تھا، مجھے ایک بندہ خدا سے ایسا تعلق ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک بساور میں ہی رہا اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب اور سخت مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پورا سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں فتح پور گیا اور اسی مہینے کی 6 تاریخ کو بارگاہ میں حاضری دی، بادشاہ نے شیخ ابو الفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں کیوں ساتھ نہیں تھا؟ اس نے کہا" یہ بھی تمام مفت خور بدمعاشوں میں شامل ہے" میری غیر حاضری کا قصہ بس اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو ساتھ نہیں آئے ہیں سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین (۱۵) مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے، جن سے میری دوستی ایک سال سے قائم تھی اور بڑا تعلق خاطر ہو گیا تھا، مجھے مریض لکھوا دیا اور فہرست پیش کرا دی۔ مرحوم نظام الدین تمام احباب کے ساتھ عام طور سے دل سوزی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے، مجھ پر تو ان کی خاص مہربانی تھی۔ اس دوران انھوں نے مجھے پے در پے کئی خط بھی لکھے تھے اور تاکید کی تھی کہ چونکہ تم لشکر کے ساتھ آ نہیں سکے ہو اس لیے اب استقبال کے لیے کم از کم لاہور، دہلی یا متھرا جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش

کرو، کیونکہ یہ دنیاوی معاملات ہیں اور ان میں احتیاط برتنا ضروری ہے"۔ اس بے چارے نے خیرخواہی سے یہ سب کچھ لکھا، لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہو رہا تھا، مصلحت اور نفع و نقصان کی فکر کسے تھی:

تو با خدای خود انداز کار و خوش دل باش

کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

اس مستی و کیف کے عالم میں حالت خواب میں کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ ایک رات نیند میں میں نے یہ شعر کہا تھا اور بیدار ہونے کے بعد عرصے تک اس کو یاد کر کے میں مضطرب و بے قرار رہا:

آئینہ ما روی ترا عکس پذیر است
گر تو ننمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العزت کی قسم کہ اس واقعے کو گزرے ہوئے تادم تحریر 17 سال بیت گئے ہیں ابھی تک اس ذوق و سرمستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں زار زار رونے لگتا ہوں، کاش کہ میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا:

خوش آنکہ دید روی ترا و سپرد جان
آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھے سر رشتہ معرفت ہاتھ آ گیا تھا اور میرا دل ایسے فیض سے سرشار تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا ہوں اور شکر بجا لاؤں تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا:

در گوش دلم نہ یک زمزمۂ عشق
زان زمزمہ ام زپای تا سر ہمہ عشق
حقا کہ بہ عہدہا نیایم بیرون
از عہدۂ حق گزاری یک دمہ عشق

ترہت میں بغاوت

بادشاہ جس زمانے میں کابل کی طرف متوجہ تھے، ترہت کے علاقے میں بہادر ولد سعید بدخشی نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ اپنا خطاب بہادر شاہ رکھا تھا اور اپنی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

بہادر الدین سلطان است بن اسفید شہ سلطان
پدر سلطان و خود سلطان زہی سلطان بن سلطان

آخرکار وہ اعظم خاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

معصوم خاں کا قتل

معصوم خاں فرنخودی کوہ سوالک میں حیران و پریشان گھومتا رہا۔ آخر اس نے اعظم خاں کو وسیلہ بنا کر اپنے قصوروں کی معافی کے لیے لکھا۔ بادشاہ نے اس کی دلجوئی کے لیے فرمان بھیج دیا اور وہ فتح پور میں آ کر کورنش بجا لایا۔ چند دن بعد آدھی رات کے وقت وہ دربار سے اپنے گھر سنگھاسن پر سوار ہو کر جا رہا تھا کہ شہر کے دروازے کے باہر ٹھگوں کے گروہ نے اس کو گھیر لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نیابت خاں کا قتل

جس دن معصوم ملازمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اسی دن نیابت خاں بھی بیگم بادشاہ کے توسط سے خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس کے چچا شہاب الدین احمد خاں جو مالوہ کا حاکم تھا کی خاطر اس کی جان بخشی کر دی اور کچھ دن کے لیے رنتھنبور کے قلعے میں بھیج دیا۔ وہ اسی قلعے میں قید تھا۔ اسی قید کی حالت میں اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جو ناقابل بیان ہیں۔ اس نے وہاں بھی دوسرے قیدیوں کو ہموار کر کے فتنہ و فساد مچانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس کی ان حرکتوں سے بادشاہ نے 997ھ میں فرمان بھیج کر اس کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم جو بڑی نیک، خدا رسیدہ اور فیاض خاتون تھیں اور دہلی میں جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے روضے کی مجاورت اختیار کر رکھی تھی فوت ہوگئیں۔ ان کے انتقال سے روضے کے مجاوروں اور وہاں کے باشندوں کے معاملات میں بڑی خرابی اور انتشار پیدا ہوگیا۔

عیسائی سے مناظرہ

بادشاہ نے فرنگی راہبوں سے بحث و مناظرے کے لیے شیخ قطب جلیسری کو جو نہایت بدمست مجذوب تھا۔ شیخ جمالی بختیار کے ذریعے بلوایا اور اس مجلس میں اس عہد کے تقریباً تمام دانشوروں اور صاحب اجتہاد عالموں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ شیخ نے کہا خوب بھڑکتی ہوئی آگ جلائی جائے، اس آگ میں میں اور میرے مقابل حریف داخل ہوں گے، جو صحیح سلامت نکل آئے گا وہی حق پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آگ جلائی گئی اور اس نے فرنگی راہب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا ''چلو آؤ بسم اللہ'' فرنگیوں میں اور کسی کو اس آگ میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ بادشاہ فرنگیوں کو ناکام ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مارے غیرت کے شیخ قطب کو چند دوسرے فقراء کے ہمراہ بھکر بھجوا دیا۔ یہ لوگ اپنے آخری وقت تک اسی جگہ رہے۔ اس طرح بہت سے فقراء کو مختلف مقامات پر جلاوطن کر دیا۔ اکثر کو تو قندھار بھیج کر ان کے عوض وہاں سے گھوڑے منگوا لیے۔

فقراء کی جلاوطنی

اس زمانے میں فقیروں کی ایک جماعت الہیوں کے نام سے مشہور تھی۔ یہ لوگ پیری مریدی کا سلسلہ چلائے ہوئے تھے اور طرح طرح کی بیہودہ اور گمراہ کن باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان فقیروں کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم ان بیہودہ عقائد سے توبہ کرو۔ انھوں نے مہمل باتیں کر کے توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ان فقیروں نے دین اسلام میں روزہ وغیرہ کے نئے نئے نام اختراع کر رکھے تھے۔ بادشاہ نے ان

فقیروں کو بھی بھکر اور قندھار بھیج کر ترکی نسل کے گھوڑے ان کے عوض منگوا لیے۔

شیخ ادھن کے پوتوں کو بھی جو جونپور کے بڑے مشائخ میں سے تھے اہل و عیال کے ساتھ دربار میں بلایا گیا اور ان کو اجمیر بھیج کر وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان میں سے دو تین افراد تو انتقال کر گئے اور اس خاندان کے دوسرے لوگ نہایت تنگ دستی کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین کے پوتے شیخ حسین نے حسب دستور تعظیم و تسلیمات بجالانے سے انکار کر دیا تھا اور اخراج کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ مکہ معظمہ کو چلے گئے تھے۔ انھی دنوں مکہ سے فتح پور واپس تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے پہلے کی طرح کورنش ادا نہیں کی۔ بادشاہ نے ان کو بھی سرکش جان کر بھکر میں بھجوا دیا۔ 1002ھ میں نظام الدین احمد، شیخ حسین اور شیخ کمال بیابانی وغیرہ کو بھکر سے دربار میں بلایا گیا۔ ان لوگوں نے زمین بوس کی رسم ادا کر دی اس لیے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن کمال بیابانی کو رنتھنبور کے قلعے میں بھیج دیا اور شیخ حسین کے لیے بھکر ہی میں مدد معاش کا انتظام کرا کے اس جگہ مقرر کر دیا۔

اعظم خاں کی بنگالہ سے آمد

9 محرم 990ھ کو اعظم خاں بنگالہ سے آ کر حاضر ہوا۔ ایک رات گفتگو کے دوران بادشاہ نے اس سے کہا ہم مضبوط دلیلوں کی بنا پر عقیدۂ تناسخ کو حق سمجھتے ہیں۔ شیخ ابوالفضل تم کو بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھا دے گا، اعظم خاں نے یہ بات قبول کر لی، بادشاہ نے اسے ان امیروں کے ساتھ جو کابل کی مہم پر نہ جا سکے تھے معصوم کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کر دیا۔

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال

اسی سال 15 صفر کو نوروز ہوا، اور شاہی تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال شروع ہوا۔ جشن نوروز کے لیے دیوان خانہ خاص اور عام کو بڑے ٹھاٹھ سے سجایا گیا، رنگ برنگے پردے لگائے

گئے، طرح طرح کی قیمتی چیزیں سلیقے سے رکھی گئیں۔ فرنگی پردے اور خوبصورت تصویریں آویزاں ہوئیں، اونچے اونچے سراپردے قائم کیے گئے۔ فتح پور اور آگرہ کے بازاروں میں بھی بڑی دھوم دھام سے آرائش کی گئی اور برابر 18 دن تک نوروز کا شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جشن کی محفلوں میں بے شمار ہندی اور فارسی گوینے موسیقار اور اہل طرب مرد اور عورتیں اپنے اپنے ہنر اور کمال دکھاتی تھیں اور ایوان میں ہر روز کوئی ایک بڑا امیر حاضر ہوتا اور بادشاہ کے لیے قیمتی نذرانہ اور تحائف پیش کر کے ہم نشینی کا اعزاز حاصل کرتا۔

دین الٰہی کا نفاذ

ہجرت پر ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر دیا کہ ہجرت سے نہ سہی حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے تو پورے ہزار سال ہو چکے ہیں اور اب پیغمبر علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کر دیں۔ اس وقت ایسے کسی دعوے اور اعلان کے لیے کوئی رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ سب سے بڑی رکاوٹ علما اور مشائخ کی تھی جن کے اثر و اقتدار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ ان علما کو دربار سے خارج کیا جا چکا تھا، اسی لیے نہایت اطمینان و جسارت کے ساتھ اکبر نے اسلامی احکام کی منسوخی اور ایک نئے دین کے اصول و قواعد کے نفاذ کا فیصلہ کر کے اس سلسلے میں پہلا حکم یہ صادر کیا کہ اب سے سکے پر ''الفی تاریخ'' یعنی کہ ہزارواں سال ثبت کیا جائے اور یہ ہزار سن ''بعثت'' ہجرت سے نہیں بلکہ بعثت سے موسوم کیا جائے۔

دین الٰہی کی بدعتیں

اسی طرح دوسری اور بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیے گئے کہ انھیں دیکھ کر عقل حیران و سر بہ گریباں ہو جاتی تھی۔

ایک حکم تو یہ تھا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہوں کے لیے سجدہ کرنا جائز و لازم ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شراب جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر پی لی جائے اور اس کے پینے سے خلل و فساد نہ پیدا ہو تو وہ جائز ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اتنی پی لے کہ بدمستی کرنے اور شور و غوغا مچانے لگے تو اسے سزا دی جائے گی۔ حسب الحکم دربار کے دروازے پر شراب فروش کی ایک دکان بھی قائم کی گئی جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ یہ عورت کسی شراب فروش کی بیٹی تھی، بادشاہ نے خود شراب کا دام مقرر کیا۔ اس دکان سے ہر شخص علاج کے نام سے منشی کے پاس اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام لکھوا کر شراب خرید سکتا تھا۔ لوگ فرضی نام لکھوا لکھوا کر شراب مول لے جاتے تھے ان کی تحقیق کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس طرح شاہی سرپرستی میں نشے کے بازاروں میں متوالوں کے لیے باقاعدہ سرکاری دکانیں کھل گئیں۔ لوگوں کا بیان ہے اس شراب میں سور کے گوشت کا عرق بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اس احتیاط و سختی کے باوجود لوگ پی پی کر وہاں شور و غوغا مچانے لگے اور ہر روز جھگڑا و فساد ہونے لگا۔ سپاہی روزانہ بدمستوں کو پکڑ کر سزائیں دیتے تھے، لیکن ان کی مستی اتارے نہیں اترتی تھی۔ بادشاہ سلامت اس دکان کو بند بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان ہنگاموں سے عاجز بھی تھے۔

شیطان پورہ

اس زمانے میں پایہ تخت فتح پور میں سارے ملک سے کھینچ کھینچ کر بہت سی طوائفیں اور فاحشہ عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ ان کی تعداد حساب و شمار سے باہر تھی۔ شاہی حکم سے ان عورتوں کو شہر سے باہر بسایا گیا اور ان کی بستی کا نام ''شیطان پورہ'' رکھا گیا اور وہاں بھی محافظ داروغہ اور منشی مقرر کیے گئے کہ جو شخص بھی ان عورتوں کے پاس جائے یا ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو وہ باضابطہ اپنا نام و نسب رجسٹر میں درج کرا دے۔ اس کارروائی کے بعد ہر شخص کو ان رنڈیوں کے ساتھ زنا کرنے کی اجازت رہتی تھی۔ اس دفتری اندراج کے بغیر کوئی شخص کسی عورت کو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ ان میں سے کنواری لڑکیوں

کے ساتھ پہلی شب باشی کی اجازت صرف نامی گرامی امراء کو ہی حاصل تھی وہ بھی داروغہ کو باقاعدہ اطلاع کرکے اور دربار سے اجازت حاصل کرکے کسی امیر کو اس کا موقع دیتا تھا۔ بدمعاشوں نے یہاں بھی فرضی ناموں سے اپنا دھندا بے دھڑک شروع کردیا۔ لوگ بدمست ہوکر جھگڑے فساد کرنے لگے اور عورتوں کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ قصاص میں پکڑے بھی جاتے تھے اور سزا بھی پاتے تھے لیکن ان کی جگہ دوسرے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ یہ جرائم کرنے کے لیے آجاتے تھے۔

حسنِ بی پایانِ او چندان کہ عاشق می کشد
زمرۂ دیگر بہ عشق از غیب سر برمی کند

ان فاحشہ عورتوں میں سے جو مشہور اور نامی گرامی عورتیں تھیں ان کو بادشاہ نے پوشیدہ طور پر اپنے پاس بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے کس شخص نے ان کے کنوارے پن کو توڑا تھا۔ ان عورتوں نے جن مردوں کے نام لیے ان کو سخت سزائیں دیں اور کافی عرصے تک قید میں بھیج دیا۔ انہی میں سے ایک نے راجہ بیربر کا بھی جو "مراتب چہارگانہ" میں سب کا پیشرو اور مخلص مرید تھا، نام لیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑا ہے، وہ اس زمانے میں اپنی جاگیر کورہ میں گیا ہوا تھا، جب افشائے راز کی یہ خبر اس کو ملی تو اس نے جوگی بن جانے کا فیصلہ کرلیا، پھر بادشاہ نے عنایت آمیز فرمان لکھ کر اس کو دربار میں بلالیا۔

گائے کے ذبیحہ پر ممانعت

بادشاہ کو بچپن ہی سے ہندوؤں سے خاصی وابستگی تھی۔ انہی کی صحبت میں گائے کی تعظیم اس کے ذہن نشین ہوگئی تھی، اس لیے گائے کے ذبیحہ کی بھی ممانعت کردی گئی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بہت سی لڑکیاں شاہی حرم میں تھیں، اور وہ بادشاہ کے مزاج پر بہت حاوی تھیں۔ ان کی صحبت کی وجہ سے اکبر گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز کھانے اور داڑھی رکھنے سے پرہیز کرتا تھا اور اپنی مجلس میں ہندوؤں کی رسومات کی پابندی کیا کرتا

تھا۔ غرض ان ہندو عورتوں اور ان کے خاندان والوں کی دلجوئی کی خاطر اکبر نے ان تمام باتوں کو ترک کر دیا جس سے ہندوؤں کے مذہب کو آنچ آتی تھی۔

داڑھی ترشوانے کا رواج

جو لوگ داڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا اس وجہ سے داڑھی منڈوانے کا عام رواج ہو گیا۔ داڑھی منڈوانے کے متعلق بڑی عجیب و غریب دلیلیں پیدا کی گئیں کہ داڑھی کا تعلق اصل میں مرد کے خصیوں سے ہے۔ چنانچہ خواجہ سراؤں کی داڑھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے خصیے ناکارہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ پچھلے زمانے میں ملامتی فرقے کے عبادت گزار لوگ داڑھی رکھنے کو ایک طرح کی ریاضت سمجھ کر رکھا کرتے تھے ان کی دیکھا دیکھی داڑھی رکھنے کا رواج ہو گیا۔ اب اس زمانے میں ریاضت اور ملامت داڑھی رکھنے میں نہیں بلکہ منڈوانے میں ہے۔ کیوں کہ اب اگر داڑھی منڈوائی جائے تو نادان فقیہ اور عالم ناراض ہوں گے اور ملامت کریں گے۔ شاہی مفتی بھی اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دور کی کوڑی لائے اور فقہ کی کتابوں میں سے ایک مجہول سی روایت نکال لائے جس میں یہ فقرہ تھا "**کما یفعله بعض القضاة**" اس فقرہ میں ان بے دین مفتیوں نے تحریف سے کام لیا۔ اصل لفظ "عصات" تھا اس کو "قضات" میں تبدیل کر دیا۔ اب بجائے گناہگاروں کے اس کا مطلب نکلا کہ جس طرح عراق کے بعض قاضیوں کا عمل داڑھی منڈانا تھا۔

زمانے کی نیرنگی دیکھیے کہ جب میں نیا نیا شاہی دربار میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری داڑھی حد شرعی سے کسی قدر کم تھی جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میر ابوالغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو داڑھی کٹانا زیب نہیں دیتا۔ میں نے جواب دیا کہ "یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں"۔ آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا، یہ بات نہایت بدنما اور نازیبا ہے۔ دن ایسے پھرے کہ اسی ابوالفتح نے حیدری جوگی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کرا دیا اور نوعمر بچے کی

طرح چھیل چھبیلا بن کر بال تراشی کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔

تثلیث پرستی

ہندوؤں کی ان رسومات کے علاوہ دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی اور ان کے تین خداؤں کی تصویروں کی زیارت بھی کی جانے لگی۔ طرح طرح کے لہو ولعب شروع ہو گئے۔ اس زمانہ کی تاریخ نکالی گئی'

''کفر شائع شد''

دین الٰہی کے اقرار نامے

دس بارہ سال کے اندر اندر یہ صورت ہوگئی کہ اکثر گمراہ جیسے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور دوسرے بڑے مرتبہ والے امراء نے اپنے ہاتھ سے اس مضمون کے اقرار نامے لکھے کہ میں ''فلاں ابن فلاں'' اپنی خوشی اور مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں، انکار کرتا ہوں اور اب میں دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوگیا ہوں اور اخلاص کے مراتب چہارگانہ یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں''۔ یہ اقرار نامے اس نئے دین کے مجتہدین کو سپرد کر دیے جاتے تھے اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا کرتا تھا۔

کتے اور سور کی پاکی

احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دے دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک جانوروں کو شاہی محل کے نیچے رکھا گیا۔ بادشاہ ہر صبح ان کے دیدار کو عبادت سمجھتا تھا، کیونکہ ہندوؤں نے یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ سور ان 10 مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے۔ کتے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول سند تھا کہ کتے میں ایسی 10 محمود صفات ہیں اگر ان میں سے ایک صفت کسی آدمی کو مل جائے تو وہ ولی بن

جائے۔ دربار کے بعض مقرب اور ملک الشعرا فیضی تو اپنے دسترخوان پر چند کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھا کرتا تھا اور عراق و ہندستان کے بعض مردود مشاہیر اس کی پیروی کرتے تھے۔ بلکہ بڑے فخر کے ساتھ کتوں کی زبان اپنے منہ میں لے کر پیار کرتے تھے۔

غسل جنابت کی تحریم

نئے دین کی شریعت میں ناپاکی کے غسل کی فرضیت بھی کلی طور پر منسوخ کردی گئی۔ دلیل یہ لائی گئی کہ انسان کی اصل منی کے نطفے سے ہے، جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ہے۔ اس صورت میں یہ عجیب بات ہے کہ پیشاب اور پاخانے کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہوتا اور اس پاکیزہ لطیف مادہ کا اخراج غسل کو واجب کردیتا ہے، بلکہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔

آشِ حیات

ایک اور بات پیدا کی گئی کہ موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا نہایت لغو ہے۔ مردہ جمادات میں شامل ہوجاتا ہے، اس کو کس طرح ثواب پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بجائے روز ولادت کو جشن کرکے کھانا پکوانا چاہیے۔ اکبر نے ولادت کے کھانے کا نام ''آش حیات'' رکھا۔

شیر اور جنگلی سور کا گوشت اس بنا پر حلال کردیا کہ اس سے آدمی میں بہادری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

چچا، ماموں، قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کردیا گیا، کیونکہ ان لڑکیوں کی طرف مرد کی خواہش کمزور رہتی ہے۔ نکاح کے لیے عمر مقرر کی گئی کہ مرد کے لیے 16 سال کی عمر سے اور عورتوں کے لیے 14 سال کی عمر سے پہلے نکاح روا نہیں، کیونکہ چھوٹی عمر کی اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔

سونے اور ریشم کا جواز

سونا اور ریشم پہننا فرض عین قرار دیا گیا۔ ایک دن میں نے متقی ممالک محروسہ کو خالص ریشم کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، میں نے یہ پوچھا ریشم پہننے کے لیے کوئی روایت نکل آئی ہے کیا؟ اس نے کہا ہاں! جس شہر میں ریشمی لباس عام ہوجائے وہاں ریشم پہننا جائز ہے"۔ میں نے کہا بظاہر تو یہی روایت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ نے اس کا حکم دے رکھا ہے۔ اس نے کہا، نہیں اس کے علاوہ بھی روایت موجود ہے، واللہ اعلم!

نماز، روزہ اور حج وغیرہ اس سے پہلے ہی متروک ہو چکا تھا، بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے ان عبادتوں کی مذمت اور تمسخر میں کئی ایک رسالے بڑے دلائل کے ساتھ لکھے، بادشاہ کو یہ رسالے بہت پسند آئے، اور اس پر بڑی نوازش فرمائی۔

سن الٰہی کا اجراء

عربی کے سن ہجری کو اکبر نے موقوف کرادیا اور اس کی جگہ تاریخ کو اپنے جلوس کے سن سے شروع کرایا جو 963ھ میں ہوا تھا۔ مہینوں کا تعین عجمی بادشاہوں کے طریقے پر کیا گیا جو نصابی کتابوں میں درج ہے۔

زردشتیوں کے مذہب کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کی گئیں۔ مسلمانوں کی عیدوں کی رونق باقی نہ رہی البتہ جمعہ کا التزام باقی رہا وہ صرف اس خیال سے کہ جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام سے پڑھا جاتا تھا اور اس میں بھی بس بوڑھے لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔

نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الٰہی اور ماہ الٰہی کہا جانے لگا۔ سکے اور مہر پر تاریخ الفی ثبت کرایا گیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال پر دین محمدی کی مدت ختم ہو چکی ہے۔

عربی زبان کی مخالفت

عربی پڑھنا عیب ہوگیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانے کی تحصیل فرض ہوگئی۔ عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو ابدی کہا اور لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

شاہنامے کے دو شعر جسے فردوسی طوسی نے شاہنامے میں نقل کیا ہے۔ بادشاہ سلامت کو بہت پسند تھے اور ان کو وہ سند بناتے ہوئے تھے شعر یہ ہیں:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائی رسیدہ است کار
کہ ملک عجم راکنند آرزو
تفو باد بر چرخ گردون تفو

بادشاہ کو اساتذہ کا جو شعر بھی اپنے مسلک کے مطابق مل جاتا وہ اسے سند بنا لیتا تھا۔

دینی مسائل کا تمسخر

غرض اکبر نے دین کے ہر مسئلے اور ہر عقیدے میں جیسے نبوت، کلام، رویت، تکلیف، تکوین، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے طرح طرح کے شبہات پیدا کیے اور ہر ایک کا تمسخر و استہزا کیا۔ اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تھا تو اس کو جواب دینے سے روک دیا جاتا تھا اور کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مناظرے میں عموماً ثابت کرنے والے کے مقابلے میں انکار کرنے والے کا پلہ ہی بھاری رہتا ہے۔ خصوصاً جب کہ مقابل کو کسی بات کے جبراً منوانے کے بھی پورے اختیارات حاصل ہوں۔ بحث میں تو دونوں فریقوں کے مساوی ہونے کی شرط لازمی ہے اور یہاں ذرہ و آفتاب کا معاملہ، کون کس سے بحث کرتا اور بحث کی کس کو ہمت تھی؟ چنانچہ اس

مباحثے کی قربان گاہ پر کتنے ہی خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔ یہ تو مباحثہ نہیں بلکہ ''مکابرہ'' ہوتا تھا جس میں دین فروش علماء خوشامد کے لیے طرح طرح کے استدرکات و مشتبہات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بطور تحفہ پیش کرتے تھے، جیسا کہ لطیف خواجہ نے جو ماوراء النہر کے بزرگ زادوں میں سے تھا، شمائل ترمذی کی اس حدیث "کانہ جید رقبتہ" (حضور کی گردن تصویر کی گردن کی طرح تھی) کے بارے میں جو سیرت کی کتابوں میں مشہور ہے اور ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلے کو لوٹ لینے کے متعلق، حضور ﷺ کے چودہ نکاح کرنے اور آپ ﷺ کی رحلت کے بعد دوسروں پر آپ ﷺ کی بیویوں کے حرام ہونے کے سلسلے میں بڑے اعتراض اٹھائے گئے اور اس طرح کی لایعنی بحثیں نکالی گئیں، جن کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

چہل گانہ کی مجلس

بادشاہ نے اپنی رات کی محفل میں چالیس مقربوں کو شرکت کے لیے مخصوص کر دیا۔ ان 40 عقلمندوں کی محفل میں جس کو جو سمجھ میں آتا پیش کرتا اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اگر کوئی کسی علمی مسئلہ کے متعلق سوال اٹھاتا تو اس سے کہا جاتا کہ ایسی باتیں ملاؤں سے پوچھی جائیں اور جو مسائل عقل و حکمت پر مبنی ہوں وہ ہمارے سامنے لائے جائیں۔ ان محفلوں میں جب سیرت کی کتابیں پڑھی جاتیں تو یہ لوگ ایسی ایسی بے ادبانہ باتیں کرتے، خاص طور سے خلفائے راشدین کی خلافت، قضیۂ فدک اور جنگ صفین کے سلسلے میں ان کی زبانیں اس بے باکی سے چلتی تھیں کہ انھیں بیان کرنے سے بھی غیرت آتی ہے۔ خدا ایسی باتیں کسی کو نہ سنوائے۔

شیعوں کو بڑا غلبہ اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا اور سنی عاجز و مغلوب ہوگئے تھے۔ جتنے خدا کے نیک بندے تھے وہ خوف زدہ رہنے لگے تھے اور شرپسند عناصر کے لیے میدان بالکل صاف ہوگیا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا حکم، ایک نہ ایک نئی ممانعت نکلتی، طرح طرح کے اشکال و اوہام سامنے لائے جاتے۔ بادشاہ اور اس کے حواری اپنے معتقدات و

نظریات کے حق ہونے کے لیے کوئی دلیل اور ثبوت تو کیا لاتے صرف دوسروں کی نفی اور تردید کرتے اور اپنی بات منوانے کی فکر میں رہتے۔ بے دینوں کی بن آئی تھی۔ اچھے لوگ مردود ہو گئے تھے اور مردود مقبول بن گئے تھے۔ جو نزدیک تھے انھیں دھتکار دیا گیا اور جو دور تھے ان کو قریب کر لیا گیا تھا۔

دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر سارے ملک میں بڑا شور و غوغا مچا اور بادشاہ کی ان حرکتوں پر لوگ اللہ اکبر کہہ کر کان پکڑنے لگے۔ اس صورتحال کو ملا شیری کے اس قطعہ میں کس عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس نے یہ قطعہ اسی پُرآشوب زمانہ میں کہا تھا:

تا بزاید ہر زمان کشور بر انداز آفتی   فتنہ در کوی حوادث کہ خدا خواہد شدن
باعقاب قرض خواہ تیغ در ارباب شرک   بار سر از دوش گردن ادا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریبان پارہ شد   خرقہ پوش زہد را تقوی روا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی   کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زین بیت بس کز طرفگی   نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن

بادشاہ امسال دعوی نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سال خدا خواہد شدن

جشن نو روز کی محفلیں

جشن نو روز کے موقعے پر اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی اور مفتی تک جام و مے سے شغل کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے:

عشقت خبر ز عالم بی ہوشی آورد
اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یاد تو ای نگار چہ معجون حکمت است
کز ہرچہ خواندہ ایم فراموشی آورد

نئے دین الٰہی کے مجتہد، خاص طور سے ملک الشعراء فیضی تو یہ کہہ کر پچے کہ ”ہم

یہ پیالہ فقیہوں اور عالموں کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں"۔

نو روز کے آخری دن کا نام جو برج حمل کے انیسویں درجے میں ہوتا تھا "شرف الشرف" رکھا گیا تھا۔ اس روز تمام دنوں سے بڑھ چڑھ کر جشن کا اہتمام ہوتا اور کورنش و تعظیم کے مراسم ادا کیے جاتے۔ امراء کے منصب و جاگیر میں اضافے ہوتے۔ حسب مدارج گھوڑے اور خلعتیں عطا ہوتیں، شاندار ضیافتیں ہوتیں، نذرانے اور تحفے گزارے جاتے۔

اسی نو روز کے موقعے پر بنگالہ سے شاہم خان جلائر اور لاہور سے راجا بھگوان داس حاضر ہوئے۔ اعظم خاں اور دوسرے تمام امرا حاجی پور سے دارالخلافہ میں پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بہار میں باغیوں نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ معصوم خاں کابلی کے ایک ملازم خبیثہ بہادر نے ترخان دیوانہ سرخ بدخشی کو ہمراہ لے کر بادشاہی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ محمد صادق خان نے محب علی خان کے ہمراہ اس سے مقابلہ کیا اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خبیثہ بھی مارا گیا۔

اسی سال گلبدن بیگم اور سلیمہ سلطان بیگم حج سے لوٹ کر آ گئیں۔ ان کے استقبال کے لیے شاہزادہ سلطان سلیم اجمیر تک گیا اور خواجہ صاحب کے روضے کی زیارت کی، لیکن پہلے کی طرح نذر نیاز کچھ نہیں ہوئی۔

انہی دنوں بہار سے محمد صادق خاں بھی حاضر ہوا۔ بادشاہ نے بہت جلد اسے اعظم خاں کے ہمراہ معصوم کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا۔ صادق خاں کی مدد کے لیے شاہ قلی خاں محرم، شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کو جو کابل کی مہم پر نہیں جا سکے تھے، مقرر کیا گیا۔

نقش قدم کا استقبال

اسی دوران شاہ ابوتراب اور اعتماد خان جو حجاز کے سفر پر گئے ہوئے تھے، واپس آ گئے اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بھاری پتھر لے کر آئے۔ اس پتھر پر ایک نقش قدم بنا ہوا تھا۔ شاہ ابوتراب کا کہنا تھا کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش ہے۔

بر لوح سر تربت خود نقش تو کندیم
تا روز قیامت سر ما و قدم تست

بادشاہ بھی اس کے لیے چار کوس تک تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ امراء باری باری سے پتھر کو اٹھا کر چند قدم تک لے جائیں۔ اس اعزاز کے ساتھ اس متبرک پتھر کو شہر میں پہنچایا گیا۔

مخدوم الملک کا انتقال

19 شعبان کو بڑے شاہزادے کی سالگرہ منائی گئی اور شہزادے کا وزن کیا گیا۔ اسی سال یا آئندہ سال شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک جنھیں ہمیشہ کے لیے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ مرزا محمد حکیم اور دوسرے امراء کی بغاوتوں کی خبر سن کر مکے سے گجرات واپس آ گئے تھے اور اپنی سابقہ شان و شوکت کی آرزو میں وقت گزاری کر رہے تھے۔ 990ھ میں مخدوم الملک کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے فتح پور سے قاضی علی کو مقرر کیا گیا۔ اس نے لاہور آ کر چھان بین کی تو مخدوم الملک کے اتنے خزانے اور سونا چاندی برآمد ہوا کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے بھی سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے کئی ایک صندوق نکلے جو اس نے میت بنا کر دفن کرا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مال لوگوں کے پاس رکھا تھا۔ اس کی مقدار تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سونے کی ساری اینٹیں اور اس کی تمام کتابیں خزانہ عامرہ میں داخل کر لی گئیں۔ اس کی اولاد مصیبتوں میں گرفتار ہو کر روٹی روٹی کو محتاج ہو گئی۔

شیخ عبدالنبی کا عبرت ناک انجام

شیخ عبدالنبی بہرحال فتح پور پہنچ گیا اور اکبر کے سامنے اس نے سخت باتیں کیں اور اسے خوب بُرا بھلا کہا۔ اکبر کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شیخ عبدالنبی کے منھ پر پوری قوت سے ایک گھونسہ مارا۔ اس نے چلا کر کہا ”ایک ہی بار چھری مار کر میرا کام تمام کیوں نہیں

کر دیتے؟ اکبر نے اس کو راجہ ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا کہ اس سے ستر ہزار روپے کا حساب لیا جائے جو مکہ معظمہ جاتے وقت دیا گیا تھا۔ کروڑیوں نے اس کو کچہری کے حوالات میں طویل عرصے تک قید رکھا۔ آخر ایک رات گلا گھونٹ کر اس کی زندگی کو قید سے رہائی دے دی گئی۔ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبد النبی جیسا بزرگ آدمی اس کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ 992ھ/1582ء میں رونما ہوا۔ اس کی تاریخ ''شیخ کلبی'' نکالی گئی:

گر چہ الشیخ کالنبی گفتند
کالنبی نیست شیخ است

اسی سال شیخ جلال تھانیسریؒ کا بھی وصال ہوا۔ ان کی تاریخ ''شیخ الاولیاء'' نکالی گئی۔ اسی سال آصف خاں میر بخشی ثانی جس کا اصل نام میرزا غیاث الدین علی تھا، فوت ہو گیا۔ اس کی تاریخ وفات ''خدا یاورش باد'' سے نکلتی ہے۔ اس کا قائم مقام اس کا بھتیجہ میرزا جعفر ہوا جسے بعد میں آصف خاں کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل

حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ اس نے کافی مال و متاع جمع کر لیا ہے اور اس کے حرم میں بھی بہت سی عورتیں جمع ہیں اور وہ سرکش ہو کر دکن(59) کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصے تک اسے عین الملک کی نگرانی میں دے دیا تھا بعد میں رنتھمبور کے قلعے میں بھیج کر قتل کرا دیا گیا۔

برہان قاطع کا اعلان

اسی سال شیخ مبارک نے خلوت شاہی میں اکبر کے سامنے بیربر سے کہا کہ ''جس طرح تمہاری مذہبی کتابوں میں تحریفیں ہوئی ہیں ہمارے دین میں بھی بہت سی تحریفات ہو چکی

ہیں، اور اب وہ قابلِ اعتبار نہیں رہا ہے۔

آخرت فروش گمراہوں نے اسی سال اکبر کو یہ سمجھایا تھا کہ ہجرت کو ہزار سال ہو چکے ہیں۔ آپ بھی شاہ اسماعیل اول کی طرح برہانِ قاطع (دین الٰہی کے اجراء) کا اعلان فرمائیں۔ دربار میں مشورے کے بعد طے پایا کہ اس مقصد کو بتدریج پورا کیا جائے اور بغیر کسی سختی کے اپنے دلی ارادوں کو ظاہر کیا جائے۔ بادشاہ ان دنوں حکیم ناصر خسرو کی یہ رباعی بہت پڑھا کرتا تھا:

درنہ صدو تسعین دوقرآن می بینم   وز مہدی و دجال نشان می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد دین   سرّی کہ نہان است عیان می بینم

جس وقت ایک نئے دین کے اجراء کے متعلق دربار میں مشورے ہو رہے تھے اور اکبر پوری شدت سے اس کو جاری کرنے کا خیال ظاہر کر رہا تھا، راجہ بھگونت داس نے کہا "چلو ہم یہ قبول کیے لیتے ہیں کہ ہندو بھی برے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن بھلا یہ تو بتائیے کہ ان دونوں سے بہتر اور اعلیٰ کون سا فرقہ اور گروہ ہے جس میں ہم شامل ہو جائیں۔" بھگونت داس کی بات پر اکبر نے قائل ہو کر شدت برتنے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد ہی سے ملتِ اسلامیہ کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تاریخ "احداث بدعت" نکالی گئی۔

قاضی جلال ملتانی پر تہمت

اسی زمانے میں بادشاہ نے قاضی جلال ملتانی پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے جعلی تمسک لکھ کر پانچ لاکھ تنکہ شاہی خزانے سے وصول کر لیا ہے۔ یہ الزام رکھ کر ان کو خواجہ فتح اللہ بخشی کے ساتھ دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ دکن کے حکام متعصب رافضی ہیں اس لیے وہ قاضی کو سخت اذیتیں دے کر نہایت رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیں گے، مگر معاملہ کچھ برعکس ہی ہوا۔ جب وہ دکن پہنچے تو وہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیونکہ ان سے پہلے ہی یہ خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں کہ قاضی نے اکبر کی بے دینی کا نہایت ثابت قدمی سے

مقابلہ کیا اور کلمۂ حق کہنے میں بزدلی نہیں دکھائی۔

دکن والوں نے ان کی آمد کو باعث برکت جانا اور مدد معاش کی آراضیات کے علاوہ ان کو اور بھی ذمے دارانہ خدمات تفویض کر دیں اور وہ وہاں آخر تک نہایت عزت و احترام سے رہے۔ آخر میں حج پر جانے کی اجازت طلب کی، لیکن دکن کے حکام ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے عرصے تک ان کو اجازت نہ ملی۔ آخر وہ اجازت حاصل کر کے زیارت حرمین کی سعادت سے فیض یاب ہوئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

قاضی عبد السمیع ماوراء النہری

قاضی جلال کو ہٹانے کے بعد ان کی جگہ قاضی عبد السمیع ماوراء النہری میاں کالی کو قاضی بنایا گیا۔ اس شخص کے متعلق سوجی شاعر نے یہ شعر کہا تھا:

پیری ز قبیلہ معزز
ریشی چو گل سفید یک گز

یہ نہایت فاسق و فاجر شخص تھا۔ شطرنج پر جوا کھیلتا تھا۔ اعلانیہ شراب پیتا تھا۔ اس کے مذہب میں رشوت نہ صرف جائز بلکہ فرض تھی۔ قرض کے قبالوں پر حکماً سود وضع کر کے اس کے اندراجات کراتا تھا۔ دین اور مذہب کی بادشاہ کو کوئی پرواہ نہ تھی، محض بدنامی سے بچنے کے لیے قاضی کا تقرر کرتا تھا، اور اس سے بہتر کوئی دوسرا قاضی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اذان اور نماز کی موقوفی

محل میں پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز بھی ہوتی تھی اور اذان بھی دی جاتی تھی، لیکن انہی دنوں جماعت، نماز اور اذان سب موقوف ہو گئے۔ کافروں اور حرم کی کافر زادیوں کی خاطر اکبر کو اب تو احمدؐ، محمدؐ اور مصطفیٰؐ جیسے نام بھی گراں گزرتے تھے۔ چنانچہ اُس نے کچھ دن بعد اپنے بعض مقربوں کے نام جو اس طرز کے تھے تبدیل کرا دیے، جیسے یار محمد اور محمد خان کو بدل کر رحمت خان وغیرہ کر دیا۔ اچھا ہوا کیونکہ ان خبیثوں پر یہ بابرکت نام بچتے

بھی نہیں تھے، سور کی گردن میں قیمتی موتی کہاں زیب دے سکتے ہیں؟

بے دینی کی یہ ساری آگ آگرہ سے اٹھی اور اس نے چھوٹے بڑے ہر ایک کو جلا کر راکھ کر دیا۔ آخر اس کی لپٹوں سے آگ لگانے والے فسادی بھی نہ بچ سکے۔

میر فتح اللہ شیرازی کی حاضری

ماہ ربیع الثانی 990ھ/1582ء میں بادشاہ نے میر فتح اللہ شیرازی کو عادل خان، جو دکن کا حاکم تھا، کے پاس فرمان بھیج کر بلایا۔ جب وہ فتح پور پہنچا تو بادشاہ کے حکم سے خان خاناں اور حکیم ابو الفتح اس کے استقبال کے لیے گئے۔ میر فتح اللہ الہیات، ریاضیات، طبیعات، طلسمات اور دوسرے تمام عقلی اور نقلی علوم میں اپنے عہد کا ماہر فن شخص تھا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اسے صدارت کا منصب عطا کیا جو اُن دنوں سیاہ نوکری سے بڑھ کر کچھ نہیں رہا تھا اور صدر کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ فقراء کو کچھ دینے کے بجائے ان کی زمین ضبط کرتا رہے۔ اس کو بیناور کا پرگنہ داغ و محلہ سے مستثنیٰ کر کے بطور جاگیر عطا کیا گیا۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ اس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا شاگرد ہے اور میر غیاث الدین نماز اور عبادت کا پابند اور قائل نہ تھا، اس لیے بادشاہ کو اس کے متعلق بھی یہ خوش گمانی تھی کہ شاید وہ مذہب اور دین کے معاملے میں ان کی تائید کرے گا، لیکن یہ خوش گمانی نہ رہی، کیوں کہ میر فتح اللہ شیرازی نے باوجود اپنی ساری دنیاداری، امرا پرستی کے مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھائی، چنانچہ وہ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک پر نماز پڑھا کرتا تھا۔ بادشاہ کے علم میں اس کی یہ تقلید پرستی تھی لیکن اس کے علم و حکمت، تدبیر و مصلحت کا خیال کر کے بادشاہ نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کی ترقی و خاطر داری میں کوئی کمی نہ کی۔ یہاں تک کہ مظفر خان کی چھوٹی لڑکی سے اس کا نکاح بھی کرا دیا اور اسے وزارت کے عہدے پر راجہ ٹوڈرمل کا شریک کار بنا دیا۔ وہ نہایت جرأت کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کر کے فرائض وزارت بجالاتا تھا۔ وزارت

کے ساتھ ساتھ وہ امراء کے بچوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھاتا رہتا تھا اور ہر روز بادشاہی مصاحبوں کے گھر پر اسی غرض سے ضرور جایا کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے حکیم ابوالفتح کے لڑکے کو پھر شیخ ابوالفضل کے لڑکے کو پڑھایا، دوسرے امیروں کے بھی سات سات، آٹھ آٹھ سال تک کے بچوں کو الف، ب پڑھنے اور لکھنے کی کوشش کراتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کاندھے پر بندوق اور کمر میں بارود کی پٹی بندھی رہتی تھی اور بادشاہ کے ساتھ جنگل میں قاصدوں کی طرح پیدل جایا کرتا تھا۔ اپنی اس وضع قطع اور اوچھی حرکتوں سے اس نے علم کے رہے سہے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن اس کا کمال یہی تھا کہ وہ اس ذلت، رذالت اور خسیسی کے باوجود مذہب کے معاملے میں بڑا سخت تھا اور کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس کی آمد کی تاریخ ''شاہ فتح اللہ امام اولیاء'' سے نکلتی ہے۔

معراج نبوی ﷺ سے انکار

ایک رات اکبر نے شاہ فتح اللہ کی موجودگی میں بیربر سے کہا ''اس بات کی عقل اجازت نہیں دیتی کہ ایک شخص اپنے جسمانی بوجھ کو لیے پلک جھپکنے میں آسمان پر جائے اور اللہ تعالیٰ سے 90 ہزار باتیں کر کے اتنی جلد لوٹ آئے کہ ان کا بستر واپسی تک گرم ہی رہے اور لوگ بھی اس دعوے کی تصدیق کرنے لگ جائیں۔ اسی طرح ''شق القمر'' اور دوسرے معجزے بھی خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں''۔ پھر اکبر نے اپنا ایک پاؤں اٹھا کر سب کو دکھایا اور کہا ''دوسرا پاؤں ٹکائے بغیر آخر ہمارا کھڑا رہنا کس طرح ممکن ہے''۔ آخر لوگوں نے یہ کیا داستان بنا رکھی ہے۔ بیربر بدبخت اور دوسرے گمراہوں نے بادشاہ کی خوب ہاں میں ہاں ملائی اور بڑا سراہا۔ اکبر رہ رہ کر شاہ فتح اللہ کو دیکھتا جاتا تھا اور اس ساری گفتگو کی غرض بھی یہی تھی کہ وہ نیا آیا ہوا ہے اس کے خیالات معلوم کریں، لیکن وہ بندۂ خدا سر جھکائے کھڑا رہا، کچھ نہیں بولا۔

ملا احمد ٹھٹھہ کی آمد

انہی دنوں ٹھٹھہ کا ملا احمد متعصب رافضی جو بڑی بے حیائی سے خود کو حکیم بھی کہا کرتا تھا

دکن سے آ کر حاضر ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد فاروقی سلسلے کے حنفی تھے۔ وہ ناپاک ان بدنصیبوں پر بھی لعنت بھیجتا تھا مگر حضور کا قول ہے کہ جو اپنے باپ کو لعنت کرتا ہے اس کی لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ وہ شاہ طہماسپ کے عہد میں عراق میں تبرا کرنے والے شیعہ مومنوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا۔ اسی لیے وہ ان کی طرح ہو گیا، لیکن جب شاہ اسمٰعیل ثانی نے اپنے باپ کے برعکس سنّی مسلک اختیار کر لیا اور رافضیوں کو تنگ کرنے لگا تو وہ میرزا مخدوم کے ساتھ جو پکے سنّی تھے اور انھوں نے "النواقض فی ذم الروافض" کے نام سے رافضیوں کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں کتاب کی تاریخ تصنیف بھی درج ہے، مکے کو چلا گیا وہاں سے بھٹکتا بھٹکتا دکن پہنچا، وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں سارا میدان خالی پڑا تھا چنانچہ اسے مہمل باتوں کو پھیلانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا کھلا موقع مل گیا مگر کچھ ہی عرصے بعد اسے اپنے کیے کا اچھا بدلہ بھی مل گیا۔

ان دنوں جب کہ وہ شیخ فیضی کی صحبت میں نہیں پہنچا تھا اور اتنا بے باک نہیں ہوا تھا میری اس سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ عراقیوں نے اس کے سامنے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا ”رفض کا نور آپ کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے“ میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔ ”ہاں جس طرح نورِ تسنن تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے“ جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بڑے خوش ہوئے۔ اس کا مزید حال آگے بیان کیا جائے گا۔

تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں، اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں، یہ تاریخ دوسری تاریخوں کے غلط واقعات کی تردید و تصحیح کرے۔ اس کا نام ”تاریخ الفی“ رکھا جائے اس میں سنین کے ساتھ بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی وفات سے اس زمانہ تک کے

حالات لکھنے کے لیے 7 اشخاص مقرر کیے گئے۔ پہلے سال کے واقعات کے لیے نقیب خاں کو دوسرے سال کے لیے شاہ فتح اللہ کو اور اسی ترتیب سے دوسروں کو مقرر کیا گیا۔ لکھنے والوں میں حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی جو انہی دنوں گجرات سے آیا ہوا تھا، مرزا نظام الدین احمد اور اس ناچیز[160] کا نام بھی شامل تھا۔ اسی طرح 35 سال کے واقعات کی ترتیب و تقسیم کی گئی۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرے میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے۔ ایک رات یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظے میں تھا جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر قصر الامارت کے انہدام، حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قصے، شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قد و قامت کے بچھوؤں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان بیانات پر بڑی رد و کد شروع کر دی، مرزا جعفر آصف خاں ثالث نے اس موقعے پر اکبر کی غلط تائید کی اور اس کی طرف سے بحث کرنے لگا البتہ شیخ ابو الفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کی صحیح توجیہات بیان کیں۔ مجھ سے اکبر نے پوچھا: ''تم نے یہ سب حالات کس طرح لکھ دیے؟'' میں نے عرض کیا ''میں نے اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا، کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کر دیا''۔ اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانے سے ''روضۃ الاحباب'' اور ''سیرت'' کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ ''وہ تحقیق کر کے بتائے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے''۔ اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت و گیر سے چھٹکارا ملا۔

36 سال تک کے حالات لکھے جا چکے تو اکبر نے حکم دیا کہ اب صرف ملا احمد ٹھٹھوی ''تاریخ الفی'' کے بقیہ حالات لکھے گا۔ یہ تبدیلی حکیم ابو الفتح کی تجویز و سفارش کی وجہ سے عمل میں آئی۔ ملا احمد نہایت متعصب آدمی تھا اس نے اپنے اعتقاد کے مطابق جی میں جو آیا لکھ دیا، جیسا کے اس تاریخ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے دور تک اس نے اس تاریخ کی دو جلدیں پوری کر دیں۔

ملا احمد اپنے مذہب میں نہایت غلو اور تشدد تھا۔ میرزا فولاد برلاس کو بھی اس کی وجہ

سے نقصان پہنچا تھا، چنانچہ مرزا نے ایک رات اس بہانے سے کہ اسے بادشاہ نے طلب کیا ہے گھر سے باہر بلایا اور لاہور کی ایک گلی میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو بھی سزائے موت دی گئی۔

''تاریخ الفی'' کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمے داری اب آصف خان کے سپرد کی گئی۔ اس نے یہ واقعات 997ھ/1589ء تک پورے کر دیے۔ 1000ھ/1592ء میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنین میں جو تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے اُسے درست کر دوں۔ ایک سال تک میں[1] یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کر دیا۔ تیسری جلد کا کام آصف خاں کے حوالے کر دیا۔

مہابھارت کا ترجمہ

اس سال کا اہم واقعہ مہابھارت کے ترجمے کی تکمیل ہے۔ مہابھارت ہندستان کی قدیم اور بڑی کتاب ہے جس میں متعدد قصے، نصیحتیں، مصالح ملکی، اخلاق و آداب، علوم و اعتقادیات، ہندو مذہب اور اس کی عبادتوں کی تفصیل ہے۔ یہ تمام موضوعات ہندستان کے قدیم فرمانروا کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں بعض کی رائے میں یہ واقعات کم از کم چار ہزار سال پہلے پیش آئے تھے۔ بعض کا قول ہے، مہابھارت پر 80 ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جو بظاہر آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے غیر مسلم اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مہابھارت کے ترجمے کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہنامہ اور امیر حمزہ کے قصے کو 17 جلدوں میں 15 سال کی مدت میں لکھوایا تھا۔ اس کی تصویروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ اسی طرح ابومسلم کا قصہ جامع الحکایات وغیرہ کو بادشاہ نے متعدد بار پڑھوا کر سنا تھا۔ ان کتابوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ سب حقیقی واقعات نہیں ہیں بلکہ فرضی ہیں اور محض شاعری کی گئی ہے یہ کتابیں چونکہ اچھے وقت میں لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی

قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلے میں چونکہ اچھے وقت لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی کتابوں کو جنھیں عبادت گزار دانشوروں نے لکھا ہے اور وہ سب کی سب حقیقی اور نص قاطع ہیں، ہندوؤں کی عبادتوں، اعتقاد اور مذہب کا سرچشمہ بھی ہیں، ہندی(۸۲) سے فارسی میں ترجمہ کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کرایا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں، اس لئے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ اس کے علاوہ جس طرح ان کتابوں کے مقدمے میں درج ہے ان کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کے بقاء، اولاد و اموال کی کثرت کا باعث بھی ہوگی۔

چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خان کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں۔ تین چار مہینے کی مدت میں اس مجموعۂ خرافات کے 18 فنوں میں سے جن میں 18 ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے صرف 2 فن لکھے جاسکے۔ نہ معلوم مجھ(۸۳) سے کیا گناہ ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا اور طرح طرح کے اعتراضات برداشت کرنے پڑے۔ اس کام میں مجھے سوائے طعن و تعریض کے کچھ نہیں ملا۔ بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خان نے پورا کیا اور ایک حصے کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے اس کے دو فنوں کی نظم و نثر مرتب کی۔ پھر حاجی مذکور نے 2 حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں ان کی تصحیح کرائی۔ اس طرح اس کتاب کے سو جز مکمل ہوگئے۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

سلطان حاجی تھانیسری کو اس محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصے بعد کسی بہانے سے اس کو بھکر کی طرف جلاوطن کردیا گیا۔ اب وہ اپنے شہر میں مقیم ہے۔ مہابھارت کی

تعبیر و ترجمانی کرنے والے اکثر لوگ کورو اور پانڈو سے جا ملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس بارے میں معافی عطا فرمائے۔

اکبر نے اس ترجمے کا نام "رزم نامہ" رکھا۔ اس کے دو مصور نسخے تیار کرائے اور جب یہ تیار ہو گئے تو امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابو الفضل جس نے اس سے پہلے "آیۃ الکرسی" کی تفسیر لکھی تھی اس کفر نامے پر اس نے دو جز کا خطبہ لکھا۔

اس سال کے واقعات میں نے ایک خاص وجہ سے نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ لکھے ہیں، اس لیے اگر واقعات کی ترتیب اور سنین کی تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو قارئین اسے نظر انداز فرما دیں۔

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال

25 صفر 991ھ/ 1583ء کو نو روز ہوا اور جلوس اکبری کے اٹھائیسویں سال کا آغاز ہوا۔ حسب دستور سابق نمائشی دکان کی آرائش امراء میں تقسیم کر دی گئی اور جشن کی تقریبات منائی گئیں۔ شاہ فتح اللہ نے اپنی دکان کی بڑی اچھی آرائش کی تھی۔ اس میں وزن اٹھانے اور ایسے دوسرے آلات کی نمائش کی گئی تھی۔

اس سال بھی چند نئے احکام اختراع کیے گئے۔ اتوار کے دن نو روز کے اٹھارہویں دن اور اکبر کی ولادت کے مہینے آبان(161) کے تمام دنوں میں تمام حدود ممالک محروسہ میں جانوروں کے ذبیحے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ حکم بھی محض ہندوؤں کی خاطر نافذ کیا گیا تھا۔ جو شخص بھی ان دنوں ذبیحہ کرتا اسے جرمانے کی سزا دی جاتی تھی اور اس کا گھر بار تباہ کر دیا جاتا تھا۔ خود اکبر نے گوشت خوری سے اتنا پرہیز کیا کہ سال بھر میں چھ مہینے بلکہ اس سے بھی کم گوشت کھایا کرتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ ہے کہ مطلقاً گوشت کھانا ترک کر دے۔

اکبر نے ہر روز چار مرتبہ صبح، دوپہر، شام اور نصف شب کو آفتاب کی پرستش شروع

کردی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ یہ وظیفہ بڑے خشوع و خضوع سے دوپہر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس وظیفے کے وقت دونوں کان پکڑ کر گھوما کرتا تھا اور کانوں پہ دونوں ہاتھ توبہ کی طرح مارتا تھا۔ اس دوران وہ طرح طرح کی اور بہت سی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

نوبت اور نقارہ ایک مرتبہ تو نصف رات کو اور ایک بار طلوع کے وقت بجانے کا حکم دیا گیا۔ مسجدیں اور خانقاہیں ہندوؤں کے فراش خانے اور چوکی خانے بن گئے اور وہاں بجائے جماعت کے جماع ہونے لگا اور "حی علی" کی جگہ "یللا تللا" ہونے لگی۔ جو قبرستان شہر میں تھے ان کو مسمار کر دینے کا حکم دیا گیا۔

اس جشن کے موقعے پر اکبر نے اپنی والدہ کو ایک لاکھ روپیہ نقد، چند ہاتھی، پوشاکیں، سونے کے برتن اور جڑاؤ زیور وغیرہ دیے۔ اس طرح اپنی پھوپھی گلبدن بیگم اور دوسری تمام بیگمات کو بھی انعامات دیے گئے اور عام حکم دیا گیا کہ ہر خاص و عام نذرانے پیش کرے۔

ٹانڈہ پر قبضہ

اسی سال اعظم خان اور دوسرے امراء نے ٹانڈہ پہ قبضہ کر لیا۔ خالدی خان جباری، میرزا بیگ قاقشال، معصوم خاں کا ساتھ چھوڑ کر اعظم خاں کے پاس چلے آئے اور معصوم خاں بعض زمینداروں کی پناہ میں چلا گیا۔ بنگالہ کا سارا علاقہ سرکاری حدود میں آ گیا۔

بادشاہ نے دکن کے حکام کی تالیف قلب کے لیے اس سال گجرات کی حکومت اعتماد خاں کو تفویض کر دی۔ شاہ ابو تراب کو وہاں کا امین، خواجہ نظام الدین احمد کو میر بخشی، بادشاہ کے استاد مولانا عبد القادر کے بھائی ابو القاسم تبریزی کو دیوان کے عہدے پر مامور کیا گیا۔

گجرات کی جاگیروں پہ امراء کی بڑی تعداد کو مقرر کیا گیا جن میں محمد حسین، میر ابو المظفر ولد اشرف خان، میر ہاشم، میر صالح واگی اور سید ابو اسحاق وغیرہ شامل تھے۔

شہباز خاں کو بادشاہ نے اس کی چند گستاخیوں کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اس نے جو

سرکاری رقم موقع بے موقع صرف کی تھی اس کے حساب کتاب کا کام راجہ ٹوڈرمل کے سپرد کر دیا تھا۔ اس سال ابوالفضل کی سفارش پر اسے معاف کر کے راجہ کے چنگل سے رہائی عطا کی اور 17 ربیع الثانی کو اسے بنگالہ پر مقرر کر کے رخصت کر دیا کہ وہاں جا کر تمام سرکار بنگالہ کو بادشاہی جاگیرداروں میں تقسیم کر دے اور بہار کے صوبے سے معصوم کابلی کو باہر کر دے۔

شیخ فرید بخاری کی سفارت

اسی اثناء میں خبر ملی کہ خان اعظم نے شیخ فرید بخاری کو مصالحت کے لیے اڑیسہ کے حاکم قتلو افغان لوحانی کے پاس بھیجا تھا، قتلو نے شیخ فرید کی بزرگی کا خیال کر کے ان کا استقبال کیا۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو بہادر کورفرد نے جو بنگالہ کا زمیندار اور قتلو کا بڑا فوجی افسر تھا، شیخ سے نہایت بے ادبی کے ساتھ ملاقات کی اور برابری سے بات کرنے لگا۔ شیخ نے اسے ایک زمیندار سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے رویے پر شاہو ولد شیخ راجو بخاری سرہندی نے بھی بگڑ کر سخت طرز عمل اختیار کیا اور دوسرے بخاریوں نے بھی بڑی بے اعتدالی دکھائی۔ جس وقت شیخ فرید وہاں سے لوٹ رہے تھے اور قتلو شیخ کی خدمت میں تھا، بہادر نے لڑنے کا ارادہ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ اس جھڑپ میں شاہو اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا، شیخ فرید سلامتی کے ساتھ بچ کر نکل آئے۔

برہان الملک کی آمد

حاکم دکن مرتضی نظام الملک کا بھائی برہان الملک وہاں سے بھاگ کر مالوہ میں قطب الدین خان کے پاس آ گیا تھا۔ اس سال رجب کے مہینے میں وہ حسب الحکم دارالخلافہ آیا اور باریاب ہوا۔ اس کی آمد سے قبل ایک آوارہ نامعلوم شخص دربار میں آیا تھا اور اس نے خود کو برہان الملک ظاہر کیا تھا۔ اسے بادشاہ نے اودھ میں جاگیر عطا کر دی تھی، جب بھید کھل گیا تو وہ بھاگ کر جوگیوں کے پاس چھپ گیا تھا مگر ایک ہفتہ بعد وہ پکڑا گیا۔ اسے

قید خانے بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا؟

جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت

انہی دنوں بادشاہ نے شہر سے باہر ہندو اور مسلمان فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے دو سرائیں تعمیر کرائیں۔ ایک کا نام خیر پورہ، دوسرے کا دھرم پورہ رکھا گیا۔ ان کے انتظام پر شیخ ابوالفضل کے چند آدمی متعین تھے جو بادشاہی خرچ پر فقراء کو کھانا کھلاتے تھے۔ جوگیوں کی ٹولیاں بھی بہت آتی رہتی تھیں ان کے لیے ایک الگ سرائے بنوا کر اس کا نام جوگی پورہ رکھا گیا۔ اکبر راتوں میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ ان جوگیوں کی صحبت میں جایا کرتا تھا اور ان سے مختلف جاہلانہ معلومات، اعتقادات، مراقبے، مشغلے، آسن، کیمیا، ہمیا اور ایمیا جیسے عجیب و غریب علوم سیکھا کرتا تھا۔ اس نے کیمیا کے ذریعے خود سونا بھی بنایا اور اسے لوگوں کو دکھایا۔ جوگی ہر سال ایک مقررہ رات میں جسے وہ شیورات کہتے تھے ہر طرف آ کر جمع ہوتے تھے۔ اس رات اکبر بڑے بڑے جوگیوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور ان سے لمبی چوڑی عمر کی بشارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ان کی دعاؤں اور بعض دوسرے قرینوں سے اکبر کو اپنی لمبی عمر کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ بعض حکیموں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ عمر کی کمی کا تعلق دور قمری سے تھا اب جب کہ دور زحل شروع ہو چکا ہے جس میں ساری باتیں برعکس ہوں گی اور عمریں بھی طویل ہو جائیں گی، چنانچہ پچھلے لوگ ہزار ہزار سال کی عمر کے ہوتے تھے اور ہندی کتابوں میں آدمیوں کی عمر دس دس ہزار لکھی گئی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں لاماؤں کی عمر جو چینیوں کے پیشوا اور زاہد و عابد ہوتے ہیں دو سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے اس لمبی عمر کی خاطر اکبر نے بھی ان جوگیوں کی طرح مباشرت اور کھانے پینے میں کمی کر دی۔ خاص طور سے گوشت ترک کر دیا اور اپنی تالو کے بال منڈوا ڈالے صرف اطراف کے بال رہنے دیے۔ وہم یہ تھا کہ کاملوں کی روح سر کے درمیان جو جسم کا دسواں منفذ ہے، نکلتی ہے اور اس وقت گرج کی طرح کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز سعادت اور نجات کی علامت ہے۔ تاریخ کی رو سے یہ اس

بات کی نشانی ہے کہ روح کسی صاحب شوکت مقتدر بادشاہ کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔

جہالی اکبر کے درشن

بادشاہ نے اپنے مسلک کا نام "توحید الٰہی" رکھا اور اپنے خاص گروہ کے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں "چیلہ" کا نام دیا۔ عام لوگ جن میں زیادہ تر رذیل اور مکار شامل تھے چونکہ بارگاہ شاہی میں نہیں جا سکتے تھے اس لیے وہ ہر صبح کو سورج پوجا کے وقت جھرو کے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کا دیدار نہیں کر لیتے ان پر مسواک اور کھانا پینا حرام رہتا تھا۔ بادشاہ کے تقدس کا رفتہ رفتہ یہ رنگ جما کہ ہر رات ہندو، مسلمان، عورتیں اور مرد، تندرست اور بیمار اپنی حاجتیں پوری کرانے نیاز مندانہ حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو حاضری کو عام اجازت ہوتی تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور جیسے ہی بادشاہ آفتاب کے ایک ہزار نام کا ورد کر کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتا، یہ لوگ سجدے میں گر پڑتے۔

اکبر پرمیشور کا اوتار

مکار اور چالاک برہمنوں نے خود اکبر کے ایک ہزار ایک نام ترتیب دے دے کر رام اور کرشن کی طرح آپ بھی ایک اوتار ہیں اور پرمیشور نے آپ کی صورت میں داخل کیا ہے، اکبر نے یہ بھی باور کر لیا۔ پنڈت ہندوستان کے قدیم علما کے ہندی دو ہے نقل کر کے پیش کرتے رہتے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان میں ایک بڑا بادشاہ پیدا ہوگا جو برہمنوں کا محافظ ہوگا، گائے کی حفاظت کرے گا اور ساری دنیا پر عدل و انصاف سے حکومت کرے گا۔ یہ ساری خرافات پرانے کاغذوں پر لکھ لکھ کر پیش کی جاتی تھیں۔ اکبر ان تمام باتوں پر اعتقاد لے آتا تھا۔ مختلف فرقوں میں سے جن کے سچے اعتقاد کا اکبر کو یقین ہو جاتا تھا ان کو وہ "احدی" کہا کرتا تھا اور یہ گمان تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو وقت پڑنے پر آگ اور خون کے سمندر میں بے جھجک داخل ہو جائیں گے۔

اسی سال اکبر نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں حنفیوں کے مسئلے کے مطابق ''دہ دردہ'' اور شافعیوں اور شیعوں کے ''قلتین'' کے مطابق پانی بھروا کر وزن کرایا۔ حوض کا پانی ان دونوں سے زیادہ نکلا۔ بادشاہ نے سنیوں اور شیعوں کے دو علیحدہ گروپ بنانے کا حکم دیا، جتنے ہندستانی تھے وہ سنیوں کے کیمپ میں ہو گئے اور جتنے عراقی تھے وہ شیعوں کی طرف چلے گئے۔ ایسے بہت سے جزوی واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔

گجرات کی بغاوت

جب اعتماد خاں اپنے حسب مدعا گجرات کی حکومت پر مامور ہو کر سروہی پہنچا تو اس نے اس مقام کو سرتال سے علیحدہ کر کے رانا کے بھائی جگمال کے سپرد کر دیا اور متعینہ امرا کو ساتھ لے کر 12 شعبان کو احمد آباد پہنچ گیا۔

شہاب الدین احمد خاں احمد آباد کا مستقل حاکم تھا اور گجرات کے سارے فتنہ و فساد کی اس نے بڑی خوبی سے روک تھام کر رکھی تھی وہ اپنے گھر سے نکل کر عثمان پورہ کے محلّے میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس کے ملازم سردار جو اس تبدیلی پر سخت ناراض تھے دوسرے مہم پسندوں کے ساتھ کاٹھیا واڑ کی طرف چلے گئے جہاں محمود گجراتی کا لڑکا مظفر شاہ دربار اکبری سے بھاگ کر اپنے ننیہال کے رشتے داروں کی پناہ میں اپنے دن کاٹ رہا تھا۔ بغاوت پسندوں نے وہاں جا کر اسے حصول بادشاہت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اعتماد خاں نے شہاب الدین احمد خاں سے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی جماعت کو دلاسا اور تسلی دے کر واپس بلا لے لیکن اس نے قبول نہ کیا اور کہا یہ لوگ ایک عرصۂ دراز سے اس دن کے منتظر تھے اور میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ اب ان کا معاملہ میرے قابو سے باہر ہے، اب تم یہاں کے حاکم ہو، تم جانو اور یہاں کے لوگ! یہ کہہ کر وہ احمد آباد سے 20 کوس پر قصبۂ کری میں چلا گیا۔

مظفر شاہ کی بغاوت

اعتماد خاں اور نظام الدین احمد کے ایک دو آدمی باغیوں کے پاس گئے اور انھیں بہت تسلی اور دلاسا دیا، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ 27 شعبان کو مظفر کاٹھیاواڑیوں اور بھیڑے کا لشکر لے کر احمد آباد سے 12 کوس پر دولقہ کے مقام پر آ پہنچا۔ اسی وقت اعتماد خاں اور نظام الدین احمد شہر چھوڑ کر شہاب الدین احمد خاں کو واپس لانے کے لیے کڑی کی طرف کوچ کر گئے اور اس کو اطمینان دلایا کہ بدستور سابق قدیم پرگنے اس کی جاگیر میں رہیں گے اس کے علاوہ اسے 2 لاکھ روپیہ نقد بھی دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے جانے سے پہلے احمد آباد کو شیر خاں ولد اعتماد خاں اور میر محمد معصوم بھکری کی تحویل میں دے دیا تھا کہ ہم کڑی سے واپس آ کر فوج کا ساز و سامان درست کریں گے۔

مظفر شاہ نے دوسرے دن پیش قدمی کی۔ احمد آباد سے 3 کوس پر سرکھیج کے مجاوروں نے گجرات کے بادشاہوں کے مزاروں کا نقشہ تیار کر کے شگون کے لیے اس کے سر پر سایہ کیا اور اسے سلطنت کی مبارک باد دی۔ اس کے لیے تو یہ مژدۂ غیب تھا۔ غرض وہ اسی دن دھاوا مار کر شہر میں داخل ہو گیا۔

شاہی امراء کی ابتری

وہی دونوں امیر کڑی سے راتوں رات یلغار کرتے ہوئے صبح کے وقت عثمان پور پہنچے۔ ان کے استقبال کے لیے مظفر اپنی فوج کو آراستہ کر کے آگے بڑھا اور احمد آباد کے ریگستانی ساحل پر مقابلے کے لیے صف آرائی کر لی۔ وہ تو میدان میں پہنچ کر دم خم دکھا رہا تھا اور یہاں یہ 2 بوڑھے امیر باغیوں میں تفرقہ پیدا کرنے، بھاگے ہوئے ملازموں کو تسلی دے کر واپس بلا لانے، قرض لینے، دستاویز و تمسک لکھنے اور نامہ و پیام کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ غرض ان کے روکے بغاوت کا یہ سیلاب رک نہ سکا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو وہ دونوں بغیر لڑے ہی وہاں سے فرار ہو کر نہروالہ کے شہر پٹن میں جو احمد آباد سے 45 کوس پر ہے ایک ہی دن میں جا پہنچے۔ ان کے لشکر کا سارا ساز و سامان باغیوں نے لوٹ

لیا اور لشکریوں کے اہل و عیال اسیر ہو گئے۔ نظام الدین احمد کا لڑکا محمد شریف سارا مال و اسباب لٹوا کر محافظ سپاہیوں کے ہمراہ بہ مشکل باپ سے آ کر ملا۔

شیر خاں فولادی کی واپسی

ان بھاگے ہوئے امیروں نے فتح پور سے مدد کے لئے آنے والے امراء کے ساتھ پٹن کے قلعے کی مرمت کی اور اس میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مظفر نے اپنے معمولی سپاہیوں کو بھی بڑے بڑے خطاب عطا کیے اور جاگیروں کا امیدوار بنا کر ان کے عہدے بڑھا دیے، خدا کی قدرت کہ ملازمت شاہی میں اسے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اب وہ تیس ہزار سپاہیوں کا مالک بن گیا۔ اس نے شیر خاں فولادی کو جو پہلے پٹن کا حاکم تھا اور اب سورت میں نہایت تنگدستی سے گزر بسر کر رہا تھا، بلا بھیجا اور 4 ہزار سوار دے کر اسے پٹن پر حملے کے لیے رخصت کیا۔

پٹن کے سرداروں نے شہباز خاں کے بھائی زین الدین کنبو کو قطب الدین محمد خاں کے پاس بھیجا کہ وہ اس طرف سے اور پٹن والے اُس طرف سے احمد آباد پر حملہ کریں اور مظفر کو گھیر لیں۔ مظفر نے اس کارروائی سے پہلے ہی آگے بڑھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ بڑودہ میں قطب الدین محمد خاں پر حملہ کر دیا اور سخت جنگ کر کے اسے شکست دی۔ قطب الدین محمد خان بھاگ کر بڑودہ کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ اس کے لشکر کے سردار اور ملازم سارے مظفر سے جا کر مل گئے۔

اس واقعہ سے پہلے ہی شیر خاں 5000 سوار لے کر پٹن سے 15 کوس پر قصبہ میانہ کے علاقے میں پہنچ گیا اور شہاب الدین احمد خاں بڑے تذبذب کے بعد جالور کی طرف بھاگ گئے۔ پٹن میں صرف نظام الدین احمد رہ گئے۔ ان کے ساتھ جو سردار تھے ان سب کی جمعیت 2000 سواروں سے زائد نہیں تھی۔ فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی، آخر نظام الدین احمد کو فتح نصیب ہوئی اور شیر خاں شکست کھا کر احمد آباد بھاگ گیا۔ نظام الدین احمد نے بڑے اصرار سے کہا کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس وقت احمد آباد پر حملہ کر دیا

چاہیے، لیکن امراء نے قبول نہ کیا، حالانکہ ان کا مشورہ بالکل درست تھا کیوں کہ لشکریوں کو اس وقت تک قطب الدین محمد خان کی شکست کی خبر نہیں لگی تھی۔ اس جنگ میں امراء کے ہاتھ کافی مال غنیمت آیا۔ یہ لوگ کرّی جا کر ٹھہر گئے اور 12 دن تک وہاں لشکر کا انتظار کرتے رہے جو مال غنیمت لے کر چلا گیا ہوا تھا۔

بڑودہ پر باغیوں کا قبضہ

اسی اثنا میں خبر ملی کہ مظفر نے بڑودہ کے قلعے کی پرانی دیوار کو توپ اندازی کر کے گرا دیا ہے اور قطب الدین محمد خاں نے زین الدین کو پناہ کا قول نامہ لینے کے لیے مظفر کے پاس بھیج دیا ہے۔ مظفر نے زین الدین کو تو اسی وقت قتل کرا دیا اور خواجہ محمد صالح، سابقہ صدر کو جو اعتماد خاں کے ساتھ مقرر کر آئے تھے ان کی بزرگی کا لحاظ کر کے حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ قطب الدین محمد خاں امان پا کر جب قلعے سے باہر آیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ تسلیمات بجالایا تو مظفر نے ملاقات کے وقت اس کی بڑی تعظیم کی اور استقبال کر کے اسے مسند پر بٹھالیا، وہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن راج سپیلہ کے زمیندار تواڑی کے بہکانے سے آخر کار اسے قتل کرا دیا۔

پرواں سے مظفر نے بھڑوچ پر حملہ کیا اور اس قلعے کو بھی قطب الدین محمد خاں کی بیوی اور دوسرے رشتے داروں سے صلح کر کے چھین لیا۔ وہاں مظفر کو کھمبایت کا 14 لاکھ روپیہ جو عماد الدین کروڑی لے آیا تھا اور دوسرا بہت سا ساز و سامان مل گیا۔ قطب الدین خاں کا 10 کروڑ سے زائد روپیہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا اور اس نے ایک بڑی فوج اکٹھی کر لی۔ حیرت کی بات ہے کہ قطب الدین خاں کا لڑکا نورنگ خاں اور دوسرے تمام مالوہ کے امیر قریب ہی ندربار اور سلطان پور میں تھے۔ نورنگ خاں نے آگے بڑھ کر اپنے ماں باپ کی کوئی خبر نہ لی۔ اس فتح سے مظفر کی دھاک بیٹھ گئی اور مغل، پٹھان اور گجراتی بے شمار اس کے لشکر میں جا کر شامل ہو گئے۔

مرزا خان کی کاروائی

جب نظام الدین کو اس کی خبر ملی تو وہ تمام سرداروں کو لے کر پٹن میں مذکورہ دونوں امیروں سے آکر ملے۔ یہ سب لوگ پٹن میں مرزا خان ولد بیرم خاں خانخاناں کا انتظار کرنے لگے جو دربار سے دوسرے امراء کے ساتھ جالور کے راستے پٹن آرہا تھا۔ مرزا خاں نے آنے کے بعد پٹن میں ایک دن پڑاؤ کیا اور آگے بڑھ کر سرکھیج میں کیمپ لگا دیا۔ مظفر بھی بڑودہ سے لوٹ کر آیا اور بھڑوچ پر اپنے سالے نصیر کو اور چرکس رومی کو جو پہلے شاہی لشکر میں تھا مقرر کردیا اور شاہ بھیکن کے مزار کے علاقے میں پہنچ کر اپنی چھاؤنی قائم کردی۔ دوسرے دن دونوں فوجوں میں بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ مظفر شکست کھا کر محمود آباد چلا گیا اور یہ لڑائی سید ہاشم بارہہ، خضر آقا وکیل اور مرزا خان نے جیت لی۔ اس جنگ میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ دشمن کے جو لوگ ہلاک ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔

میرزا خان نے فتح پور سے پہلے منت مانی تھی کہ اگر فتح نصیب ہوجائے تو میں اپنا سارا مال و متاع اس کے شکرانے میں خیرات کردونگا۔ چنانچہ اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے ملازمین کو ہاتھی، گھوڑے، پوشاکیں اور سارے مال و اسباب کی قیمت مقرر کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ رقم مساکین کو تقسیم کردی جائے۔ بددیانت ملازمین نے ہر چیز کی اس طرح گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی کہ محتاجوں کو چوتھائی بلکہ دسواں حصہ تک نہ مل سکا، بلکہ اچھی خاصی رقم ان بدبختوں نے اپنی عیاشیوں میں اڑادی۔

میرزا خاں کے اکثر ملازم قلیچی تھے، جیسے دولت خاں افغان لودی، ملا محمودی اور دوسرے امراء۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے ملازم بنے ہیں کوئی قصور تو نہیں کیا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بادشاہی ملازمین کے سامنے اس طرح دبے دبے اور حقیر رہیں اور وہ مجلسوں میں ہم پر ہمیشہ اپنی برتری جتلاتے رہیں۔ تسلیم و تعظیم اور دوسرے درباری مراسم میں ان کو بھی ہمارے مساوی درجہ دیا جانا چاہئے۔ یہ بغیر سرپاؤں کی بات کرتے ہیں جو مرزا خان کو بُری معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے امراء اور سرداروں میں سے ہر ایک کے لیے بھاری پوشاکیں اور گھوڑے تیار کرائے اور تمام امرا کی فہرست تیار کرکے ایک بڑا

جشن منعقد کیا اور لباس خانے میں بیٹھ کر اجلاس کی تیاری کرنے لگا۔ نظام الدین احمد کی بہن کسی وقت بیرم خان خان خاناں کے نکاح میں رہی تھیں۔ اس سابقہ رشتے کی بناء پر اس نے نظام الدین احمد کو بلا کر اس بارے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے نصیحت کی کہ ”یہ کم عقل اور کوتاہ اندیش تم کو بہکا رہے ہیں اگر بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے۔ جہاں تک تسلیمات و کورنش کا معاملہ ہے، بھلا سوچو تو کہ شہاب الدین خاں مرتبے کے لحاظ سے پنج ہزار سواروں کا منصب دار تھا تمھاری تسلیمات بجالائے تو کیا زیب دے گا؟ خود پایندہ خاں مغول بھی اس بات سے صاف انکار کر دے گا اور ممکن ہے وہ کسی جہالت کا ثبوت دیں اور خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جائے۔“ مرزا خان کو یہ رائے پسند آ گئی اور اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔

مظفر شاہ کی شکست اور اس کا فرار ہونا

اس فتح کے تین دن بعد قلیچ خان اور مالوہ کے دوسرے امیر احمد آباد پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظفر محمود آباد(65) سے جو دریائے مہندری کے کنارے ہے کھنبایت چلا گیا ہے اور بھاگی ہوئی فوج کے 3 ہزار سوار اس کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ میرزا خاں امراء کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مظفر بڑودہ اور پھر وہاں سے راج پپلہ اور نادوت کی طرف نکل گیا۔ میرزا خاں نے بڑودہ پہنچ کر کھنبایت پر ایک فوج روانہ کی جس نے مظفر کے سردار دولت نامی شخص کو شکست دے کر کھنبایت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرزا خان نے نادوت کی طرف پیش قدمی کی اور قلیچ خاں اور دوسرے امیروں کو دسطی پہاڑی پر جہاں مظفر پناہ گزیں تھا حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ ساری لڑائیاں نظام الدین احمد کی بدولت جیتی گئیں۔ شاہی فوج ساز و سامان سے لدی رہتی تھی اس کے لیے تیزی سے نقل و حرکت کرنا دشوار رہتا تھا۔ نظام الدین احمد نے امراء کے حوصلے بڑھائے اور خود بھی اپنے عہدے سے بڑھ کر کارگزاری دکھائی۔ ان کی کوشش و استقامت تھی کہ مظفر کے ساتھ لشکر نے سرگنج کی پہلی سخت لڑائی جیت لی تھی اور اب مظفر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

میرزا خاں احمد آباد کو لوٹ آیا اور مالوہ کے لشکر کو اس نے بھڑوچ کے قلعے کے محاصرے پر مقرر کر دیا۔ بھڑوچ پر مظفر کی طرف سے چرکس رومی حاکم تھا 7 ماہ بعد وہ مارا گیا اور مظفر کا سالا نصیر فرار ہو گیا۔

اکبر کی الہ آباد روانگی

اسی سال مرزا خاں اور مالوہ کے لشکر کو گجرات پر مقرر کرنے کے بعد بادشاہ نے بذریعہ کشتی الہ آباد کی سیر کا ارادہ کیا۔ الہ آباد قدیم شہر پیاگ(66) کی جگہ نیا آباد کیا گیا تھا۔ یہ شہر ہندوؤں کی قدیم پرستش گاہ ہے۔ وہاں بادشاہ نے قلعے کی بنیادیں بھی رکھوائی ہیں۔ جس دن بادشاہ رخصت ہونے والے تھے، مکہ معظمہ سے شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے شیخ بدرالدین کے انتقال کی خبر پہنچی کہ انھوں نے 7 دن کا روزہ رکھا ہوا تھا اور تیز دھوپ میں ننگے پیر طواف کر رہے تھے جس سے پیروں میں آبلے پڑ گئے اور تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور عین عید قربان کے دن 990 ھ میں اللہ کے راستے میں جان دے دی۔ بادشاہ نے شیخ کی خانقاہ کے خادم حاجی حسین کے ذریعے ان کی وفات کی اطلاع بھجوائی جس سے ان کے خاندان میں واویلا مچ گیا۔ اس خاندان کے یہ آخری بزرگ تھے۔ ان پر رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

راجہ رام چند کی اطاعت

الہ آباد پہنچنے کے بعد بادشاہ نے وہاں 4 مہینے تک قیام فرمایا۔ یہاں سے زین خاں کوکہ اور بیربر کو جو پہلے رام چند بھٹہ کا ملازم تھا، ایلچی بنا کر چورا گڑھ روانہ کیا۔ رام چند نے اطاعت قبول کر لی اور زین خاں کو بڑی خاطر داری کے ساتھ روک لیا، پھر اس کے ہمراہ فتح پور میں آکر اس نے دربار شاہی میں حاضری دی اور 120 قیمتی لعل و جواہر جن کی قیمت 50 ہزار روپے ہوتی تھی نذرانے میں دیے۔ اپنے بیٹے بابو کو خدمت شاہی میں چھوڑ کر کچھ عرصے بعد وطن لوٹنے کی اجازت حاصل کی۔ واپسی کے چند دن بعد ہی وہ فوت ہو گیا۔

رام چند نہایت خوش اخلاق اور فیاض راجہ تھا۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے اس کی بخششوں کا یہ عالم تھا کہ ایک کروڑ کا سونا ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس نے ابراہیم سور کو بادشاہی کا کتنا کچھ سازو سامان تیار کر کے دیا تھا۔ میاں تان سین تو اس کے پاس سے واپس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر جلال خاں قورچی بڑے وعدے وعید کر کے اسے اپنے ساتھ واپس لایا۔

انہی دنوں میں حاجی پور سے اعظم خاں حملہ کرتے ہوئے الہ آباد پہنچا، لیکن اپنے لشکر کو لانے کے لیے بہت جلد واپس چلا گیا۔ امرائے شاہی نے الہ آباد میں شاندار عمارتوں کی تعمیر کا بندوبست کیا اور یہ طے پا گیا کہ آئندہ اس شہر کو پایہ تخت بنایا جائے، نیا سکہ جاری کیا جائے اور اس کے لیے شریف سرمدی چوکی نویس نے سکے کا یہ شعر نکالا تھا:

ہمیشہ چون زر خورشید و ماہ رائج باد
بشرق و غرب جہان سکۂ الہ آباد

کسی دل جلے نے شریف سرمدی کے متعلق یہ شعر کہا تھا:

دو چوکی نویسندہ ہر دو کثیف
یکی نا نفیس و دگر نا شریف

انہی دنوں ملا الہداد امروہہ اور ملا شیری جو دوآبہ پنجاب کی صدارت کے عہدے پر مامور تھے، الہ آباد آکر دربار میں حاضر ہوئے۔ ملا شیری نے بادشاہ کی خوشامد میں "ہزار شعاع" کے عنوان سے آفتاب کی تعریف و توصیف میں ایک نظم پیش کی جو ہزار قطعات پر مشتمل تھی یہ بادشاہ کو بہت پسند آئی۔

بادشاہ کی فتح پور واپسی

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں گجرات کی بغاوت کے تدارک کے لیے الہ آباد سے فتح پور واپسی ہوئی۔ اٹاوہ کے علاقے میں میرزا خاں کی فتح کی خبر پہنچ گئی۔ بادشاہ دار الخلافہ کو ماہ صفر 992ھ میں لوٹ کر آئے اور گجرات کے امیروں کے نام خوشنودی کے فرمان جاری کیے

گئے۔ میرزا خاں کو خان خاناں کا خطاب، گھوڑا، خلعت، مرصع خنجر، سرداری کے لوازمات اور سب سے بڑا 5 ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ نظام الدین احمد نے اس مہم میں نمایاں کارنامے انجام دیے تھے اس لیے ان کو بھی گھوڑا، خلعت اور منصب میں ترقی دی گئی۔ دوسرے امراء کے منصبوں میں بھی دس بیس اور دس تیس کا حسب مدارج اضافہ کیا گیا۔

رامائن کے ترجمہ کا حکم

اسی زمانے میں بادشاہ نے مجھے(67) ''رامائن'' کے ترجمے کا حکم دیا، جو تصنیف کے لحاظ سے مہابھارت سے پہلے کی کتاب ہے۔ اس میں 25 ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک 65 حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔ رامائن میں اودھ کے راجہ رام چندر جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے انہی کی داستان ہے۔ ہندو ان کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں کہ اللہ نے رام کی شکل میں حلول کیا تھا۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نامی 10 سروں والا ایک دیو حکومت کرتا تھا وہ رام کی بیوی سیتا کو اغوا کر کے لنکا لے گیا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر 4 کوس لمبا پل بندھوایا۔ بعض بندروں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک چھلانگ میں طے کر گئے اور بعض ایسے بندر تھے کہ سمندر پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ غرض ایسی بہت سی باتیں اس میں درج ہیں۔ بہرحال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتے تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل و عیال کے ساتھ قتل کر دیا اور لنکا کو راون کے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آ گئے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندستان پر 10 ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا کافی قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جب انسان اس دنیا میں نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ رامائن کے یہ واقعات صحیح نہیں، محض افسانے اور خیالی داستانیں ہیں جیسے شاہنامہ اور امیر حمزہ کی داستانیں جو درندوں اور جنوں کے اقتدار کے زمانے میں گزرا تھا۔

جنس کی تبدیلی کا واقعہ

ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانے میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے۔ راماین کا ایک ترجمان بھی دفتر کتاب سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آ کر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم سے چہرہ چھپا رکھا تھا اور بات نہیں کر رہی تھی۔ حکیموں نے اس کی تائید و تصدیق میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہے ہیں۔ اسی سال ملا عالم کابلی جو نہایت شیریں گفتار، عالم، خوش بیان اور باغ و بہار آدمی تھے، وفات پا گئے۔ ان کی تصنیف ''فواتح الولایت'' ہے ان کی تاریخ وفات ''اشعت طبع'' نکالی گئی۔

اکبر کی حکومت کا انتیسواں سال

اس سال 8 ربیع الاول 992ھ کو حمل آفتاب واقع ہوا اور نوروز جلالی کے دن جلوس شاہی اور نوروز سلطانی کا انتیسواں سال شروع ہو گیا۔ جشن نوروز بڑی دھوم دھام سے منایا گیا، دکانوں، مکانوں کی آرائش کی گئی، طرح طرح کی محفلیں منعقد ہوئیں، سامری کے گوسالے کی طرح کانسے کی گائے کا ایک ناقوس بنا کر بجایا گیا۔ غبارے جو فرنگیوں کی ایجاد ہیں اور جو کپڑے سے گیند کی شکل کے بنائے جاتے ہیں، چھوڑے گئے۔ اس مرتبہ دس دس آدمیوں کی ٹکڑی شاہی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ یہ لوگ اکبر کی مریدی اختیار کر کے نئے دین میں داخل ہوتے تھے۔ شجرے کے بجائے اکبر اپنی تصویر اخلاص اور رشد و ہدایت کی علامت کے طور پر عطا کرتا تھا۔ اکبر نے پگڑی پر جواہرات سے جڑا ایک سرپیچ باندھ رکھا تھا۔ فرامین میں سرنامے کے لیے ''اللہ اکبر'' کا کلمہ تجویز کیا گیا۔ اس سال جوا اور سود حلال کر دیے گئے، اس طرح اور دوسری ممنوعات بھی جائز قرار دے دی گئیں۔ اکبر نے دربار میں ایک جوا خانہ بھی بنوایا، جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر روپیہ قرض دیا جاتا تھا اس طرح بادشاہ کی دولت میں اضافے کی ایک صورت نکل آئی۔ 14 سال سے کم عمر لڑکی اور 16 سال سے کم عمر لڑکے کی شادی کی ممانعت کر دی گئی۔ حضور اکرم ﷺ اور حضرت

عائشہؓ کے جن کا کم عمری میں عقد ہوا تھا زفاف کے قصے وغیرہ سے اکبر نے صریحاً انکار کر دیا۔ پیغمبران اکرام سے خدا کی جناب میں جو لغزشیں ہوئیں مثلاً داؤد علیہ السلام اور اوریہ کا قصہ وغیرہ وہ سب اس مطلقاً انکار کے لیے اچھا خاصا بہانہ بن گئیں۔ اکبر جسے اپنا معتقد نہیں پاتا تھا اسے لائق قتل، مردود اور نابکار سمجھتا تھا۔ ایسے شخص کو فقیہہ اور دشمن سلطنت کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے ہر شخص کو وہی کاٹنا پڑتا ہے جو کچھ اس نے بویا ہوتا ہے۔ دوسرے مردود و نابکار کیا ہوتے خود حضرت سلامت سارے زمانے میں گمراہ اور کفر کے نام سے مشہور ہو گئے اور ان کے مرشد و مجتہد ابوالفضل کو "ابوجہل" کا لقب ملا۔ غرض دنیاوی سلطنت اب دین الٰہی کے زیر تسلط آ گئی اور اکبر اپنے دین کے معاملات کو امور سلطنت سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگا۔ عزت و ناموس کی بربادی کے لیے نوروز کی دکانوں اور مینا بازار کو کبھی کبھی مردوں سے خالی کرا دیا جاتا تھا اور بیگمات، اہل حرم اور خاص و عام پردہ نشین عورتوں کو سیر و تفریح کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس میلے میں بادشاہ لوگوں کو روپیہ پیسہ انعام دیتے تھے باہر سے آنے والی عورتوں کے قصے بھی طے کیے جاتے تھے اور لڑکیوں کے نکاح بھی کرائے جاتے تھے۔ بادشاہ نے نکاح کی قید کو بھی ختم کرا دینے کی بڑی کوشش کی، لیکن ہندو اس کے لیے راضی نہیں تھے اس لیے کچھ نہ کر سکا۔ اس زمانے میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا، آدھا ملک ان کے قبضے میں تھا وہ فوج میں بھی 50 فی صد تھے۔ مغل اور ہندوستانی امراء سے وہ کہیں زیادہ مقتدر اور با اختیار تھے، اس لیے نکاح کے معاملے میں ان کے سامنے اکبر کی کچھ نہ چلی۔ رہ گئیں دوسری قومیں تو ان کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ ان میں نہ غیرت تھی نہ اتفاق، اس لیے بادشاہ نے جس طرح چاہا انکو نچا کر رکھ دیا۔

انہی دنوں حسب وعدہ اعظم خاں حاجی پور سے یلغار کرتے ہوئے حاضر ہوا۔ مرزا سلیمان مکہ معظمہ سے لوٹ کر بدخشاں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس نے اور میرزا شاہرخ نے ازبکوں سے جنگ کی اور شکست کھائی اور اب دونوں ہندوستان میں پناہ لینے کے لیے آ رہے ہیں۔

ذی قعدہ کے اوائل میں نیلاب سے مان سنگھ کا عریضہ پہنچا کہ میرزا شاہرخ نیلاب کے کنارے آچکا ہے۔ اس نے میرزا کا استقبال کیا اور 6 ہزار روپیہ نقد، بہت سے کپڑے اور پانچ ہاتھی میرزا کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ کو اس کی خدمت گزاری بہت پسند آئی۔

شاہی امراء کا انتقال

اس سال چند امیروں کا انتقال ہوگیا۔ محمد باقی خاں جو ادہم خاں کا بھائی تھا، اس نے اپنی جاگیر گڑھ کٹنگہ میں وفات پائی۔ غازی خاں بدخشی کو الہ آباد سے اودھ کی طرف بھیجا گیا تھا وہ اسی جگہ فوت ہوگیا۔ غازی خاں آخر عمر میں اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اسے قالین پر بٹھا کر اجلاس میں لایا جاتا تھا۔ کسی نے اس پوچھا آپ کا کیا حال ہے؟ تو اس نے جواب دیا "الحمد للہ حرص و طمع کے بل پر زندہ ہوں اور اپنے تمام لاؤ لشکر پر حکمران ہوں"۔ نوکروں پر برہم ہوکر یہ دعا کرتا تھا کہ "خدا کرے تو بھی ہزاری منصب ہو جائے تا کہ تجھے میری قدر معلوم ہو"۔

ایک رات قلیچ خاں کے گھر پر بہت سے لوگ افطار کی دعوت میں جمع تھے، غازی خاں سورۂ "انا فتحنا" کی تفسیر بیان کر رہا تھا میں نے کوئی اعتراض کیا۔ اس نے کچھ توجیہہ کر کے درشتی سے جواب دیا، میں نے کہا، ظاہر تو یہی ہو رہا ہے۔ اس پر وہ بہت برافروختہ ہوگیا، آخر آصف خاں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔

جس دن الہ آباد سے کوچ ہوا تھا، راستے میں کافی دور تک میں اور غازی خاں علمی مذاکرہ اور مشائخین کے اقوال بیان کرتے رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو وداع کیا۔ غازی خاں سے بس یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اسی سال سلطان خواجہ بھی فوت ہوگیا وہ اکبر کے مریدان خاص میں شامل تھا۔ اس کو ایک خاص وضع کی قبر میں دفن کرایا گیا تھا جس میں ایک جالی لگائی گئی تھی کہ ہر صبح کو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی رہے، کیوں کہ سورج گناہوں کو پاک کرنے والا ہے،

کہتے ہیں کے منہ کو آگ سے جھلسایا بھی گیا تھا۔

ملا احمد ٹھٹھہ بھی مرگیا۔ اس کی تاریخ "سلطان الخوارج" ہے جس میں ایک عدد کی کی ہے۔

مرزا شاہرخ کی آمد

993ھ/1585ء کے آغاز میں جبکہ تیسویں سال جلوس کا اختتام تھا، میرزا شاہرخ اور راجہ بھگوان داس فتح پور کے قریب پہنچ گئے۔ اکبر نے شاہزادہ دانیال کو شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کے ساتھ استقبال کے لیے بھیجا یہ لوگ اسے بارگاہ میں لے کر آئے۔ بادشاہ نے مرزا کو ایک لاکھ روپیہ نقد، فراش خانے کا سامان، تین عراقی گھوڑے، پانچ ہاتھی، چند اونٹ، خچر اور ملازم عطا فرمائے۔

شاہزادہ سلیم کی شادی

انہی دنوں بادشاہ نے اپنے مقررہ طریقے پر شاہزادہ سلیم کو 16 سال کی عمر میں راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے بیاہ دیا۔ خود بادشاہ سلامت کی سواری اس کے گھر پر گئی اور عقد قاضیوں اور شرفاء کی محفل میں منعقد ہوا۔ 2 کروڑ تنکہ مہر باندھا گیا اور ہندوؤں کی تمام رسمیں جیسے آگ جلانا وغیرہ انجام دی گئیں دلہن کے گھر سے دولت خانہ شاہی تک دلہن کی پالکی پر سے بادشاہ نے سونا نچھاور کرایا۔

راجہ بھگونت داس نے چند گھوڑے اور قسم قسم کے جڑاؤ سونے کے زیور، جواہرات، سونے چاندی کے برتن، طرح طرح کے بے حد وشمار کپڑے جہیز میں دیے شاہی امراء کو بھی اس نے ہر ایک کے حسب حال عراقی، ترکی اور عربی گھوڑے سنہری زین کس کر بطور ہدیہ پیش کیے۔

اکبر کی حکومت کا تیسواں سال

جمعرات کے دن 19 ربیع الاول 993ھ/1585ء کو بہار کے موسم کا آغاز ہوا۔ نوروز سلطانی

کے دن آ گئے۔ میرزا نظام الدین احمد نے جو سن وار ترتیب سے تاریخ لکھی ہے، اس نوروز کے متعلق لکھا ہے کہ "جلوس کا تیسواں سال شروع ہو گیا۔ حالانکہ جلوس کے دوسرے قرن کا آغاز 25 ربیع الاول 994ھ/1586ء میں بمقام اٹک بنارس میں ہوا تھا، اس صورت میں یہ تیسواں جلوس کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہاں میرزا سے بھول ہو گئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایام کبیسہ کی وجہ سے قمری کے ہر تین سال پر ایک مہینے کا فرق پڑ جاتا ہے اور ہر قرن پر شمسی اور قمری سنین میں ایک سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ میرے پاس چونکہ تقویم نہیں ہے، اس لیے میں نے مجبوراً میرزا ہی کی پیروی کی ہے۔ اس کی ذمے داری میرزا پر ہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان دنوں میرزا گجرات میں تھے، شاہی لشکر میں نہیں تھے۔

غرض یہ کہ پرانے رواج کے تحت نوروز کا جشن خوب دھوم دھام کے ساتھ منایا گیا۔ ہر روز بڑی بڑی ضیافتیں ہوئیں۔ مینا بازار یعنی کہ نوروز کی دکانیں جو امراء لگایا کرتے تھے، ہر دکان دار نے بھاری بھاری نذرانے، سب طرح کے کھانے، عطر اور اہل طرب کے انعامات کا خرچ شاہی خزانے سے ادا کیا گیا۔ حسب الحکم پنج ہزاری سے لے کر احدی تک ہر چھوٹے بڑے نے پیش کش اور نذرانے خدمت میں پیش کیے۔ مجھ(68) حقیر نے بھی کہ میری حیثیت ذرۂ ناچیز سے بڑھ کر نہ تھی، لیکن ہزار بیگھ زمین کی وجہ سے ہزاری سمجھا جاتا تھا یوسف علیہ السلام کو خریدنے والی بڑھیا کی طرح 40 روپے کی نذر دی جسے بادشاہ نے قبول فرمایا۔

اس جشن میں بڑے شاہزادے کو بارہ ہزاری کا منصب ملا۔ ان سب کو فراش خانہ، علم و سراپردہ اور نقارے وغیرہ بھی عطا ہوئے۔

دکن پر حملے کی تیاریاں

اس سال کے شروع میں دکن میں متعینہ امیر میر مرتضیٰ اور خداوند خاں نے برار کے علاقے سے نظام الملک کے پایۂ تخت احمد نگر پر حملہ کیا تھا۔ انھیں نظام الملک کے وزیر صلابت خاں نے شکست دے دی تھی، وہ وہاں سے بھاگ کر برہانپور میں راجہ علی خان کے پاس

چلے گئے تھے۔ راجہ علی خان نے ان کے سارے ہاتھی، گھوڑے چھین لیے تھے، ان میں سے 150 ہاتھی اس نے اپنے لڑکے ابراہیم خاں کے ساتھ دربار میں بھجوادیے تھے۔ جشن نوروز کے موقعے پر خود راجہ خاں بقیہ گھوڑے لے کر دربار میں آیا اور اکبر کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس کی فرمائش پر بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو جسے بعد میں میر فتح اللہ کا نام دیا گیا، عضد اللہ کا خطاب عطا فرمایا اور 5 ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کی اور ہندستان کا صدر کل بنا کر دکن کی مہم پر مقرر فرمایا۔ اس کے ساتھ خان اعظم، شہاب الدین احمد خاں اور دوسرے امراء بھی مقرر کیے گئے اس کے تقرر سے صدارت کا عہدہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا۔ آخر یہ معاملہ اس حد تک پہنچا کہ شاہ فتح اللہ کو اس اقتدار کے باوجود کسی امام کو 5 بیگھہ زمین بھی دینے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ البتہ وہ ساری کی ساری زمینیں واپس لے کر بحث ضرور کرتا رہتا تھا۔ مدد معاش کی جتنی زمینیں واپس لے لی گئی تھیں وہ ساری کی ساری تباہ ہوگئیں۔ نہ ائمہ اس سے مستفید ہو سکے نہ رعایا۔ اماموں اور معاش داروں پر جو مظالم ہوئے وہ ان تمام صدور کے نامۂ اعمال میں باقی رہیں گے جن کے اب نام تک باقی نہیں رہے ہیں۔

ماہ رجب 993ھ/1585ء میں کابل سے خبر آئی کہ مرزا سلیمان اوزبکوں سے شکست کھا کر بدخشاں سے میرزا محمد حکیم کے پاس کابل آگیا ہے اور اسالو نامی ایک موضع کی جاگیر پر صبر شکر کر کے بیٹھ رہا تھا، پھر اس نے قبائل کو اکٹھا کر کے بدخشاں کی سرحد پر اوزبکوں سے مقابلہ کیا اور انھیں شکست دی، بہت سے اوزبک اس لڑائی میں مارے گئے۔ جو قیدی بن کر آئے ان کو میرزا نے خلعت و انعام دے کر رہا کر دیا اور اپنا ملک دوبارہ حاصل کر لیا۔

گجرات میں دوبارہ بغاوت

ماہ شعبان میں حسب الحکم شاہی، خان خاناں گجرات سے فتح پور آیا ہوا تھا۔ اس کے گجرات سے نکلتے ہی مظفر نے دوبارہ بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ مظفر کو جونا گڑھ کے حاکم جام امین

خاں غوری سے بڑی شکایات تھیں اس کے ہاتھوں اس نے منھ کی کھائی تھی، اس لیے اس بار اس نے بڑھ کر جونا گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ قلیچ خاں تو احمد آباد میں حفاظت و ناکہ بندی کے لیے ٹھہرا رہا اور مظفر کے بغاوت کو کچلنے کے لیے نظام الدین احمد گجرات کے امیروں کو ساتھ لے کر مقابلے پر پہنچے۔ مظفر شاہی لشکر سے مقابلے کی تاب نہ لا کر دریائے رَن کو پار کر کے کچھ میں چلا گیا۔ یہ دریا سمندر سے 10 کوس اور 30 کوس کے فاصلے سے جیسلمیر کے ریگستان میں داخل ہوتا ہے اور اسی ریگزار میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

اسی زمانے میں نظام الدین احمد نے گجرات سے میرے نام خط بھیجا تھا کہ ”خان خاناں نے یہاں سے جاتے ہوئے وعدہ کیا ہے کہ اس بار وہ بادشاہ سے اجازت لے کر تم کو اور ملا الہداد کو اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تم حسب مراتب خان خاناں سے مل لو اور دربار سے رخصت لے کر یہاں آ جاؤ۔ گجرات کی سیر نہایت دلچسپ رہے گی“۔

اس خط کے بموجب میں خان خاناں سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا، صرف ایک بار جب کہ میں(70) دولت خانۂ شاہی سے متعلقہ کتب خانے میں جہاں ترجمے کے کام پر میں مامور تھا، جا رہا تھا تو خان خاناں سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ بہت جلد گجرات کی جانب لوٹ گیا، پھر کابل کے قضیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے گجرات جانے کے لیے رخصت لینے کا موقع نہ ملا اور وہ ارادہ جسے میں نے اپنی نجات اور بہتری کا وسیلہ سمجھ رکھا تھا پورا نہ ہو سکا۔

خان خاناں فتح پور سے رخصت ہوکر جب سروہی سے 10 کوس پر پہنچا تو اس نے سروہی اور جالور پر قبضہ کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ نظام الدین احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ سید قاسم بارہہ بھی اپنی ساری جمعیت کو لے کر استقبال کے لیے آ گیا۔ خان خاناں کی فوجی کاروائی کی خبر سن کر سروہی کا راجہ بھاری پیش کش لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ غزنین خاں جالوری بھی اس مرتبہ ملاقات کے لیے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا لیکن جس وقت خان خاناں

دربار کے ارادے سے کوچ کر رہا تھا تو اس سے کوئی خطا سرزد ہو گئی تھی اور اب اس کے باغی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے خان خاناں نے اسے قید کر دیا اور اپنے ساتھ احمد آباد لے کر چلا گیا۔ جالور کی جاگیر اس سے لے کر اپنی فوج کو وہاں مقرر کر دیا۔

عشق کا انجام

سید محمود بارہہ کے پوتے سید جمال الدین کو جو چند سال پہلے شاہی طرب خانے کی ایک حسین طوائف تھی اور جس کا نام بکھن تھا اور اب تو وہ چڑیل سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے، عشق ہو گیا۔ اس عشق بازی کا بھانڈا پھوٹا تو وہ ڈر کر دربار سے پہاڑی علاقے میں جا چھپا اور وہاں اس نے اپنی ایک ٹولی بنالی اور وہ سرکاری علاقے میں لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ بعد میں وہ پہاڑی سے اپنے چچا سید قاسم کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ خان خاناں نے حسب فرمان اس کو سید قاسم کی جاگیر پٹن سے بلوا کر قید کر لیا، پھر اس کو اور غزنین خاں کو لاہور بھیج دیا گیا۔ غزنین خاں کی شادی میاں محمد وفا خزانچی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی تھی بادشاہ نے اس کے سالے میاں فتح اللہ شربتی کا لحاظ کر کے اس معاف کر دیا اور وہ دوبارہ ملازمت شاہی سے وابستہ ہو گیا، لیکن سید جمال الدین عتاب سے نہ بچ سکا، اسے پھانسی پر چڑھا کر تیروں سے چھلنی چھلنی کر دیا گیا۔ عشق بازی کا روگ آخر اس کی جان لے کر ہی ٹلا۔

پیر روشن کی لوٹ مار

اٹک بنارس سے راجہ مان سنگھ اور خواجہ شمس الدین کا عریضہ پہنچا کہ کابل میں مرزا محمد حکیم سخت بیمار اور فراش ہے۔ پشاور سے فریدوں ایک قافلہ لے کر کابل کی طرف گیا تھا، جب وہ کوتل خیبر پہنچا تو وہاں اس کا مقابلہ روشن طمد کے لڑکے سے ہو گیا۔ روشن طمد اس علاقے میں معقول مستند آدمی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اب تو وہ روشن نہیں بلکہ پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے۔ فریدوں خیبر پر شکست کھا کر پشاور واپس چلا آیا۔ اتفاق سے جب وہ پشاور پہنچا تو وہاں کے

قلعے میں آگ لگ گئی اور سوداگروں کا ایک ہزار اونٹوں کا لدا ہوا مال جل گیا۔

اسی اثنا میں یہ خبر بھی ملی کہ عبداللہ خاں ازبک نے دوبارہ ایک بڑی فوج بھیج کر بدخشاں پر قبضہ کر لیا ہے اور مرزا سلیمان کو وہاں سے بے دخل کر کے اس کے سارے مال و اسباب پر قابض ہو گیا ہے۔ میرزا سلیمان اس کے مقابلے کی تاب نہ لاکر دوبارہ کابل لوٹ آیا ہے۔

مرزا محمد حکیم کا انتقال

اس کے ساتھ کابل سے ایک اور خبر آئی کہ میرزا محمد حکیم،(7) کثرت شراب نوشی سے طرح طرح کے امراض میں گرفتار تھا، چنانچہ رعشے کے عارضے میں 12 شعبان 993ھ/1585ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

بادشاہ کا کابل کا ارادہ

میرزا محمد حکیم کے انتقال کی خبر تیسری ماہ رمضان المبارک کی ملی تھی، بادشاہ کو کابل اور غزنی کی حفاظت کی بڑی فکر ہوئی۔ پہلے خیال تھا کہ یہ علاقہ میرزا محمد کے لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن امراء نے عرض کیا کہ مرزا کے لڑکے ابھی چھوٹے ہیں۔ وہ وہاں کا نظم ونسق سنبھال نہیں سکیں گے۔ اس لیے بادشاہ نے خود وہاں جانے کا عزم کیا۔ خان خاناں کے نام گجرات جلد پہنچ جانے کا فرمان صادر کیا گیا۔ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں دکن کی مہم کے لیے نامزد کیے جا چکے تھے۔ عضد اللہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دکن کی مہم انتظامات کے لئے مالوہ اور رائے سین میں ان امراء کے پاس چلا جائے۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے پنجاب کی طرف کوچ کر دیا۔ شوال کا چاند دہلی میں دیکھا گیا۔ پانی پت پہنچے تو وہاں سے میر ابوالغیث بخاری کو لکھنؤ کے نواح میں جاگیر دے کر رخصت کر دیا۔ اس ماہ کی 19 تاریخ کو ستلج کے کنارے کیمپ لگایا گیا۔

انہی دنوں شیخ جمال بختیار اور شیخ الاسلام کا پوتا خواجہ اسماعیل جو نہایت حسین اور

خوبرو شخص تھا اور عیاشی کی کثرت کی وجہ سے بیمار تھا۔ ایک ہفتے کے فرق سے یہ دونوں انتقال کر گئے۔ ایک کی وفات لدھیانہ میں ہوئی اور دوسرے کی تھانیسر میں۔ خواجہ اسماعیل کی وفات کی تاریخ ہے:

"رفت زیبا گلی زباغ جہان"

سیالکوٹ سے 3 کوس کی مسافت پر ملا الہداد امروہہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سینے پر ایک داغ پڑ گیا تھا اور اسکی تپش دل تک پہنچ گئی تھی۔ اسے حکیم حسن نے ایک مسہل دیا تھا، اسی دن وہ فوت ہو گیا۔ بڑا اچھا دوست تھا جو بچھڑ گیا۔

لاہور کے علاقے میں جب قیام ہوا تو صادق خان کو بھکر کی حکومت پر مقرر کیا گیا تھا۔ 13 ذیقعدہ کو لشکر چناب کے کنارے پہنچ گیا۔ میر ابوالغیث اور شیخ محمد بخاری کا مصاحب شیخ عبدالرحیم لکھنوی خان زمان کے زوال کے بعد دربار میں آ گیا تھا اور امارت کے منصب پر فائز تھا۔ اسے بادشاہ نے پہاڑی علاقے میں پرگنہ پٹھان کی جاگیر عطا کی تھی۔ ان دنوں جنون کے عارضے میں مبتلا تھا۔ چناب کے قیام کے دوران اس نے حکیم ابوالفتح کے خیمے میں اپنے آپ خنجر مار لیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھ سے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے سیالکوٹ میں بہ حفاظت رکھنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ صحت یاب ہو گیا، لیکن دیوانگی اسی طرح باقی رہی۔ اسی ماہ کی 27 تاریخ کو بہت دریا کو پار کیا اور اسی جگہ محمد علی خزانچی جو کابل میں مقرر تھا خدمت میں حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ میرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد اس کے لڑکے فریدوں خان، کیقباد اور افراسیاب جو کم عمری کے سبب سلطنت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، امراء کے ساتھ مان سنگھ کے پاس پہنچا دیے گئے تھے۔ مان سنگھ نے اپنے لڑکے کو خواجہ شمس الدین خوافی کے ہمراہ کابل میں چھوڑ دیا ہے اور میرزا کے تمام آدمیوں کو تسلی و اطمینان دے کر اپنے ساتھ بارگاہ میں لے آیا ہے۔

5 ذی الحجہ کو قصبہ چنڈی(72) میں جو اٹک بنارس اور رہتاس کے درمیان ہے، قیام ہوا۔ یہاں مان سنگھ میرزا کے لڑکوں اور ملازمین کو اپنے ہمراہ لے کر حاضر ہو گیا۔ بادشاہ ان سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے اور لائق حال امداد اور خرچ عطا کیا۔

اٹک بنارس کے علاقے سے شاہرخ میرزا راجہ بھگونت داس اور شاہ قلی خاں محرم کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ کشمیر فتح کرنے کے لیے رخصت کیا گیا۔ اسی دن اسماعیل قلی خاں اور رائے سنگھ درباری کو بلوچوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے زین خان کوکہ کو ایک منظم فوج دے کر سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں پر فوجی کارروائی کے لیے روانہ کیا گیا۔

روشنیہ قبیلہ پر فوجی کارروائی

یکم محرم 994ھ/1586ء کو اٹک بنارس میں چھاؤنی لگائی گئی۔ 25 سال پہلے ایک ہندستانی سپاہی پٹھان قبیلوں میں چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں پیر روشنائی کے نام سے بہت سے احمق پٹھانوں کو اپنا مرید بنا لیا تھا اور پٹھانوں میں الحاد و بے دینی پھیلاتا رہا تھا۔ ایک کتاب بھی ''خیر البیان'' کے نام سے لکھی تھی، جس میں مفسدانہ عقائد درج کر رکھے تھے، بعد میں انہی پٹھانوں میں اس کا انتقال ہو گیا تھا اس کا ایک لڑکا جلالہ نامی تھا جو چودہ سال کی عمر 989ھ/1571ء میں جب کہ بادشاہ سلامت کابل سے لوٹ رہے تھے، شاہی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور بادشاہ نے اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا تھا، لیکن اپنی موروثی بدقسمتی کے سبب وہ شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور پھر پٹھانوں کے قبیلے میں شامل ہو کر ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس کے چھاپوں سے ہندستان اور کابل کا راستہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پٹھانوں کے اس روشنائی فرقے نے کافی زور باندھ رکھا تھا۔ اس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بادشاہ نے کابل مان سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تا کہ وہ ان سرکشوں سے بخوبی نپٹ سکے۔

اس سال کے ماہ صفر میں سعید خاں گکھر، بیربر، شیخ فیضی اور فتح اللہ شربتی اور دوسرے چند امراء کو زین خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا۔ چند دن بعد ہی حکیم ابوالفتح اور امراء کی ایک جماعت کو پہلی کمک کے پیچھے ہی رخصت کیا گیا۔ یہ فوجیں زین خاں سے جا کر مل گئیں اور ان سبھی نے مل کر پٹھانوں پر سخت حملے کیے۔ ان کے علاقے پامال کر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد کو قیدی بنا لیا۔

بیربر کی ہلاکت

ایک رات کسی شخص نے بیربر کو آکر اطلاع دی کہ "پٹھان آج رات حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر تم اس تنگ گھاٹی کو جو تین چار کوس سے زیادہ نہیں ہے، جلد طے کر کے نکل جاؤ تو خطرے سے باہر ہو جاؤ گے"۔ اس وقت شام ہونے ہی والی تھی، بیربر نے اپنی خود سری اور خود پسندی کی وجہ سے زین خاں سے کوئی مشورہ نہ کیا اور بے وقت وہاں سے کوچ کر دیا۔ سارا لشکر اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب شام کو وہ ایک گھاٹی میں داخل ہو رہے تھے، تو پٹھانوں نے آس پاس کی پہاڑیوں سے پتھروں اور تیروں کی بارش کر دی اس اندھیری گھاٹی میں راستے کی تنگی اور غاروں کی کثرت کی وجہ سے سارا لشکر پراگندہ ہو گیا کسی کو کسی کی خبر نہیں رہی اور پٹھانوں نے انھیں گھیر گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثے میں 8 ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ بیربر جو جان بچانے کے لیے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا، قتل کر دیا گیا۔ اس ہولناک رات کو بہت سے بادشاہی امیر اور سردار جیسے حسن خان پنی، خواجہ عرب بخشی، خان جہاں اور ملا شیری جیسے شاعر مارے گئے۔ پٹھانوں نے جنھیں قید کر لیا ان کا شمار اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس واقعہ کی تاریخ "از خواجہ عرب حیف" سے نکلتی ہے۔ اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

اس شکست کے بعد حکیم ابو الفتح اور زین خاں پہنچے۔ ان لوگوں نے بیربر جیسے مصاحب کو مخالفت کی بنا پر ہلاک کروا دیا تھا اور ان کی یہ منافقت ثابت ہو چکی تھی اس لیے کچھ دن تک یہ لوگ عتاب میں رہے اور کورنش سے محروم کر دیے گئے، بعد میں پھر ان کے منصب بحال ہو گئے بلکہ اس سے بڑے مدارج تک ترقی پائی۔

بیربر کا ماتم

اکبر کو کسی امیر کے مرنے کا اتنا رنج نہیں تھا، جتنا بیربر کی موت کا۔ نہایت حسرت سے کہتا تھا: "افسوس اس کی لاش اس گھاٹی سے نہیں لائی جا سکی کہ اسے چتا تو نصیب ہو جاتی۔ پھر یہ کہہ کر خود تسلی دیتا کہ وہ تمام پابندیوں سے آزاد مجرد شخص تھا، اسے پاک کرنے کے لیے

نیر اعظم کی تمازت کافی، ویسے بھی اسے پالکی کی ضرورت نہ تھی"۔

روشنائی قبیلہ کی شکست

پٹھانوں کی اٹک کی طرف پیش قدمی کی خبر گرم تھی، اس لیے بادشاہ نے دوسرے دن شاہزادہ سلطان مراد اور راجہ ٹوڈرمل کو سندھ ندی پار کرکے باغی پٹھانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا۔ بعد میں شاہزادے کو واپس بلا لیا۔ صرف راجہ کو یہ مہم سپرد کر دی گئی۔ اس نے اس پہاڑی علاقے میں کئی قلعے بنوائے۔

مان سنگھ روشنائی قبیلہ پر مقرر تھا۔ اس نے ان کے بہت سے آدمیوں کو ہلاک اور قید کرلیا۔ اس دوران عبد اللہ خان کا ایلچی میر قریش اس کا خط لے کر وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی بلخ کا حاکم نظر اوزبک بھی عبد اللہ خان سے بگڑ کر اپنے تین بچوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کو لانے کے لیے شیخ فرید بخشی کو احدیوں کے ایک دستے کے ساتھ روانہ کیا۔ انھوں نے پہنچ کر آنے والوں کا کوتل خیبر پار کرا دیا۔ روشنائی قبیلے کے آدمیوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

اکبر کے دور حکومت کا اکتیسواں سال

25 ربیع الاول 994ھ/1586ء کو نوروز آپہنچا اور تخت نشینی کا اکتیسواں سال[73] شروع ہوگیا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن اٹک کے بادشاہی دیوان خانے میں منایا گیا۔ میر قریش کو کورنش کی اجازت ملی۔ مان سنگھ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ شیخ فیضی نے مبارک بادی کا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

فرخندہ باد یا رب بر مملکت ستانی
از مبدۂ خلافت آغاز قرن ثانی

واضح رہے کہ یہاں تخت نشینی کے پہلے سال کے تعین میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف پہلے بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں۔ میرزا کے صاحبزادے محمد شریف نے اپنے باپ

کی وفات کے بعد" تاریخ نظامی" کے سنوں کی تنقیح کی ہے۔ اختلاف سنین کو رفع کرنے کے لیے اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

حاکم کشمیر سے صلح

میرزا شاہرخ راجا بھگوان داس اور شاہ قلی خاں محرم کشمیر میں کوتل پھولباس تک پہنچ چکے تھے۔ جب انھیں زین خاں کی شکست کی خبر ملی تو انھوں نے کشمیر کے حاکم یوسف خاں سے اس شرط پر کہ کشمیر کے زعفران زار کی سالانہ پیداوار اور سکۂ خالصہ اکبر شاہی سے منسوب رہے گا صلح کر لی اور وہاں اپنے کارندے مقرر کر کے سارا علاقہ حسب سابق یوسف خاں کو عطا کر دیا۔ یوسف خاں دربار شاہی میں حاضری کا بہت زیادہ خواہشمند تھا اس لیے یہ سب امیر اسے ہمراہ لے کر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے اس صلح کو پسند نہ فرمایا اس لیے ان امیروں کو بڑی ہی شرمندگی ہوئی اور وہ منہ چھپائے بیٹھے رہے آخر نو روز کے دن سب کو بلا کر کورنش کی اجازت ملی۔

انھی دنوں عبد اللہ خاں اوزبک کا ایلچی اور مذکورہ سردار نظر بی اپنے بچوں کے ساتھ حاضر ہوا۔ نظر بی کو 4 لاکھ تنکہ جو عراق کے 500 تومان کے برابر ہے، عطا کیا گیا۔

اکبر کی لاہور واپسی

24 ربیع الثانی 994ھ/1556ء کو بادشاہ نے اٹک سے لاہور واپسی کا ارادہ کیا۔ دریائے سندھ کے کنارے پٹھانوں کے مقابلے پر مان سنگھ کے بجائے اسماعیل قلی خاں کو اور کابل پر مان سنگھ کو مقرر کیا گیا۔ اسماعیل قلی خاں کی مدد کے لیے سید حامد بخاری کو راستے کی حفاظت و انتظام کے لیے پشاور میں مقرر کیا گیا۔ 17 جمادی الثانی کو لاہور میں آنے کی خوشی میں اجلاس ہوا۔ اسی وقت عرب بہادر کا سر جو بہرائچ میں حکیم ابو الفتح سے جنگ میں مارا گیا تھا، ملاحظہ شاہی میں پیش کیا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بہادر طبعی موت مرا تھا۔ حکیم نے مردہ کا سر کٹوا کر بھجوا دیا تھا۔

شہزادہ سلیم کا عقد اور راجہ بھگوان داس کی خودکشی

19 رجب کو رائے سنگھ بھتہ کی لڑکی سے شہزادہ سلطان سلیم کا عقد کیا گیا تھا۔ شعبان کے اوائل میں محمد قاسم خاں میر بحر اور فتح خاں فیل بان فوجدار اور امراء کی ایک جماعت کشمیر کو فتح کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ اس سے پہلے یوسف خاں کشمیری کو جو راجہ بھگوان داس کے قول و قرار پر چلا آیا تھا۔ اکبر نے قید کر کے قتل کرا دینے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ کے یہ تیور دیکھ کر راجہ بھگوان داس نے اپنے قول و قرار کی حمیت و غیرت میں آپنے آپ کو جمدہر مار لیا۔

یعقوب کشمیری کی بغاوت

یوسف خاں کا لڑکا یعقوب شاہی دربار کے مصاحبوں میں شامل تھا اور مظفر گجراتی کی طرح اس کا بھی 39، 40 روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ وہ کسی طرح بھاگ کر کشمیر واپس چلا گیا۔ چونکہ متعصب شیعہ تھا اس لیے وہاں کے سنی قاضی کو اپنے ہاتھ سے شہید کر دیا اور اپنے باپ کے امیروں اور افسروں کو ہموار کر کے کشمیر کی حکمرانی ہاتھ میں لے لی، کیوں کہ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا باپ قتل کرا دیا گیا ہے۔ جب بادشاہی فوج کوہل کتریل میں پہنچی تو یعقوب اس کے مقابلے پر ایک بھاری لشکر لے کر آیا اور پہاڑ کی گھاٹیوں کو اچھی طرح مستحکم کر کے لڑائی کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔

یعقوب ایک اوباش طبیعت آدمی تھا اور اپنے آدمیوں سے بدسلوکی کرتا رہتا تھا اس لیے اس کے ملازموں کی ایک جماعت ساتھ چھوڑ کر محمد قاسم خاں سے آ کر مل گئی اور کچھ لوگوں نے کشمیر کے حاکم نشین شہر سری نگر میں اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ یعقوب نے پہلے گھر کے فتنے کا سد باب ضروری سمجھا اور وہاں سے لوٹ کر شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کے پیچھے شاہی فوجیں بغیر کسی رکاوٹ کے کشمیر میں داخل ہو گئیں اور سارا کشمیر شاہی قبضے میں آ گیا۔ یعقوب مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا اور پہاڑی علاقے میں جا کر پناہ لے لی۔

یوسف اور یعقوب کا انجام

یعقوب نے دوبارہ لاؤ لشکر جمع کر کے قاسم خاں سے جنگ کی، لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی۔ ایک مرتبہ اس نے شب خون بھی مارا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس جنگ میں میرزادہ مٹے خاں مارا گیا۔ بادشاہی فوجوں نے یعقوب کو تنگ گھاٹیوں میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور نہایت عاجزی کے ساتھ قاسم خاں کے پاس حاضر ہوا اور اس کے ہمراہ خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ بعد میں بادشاہ نے اسے بہار میں مان سنگھ کے پاس جہاں اس کا باپ یوسف بھی قید میں تھا، بھیج دیا۔ دونوں باپ بیٹے عرصے تک قید میں رہے پھر مالیخولیا کے عارضے میں دونوں کا انتقال ہو گیا۔

۱۹ رمضان کو بادشاہ نے میر قریش ایلچی کو حکیم ابو الفتح کے بھائی حکیم ہمام اور میر صدر جہاں مفتی ساکن بھانی کے ہمراہ قنوج سے عبد اللہ خان کے باپ سکندر خاں کی عزاداری کے لیے ماوراء النہر کی طرف روانہ کیا۔ محمد علی خزانچی کے ہاتھ اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے ہندستان کے لیے تحائف وغیرہ بھی بھیجے۔

روشنائی قبیلے کی فوجی کاروائی

انہی دنوں روشنائی قبیلے کے پٹھانوں نے 20 ہزار پیدل فوج اور پانچ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر سید حامد بخاری جو گجرات کے سلاطین کے عہد کا ایک بہت بڑا امیر تھا، حملہ کر دیا۔ اس نے اپنی تھوڑی بہت جمعیت کے ساتھ پشاور میں ان سے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ اس حادثے پر روشنائی قبیلہ کی بغاوت کو کچلنے کے لیے دربار سے زین خان کوکہ، شاہ قلی خاں محرم اور شیخ فرید بخشی کو روانہ کیا گیا۔ مان سنگھ بھی کابل سے ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور خیبر درہ پر پٹھانوں سے سخت جنگ کر کے اس نے روشنائی قبیلے کو شکست دی اور وہیں ٹھہرا رہا۔ پٹھانوں نے دوسرے دن واپس آکر پھر حملہ کیا اور چو طرفہ لڑائی لڑنے لگے، اس وقت مان سنگھ کا بھائی مادھو سنگھ جو اوھند کے تھانے پر اسماعیل قلی خاں کے ساتھ متعین

تھا، مدد کے لیے آ پہنچا۔ اس تازہ کمک کے آجانے کی وجہ سے پٹھان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کے تقریباً 2 ہزار آدمی مارے گئے۔

انہی دنوں بدخشاں میں میرزا سلیمان اوزبکوں سے برابر لڑتا رہا، کبھی ان کو شکست دی اور کبھی ان سے شکست کھائی۔ آخر عاجز ہوکر وہ کابل اور وہاں سے خیبر میں آ کر مان سنگھ سے ملا اور وہاں سے ہندستان کے لیے روانہ ہوگیا۔ مرزا سلیمان ماہ ربیع الاول 995ھ/ 1587ء کو لاہور میں شاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

محمد زماں میرزا کا کارنامہ

شاہرخ میرزا کا لڑکا محمد زمان میرزا 12 سال کا تھا۔ جب اوزبکوں کے مقابلے میں اس کے باپ کو شکست ہوئی تو وہ گرفتار ہوگیا تھا۔ عبد اللہ خاں نے اسے پیرو مرشد خواجہ کلاں بیگ نقشبندی جو خواجہ احرار کے پوتے تھے، کے سپرد کردیا تھا کہ اسے بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ قتل کرادیں۔ خواجہ صاحب نے اس لڑکے کے عوض ایک دوسرے واجب القتل قیدی کو قتل کرا کے اسے رہا کر دیا اور وہاں سے رخصت کر دیا۔ جس زمانے میں سلیمان میرزا دربار میں پہنچا تو وہ ماوراء النہر کے فقیروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے شاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اُسے ایک ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ پھر وہ ہندستان سے حج کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے دوبارہ اس نے بدخشاں کا رخ کیا اور ایک اچھی خاصی فوج فراہم کر کے اوزبکوں سے مردانہ وار کئی ایک لڑائیاں لڑیں اور انھیں شکست دے کر وہاں کے سارے پہاڑی علاقے پر قبضہ کرلیا اور دشمنوں کو اپنے موروثی ملک سے نکال دیا۔ اس وقت بادشاہ نے لاہور سے 2 ہزار اشرفی اور بہت سی بندوقیں، تیر اور کمان سوغات میں میر طوفان احدی کے ذریعہ اس کے پاس بھجوائے تھے۔ چند سال تک وہ اوزبکوں سے برابر مقابلے کرتا رہا، آخر شکست کھا کر کابل چلا آیا۔ اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ ہم انشاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

اکبر تخت نشینی کا بتیسواں سال

11 ربیع الثانی 995ھ/1586ء کو نو روز ہوا اور جلوس شاہی کا بتیسواں اور بقول میرزا نظام الدین تینتیسواں سال شروع ہو گیا۔

نو روز کی تقریبات حسب سابق منائی گئیں اور از سر نو ضابطہ بندی عمل میں آئی۔ ایک قانون یہ نافذ کیا گیا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں بجز اس کے کہ عورت بانجھ نکلے، کیوں کہ خدا بھی ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہی ہونی چاہیے۔ جب عورت کی عمر کافی ہو جائے اور اس کو حیض آنا بند ہو جائے تو وہ شادی نہ کرے، اگر بیوہ عورتیں شادی کرنا چاہیں تو انھیں کوئی نہ روکے۔ کم عمر ہندو لڑکی کو جس نے نکاح کے باوجود شوہر کا لطف نہ لیا ہو ستی نہ کیا جائے، بلکہ کسی ایسے ہندو سے جس کی عورت مر چکی ہو اس کا نکاح کر دیا جائے۔

جب بادشاہی مرید ایک دوسرے سے ملیں تو سلام کے بجائے ایک ''اللہ اکبر'' کہے اور دوسرا ''جل جلالہ'' کہہ کر جواب دے۔ ہندی مہینوں کا حساب 28 تاریخ سے لگایا جائے نہ کہ 13 تاریخ سے جسے راجا بکرماجیت نے رواج دیا تھا۔ ہندوؤں کے مشہور تہوار اسی حساب سے منائے جائیں، لیکن یہ تاریخ رائج نہ ہو سکی، اگرچہ اس سلسلے میں فتح پور سے اور 990ھ/1582ء میں گجرات اور بنگالہ سے فرامین صادر کیے جاتے رہے تھے۔

کم حیثیت لوگوں کو شہروں میں تحصیل علم سے روکنے کا حکم بھی نافذ ہوا، کیوں کہ بادشاہ کے خیال میں یہی لوگ پڑھ لکھ کر فتنہ و فساد مچایا کرتے ہیں۔

ایک نیا ضابطہ بنا کہ ہندوؤں کے معاملات کا فیصلہ مسلمانوں کا قاضی نہیں کرے گا بلکہ وہ اس غرض کے لیے کسی دانا برہمن کے پاس رجوع کریں گے۔ اگر حلف اٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو گرم گرم لوہا انکار کرنے والے کے ہاتھ پر رکھا جائے اگر ہاتھ جل جائے تو وہ جھوٹا ہوگا ورنہ سچا، یا یہ کہ وہ جلتے ہوئے تیل میں اپنا ہاتھ ڈال دے یا یہ کہ جتنی دیر میں ایک تیر پھینکا جائے اور اسے اٹھا کر واپس لایا جائے وہ شخص پانی میں غوطہ لگائے اور اس عرصہ میں سر باہر نہ نکالے اگر وہ اس سے پہلے ہی سر نکال لے تو مدعا علیہ کو مدعی کا

حق دے دیا جائے، ایک اور حکم دیا گیا کہ مردہ کو دفناتے وقت اس کا سر مشرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف رکھے جائیں۔ سونے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسی سال بادشاہ نے جلال روشنائی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے عبد المطلب خاں کو ایک فوج دے کر بنگش کی طرف بھیجا۔ اس نے جلال کو دوسرے پٹھان سرداروں سمیت شکست دی اور بہت سے آدمیوں کو قتل کرادیا۔ زین خاں کے لشکر کے جتنے آدمی پٹھانوں کی قید میں تھے ان کے عوض دوگنے، چوگنے مرد اور عورتوں کو گرفتار کرلیا گیا۔

سلطان خسرو کی پیدائش

995ھ/1587ء میں شہزادہ سلطان سلیم کے یہاں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے سلطان خسرو کی پیدائش ہوئی۔ بادشاہ نے اس خوشی میں بڑا جشن منعقد کیا۔

بیربر کے زندہ ہونے کی افواہ

اسی سال ہندوؤں نے بیربر کے زندہ ہونے کی خبر اڑادی۔ ان لوگوں نے جب بادشاہ کو بیربر کی جدائی میں بہت زیادہ رنجیدہ اور مضطرب دیکھا تو یہ شہرت کی کہ لوگ اس کو شمالی پہاڑی میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ دیکھ کر آئے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے بھی یقین کرلیا کہ وہ چونکہ دنیا سے بیزار اور مجرد تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس نے سنیاس لے لیا ہو اور یوسف زئی پٹھانوں کے واقعہ کی شرمندگی کی وجہ سے یہاں آنا نہ چاہتا ہو۔ لوگ لاہور میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتے تھے۔ بعد میں بادشاہ نے ایک احدی کو تحقیق حال کے لیے نگرکوٹ بھیجا۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ سب خبریں بے بنیاد تھیں۔

کچھ عرصے بعد اس کی جاگیر کالنجر کے حکام نے دربار میں عریضہ بھجوایا کہ وہ کالنجر پہنچا ہوا ہے، یہاں کے ایک حجام نے تیل ملتے وقت جسم کی علامتیں دیکھ کر پہچان لیا اور وہ اسی حجام کے پاس چھپا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھجوانے کے لیے فرمان صادر کیا۔ وہاں کے کروڑی نے دراصل ایک مسافر کو بیربر کا دھوکہ دینے کے لیے پکڑ رکھا تھا، راز کھل

جانے کے اندیشے سے اس نے اس غریب کو مروا ڈالا اور یہ لکھ بھیجا کہ بیربر آیا ہوا تھا لیکن وہ فوت ہو گیا۔ اس نے اس حجام کو بھی دربار میں نہیں بھجوایا۔ اس خبر پر بادشاہ نے دوبارہ بیربر کا ماتم کیا وہاں کے کروڑی اور دوسروں کو پکڑ کر بلوایا اور ان کو کچھ عرصے کے لیے قید میں ڈال دیا کہ آخر تم لوگوں نے پہلے ہی ہم کو اس کی آمد سے آگاہ کیوں نہ کیا؟ اس جرمانے میں کروڑی سے بادشاہ نے کافی روپیہ بھی وصول کر لیا۔

اسی سال صادق خاں نے ٹھٹھہ پر فوج کشی کر کے قلعہ سیوان کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کے حاکم میرزا جانی بیگ نے جو محمد باقی ترخان کا پوتا تھا اپنے بزرگوں کے دستور کے مطابق دربار شاہی میں ایلچیوں کے ساتھ بہت سے نفیس تحائف اور نذرانے بھجوائے۔ بادشاہ نے 25 ذی قعدہ 995ھ/1587ء کو ان ایلچیوں کے ہمراہ حکیم عین الملک کو میرزا جان کے پاس روانہ کیا اور وہ علاقہ اس کے لیے بحال کر کے صادق کے نام فرمان صادر کیا کہ وہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اوائل ربیع الثانی میں زین خان کوکہ کو کابل کی حکومت پر مقرر کر کے مان سنگھ کو وہاں سے طلب کر لیا گیا۔ اسی مہینے کے آخر میں خان خاناں، مرزا خاں، عضد اللہ، علامت الزماں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کو ہمراہ لے کر حملہ کرتے ہوئے گجرات سے لاہور آیا اور 27 رجب کو بھکر سے صادق خاں حاضر ہوا۔

گجرات کے حالات کا اعادہ

گجرات میں مظفر اور خان خاناں کے درمیان جو حالات پیش آئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مظفر دوسری شکست کے بعد نادوت سے چاپانیر کے راستے سورت کی طرف بھاگ گیا تھا اور قلعہ جوناگڑھ سے 15 کوس پر کونڈل کے مقام پر رکا رہا۔ 3 ہزار سواروں کی فوج اس نے جمع کر لی اور امین خاں غوری جو سورت کا حاکم تھا، ایک لاکھ محمودی سکہ اور مرصع خنجر رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی قدر رقم اس نے جام کو بھی دی جو عرصے سے احمد آباد کی فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امین خاں تجربہ کار آدمی تھا اس نے اسے یہ جھانسا دیا کہ تم ستر

سال جام کے پاس چلو اور اسے لے کر آگے بڑھو، میں بھی بس تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ جام نے بھی اس کے ساتھ چال چلی اور لشکر کی تیاری کا بہانہ کر کے پیچھے رہ گیا۔ مظفر احمد آباد سے 60 کوس پر ایک موضع میں امین خاں غوری اور جام کا انتظار کرنے لگا۔ خان خاناں کو جب خبر ملی تو اس نے نہایت تیز رفتاری سے کوچ کیا اور اپنی فوجیں لے کر اس کے سر پر آپہنچا۔ مظفر جب امین خان اور جام کی مدد سے مایوس ہو گیا تو ناچار حیران وسراسیمہ پہاڑی کی طرف بھاگ گیا اور سورت کے ایک شہر دوارکا میں جا کر پناہ لی۔ جام نے اپنے وکیل کو اور امین خاں نے اپنے لڑکے کو شاہ ابوتراب کے وسیلے سے خان خاناں کے پاس بھیجا اور جام کے آدمی خان خاناں کو کوہستان میں لے کر گئے۔ وہاں اسے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔

مظفر ایک ہزار مغل اور کاٹھیاواڑی سواروں کے ساتھ جو اس کے ننھیال کے رشتے دار ہوتے ہیں گجرات جا کر آشیہ نامی ایک مقام پر پناہ گزیں ہو گیا۔ یہ جگہ دریائے سابرمتی کے کنارے ہے اور کٹے پھٹے کراروں پر واقع ہے۔ یہ سرکش کولیوں کی جائے پناہ ہے۔ خان خاناں نے دور اندیشی سے کام لے کر پہلے ہی اس خطرناک مقام پر اپنے امراء کو مقرر کر رکھا تھا جب مظفر وہاں آیا تو ان امیروں نے سید قاسم بارہہ کی سرداری میں اس پر حملہ کر دیا، ایک سخت جنگ کے بعد مظفر کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھی اور چتر آفتابی، آفتاب پرستوں کے ہاتھ آ گئے۔ اس کے رشتے دار مارے گئے اور وہ سورت کے علاقے کاٹھیاواڑ کو بھاگ گیا۔

خان خاناں جب بڑودہ واپس ہوا تو اس نے جام پر فوج سے حملہ کر دیا۔ جام نے بھی 8 ہزار سوار جمع کر لیے تھے۔ کہتے ہیں جام کے 2 ہزار آدمیوں نے کھانا نہ کھانے کی قسم کھائی تھی اور جان دینے کا حلف اٹھایا تھا۔ جب جام اپنی جمعیت کو لے کر مقابلے پر آیا اور دونوں فوجوں میں 8 کوس کا فاصلہ رہ گیا تو جام نے گھبرا کر اطاعت قبول کر لی اور اپنے لڑکے کو 3 ہاتھی، 18 کچھی گھوڑے جو عربی گھوڑے کے مشابہ ہوتے ہیں اور دوسرے تحائف دے کر خان خاناں کی خدمت میں بھیجا۔ اس موقعے پر خان خاناں حسب الحکم پہلی

مرتبہ گجرات سے فتح پور پہنچا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں مظفر نے کاٹھیوں اور دوسرے زمینداروں کی مدد لے کر قلعہ جوناگڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت قلیچ خاں کے حسب ہدایت نظام الدین احمد اور سید قاسم بارہہ نے احمد آباد سے سورت کی طرف کوچ کیا، مظفر ان سے مقابلے کی تاب نہ لا کر گجرات بھاگ گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

دکن پر حملہ اور پسپائی

جب خان خاناں سروہی اور جالور کے راستے احمد آباد پہنچ گیا تو بادشاہ نے دکن پر حملے کے لیے عضد الدولہ کو میر مرتضیٰ اور خداوند خاں حاکم برار، اعظم خاں اور شہاب الدین احمد خاں اور مالوہ کے تمام امراء کے ساتھ مامور کیا اور اس علاقے کے تمام جاگیرداروں کے نام فرمان صادر ہوا کہ اعظم خاں کی سرداری میں پہلے تو برار کا علاقہ دکن والوں کے ہاتھ سے چھین لیا جائے بعد میں سب مل کر احمد نگر پر حملہ کر دیں، چنانچہ یہ فوجیں حسب الحکم روانہ ہوئیں اور دکن کی سرحد پر بمقام ہندیہ کیمپ لگا دیا، لیکن یہاں ان امیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اعظم خاں کو شہاب الدین خان سے پرانی دشمنی تھی کیوں کہ اس کا باپ شہاب الدین احمد خاں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے مارا گیا تھا اس لیے وہ اس کو اور عضد الدولہ کو مجلسوں میں تنگ کیا کرتا تھا اور حق استادی کے باوجود اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل سے شہاب الدین خاں رنجیدہ ہو کر اپنی جاگیر رائے سین کو لوٹ گیا۔ اعظم خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خواجہ فتح اللہ بخشی اور دوسرے تو دولتیے سردار اس فتنے کو خوب ہوا دے رہے تھے لیکن عضد الدولہ نے دوڑ دھوپ کر کے اس قضیے کو رفع دفع کرا دیا۔

شاہی لشکر کے اسی باہمی نفاق کی وجہ امیر اور برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کو اچھا موقع مل گیا اور وہ دکنی لشکر کو اپنے ساتھ لے کر مقابلے پر آ گیا۔ شاہی لشکر مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے عضد الدولہ، راجہ علی خاں کے پاس گیا اور بڑی کوشش کی کہ وہ مقابلے کا ارادہ ترک کر دے لیکن راجہ علی خاں واپس جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ یہ

صورت حال دیکھ کر عضد الدولہ وہاں سے نکل کر گجرات آ گیا اور خان خاناں کو دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے لگا۔

راجہ علی خاں کے مقابلے میں اعظم خاں تنہا رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر برار کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں بھی اس کے قدم ٹک نہ سکے۔ وہاں سے وہ ایلچ پور چلا گیا اور اس کو بری طرح لوٹا۔ دکنی فوجیں اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ ایلچ پور سے بندربار چلا گیا اور وہاں سے لشکر کے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے بہنوئی خان خاناں سے مدد لینے کے لیے احمد آباد پہنچا۔

خان خاناں نے اس کا استقبال کیا۔ ان کی ملاقات محمود آباد میں نظام الدین احمد کے گھر پر ہوئی۔ اعظم خاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے خان خاناں کے ساتھ احمد آباد چلا گیا۔ نظام الدین احمد کو اس علاقے میں متعینہ امیروں کے ساتھ بڑودہ کی طرف بھیجا گیا اور ان کے پیچھے یہ دونوں سردار بھی احمد آباد سے روانہ ہو گئے۔ اعظم خاں تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا بندر بار اپنے لشکر میں پہنچ گیا اور خان خاناں بھڑوچ جا پہنچا۔ اس کے بعد اعظم خاں نے اس کو لکھا کہ بارش کا موسم آ چکا ہے۔ اس لیے دکن کی مہم کو اس سال ملتوی کر دینا چاہیے۔ چنانچہ خان خاناں بھڑوچ سے احمد آباد کو لوٹ گیا اور اعظم خاں ندر بار مالوہ چلا گیا اور راجہ علی خاں دکنی فوجوں کو لے کر اپنے وطن واپس ہو گیا۔

اس واقعہ کے 5 ماہ بعد اٹک بنارس میں جسے اٹک کٹک بھی کہتے ہیں خان خاناں کی عرضی پہنچی کہ حضور والا بدخشاں پر فوجی کارروائی کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں بھی اس سفر میں ہم رکاب رہوں۔ جب اٹک سے لاہور لشکر پہنچ گیا تو اس کے نام فرمان گیا کہ قلیچ خاں اور نظام الدین احمد تو گجرات میں رہیں اور خان خاناں بارگاہ میں حاضر ہو جائے۔ خانخاناں کے دوبارہ لاہور حاضر ہونے اور عضد الدولہ کو ساتھ لانے کا یہی سبب تھا۔

خان خاناں کی غیر حاضری میں گجرات میں نظام الدین احمد نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے جس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے تاریخ نظامی میں بھی کیا ہے۔

میر ابو الغیث بخاری کی وفات

اسی سال میر ابو الغیث بخاری جن کی تعریف حد سے زیادہ ہے، لکھنؤ میں قولنج کے مرض میں انتقال فرما گئے۔ ان کی میت دہلی لاکر خاندانی مقبرے میں دفن کی گئی۔ ان کی تاریخ وفات ''میر ستودہ سیر'' سے نکلتی ہے۔ میں(74) نے ان کی شان میں حسب ذیل مرثیہ کہا تھا:

بگورستان او روزی عبوری کردم از عبرت   جہانی دیدم از آسودگان یکسر بہ میدانش
ازین سو رفتہ ابوی وزآنسو نامدہ یک کس   کہ از وی حال پرسم یا نشان باشد از ایشانش
دران شہر خموشان از زبان دانان سخن جمعی   زشارستان گیتی رفتہ و گردیدہ مہمانش
ازین جملہ امیری پاک طینت بوترابی آئین   ابوالغیث آنکہ گردون غوث خواند قطب کیہانش
زہی شائستہ سیرت سیدی فرخندہ طلعت ہم   کہ خلق مصطفیٰ بودی عیان در روئی خندانش
بخارائی کہ دہلی قبۃ الاسلام بود از وی   چہ شد آن قبہ و آن اسلام و یا رب کو مسلمانش
چو درویش سپاہی بود خاک پاش ارباہم   کشم در چشم بخت خویش چون کحل صفاہانش
بپالینش ز قندیل دل خود سوختم شمعی   اگرچہ مشعل ربانی آمد نور ایمانش

بساط مرقد او ساختم نمناک از اشکی
اگرچہ ابر رحمت مشت از باران غفرانش

عربی علوم پر پابندی

اسی سال حکم نافذ ہوا کہ لوگ علوم عربیہ کو پڑھنا ترک کردیں اور نجوم، حساب، طب اور فلسفے کے علاوہ کچھ اور پڑھانہ جائے۔ اس حکم کی تاریخ نفاذ ''کساد فضل'' سے نکلتی ہے۔

اسی سال ماہ شعبان میں مان سنگھ دربار میں حاضر ہوا۔ خبر پہنچی کہ عبد اللہ خاں نے ہرات کو فتح کرلیا ہے اور وہاں کے حاکم علی قلی خاں کو بے شمار ترکمنوں اور ہرات کے باشندگان کے ساتھ قتل کرادیا ہے اس کی تاریخ ''شکست ہری'' سے نکالی گئی۔

مان سنگھ کا بیباکانہ جواب

محرم 996ھ/1588ء میں مان سنگھ کو بہار، حاجی پور اور پٹنہ(۷۴) علاقہ پر مقرر کیا گیا۔ عاشورہ کی رات مان سنگھ اور خان خاناں کو خلوت میں بادشاہ نے بلا کر دوستانہ انداز میں گفتگو کی اور اپنے دین کی ترغیب دینے کے لیے ان سے بطور آزمائش کچھ باتیں کیں۔ مان سنگھ نے بے جھجک جواب دیا اگر حضور کی مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ہوئے خدمت میں حاضر ہیں، کسی اور طرح ہم کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر اس کے علاوہ کچھ اور منشاء ہے اور اس کا تعلق دین اور مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان بن جاؤں۔ ان دو کے علاوہ میں کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا کہ وہ کون سا ہے؟ اس کے جواب پر اکبر نے اس معاملے کو اسی جگہ ختم کر دیا اور مان سنگھ بنگالہ کی جانب رخصت ہو گیا۔

تقرر اور تبادلے

انہی دنوں بادشاہ نے کشمیر کی حکومت پر میرزا یوسف خاں رضوی مشہدی کا تقرر کیا اور محمد قاسم خاں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔

12 صفر 996ھ/1588ء کو محمد صادق خاں کو یوسف زئی قبیلے کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بجور کی طرف رخصت کیا اور سیالکوٹ وغیرہ جو مان سنگھ کی جاگیر میں تھا اسے عطا کر دیا۔ اسماعیل قلی خاں کو بجور سے بلا کر گجرات میں قلیچ خاں کی جگہ متعین کیا اور قلیچ خاں کو دربار میں بلا لیا گیا۔

ملا احمد کا قتل اور قصاص

اسی مہینے میرزا فولاد بیگ برلاس نے آدھی رات کے وقت ملا احمد رافضی کو جو اعلانیہ صحابہ پر تبرا کرتا تھا کسی بہانے گھر سے باہر بلوایا اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل کی تاریخ ''زہی خنجر فولاد'' سے نکلتی ہے۔ ایک دوسری تاریخ ''خوک سقری'' ہے۔ میں(۷۵) نے خود اس کے

کو ذبح کے وقت دیکھا تھا، خدا پناہ میں رکھے اس کی شکل بالکل سور جیسی ہو گئی تھی۔ یہ صرف میں(77) نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی اسی طرح دیکھا تھا۔ اس کے قصاص میں مرزا فولاد کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر لاہور میں گھسیٹا گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ اکبر نے حکیم ابو الفتح کو بھیج کر اس سے پوچھا تھا کہ ”تو نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ملا احمد کو قتل کیا ہے“ ؟ اس نے جواب دیا ”اگر تعصب ہوتا تو اس کے بجائے میں اس سے کسی اور بڑے کو قتل کرتا“۔ حکیم نے یہی جملہ جا کر بادشاہ کو سنایا اکبر نے کہا ”یہ تو بڑا حرام زادہ ہے اس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے“۔ اس لیے اس کو موت کی سزا دی گئی، ویسے بادشاہ اس کی بہادری اور اہل حرم کی سفارش کی وجہ سے اس کو معاف ہی کر دینا چاہتے تھے۔ قاتل کو موت کی سزا مل گئی، لیکن مقتول کاری زخم کھا کر ابھی زندہ تھا، اپنے قاتل کی موت کے تین چار دن بعد وہ فوت ہوا۔ شیعوں نے اپنے مسلک کے دستور کی بنا پر اس کی مقعد میں ایک میخ ٹھونک کر دریا میں اسے غوطہ دیا۔ دفن کرنے کے بعد ابو الفضل اور فیضی نے اس کی قبر پر محافظوں کا پہرہ لگا دیا، اس کے باوجود لاہور والوں نے اس وقت جب کہ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے اس کی قبر کھود ڈالی اور اس کی ناپاک لاش کو جلا دیا۔

حکومت کا چونتیسواں سال جلوس

22 ربیع الثانی 996ھ/1556ء کو نوروز منایا گیا اور جلوس کے 33 ویں یا 34 ویں سال کا آغاز ہوا۔ دربار عام میں جس کے 114 ایوان ہیں، بڑے نفیس کپڑے اور مصور پردے لگائے گئے، بڑی آرائش و زیبائش عمل میں آئی۔ اس سال بھی بہت سے خلاف شرع احکام نافذ کیے گئے۔ اس سال کی تاریخ ”شیوع معصیت“ سے نکلتی ہے۔

ٹوڈرمل پر قاتلانہ حملہ

انہی دنوں قلیج خاں گجرات سے آ کر حاضر ہوا اور بہت سے نذرانے پیش کیے۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ وہ ٹوڈرمل کے ساتھ شاہی دفتر میں ملکی اور مالی معاملات سرانجام دے۔ ان

دنوں ٹوڈرمل نہایت خوفزدہ اور بدحواس ہو گیا تھا کیونکہ ایک رات اس کے کسی دشمن نے جو گھات میں لگا ہوا تھا اس پر تلوار سے حملہ کیا تھا۔ اس حملہ سے راجہ زخمی ہو گیا تھا، لیکن زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔

کمایوں کے راجہ کی دربار شاہی میں آمد

اسی سال کمایوں کا راجہ بادشاہ اکبر سے ملنے کے لیے سوالک کی پہاڑی سے آیا۔ اس سے پہلے وہ یا اس کے آباواجداد میں سے کوئی کسی بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔ اس نے لاہور میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور قسم قسم کے تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ ان میں کچھ تو گائے کی عجیب عجیب دمیں تھیں اور ایک مشکی ہرن بھی تھا لیکن وہ گرمی کی وجہ سے راستہ ہی میں مر گیا تھا۔ میں(78) نے بھی اس مردہ ہرن کو دیکھا، بالکل لومڑی جیسا تھا۔ اس کے دو چھوٹے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور سینگوں کی جگہ کچھ ابھار سا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ لپٹا ہوا تھا، اس لیے اس کا پورا جسم دکھائی نہیں دیا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے وطن میں پردار آدمی بھی ہوتے ہیں جو اڑتے ہیں اور آم کا ایک ایسا درخت بھی وہاں ہوتا ہے، جو سال بھر پھل دیتا ہے۔

انہی دنوں حکیم عین الملک بھی میرزا جان کے سفیروں کے ساتھ حاضر ہوا۔ طرح طرح کے نذرانے پیش کیے اور بادشاہ کی ہمدردی سے فیض یاب ہوا۔

رامائن کا ترجمہ

ماہ جمادی الاول 999ھ/1591ء میں میں(79) نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا یہ ترجمہ میں نے 4 سال میں ختم کیا تھا اور اس کے 2 نسخے مرتب کر دیے تھے۔ ترجمہ کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا:

ما قصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند
جان سوختہ کردیم بہ جانان کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا ”یہ کتنے جز میں مکمل ہوا؟“ میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً 70 جز میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ 120 جز میں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے اس کا دیباچہ لکھ دو“۔ دیباچے کی اتنی ضرورت نہ تھی پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا، اس لیے میں نے دیباچے کے معاملے کو ٹال دیا۔ اپنے اس سیاہ نامہ سے جو میرے نامۂ اعمال کی طرح داغدار ہے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں لیکن ”نقل کفر کفر نیست“۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کرہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے میرے لیے لعنت بن جائے گی۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور پناہ میں رکھے۔

مکار قلندر کا فریب

انہی دنوں شیخ کمال بیابانی نامی ایک قلندر کو دریائے راوی کے کنارے سے لوگ لے کر آئے کہ یہ عجب باکمال آدمی ہے کہ ساتھیوں سے باتیں کرتے کرتے پلک جھپکنے میں دریا کے دوسرے کنارے پر چلا جاتا ہے اور وہاں سے پکار کر کہتا ہے کہ اے فلاں اب تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ بادشاہ اس کو خلوت میں دریا کے کنارے لے کر گئے اور اس سے کہا کہ ”ہم ایسی چیزوں کے بڑے مشتاق ہیں، اگر تم یہ کرامت ہم کو دکھلا دو تو ہمارا ملک و مال سب تمہارا ہوگا اور ہم تمہارے مرید بن جائیں گے“۔ وہ جواب میں نہ تو کچھ بولا اور نہ ہی کوئی حرکت کی۔ اسے گم سم دیکھ کر بادشاہ نے کہا ”ہم تجھے ہاتھ پیر باندھ کر قلعے پر سے دریا میں پھینک دیں گے اگر پانی سے صحیح سلامت نکل آیا تو کیا کہنے ورنہ تو اپنے آپ جہنم رسید ہو جائے گا“۔ اب تو وہ بڑا سٹپٹایا اور اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ میں یہ سارا ڈھونگ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے کرتا ہوں۔ اس نے یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے لڑکے کو جو اس کا ہم شکل تھا دریا کے کنارے پر کھڑا کر دیتا تھا اور مغرب کے وقت کسی نہ کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچتا اور وضو کے بہانے وہاں کسی پہاڑ کی کھوہ میں چھپ جاتا۔ اس وقت اس کا بیٹا دوسرے کنارے سے اس کے ساتھی

کا نام لے کر آواز دیتا تھا کہ ”بس اب تم اپنے گھر لوٹ جاؤ“۔ بادشاہ نے اس کو بھکر میں بھیج دیا، وہاں بھی اس نے اپنی کرامتوں کا بڑا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔ خانخاناں اور اس کا نائب دولت خاں بھی اس کے چکر میں آ گئے۔ اس نے ان کو طرح طرح کے کرتب دکھائے اور ایک مرتبہ جمعہ کی رات کو بازی گروں کی طرح اپنے جسم کے عضو عضو کو الگ الگ کر کے دکھایا اور ان کرامتوں سے دولت خان افغان کو جو خان خاناں کا نفس ناطقہ اور وکیل کل تھا، اپنا معتقد اور مرید بنا لیا۔ خان خاناں نے بھی اس کی عقیدت میں دھوکا کھایا۔ اس چال باز نے ایک سونے کی گیند اپنے شیخ کے نام پر حاصل کر کے کہا کہ خضر علیہ السلام نے تمہارے نام دعا اور سلام کہلوایا ہے، پھر وہ اس گیند کو دریا میں لے کر گیا اور چھل اور مکاری سے خان خاناں کے سامنے اس کے بجائے کانسے کی ایک گیند دریائے سندھ میں ڈال دی اور سونے کی گیند اڑا لے گیا۔

رامائن کے ترجمے کا صلہ

انہی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے(81) دیا جائے، چنانچہ ایک دن شاہ فتح اللہ نے عضد الدولہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”فی الحال یہ شال عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔“ بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو بساور کی جاگیر کی عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی آراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں۔ پھر میرا نام لے کر کہا: ”یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے۔ اس کی مدد معاش کو ہم کسی قصور کے بغیر دیدہ و دانستہ بساور سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کیے دیتے ہیں“۔ شاہ فتح اللہ نے ایک ہزار روپے کی تھیلی حضور میں پیش کی کہ میرے کارندوں نے یہ رقم اماموں کی معاش سے بچا کر بھیجی ہے حالانکہ یہ رقم اس کے شقدار نے پرگنہ بساور کے ائمہ کی بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم کر کے وصول کی تھی۔ جب رقم پیش کی گئی تو بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا ”یہ تمہاری ہے، ہم تمہیں بخشتے ہیں“۔ اس معاملے کو 3 مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ شاہ فتح اللہ اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا۔

جب میری(81) مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہو گیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے بساور اور پھر وہاں سے بداؤں گیا۔ وہاں سے میرا ارادہ مرزا نظام الدین احمد سے ملنے اور سیر و تفریح کے لیے گجرات جانے کا تھا، لیکن کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ جا نہ سکا۔

کشمیر کے امراء کی وفات

اسی سن جلوس میں سید عبد اللہ خاں چوگان بیگی اور میرزادہ علی خاں جو صاحب اعتبار امیر تھے، کشمیر میں فوت ہو گئے۔ سید عبد اللہ خاں نے 12 ماہ ربیع الاول کو حضور اکرم ﷺ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوایا اور فقیروں کو کھلایا اور گناہوں سے توبہ و استغفار کی۔ اسی دن وہ میرزا یوسف خاں کے ساتھ شکار پر گیا۔ شکار میں اسے بخار ہو گیا اور اسی میں جان دے دی۔ اس سے لگ بھگ ایک سال پہلے میرزادہ علی خاں اسی رات کو جس رات یعقوب نے محمد قاسم خاں پر شب خون مارا تھا، لڑائی میں ہلاک ہو گیا تھا۔

کشمیر کی جانب اکبر کی روانگی

22 جمادی الثانی 997ھ/ 1589ء کو بادشاہ سلامت کشمیر کی سیر کے لیے، جسے بادشاہ نے "باغ خاصہ" کا نام دیا ہوا تھا کابل سے تشریف لے گئے۔ اہل حرم کو شاہزادہ سلطان مراد کے ساتھ بھمبر میں جہاں سے کشمیر کا پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا، چھوڑ دیا اور خود بطور یلغار آگے روانہ ہو گئے۔ اس حسین خطے کی سیر و تفریح میں کچھ عرصہ صرف کیا پھر شاہزادے کے نام فرمان آیا کہ وہ محل والوں کو رہتاس لے جا کر وہاں ہماری آمد کا انتظار کرے۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات

انہی دنوں ستمبر میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ خود بھی حاذق طبیب تھا اس لیے اس نے بطور علاج ہریسہ کھانا شروع کر دیا۔ حکیم علی نے ہریسہ کھانے سے اسے بہت روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار موت اس کا گریبان پکڑ کر عالم بقا کی

طرف کھینچ لے گئی۔ شاہ فتح اللہ کو تخت سلیمان میں جو کشمیر کے ایک شہر سے متصل بڑا پہاڑ ہے، سید عبداللہ خاں چوگان بیگ کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ ملک الشعراء شیخ فیضی نے اس کے مرثیے میں ایک ترکیب بند کہا تھا جس کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

در ہنگام آن آمد کہ عالم از نظام افتد   جہاں عقل را در نیم روز علم شام افتد
ہمہ گنجینۂ اقبال در دست لیام افتد   ہمہ خونابۂ ادبار در کاس کرام افتد
حقیقت گم کند سررشتۂ تحقیق مقصد را   معانی از بیان ماند روابط از کلام افتد
زبان جہل جنبد بی محابا در سخن رانی   مطالب تا درست آید دلائل نا تمام افتد
دل مستکملان دہر در نقص ابد ماند   چو نارس میوۂ تر شاخ تا کہ نیم خام افتد
گرامی امہات فضل را فرزند روحانی   ابو الآبائی سحق شاہ فتح اللہ شیرازی
دو صد بو نصر رفت و بو علی تا او پدید آید   بسی دارد قضا ورد کان زین گونہ برازی
گہی با محمل مشائیاں گرد زمین گردی   گہی با موکب اشراقیان گرد فلک تازی
مباہات از وجود کامل او بود دوران را   بدوران جلال الدین محمد اکبر غازی

شہنشاہ جہان را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کا فلاطون ز عالم شد

حکیم ابو الفتح کا انتقال

27 رمضان المبارک کو بادشاہ کابل کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ پکھلی کے راستے سے قلعہ اٹک کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی موقع پر حکیم ابو الفتح بھی دھتوڑ کے مقام پر فوت ہو گیا جسے حسن ابدال میں دفن کیا گیا۔ اس کی تاریخ وفات ''خدا ایش سزا دھاد'' سے نکلتی ہے۔

جب اٹک کے سامنے خیمہ شاہی لگا ہوا تھا، شاہزادہ اہل محل کو لے کر حاضر خدمت ہوا۔ اسی منزل سے شہباز خاں کو یوسف زئی قبیلے کے بقیہ پٹھانوں پر حملے کے لیے مامور کیا گیا۔

22 ذی قعدہ 997ھ/1589ء کو بادشاہ کی سواری کابل پہنچی۔ اس موقع پر حکیم ہمام اور صدر جہاں عبد اللہ خاں اوزبک کے پاس سے لوٹ کر آئے اور عبداللہ خان کے دوستانہ خطوط پیش کیے۔

ٹوڈرمل اور بھگوان داس کا انتقال

998ھ/1589ء میں راجہ ٹوڈرمل اور بھگوان داس امیر الامراء جو لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے، فوت ہو گئے۔ ان کی تاریخ ہے ''بگفتا ٹوڈرو بھگوان مردند'' کسی نے ایک تاریخ اور کہی ہے:

توڈرمل آنکہ ظلمش گرفتہ بود عالم — چون رفت سوی دوزخ خلقی شدند خرم
تاریخ رحلتش را از پیر عقل جستم — خوش گفت پیر دانا ''وی رفت در جہنم''

کابل اور گجرات کے لیے تقرر

20 محرم 998ھ/1589ء کو کابل کی حکومت محمد قاسم خاں میر بحر کو عطا کر کے بادشاہ نے ہندوستان کی طرف رخ کیا۔

گجرات پر اعظم خاں کی تقرری کا فرمان جاری کیا گیا اور اسے مالوہ سے وہاں تبدیل کر دیا گیا۔ نظام الدین احمد کو دربار میں طلب کیا گیا۔ خان خاناں کو گجرات کے بجائے جونپور دیا گیا۔ مالوہ میں شہاب خاں کی تعیناتی ہوئی۔ اعظم خاں نے شہاب خاں کی مخالفت میں مالوہ کو ویران کر کے وہاں دھول اڑا دی۔

خداوند خاں دکنی کا انتقال

اسی سال خداوند خان دکنی رافضی جس کا نکاح بادشاہ کے حکم سے شیخ ابو الفضل کی بہن سے ہوا تھا اور گجرات میں کری کا قصبہ اسے جاگیر میں ملا تھا، فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کی تاریخ ہے۔ ''خداوند دکنی مردہ''۔

اکبر کے حکومت کا پینتیسواں سال

14 جمادی الاول 998ھ/1589ء کو 35 ویں سال جلوس کا آغاز ہوا۔ بادشاہ نے لاہور کے دیوان خانے کو آراستہ کرنے کا حکم پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ نوروز کے دوسرے دن لاہور میں بادشاہ حاضر ہوئے۔ تیسرے دن نظام الدین احمد شتر سواروں کی جمعیت کے ہمراہ ایک سو کوس کا فاصلہ صرف 12 دن میں طے کر کے خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس ضرورت میں یہ شتر سوار آئے ہیں اسی طرح سیدھے ڈیوڑھی میں چلے آئیں۔ اس قافلے کی آمد بھی اچھا خاصا تماشا بن گئی۔ نظام الدین احمد پر بڑی شاہانہ نوازشیں ہوئیں۔ بادشاہ نے بھگوان داس کی وفات پر مان سنگھ کو راجا کا خطاب عطا کیا اور تعزیت کے لیے اس کے نام فرمان صادر ہوا جس میں بڑی عنایتوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ فرمان کے ساتھ خلعت خاصہ اور گھوڑا بھی بھیجا گیا۔ شرف آفتاب کے دن میں بھی بدایوں سے آکر بارگاہ میں حاضر ہوا اور 7 سال بعد میرزا نظام الدین احمد سے ملاقات ہوئی۔

اعظم خاں کی فتوحات

اسی سال اعظم خاں نے گجرات سے سورت اور جوناگڑھ پر حملہ کیا۔ وہاں کا حاکم جام ستر سال اور دولت خاں ولد امین خاں غوری جو اپنے باپ کا جانشین بنا تھا اور اپنے لاؤ لشکر پر اسے بڑا گھمنڈ ہو گیا تھا۔ اعظم خاں کی فوج کشی پر یہ دونوں تیس ہزار کا لشکر لے کر مقابلے پر آئے اور فریقین میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ اعظم خان نے اپنی فوج کو 7 حصوں میں تقسیم کر کے بڑی بہادری سے جنگ کی۔ بادشاہی میمنہ کا سردار خواجہ رفیع بدخشی جو بڑا بہادر نوجوان تھا اور محمد حسین شیخ جو امرائے قدیم میں سے تھا اس معرکے میں شہید ہو گئے۔ ہراول کی فوج میں ابوتراب کا بھتیجا شرف الدین بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے 4 ہزار آدمی مارے گئے۔ جام کا لڑکا بھی قتل ہو گیا۔ اعظم خاں کو بڑی شاندار شان فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح اتوار کے دن 6 شوال 998ھ/1589ء کو ہوئی۔ شیخ فیضی نے "فتوحات عزیزی" سے اس کی تاریخ نکالی۔

دو بزرگوں کا انتقال

اسی سال صاحب تصانیف بزرگ شیخ وجیہہ الدین کا احمد آباد میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تاریخ ان کے نام "شیخ وجیہہ الدین" سے نکلتی ہے۔

اسی سال شیخ عبد العزیز دہلوی کے خلیفہ جالندہ بھی قصبۂ سیہنہ میں فوت ہوگئے۔ ان کے ایک مرید نے "حقیقت فقر" سے ان کی تاریخ نکالی۔

سندھ اور بلوچستان پر حملہ

بادشاہ نے خان خاناں کا جون پور سے بھی تبادلہ کردیا اس کو ملتان اور بھکّر کی حکومت عطا کر کے سندھ اور بلوچستان کی تسخیر اور میرزا جان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کر دیا۔ خان خاناں کو اس مہم پر چند بڑے بڑے امراء جیسے شاہ بیگ خاں، سید بہاؤ الدین بخاری اور میر محمد معصوم بھکّری وغیرہ کے ساتھ 999ھ/1590ء میں رخصت کیا گیا۔ ان کے ساتھ 100 ہاتھی بھی بھیجے گئے، شیخ فیضی نے "قصد ٹھٹھہ" سے اس روانگی کی تاریخ نکالی۔

شہاب الدین احمد خان کی وفات

اسی سال مالوہ سے شہاب الدین احمد خاں کی وفات کی خبر پہنچی" شہاب خاتم" اور "ذمیم الاوصاف" اس کی تاریخ وفات ہے۔

تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین

اسی سال مجھے[182] حکم دیا گیا کہ کشمیر کی تاریخ جس کو ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو بڑا عالم و فاضل شخص ہے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا تھا سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں۔ میں[183] نے اس کا انتخاب 2 مہینے میں مرتب کر دیا، اس کے آخر میں یہ شعر لکھا:

در عرض یک دو ماہ بہ تقریب حکم شاہ
این نامہ شد چو خط پری پیکران سیاہ

یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا گیا بادشاہ کے سامنے جز جز اس کو پڑھا جاتا ہے۔

شیخ ابراہیم چشتی کا انتقال

اسی سال شیخ ابراہیم چشتی نے فتح پور میں انتقال کیا، وہ اپنے پیچھے کافی دولت چھوڑ گیا تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے 25 کروڑ نقد روپے، ہاتھی، گھوڑے اور دوسرا سامان شاہی خزانے میں داخل ہوگیا۔ وہ نہایت کنجوس اور بخیل مشہور تھا اس لیے اس کی تاریخ ''ومیم الاوصاف'' اور ''شیخ لئیم'' نکالی گئی۔

عرفی شیرازی کا انتقال

لاہور کے چند امراء بھی اسی سال فوت ہوئے جن میں سے خنجری ترک تو بواسیر کے مرض میں اور شیخ احمد ہاتھی کے حادثے میں فوت ہوئے۔ اسی سال مشہور شاعر ملا عرفی شیرازی نے بھی انتقال کیا۔ مرتے وقت اس نے یہ رباعی کہی تھی:

عرفی دمِ نزع است وہمان مستی تو   آخر بچہ مایہ بار بربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف   جویای متاع است و تہی دستی تو

عرفی متقدمین اور متاخرین تمام اساتذہ کلام کے بارے میں بڑی بے ادبانہ باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس نے یہ تاریخ پائی:

''گفت عرفی جوانہ مرگ شدی''

اس کی ایک دوسری تاریخ ہے'' دشمن خدا''

معجم البلدان کا فارسی ترجمہ

اسی زمانے میں حکیم ہمام نے ایک کتاب ''معجم البلدان'' کی جس کی ضخامت 200 جز پر مشتمل تھی، بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی کہ

اس کتاب میں بڑی عجیب و غریب حکایتیں اور مفید مضامین ہیں۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزاء تقسیم کر دیے۔ میرے حصے میں بھی 10 جز آئے۔ ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے اسے پیش کیا اور اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی

اکبر کی حکومت کا چھتیسواں سال جلوس

24 جمادی الاول 999ھ/1590ء نوروز کا جشن حسب دستور منعقد کیا گیا اور جلوس کا 36 واں سال شروع ہوا۔ اس سال گائے، بھینس، گھوڑے اور اونٹ کا گوشت حرام کر دیا گیا۔ ایک اور حکم ستی کے متعلق تھا کہ جو عورت برضا و رغبت اپنے شوہر کے ساتھ چتا پر جلنا چاہے اس کو نہ روکیں، لیکن کسی عورت کو زبردستی شوہر کے ساتھ نہ جلایا جائے۔ 12 سال سے پہلے بچوں کی ختنہ نہ کی جائے 12 سال بعد اگر لڑکا چاہے تو ختنہ کرائے نہیں تو نہ کی جائے۔ ایسے شخص کے ساتھ جس کا پیشہ جانوروں کو ذبح کرنے کا ہو، اگر کوئی کھانا کھا لے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کے گھر والے اس کے ساتھ کھانا کھائیں تو ان کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں۔

تبت کی سفارت

اس سال حاجی میرزا بیگ خود تبت سے واپس آیا اور اپنے ساتھ وہاں کے حاکم علی رائے کی لڑکی کو لیتا آیا، بادشاہ نے اس لڑکی کا نکاح بڑے شاہزادے کے ساتھ کر دیا۔ تبت میں دوسری مرتبہ ملا طالب اصفہانی ایلچی بن کر گیا تھا۔ اس کے اور حاجی میرزا کے بیانات سے وہاں کے جو حالات اور رسوم و عقائد سے متعلق معلومات ملی ہیں وہ ایک رسالہ کی صورت میں مرتب ہو چکی ہیں۔ اکبر نامہ میں بھی حالات درج ہیں، کیوں کہ اس میں ہندوستان، کابل، تبت اور کشمیر کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

مرزا نظام الدین احمد کو پرگنہ شمس آباد کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس سال شعبان کے آخر میں ان کو جاگیر پر روانہ کردیا گیا۔ ان کا خالہ زاد بھائی شمس آباد کے حملے میں شہید ہوگیا، اس کا نام محمد جعفر تھا۔ یہ نہایت سعادت مند اور بہادر نوجوان تھا اس کی تاریخ شہادت ہے:

چو منشور شہادت یافت جعفر از در داور
بود تاریخ سال او شہید پاک شد جعفر

سجدے سے انکار

اس مرتبہ مجھے(84) 5 مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین نے سفارشاً عرض کیا کہ عبدالقادر کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی اور دلاسا دینے کے لیے وہ جانا چاہتا ہے اور رخصت کا طلب گار ہے تو بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی صدر جہاں نے اس موقعے پر دہرا دہرا کر کہا کہ "بادشاہ کو سجدہ کرو" لیکن میں(85) نے سجدہ نہیں کیا بادشاہ نے صرف اتنا کہا "چھوڑو" سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہو کر مجھے سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔ بہرحال میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہوگیا۔ پھر وہاں سے بدایوں آگیا۔ مرزا لاہور کو چلے گئے۔

شاہی فرمان

شاہی کتب خانے سے "نامہ خرد افزا" کا نسخہ گم ہوگیا تھا۔ سلیمہ سلطان بیگم نے اس سلسلے میں مجھے(86) چند مرتبہ یاد فرمایا۔ میرے پاس بدایوں میں کئی قاصد پوچھ گچھ کے لیے پہنچے لیکن میں کچھ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ نہ جا سکا۔ آخر بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اس کی مدد معاش موقوف کردی جائے اور اسے زبردستی بدایوں سے لایا جائے۔ اس موقعے پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا بڑا حق ادا کیا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی بادشاہ سے بار بار یہی کہا کہ کوئی نہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہوگی، اس لیے وہ نہیں آسکا اور وہاں رہ گیا۔

سفیروں کی دکن روانگی

اس سال شوال کے مہینے میں دربار کے 4 خاص مقربوں کو دکن حاکموں کے پاس سفارت پر بھیجا گیا۔ شیخ فیضی کو اسیر و برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کے پاس بھیجا گیا۔ امین الدین کا پہلے نام محمد امین تھا اس نے خود اپنا نام بدلنے کی درخواست کی کیوں کہ اس میں لفظ محمد آتا تھا اور وہ بادشاہ کو پسند نہیں تھا۔ اس کو امین الدین کا نام دیا گیا۔ امین الدین کو احمد نگر بھیجا گیا۔ احمد نگر میں اس وقت برہان الملک حاکم تھا جو دربار سے مدد لے کر وہاں کی سلطنت پر قابض ہوا تھا اور اب خودمختاری کا دعوی کرنے لگا تھا۔ بیجاپور کے حاکم عادل خاں کے پاس صادق خاں کے سابق ملازم میر محمد امین کو رخصت کیا گیا۔ گولکنڈہ کے حاکم قطب الملک کے پاس سفارت کے لیے میر مشیر کو نامزد کیا گیا۔ حکم یہ ہوا تھا کہ شیخ فیضی راجہ علی خاں کی سفارت سے فارغ ہو کر برہان الملک کے پاس چلا جائے، جب وہ احمد نگر پہنچا تو اس کے اور امین الدین کے درمیان بڑی دوستانہ محفلیں رہیں، لیکن آخر میں یہ دوستی مخالفت میں تبدیل گئی۔

اکبر کی علالت

اسی سال اکبر کی طبیعت کچھ علیل ہوگئی۔ پیٹ کا درد ہوتا تھا جس سے نہایت بے چینی کی حالت رہتی تھی۔ اکبر کو بڑے شاہزادے جہانگیر کی طرف سے بدگمانی ہوگئی کہ شاید اس نے زہر دے دیا ہو۔ بار بار اس سے یہ کہتا تھا ''بابا شیخو جیتے رہو یہ سلطنت تو ساری تمہارے ہی لیے تھی پھر تم نے ایسی حرکت کیوں کی؟'' بادشاہ کو حکیم ہمام پر بھی، جو اُن دنوں شاہی معتمد تھا، کچھ نہ کچھ کھلا دینے کا شبہ ہوا۔ بڑے شاہزادے نے اپنے چند معتمد آدمیوں کو شاہزادہ مراد کی نگرانی پر مقرر کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی دن بعد بادشاہ صحت مند ہو گئے۔ اس وقت حرم کی عورتوں اور شاہزادہ مراد نے اس نگرانی کا قضیہ پیش کیا۔ اس معاملے کو یکسو کرنے کے لیے بادشاہ نے 20 ذی الحجہ کو شاہزادہ سلطان مراد کو جسے وہ ''پہاڑی'' کہہ کر پکارتے تھے، مالوہ اور اس سے متعلق علاقے سپرد کر دے۔ شاہزادوں کو علم، نوبت، نقارہ،

پرچم، نشان اور بادشاہی کا دوسرا ساز و سامان جو شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا جیسے چار پارچہ شاہانہ اور خلعت مرحمت فرمائی۔ اسماعیل قلی خان کو اس کا نائب بنایا گیا اور دوسرے چند بڑے بڑے امراء کو بھی اس کی ملازمت میں مقرر کر کے رخصت فرمایا تاکہ دونوں شاہزادوں میں ایک بڑی مسافت حائل رہے اور آئے دن کے ان کے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔

شاہزادہ مراد کی فوج کشی

شاہزادہ مراد ملک کو آگے بڑھانے کے شوق میں مالوہ کی طرف چلا گیا اور بہت سے لوگ شاہزادہ مراد کی قدر و منزلت کو دیکھ کر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے آگرہ، قنوج اور گوالیار سے بے شمار فوج جمع کر لی اور لشکر لے کر روند چھ کے زمیندار مدھوکر ناگی پر حملہ کر دیا۔ یہ زمیندار اپنے کثیر لاؤ لشکر کی وجہ سے ہندستان کے راجاؤں میں بڑا درجہ رکھتا تھا اور اس علاقے میں اس نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ شاہزادے کے لشکر سے اس کا مقابلہ نرور کے علاقہ میں ہوا اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر چھاپے مارنے لگا۔ اس کے آدمیوں نے شاہزادے کے بہت سے لشکریوں کو قتل کر دیا، اس کے چھاپوں سے لشکر میں بڑا انتشار پھیل گیا اور وہ اس علاقے میں نہایت پریشان اور خستہ حال ادھر اُدھر کوچ کرتا رہا۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں مدھوکر طبعی موت مر گیا اور اس کا لڑکا نہایت عمدہ نذرانے لے کر شاہزادے سے ملنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ شاہزادہ مراد نے اسے یار محمد ولد صادق خان کے ہمراہ شاہی خدمت میں لاہور کو روانہ کر دیا اور اجین شہر کو اپنا مستقر بنا کر قیام کیا۔ شہزادہ مراد کا اپنے آدمیوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں تھا۔ لین دین، نشست و برخاست، تسلیم و تعظیم میں باپ کی دیکھا دیکھی بڑے غرور و تکبر سے پیش آتا تھا، اس کے رویے سے لوگ ناراض ہو گئے اور اجازت لے کر یا بغیر اجازت کے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے۔

جونا گڑھ کی فتح

انہی دنوں جونا گڑھ کے حاکم دولت خاں ولد امین خاں غوری جو جام کی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا، مرگیا اور اعظم خاں نے اس قلعے کی تسخیر کے لیے حملہ کردیا۔ امین خان کے وزیروں نے دولت خاں کی سرداری میں کچھ دن تک تو اعظم خاں کی مدافعت کی۔ آخر جان کی امان طلب کر کے قلعے کی کنجی اسی سال 5 ذی قعدہ کو اس کے حوالے کردی۔

ٹھٹھہ کی فتح

26 محرم1000ھ/1591ء کو اکبر کی حکومت کے چھتیسویں سال، خان خاناں نے جانی بیگ سے ایک رات اور ایک دن مسلسل جنگ کی۔ دونوں طرف سے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا۔ خان خاناں 2 مہینے تک اس کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اس دوران بادشاہ نے خان خاناں کی مدد کے لیے ایک مرتبہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور دوسری دفعہ ایک لاکھ روپیہ، ایک لاکھ من غلہ، سو بڑی توپیں، توپچیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دریا کے راستے بھجوائیں۔ رائے سنگھ کو جو 4 ہزاری امیر ہے مدد کے لیے جیسلمیر کے راستے سے روانہ کیا۔ جانی بیگ نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور کئی ایک سخت لڑائیوں کے بعد آخر کار عاجز آگیا۔ مصالحت کرلی اور اپنی لڑکی خان خاناں کے لڑکے سے بیاہ دی، وہ کشمیر کی فتح کے بعد خان خاناں کے ساتھ ملازمت میں داخل ہوا۔

اکبر کی حکومت کا سینتیسواں سال

5 جمادی الثانی 1000ھ/ 1591ء کو نوروز منعقد ہوا اور اکبر کی سلطنت کا سینتیسواں سال شروع ہوا۔ اس سال درباریوں نے بڑے اہتمام سے اپنی داڑھیاں منڈوائیں، اس لیے ان کی تاریخ ہوئی ''بگفتہ ریشہا بر باد داوہ مفسدی چند''۔

کرنسی کا نیا قانون

اس سال بھی کئی ایک نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ ایک حکم یہ دیا گیا کہ پچھلے بادشاہوں کے

جتنے بھی سکے ہیں روپیہ، اشرفیاں وغیرہ سب گلا کر سونے چاندی کے بھاؤ فروخت کر دیے جائیں۔ پہلے سکوں کا نام ونشان تک نہ رہے اور بادشاہی سکے، روپے اشرفی وغیرہ خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے ان کا چلن ایک شرح پر رہے اور سنین کا فرق ان کے چلن پر اثر انداز نہ ہو۔ اس قانون کے نفاذ کے لیے قلیچ خان کو مقرر کیا گیا۔ وہ ہر روز صرافوں کو بلا کر ان سے مچلکے لیتا تھا اور جرمانے لگائے جاتے تھے اس نے بڑی سختی سے کام لیا اور چند ایک کو تو قتل تک کرا دیا۔ اس کے باوجود صراف جعل اور دھوکے سے باز نہ آتے تھے۔ بادشاہ نے کرنسی کے سلسلے میں بڑے تاکیدی فرمان ہر جگہ بھجوائے۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر خواجہ شمس الدین خوافی دیوان کل کی کوششوں سے اس حکم کا نفاذ ہو سکا۔

جلالہ تاریکی پر حملہ

یوم شرف آفتاب کو جب سورج انیسویں درجہ حمل میں ہوتا ہے، جعفر بیگ آصف خان بخشی کو جلالہ تاریکی کے تعاقب پر مقرر کیا گیا۔ جلالہ اس وقت وہ عبد اللہ خاں کے پاس سے لوٹ کر کابل کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی مدد کے لیے کابل کے حاکم محمد قاسم خاں کو مقرر کیا گیا۔ نظام الدین احمد کو "بخشی کل" کا عہدہ عطا ہوا۔ آخر شعبان میں زین خاں کوکہ کو بھی آصف خاں کی مدد اور تاریکیوں (روشنائی قبیلے) کے مکمل استیصال اور سواد اور بجوڑ کے علاقے کو آباد کرنے کے لیے نامزد کیا گیا۔

اس سال وسط شوال میں حافظ سلطان رخنہ ہروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت مخیّر شخص تھا، خاص طور سے سرہند میں اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اور باغ ایسے خوش منظر اور عالی شان ہیں کہ ہندوستان میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تاریخ وفات اصول تعمیہ پر نکالی گئی:

رخنہ در باغ شد و آب نماند

فیضی سرہندی نے دو تاریخیں کہی ہیں، ایک: "باغ بی آب شد"

دوسری:

چو او در گوشہ باغ است مدفون
بجو تاریخ او از گوشۂ باغ

ایک اور تاریخ ہے: ''یا حافظ''

یادگار کا کشمیر پر قبضہ

یوسف خان رضوی کشمیر میں اپنے بھتیجے یادگار کو نائب بنا کر 24 شوال کو خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس کے آنے کے بعد بادشاہ سلامت نے لاہور کے نظم و نسق پر قلیج خاں کا تقرر کیا اور عین موسم باران میں جب کہ برسات اپنے شباب پر تھی راوی ندی کو پار کیا۔ لشکر کو بڑے شاہزادے کے ہمراہ کر کے خود شکار کھیلتے ہوئے چناب ندی پر پہنچے۔

چناب کے قیام میں یہ خبریں ملیں کہ یادگار نے کشمیر کے بادشاہی تحصیلدار حسین بیگ نے شیخ عمری بدخشی سے جنگ کر کے اسے شکست دے دی ہے۔ کشمیر کا سرکاری قاضی علی بغدادی اماموں کا بڑا دشمن تھا اور کشمیر کی دیوانی کے عہدے پر فائز تھا اور حساب کتاب میں الجھنیں پیدا کر کے رعیت کو تنگ کر رکھا تھا۔ یادگار نے اس کے کان کاٹ کر اسے وہاں سے نکال دیا۔ اس واقعہ کی تاریخ ہے:

چون کہ قاضی علی بغدادی   حسرت یادگار با خود برد
خامۂ منشی قضا بنوشت   سال تاریخ او کہ موذی مرد

یادگار کی تخت نشینی

اس کامیابی کے بعد یادگار نے وہاں کے قدیم امراء کی مدد سے شاہی تاج سر پر رکھا۔ کشمیر میں یہ رسم ہے کہ تخت نشینی کے وقت امراء نئے بادشاہ کے اطراف ننگی تلواریں لیے کھڑے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں جب یادگار خطبہ پڑھنے کھڑا ہوا تو خوف سے لرزنے لگا اور کافی دیر تک بدحواس رہا۔ ایک اور اتفاق یہ پیش آیا کہ جس دن اس کے مہر کے لیے نگ

تجویز کیا گیا تو اس نے اپنے سامنے نگینہ کھدوایا۔ اس وقت نگینے کا ایک ریزہ اڑ کر اس کی آنکھ میں پڑ گیا اور وہ دیر تک اس تکلیف میں مبتلا رہا۔ اس بدشگونیوں کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ اس کی سلطنت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔

حسین بیگ شیخ عمری نے یادگار گل سے شکست کھائی وہ کشمیر کے دروں سے اپنی جان بچا کر لے آیا اور راجوری میں جو کشمیر کے راستے پر ہے، شاہی حکم کا انتظار کرنے لگا۔

یادگار نے کشمیر میں اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ لوگوں کو جاگیریں دیں، خطابات عطا کیے اور میرزا یوسف خاں کے خزانے، طویلے اور اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔ یوسف خاں کے اہل و عیال سے سارا روپیہ زیور اور اناج وغیرہ چھین کر خچروں پر سوار کرا دیا اور ان کو یوسف خاں کے بیٹے کے ہمراہ کشمیر سے باہر نکال دیا۔

یادگار گل کی شکست اور قتل

اس واقعے پر بادشاہ نے سارا الزام یوسف خان کے سر رکھا اور اسے کچھ دن تک شیخ ابو الفضل کے پاس قید میں ڈلوا دیا، نیز شیخ فرید بخش کو شیخ عبد الرحیم لکھنوی اور دوسرے چند امراء کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دے کر خود چناب پر شاہزادے کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ ابھی بادشاہ نے وہاں سے کوچ نہیں کیا تھا کہ خبر ملی کہ شاہی امراء کے مقابلے کے لیے یادگار کشمیر سے نکل کر ہیراپور نامی درے پر مورچہ جمائے تھا اور رات کے وقت وہ اپنے سراپردہ میں عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ مرزا یوسف خان کے بعض نوکروں نے پٹھانوں کے ایک دستے کو ساتھ لے کر آدھی رات کو شب خون مارا اور یادگار خان کو قتل کر دیا۔ 3 دن کے بعد اس کا سر بھی شاہی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ اس کی تخت نشینی کے چالیسویں دن ہی اس کا سر کٹ کر دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے سر کو عبرت کے لیے لاہور کے قلعے کے کنگورے پر لٹکا دیا گیا۔

جامع رشیدی کے ترجمے کا حق

اسی سال ماہ ذی الحجہ کو حسب الحکم میں(87) بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا بھمبر کے قیام

میں حکیم ہمام نے عرض کیا کہ عبدالقادر کورنش بجالانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدہ کے خلاف کتنے عرصے تک غیر حاضر رہا، حکیم نے جواب دیا: ''پانچ مہینے!'' بادشاہ نے پوچھا: ''غیر حاضری کا کیا سبب تھا؟'' لوگوں نے کہا، وہ بیمار ہو گیا تھا، تصدیق کے لئے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لئے تو فرمایا: ''بیماری 5 مہینے تک نہیں رہتی'' اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ میں ۱۹۹۱ نہایت شرمندہ، رنجیدہ اور غمزدہ شاہزادہ دانیال کے لشکر میں جسے رہتاس میں مقرر کیا گیا تھا ٹھہرا رہا اور حضور اکرم ﷺ پر درود بھیج کر اور قصیدہ پڑھ کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخر کار بفضل ایزدی قبول ہوئیں اور میرے پہنچنے کے 5 ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر توجہ اور عنایت فرمائی اور ایک کتاب جامع رشیدی کے ترجمے کے لیے جو کافی ضخیم ہے، خلوت شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میرے غائبانے میں تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی واپسی کے بعد اسی سال 17 ربیع الآخر کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خفگی بآسانی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے ابوالفضل علامی کے مشورے سے مجھے جامع رشیدی کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اس انتخاب میں عباسی، مصری، اموی خلفاء کے شجرے کو جن کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام نبیوں اور آدم علیہ السلام تک جا کر ختم ہوتا ہے، عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے شاہی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانہ عامرہ میں داخل کرا دیا۔

کشمیر کی سیر

6 محرم 1001ھ/1592ء کو شہنشاہ کشمیر پہنچ گئے اور 28 دن تک اس ''باغ خاصہ'' کی سیر میں

معروف رہے۔ وہاں کی حکومت دوبارہ میرزا یوسف خان کے حوالے کر دی، 6 صفر 1001ھ/1592ء کو وہاں سے لوٹ گئے اور کشتی کے ذریعہ کشمیر کی سرحد پر پکھلی کے راستے سے بارہ مولہ جا پہنچے۔ راستہ میں "زین لنکا" نامی تالاب کی بھی سیر کی۔ یہ تالاب دو مشرقی اور مغربی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ اس کا دور 30 کوس کا ہے اور بہت گہرا ہے "دریائے بہت" اسی جھیل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔

سلطان زین العابدین نے، جس کا ذکر تاریخ کشمیر کے ضمن میں کیا گیا ہے، اس تالاب میں تقریبا ایک جریب پتھر ڈلوا کر ایک بڑا پشتہ بنوایا اور اس پر ایسی عالی شان، خوش منظر سنگین عمارتیں تعمیر کرائیں کہ انکی مثال ہندوستان کے کسی شہر میں بھی نہیں ملتی۔

لرزنے والا درخت

لشکر والے کشمیر میں ایک نہایت انوکھی چیز دیکھ کر آئے تھے، یہ موضع خان پور میں ایک لرزنے والا درخت ہے جس کا تنہ تو دو ہاتھ موٹا اور اسکی بلندی ایک گز سے زیادہ ہوگی۔ اس کی شاخیں بید مجنوں کی ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی بچہ اس کی شاخ کو پکڑ کر ہلا دے تو پورا درخت حرکت میں آ جاتا ہے اور لرزنے لگتا ہے۔

کشمیر کے بعض عجائبات کا تذکرہ شاہ فتح اللہ شیرازی مرحوم نے اپنے ایک رسالے میں بھی کیا تھا جو علامی شیخ ابو الفضل کی تصنیف اکبر نامہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

پشاور میں شاہانہ داخلہ

یکم ربیع الاول کو رہتاس میں قیام ہوا اور اسی ماہ کی 15 تاریخ کو پشاور کی طرف مراجعت ہوئی۔ 6 ربیع الثانی کو بادشاہ شہر پشاور میں داخل ہوئے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ بہادر کورو نے جس کا کچھ حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اڑیسہ کے حاکم قتلو خان کے انتقال کے بعد مکت سنگھ ولد مان سنگھ نے اس پر فوجی حملہ کر دیا۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپا اور سمندر کے کنارے

تک بنگال کا سارا علاقہ بادشاہی قبضہ میں آ گیا۔

اکبر کی حکومت کا اڑتیسواں سال

اتوار 17 جمادی الثانی 1001ھ/1592ء جب سورج برج حوت سے برج حمل میں منتقل ہوا تو جشن نوروز منعقد کیا گیا اور جلوس شاہانہ کا 38 واں سال شروع ہو گیا اور چند نئے قوانین اجرا کیے گئے۔ 24 جمادی الثانی کو خانخاناں اور میرزا جان شاہی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور خسروانہ ہمدردی سے نوازے گئے۔ ان امیروں کو بھی جو اس مہم میں خان خاناں کے ہمراہ گئے تھے حسب مراتب منصبوں اور جاگیروں میں ترقی ملی۔ ملتان پہلے میرزا جانی کی جاگیر میں دیا گیا بعد میں اسے ٹھٹھہ اور میرزا رستم کو ملتان کا علاقہ سپرد ہوا، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

مظفر گجراتی کی خودکشی

اس وقت خبر پہنچی کہ جب خان اعظم نے سورت پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے مظفر گجراتی بھاگ کر کچھ کے ایک زمیندار کنکار کے پاس چلا گیا۔ خان اعظم اس کے تعاقب میں کنکار جا پہنچا۔ زمیندار اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور مظفر کو غفلت کی حالت میں قید کر کے خان اعظم کے پاس بھجوا دیا۔ مظفر نے راستے میں قضائے حاجت کا بہانہ کیا اور ایک استرے سے جو اس کے بازو بند میں چھپا ہوا تھا اپنا گلا کاٹ لیا۔ اس کا سر خان اعظم کے پاس پہنچایا گیا۔ خان اعظم نے اُسے ملاحظہ شاہی کے لیے لاہور بھیج دیا۔

انہی دنوں 120 ہاتھی جو اڑیسہ کی فتح میں راجہ مان سنگھ کے ہاتھ آئے تھے بنگال سے لائے گئے۔ اکبر نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ امرائے سرحد ہمیشہ وقفے وقفے سے دربار میں حاضر ہوتے رہیں۔ اس سال خان اعظم کی طلبی کا فرمان صادر کیا گیا جو 6 سال سے دربار میں نہیں آیا تھا، اس نے جونا گڑھ کو فتح کیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے جونا گڑھ لے کر راجہ

رائے سنگھ کے حوالے کر دیا۔

خان اعظم کی حجاز روانگی

آخری مرتبہ جب خان اعظم بنگالہ سے فتح پور میں آ کر باریاب ہوا تو اس نے مذہبی معاملات میں اکبر سے بہت بحث کی تھی اور بادشاہ کے سامنے ابو الفضل اور بیربر سے سخت گفتگو کی تھی اس لیے وہ حاضری میں تامل کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس نے جام کی لڑائی میں اپنی منت کے مطابق داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں طنزاً یہ بھی لکھا تھا کہ تیری "داڑھی اتنی بوجھل ہے کہ تجھے آنے نہیں دیتی ہے" اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل اور نہایت سخت عریضہ روانہ کیا۔ یہ جواب بادشاہ کے دل میں کھٹک گیا۔ منافقوں نے بھی اس کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی۔ دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خان اعظم اسی سال یکم رجب کو اپنے اہل وعیال کے ہمراہ تمام مال وخزانہ لے کر ایک جہاز میں جو ناگڑھ سے بندر دیو کو چلا گیا اور حجاز چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس کی روانگی کی تاریخ ایک عدو کی کمی سے یہ کہی گئی ہے:

بجای راستان شد خان اعظم　　ولی در زعم شاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم ز دل تاریخ این سال　　گفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

اس کا یہ جرأت مندانہ اقدام بلاشبہ ابن ادہم کے ترک سلطنت کے مشابہ تھا۔

امرائے گجرات کے تبادلے

بادشاہ کو جب خان اعظم کے چلے جانے کی خبر ملی تو مالوہ میں شاہزادہ مراد کے پاس فرمان گیا کہ اسے گجرات کی حکومت سپرد کی جاتی ہے۔ اس کی وکالت کے لیے اسماعیل قلی خان کے بجائے محمد صادق خان کو مقرر کیا گیا۔ سورت اور بھڑوچ کا علاقہ قلیج خان سے لے کر صادق خان کی جاگیر میں دے دیا گیا۔

زین خاں کوکہ اور آصف خان نے جو سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں اور جلالہ تاریکی

(روشنائی) کی بغاوت پر مقرر کیے گئے تھے، حملہ کر کے بہت سے پٹھانوں کو قتل کر دیا اور اس کے بھائی وحدت علی کو اس کے اہل قبیلہ کے ساتھ جو تقریباً 14 ہزار آدمی تھے، قید کر لیا اور اسی سال دربار میں بھجوا دیا۔

29 ذی قعدہ کو مالوہ کی حکومت شاہرخ میرزا کو سپرد کی گئی۔ شہباز خاں کنبو 3 سال سے قید میں تھا، اس سے 7 لاکھ روپیہ نقد لے کر کانگڑہ کے قلعے سے بلا کر رہا کر دیا۔ اسے شاہرخ میرزا کی وکالت اور مالوہ کے نظم و نسق پر مقرر کیا گیا۔

شیخ مبارک کی وفات

17 ذی قعدہ 1001ھ/1592ء کو شیخ مبارک دانشمند کا انتقال ہو گیا، اس کے لڑکوں نے تعزیت میں اپنے سر کے بال، داڑھی، مونچھیں اور ابرو منڈوا دیے۔ ان کی تاریخ وفات ملک الشعراء فیضی نے ''فخر الکمل'' اور میں ''(*)'' نے '' شیخ کامل'' نکالی۔

میرزا رستم کی آمد

8 محرم 1002ھ/1593ء کو میرزا رستم بن سلطان حسین میرزا، بہرام میرزا بن شاہ اسماعیل صفوی جو ملک داور اور اس کے نواحی علاقے کا حاکم تھا اور قندھار و گرمسیر پر اس کے بڑے بھائی میرزا مظفر حسین کی حکمرانی تھی۔ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ ہندستان آ گیا اور بادشاہ کے پاس حاضر ہوا۔ اس کے استقبال کے لیے بادشاہ نے حکیم عین الملک کو بھیجا تھا اور اس کے لیے سراپردہ، قالین اور فراش خانہ کا دوسرا ساز و سامان، مرصع کمر پٹہ اور جمجر بھی روانہ کیا۔ جب وہ لاہور سے 4 کوس پر پہنچا تو حسب الحکم خان خاناں زین خان کوکہ اور دوسرے تمام اکابر امراء پیشوائی کے لیے روانہ ہوئے۔ حاضری کے وقت اس کو ایک کروڑ تنکہ نقد انعام دیا گیا اور 5 ہزاری امراء میں اس کو داخل کیا گیا اور ملتان اس کی جاگیر میں دیا گیا۔

دکن کی مہم پر دانیال اور خانخاناں کا تقرر

ملک الشعراء شیخ فیضی کچھ دن پہلے دکن سے آ چکا تھا اس کی آمد کے 4 مہینے بعد دکن کے

حکام کے ایلچی دربار میں آئے۔ چونکہ برہان الملک نے خاطر خواہ پیش کش نہیں بھیجی تھی۔ اکبر نے 21 محرم کو شاہزادہ دانیال کو دکن کی مہم پر مقرر کیا۔ خانخاناں اور رائے سنگھ اس کے وکیل مقرر ہوئے اور دوسرے بہت سے امراء ہمراہی کے لیے نامزد کیے گئے۔ اس مہم پر روانگی سے پہلے بادشاہ نے شہزادہ دانیال کا خانخاناں کی بیٹی سے نکاح کرا دیا۔ اس خوشی میں ایک شاندار جشن منعقد ہوا۔ شاہزادے کو اس قدر نقد روپیہ اور مال و اسباب جہیز میں ملا کہ ایک لشکر کا پورا سامان اس سے ہو سکتا تھا۔ شادی کے بعد اکبر نے دانیال کو تمام شاہی لوازمات اور شان و شوکت کا سامان عطا کر کے اس مہم پر رخصت کر دیا۔ خود بھی اس کے پیچھے شکار کے ارادے سے سلطان پور کی ندی تک جو لاہور سے 25 کوس پر ہے، گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد بادشاہ کی رائے بدل گئی اور شہزادے کو واپسی کا حکم دے کر خان خاناں کو بھی جو سرہند تک پہنچ چکا تھا، مشورے کے لیے بلوایا اور اس کو لشکر کا مستقل سردار بنا کر اور مہم کے ضروری انتظامات کر کے دوبارہ لشکر کو رخصت کر دیا اور خود وہاں سے لاہور لوٹ آیا۔

جمعہ کے دن 18 جمادی الثانی 1002ھ/1593ء کو میاں شیخ داؤد نے انتقال فرمایا۔ ان کی تاریخ "جان پاک شیخ داؤد" نکالی گئی۔

میں[91] یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں تک جتنے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا ماخذ "طبقات اکبر شاہی" ہے جس کا نام میں نے تاریخ کی رو سے "نظامی" رکھا ہے۔ یہ نام اس کے مصنف نے بھی پسند کیا تھا اور اسے اپنی کتاب کے ساتھ درج کیا تھا۔ اس کے بعد 2 سال کے واقعات میں مجملاً بیان کروں گا۔

اکبر کی حکومت کا انتالیسواں سال اور کوتوالی کے انتظامات

پیر کے دن 28 جمادی الثانی 1002ھ/1593ء کو نوروز منعقد ہوا اور سلطان کی تخت نشینی کا انتالیسواں سال شروع ہو گیا۔ حسب سابق 18 دن تک بڑے عیش و طرب کے ہنگامے گرم

رہے اور نئے نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ کوتوالوں کو حکم دیا گیا کہ ہر شہر کا کوتوال اپنے شہر کے تمام محلوں اور گھروں کے حالات سے باخبر رہے اور میر محلّہ سے اس بات کا مچلکہ لکھوالے کہ جو شخص تاجر یا سپاہی یا کوئی اور پیشہ ور ان کے محلّے میں آکر ٹھہرے وہ ان کے حالات سے باخبر رہے گا۔ کسی مفسد یا چور کو اپنے محلّہ میں رہنے نہیں دے گا۔ جس آدمی کا خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ دکھائی دے اس کی تحقیقات کرکے کوتوال کو باخبر کردے گا، کیوں کہ اس کی فضول خرچیاں ناجائز آمدنی ہی کے سبب ہوسکتی ہیں۔ محلّے میں خوشی اور غمی کی جو تقریبات ہوں، خصوصاً نکاح، ولادت اور قتل وغیرہ کے واقعات سے محلّے والے کوتوال کو لازماً آگاہ کردیا کریں۔ کوتوال ایک معتبر آدمی ہمیشہ ہر محلّہ، گلی بازار اور پانی کی گزرگاہ پر مقرر رکھے اور لوگوں کی اچھائی برائی کو اپنی نظر میں رکھے۔ راستوں کی ایسی ناکہ بندی کی جائے کہ بھاگا ہوا کوئی شخص یا بھولا بھٹکا آدمی بچ کر نہ جاسکے۔ کوئی سوداگر بغیر اجازت گھوڑے نہ لے جائے اور سوداگر ہندستان سے غلاموں کو لے کر نہ جاسکیں۔

لین دین کے قاعدے

سونے چاندی اور کپڑوں کا دام بھی مقرر کیا گیا کہ ان کا لین دین سرکاری شرح پر ہو اور منافع پر مقرر ٹیکس سرکاری خزانے میں داخل کیا جائے۔ مُردوں کے مال پر ایک داروغہ مقرر کیا جائے تاکہ تحقیقات کے بعد اگر اس کے ذمے کچھ سرکاری بقایا ہو یا مرنے والا کروڑی، علمدار یا قوطے دار ہو تو اس کا مال ضبط کرلیا جائے ورنہ اس کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ جب تک بیت المال کے داروغہ کی اجازت نہ مل جائے، مُردوں کو دفن نہ کیا جائے۔

آفتاب کی تعظیم کے لیے قبرستان کا دروازہ شہر کی مشرقی جانب رکھا جائے۔ اگر کوئی ’’درشنی مرید‘‘ مرجائے تو خواہ مرد ہو یا عورت کچا اناج اور چند پکی اینٹیں اس کی گردن پر باندھ کر دریا میں بہادیں، جہاں پانی نہ ہو وہاں اس کی میت جلادی جائے یا چینیوں کی طرح کسی درخت پر اسے باندھ دیں۔

شادی کے قانون

نکاح سے پہلے دولھا اور دلہن کو کوتوالی میں لاکر جب تک کوتوال کے گماشتوں سے ان کی عمروں کی تحقیق نہ کر لی جائے اس وقت تک ان کا نکاح نہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا قوانین سے عوام کو جو فائدہ یا نقصان ہوا وہ ہوا، لیکن ان کے نفاذ سے کوتوالی کے ملازمین اور تمام بدمعاشوں کی خوب بن آئی اور انھوں نے رشوت میں اپنے ہاتھ خوب رنگے۔

ایک حکم یہ دیا گیا کہ جو عورت اپنے شوہر سے 12 سال بڑی ہو شوہر اس سے صحبت نہ کرے۔ جو نوجوان عورت شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے پردہ گھومتی نظر آئے یا ایسی مکار عورت جو شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہو، فاحشہ عورتوں کے محلے میں بھجوادی جائے۔

بھوک اور اضطرار کی حالت میں ماں باپ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کردیں اور جب ان کی تنگی ختم ہو جائے تو وہ روپیہ دے کر اپنے بچوں کو چھڑالیں۔

تبدیلی مذہب کی آزادی

وہ ہندو جو بچپن میں یا جبراً مسلمان بنا لیے گئے ہوں، انھیں اختیار ہوگا کہ اگر چاہیں تو دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کرلیں۔ مذہب تبدیل کرنے پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ جو شخص جس مذہب کو چاہے اختیار کرسکتا ہے۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر فریفتہ ہوکر مسلمان ہو جائے تو اسے زبردستی اس کے آدمیوں کے سپرد کردیا جائے۔

بت خانہ، گرجا اور آتش کدہ کسی بھی عبادت گاہ کی تعمیر میں غیر مسلمانوں پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔

ملکی قوانین کی تفصیلات

یہ چند احکام تھے جن کا تعلق مذہبی معاملات سے تھا ان کو مختصراً لکھ دیا گیا۔ ان کی تفصیل میری(۱۹۱) قوت تحریر سے باہر ہے۔ اسی طرح وہ سارے قوانین جو ملکی اور مالی امور سے

متعلق ہیں جیسے بیوتات، دار الضرب، فوج، رعیت، سوداگری، چوکی، واقعہ نویسی، کروڑی، داغ و محل، ہاتھیوں کی لڑائی، ہرن، چیتا، مرغ، بکری، کتے اور سور کی لڑائی۔ اسی طرح اصطبل کے ضوابط، کھانے پینے، سونے اٹھنے کے اوقات کا تعین غرض چھوٹے بڑے سارے معاملات سے متعلق جو قاعدے، ضابطے بنائے گئے انھیں بیان کرنے کے لیے بھی ایک عمر اور ایک دفتر چاہیے۔ یہ تفصیلات "اکبر نامہ" کے دوسرے دفتر آئین اکبری میں جسے علامی شیخ ابوالفضل نے ایک ضخیم جلد میں تصنیف کیا ہے، دیکھی جا سکتی ہیں۔

تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب

تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھہ رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خان نے لکھا تھا۔ ان تینوں دفتروں کی تصحیح اور مقابلے کا کام میرے(92) سپرد کیا گیا تھا۔ میں نے یہ کام ملا مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے جو بڑا اچھا مددگار تھا اور احدیوں میں ملازم ہے، انجام دیا اور اس کے پہلے دفتر کو مکمل کر کے اس نوروز کے جشن میں شرف آفتاب کے دن ملاحظہ شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے اس لیے اس کے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کر دو۔ میں(93) نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کر دی، لیکن اس خوف سے کہ مبادا مجھ پر بھی تعصب کا الزام آ جائے میں نے اس کے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی، بس سنین وغیرہ کی ترتیب درست کر دی اور اس کو اسی حال میں رہنے دیا تا کہ میرے ساتھ کوئی نئی پرخاش پیدا نہ ہو جائے۔

فیضی کی غیر منقوط تفسیر

انھی دنوں ملک الشعرا شیخ فیضی نے قرآن کی ایک تفسیر "سواطع الالہام" کے نام سے لکھی، جس کی ضخامت 75 جز کی تھی اور اول سے آخر تک غیر منقوط تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے 99 غیر منقوط فقروں سے اس کی تاریخ بھی نکالی اور اس کے چند جز اشاعت کے لیے

عراق بھجوائے۔ اس سال فیضی اس کی تصحیح و مقابلے میں مصروف ہے۔ اس نظر ثانی کی تاریخ ''اسرار ثانی'' سے نکلتی ہے۔ اکثر عالموں نے اس کی تفسیر پر تقریظیں لکھی ہیں۔ شیخ یعقوب کشمیری نے عربی زبان میں تقریظ لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے اس کی تاریخ نکالی۔ **"وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِی کِتَابٍ مُّبِین"** میر محمد حیدر معمائی نے تسمیہ کو چھوڑ کر پورے سورۂ اخلاص سے اس کی تاریخ نکالی۔ میں(94) نے **"من احسن التفاسیر بسم الله الرحمٰن الرحیم علم القرآن"** سے تاریخ نکالی۔ ایک تقریظ بھی میں نے اس پر لکھی جس کا ذکر مناسب مقام پر آئے گا۔ میں(95) نے لاہور کی شکارگاہ میں جو 30 تاریخی فقرے نکالے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔ **"الحمد لله لحصل المرام اکرم سواطع الالہام"** **"اللہم المحرر وحدہ لاطراء من الکلام"**۔ **"حدود اسرار کلام الله المرسل در والسرور"**۔ **"سمو السرو الدرر علو"**۔ وغیرہ۔

ماہ صفر 1002ھ/ 1593ء میں خواجہ ابراہیم حسین احدی جو میرے(96) خاص آدمیوں میں سے تھا، فوت ہوگیا۔ اس نے ''خواجہ ابراہیم حسین'' تاریخ پائی۔

اس سال میں نے توفیق خداوندی سے کلام پاک کی روشن اور صاف خط نسخ میں نہایت صاف کتابت کی اور اسے پورا کرکے یہاں شیخ حسین والی کے روضے کے لیے وقف کرادیا۔

محمد قاسم خاں میر بحر کا قتل

اسی سال 17 ذی قعدہ کو محمد قاسم خاں میر بحر اور میرزا محمد زمان جو شاہرخ میرزا کا لڑکا تھا، کابل میں مارے گئے۔ محمد زمان میرزا حج سے واپسی کے بعد بدخشاں آیا۔ بدخشاں والے اوزبکوں کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے انھوں نے اسی کو اپنا سردار بنالیا اور ہندستان کی مدد کے بل پر بڑی بہادری سے اوزبکوں پر حملہ کردیا۔ بعد میں اوزبک ایک بڑی فوج لے کر محمد زمان میرزا کے مقابلے پر آئے وہ اپنی قوت سے چند سال تک برابر اوزبکوں سے لڑتا رہا اور آخر کار شکست کھا کر بھاگا اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ ہندستان پر حملہ

کرنے کے ارادے سے کابل کے علاقے میں پہنچا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اسے لوگوں نے بہکایا تو کابل کے لیے اس کی نیت ڈانواڈول ہوگئی۔ اس کے ارادے کو بھانپ کر کابل کے حاکم نے جو اس وقت محمد قاسم خان تھا۔ اس نے اس کو گرفتار کر لیا، مگر وہ اس کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا اور اسے گھوڑا، خرچ اور خلعت دے کر 150 سواروں کو اس کی ہمراہی کے لیے مقرر کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ میرزا کو لاہور بھجوا دے۔ اسی اثناء میں محمد قاسم خان کے بعض بدخشی اور کابلی ملازموں نے میرزا سے سازباز کی اور دوپہر کو سرکاری حویلی کا دروازہ توڑ کر زبردستی اندر داخل ہوگئے اور خوابگاہ میں جا کر محمد قاسم خان کو تہہ و تیغ کر ڈالا۔

محمد ہاشم ولد محمد قاسم خاں اس وقت قلعے سے باہر تھا، اس نے توپچیوں اور محافظ دستے کی ایک جمعیت لے کر میرزا محمد زمان کا محاصرہ کرلیا اور ایک دن ایک رات مسلسل جنگ کر کے میرزا کو قتل کر دیا اور اس کا سر دربار میں بھجوا دیا۔

اس واقعے کے بعد بادشاہ نے محمد قلیچ خاں کو جو کچھ عرصے تک جملۃ الملک رہ چکا تھا، کابل کی حکومت پر مقرر کر کے روانہ کر دیا۔ دیوان مطلق کے عہدے پر تمام ملکی اور مالی معاملات سرانجام دینے کے لیے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کا تقرر عمل میں آیا۔ انہی دنوں آصف خاں بخشی کو کشمیر کے انتظامی معاملات اور فوجی مہمات کی تحقیق و انتظام کے لیے روانہ کیا گیا۔

میں[97] بعض ناشائستہ عادتوں میں مبتلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سال مجھے توبہ کی توفیق عطا کی اور میں نے اپنی بداعمالیوں کی سچے دل سے توبہ و استغفار کی۔ اس توبہ کی تاریخ لفظ ''استقامت'' سے حاصل ہوئی۔ میری توبہ پر ملک الشعراء فیضی نے یہ شعر کہا:

لقد تاب شهمی عن الصبوه
تاریخه سابق التوبه

غرض یہ کہ:

رفت از سرم اندیشۂ می و معشوق
بشد زخاطرم آواز بربط و طنبور

محرم 1003ھ/1593ء کے شروع میں شیخ فرید بخاری کو جو ان دنوں آصف خان کے ساتھ نائب بخشی کے عہدے پر مقرر تھا، حکم دیا گیا کہ وہ شمالی پہاڑی پر فوجی حملہ کر کے وہاں کے باغی راجاؤں کو اطاعت پر مجبور کرے اور وہاں کی زمین کی جمعبندی کر کے عمدہ پیش کش لے کر آئے۔

سفر کے شروع میں بادشاہ نے راوی ندی کو پار کیا اور اس علاقے میں 25 دن تک سیر و شکار میں معروف رہا۔

نل دمن داستان کی تصنیف

انہی دنوں بادشاہ نے ملک الشعراء فیضی کو "پنج گنج" تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ اس نے تقریباً 5 ماہ کی مدت میں ہندستان کی مشہور عشقیہ داستان "نل و دمن" کو 4 ہزار سے کچھ 200 کم اشعار میں مرتب کر کے شاہی خدمت میں چند اشرفیوں کے نذرانے کے ساتھ پیش کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کو نہایت پسند آئی۔ اس کی کتابت اور مصوری ہونے کا حکم دیا گیا اور نقیب خاں کو پڑھ کر سنانے پر مقرر کیا گیا۔ اس کتاب کا مطلع ہے

ای در تگ و پوئی تو آغاز
عنقای نظر بلند پرواز

واقعتاً یہ ایک ایسی مثنوی ہے کہ ان 300 سال میں امیر خسرو کے [illegible] شاید [illegible] نے ہندستان میں ایسی مثنوی لکھی ہو۔

مرزا نظام الدین احمد کا انتقال

میرزا نظام الدین کی قلیج خاں کے ساتھ ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ میرزا کا بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل ہو گیا۔ اس نے مفوضہ فرائض بھی نہایت دیانت داری، محنت اور خلوص سے سرانجام دیے۔ اس کی حسن کارگزاری کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ نے قلیج خاں اور دوسرے مقربین کو تو مختلف مقامات پر تقرر کر کے دربار سے علیحدہ کر دیا لیکن نظام الدین

احمد پر بادشاہ کی عنایات پہلے سے کہیں زیادہ مبذول رہیں۔ بادشاہ نے اس گوہر قابل کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن تقدیر کے فیصلے انسانی ارادوں کے پابند نہیں ہوتے۔ نظام الدین احمد اپنی ترقی اور اقتدار کے اس دور عروج میں تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انکی عمر 45 سال تھی۔ اس مرض میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تمام دوستوں کو آبدیدہ چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے حسن اخلاق نے سب کو ہی گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن خاص طور سے میرا ان کا تعلق نہایت بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ انکی موت کا مجھے[98] بے حد صدمہ ہوا۔ اشک بہانے اور صبر کرنے کے اور کیا چارہ تھا؟ میں[99] نے اس صدمے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ کسی کی محبت کا دم بھرنا اس دنیا میں بے فائدہ ہے۔ ان جیسے دوستوں سے تو گوشہ عزلت ہی زیادہ بہتر ہے۔

نظام الدین احمد کی وفات 3 صفر 1003 ھ/ 1594 ء میں ہوئی۔ ان کی میت لشکر سے لاہور میں لائی گئی اور ان کے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے جنازے پر خاص کیا؟ عام کیا؟ سبھی زار زار رو رہے تھے۔ لوگ ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے قصے یاد کر کے بڑی حسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی وفات کی تاریخ کے لیے یہ قطعہ موزوں ہو گیا۔

رفت میرزا نظام الدین احمد سوی عقبیٰ چست و ز دنیا رفت

جوہر او زبس کہ عالی بود در جوار ملک تعالیٰ رفت

قادری یافت سال تاریخش
گوہر بے بہا ز دنیا رفت

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ فرید کو جس کو بخشی گری کی تقریباً تمام ذمہ داریاں سپرد ہو چکی تھیں اور وہ پہاڑوں میں سوالک کے علاقے پر حملہ کرنے گیا ہوا تھا، واپس بلا لیا اور اس کی جگہ قاضی حسین قزوینی کا تقرر کر دیا گیا۔

اعظم خان کی واپسی اور بے راہ روی

انہی دنوں اعظم خاں جو مکہ گیا ہوا تھا وہاں کے امراء کے ہاتھوں تنگ آ کر حج سے ہندستان واپس آ گیا۔ اب جو وہ لوٹ کر آیا تو اس کی شان بے نیازی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری پسندیدہ خصوصیات کو خیر باد کہہ دیا اور بادشاہی مریدوں میں داخل ہو کر تعظیم و تسلیم کے تمام مقررہ لوازمات کی اطاعت کی۔ بادشاہی سجدہ بھی کیا۔ اس تبدیلی کے بعد دربار شاہی میں اس کا چراغ جلنے لگا اور محفلوں، گفتگو گویا ہر جگہ اور ہر موقعے پر وہ پیش پیش نظر آنے لگا۔ بادشاہ نے اسے غازی پور اور حاجی پور کا صوبہ جاگیر میں عطا فرمایا اور وہ ابوالفضل کے پاس بیٹھ کر نئے مذہب کے احکام سیکھنے لگا۔

اکبر کی حکومت کا چالیسواں سال

اس سال 9 رجب 1003ھ/1594ء کو نوروز منعقد ہوا اور شاہی حکومت کا چالیسواں سال شروع ہوا۔ نوروز کے جشن کی ساری تیاریاں حسب معمول سرانجام پائیں۔

مہابھارت کی ایک حکایت

نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے مجھے(100) دیوان خانہ خاص و عام کے جھروکے میں بلوایا اور براہ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا: ''ہم فلاں کو (اشارہ میری طرف تھا) صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہہ ظاہر کیا ہے کہ کوئی تلوار ایسے تعصب کی رگ کو کاٹ نہیں سکتی''۔ شیخ ابوالفضل نے پوچھا۔ ''صاحب! اس نے کس کتاب میں ایسا کچھ لکھ دیا کہ آپ اس کے متعلق یہ ارشاد فرماتے ہیں''۔ اکبر نے فرمایا: ''اسی رزم نامہ یعنی مہابھارت میں کل رات ہم نے اس کی تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے''۔ شیخ نے کہا ''اس سے غلطی ہو گئی''۔ اس وقت مجبوراً آگے بڑھ کر کہنا پڑا: ''کمترین تو بس ایک مترجم ہے اس سے زیادہ نہیں، جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف

سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً قصوروار ہوں"۔ شیخ نے بھی اس بات کی تائید کی اور بادشاہ سلامت خاموش رہ گئے۔

اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ رزم نامہ میں، میں نے ایک حکایت نقل کی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایک پنڈت نے عالم نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ غفلت و جہالت ترک کر کے سب سے پہلے اس صانع حقیقی کو پہچانے اور علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور بے علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا بھروسا نہ رکھے۔ حسن عمل کو اختیار کر کے تاحد امکان جھگڑوں سے بچتا رہے اور اس کا یقین کامل رکھے کہ ہر فعل کی بازپرس ہو کر رہے گی۔ اس موقعے پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا۔

ہر عمل اجری و ہر کردہ جزائی دارد

ہندو مذہب میں جزائے اعمال کا تصور

بس یہ عبارت اور یہ مصرع تھا جو کھٹک گیا اور اکبر نے اس کو منکر نکیر کے سوال و جواب، حشر و نشر اور آخرت کے حساب و میزان پر محمول کیا۔ یہ بات چونکہ اس کے عقیدہ تناسخ کے خلاف تھی جس کے سوا وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اس نے مجھ پر طاپن اور تعصب پرستی کا الزام لگا دیا۔ یہ بات خوب چھڑی اور اچھا موقع نکل آیا۔ چنانچہ میں نے شاہی مقربان کو بخوبی سمجھایا کہ ہندوستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور برے انجام کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے نامہ اعمال کو زندگی بھر لکھتا رہتا ہے روحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کے سامنے جس کا نام بادشاہ عدل ہے، لے جاتا ہے اور وہ نیکی اور بدی کے اندراجات دیکھ کر اور ان کی کمی و زیادتی کا مقابلہ کر کے حکم کرتا ہے کہ یہ شخص مخیر (نیک) ہے پھر اس نیک روح سے کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے تو تجھے جنت میں لے جائیں گے تاکہ تو وہاں اپنی نیکیوں کے برابر لذتوں سے لطف اندوز ہو جائے بعد میں تجھے دوزخ میں ڈالا جائے گا تاکہ تیرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ اگر تو چاہے تو پہلے تجھے دوزخ میں پھر بعد میں جنت

میں لے جایا جائے۔ جب وہ دوزخ و جنت کی اس مدت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر اسے دنیا میں جانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے مطابق کسی جسم میں حلول کر کے زندگی کی چند گردشوں میں گھومتا رہے، یہاں تک کہ اسے نجات مطلق مل جائے اور وہ دنیا میں آنے اور جانے کی اس زحمت سے چھٹکارہ پالے۔ میری اس توضیح و تقریر پر وہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اجمیر کی تولیت کی تجویز

شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے کہے بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر فلاں[101] کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضے کی تولیت دے دیں تو کیسا رہے گا؟ کیوں کہ اس روضۂ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے۔ صدر جہاں نے کہا یہ بہت اچھی تجویز ہے۔ میں[102] بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں سے کسی طرح نجات مل جائے، اس غرض کے لیے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں بڑی کوششیں بھی کیں اور دو تین عرضیاں بھی لکھ کر پیش کیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

اس سال آخر ماہ رمضان میں صدر جہاں نے شاہی بارگاہ میں عرض کیا کہ 'فلاں'[103] کی رخصت کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے؟ بادشاہ نے فرمایا: ''یہاں بہت سے کام نکلتے رہتے ہیں اور ہم اسے کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی جگہ کسی اور کام کے آدمی کو مہیا کرلو تو دیکھا جائے گا''۔ بہر حال خدا کی مصلحت نہیں تھی رخصتی نہ ملی اور میں صبر کر کے بیٹھ رہا۔

انہی دنوں ایک دن میرے سامنے اکبر نے شیخ ابو الفضل سے فرمایا: ''فلاں[104] اجمیر کی خدمت کو بہ حسن و خوبی انجام دے گا، لیکن ہم اس سے جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ نہایت اچھی طرح سے ہمارے خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے، اس لیے ہم اسے جدا نہیں کرنا چاہتے''۔ شیخ ابو الفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

بحر الاسمار کی تصنیف

اسی دن بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر نے جس ہندی افسانہ کا "بحر الاسمار" کے نام سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا تھا اس کا ترجمہ کرکے تکمیل کردو۔ میں نے اس کام کو شروع کردیا اور اس کتاب کی آخری جلد کو جس کی ضخامت 60 جزو کی ہے 5 مہینے میں پورا کردیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ سلامت نے خواب گاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلوایا اور صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتے رہے۔ پھر حکم دیا۔ "کہ بحر الاسمار کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے اس کو بھی تم مروّجہ زبان میں تحریر کردو اور اپنے اس ترجمہ کیے ہوئے مسودے کو حفاظت سے رکھے رہو" میں نے زمین بوس ہوکر بہ سر و چشم اس خدمت کو قبول کرلیا اور اس کام کو شروع کر دیا۔ بادشاہ نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ 10 ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ میں نے کہا انشاء اللہ یہ کتاب ابھی دو تین ماہ کے اندر بہ حسن و خوبی مرتب ہو جائے گی تب کہیں جاکر مجھے وطن جانے کی رخصت مل سکے گی۔

دکن کی مہم پر شاہزادہ مراد اور خان خاناں کا تقرر

اسی سال ہندیہ سے حکیم عین الملک اور شہباز خان کے عریضے پہنچے کہ برہان الملک کو اس کی بدسلوکی سے ناراض ہوکر امراء نے قتل کرادیا اور ایک 12 سالہ لڑکے کو اس کا ولی عہد بنا کر تخت نشین کردیا ہے۔ بادشاہ نے ایک فرمان شہزادہ مراد کے اور دوسرا خان خانان کے نام لکھ کر بھیجا کہ دونوں جلد از جلد کوچ کرکے تسخیر دکن کے لیے سرحدوں پر پہنچ جائیں۔

شاہ بیگ خان کی فوجی کاروائی اور فتح

اس سال اوائل ماہ ذی الحج میں شاہ بیگ خان کابلی قندھار کو چلا گیا اور میرزا مظفر حسین حاکم قندھار قرا بیگ میر شکار کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوا۔ بھاری نذرانوں کے ساتھ قیمتی جواہر بھی پیش کیا۔ بادشاہ نے اس پر عنایت فرمائی شاہ بیگ خان نے داور میں جاکر

اوزبکوں کی ایک بڑی فوج کو شکست دی ان کے اکثر سرداروں کو قتل کر دیا اور بقیہ امیروں کو خلعتیں دے کر رہا کر دیا۔ اوزبکوں کی ایک جمعیت بھاگ کر قلعے میں بند ہو گئی تھی۔ شاہ بیگ خان نے توپ خانے کے ساتھ قلعے پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر کے آگے کوچ کر دیا۔ گرمسیر کے سارے علاقے پر اس نے بخوبی قابو پا لیا۔

بادشاہ نے میرزا رستم کو صوبہ پچھوڑ عطا کیا اور سنبھل کا علاقہ ابو الفضل سے لے کر میرزا قندھاری کو جاگیر میں دے دیا۔ ملتان کو جو میرزا رستم کے مظالم سے تباہ ہو گیا تھا خالصہ میں شامل کر لیا۔ انہی دنوں سعید خان مغل بنگالہ سے حاضر ہوا اور اپنے ساتھ عیسیٰ خان زمیندار کے دیے ہوئے نفیس تحفے، روپیہ اور ہاتھی بطور پیشکش لے کر آیا۔

شیخ یعقوب کشمیری کی وفات

اسی سال شیخ یعقوب کشمیری صوفی جو دربار سے رخصت کر اپنے وطن گیا ہوا تھا۔ فوت ہو گیا۔

یاران ہمہ رفتند و رہ کعبہ گرفتند ماست قدم بر در خمار بماندیم
از نکتہ مقصود نشد فہم حدیثی لا دین ولا دنیا بی کار بماندیم

حکیم عین الملک کا انتقال

حکیم عین الملک راجہ علی خان کے پاس سفیر بن کر گیا تھا، وہاں سے اپنی جاگیر ہندیہ میں لوٹ کر آیا اور 5 مہینے کی بیماری کے بعد 27 ذی الحج 1003ھ/ 1594ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ کی شان ہے کہ تمام دوست اور رفیق ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں اور ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی کے ساتھ آخرت سے غافل ہیں اور اپنی عزیز عمر کو بیہودہ مشاغل میں گنوا رہے ہیں۔

حکیم حسن گیلانی کا انتقال

3 ماہ محرم 1004ھ/ 1595ء کو حکیم حسن گیلانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ حکیم حسن نہایت درویش

مزاج، مہربان اور صاحب اخلاق تھے۔

انہی دنوں مخدوم شیخ حامد کا لڑکا شیخ موسیٰ گیلانی جو اُچہ کے سجادہ نشین شیخ عبدالقادر کا چھوٹا بھائی ہے شاہی ملازمت میں داخل ہوا، بادشاہ نے اسے پانصدی کا منصب عطا کیا۔

مفتی صدر جہاں دین الٰہی کا پیرو

اسی مہینے مفتی ممالک محروسہ صدر جہاں کو ہزاری منصب عطا ہوا اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مریدان خاص میں شامل ہوگیا۔ ہزاری کا منصب اسی مریدی کا معاوضہ تھا۔ مرید ہونے کے بعد اس نے پوچھا: ''میری داڑھی کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے؟'' بادشاہ نے کہا رہنے دو! اس عرصے میں جو لوگ بادشاہی مرید بنے ان میں سے ایک تو ملا تقی شوستری ہے جو اپنے آپ کو ''اعلم العلما'' سمجھے ہوئے ہے۔ آج کل وہ حسب الحکم شاہنامے کو نثر میں لکھ رہا ہے۔ اپنی تحریر میں جہاں بھی آفتاب کا نام آتا ہے وہ اس کے ساتھ جلت عظمتہ، و عز شانہ، یا اس جیسا کوئی اور کلمہ ضرور لکھ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ زادہ گوسالہ خام نامی بنارسی، ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور صوفی احمد مطرب مسند صاد دہلوی جو خود کو حضرت غوث الثقلین کی اولاد میں سے بتاتا ہے، مرید بنائے گئے۔ ان سب لوگوں نے ''مراتب اخلاص چہار گانہ'' کو قبول کرلیا اور ایک صدی سے پانصدی تک کا منصب حاصل کرلیا۔ بڑی عقیدت سے داڑھی منڈوا ڈالی ان کی تاریخ ''موتراش چند'' سے نکلتی ہے۔

ان نو مریدوں کا حال بس ایسا ہی تھا کہ: ''ایک ہندو مسلمان ہوگیا، اس خوشی میں لوگوں نے اسے ایک سرخ شال اوڑھا دی۔ سرخ دوشالہ اوڑھ کر اس نے اپنے لوگوں کی طرف بڑے فخر و شان سے دیکھا۔ ان لوگوں نے کہا: ''احمق یہ کپڑا تو کل پرانا ہو کر پھٹ جائے گا اور یہ مسلمانی ہمیشہ کے لیے تیری گردن کا ہار بن جائے گی''۔

صوفی احمد مطرب

یہ صوفی احمد وہی شخص ہے جو اپنے آپ کو شیخ احمد جعفری مصریؒ کا مرید، بلکہ خلیفہ کامل بتا کر

کہا کرتا تھا کہ: ”میں اس مرشد زمان کے اشارے سے دیار ہند میں آیا ہوں۔ میرے مرشد نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندستان کے بادشاہ سے لغزش ہوگئی ہے تو وہاں جا کر اس کی مدد کرے گا اور اسے ہلاکت سے بچالے گا“، اب یہ معاملہ ہی برعکس ہوگیا کہ شکاری خود شکار کے پھندے میں پھنس گیا۔

لاف زن جولاہہ ای گفت من بس ماہرم　　شاید ار سازند فردا بہر جورم حلہ باف
آن شنیدہ ستی کہ بادی جولہ دیگر چہ گفت　　کای برادر چند لاف اول بباف آنگہ بلاف

گوسالہ بناری کا معاشقہ

گوسالہ بناری نے شیخ ابوالفضل کے پاس بڑی رسائی پیدا کرلی اور مکاری و چاپلوسی سے کام لے کر بنارس کا کروڑی بن گیا۔ وہاں اس نے خوب کھیل کھیلے اور بنارس کی ایک طوائف سے عشق بازی شروع کردی۔ ملا احمد صوفی مذکور بھی اسی طوائف پر عاشق تھا، بناری نے احمد کو کافی روپیہ دے کر درمیان سے ہٹا دیا اور اپنا ایک نگران اس طوائف کے دروازے پر مقرر کر دیا۔ طوائفوں کے داروغہ نے یہ سارا حال بادشاہ کے پاس لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے ایک محفل نوروزی میں احمد سنگی اور ملا شاہ محمد کی دوصدی جاگیر جو پہاڑ کے دامن میں تھی اور اس پر دونوں کا مشترکہ قبضہ تھا۔ چھین لی اور بناری کو بنارس سے بلالیا۔

ملک الشعراء فیضی کا انتقال

ملک الشعراء شیخ فیضی کئی بیماریوں جیسے ضیق النفس، استسقاء، ورم، خونی قے وغیرہ میں مبتلا ہوگیا تھا، 6 مہینے تک وہ مرض کی سختیاں برداشت کرتا رہا، آخر 10 صفر 1004ھ/1595ء کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑی انسیت تھی اور رات دن ان کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا متعصب حامی تھا، چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بیہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس

کی تاریخ وفات ہے:

"دی فلسفی وشیعی وطبیعی و دہری"

ایک دوسری تاریخ ہے "قاعدۂ الحاد شکست"۔ ایک شناسا نے یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ فلک چہ مایہ نیرنگی کرد
مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمی درو می گنجید
تا نیم دمی بر آورد تنگی کرد

نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں سے تھام کر آوازیں دیں کہ: "شیخ جیو، ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے ہو؟" وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرادی آخر بادشاہ شیخ ابو الفضل کو تسلی اور دلاسہ دے کر لوٹ گئے۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہو گیا۔

حکیم ہمام کی وفات

فیضی کے انتقال سے چند دن بعد ہی 6 ربیع الاول 1004ھ/ 1595ء کو حکیم ہمام بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ 7 ربیع الاول کو کمالائی صدر کا انتقال ہوا۔ ان دونوں کا مال و اسباب اسی وقت ضبط کر لیا گیا اور وہ دونوں کفن کے کپڑے تک کو محتاج ہو گئے۔

خاتمہ

یہ دور اکبر بادشاہ کے دور حکومت کے واقعات جو میں نے بیان کیے ہیں وہ ماہ صفر 1004ھ/1595ء یعنی اکبر بادشاہ کے دور حکومت کے چالیس سالہ دور حکومت پر مبنی ہیں۔ میں نے اپنی جانکاری اور اپنے طور پر یہ سارے حالات ٹھیک طور پر بیان کر دیے ہیں۔ بعض سنین کے اندراج میں جو تقدیم و تاخیر، تحریف اور تغیر ہو گیا ہے، اس کا میں ذمے دار

نہیں ہوں بلکہ اس کی ساری ذمے داری اس ماخذ یعنی تاریخ نظامی پر ہے جس سے میں نے یہ منتخب مرتب کی ہے۔ اگر جیتا رہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو انشاء اللہ آنے والے حالات کا بھی میں انتخاب کر جاؤں گا ورنہ جس شخص کو بھی میسر ہو وہ ان حالات کی ترتیب وتسوید کا فرض انجام دے کہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری رہی ہے:

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

☆☆☆

حواشی

جلوس اکبری جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے "میرے والد نے چودہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ بیرم خان نے اس صوبہ کے امیروں کو جمع کر کے نیک ساعت میں مضافات لاہور پرگنہ کلانور میں تخت سلطنت پر بٹھایا تھا"۔ یہ غلطی شاید کاتب سے سرزد ہوئی ہے کیونکہ ہمایوں 7 ربیع الاول کو بالا خانے سے گرا تھا اور 15 ربیع الاول کو اس کی وفات ہوئی۔ اس صورت میں دوسری ربیع الاول کو اکبر کس طرح تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ غلطی طبقات اکبری، مطبوعہ نولکشور، ص 242 میں بھی ہے جہاں دوم ربیع الاول تحریر ہے۔ نظام الدین ہروی نے دوسری جگہ تخت نشینی کے جشن کی تاریخ 2 ربیع الثانی لکھی ہے، اس لیے ایک خیال یہ ہے کہ یہی تاریخ صحیح ہوگی۔ مآثر رحیمی کے مصنف نے "دوپہر کا وقت جمعہ کا دن 7 ربیع الثانی 963ھ لکھا ہے (ص 645) دوسرے بیانات سے مآثر رحیمی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے، اس لیے اکبر کی تاریخ جلوس 2 ربیع الاول کے بجائے 7 ربیع الثانی یا زیادہ سے زیادہ 2 ربیع الثانی قرین قیاس ہے۔

میر عبداللطیف قزوینی۔ یہ اعاظم سادات حسینی سیفی میں سے تھے والد کا نام قاضی میر یحییٰ تھا۔ میر علاء الدولہ صاحب تذکرہ ان کا بھائی ہے۔ قزوینی شاہ طہماسپ صفوی کے مخالف تھے اس لیے بادشاہ نے ان پر سختی کی اور وہ بھاگ کر گیلان کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ جب ہمایوں ایران پہنچا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ 963ھ/1555ء میں ہندوستان آ کر اکبر سے متعلق ہو گئے۔ 5 رجب 981ھ/1573ء کو فتح پور سیکری میں انتقال کیا۔ قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ

سلطار کی درگاہ میں ان کی قبر ہے۔ بحوالہ (مآثر الامراء، ذخیرۃ الخوانین)

بیرم خان کے زوال میں ماہم انکہ، شہاب الدین احمد خان کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

منتخب اللباب، جلد سوم، ص 83 میں لکھا ہے کہ پیر محمد خان دکن کا رہنے والا تھا وہ وہاں تین چار سال کسی جرم میں قید کی سزا کاٹ کر بیرم خان کے پاس چلا گیا تھا۔ بیرم خان نے سب سے پہلے اسے اپنے کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا تھا۔

بیرم خان کی شکست کے نتیجے کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ اکبری اور جہانگیری دور کے مصنفوں نے بیرم خان کی شکست ہی لکھی ہے، لیکن خافی خان نے لکھا ہے، ان مورخوں نے مغل بادشاہ کی رعایت سے اصل واقعہ پر پردہ ڈال دیا ہے ورنہ حقیقت میں شکست خان اعظم شمس الدین انکہ کو ہوئی تھی اور بیرم خان مظفر و منصور ہوا تھا۔ (منتخب اللباب، جلد سوم، ص 149، چاپ کلکتہ)

میں نے جس نسخہ کو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا ہے اس کے اصلی متن میں "چیالی" لکھا ہے جب کہ صحیح لفظ "پنیالی" ہے۔

اکبر نے بوڑھے بیرم خان کے سامنے تین صورتیں رکھی تھی۔

(i) حکومت کی تمنا ہو تو چندیری اور کالپی عطا کر دیا جاتا ہے۔

(ii) مصاحبت منظور ہو سابقہ اعزاز و احترام کے ساتھ ہمارے ہمراہ رہو۔

(iii) حج کا ارادہ ہو تو سفر کا بندوبست کر دیا جائے۔

بیرم خاں نے تیسری صورت قبول کی۔

محمد بیرم خان ترکمان۔ بیرم خاں کے آباؤ اجداد کا تعلق ایران کے "قرہ قوینلو" نامی ایک ترکمان قبیلے سے تھا اس قبیلے کا ایک سردار علی شکر بیگ ترکمان تیموری خاندان سے وابستہ تھا۔ علی شکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ترکمان گزرا ہے۔ یہ مرزا سلطان حسین حاکم ہرات سے لڑتے ہوئے مارا گیا، اس کا بڑا لڑکا یار علی بیگ قندز کی فتح کے بعد بابر کی ملازمت میں آگیا۔ بابر نے اسے غزنی کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا سیف علی بیگ حاکم ہوا۔ یہی سیف علی بیگ بیرم خان کا باپ تھا۔ بیرم خان بدخشاں میں پیدا ہوا۔ باپ کے مرنے پر بلخ میں جاکر تعلیم حاصل کرتا رہا، جب وہ 16 سال کا ہوا تو ہمایوں کی ملازمت اختیار کر لی، تیموری خاندان سے اس کا ننھیالی

رشتہ بھی تھا۔ (بحوالہ اکبر نامہ مؤلف ابو الفضل، جلد دوم، ص 8) بیرم علم کا قدر داں، فن موسیقی کا رسیا، خلیق، خاکسار اور منکسر المزاج تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا اور انھوں نے دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ بیرم خان نہایت صاحب ذوق اور سخن شناس تھا، اکثر اساتذہ کے کلام پر اس نے تنقید و اصلاح کی ہے اس کے ساتھ ہی وہ نہایت شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع بھی تھا۔ میدان جنگ میں ایک ماہر جرنیل بہادر سپاہی تھا تو مسند وزارت پر مدبر سیاست داں اور منتظم حاکم تھا۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کا بھی دور دور تک شہرہ تھا۔ اکبر نے 965ھ/ 1557ء میں جالندھر میں سلطان بیگم کو بیرم خان کے عقد میں دیا تھا۔ سلیمہ ہمایوں کی بھانجی تھی۔ (بحوالہ توزک جہانگیری، ص 114، جہانگیر نامہ کشوری، ص 66، مآثر الامراء، جلد اول، ص 376) بیرم کی وفات پر اکبر بادشاہ نے اس سے شادی کر لی تھی۔ (بحوالہ مآثر الامراء، جلد دوم، ص 377، منتخب اللباب، جلد دوم، ص 151، جہانگیر نامہ، ص 66)۔

ان عورتوں میں جو باز بہادر کے حرم میں تھیں روپ متی بھی شامل تھی۔ اکبر جب خود تحقیقات کے لیے پہنچا تو اسے دو قیدی عورتوں کی فریاد پہنچی کہ ادھم خاں نے ان کی آبرو ریزی کی ہے۔ اس نے ان عورتوں کو کیمپ میں بلا لیا، لیکن ماہم انگہ نے اپنے بیٹے کے جرم کو چھپانے کے لیے ان مظلوم عورتوں کو قتل کرا دیا۔

- جب اکبر ادھم خاں کی تحقیقات کے لیے چلا تو ماہم انگہ نے ایک قاصد کو اس کی خبر دینے کے لیے بھیجا تھا، لیکن اکبر اس سے پہلے سارنگ پور پہنچ گیا۔ ماہم انگہ بھی دوسرے دن وہاں پہنچ گئی اور مال غنیمت پر قبضہ کر کے ادھم خاں کے معاملہ کو دبا دیا۔
- ادھم خاں کی ہلاکت: دوسری تاریخوں کی روشنی میں یہ حوالے ملتے ہیں کہ ادھم خاں کو خود اکبر نے گھونسہ مار کر نیچے گرا دیا تھا اور خود ہی جا کر ماہم انگہ کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ ''ماہم ہم نے تیرے لڑکے کو قتل کرا دیا ہے''۔ جب وہ مری ہے تو اکبر نے اپنی دایہ کے جنازہ کو کندھا دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے اکبر آباد میں ایک ہی جگہ دفن ہیں۔
- ماہم انگہ: تاریخ کی دوسری کتابوں میں ماہم انگہ کی جگہ پر ماہم اناقہ بھی لکھا ہے۔ ماہم انگہ ہمایوں کے ایک وفادار ملازم ندیم خاں کی بیوی تھی یہ وہ عورت ہے جس نے اکبر کی تربیت اور پرورش کی تھی اور اکبر کے ساتھ بیٹوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ ادھم خاں اسی کا لڑکا تھا۔ باچ یہ لکھتا ہے: ''اس کی ذات میں کوئی خوبی نہیں تھی نہ عقلمند اور نہ ہی ہوشیار تھی۔ اکبر کی دایہ ہونے کی

وجہ سے اس کو اقتدار مل گیا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم اکبر کی حقیقی ماں سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ابتدائی عہد میں ماہم انگہ کچھ معنوں میں سلطنت کی وزیر اعظم بنی ہوئی تھی، اس کے اشارہ پر بیرم خاں کے مقابلے میں منعم خاں کو آگے لایا گیا تھا۔ اکبر نے عرصہ تک ماہم کے اثر و اقتدار میں بسر کیے۔ جب اس کی عمر ۱۹ سال کی ہوئی تو اس نے اسے اور اس کے بیٹے کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ ایرانی مورخ انکہ کے لیے اچھے خیال نہیں رکھتا مگر ابوالفضل نے اسے پاک بازی کا گنبد لکھا ہے۔

۵۔ جوجک بیگم: ان کا پورا نام ماہ جوجک بیگم تھا۔ کہتے ہیں یہ کوئی خاندانی عورت نہ تھی۔ جب 1546ء میں حمیدہ بانو بیگم قندھار سے کابل چلی گئی، ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ جب اس کے بطن سے ہمایوں کا دوسرا لڑکا مرزا محمد حکیم پیدا ہوا تو اسے ہمایوں نے بیگم کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہوشیار اور بہادر عورت تھی۔ اس نے جس طرح کابل پر قبضہ رکھا اور بڑے بڑے امیروں پر قابو پایا یہ اس کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

۱۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی: یہ شیخ محمد بن عارف چشتی کے مرید تھے۔ ان کی ایک کتاب 'انوار العیون" ہے۔ صاحب معارج الولایت نے ان کو ولی "مادرزاد" لکھا ہے۔ ان کے پوتے عبدالنبی نے اپنے باپ کے رسالہ "اباحت سماع" سے اختلاف کر کے سماع کے خلاف بڑا مدلل رسالہ لکھا تھا۔ یہ وہ عبدالنبی ہے جن کو اکبر نے صدر الصدور بنایا تھا۔ عبدالنبی کو آخر میں اکبر نے ناراض ہو کر قید کر دیا، جس میں وہ 992ھ/ 1574ء میں فوت ہو گیا۔ شیخ عبدالقدوس کی وفات 945ھ/ 1538ء میں ہوئی تھی۔ گنگوہ کے مقام پر آپ کا مزار مبارک ہے۔

۔ ہاتھی کا شکار: ہاتھی کے شکار کے مختلف طریقے تھے۔ ایک طریقہ "کھیدہ" کہلاتا تھا۔ اس میں سوار اور پیادہ ہو کر شکار کھیلتے تھے۔ یہ شکار عموماً گرمی کے موسم میں کیا جاتا تھا۔ ڈھول اور نقارہ بجا کر ہاتھی کو بدحواس کر دیا جاتا تھا اور اسے اس قدر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ تھک جاتا تھا اور کسی درخت کے سایہ میں سستانے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ شکاری موٹے رسی سے اس کی گردن اور پاؤں کو درخت سے باندھ دیتے، پھر پالتو ہاتھی کے ذریعے اسے مانوس کیا جاتا۔ ایک اور طریقہ "چور کھیدہ" تھا۔ پالتو ہاتھی کو جنگلی ہاتھیوں کی چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور مہاوت اس پر اس طرح لیٹ جاتا تھا کہ دکھائی نہ دے۔ جب ہاتھیوں کے غول میں داخل ہوتا تو مہاوت کسی ہاتھی پر کمند پھینک کر اسے بس میں کر لیتا اور اپنے ہاتھی سمیت نکال لاتا۔ ایک اور طریقہ "گاڑ" "بار" اور بہت سارے

دوسرے طریقے بھی تھے۔

آگرہ کا قلعہ: قلعے کی عمارت لال پتھر کی ہے جس کے چاروں طرف خندق ہے۔ فصیل 70 فٹ بلند ہے۔ قلعے کا دور دو میل ہوگا۔ قلعے میں شاہی محل سرا، دیوان عام، دیوان خاص، مثمن برج، انگوری باغ، حوض، شیش محل مشہور عمارتیں ہیں۔ ان میں شاہ جہاں کی بنائی ہوئی مسجد نہایت خوبصورت ہے۔ یہ مسجد 1058ھ 1648ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ ہنٹر نے لکھا ہے "یہ مسجد دنیا کے تمام مسجدوں میں سب سے زیادہ نفیس ہے۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے "ایک پرانا قلعہ تھا میرے باپ نے میری پیدائش سے پہلے اس کو گرا کر نیا قلعہ لال پتھر سے بنوایا کہ سیاح اس جیسا قلعہ اور نہیں بتاتے۔ یہ قلعہ پندرہ سولہ سال میں مکمل ہوا۔ اس میں چار دروازے اور دو کھڑکیاں ہیں۔ اس کی تعمیر میں 35 لاکھ روپے جو ایران کے مروجہ ایک سو پندرہ تومان اور توران کے ایک کروڑ پانچ لاکھ "خانی" کے مساوی ہے خرچ ہوا ہے۔

بنگال پر شیر شاہ کے وقت سے پٹھانوں کی حکمرانی چلی آرہی تھی۔ یہ بادشاہ برائے نام دہلی کے ماتحت تھے۔ عدلی شاہ کے زمانہ میں کرانی افغانوں میں سے چند امیر اور سردار دربار سے ناراض ہوکر بنگال چلے گئے اور وہاں خود مختار حکومت بنالی۔ ان کا سردار تاج خاں تھا۔ سلیمان کرانی اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے کٹک، بنارس، جگناتھ، کامروپ اور اڑیسہ تک کے علاقے فتح کیے۔ اس کی زندگی تک اکبر نے بنگال کا رخ نہیں کیا۔ یہ نہایت بہادر، منتظم اور دیندار حکمراں تھا۔ ڈیڑھ سو عالم اور مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ وہ تفسیر، حدیث، نماز، روزہ کا شائق اور اوقات کا پابند تھا۔ اس کے بعد پٹھانوں میں خانہ جنگی اور سازشیں شروع ہوگئیں اور بنگال سے مغلوں کا اثر و رسوخ جاتا رہا۔

میر مرتضیٰ شریفی: یہ حضرت علامہ میر شریف جرجان کے خاندان سے تھے۔

فریدون خاں: مرزا حکیم کا ماموں تھا۔

قلعہ بھکر: ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے: قدیم زمانہ میں قلعہ بھکر کا نام "منصورہ" تھا۔ ابوالفضل کی تائید مشہور مورخ "ابوالفدا" بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "منصورہ" وہ شہر ہے جو دریائے سندھ کی ایک شاخ سے جزیرہ کی مانند گھرا ہوا ہے۔ یہ اشارہ غالباً اسی مقام کی طرف ہے جہاں پانچ ندیاں دریائے سندھ سے مل کر بہتی تھیں۔ اس زمانہ میں ملتان سے منصورہ کا فاصلہ بارہ پڑاؤ سمجھا جاتا تھا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ شہر بھکر کو ایک مالدار عرب عمر بن حفص نے بسایا تھا اور

خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور بن عباس کے نام پر منصورہ نام رکھا تھا۔ مذکورہ قلعہ میں ایک مقام پر "مقیاس الماء" یا "پیمانہ آب" بنا ہوا ہے۔ یہ بھی غالباً عرب فاتحین کا نصب کردہ ہے۔ اس سے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روزانہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دریائے نیل میں بھی اسی طرح کا "مقیاس الماء" یا "پیمانہ آب" لگا ہوا ہے جس کا ذکر ناصر خسرو (چوتھی صدی ہجری) اور ابن بطوطہ (ساتویں صدی ہجری) جیسے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔

2۔ رانا اودے سنگھ کا تعلق میواڑ کے راجہ خاندان سے ہے۔ یہ راجہ اپنا سلسلہ نوشیروان سے ملاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں 8 جلوس کے حالات میں رانا امر سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "رانا ہندوستان کے معتبر راجاؤں میں سے ہے۔ اس ملک کے تمام رائے راجا اس کے آباؤ اجداد کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے۔ ایک مدت سے سلطنت اس کے خاندان کے ہاتھ میں چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ عرصہ تک مشرقی علاقے کے حکمراں رہے۔ پھر دکن کی طرف رخ کیا اور وہاں کی اکثر ریاستیں فتح کرلیں۔ اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کرلیا۔ پھر میوات کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر چتوڑ کے قلعہ کو فتح کرلیا۔ اس وقت سے آج تک میرے جلوس کا آٹھواں سال ہے، 1271 سال ہوتے ہیں۔ اس 1010 سال کے عرصے میں اس خاندان کے 26 فرمانروا راول کے لقب سے مشہور ہوئے اور راول سے رانا امر سنگھ تک کہ اب رانا ہے۔ 460 سال میں 26 رانا فرمانروا ہوئے"۔ (جلوس 8، توزک جہانگیری)

اس خاندان کا مشہور راجہ سنگرام، رانا سانگا تھا۔ مارواڑ، جودھپور، اجمیر سے لے کر رام پور اور الور تک کے راجہ اس کے باج گزار تھے۔ اس کی حکومت بیانہ سے دریائے سندھ، مالوہ سے میواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ بابر نے اپنی توزک میں یوں لکھا ہے۔ "جب میں کابل میں تھا تو رانا نے دوستی کے خطوط لکھے اور یہ کہلوایا کہ آپ دلی پر حملہ کریں میں آگرہ پر حملہ کروں گا۔ لیکن جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور آگرہ بھی فتح کرلیا تو اس نے میری بات تک نہ پوچھی بلکہ کچھ ہی دن بعد کندبار کا محاصرہ کرلیا"۔

رانا سانگا کے بعد اس کے جانشین کمزور نکلے۔ یہاں تک کہ اکبر نے اودے سنگھ کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اودے سنگھ نے بھیل قبیلے میں پناہ لی اور دشوار گھاٹیوں میں ایک شہر اودے پور آباد کیا۔ وہاں گھاٹیوں میں بندھ باندھ کر ایک جھیل بھی بنائی جو اب بھی اودے ساگر کے نام سے مشہور ہے۔ 42 سال بعد جب وہ مرا تو اس کا بیٹا پرتاپ جانشین ہوا۔ یہ نسبتاً باپ کے زیادہ جری ر

حکم راجہ تھا۔

22۔ چترانگ نامی ایک راجہ نے اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر یہ چتراکوٹ کہلایا۔ آخر بگڑ کر چتوڑ ہو گیا۔ راجپوتوں کی مشہور ریاست اودے پور کا یہ سولہویں صدی عیسوی تک پایہ تخت رہا۔ اس قلعہ کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ یہاں کے راجپوتوں نے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے بڑی خونریز لڑائیاں اس جگہ لڑی تھیں۔ مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے اس کو فتح کیا تھا۔ خلجی کے بعد سلطان محمد تغلق نے اور ایک مرتبہ بہادر شاہ والی گجرات نے اس قلعہ کو فتح کیا تھا۔ آخر میں اکبر نے اس پر قبضہ کر کے راجپوتوں کی کمر توڑ دی۔ اکبر کے وقت یہاں کا حکمراں رانا اودے سنگھ تھا۔

23۔ یہ خاتون راجہ بھارا مل کی بیٹی تھی جو راجہ مان سنگھ کی پھوپھی ہے اور یہی جہانگیر کی ماں ہے۔

24۔ اس وقت اکبر کی عمر 27-28 سال کی تھی شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک کے کہنے پر اکبر شیخ سلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کرائی تھی۔

25۔ اس عمارت کا نام رنگ محل تھا۔ اسے اکبر نے شیخ سلیم کے مکان سے متصل مستورات کی قیام گاہ کے لیے بنوایا تھا۔ اسی محل میں شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا۔ بدایونی نے اس کی پیدائش شیخ کے اصل مکان میں بتائی ہے لیکن اکبر نامہ اور مآثر الامرا میں وضاحت سے اس محل کا ذکر کیا گیا ہے۔

26۔ سیکری کے پہاڑ کا نام کوہ اربلی ہے۔ اس کی ایک شاخ کے دامن میں فتح پور آباد ہے۔ سیکری کی آبادی شیخ سلیم اور ان کے مریدوں کے مکانوں سے شروع ہوئی تھی۔ جس غار میں وہ ریاضت کرتے تھے وہ مسجد سنگ تراش میں اب بھی موجود ہے۔ پہلے اس کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا۔ اسی جگہ رانا سانگا کو بابر نے شکست دی تھی۔ اسی فتح کی یاد میں یہ نام تجویز ہوا تھا۔ بعد میں یہ شہر فتح پور کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جہانگیر اپنی تزک میں یوں لکھتا ہے "شہر 14-15 برس کی مدت میں آباد ہوا"۔ لیکن وہ اس نام کی وجہ تسمیہ گجرات کی فتح لکھتا ہے۔

27۔ شیخ سلیم چشتی بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ والد کا نام شیخ بہاؤ الدین تھا۔ آپ کے پردادا شیخ سلیمان پٹن سے لدھیانہ میں آ کر رہنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد 14 سال کی عمر میں آپ اپنے بھائی شیخ موسیٰ سے اجازت لے کر سرہند گئے اور وہاں شیخ مجد الدین سے علم حاصل کیا، وہاں سے عالم اسلام کی سیاحت اور حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ تیس سال تک عرب، ایران اور مصر کے اکثر شہروں کی سیاحت کی۔ اس عرصہ میں 14 حج کیے۔ بصرہ میں خواجہ ابراہیم

عرب سے خرقہ حاصل کیا اور شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سرہند کے قریب بیدآلی میں ڈھائی سال قیام کیا پھر 1533ء میں سیکری تشریف لائے۔ 1554ء میں بحری راستے سے دوسرا حج کیا اور آٹھ سال حرمین شریفین میں مقیم رہے۔ 1563ء میں ہندوستان واپس آئے۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں آپ کا بڑا اعزاز تھا۔ آپ نے 1563ء میں فتح پور میں خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہی خانقاہ شہر فتح پور کی آبادی کا باعث ہوئی۔ آپ کا انتقال جمعرات، 29 رمضان، 979ھ/ 1571ء کو ہوا۔

28۔ شیخ کے مکان میں شمالی دالان کا نام مجلسی دالان تھا۔ یہ انکی نشست گاہ تھی۔ اسی دالان کی چھت پر ایک چھوٹا کمرہ منذف نام کا ہے یہ شیخ کی چلہ گاہ تھی۔ کہتے ہیں اسی میں سلیم پیدا ہوا۔ دوسرے بیان کے مطابق مکان سے قریب اکبر نے ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ اس میں سلیم اور دانیال دونوں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ مآثر الامراء، جلد دوم، ص 570، اکبر نامہ، ص 267)

29۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ''یہ حسینی حسنی سادات ہیں۔ باپ کا نام غیاث الدین حسن تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر میں ہرون میں جو نیشاپور کے علاقے میں ہے، خواجہ عثمان چشتیؒ کی خدمت میں پہنچے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی فیض اٹھایا۔ جس سال معز الدین سام نے دہلی کو فتح کیا تھا وہ ہندوستان آئے۔ گوشہ نشینی کی خاطر اجمیر پہنچے اور وہاں دین کا چراغ جلایا۔ ہفتہ کے دن 6 رجب 633ھ/ 1235ء میں آپ کا وصال ہوا۔

جہانگیر نے اپنی توزک میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے متعلق یوں لکھا ہے: ''آپ کا مولد شریف سیستان ہے۔ پہلے بخارا گئے اور علوم ظاہری کی تحصیل کی پھر خراسان آئے پھر قصبۂ ھروان (ہارون) میں شیخ عثمان ہارونیؒ کے مرید ہوئے اور ان کے حکم سے ہمیشہ وہ سفر میں رہتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم ادھمؒ سے ملتا ہے۔ خواجہ قطب الدین اندجانیؒ آپ کے مرید تھے۔ ان کے مرید شیخ فریدالدین شکر گنج ہیں اور ان کے مرید شیخ نظام الدین اولیاءؒ ہیں''۔

30۔ شاہ مدار۔ ان کا لقب بدیع الدین تھا۔ یہ شیخ محمد طیفوری بسطامی کے مرید تھے۔ ہمیشہ خلوت میں رہتے تھے۔ ہر جمعہ کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب لوگ جمع ہوجاتے تو وہ کوئی نہ کوئی داستان سناتے۔ اس داستان میں ہر شخص کو اپنی مراد اور سوال کا جواب مل جاتا۔ انہی سے ''سلسلہ مداریہ'' کے لوگ منسوب رہے ہیں۔ ان کا مزار مکن پور میں ہے۔ ان بزرگ کا زمانہ شیر شاہ کے بعد کا

ہے۔ سلطان ابراہیم شرقی جونپور کے زمانہ میں قاضی شہاب الدین نے ان سے مباحثہ و مجادلہ کیا تھا اور نتیجہ میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ (بحوالہ آئین اکبری، ابوالفضل، دفتر سوم، ص 173)

31۔ ایک درخت کا نام ہے جو ندی کے کنارے ہوتا ہے، اسے عرب میں "طرفا" اور ہندوستان میں "جھاؤ" کہتے ہیں۔

32۔ مصنف نے "افواہ عام" کا لفظ لکھا ہے وضاحت نہیں کی۔ جاہل لوگ کہا کرتے ہیں "فرشتوں سے بھی غلطی ہوجاتی ہے"۔ غالباً اسی طرف صاحب تصنیف کا اشارہ ہے۔

33۔ جنگ کے موقعے پر ہندوستان میں استعمال ہونے والا ایک مشہور ہتھیار۔

34۔ احمد آباد، یہ شہر دریائے سابرمتی کے کنارے واقع ہے۔ 810ھ/ 1407ء میں احمد شاہ والی گجرات نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ احمد شاہ اور محمود شاہ بیگڑہ کے دور میں شہر نے بڑی ترقی کی۔ گجرات کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے یہ دہلی کے بعد دوسرے درجہ کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں اور مقبرے تھے۔ اکبر کے عہد میں احمد آباد صنعت اور تجارت میں بڑی رونق پر تھا۔

35۔ راجہ بیربر: ان کا اصل نام مہیش داس اور برہمداس دونوں ملتا ہے۔ اس کا باپ کالیداس مادھورام جو بھٹ فرقے کا برہمن تھا۔ بیربر کا ایک بھائی سوہن رائے چھوٹی عمر میں گنگا میں ڈوب کر مر گیا تھا، دوسرا بھائی گنگا رائے سادھو بن کر نیپال کے جنگلوں میں چلا گیا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں باپ کا بھی انتقال ہوگیا اور وہ بڑی غربت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حسن اتفاق سے راجہ کالنجر کے ایک درباری مہاکنگی کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگئی۔ جہیز میں کافی مال و دولت ملا اور بیربر کے دن پھر گئے۔ اسی رشتہ کی بنا پر اس کی مہاراجہ کالنجر کے دربار میں رسائی ہوگئی اور وہ "اشلوک" سنانے اور گیت پڑھنے پر مامور ہوگئے۔ اکبر کے دربار میں پہنچنے کے بعد اس کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بیربر اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا اور اس کا لقب "مصاحب دانشور" تھا۔ راگ راگنی میں بھی بڑی مہارت تھی۔ جب پشاور کے مغرب عدم آباد کے پٹھانوں کے خلاف مہم بھیجی گئی تو بیربر بھی اس مہم کے ساتھ گیا اور اپنی بے تدبیری کی وجہ سے ان گھاٹیوں میں مارا گیا۔ اکبر کو اس کی موت کا بڑا رنج ہوا۔ بیربر کی وفات 993ھ/ 1585ء میں ہوئی۔ اکبرنامہ اور اقبال نامہ جہانگیری میں اس کے دو لڑکوں کے نام ملتے ہیں۔ ایک ہرہر رائے تھا جو خدمت شاہی میں رہتا تھا اور 1011ھ/ 1602ء میں وہ شہزادہ دانیال کی خدمت میں آگیا۔ شہزادہ دانیال اسے "بیربر ثانی" کہا کرتا تھا۔

اس کے بڑے بیٹے کا نام لالہ تھا۔ 1010ھ / 1601ء میں ملازمت چھوڑ کر گنگا کے کنارے وہ سادھو بن گیا۔ لوگوں میں بیربر اور ملا دو پیازہ کے لطیفے بڑے مشہور ہیں مگر میرے خیال میں سب فرضی ہیں۔

36۔ طوطی نامہ: اس کے سنسکرت ماخذ کا نام شک ستتی یعنی طوطے کی ستر کہانیاں ہے۔ اس کا مؤلف ایک برہمن چنتامنی بھٹ ہے جس نے پورن بھدر کے پنچ تنتر سے عورتوں کی بدچلنی کی کہانیاں لے کر کسی پرانی شک ستتی کی مدد سے یہ کتاب لکھی۔

37۔ سنگھاسن بتیسی یہ سنسکرت کی قدیم داستان ہے اس کا ہیرو راجا بکرماجیت ہے جس کے نام سے ہندوؤں کا بکرمی سن منسوب ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں بکرماجیت کے تخت پر راجہ بھوج نے مداخلت کی تھی۔ جب بھوج نے بکرماجیت کا سنگھاسن جو 32 پتلیوں کے سروں پر کھڑا ہوا تھا ایک کھنڈر سے نکالا اور اس پر جلوس کرنا چاہا تو ایک پتلی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس نے ایک داستان سنائی اس طرح پوری 32 پتلیاں 32 داستانیں سناتی ہیں۔ جو سب کی سب راجہ بکرماجیت سے متعلق ہیں۔ انہی داستانوں کا مجموعہ یہ کتاب ہے اور اس کتاب کا سنسکرت میں نام "وکرم چرتر" اور سنہاسن وترلی" ہے اور اس کے مصنف کے متعلق کافی اختلاف ہے۔

38۔ خواجہ امینا: ان کا پورا نام خواجہ امین الدین ترقی تھا۔ تربت خراسان کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں کے ایران کے سفر میں خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیرم خان کے معتمد خاص تھے، خواجہ جہان کا خطاب اکبر نے انھیں عطا کیا تھا۔

39۔ منتخب التواریخ کے تصنیف کے وقت تک۔

40۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

41۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

42۔ اکبر کے زمانے میں سب سے پہلے کل ممالک محروسہ کی پیمائش کرائی گئی۔ البتہ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں بندوبست اور مالگذاری کا ایک ضابطہ محاصل ضرور مرتب ہوا تھا۔ ناپنے کے لیے جو جریب استعمال ہوتی تھی وہ پہلے رسی کی تھی۔ اس کے بعد بانس میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریب بنائی گئی۔ پہلے لمبائی 50 گز کا تھا اس کے بجائے 60 گز کا طول مقرر کیا گیا۔ کروڑیوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے مالگذاری کا یہ بندوبست ناکام رہا، لوگ اس قدر اس سے تنگ تھے کہ گھر گھر اس پیمائش اور کروڑیوں کا رونا تھا۔

43۔ آئین داغ: یہ ترکوں کی قدیم رسم ہے۔ پہلے صرف بادشاہ کی ملکیت کے اظہار کے لیے گھوڑوں پر نشان لگا دیا جاتا تھا۔ بہار کے موسم میں داغ کا جشن منعقد ہوتا تھا، بعد کے وقتوں میں یہ فوج میں بھرتی کا قانون بن گیا۔ ہندوستان میں علاؤ الدین خلجی نے گھوڑوں کی حاضری اور شمار کے لیے داغ کا قانون سب سے پہلے رائج کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے جاگیرداری کا طریقہ اختیار کیا اور داغ موقوف ہو گیا۔ شیر شاہ نے دوبارہ آئین داغ کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اکبر نے ہی اس کو تازہ کیا۔

44۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

45۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

46۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

47۔ جزیہ: اکبر سے پہلے بھی غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا قاعدہ تھا جو کبھی کبھی موقوف بھی ہو جاتا تھا۔ جزیہ کی معافی کا سن 987ھ ہے۔ اکبر کا ہندوؤں سے وہ معاملہ نہیں تھا جو پہلے سلاطین کا رہا تھا وہ انھیں اپنائے رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ چنانچہ جلوس کے پہلے سال ہی اس نے جزیہ معاف کر دینا چاہا تھا۔ 9 سنہ جلوس میں دوبارہ جب یہ معاملہ سامنے آیا تو علما کی مخالفت کی وجہ سے اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جا سکا۔ لیکن عملاً اکثر مقامات پر جزیہ موقوف ہو گیا۔ 983ھ میں اکبر نے دوبارہ جزیہ لگانے کا حکم دیا۔ لیکن جلد ہی منسوخ کر دیا گیا۔ آخر 25 سنہ جلوس 988ھ میں اکبر نے مستقلاً جزیہ کے معافی کا حکم جاری کیا تھا۔

48۔ اہل فرنگ سب سے پہلے اکبر کے دربار میں 979ھ/ 1571ء میں حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کر کے سورت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اکبر نے جب اس کا محاصرہ کر لیا تو اس نے اپنی مدد کے لیے اہل فرنگ کو بلایا تھا۔ یہ اس کی مدد کو آئے تھے اندر ہی اندر قلعہ پر قبضہ کر لینے کے منصوبے تھے۔ لیکن جب شاہی فوجوں کو فتح ہوئی تو یہ مکار تحفے تحائف لے کر سفیروں کے بھیس میں بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے اور خلعت و انعام لے کر رخصت ہو گئے۔ پھر اکبر نے کئی سال بعد خود حاجی حبیب اللہ کاشی کو گوا بھیجا تاکہ وہ یورپ کے تحفے فرنگیوں سے لے کر آئے۔ کاشی یورپ کا ساز و سامان اور اہل ہنر و کمال کی ایک جماعت کو لے کر دربار میں واپس آیا۔

49۔ کورنش: بادشاہوں کے دربار میں سلام کے مختلف طریقے تھے۔ کہیں سینہ پر ہاتھ باندھنے، کہیں سر جھکانے، کہیں دو زانو ہو کر جھکنے کا رواج تھا۔ اکبر کے دربار میں سلام کا طریقہ یہ تھا کہ حاضر

ہونے والا ادب سے آ کر سامنے بیٹھے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے ہاتھ کو پیچھے کر کے زمین پر ٹیکے اور پھر آہستہ سے سیدھا اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور سیدھا ہاتھ سر پر رکھ کر اتنا جھکے کہ دہرا ہو جائے، پھر داہنی طرف کو جھوک دیتا ہوا سیدھا ہو جائے۔ اسی کو ''کورنش'' اور تسلیم کہا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ طریقہ خود اپنے ایک واقعہ سے اخذ کیا تھا۔ بچپن میں ہمایوں نے ایک مرتبہ اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔ اتالیقوں کے اشارے پر اکبر نے سلام کرنا چاہا، چونکہ تاج بڑا تھا اس لیے اسے سنبھالتے ہوئے جھک کر اور سیدھا ہو کر آداب بجالایا۔ اس وقت سہارے کے لیے مٹھی زمین پر بھی ٹکائی۔ ہمایوں کو اس کی یہ ادا پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرح ہوا کرے۔ اکبر نے اس طرح کورنش کا باقاعدہ آئین مقرر کر دیا۔ بعد میں سجدۂ تعظیمی کا حکم دے دیا گیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بھی سجدہ ہوتا رہا۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانی کو سجدہ اور کورنش نہ کرنے پر ہی قلعہ میں قید کرا دیا تھا۔ شاہ جہاں نے سب سے پہلا حکم اسی سجدہ کی موقوفی کا دیا۔ شاہ جہاں کے دسویں سال میں کورنش بھی بند ہوگئی۔ صرف شرعی سلام دربار کا سلام مقرر کیا گیا۔

50۔ کتاب الاحادیث یہ ملا عبدالقادر بدایونی کی مرتبہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب شاہی ملازمت سے پہلے 976ھ/ 1568ء میں اپنے شوق سے لکھی تھی۔

51۔ متن میں پرکھوتم آیا ہے۔ جب کہ ہندو حضرات میں پرشوتم نام معمول ہے۔

52۔ شیخ زماں: بدایونی نے شیخ زماں لکھا ہے۔ اصل نام عبدالملک لقب امان اللہ تھا، شیخ امان پانی پتی کے نام سے مشہور تھے۔

53۔ ''میری'' مؤلف منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی سے مراد ہے۔

54۔ 'میری' یعنی میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی' ہے۔

55۔ تان سین تان سین کا اصلی نام تانا سیتا یا تونا ساتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش [illegible] کی تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرورش کشمیر میں ہوئی۔ شاید وہ کشمیر ہی [illegible] 1567ء میں وہ کشمیر سے لاہور آیا۔ وہاں سے 18 سال کی عمر میں دلی چلا گیا۔ یہاں ایک بزرگ ملا سلامت کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور ان کے ساتھ وہ یکم رمضان 1569ء کو پشاور بھاگ گیا۔ لیکن سرکاری آدمی دونوں کو دلی پکڑ لائے۔ تان سین کے گانے کی دلی میں بڑی شہرت تھی۔ اس کو یہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ملا سلامت کے مرنے کے بعد وہ دلی سے آگرہ چلا گیا پھر وہ یہاں چھ ماہ ٹھہر کر بہار اور بنگال چلا گیا اور وہاں وہ داؤد شاہ کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ داؤد شاہ

کی شکست کے بعد وہ آگرہ لوٹ آیا اور کچھ دن رک کر دربار میں حاضر ہوا۔ تان سین کے یہاں چار بیٹے مختلف بیویوں سے ہوئے۔ ان میں سے تین بیٹے تو مولوی بن گئے اور ایک نے اپنے باپ کے فن کو زندہ رکھا۔ تان سین کا انتقال 1595ء میں ہوا۔ اس کی قبر آگرہ میں تھی جو 1857ء میں تباہ کردی گئی۔

56۔ پرکھوتم: متن میں یہ نام پرکھوتم آیا ہے جب کہ اصل میں یہ نام پرشوتم ہونا چاہیے۔

57۔ نیلاب ندی: سندھ ندی کو نیلاب ندی بھی کہتے ہیں۔

58۔ خواجہ نظام الدین احمد: خواجہ نظام الدین احمد، دور اکبری کے مشہور مورخ ہیں۔ ان کے والد خواجہ مقیم ہروی بابر بادشاہ کے دیوان تھے۔ ہمایوں کے عہد میں وزیر رہے اور مرزا عسکری کے ساتھ گجرات پر مقرر تھے۔ اکبر نے خواجہ نظام الدین احمد کو گجرات اور جونپور میں بخشی گری کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ان کی مشہور تصنیف جو تاریخ کے موضوع پر بھی "طبقات اکبری" ہے جو 367ھ سے شروع ہوکر اکبر کے جلوس کے 38ویں سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اکبر کے حکم سے شائع کتاب "تاریخ الفی" میں وہ بدایوانی، حکیم ہمایوں، فتح اللہ شیرازی، ملا احمد اور آصف خاں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ ملا عبدالقادر نے اپنی اس تصنیف میں "طبقات اکبری" کو ہی "تاریخ نظامی" کے نام سے یاد کیا ہے۔

59۔ دکھن: جس نسخہ سے متن اخذ کیا گیا ہے اس میں دکھن آیا ہے جب کہ لفظ دکن زیادہ مناسب ہے۔

60۔ ناچیز سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

61۔ میں سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

62۔ ہندی۔ یہ تصنیف سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔

63۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

64۔ آبان: ایران میں رائج پارسی مہینہ کا نام ہے جو سال کا چوتھا مہینہ ہے۔

65۔ معمود آباد: متن میں معمود آباد آیا ہے شاید کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں یہ محمود آباد ہے۔

66۔ پیاگ: سنسکرت نام پریاگ ہے جس کو فارسی میں پیاگ لکھا جاتا ہے۔

67۔ مجھے سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

68۔ یہاں مجھ سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

69۔ میرے نام سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

70۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

71۔ مرزا محمد حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی تھا جو ماہ چوچک بیگم کے بطن سے تھا جو شاہی خاندان کی عورت تو نہیں تھی البتہ کنیزوں کا درجہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔

72۔ پنڈی: اب اسے راول پنڈی کہتے ہیں اور پاکستان میں واقع ہے۔

73۔ تاریخ نظامی کی روشنی میں یہ اکبر کے تخت نشینی کا 32واں سال تھا۔

74۔ میں سے مراد صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

75۔ بہار، حاجی پور، پٹنہ مغل دور حکومت میں الگ الگ صوبے تھے۔ انگریزوں کے عہد میں مارچ 1922ء میں بہار صوبہ بنا جس میں یہ تینوں صوبے ایک ہو گئے۔

76۔ میں صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

77۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

78۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

79۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

80۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کو۔

81۔ میری، صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

82۔ مجھے، صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

83۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

84۔ مجھے سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہے جس کے مؤلف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

85۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

86۔ مجھے ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے جو صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہیں۔

87۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

88۔ میں سے مراد صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

89۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر ہیں۔

90۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

91۔ میری سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

92۔ میرے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

93۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

94۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

95۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

96۔ میرے سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

97۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

98۔ مجھے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

99۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

100۔ مجھے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

102۔ میں سے مراد عبدالقادر بدایونی ہے۔

101۔ 103۔ 104۔ کئی جگہ فلاں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

منتخب التواریخ

جلد سوم

فہرست

عہد اکبری کے مشائخین کرام

میاں حاتم سنبھلیؒ 366

شیخ جلال الدین تھانیسریؒ 367

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ 368

شیخ برہانؒ 370

شیخ محمد کبیر سنبھلیؒ 371

شیخ عزیز اللہؒ 372

شیخ سلیم چشتیؒ 374

شیخ نظام الدینؒ امیٹھی والے 376

شیخ بھیکنؒ کاکوری والے 383

شیخ سعدیؒ 384

شیخ نظام نارنولیؒ 385

شیخ اللہ دیہ خیرآبادیؒ 386

شیخ داؤد چھنی والؒ 387

شیخ ابن امروہہؒ 395

شیخ ادھنؒ جونپوری 396

شیخ عبدالغفورؒ اعظم پوری 397

میاں وجیہ الدینؒ احمد آبادی 398

میاں عبداللہ نیازیؒ سرھندی 399

شیخ ابوالفتح گجراتیؒ 401

شیخ ابو اسحاقؒ لاہوری 402

شیخ رکن الدینؒ 404

شیخ اسحٰق کاکو لاہوری 405

شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل 406

میاں شیخ عبداللہ بداونی 408

شیخ جلال الدین قنوجی 409

شیخ کپور مجذوب گوالیاری 410

شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری 411

شیخ عارف حسینیؒ 412

میر سید علاء الدین اودھیؒ 414

شیخ حمزہ لکھنوی 415

شیخ چیرکؒ 416

شیخ محمد حسین سکندریؒ 417

شیخ عبدالواحد بلگرامیؒ 418

عہد اکبری کے علماء

میاں حاتم سنبھلی 419

مولانا عبداللہ سلطان پوریؒ 422

شیخ مبارک ناگوری 425

میر سید محمد میر عدلی امروہی 426

شیخ گدائی دہلوی کنبوئی 427

میاں جمال خان مفتی دہلی 428

قاضی جلال الدین ملتانی 429

شیخ عبدالنبی صدر الصدور 430

شیخ احمدی فیاض امیٹھی وال 434

میاں الہداد لکھنوی 436

شیخ حسین اجمیری 437

شیخ عبدالقادر 440

شیخ کبیر 441

میر سید علی لدھیانہ 442

شیخ معین 444

میر عبداللطیف قزوینی 445

میر غیاث الدین علی 447

شیخ حسین بدخشی 448

شیخ ابوالمعالی 449

مولانا جمال تلہ 451

مولانا عبدالشکور لاہوری 452

شیخ سعد اللہ نحوی 453

شیخ نصیر الدین 454

شیخ مبارک الوری 455

شیخ عبدالغنی بدایونی 456

شیخ عبدالحق دہلوی 458

مولانا الہداد سلطان پوری 461

حاجی سلطان تھانیسری 462

شیخ ضیاء اللہ 464

میر ابوالغیث بخاریؒ 468

میاں کمال الدین حسین شیرازی 469

شیخ ابوالفتح تھانیسری 471

قاضی مبارک گوپامئوی 472

مولانا ویس گوالیاری 473

شیخ محمد شامی 474

شیخ حسن علی موصلی 475

قاضی نور اللہ شوستری 476

حاجی ابراہیم محدث 477

صدر جہاں پہانی 478

شیخ یعقوب کشمیری 479
مولانا میرزا سمرقندی 484
قاضی ابوالمعالی 485
مولانا میر کلاں 486
قاضی نظام بدخشی 487
مولانا الہداد لنگر خانی 488
میر فتح اللہ شیرازی 489
ملا پیر محمد شیروانی 490
مولانا نورالدین محمد ترخان 491

عہد اکبری کے حکما

حکیم الملک گیلانی 495
حکیم سیف الملوک دماوندی 496
حکیم مسیح الملک شیرازی 498
حکیم مصری 499
حکیم ابوالفتح گیلانی 500
حکیم احمد ٹھٹھوی 501
حکیم فتح اللہ گیلانی 502
شیخ بینا 503

عہد اکبری کے شعرا

غزالی مشہدی 504
قاسم کاہی 507

خواجہ حسین مروی 510

قاسم ارسلان 512

آتشی قندھاری 514

امیر قاضی اسیری 515

میر امامی بلغجویہ 516

میر شرف امان اصفہانی 517

قاضی احمد غفاری قزوینی 518

میر اشکی قمی 519

یول قلی انیسی 520

الفتی قلیچ خان 521

الفتی عراقی 522

بیرم خان خانخاناں 523

بیکسی غزنوی 524

باقی کولابی 526

بقائی 527

ملا نورالدین محمد ترخان 528

میرزا منوچہر توسنی 531

قدروئی ابہری 532

تشبیہی کاشی 533

تقی الدین شوستری 535

ثنائی مشہدی 536

جدائی 537

جذبی 538

جیلی کابلی وال 539

شیخ حسین صوفی چشتی 540

جعفر بیگ 541

حیاتی گیلانی 542

حیاتی 543

خان اعظم 544

خنجر بیگ 545

خسروی 546

دوائی 548

رفیعی 549

زین خان کوکہ 550

سلطان سپلی 551

سیری 553

سہمی 554

سپاہی 555

سرمدی اصفہانی 556

شاہ ابوالمعالی 557

شیری 558

شجاعی 559

ملا صادق حلوائی سمرقندی 560
صبوحی 561
صرفی ساوجی 562
صبوری ہمدانی 563
طاری 564
طالب اصفہانی 565
ظہوری 566
عالم کابلی 567
میر عبدالحی مشہدی 569
عتابی 570
عشقی خان 571
میر عزیز اللہ 572
میرزا عزیز کوکہ 573
عہدی شیرازی 574
عرفی شیرازی 575
غزنوی 576
غباری 578
غرتی حصاری 579
فارغی شیرازی 580
فنائی 581
فیروزہ کابلی 582

ملک الشعرا شیخ فیضی 583

لطفی منجم 585

میر مرتضیٰ شریفی شیرازی 586

میرزادہ علی خاں 587

مرادی استرآبادی 588

میلی ہروی 589

ملک قمی 590

مدای بدخشی 591

موسوی مشہدی 592

محمد یوسف 593

منظری سمرقندی 594

مظہری کشمیری 595

نویدی ترجی 596

نشائی 597

ناصحی 599

نوعی خبوشانی 600

نامی 601

نظیری نیشاپوری 603

نظمی تبریزی 604

وقوعی نیشاپوری 605

وداعی ہروی 606

وصلی 607

بہدی 608

ہجری 609

خاتمہ 611

مناجات 614

عہد اکبری کے مشائخین کرام

نظام الدین احمد مؤلف ''تاریخ نظامی'' نے اپنی تاریخ کے آخر میں شاہی دربار سے منسلک امراء کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ میری نگاہ میں ان امیروں میں سے اکثر زندہ، گمراہ اور بدعمل ہیں کیونکہ،

من وفائی ندیدم ز کسان
گر تو دیدی دعائی من برسان

(میں نے کسی سے بھی کوئی وفا نہیں دیکھی اگر تو نے کوئی وفا دیکھی ہو تو میری دعا ان تک پہنچا دے)

ان امراء کی گمراہیوں کی وجہ سے میں نے اپنے قلم کو ان کے فضول تذکروں میں الجھنے نہیں دیا، بلکہ یہ صفحات اس عہد کے بعض مشائخین کرام کے تذکرے سے شروع ہوتے ہیں۔ دور اکبری کے بزرگوں میں سے اکثر رحلت فرما چکے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور شخصیتیں ہیں ان کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں۔

میاں حاتم سنبھلیؒ

میاں حاتم سنبھلی بہت بڑے عالم تھے۔ مدتوں علوم کا فیض ان کی ذات سے جاری رہا۔ صوری اور معنوی کمالات ان کی شخصیت میں جمع تھے۔ ابھی وہ تحصیل علم میں مشغول تھے کہ

ان پر ''حال'' غالب آگیا اور قیل و قال کو ترک کر کے اپنے استاد شیخ عزیز اللہ دانشمند طلبنیؒ جو اپنے عہد کے عالم ربانی اور ولی کامل تھے، ان کے مرید ہو گئے۔ شیخ علاؤالدین چشتیؒ دہلوی کی خدمت میں بھی سلوک کے طریقے سیکھے۔ ان دونوں بزرگوں سے تربیت و تعلیم اور مرید کرنے کی اجازت حاصل کی۔ جذب کی ابتدائی کیفیت میں میاں صاحب سنبھل اور امروہہ کے جنگلوں میں دس سال تک ننگے سر ننگے پیر گھومتے رہے۔ اس ساری مدت میں نہ بستر سے پیٹھ لگی، نہ سر کو تکیہ میسر ہوا۔ ذوق سماع ان کی طبیعت پر غالب تھا۔ جب بھی بات کرتے یا مسکراتے تو ''اللہ'' کا کلمہ برابر زبان پر ہوتا۔ آخر جذب و کیفیت کا یہ عالم ہوا کہ راگ سننے کی تاب نہ رہی، راگ پڑھتے ہی بے خودی کے عالم میں کہیں سے کہیں جا پہنچتے۔

960ھ/1552ء میں جب کہ میری عمر صرف 12 سال تھی، میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل میں ان کی خدمت میں گیا۔ ان کی خانقاہ میں ''قصیدہ بردہ'' کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے تبرکاً ''حنفی'' فقہ کی کتاب ''کنز'' کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کر لیا۔

میرے والد سے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لڑکے کو اپنے استاد شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے تاکہ اسے علوم ظاہری کا فائدہ بھی پہنچے۔ شیخ ممدوح نے 969ھ/1561ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی تاریخ رحلت'' درویش دانش مند'' سے نکلتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے والد کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ یہ ان کی حسن عقیدت کا ثمرہ تھا۔

شیخ جلال الدین تھانیسریؒ

شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ علوم ظاہر و باطن دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ کافی عرصے تک دینی علوم کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔ آخر میں علوم رسمی کو ترک کر دیا۔ جلوت چھوڑ کر خلوت میں جا بسے۔ ان کے اکثر اوقات قرآن پاک کے ختم، نوافل، دعا اور درود ہی میں صرف ہوتے تھے۔ 193 سال کی عمر کو پہنچے تو نہایت کمزور اور ضعیف ہو گئے،

بس ہڈی چمڑا ہو کر رہ گئے تھے

پیر را از نامرادی رنگ چو پیدا شد زپوست
بہر تعلیم مریدان راستی را مسطر است

اس عمر میں حال یہ ہو گیا تھا کہ بیٹھنے اور حرکت کرنے کی قوت نہیں رہی تھی۔ ہر وقت غذا کی کمی اور کمزوری کی وجہ سے ٹیک لگائے بس غنودگی میں پڑے رہتے تھے، لیکن دل کی قوت کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑتی کسی کے مدد کے بغیر جھٹ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے، جوتیاں پہنتے، لاٹھی تھام کر خود طہارت اور وضو کر کے نماز ادا کرتے، یہ قوت جیسے نماز ہی کے لیے پیدا ہو جاتی تھی، چنانچہ نماز سے فارغ ہوتے ہی اسی طرح پھر بستر پر لیٹ جاتے۔

مجھے دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی بار تو میں 969ھ/1561ء میں آگرے میں ملا تھا جبکہ وہ تھانیسر کے اماموں کی سفارش اور کاربرآری کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ دوسری مرتبہ 981ھ/1573ء میں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حسین خان الغ میرزا کا تعاقب کرتے ہوئے تھانیسر پہنچا تھا۔ یہ ملاقات میں نے حسین خان کے ساتھ کی تھی۔ اس وقت مجھے ان کی شخصیت مجسم نور دکھائی دی۔

شیخ جلالؒ نے 989ھ/1581ء میں رحلت فرمائی۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

شیخ محمد غوث، شیخ ظہور اور حاجی حضور عرف حاجی حمید کے مرید ہیں۔ شطاری سلسلے میں ان کا نسب سلطان العارفین شیخ بایزید بسطامیؒ سے ملتا ہے۔

ابتدائی زمانے میں وہ 12 سال تک چنار کے پہاڑی دامن میں مقیم رہے۔ غار ان کا ٹھکانہ تھے اور غذا درختوں کے پتے۔ اس عرصے میں انھوں نے بڑی سخت ریاضتیں کیں۔ علم و اسماء الٰہی میں مقتدا اور صاحب تصوف تھے۔ اس علم کی اجازت ان کو اپنے بڑے بھائی

شیخ بہلولؒ سے جو بڑے صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں، سے حاصل تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے ہمایوں بادشاہ مغفرت پناہ کو بڑی مخلصانہ عقیدت تھی۔ ہمایوں کو شاید ہی کسی اور سے ایسی عقیدت رہی ہو انہی سے ہمایوں نے بھی "دعوت اسماء" کا طریقہ سیکھا تھا۔

جب شیر شاہ نے اقتدار سنبھالا تو ہمایوں کے تعلق کی وجہ سے وہ شیخ غوثؒ کے خلاف ہو گیا۔ اسلئے شیخ گجرات چلے گئے۔ وہاں کے حکام و سلاطین نے سر آنکھوں پر لیا اور وہ سب شیخ کے عقیدت مند رہے۔ شیخ کی کرامتوں اور کمالات باطنی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ میاں شیخ وجیہہ الدین جیسا متبحر عالم ربانی بھی ان کی بارگاہ تقدس کا حاشیہ نشین بن گیا تھا۔ ان کے دامن فیض سے دہلی، گجرات اور بنگالہ میں کتنے ہی صاحب مرتبہ بزرگ پیدا ہوئے۔ ان کے کمالات روحانی کے آثار اب تک ہندوستان میں باقی ہیں۔

میں[1] نے انھیں سب سے پہلے 966ھ/1558ء میں آگرہ کے بازار میں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سوار ہو کر جا رہے تھے اور ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں لوگوں نے اتنا ہجوم کر رکھا تھا کہ اس بھیڑ میں کسی کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس قدر و منزلت پر ان کے انکسار و تواضع کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو دائیں بائیں گھوم کر اور اس قدر جھک کر سلام کا جواب دے رہے تھے کہ ان کے سر کو لحظہ بھر کے لیے قرار نہ تھا۔ ان کی پشت زین کے تکیہ سے ٹکرائی جاتی تھی۔

اس سال شیخ ممدوح گجرات سے آگرہ آئے تھے۔ اکبر کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ وہ ان کی تحریص و ترغیب پر ان کے مریدوں میں شامل ہو گیا، لیکن کچھ ہی دن بعد ان کا منکر ہو گیا۔ خان خاناں، بیرم خاں اور شیخ گدائی سے ان کی نبھ نہ سکی اس لیے وہ ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے۔ وہاں ایک خانقاہ قائم کر کے مریدوں کی تربیت و تکمیل میں مشغول رہے۔ سماع و سرود اور وجد کا بھی ذوق تھا بلکہ انھوں نے سماع کے متعلق رسالہ بھی تصنیف کیا ہے۔

لباس فقر میں بڑے جاہ و جلال والے تھے۔ انکی مدد معاش ایک ہزار تنکہ تھی۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا تھا وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ غیر مسلموں سے

بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ اسی سبب بعض اہل فقر ان کے مخالف بھی ہو گئے تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی نیت کیا تھی:

چوں رد و قبول ہمہ در پردۂ غیب است
زنہار کسی را مکن عیب کہ عیب است

(چونکہ رد و قبول بھی پردۂ غیب میں ہے اس لیے کسی کا عیب ظاہر مت کرو کہ یہ خود عیب ہے)

80 سال عمر پا کر 970ھ/1562ء میں آگرہ میں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے۔ شیخ نہایت سخی اور دریا دل آدمی تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے آپ کو "میں" نہیں کہا ہمیشہ خود کو "فقیر" ہی کہا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا کچھ عجیب طرح کا حال تھا کہ جب کسی کو غلہ دیتے تو اس کے وزن کو ظاہر کرنے کے لیے "من" کا لفظ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ کہتے تھے اسے "میم" اور "نون" (من) فلاں آدمی کو دے دو!

شیخ برہانؒ

شیخ برہان بڑے زاہد، متوکل، گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں وہ میاں الہداد باری کی۔ جن کا سلسلہ ایک واسطے سے سید محمد جون پوری سے ملتا ہے کی صحبت میں صرف 3 دن رہے اور فقر و فنا کا یہ فیض حاصل کیا، کہ درجۂ کمال تک جا پہنچے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحب حضور تھے۔ تقریبا 50 سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کر دیا، صرف تھوڑے سے دودھ اور شیرینی پر گزر کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ دیکھنے میں بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے تھے۔ کالپی میں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرے میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبے میں مشغول رہتے تھے۔ مہدوی طریقہ پر "پاس انفاس" میں مصروف رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے پھر بھی قرآن کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

میں(2) جب چنار کے سفر سے لوٹا، یہ 967ھ/1559ء کا کوئی مہینہ تھا اور عبداللہ

خاں اوزبک کا دور دورہ تھا۔ ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی پتے کی باتیں کہیں اور اپنے ہندی کے شعر جن میں وعظ، نصیحت، تصوف، توحید اور تجرید کے مضامین تھے وہ بھی سنائے۔

دوسرے دن میر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترکی تھا اور مردم آزاری، ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا۔ میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے آیا، اتفاق یہ تھا کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی اور ان کو مغلظ گالیاں دی تھیں، جب ہم (1) پہنچے تو شیخ نے سب سے پہلے جو بات فرمائی وہ یہ حدیث تھی

"قال النبی ﷺ المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ"

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

یہ حدیث پڑھ کر انھوں نے اس کے نکات کے بڑی عالمانہ اور دلکش تشریح کی۔ میر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کیے پر نادم و شرمندہ ہو کر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا و فاتحہ کی درخواست کی، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا جو شیخ نے قبول نہ کیا۔ شیخ ممدوح کی عمر 100 سال ہوئی ہے۔ انھوں نے 970ھ/1562ء میں رحلت فرمائی۔ میں (1) نے ان کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی ہے

"دل گفت کہ شیخ اولیاء بود"

ان کو وصیت کے مطابق اسی حجرے میں دفن کیا گیا جس میں کہ وہ گوشہ نشین رہے تھے۔

شیخ محمد کنبو سنبھلیؒ

قادری سلسلے کے بزرگ تھے۔ راہ سلوک میں انھوں نے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں۔ وجد و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے، خود بھی نہایت خوش آواز تھے۔ جب ان پر حال و کیفیت طاری ہو جاتی تو بے اختیار خود بھی گانے لگ جاتے اور اس درد بھری آواز میں کہ

حاضرین پر رقت طاری ہو جاتی۔ ان کی محفلوں میں سماع کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اس کا خیال اب بھی مجھ(9) کو سرشار کر دیتا ہے۔

ابتدا میں علوم ظاہری کی تحصیل کی تھی۔ عشق و تعشق کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ کسی نہ کسی دلربا صورت سے ان کے عشقیہ تعلقات ضرور قائم رہتے تھے۔ اس معاملہ میں ایسے آزاد مشرب تھے کہ لوگوں کی انگلیوں کی انھیں کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی۔ کھلے بندوں دل کے معاملات میں الجھے رہتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ شیخ محمد عاشق مشہور ہو گئے۔

985ھ/1578ء میں ان کا وصال ہوا۔ ان کی وفات "ششم از شوال" سے نکلتی ہے۔

شیخ فخر الدینؒ

نیک، گوشہ نشین، متوکل، عبادت گزار بزرگ تھے۔ ہمیشہ لوگوں سے دور خلوت میں رہا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ان کی خانقاہ میں صوفیوں کی مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں سماع لازماً ہوا کرتا تھا۔ ان کی محفل سماع میں سماع کا کیسا ہی منکر اور مخالف آ جاتا، وجد و حال سے بچ نہیں سکتا تھا۔ شیخ کی مستانہ کیفیت دوسروں کو متاثر کر دیتی تھی۔

اس مجلس کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ ان کی مجلس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ اور فقیر برابر کے ہم نشین ہوتے تھے۔ خان خاناں بیرم خاں جمعہ کی نماز اکثر انہی کی مسجد میں ادا کرتا تھا۔ شیخ کی صحبت میں اس پر اکثر اوقات بڑی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ خانقاہ کے معمول کے مطابق خان خاناں وہاں نشست و برخاست اور تناول طعام (یعنی کھانے پینے) میں دوسروں سے کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔

شیخ عزیز اللہؒ

معرفت الٰہی اور عشق خداوندی کے سراپا مظہر تھے۔ صفائی قلب اور سوز و گداز ان کے بشرہ سے عیاں تھا۔ صاحب ذوق ایسے کہ دن رات گریہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ گانے کی بھنک بھی ان کے کان میں پڑ جاتی تو اس طرح بے قرار ہو جاتے جیسے کسی نے ان کے

باطن میں آگ لگا دی ہو۔ ان کے یہاں صبح و شام سماع کی محفل جمی رہتی تھی، اس وقت ان کا یہ عالم رہتا تھا کہ اگر پتھر پر بھی اس عالم میں نگاہ پڑ جائے تو پانی بن جائے۔

اپنے والد بزرگوار شیخ حسن سے بیعت تھے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد حسن سے جو شیخ امان پانی پتی کے پیر تھے، انھوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ طبیعت میں عجز و انکسار بہت تھا۔ خدمت خلق کا بڑا خیال و اہتمام کرتے تھے۔ اگر وہ چلّے میں بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی محتاج شخص خواہ وہ کسی غیر مسلمان کے پاس سفارش کے لیے لے جانا چاہتا تو حجرۂ اعتکاف سے نکل آتے اور اس کے گھر دور دراز کی مسافت طے کر کے پیدل ہی چلے جاتے۔ حاجت برآری کے بعد لوٹ کر پھر اعتکاف میں بیٹھ جاتے، گویا اس سے ان کا چلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی عبادتوں پر لوگوں کی حاجت روائی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اگر کوئی کافر یا ظالم حاکم ایک بار کہنے پر ان کی سفارش کو قبول نہ کرتا یا جان بوجھ کر گھر سے ملاقات کے لیے نہ نکلتا تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہتے۔ پھر بھی ملاقات نہ ہوتی تو دوسرے دن جانے کے لیے انکار نہ کرتے اور بے تکلف اس طرح چلے جاتے جیسے ان کو کسی طرح کی کدورت نہیں ہوئی۔ ان کے اس انکسار کو دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہو جاتا اور ان کے پاؤں پر گر پڑتا اور اس حاجت مند کی حاجت پوری ہو جاتی۔

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حسب معمول مجلس سماع میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک دیوانے شخص نے چیخ ماری اور شیخ کو جھولی بھر کر اٹھا لیا اور سر کے بل ان کو زمین پر پٹک دیا۔ ان کی دستار کھل کر گر گئی۔ لیکن ایسا ضبط و تحمل تھا کہ چہرے پر ناگواری کا ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ اس کے وجد و حال کا خیال کر کے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس پاگل نے دوبارہ یہی حرکت کی تو شہر کے حاکم نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا شیخ نے اسے اپنی حمایت میں لے لیا اور بڑی عذر خواہی کر کے اسے سزا سے بچا لیا۔

علوم ظاہری میں ان کی بڑی دسترس تھی۔ اپنے شاگردوں کو عموماً ''تفسیر عرائس، عوارف اور فصوص الحکم'' نیز ان کی شرحیں پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ امان پانی پتی نے ایک رسالہ ''غیریہ'' لکھا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ عزیز اللہ نے ایک رسالہ ''عینیہ'' کے نام

سے لکھا، اس رسالہ میں نظریۂ "وحدت الوجود" کے بڑے اہم نکات بیان کیے ہیں۔

جس زمانے میں خان خاناں کی سرکشی کے قصے چل رہے تھے، کچھ عرصہ تک اور اس کے بعد بھی چند سال تک میں(۵) نے ان کی خدمت میں تصوف کی بعض کتابوں کی سماعت کی تھی۔ 975ھ/1567ء میں وہ عالم فنا سے عالم بقاء کو تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے۔

"قطب طریقت نماند" (قطب طریقت حیات نہیں رہے)

اپنے رسائل و تصنیفات اور خطوط میں وہ ہمیشہ خود کو "ذرۂ ناچیز عبد العزیز" لکھا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تاریخ کسی نے "ذرۂ ناچیز" سے بھی نکالی ہے۔

شیخ سلیم چشتی

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا اصل تعلق دہلی سے تھا۔ سلسلہ بیعت میں خواجہ ابراہیم سے متعلق تھے۔ خواجہ ابراہیم 6 واسطوں سے خواجہ فضیل بن عیاضؒ کے سجادہ نشین ہوئے ہیں۔

شیخ سلیم خشکی اور تری کے راستوں سے 2 مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت و طواف کے لیے ہندستان سے تشریف لے گئے تھے۔ روم، بغداد، شام، نجف اور مغرب کے دوسرے شہروں کی سیاحت بھی کی تھی۔ وہ سال بھر سیر و سیاحت میں رہتے تھے لیکن حج کے زمانے میں مکہ ضرور پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے 22 حج ادا کیے۔ 14 حج اپنی سیاحت کے پہلے دور میں اور 8 حج دوسرے دور میں۔ آخری بار جب حرمین شریفین پہنچے تو چار سال مکہ معظمہ میں اور چار سال مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔ جس زمانے میں وہ مکہ میں مقیم تھے، میلاد کا زمانہ تو مدینے میں گزارتے اور حج کا موسم مکہ میں گزارتے تھے۔ اس آخری دورہ میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ان کے ساتھ تھے۔ قیام کی تاریخ انھوں نے یوں کہی تھی:

شکر خدا را کہ بہ محض کرم　　منزل باشد حرم محترم

ہر کہ پرسید ز تاریخ سال　　نحن اجناد دخلنا الحرم

بلاد عرب میں شیخ سلیم ”شیخ الہند“ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی عمر 95 سال کی ہوئی، ساری عمر انھوں نے شریعت نبویؐ کے اتباع میں بڑی بڑی ریاضتوں اور سخت مجاہدوں میں گزاری۔ ایسی ریاضت مشائخین کے عہد میں سے کسی اور نے کم ہی کی ہوگی۔ غسل روزانہ کرتے تھے۔ طہارت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کبھی نماز پنجگانہ فوت نہیں ہوئی۔

جب شیخ امان پانی پتی ان سے ملنے آئے تو پوچھا سلوک و طریقت کا مقصود آپ کو استدلال کے ذریعہ ملا یا کشف کے ذریعے؟ انھوں نے جواب دیا ”ہمارے مسلک کا تعلق بس دل ہی سے وابستہ رہا“۔

بہت سے اہل کمال شیوخ نے ان کے دامن تربیت سے استفادہ کیا، ان کے قائم مقام بنے۔ ان تربیت یافتگان میں ایک شیخ کمال الوری تھے۔ یہ نہایت بوڑھے آدمی تھے لیکن دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک اور بزرگ شیخ پیارے بنگالی ہیں جو بنگالہ کے شہروں میں بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی، شیخ رکن الدین اجودھنی اور حاجی خادم ہیں جو فتح پور کی خانقاہ کے منتظم اور ان کے خلیفہ ارشد ہیں۔

جس زمانے میں کہ شیخ دوسری مرتبہ ہندستان تشریف لائے تھے، مجھے پتہ چلا کہ وہ عربی انشاء میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی آمد کی تاریخ نکالی اور عربی میں مبارک بادی کا خط لکھ کر بدایوں سے بھجوایا تھا۔

976ھ/1568ء میں شیخ اعظم بدایونی کے واسطے سے جو ان کے چچا کا لڑکا اور داماد تھا، خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران مجھ(1) سے پوچھا کہ احادیث میں حضور اکرم ﷺ اور شیخینؓ کی قبروں کا حال کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ میں نے کہا ”احادیث میں تو اسی طرح ذکر ہے اور بعض نے اس طرح بیان کیا ہے“۔ شیخ نے کہا سہروردی نے ”واقعہ صاعقہ“ میں تینوں قبروں کی صورت بیان کی ہے اور پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

میں(2) حسب ارشاد 2 روز شیخ اعظم مذکور کے ہمراہ پرانی خانقاہ کے حجرے میں مقیم

رہا۔ اس دوران میں نے تفصیل سے گفتگو نہ کی، پھر اجازت لے کر پشاور چلا گیا۔ اس کے بعد 978ھ/1570ء میں نے بھی کئی بار حاضری دی۔

میں'' نے شیخ کی جو کرامت دیکھی وہ یہ تھی کہ فتح پور کے اس پہاڑ میں جہاں سردی کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے سوائے ایک باریک کرتے اور ململ کی چادر کے وہ دوسرا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ ہر روز دو مرتبہ غسل کرتے تھے۔ چلہ میں وصال کے روزے رکھتے تھے اور صرف آدھے تربوز بلکہ اس سے بھی کم پر گزر کر لیتے تھے۔

شیخ سلیم کی وفات 979ھ/1571ء میں واقع ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ ہندی'' ہے۔

شیخ نظام الدینؒ امیٹھی وال

امیٹھی لکھنؤ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ نظام الدین اس قصبہ کے رہنے والے اور شیخ معروف چشتی کے شاگرد اور مرید ہیں۔ ان کا سلسلہ شیخ نور قطب عالم سے ملتا ہے۔ پہلے اکتسابی علوم کے طالب علم رہے، لیکن ان کی فطرت بلند پرواز تھی اس لیے علوم ظاہری سے فیوض باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہمیشہ آنکھیں بند کیے اللہ سے لو لگائے رہتے تھے۔ ذکر اور باطنی توجہ سے کبھی غافل نہ رہے۔

یک چشم زدن غافل ازان ماہ نباشم
ترسم کہ نگاہی کند آگاہ نباشم

(میں پلک جھپکنے کے وقت تک بھی اس معشوق سے غافل نہیں رہنا چاہتا، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ پر نظر کرے اور میں آگاہ نہ رہوں)

تھوڑی ہی مدت میں اپنے پیر سے ارشاد و تکمیل کی اجازت لے کر قصبۂ امیٹھی میں آکر رہ گئے۔ یہاں وہ بڑے توکل و قناعت سے گزارا کرتے تھے۔ خاص و عام سے دور ہی رہتے تھے، جامع مسجد کے سوائے کہیں اور نہیں جاتے تھے، البتہ کبھی کبھی خیرآباد شیخ سعد کے مزار کی زیارت اور شیخ صوفی کے خلیفہ اللہ دیہ سے ملنے چلے جاتے یا گوپامئو میں اپنے

خاص مرید قاضی مبارک گوپاموی سے ملنے چلے جاتے۔ قاضی صاحب بھی بڑے متقی، صاحب کمال اور دولت مند آدمی تھے۔ قاضی مبارک جب طالب علم تھے تو انھوں نے شیخ کو اپنے والد کی خانقاہ میں دیکھا تھا اور ان میں بڑے اثر و جذب کو محسوس کیا تھا۔ شیخ عبد الغنی سے ملنے کے لیے وہ فتح پور بھی گئے تھے۔ شیخ عبد الغنی بھی بڑے صاحب مرتبہ بزرگ تھے۔ جس وقت بھی شیخ نظام الدین شیخ اللہ دیہ کی خانقاہ میں جاتے تو ان کی خدمت میں ایک روپیہ یا ایک تنکہ یا کوئی اور چیز بطور ہدیہ ضرور پیش کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ انھوں نے شیخ اللہ دیہ کے لڑکے شیخ ابوالفتح کے ہاتھ میں جو اپنے والد کے سجادہ نشین ہیں، ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' دیکھی، شیخ سے یہ کتاب چھین کر رکھ لی اور انھیں کوئی دوسری کتاب دے کر کہا: ''اس کا مطالعہ کیا کرو''۔

عبادات ومعاملات میں وہ ہمیشہ ''احیاء العلوم''، ''عوارف''، ''رسالہ مکیہ''، ''آداب المریدین'' اور اس جیسی دوسری کتابوں سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز سے پہلے ظہر کی نماز باجماعت پڑھ لیتے تھے، اس کے بعد جمعہ کی جماعت کرتے تھے۔ ان کے جمعہ کے خطبے میں بادشاہ کا ذکر قطعاً نہیں آتا تھا۔

میں(1) نے ایک بار دیکھا کہ انھوں جمعہ کی نماز جوتے پہنے ہوئے ادا کی اور فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی جوتے پہن کر نماز ادا کی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان سے کافیہ کی کتاب تبرکاً پڑھنی چاہی لیکن شیخ نے اغماض برتا، جب اس نے بڑی عاجزی اور اصرار کیا تو جواب دیا: ''کوئی دینی کتاب پڑھو''۔ اس نے کہا یہ بھی تو دینی کتاب ہے اور علم دین کا اس پر انحصار ہے''۔ یہ سن کر شیخ کو جذبہ آگیا اور فرمایا علم دین کا اس کتاب پر کس طرح انحصار ہو سکتا ہے کہ جس میں پہلی بحث ہی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے کسر نفسی کے طور پر خدائے عز وجل کی حمد ہی درج نہیں کی۔

شیخ بہت کم مرید کرتے تھے۔ کوئی شغل نہیں بتاتے تھے۔ تلقین بھی بہت کم کرتے تھے۔ ان کے معزز مریدوں میں سب سے بڑے شیخ حاتم گوپاموی تھے۔ یہ بھی قاضی مبارک کی خانقاہ میں طالب علم تھے۔ انھیں اسی خانقاہ سے شیخ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

شیخ حاتم کو کبھی کبھی درس دیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب عطا کر دیتے اور دوسرے مشاغل کی تلقین بھی کرتے۔ اس طرح انھوں نے حاتم کو بالکل اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ انھیں دستار، جوتے اور کپڑے بھی عطا کرتے رہتے تھے۔ قاضی مبارک اور دوسرے طالب علموں نے جب یہ عنایات دیکھیں تو وہ شیخ حاتم سے جلنے لگے۔ شیخ نے ان کی دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا "میں کیا کروں اللہ کی یہی مرضی ہے کہ اسے پھٹے کپڑوں، پرانے جوتوں اور مفلسی کے باوجود اللہ کی نعمت خاص عطا ہو"۔ چنانچہ انھوں نے شیخ حاتم کے لیے اپنے پورے اثر و جذب سے کام لیا کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ درجۂ کمال تک پہنچ گیا۔ شیخ حقائق و معارف کی گفتگو صرف شیخ حاتم سے کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ حاتم کی حالت میں تنزل ہونے لگا اور اس سے بعض لغزشیں سرزد ہو گئیں۔ بعد میں پھر اس نے اپنی حالت سنبھال لی اور شیخ کے پاس وہی مرتبہ حاصل کر لیا۔ جب وہ حضرت کی خلافت اور وراثت کا پوری طرح اہل بن گیا تو خدا نے اسے دنیا سے اٹھا لیا۔ شیخ نے اس کو یاد کر کے بارہا فرمایا کہ: "خدا کا ایک بندہ تھا کہ میں جب بھی اس سے خدا کی باتیں کہتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا، وہ بھی اٹھ گیا۔ اب میں کس سے یہ بات کروں"۔

جس زمانے میں میں (11) شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس وقت شیخ اپنے سالے عبد الرزاق کو جو بعد میں ان کے خسر بھی ہو گئے تھے گفتگو میں مخاطب کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بیٹے شیخ محمد کو بھی واسطہ بنا کر خطاب کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد اب ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہیں۔

محمد حسین خان مرحوم کو جس کے حالات میں (12) نے تاریخ میں بیان کیے ہیں، انھیں حضرت سے بڑی عقیدت تھی۔ حسین خان اور میرے (13) اچھے روابط تھے۔ جس وقت اسے لکھنؤ جاگیر میں ملا تھا تو میں (14) اس سے ملا تھا۔ 976ھ/1568ء میں سید اصغر بدایونی اور قاضی مبارک گوپامئوی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ پہلی ہی ملاقات میں شیخ ہر شخص سے ایسی بات کرتے تھے جو اس کے حالات سے عین مطابقت رکھتی تھی۔ ان کی زبان پر ہمیشہ الحمد اللہ، سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، بسم اللہ،

لاحول ولاقوۃ الا باللہ، قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کسی بزرگ کا قول ہی رہتا تھا۔ سید اصغر سے مصافحہ کیا تو درود پڑھا، قاضی احمد سے ملے تو سبحان اللہ کہا، میری[12] باری آئی تو بسم اللہ، اسی طرح ہر ایک کے مطابق کوئی نہ کوئی کلمہ ارشاد فرمایا۔ اسی اثناء میں کہ ابھی وہ گفتگو نہ کر پائے تھے کہ ایک غریب طالب علم نہایت برے حال میں آکر ملا۔ اس سے مل کر شیخ نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھا۔ پھر شیخ عبدالرزاق کو مخاطب کرکے "کل شئ ھالک الاوجھہ" کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ وہ ہاں ہاں کرتے جاتے تھے۔ کبھی بطور تلمیح کسی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ کسی اور کو خوف اور رعب کے مارے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں بھی مبہوت بنا سن رہا تھا اور اپنی کوتاہیوں کا خیال کرکے ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو میرے[12] پوشیدہ حالات حضرت پر منکشف ہوگئے ہوں اور وہ اسے ظاہر فرمادیں۔ اسی ڈر سے میں[12] مجلس سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کہ وہ طالب علم بول اٹھا، اس آیت میں "وجھہ" کی ضمیر کسی اور چیز کے لیے آئی ہو جیسا کہ بعض اہل معرفت نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات سن کر حضرت جلال میں آگئے۔ ان کا چہرہ تمتمانے لگا اور فرمایا میں نے اس شیطان سے ملتے ہی تعوذ پڑھا تھا چنانچہ دیکھ لو اس کی شیطانیت ظاہر ہوگئی۔ چونکہ وہ جان چکے تھے کہ اس کے اعتراض کے پیچھے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ اسی لیے بار بار لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا۔ پھر قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھا

یا لائمی فی ھوی العذری معذرۃ

منی الیک و لو انصفت لم تلم

شیخ پر اس وقت بڑا جلال طاری تھا۔ آخر آپ نے حکم دیا کہ اسے مجلس سے اٹھا دو۔ پھر اسے اپنے پاس بلا کر ملائمت کا اظہار کیا۔ حاضرین کو یہ واقعہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ وہ رات ان کی خانقاہ میں، میں[12] نے بڑی مشکلوں سے کاٹی اور بھاگ جانے کے لیے بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کرکے رات کٹ گئی۔ ابھی اتنا اندھیرا تھا کہ بغیر چراغ کے ایک دوسرے کے چہرے کو پہچاننا مشکل تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی رات

باقی ہے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی جب سورج نکلا، حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوکر ہم تین مہمانوں کے لیے شیخ محمد کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ میرے اضطراب کا یہ حال تھا کہ میں ہر لحہ شیخ محمد کو واسطہ بنا کر رخصت ہونے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا، حضرت شیخ ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور دوسرے ہاتھ میں تمک لیے ہوئے کسی بات کے ضمن میں آیت کریمہ "واعدوالھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل" کی وضاحت کر رہے تھے، میری روانگی کی اجازت کو ٹال گئے۔ ایک اور بات کہ میں حسین خان کو جو اس وقت اسولی کے پرگنہ میں تھا بڑی توجہ سے یاد فرمایا اور کہا ''وہ میرا طوطا ہے''۔

حضرت بڑے فیاض تھے امیر ہو یا فقیر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد یا تمک یا کوئی اور چیز ضرور دیتے تھے۔ مجھے[12] انھوں نے ایک تنکہ عنایت فرمایا تھا۔ اس سفر میں میں[12] نے ان کی ایک کرامت بھی دیکھی۔ جس وقت ہم تینوں آدمی امیٹھی، حضرت سے ملنے جارہے تھے وہ صورت سے فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد وہی شخص اسی طرح حاضر ہو کر حضرت کے دروازہ پر آیا اور سوال کرنے لگا۔ بڑی عاجزی اور لجاجت کی لیکن حضرت نے اسے کچھ نہ دیا۔ حاضرین جو ان کی سخاوت اور دریادلی سے واقف تھے انھیں نہایت تعجب ہوا۔ انھیں متعجب دیکھ کر حضرت نے اچانک فرمایا ''اس چور کو دیکھو کہ راہزنی بھی کرتا ہے اور فقیری بھی'' پھر آپ نے اسے مجلس سے نکال دیا لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس وقت ہم نے جو غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چوری میں پکڑا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ دوسرے دن بھی پیش آیا جس کا ذکر طویل ہو جائے گا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو حسین خان کے ہمراہ ہم لوگ پرگنہ سے حملہ کرتے ہوئے امیٹھی پہنچے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فجر کی نماز شیخ ممدوح کے پیچھے ادا کریں اس لیے تیزی سے کوچ کرتے رہے۔ صبح ہو چکی تھی، ابھی 3 کوس باقی رہ گئے تھے۔ ہمیں جماعت کے فوت ہو جانے کا افسوس ہوا اور ہم نے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑایا یہاں تک کہ طلوع آفتاب سے بس کچھ ہی پہلے شیخ موصوف کی مسجد میں پہنچے۔ اس وقت گھر سے باہر تشریف

لائے، جماعت قائم کی اور نماز پڑھائی۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کہ وقت باقی نہیں رہا۔ تاہم ہمیں جماعت کا شرف حاصل ہوگیا۔ اتنی دیر سے جماعت کرنا حضرت کے معمول کے خلاف تھا کیونکہ وہ ہمیشہ صبح کی نماز ایسے وقت ادا کرتے تھے کہ ابھی صبح صادق کے طلوع کا بس گمان ہی ہوتا تھا۔ اسی دن شام کو انھوں نے مسجد میں تصوف پر تقریر کی اور خواجہ حافظ کے چند شعر پڑھے۔ بیان کے دوران حسین خان مرحوم کے ایک ساتھی نے پوچھا "خواجہ حافظ کس کے مرید تھے؟" فرمایا "خواجہ نقشبندی کے" کسی بات پر ایک شخص نے پوچھا "گھوڑے کا گوشت امام اعظم کے مسلک میں حلال ہے"؟ آپ نے فرمایا "امام اعظم نے خود گھوڑے کا گوشت کھایا تھا"۔ جب آپ اس شعر پر پہنچے

صوفیان در دمی دو عید کنند
عنکبوتان مگس قدید کنند

مجھے اپنے خلوص پر پورا بھروسا تھا اس لیے میں نے بالکل ہی خالی ذہن ویسے ہی پوچھ لیا "دو عید سے کیا مراد ہے"؟ یہ سوال انھیں پسند نہ آیا اور فرمایا، یہ بات بایزید اور جنید کے پوچھنے کی ہے، شبلی اور منصور کے پوچھنے کی ہے تو کہاں اور یہ سوال کہاں؟ پھر اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور بڑا نادم ہوا۔ حسین خان حیرت سے دانتوں میں انگلی دابے میری طرف دیکھ رہا تھا اور تمام ساتھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ میری خوش نصیبی سے اس وقت عید کے چاند کے دکھائی دینے کا شور بلند ہوا اور لوگ مبارک باد دینے اور مصافحہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مجھے (12) موقع مل گیا اور میں وہاں سے کھسک کر مغرب کے وقت اس خیمہ میں جو مسجد سے متصل باغ میں لگا ہوا تھا نہایت رنجیدہ اور اداس چلا گیا اور زندگی سے بھی بیزار ہوگیا۔ حضرت شیخ جب اندر تشریف لے گئے اور مہمانوں کے لیے انھوں نے دسترخوان لگوایا تو اس وقت پوچھا "فلاں کہاں ہے؟ ان کے لڑکے شیخ محمد نے جواب دیا: "وہ اپنی اس گستاخی کی وجہ سے مسجد میں ٹھہر نہیں سکا اور چلا گیا ہے۔ جماعت میں بھی وہ شریک نہیں تھا۔ یہ سن کر حضرت نے اپنے سامنے سے کھانا اور حلوہ اٹھا کر تبرکاً میرے لیے بھجوایا"۔ اس وقت مجھے بڑی

تسکین اور اطمینان حاصل ہوا اور معافی کی امید بندھ گئی!

صبح سویرے ہی حسین خان عید کے لیے لکھنؤ چلا گیا اور میں اینٹھی میں اکیلا رہ گیا۔ حضرت شیخ نے مسجد ہی میں عید کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد کتاب "عوارف" کا درس دینے لگے۔ اسی موقع پر شیخ محمد نے میرا قصور معاف کرنے کے لیے سفارش کی۔ حضرت نے سبق بند کر دیا اور بڑی مہربانی اور شفقت سے ہم(12) سے بات کی۔ میں(12) نے روتے ہوئے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ حضرت نے مجھے اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور کہا: "میرے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی اور کینہ نہیں رہتا۔ میں کسی کو کچھ کہتا ہوں تو صرف نصیحت اور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کہتا ہوں اور رسول اللہ کی طرح جس کسی کو سخت بات کہہ دیتا ہوں تو اس کا نتیجہ بھلائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر کسی پر لعنت بھی بھیجوں تو وہ رحمت بن جاتی ہے"۔ پھر آپ نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر مجھے عنایت کی اور پاس کے حجرے میں مجھے اپنے ساتھ تنہا لے کر گئے اور فرمایا: "میرے سامنے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو"۔ یہ دوگانہ میں نے ایک عجیب ہی حالت میں ادا کیا۔ حضرت نے فرمایا "لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں طالبوں کو تلقین نہیں کرتا میں انھیں کیا تلقین کروں، میری تلقین تو بس یہی ہے کہ زبان پر خدا کا ذکر رہے اور دل شکرگزار رہے"۔ اس کے بعد بس حضرت کا دریا جوش میں آ گیا اور بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس موقع پر حضرت کی روش کے برخلاف کسی نے ہندی راگ چھیڑ دیا تھا اور اسے سن کر دو سندھی درویش نہایت درد بھری آواز میں آہ و فریاد کرنے لگے۔ اس وقت میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھ(12) پر حال طاری ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ: "صحابہ جب نو مسلم بدوؤں کو دیکھتے تھے کہ وہ قرآن مجید سن کر بری طرح رونے لگتے ہیں تو خود پر افسوس کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے فرمایا کرتے تھے۔ "کنا نحن امثالکم ثم قست قلوبنا ای تمکنت واستقرت قلوبنا" (ہم بھی تمہارے ہی جیسے تھے لیکن اب ہمارے دل ٹھہر گئے ہیں) اس کے بعد حضرت نے کچھ اور باتیں بیان کیں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر آپ نے مجھے(12) یہ دعا پڑھنے کی اجازت دی جسے میں(12) ہمیشہ پڑھتا رہتا

ہوں "اللھم انی اعوذبک من الصم والبکم والجنون والجذام والبرص"۔

جب میں(12) حضرت سے رخصت ہو کر لکھنؤ میں آ کر مقیم ہو گیا تھا، کبھی نمک، کبھی خاص چاول اور کبھی مٹی کا پیالہ وغیرہ میرے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت کی عادت تھی کہ عموماً مجلسوں میں بیٹھے ہوئے نمک چاٹا کرتے تھے اور یہ حدیث پڑھتے تھے:
"الملح دواء سبعین داء الأسام" (نمک بجز موت کے ستر بیماریوں کی دوا ہے)۔

حضرت نے میرے(12) چھوٹے بھائی شیخ محمد مرحوم کو بھی اپنی بیعت سے نوازا تھا، چنانچہ وہ حضرت کی تھوڑی سی توجہ سے بڑا عبادت گزار اور فرشتہ خصلت بن گیا تھا اور اکثر اوقات "طے کا روزہ" رکھے رہتا تھا۔ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت، نوافل اور ذکر و اذکار میں معروف رہتا تھا۔ اس طرح اس کا ایک لمحہ بھی فضول باتوں میں ضائع نہیں ہوتا تھا اور میری(12) طرح وہ بیکار مشغلوں میں الجھا ہوا نہیں رہا:

در حق گلاب و گل حکم ازلی این بود
کین شاہد بازاری وآن پردہ نشین باشد

انہی دنوں اسی قابل رشک حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ یقین ہے کہ وہ ایمان کے سایہ تلے جنت میں خوشی سے ہوگا۔

حضرت ممدوح کی عمر 80 سال سے زیادہ ہے، ان کے یہاں پیری میں بھی اولاد ہوتی رہی۔ آپ نے 979ھ/1571ء میں انتقال کیا۔

شیخ بھکن کاکری والے

لکھنؤ کے علاقے میں کاکری(13) نامی ایک قصبہ ہے۔ شیخ بھکن اسی قصبہ کے رہنے والے تھے۔ یہ بڑے عالم، متقی اور متشرع تھے، تقویٰ اس درجہ کا تھا کہ اس معاملہ میں وہ امام اعظم ثانیؒ تھے۔ برسوں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ سات قرأتوں کے حافظ اور قاری تھے۔ شاطبی کا درس دیا کرتے تھے۔ طریقت میں میر سید ابراہیم ایرجی کے خلیفہ تھے۔ ایرجی موصوف اپنے زمانہ کے بڑے عالم گزرے ہیں۔ شیخ بھکن تصوف کی باتیں صرف

خلوت میں وہ بھی محرمانِ راز سے کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر توحید کے رموز اعلانیہ بیان کیے جائیں تو وہ یا تو کہنے والے پر پڑتے ہیں یا سننے والوں پر بظاہر تو وہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی کرتے تھے۔

ان کے لڑکے بڑے صاحب کمال ہیں۔ وہ سب کے سب علم و حکمت، فضل و تقویٰ سے آراستہ ہیں۔ میں ان بزرگوں کی خدمت میں محمد حسین خان مرحوم کے ہمراہ لکھنؤ میں حاضر ہوا تھا۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ اس وقت کوئی شخص علم منطق کی کوئی کتاب درس لینے کے لیے ان کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا "علوم دینی کی کوئی کتاب پڑھو"۔ ان کی وفات 891ھ/1456ء میں ہوئی۔

شیخ سعدیؒ

یہ بڑے مشائخین میں سے تھے۔ اپنے والد بزرگوار شیخ محمدؒ سے خلافت پائی۔ شیخ محمد وہی بزرگ ہیں جنھوں نے "شاطبی" پر فارسی میں ایک شرح 70 جزو میں لکھی ہے۔

شیخ سعدیؒ اکثر وجد و حال میں رہتے تھے، کیا ظاہر کیا باطن سراپا خلوص تھے، ہمیشہ خوش، بشاش اور مسکراتے رہتے تھے۔ اپنی عمر نہایت خوش اوقاتی اور آزادگی سے گزاری۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو رخصت کرتے ہوئے ایک پرچہ دیا جس میں یہ شعر درج تھا:

دیدہ سعدی و دلِ ھمراہ تست
تا چنداری کہ تنہا میروی

ان کا انتقال 1002ھ/1593ء میں ہوا۔

سید تاج الدینؒ

شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ یہ بزرگ "دعوتِ اسماء" کے مجاز تھے۔ ریاضت، فقر اور توکل میں ان کی اپنی ایک شان تھی۔ نہایت ایثار پیشہ اور سخی آدمی تھے۔

جب لکھنؤ آئے تو بہت سے آدمیوں نے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا اور ارشاد و اصلاح کا مرتبہ حاصل کرلیا۔ ان کا لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا تھا۔

شیخ محمد قلندر لکھنوی

پہلے یہ بزرگ سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں سپاہگری کا پیشہ کرتے تھے، جس وقت بابر بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کیا، سپاہ گری ترک کرکے فقر و عزلت گزینی کی راہ اختیار کرلی اور شیخ بہلول کے مرید بن کر عبادت اور ریاضت میں مصروف ہوگئے۔ اپنے پیر سے اسماء الٰہی میں سے چند اسماء کی دعوت و تلقین حاصل فرمائی اور ایک باغ میں جس کے اکثر درخت انھوں نے خود لگائے تھے، گوشہ نشین ہوگئے اور لوگوں سے میل جول اور تعلقات کا دروازہ بند کردیا۔

کہتے ہیں کہ تیس سال سے زیادہ ہونے کہ وہ صرف دودھ پر گزارہ کرتے ہیں اور اناج وغیرہ کچھ نہیں کھاتے۔ ایک دن محمد حسین خان ان کی ملاقات کے لیے گیا، میں(14) بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ایک بلی شیخ کے پاس آکر درد بھری آواز میں چلانے لگی۔ آپ نے فرمایا یہ بلی فریاد کر رہی ہے کہ: "تم لوگوں نے آکر اپنے بھی اوقات ضائع کیے اور صاحب خانہ کے بھی نیز حضور قلب میں خلل پیدا کردیا"۔

شیخ نظام نارنولیؒ

نارنول ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ شیخ نظام نارنولی سلسلۂ چشتیہ میں شیخ خانو گوالیری کے جو قلعہ گوالیار میں رہتے تھے، مرید ہیں۔ لیکن انھوں نے زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی شیخ اسمٰعیل سے ہی کیا اور تربیت و خلافت حاصل کی۔ ان کے بھائی ایسے صاحب ذوق صوفی تھے کہ ہمیشہ ان پر جذب و شوق کی حالت طاری رہتی تھی۔ عزلت نشین اصحاب خانقاہ کے احوال و کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ خود بھی بڑے صاحب تصوف اور اہل دل بزرگ تھے۔

میں[14] نے معتبر آدمیوں اور شیخ کے مریدوں سے سنا ہے کہ وہ چاندگرہن کی راتوں میں اپنے مریدوں کو بالنگنی کا تیل کھلاتے تھے۔ یہ ہندوستان میں بڑی مشہور اور عام دوا ہے۔ اس کی تعریف میں اطباء نے رسالے لکھے ہیں۔ میں[14] نے خود بھی اس کے بعض خواص کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس تیل کے کھانے سے ان پر آخرت کے حالات کا کشف ہو جاتا تھا اور بڑے عجیب عجیب امور کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ واللہ اعلم

شیخ نظام چالیس سال تک رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن رہے، ان کے زمانہ سے آخر عمر تک ان کا یہی معمول تھا کہ ہر سال بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حضرت قطب عالم خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کی زیارت کے لیے پیدل دہلی جایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بڑھاپے اور بعض دوسرے مواقعات کی وجہ سے خواجہ موصوف کا عرس انھوں نے نارنول میں منایا۔

شیخ نظام اپنے پیر کی طرح کسی کی تعظیم نہیں بجا لاتے تھے۔ امیر ہوں یا غریب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طرح نہایت بے تکلفی اور سادگی سے ملتے تھے، یہی روش مرید بنانے میں بھی ملحوظ رہتی تھی۔

میں[14] نے انھیں ایک بڑے مجمع میں دیکھا تھا۔ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ ان کی وفات 997ھ/1589ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''آہ نظام'' ہے۔

شیخ اللہ دیہ خیرآبادیؒ

بڑے متبحر عالم تھے۔ ابتدائے حال میں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ شیخ صفی خلیفہ شیخ سعید سے ارادت و ارشاد کا تعلق تھا۔ ابتدائی دور میں علوم ظاہری کی تدریس میں مشغول رہے، مگر بعد میں انھوں نے کلیتاً صوفیاء کا مسلک اختیار کر لیا۔ فقر و توکل، تجرید و ایثار اور تصوف کے تمام لوازمات پر عمل پیرا رہے۔ ان پر ہمیشہ سماع و وجد کا ذوق غالب رہتا تھا۔ درود ہر وقت ورد زبان رہتا تھا اور محض اس لیے کسی کی ضیافت قبول نہیں کرتے تھے کہ ان کے تمام بچے اور متعلقین فقر و فاقہ میں اپنے والد کی طرح صبر و شکر کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کے صاحبزادے شیخ ابوالفتح جو صاحب سجادہ اور اپنے وقت کے بڑے عالم اور ظاہر و باطن میں اپنے والد کا مکمل نمونہ ہیں مختلف علوم پر بڑے پایہ کی تصانیف کے مالک ہیں۔

شیخ اللہ بدیہ کے دروازہ سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ ایک دن محمد حسین خان نے شیخ سے پوچھا، سالار مسعود جن کے معتقد ہندوستان کے عوام ہیں، کیسے آدمی تھے؟ آپ نے جواب دیا: ''ایک افغانی تھا جو شہید ہوگیا''۔

وہ آخر عمر میں بادشاہ کی طلبی پر فتح پور تشریف لائے تھے اور اس ''خلیفہ زمان'' (اکبر) سے ملاقات کی تھی۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کو بلانے جب آدمی گیا تو وہ خانقاہ سے باہر سیر کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ طلبی کی اطلاع دی گئی تو وہیں سے کچھ تیاری کیے بغیر ہی ساتھ ہوگئے۔ ان کے خادم سفر کا سامان اور پالکی پیچھے لے کر آئے۔ اکبر کو یہ بات سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ جب اکبر نے ان سے کچھ دریافت کیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ اکبر نے کچھ رقم انھیں دی، ان کی مدد معاش کا حکم صادر کیا اور اسی وقت رخصت ہونے کی اجازت دے دی شیخ کی وفات 993ھ/1585ء میں ہوئی۔

شیخ داؤد جھنی والؒ

جھنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے آئے تھے اور ملتان کے علاقے میں بمقام سیت پور مقیم رہے۔ شیخ اسی سیت پور میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد والدہ بھی فوت ہوگئیں اور وہ یتیم و یسیر رہ گئے۔ ان کی سرپرستی اور تربیت ان کے بڑے بھائی میاں رحمۃ اللہ نے کی۔ جس وقت وہ قرآن کا سبق لیا کرتے تھے تو آنسو ان کے رخساروں پر بہنے لگتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ پڑھنے پڑھانے کی مصیبت میں نہ ڈالو، بس اللہ کے سپرد کردو۔ لوگوں نے آخر سمجھ لیا کہ انھیں کسی معلم کی ضرورت نہیں ہے:

بہ تعلیم آداب اور چہ حاجت
کہ او خود ز آغاز آمد مؤدب

(اس کو تعلیم کے آداب کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ابتداء سے ہی مؤدب رہا ہے)

مشہور ہے کہ انھوں نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا تھا کہ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی چند آیتیں ان کو سکھائیں۔ جب بھی تفریح کی خاطر کھیلنے جاتے تو حیران رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ان لڑکوں کے چہرے نوچے ہوئے، ان کے جسم خون آلودہ اور کھال ادھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض مجھے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کے سر نہیں ہیں۔

ایک لمبے عرصہ کی مصیبتوں کے بعد حضرت اپنے وطن سے سنگھرہ، پھر وہاں سے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ نے مولانا عارف جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل اُچھ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور کم عمری ہی میں اس خوبی کے ساتھ شرح اصفہانی پڑھ لی، ان کے ساتھ جو ولایتی(۲) طالب علم پڑھتے تھے وہ ان کی ذہانت و ذکاوت پر حیران رہ گئے۔ ان کے استاد کہا کرتے تھے کہ جس طرح ہم اپنے استاد مولانا جامی کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے اسی طرح یہ نوجوان بھی ایسا صاحب مرتبہ ہوگا کہ لوگ اس کے دیدار کو ہی بڑی برکت جانیں گے اور اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے بالآخر یہ ظہور میں آکر رہا:

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کچھ عرصہ بعد آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ اس دوران خود بخود آپ پر ایک خاص جذبہ طاری ہوا اور حضرت غوث الثقلین سے ایک باطنی مناسبت پیدا ہوگئی۔ عالم مراقبہ میں وہ جو کچھ سوال کرتے تھے اس کا جواب انھیں مل جاتا تھا۔ پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اسی عالم جذب میں سر و پا برہنہ دیپال پور کے علاقے کے جنگل میں جسے شیر گڈھ کہا جاتا ہے اور جو جنگلی جانوروں کا مرکز ہے گھومتے رہتے تھے۔

ما عاشق سرگشتۂ صحرائی و مشقیم

کبھی کبھی جب وہ حضرت مخدوم عالم شیخ شکرؒ کے مزار پر چلے جاتے تو وہاں ان کو باطنی اشارے ملتے، بشارتیں سنائی دیتیں اور صاحب مزار سے گفتگو ہوتی، جس کی تفصیلات اس مختصر کتاب میں درج نہیں کی جاسکتی البتہ شیخ ابو المعالی ولد شیخ رحمت اللہ کی تصنیف ''نغمات داؤدی'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس جنگل میں حضرت ممدوح نے 20 سال گزار دیے۔ اس کے بعد آپکی توجہ سلوک وارشاد کی طرف مائل ہوئی لیکن مشکل یہ تھی کہ بظاہر آپ کا کوئی پیرومرشد نہ تھا۔ حضرت غوث اعظمؒ نے اپنی روحانیت سے آپ کی راہنمائی کی کہ سلسلۂ طریقت کے تحفظ کے لیے وہ شیخ حامد قادری ولد شیخ عبد القادر ثانی کے ہاتھ بیعت کریں۔ شیخ حامد چونکہ بارہا خود ان سے مقامات سلوک میں مدد لیتے رہتے تھے اور ہر مشکل مرحلہ میں ان سے دعا کراتے رہتے تھے اس لیے ان کو اپنا مرید بنانے، شجرہ لکھ کر دینے میں تأمل تھا۔ یہاں تک کہ شیخ داؤد خود ایک دن ستگوھ جہاں مخدوم شیخ حامد مقیم تھے تشریف لے گئے اور نہایت عالم جذب میں ان سے فرمایا کہ ''یہ دیکھو خود غوث اعظم تشریف لائے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ سجادۂ عصا، شجرۂ خلافت، گھوڑا پالکی اور دوسرے لوازمات پیشوائی میرے حوالہ کردو''۔ جب شیخ مخدوم کو بھی اس معاملہ میں عین الیقین حاصل ہو گیا تو انھوں نے شیخ داؤد کی تمام فرمائشوں کی تکمیل کر دی اور وہ وہاں سے شیر گڑھ کے نئے شہر میں آکر چھنی کے قریب مقیم ہو گئے۔ یہ مقام ملتان اور جنن کے درمیان تھا، آپ نے یہاں قیام فرما کر سلسلۂ سہروردیہ و چشتیہ اور قادریہ کو رواج دیا۔ ان کے تلقین وارشاد کی ایسی شہرت ہوئی کہ تا قیامت یہ شہرہ ختم نہیں ہوسکتا۔

جس زمانہ میں مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری اہل اللہ کے درپے آزار ہوگیا اور بعض طالبان حق کو شہید بھی کرادیا تھا۔ سلیم شاہ افغان سور نے گوالیار سے حضرت کی طلبی کے لیے فرمان بھجوایا تھا۔ آپ تنہا ایک دو خادموں کے ساتھ گوالیار گئے۔ سلیم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت واحترام کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اسی جگہ آپ نے قیام کیا۔ سلیم شاہ نے نہایت خلوص وعقیدت کے ساتھ حضرت سے بات چیت

کی۔ اس رنگ کو دیکھ کر ہی فتنہ پردازوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ ادھر اُدھر کھسک گئے اور ایسے روپوش ہوئے کہ تلاش کے باوجود ان کا پتہ نہ چل سکا۔ مخدوم الملک نے کہا: ''یہ جھوٹ بولنے والے آدمی نہیں ہیں''۔ کچھ گفتگو کے بعد آپ نے دریافت کیا: ''ہم فقراء کو طلب کرنے کا آخر سبب کیا تھا؟'' مخدوم الملک نے کہا، ہم نے سنا تھا کہ: ''آپ کے مرید ذکر کے وقت ''یا داؤد یا داؤد'' کا نعرہ لگاتے ہیں''۔ آپ نے جواب دیا یہ سننے والے کی غلط فہمی ہے میرے مرید تو ''یا ودود، یا ودود'' کا ذکر کرتے ہیں۔

مخدوم الملک کے ساتھ آپکی ایک دن یا ایک رات نشست رہی۔ آپ نے اسے حقائق ومعارف کی باتیں بتائیں اور چند نصیحتیں بھی کیں۔ وہ نہایت متاثر ہوا اور آپ کو اسی مقام سے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک مرتبہ ان کی مجلس میں میاں حسام الدین طلیبہ(۱۸) کے زہد وتقویٰ کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے کہا افسوس میاں ظاہری رسوم واخلاق میں پھنس کر حق تعالٰی کی محبت ذاتی سے دور رہ گیا''۔

حضرت نہایت ایثار پیشہ اور فیاض دست تھے۔ ہر سال ایک یا دو بار اپنا سارا مال جو ھدیوں اور نذرانوں میں جمع ہو جاتا تھا' راہ خدا میں لٹا دیتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے سکونتی حجرہ میں اس حال میں رہتے تھے کہ بجز مٹی کے پیالے اور پرانے بوریئے کے کچھ اور باقی نہ رہتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس روپیہ جمع ہو جاتا اسی طرح خیرات کر دیتے۔ اس دریا دلی وکشادہ دستی کے باوجود حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر انکی خانقاہ کے لنگر سے تقریباً ایک لاکھ زائرین کیا خاص، کیا عام سبھی کو کھانے پینے کی اشیاء دی جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کے لنگر کی رونق اسی طرح قائم ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

آپ کی زبان مبارک سے بعض بڑے موثر کلمے ادا ہوئے ہیں مثلاً ''بسم اللہ الدلیل الھادی فی ظلمات البحار والبوادی'' اس پاک کلمہ کا اثر خطرات اور حادثات کے موقع پر ظاہر ہوا ہے اور بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے: ایسی ہی بہت سی تسبیحات

ذکر اور اذکار آپ سے منسوب ہیں۔ آپ نے اپنی مہر کا سجع خود ہی تجویز کیا تھا:

محی داؤد عن اسم و رسم

فان الفقر یمحو کل وسم

میں(17) بیرم خاں کے عہد میں جو بلا شبہ ایک بہترین زمانہ تھا اور اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی کی طرح دلکش و بارونق تھا، آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس وقت میں نے بعض درویشوں سے آپ کی شان بزرگی کے قصے سنے تھے اور آپ کی عقیدت و محبت کا بیج میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانہ میں چند بار میں(18) نے حضرت کی خدمت میں جانے کے ارادے سے شیر گڑھ کا ارادہ کیا لیکن والد مرحوم(19) مانع ہوئے اور راستہ ہی سے مجھے واپس لوٹا لیا۔ بعض اوقات کچھ اور موانعات پیدا ہوئے کہ میں(21) اس برکت سے محروم ہی رہا اور انتظار میں 12 سال نکل گئے۔

ایک مرتبہ حضرت کا ایک مرید شیخ کالو نامی جس کی زبانی میں(20) حضرت کا حال سن کر غائبانہ معتقد ہو گیا تھا، بداؤں آیا۔ وہ جب بھی ملتا مجھ سے کہتا تھا: "بڑا افسوس ہے کہ میاں صاحب زندہ ہیں اور تم ان سے ملنے ایک بار بھی نہیں گئے۔ اس کی یہ بات میرے خرمن اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ایک اچھا سبب پیدا کر دیا کہ محمد حسین خاں نے جس کی ملازمت سے میرا(21) تعلق تھا ابراہیم حسین میرزا کے تعاقب میں کولہ و کانت سے پنجاب کی طرف کوچ کیا اور مجھے اس سعادت سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں پنجاب سے حضرت کی ملاقات کے لیے شیر گڈھ پہنچا میں نے حضرت کے جمال مبارک میں ایسا حسن پایا کہ کسی صاحب حسن کو اس سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ گفتگو کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے آپکے دانتوں سے نور برستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جس سے دل کی تاریکی چھٹ جاتی تھی۔

میں(21) وہاں چند دن مقیم رہا۔ اس دوران کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جس میں کہ سو، سو، پچاس پچاس ہندو اپنے گھرانوں سمیت آ کر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔ آپکی شخصیت کی وجہ سے مجھے تو اس شہر کے در و دیوار شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

حضرت نے مجھے(21) ایک ٹوپی عنایت کر کے کہا کہ میری طرف سے اپنے اہل وعیال میں تم نائب رہو میرا یہی طریقہ ہے۔ پھر آپ نے میرے متعلقین کے لیے اپنے گھر سے ایک دوپٹہ اور رومال منگا کر عنایت کیا۔ میں نے عرض کیا اگر ایک پیراہن بھی عطا ہو جائے تو میرے لیے نور علی نور ہے۔ بڑے تامل کے بعد فرمایا ''وہ بھی وقت پر مل جائے گا''۔ میں(22) نے حضرت سے بعض دلی مقاصد اور اسرار بیان کیے اور ان کے جواب سنے، اس کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ اسی اثناء میں حضرت بھی کمزوری کی وجہ سے پالکی میں بیٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں(23) نے ان کی پالکی کا پایہ اپنے کاندھے پر لے لیا اور کئی قدم چلا۔ اس وقت مجھ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ضبط نہ کر سکا۔ حضرت نے پالکی روکی اور مجھے بہت سی معرفت و محبت کی باتیں بتائیں۔

جس دن میں رخصت ہو رہا تھا میں نے میاں عبدالوہاب کے وسیلے سے حضرت سے عرض کیا کہ ہندستان کے مشائخ کہتے ہیں کہ ایک سید کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ ان میں سے اکثر نے ایک سید پر اتفاق بھی کر لیا ہے جس کے آباو اجداد اس سے پہلے کچھ عرصہ تک دہلی اور بدایوں پر حکمراں بھی رہے ہیں اور اب وہ لوگ جہاد کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حضرت غوث اعظمؒ کی طرف سے اس اہم خدمت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے سرحد کے بعض امیروں کو بھی اپنا حامی بنالیا ہے، بعض لوگوں نے مختلف مقامات پر بشارت پا کر اس گروہ میں شرکت کر لی ہے اور اب یہ سب اپنے ارادوں کو عملی صورت دینے کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے پوچھا اس سید کی وضع اور حالت کیسی ہے؟ میں(24) نے کہا وہ ایک گوشہ نشین متشرع اور متوکل فقیر ہے، بڑی عبادت و ریاضت کرتا ہے۔ دن کو مقبروں میں بیٹھا رہتا ہے، رات کو اپنے حجرہ میں عبادت کرتا رہتا ہے، سپاہ گری کے فن میں بھی بے مثل اور لاثانی ہے، اس کے اخلاق و عادات نہایت شائستہ ہیں، شادی شدہ کنبہ والا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس جماعت کے لوگ درویش نہیں معلوم ہوتے کہ حضرت غوث اعظمؒ پر یہ افترا باندھتے ہیں اور اس بچارے سید کا بھی خانہ

خراب کرنا چاہتے ہیں ان کی وہ ساری بشارتیں محض شیطانی وساوس ہیں۔ بھلا حضرت غوث اعظمؒ اس بات پر کس طرح راضی ہو سکتے ہیں؟ ان کا حکم تو یہ ہے کہ دنیا کی محبت بالکل دل سے نکل جائے اور خلوص و سچائی کے ساتھ عشق خداوندی حاصل کیا جائے، حرص و ہوس کا نام تک باقی نہ رہے۔ عبادت اور ریاضت کا طریقہ چھوڑ کر دنیا کے جال میں پھنسنا کہاں کی ہوش مندی ہے۔ میری جانب سے تم اس سید سے کہنا کہ تم نے جو ارادہ کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم کو استقامت عطا کرے، اگر تمہارے دل میں اس دنیائے فانی کی لذتوں کا ذرا سا شائبہ بھی رہ گیا ہے تو پہلے تم اس کو دور کرنے کی فکر کرو اور اس نادان جماعت کے بہکانے سے مغرور ہو کر بے راہ نہ ہو جاؤ۔ طالب دنیا کا منتہا و مقصود صرف سلطنت ہے جو چند روزہ اور فانی ہے، طالب حقیقی کو جاودان نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اگر خدا کا طالب اپنے مطلب سے محروم رہ کر حسرت ہی میں رہ جائے تو اس کی ناکامی اول الذکر کی کامیابی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں انھوں نے بڑی نصیحت آمیز باتیں کیں جنھیں سن کر حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ سب بے اختیار رونے لگے، میں بھی وہاں سے روتا اور آنسو بہاتا رخصت ہوا۔

اس زمانہ میں الغ بیگی مرزاؤں کی بغاوت کی وجہ سے شیر گڑھ سے لاہور تک کا راستہ خطرناک ہو گیا تھا اور میں تنہا تھا، اس لئے آپ نے اپنے ایک خادم کو میرے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شیخ ابو اسحٰق مہر کی خدمت میں جو حضرت کے بڑے اچھے خلیفہ تھے، پہنچا دے پھر وہ مجھے حسین خان کے لشکر میں جو طلبنہ سے لاہور آیا ہوا تھا اور وہاں سے کانت و گولہ جانے والا تھا، پہنچا دیں۔ غرض میں لاہور پہنچ کر حسین خان کے لشکریوں کے ساتھ ہندوستان کے لئے روانہ ہو گیا ایک دن سہارن پور کے مقام پر ایک باغ میں بیٹھا ہوا حضرت کی یاد میں ملول تھا کہ ایک مسافر قادر پیراہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ: "یہ لے لو ایک پیر بزرگ کے یہاں سے یہ مجھے حاصل ہوا تھا اور مجھے اس کے عوض کچھ راستہ کا خرچ دے دو"۔ میں(22) نے جب اس کرتے کے ملنے کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں میرزا ابراہیم حسین کے لشکر میں تھا جب اسے شکست ہوئی تو سپاہیوں کا

ایک گروہ جس میں میں[23] بھی شامل تھا لٹ لٹا کر اس حال میں کہ پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں رہے تھے شیرگڑھ میں حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچا۔ انھوں نے ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عنایت کیا۔ جب میری باری آئی تو یہ کرتا اپنے بدن سے اتار کر مجھے دے دیا۔ میں نے اسکو پہننا بے ادبی جانا اور ہدیہ و تحفہ کے طور پر اسے محفوظ رکھے رہا۔ اب وہ میں تمھیں دے رہا ہوں۔ میں[24] نے اسے تبھی سے لے لیا

نکہت پیراہنت آمد بہ من   لذت جان یافتم زان زانچہ
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا   شد قبول الحمد اللہ فاتحہ

مجھے حضرت کی وہ بات یاد آگئی کہ فرمایا تھا ''کرتا بھی اپنے وقت پر تم کو مل جائے گا''۔ بلاشبہ یہ آپکی کرامت تھی۔ میں اس پیرہن یوسف کو جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں

شوق تو در ضمیر من و مہر تو در دلم   با شیر اندرون شد و با جان بروں شود

شیخ داؤد جہنی وال اپنے وقت کے قطب اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ نے بڑی بڑی ریاضتیں اور سخت مجاہدے کیے تھے۔ ابتدا میں علوم ظاہری حاصل کیا اور ان کی تعلیم بھی دی، پھر ایسے متوکل اور خانہ نشین ہوئے کہ کبھی اہل دنیا سے ملنے نہیں گئے۔ صرف ایک بار شیرگڑھ سے گوالیار، وہ بھی سلیم شاہ کے بلانے پر گئے تھے۔ اکبر بادشاہ جب چنن گیا تو اس نے شہباز خان کو شیخ کے بلانے کے لیے بھیجا تا کہ وہ ملاقات کا موقع دیں، لیکن آپ نے عذر فرمایا کہ ہماری غائبانہ دعا ہی کافی ہے۔ غرض آپ دنیا داروں کی صحبت سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور ''الفقر فخری'' پر عمل کر کے ہمیشہ بخشش و ایثار سے کام لیتے تھے۔ جو طالبان حق آتے ان کو تلقین و ارشاد فرماتے۔ جو شخص بھی حضرت کی صحبت میں پہنچ گیا وہ آپ کے فیض روحانی سے مستفید ہو کر لوٹا۔

آپ نے 982ھ/1574ء میں وصال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات ''یا شیخ داؤد ولی'' ہے۔

شیخ ابن امروہہؒ

سالک طریقت اور مجذوب تھے۔ اس حالت جذب کے باوجود شریعت کے لوازم ترک نہیں ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی پابندی کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ ان کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ آزادانہ زندگی گزارتے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔

جس زمانہ میں میں[25] میاں شیخ داؤد سے مل کر پنجاب سے واپس ہوا تھا اور امروہہ کے راستے بدایوں جا رہا تھا تو حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت وہ کسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوئے، بغیر کلام پاک کے ایک آیت بیان کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ انھوں نے اس وقت جزا اور صبر کرنے والوں کے اجر کی فضیلت بیان کی اور اس سلسلہ میں آیت ''والباقیات الصالحات'' میری طرف دیکھ کر تلاوت کی۔ اس تلقین کا مطلب جلد ہی ظاہر ہوا۔ ان کا اشارہ کسی مصیبت کی طرف تھا، چنانچہ میری[26] ایک بچی تھی جس کو میں بہت چاہتا تھا۔ میں ابھی سفر میں تھا کہ وہ بدایوں میں فوت ہو گئی۔ ان کے وہ تسلی آمیز ارشادات غالباً میرے ہی لیے تھے۔ واللہ اعلم۔ ان کی وفات 987ھ/1589ء میں ہوئی۔

خواجہ عبدالشہیدؒ

یہ خواجکا خواجہ کے صاحبزادے اور خواجکا خواجہ حضرت خواجہ احرار کے لڑکے ہیں۔ جس وقت خواجہ عبدالشہید پیدا ہوئے تو لوگ انھیں خواجہ احرار کی خدمت میں لے کر گئے۔ حضرت نے ان کو گود میں لے کر فرمایا: ''مرد حق آگاہ بنے گا''

خواجہ عبدالشہید ظاہری اور باطنی کمالات کا مجموعہ تھے۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ ان کی شخصیت انسانی کمالات کا آئینہ تھی۔ خلق خدا نے ان کی تلقین و ہدایت سے بڑا فیض اٹھایا۔ وہ طریقہ سلوک میں خواجہ احرار کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سمرقند سے ہندستان آ کر یہاں 18 سال تک بسر کیے۔ 982ھ/1574ء میں فرمایا کرتے تھے: ''ہماری رحلت کا وقت قریب آ چکا ہے اور یہ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم

اپنی ہڈیوں کو سمرقند میں آبائی قبرستان میں پہنچادیں''۔ چنانچہ وہ سمرقند کے لیے روانہ ہوگئے۔ جس وقت وہ کابل پہنچے تھے تو میرزا شاہ رخ نے کابل والوں کو گھیر لیا تھا اور بدخشاں جارہا تھا۔ خواجہ صاحب کی سفارش سے تقریباً 10 ہزار آدمی ظالموں کی قید سے رہائی پاگئے۔

خواجہ صاحب سمرقند پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ مدفون ہوئے۔ خواجہ صاحب کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ ان کی کرامتوں کا ذکر کر کے ان کے مراتب کو ظاہر کیا جائے۔

میں نے حضرت کا دیدار اس وقت کیا تھا جب کہ شاہی لشکر پٹنہ سے واپسی میں بھون گاؤں اور چپالی کی حدود میں پہنچا تھا۔ آپ اکبر بادشاہ سے وداع ہونے کے لیے تشریف لانے تھے، میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھا۔ ملاقات اور گفتگو کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

شیخ ادھنؒ جونپوری

چشتی سلسلہ میں اپنے والد شیخ بہاؤالدین کے مرید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مقتدر اور پیشوا تھے، طویل عمر پائی، ان کی زندگی عمر طبعی سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ ان کے لڑکے تک ان کے سامنے ستر ستر، اسی اسی برس کے ہوگئے۔ اسی طرح پوتوں کی بھی ان کی زندگی میں لمبی عمریں ہوئیں۔

شیخ ادھن نے اپنی ساری زندگی عبادات اور حصول معرفت میں گزاری، علوم ظاہری بھی انھوں نے بہت حاصل کیے تھے لیکن کبھی درس نہیں دیا سماع کا بڑا ذوق تھا۔ آخر عمر میں جسمانی کمزوری کی وجہ سے وضو بنانے اور نماز پڑھنے اور ضروری حاجتوں کے لیے خادموں کی مدد کے بغیر اٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس حال میں بھی اگر راگ کی آواز کان میں پڑجاتی تو سماع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، پھر ان پر ایسا حال آتا کہ چند آدمی بھی مل کر ان کو بہ مشکل سنبھال سکتے۔ فرض نماز کے ادا کرنے میں بھی یہی حال تھا۔ سنت اور نفل تو

بیٹھ کر پڑھ لیتے لیکن فرض کھڑے ہو کر ادا کرتے تھے اور کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

مشہور ہے کہ ان سے کرامتیں بے تکلفی سے صادر ہوتی رہتی تھیں۔ انھیں اللہ نے بکثرت اولاد دی تھی۔ محفل میں جب وہ اپنے ہوش مند سفید سفید داڑھی والے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو آنے والا بڑے شبہ میں پڑ جاتا کہ ان بڈھوں میں سے حضرت کون ہیں اور ان کے لڑکے کون!

اپنی محفلوں میں طریقت و حقیقت کے باب میں ایسی گہری باتیں بیان کرتے تھے کہ عوام تو عوام، خواص بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بوالہوس ان اسرار و رموز کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ ان کی یہی رمز بیانی ان کے متعلق شبہ کا باعث ہوگئی تھی۔

اکبر پہلی بار جب باغیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے جونپور گیا تھا اور جونپور پہنچنے میں ابھی 3 دنوں کا سفر باقی تھا کہ شیخ کا جونپور میں انتقال ہو گیا میں(2) ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے محروم ہی رہا۔

آپ کی وفات 970ھ/1562ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ اوحن'' سے نکلتی ہے۔

شیخ عبدالغفورؒ اعظم پوری

اعظم پور، سنبھل کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ موصوف شیخ عبدالقدوس چشتی کے مرید ہیں، ظاہری اور باطنی کمالات کا مظہر تھے۔ بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی طرح توفیق خداوندی ان کے ہمراہ رہتی تھی۔ ان تصرف واثر ملنے والوں پر بڑی جلدی ہوتا تھا۔ اگر طالب کی اہلیت و مناسبت کمتر بھی ہوتی تو شیخ کی کشش بہت جلد اسکو آگے بڑھادیتی اور وہ بے اختیار خدمت گزاری پر مائل ہو جاتا۔

اکثر اوقات دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ ان کا روح افزا کلام پریشان حالوں کے لیے راحت بن جاتا تھا اور ان کی معجز بیان زبان بے قرار جانوں کے لیے مرہم کا کام کرتی

تھی حسن صورت اور حسن سیرت دونوں میں وہ اپنے عہد میں سب سے ممتاز تھے۔ مرید بنایا کرتے تھے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تصوف کے موضوع پر کئی ایک رسالے بھی لکھے تھے۔ بلا شبہ شیخ کے ظاہری اور روحانی کمالات میں کوئی کمی نہیں تھی۔ آپ نے 975ھ/1567ء میں رحلت فرمائی اور اعظم پور میں دفن ہوئے۔

میاں وجیہ الدینؒ احمد آبادی

یہ علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی۔ اپنے زمانہ کے بڑے عابد و متقی عالم تھے۔ شریعت کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کا شعار تھا۔ ہمیشہ دینی علوم کی درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت و عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ''صرف ہوائی'' سے لے کر ''قانون''، ''شفا''، ''شرح مفتاح'' اور ''عضدی'' جیسی کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اٹھاتی رہی۔

اللہ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی، چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے۔ ان کی دعا کا بھی بڑی جلدی اثر ہوتا تھا۔ وہ کبھی اپنے طور پر دنیا دار اصحاب کے گھر نہیں گئے اگر ایک دوبار گئے بھی تو وہ بھی طلب کرنے پر نہایت اکراہ کے ساتھ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ان کا گھر ادنی و اعلی سب کا مرکز و مرجع تھا۔

وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر ہی قانع رہتے تھے۔ جو کچھ نذر نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے تھے۔

ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت و ارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے۔ انہی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی۔ صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔

سلطان محمود گجراتی کے عہد میں جب شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے بلکہ دربار میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا، ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ سلطان نے اس فتویٰ کو میاں وجیہہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کر دیا۔ چونکہ میاں وجیہہ الدین، شیخ محمد غوث کے گھر جا چکے تھے اور پہلی ہی بار ان کے شیدا و فریفتہ ہو گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔

جب شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے، کہا آپ کس لیے بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی بن گئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا، ہم اہل قال ہیں اور شیخ محمد غوث ارباب حال میں سے، ہم ان کے اعلیٰ کمالات کو نہیں سمجھ سکتے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ تھا۔ میاں صاحب کے اس رویے کی وجہ سے شیخ موصوف پھانسی سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے۔ ظاہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق پر ایسی جیسے ہمارے پیر شیخ محمد غوث کی نظر ہے۔

میاں وجیہ کا انتقال 998ھ/1580ء میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات "وجیہ الدینؒ" سے نکلتی ہے۔ واضح رہے ان چار بزرگوں سے جن کا ذکر کر آیا ہوں مجھے ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

میاں عبداللہ نیازیؒ سرہندی

نیازی پٹھانوں کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ میاں عبداللہ پہلے شیخ سلیم چشتی فتح پوری کے مرید تھے۔ آپ اس حجرہ میں جو نئی خانقاہ سے متصل ہے اور اب وہاں عبادت خانہ شاہی

کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ ہمیشہ معتکف رہا کرتے تھے۔

جس وقت شیخ سلیم پہلی بار براہ خشکی حج کے سفر پر گئے تھے، وہاں سے لوٹ کر آئے تو میاں عبداللہ نے شیخ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے ان تمام شیوخ و اہل اللہ کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک تذکرہ دیا جن سے شیخ نے عرب و عجم اور ہندوستان میں ملاقات کی تھی۔ میاں عبد اللہ نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی اور ان مشائخین سے ملاقاتیں کیں۔

سید محمد جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ میاں عبد اللہ کا گجرات اور دکن میں اس سلسلہ سے تعلق ہوا اور انھوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔ بیانہ میں آکر کچھ عرصہ تک گوشہ گمنامی میں دنیا سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرتے رہے۔ جب بیانہ کے شیخ علائی کی تحریک کی دھوم ہوئی تو سلیم شاہ نے مخدوم الملک کے بہکانے سے میاں عبد اللہ کو بھی سخت ایذائیں دیں اور انھیں بری طرح پیٹا گیا۔ وہ مرتے مرتے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گئے۔

آخر عمر میں میاں عبد اللہ نے مہدوی عقائد کو ترک کر دیا تھا اور سرھند میں عزلت گزیں ہو گئے اور تمام مشائخین کی طرح سلوک و طریقت پر کاربند ہو گئے تھے۔ جس زمانہ میں اکبر نے فتح پور میں اور ایک حجرہ کو جو شاہی محل سے متصل تھا تعمیر کرایا اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا تو اسی سلسلہ میں میاں عبد اللہ کا حال اکبر کو معلوم ہوا تھا۔ اکبر نے ان کو سرہند سے بلا کر تنہائی میں گفتگو کی اور ان کے حالات دریافت کیے۔ اس وقت انھوں نے مہدویت سے انکار کر کے کہا، چونکہ پہلے یہ جماعت مجھے اچھی معلوم ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا جب مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اکبر جب 993ھ/1585ء میں اٹک جاتے ہوئے سرہند پہنچا تو انھیں دوبارہ طلب کر کے ملاقات کی اور ان کی مدد معاش کے لیے زمین کی پیش کش کی۔ انھوں نے توکل و قناعت کی وجہ سے اسکو قبول نہ کیا لیکن اکبر نے فرمان لکھوا کر ان کے حوالہ کر ہی دیا۔

انھوں نے مجبوراً وہ فرمان لے لیا لیکن توکل وقناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس زمین سے مرتے دم تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے سارے عمل کا انحصار ''احیاء العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' پر تھا۔

الغ میرزا کی بغاوت کے زمانہ میں میں[28] محمد حسین خاں کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ان سے میں نے سرہند جاکر ملاقات کی تھی۔ ان کے سامنے ''احیاء العلوم'' کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چند مضامین انھوں نے بیان کیے۔ اس وقت محمود خاں اور اُس کے ایک شناسا نے جو سلیم شاہ کے عہد سے ان کی مصاحبت میں تھا اور شیخ علائی کی تحریک کے وقت میاں نے اسے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا: ''دل کیا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا ''دل سے ہمارا فاصلہ ہزاروں منزلوں کا ہے اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ اخلاق وعمل کی باتیں دریافت کرو'' اس کے بعد ایک بوڑھے مغل نے کسی ذکر میں میر سید محمد جونپوری کی مہدویت کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ان سے تصدیق وشہادت طلب کی۔ انھوں نے کہا: ''جس وقت میر سید محمد جونپوری نے رحلت فرمائی تھی میں فراہ میں حاضر تھا، انھوں نے مہدویت کے دعویٰ سے انکار کیا تھا اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا میں مہدی موعود نہیں ہوں'' واللہ اعلم۔ ان کی بات سن کر محمود خان نے آہستہ سے کہا میاں عبد اللہ نے بھی اچھا کام کیا کہ مہدویت کی حمایت کرکے بیچارے شیخ علائی کی گردن کٹوادی اور خود دامن بچا کر اس دائرہ سے نکل آئے۔

میاں عبد اللہ نے 90 سال کی عمر میں 1000ھ/ 1591ء میں اس سرائے فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔

شیخ ابو الفتح گجراتی

یہ حضرت میر سید محمد جونپوری کے داماد تھے لیکن انھوں نے سید صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ رشتہ ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ یہ بڑے جاہ وجلال والے بزرگ تھے۔ سلسلہ مہدویہ میں نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ تھے۔ ملک معظم اور گجرات میں شیخ گدائی کے ساتھ

ان کی خوب دوستی رہی تھی۔ بیرم خاں خان خاناں کے عہد میں کسی اہم کام کے سلسلہ میں آگرہ آگئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد جب بیرم خاں کی بساط الٹ گئی تو وہ گجرات چلے گئے۔

میں(29) اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاجی مہدی لاہوری کے داماد مولانا عبداللہ قندھاری کے ساتھ آدھی رات کے وقت شیخؒ کی خدمت میں پہنچا تھا وہ اس وقت آگرہ میں جمنا کے پار شیخ بہاؤ الدین مفتی کے محلہ میں مقیم تھے اور ایک خالی حجرہ میں تنہا بیٹھے کسی شغل میں مصروف تھے۔ ہم(30) پہنچے تو انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث: "**لایقعد قوم یذکرون اللہ الاحفتھم الملائکۃ و غشیتھم الرحمۃ و نزلت علیھم السکینہ و ذکرھم اللہ فیمن عندہ**" پڑھی اور اس کی تشریح کی، پھر انھوں نے مجھے اسی حدیث کے ذکر کی تلقین کی۔ میں(31) نے کچھ عرصہ تک اس حدیث کا ذکر کیا اور واقعی میں نے اس کا بڑا اثر اور فیض محسوس کیا اور قرآن کا مطلب مجھ پر واضح ہوگیا۔ چند بار تو ایسا ہوا کہ جو بھی آواز میرے کان میں پڑتی تھی میں اسے ذکر ہی سمجھتا تھا۔

میں(32) نے ان کے بعض مریدوں کو دیکھا کہ انھوں نے اپنے لبوں کو سریش لگا کر بند کر دیا تھا کہ بے فائدہ گفتگو سے بچے رہیں۔ بعض اس مطلب کے لئے منہ میں کنکریاں بھر لیا کرتے تھے۔

ان کی وفات کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کہاں ہوئی۔

شیخ ابو اسحاقؒ لاہوری

حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری میں مشہور تھے۔ اپنے آپ کو پیر کی محبت میں فنا کر رکھا تھا اور ایسی مناسبت پیدا کر لی تھی کہ دونوں ایک ہی مطلب کی دو عبارتیں معلوم ہوتے تھے۔ دنیا کے الٹ پھیر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خدا طلبی کا جذبہ جاگ جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے صرف دو تین رفیق تھے جو ان کے پیر کے ہمراز اور ہم زبان تھے اور لاہور

میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ کسی کو اپنے یہاں نہیں بلاتے تھے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا، ہمیشہ ایک اندھیرے حجرہ میں جو ایک باغ میں تھا، گوشہ نشین رہتے۔ جب بھی حضرت میاں سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے اور ایک رات میں 40 کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور پیر کی آستان بوسی کر کے بغیر ملے اسی وقت لوٹ جاتے۔ کیوں کہ ان کو میاں صاحب کے دیدار کی تاب نہیں تھی۔

ایک سال میں(13) بھی ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے یہاں ایک رات ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا، راستہ میں راہزن اور لٹیرے میرا راستہ روک لیتے تھے اور حیران ہو کر پوچھتے تھے اس خطرناک جنگل میں تم تنہا کہاں جا رہے ہو؟ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میں میاں شیخ ابو اسحاق کی خدمت سے حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں جا رہا ہوں تو وہ شخص ان کا نام سن کر ہی احترام و عقیدت سے پیش آتے اور کھانے پینے کے لیے دودھ، دہی وغیرہ لے آتے اور راستہ بتا کر احتیاط و حفاظت کے لیے حضرت میاں کے نام کے ذکر اور ورد کرتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اس علاقہ میں حضرت کا نام ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ غرض میں بحفاظت منزل پر پہنچ گیا۔

جس سال حضرت میاں نے وصال فرمایا تھا، ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی اسی وبا میں تین چار ماہ کے اندر اندر حضرت کے تمام اہل خاندان اور مشہور خلفاء جو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے، جن میں ترجمان اسرار میاں عبد الوہاب جن کو "میاں بابو" بھی کہا جاتا تھا شامل تھے ایک کے پیچھے ایک اس دنیا سے رخصت ہو کر حضرت سے جا ملے۔ حضرت کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد میاں شیخ ابو اسحاق بھی انتقال فرما گئے۔

میاں شیخ داؤد کے بعد سلسلہ عالیہ قادریہ کے نام لیوا ان کے صاحبزادے میاں شیخ عبد اللہ رہ گئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کے گدی نشین میاں شیخ ابو المعالی ہیں:

سلام اللہ اکر اللیالی!
علی الشیخ الصفی ابی المعالی

شیخ رکن الدینؒ

شیخ عبد القدوس گنگوہی کے صاحبزادے ہیں۔ قلم ان کے علم وکمال کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے جو "مکتوبات قدسی" جمع کیے ہیں وہ ان کی فضیلت کا واضح ثبوت ہیں۔ گنگوہ تھانیسر کے علاقے میں ایک قصبہ ہے اور یہی قصبہ ان کا وطن بھی ہے۔ یہ بڑے صاحب مرتبہ بزرگ ہیں۔ ان کے بشرہ سے ہی ان کے کمالات جھلکتے ہیں۔ تصوف میں ایک خاص شان کے مالک ہیں۔ ان کے سلوک کا معاملہ ان کے شیوخ کے طریقہ پر ہے۔ ذوق وحال سے بڑی مناسبت ہے۔ امراء و حکام کے گھر شدید ضرورت کے علاوہ نہیں جاتے۔ ہمیشہ گوشہ نشین رہتے ہیں۔ میں[۱۹] نے انھیں بیرم خاں کے ہنگاموں کے وقت دہلی میں شیخ عبد العزیز کی محفل میں دیکھا تھا۔

میاں مصطفیٰؒ گجراتی

وہ اس بوہرہ فرقے کے فرد تھے جو گجرات میں تجارت کرتا ہے۔ میر سید محمد جونپوری کے ایک مرید کے مرید ہوئے اور فقر وفنا کا راستہ اختیار کر لیا اور مرتے دم تک اسی راہ پر گامزن رہے۔

جب اکبر بادشاہ بنگالہ کی تسخیر کے بعد پٹنہ سے لوٹ کر اجمیر گیا تھا تو حسب الحکم آصف خان ثانی میر بخشی ان کو گجرات سے اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اکبر نے ایک رات دیوان خانہ کے صحن میں علماء کی مجلس منعقد کی اور شیخ مصطفیٰ سے مہدویت کے مسئلہ کی تحقیق چاہی، انھوں نے جواب دیا اور علماء سے ان کا بڑا طویل مناظرہ ہوا۔ اس بحث میں ابراہیم سرہندی نے اپنی منحوس عادت کے مطابق سخت کلامی سے کام لیا اور شیخ کو بڑی اذیت پہنچائی۔

میر سید محمد کے ایک مرید شیخ محمد لانگی نے ایک کتاب "شرح گلشن" تصنیف کی تھی اور خود بھی مہدویت کا دعویٰ کر کے بڑے فتنے برپا کیے تھے۔ اس بحث کے دوران میں[۴۴] نے اس کتاب کے مضمون کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ یہ بات چونکہ شیخ کے مدعا کے خلاف پڑتی تھی اس لیے ان کو مجھ سے غالباً رنجش ہو گئی ہوگی۔ جب بادشاہ فتح پور پہنچ گئے تو ان کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ چند دن تک خواجہ عبد الصمد مصور شیریں قلم کے گھر مقیم رہیں۔ اس وقت میں[۴۵] ان کے یہاں معذرت خواہی کے لئے گیا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔

اس وقت وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اسی محفل میں ان کے لیے طشت لایا گیا ان کے منھ سے بہت سا خون گرا۔ جب ان کو گجرات جانے کی اجازت مل گئی تو وہ وطن پہنچنے کے بعد یا راستہ ہی میں انتقال فرما گئے۔ یہ واقعہ 983ھ/1575ء میں پیش آیا۔ ان کے مکتوبات ان کی یادگار ہیں۔ جو فقر و فنا اور سوز و ساز سے بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ اسحٰق کاکوؒ لاہوری

ان کے والد کا نام شیخ کاکو تھا۔ لاہور والے شیخ اسحاق کی ولایت کے معتقد ہیں۔ یہ بڑے صاحب علم، متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازہ پر نہیں گئے نہ کسی سے مدد مانگی۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی اس وقت تک وہ خود سے بات نہ کرتے تھے۔

ایک دن ایک نامعقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک مٹی کا دیگچہ ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا اسکو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تامل و انکار اسے سر پر اٹھا لیا اور بازار سے اس کے مکان تک لے جا کر پہنچا دیا۔ اسی دن سے اس شخص کے دل کا کھوٹ نکل گیا اور دنیاداری چھوڑ کر وہ آخرکار عالم دین بن گیا۔

میں[۴۶] نے 995ھ/1587ء میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔

ایک دن میں نے شیخ فیضی سے جسے انھی دنوں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا، مذکورہ بالا حکایت بیان کی۔ فیضی نے جیسا کہ اس کی عادت تھی کہ وہ ماضی و حال کے تمام علماء و مشائخ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا، حضرت کی بھی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر میں(36) صبر کر کے خاموش ہو رہا۔ ٹھیک یاد نہیں وہی رات تھی یا دوسری، میں(16) نے خواب میں دیکھا کہ "شیخ ابوالفضل ایک جنگل میں ٹھہرا ہوا ہے اور ایک پرانے کھنڈر میں، جس کی دو تین دیواریں کھڑی ہوئی تھیں شیخ اسحٰق ان توپچیوں کی جماعت میں ہیں جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوقیں سر کرتے ہیں۔ انھوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلا دی اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بکھر گئیں، یہ دیکھ کر میں خوف سے جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن میں شیخ کی خدمت میں نذرانے لے گیا جسے آپ نے قبول فرما لیا۔ میں نے اپنا یہ قصہ بیان کیا تو کچھ نہ کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

وہ لاہور کے بہت سے مشہور علماء کے استاد ہیں جیسے شیخ سعد اللہ جو اپنے زمانہ کے بے مثل عالم ہیں اور شیخ منور وغیرہ۔

جوانی میں حضرت شکار کے بڑے شوقین تھے، چنانچہ جب بھی سبق پڑھانے سے فارغ ہوتے، باز، عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکار گاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔

ان کی عمر 100 سال سے زیادہ ہوئی اور 996ھ/1588ء میں انتقال فرمایا۔

شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل

شیخ اسحاق کاکو کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی زندگی مختلف مرحلوں سے گزری۔ ابتدا میں شریعت کے بڑے پابند تھے۔ پھر اچانک سب کچھ چھوڑ کر ایک گانے والی کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور سفید داڑھی کے باوجود آوارہ گردی کرتے رہے:

زین پیش اگر چہ خلق گردی گرفتی زما سبق
عشق آمد و نماند نشانی زما سبق

ان کا تو عشق نے یہ حال کیا اور لوگ خوش عقیدگی کی وجہ سے اسے بھی ایک حال جان کر ان کو ولی سمجھنے لگے۔ اس دائمی تباہی کی حالت میں عین نخاس میں کھڑے ہو کر درس دینے لگتے، جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے اپنے اس محبوب کے پیچھے لٹا دیا۔ ایک رات وہ اس کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ محتسبوں کی ایک جماعت نے ان کے طلباء کے ساتھ چھاپہ مارا تو اور دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ لہو ولعب کا سارا سامان توڑ دیا۔ اصلاح کی خاطر انھیں سزا دینا چاہتے تھے کہ انھوں نے ان لوگوں سے وہی بات کہی جو کسی نے خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ: ”میں نے ایک خلاف شریعت کام شروع کیا اور تم لوگ تین غیر شرعی خطاؤں کے مستحق ہوئے ہو۔ اس لیے تم مجھ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو۔ ایک تو یہ کہ تم نے میری برائیوں کی ٹوہ لگائی، دوسرے اجازت نہیں لی، تیسرے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئے“ یہ سن کر وہ سب لوگ نہایت شرمندہ ہوئے اور وہاں سے لوٹ گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے ان بد اعمالیوں سے توبہ کر لی اور احیاء العلوم، کو اپنا دستور العمل بنا کر ہمیشہ عبادتوں اور ریاضتوں میں بسر کرنے لگے۔

انھوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیف ”جواہر القرآن“ پر ایک شرح بھی لکھی تھی۔

اکبر نے ان کو خلوت میں بلا کر گفتگو کی تھی اور ان سے پوچھا کہ تم کس قوم کے ہو؟ انھوں نے برجستہ کہا لکھنے والوں کی قوم سے جن کو ہندی زبان میں کائستھ کہتے ہیں ان کی یہ بے تکلفی بادشاہ کو بہت پسند آئی اور کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

میں(36) نے پہلی بار ان سے لاہور میں ملاقات کی تھی کسی موضوع پر ملتان کی بربادی، لاہور کے آباد ہونے، سلاطین لنکاہ، خاص طور سے سلطان حسین کا قصہ انھوں نے اس دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ میں ان کی فصاحت اور واقعات کے تجزیہ و تنقید سے حیران رہ گیا۔ گفتگو کی یہ حلاوت و شیرینی میں نے مشکل ہی سے کسی میں پائی۔ وہ نہایت فیاض طبع انسان تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں جاتا تھا۔ ان کی نہ تو تجارت تھی نہ زراعت بادشاہ کی طرف سے کوئی مدد معاش بھی نہیں ملتی تھی، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ

آمدنی کے بغیر وہ اس قدر ایثار و فیاضی کس طرح کرتے ہیں۔ لوگ اس معاملہ میں ہمیشہ حیران ہی رہے۔ تقریباً 80 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کے جنازہ میں چھوٹے بڑے ہزاروں آدمی شریک تھے اور بڑی عقیدت سے کاندھا دے رہے تھے۔

میاں شیخ عبداللہ بدایونی

میاں صاحب اپنے زمانہ کی ایک زندہ نیکی اور اللہ کی برکت ہیں۔ بچپن میں جب وہ بوستان پڑھ رہے تھے تو اس شعر پر پہنچے:

محال است سعدی کہ راہ صفا
توان رفت جز درپئے مصطفےٰ

(سعدی یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کے راستے کو کوئی سوائے محمد ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چل کر حاصل کرے)

انھوں نے استاد سے کہا اس شعر کا مطلب ہندی زبان میں بتا دیجیے۔ استاد نے کہا تجھے اس حکایت سے کیا غرض؟ آپ نے فرمایا: ”جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کرائیں گے سبق نہیں پڑھوں گا“۔ جب معلم نے اس کے معنی بتا دیے تو انھوں نے حضور اکرم کے متعلق پوچھا کہ وہ کون تھے؟ استاد نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات اور معجزے بیان کیے۔ بس اتنا سنتے ہی ایک جذب سا ان پر طاری ہوا، اپنا کرتہ پھاڑ دیا اور کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی جب ان کے والدین کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے لیکن جب دیکھا کہ ڈرانے دھمکانے سے وہ اپنے خیال سے نہیں ہٹیں گے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ اپنے آبائی وطن سامانہ سے قرآن سیکھنے، احکام دین معلوم کرنے کی خاطر دہلی چلے آئے اور بڑے بڑے علماء و مشائخین کی صحبت سے فیض اٹھا کر اپنے زمانہ کے بڑے عالم بن گئے۔

شیخ الباقی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ انھی سے ذکر کی تلقین حاصل کی، پھر شیخ صفی خیر آبادی اور دوسرے بزرگوں سے وابستہ رہے اور بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور طریقت و سلوک کا تکملہ کیا۔ اپنے زمانے کے اکثر رہنماؤں سے فیض تربیت حاصل کیا،

خاص طور سے میاں شیخ لادن دہلوی اور میر سید جلال بدایونی سے ان کو بڑی عقیدت رہی۔ میر سید جلال کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر برسوں بدایوں میں درس دیتے رہے بڑے بڑے مشہور عالم ان کی مجلس درس کے باعث عالم کہلائے۔

دور دور سے لوگ ان سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آخر حال میں ان پر حالت جذب کا غلبہ رہتا تھا۔ مجلس سماع میں حاضر ہوتے تھے اور انتہائی جذب وشوق میں نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے اور چند قدم تک جھومتے جاتے لیکن رقص اور وجد کیے بغیر ہی اچانک لاحول پڑھ کر اپنی جگہ لوٹ جاتے تھے۔ ان کے شاگرد بہت کہتے کہ حضرت تکلیف نہ کیا کریں ہم یہ خدمت بجالاتے ہیں، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔

ان کے چہرہ مبارک پر فقر وفنا کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ ان کو اپنے بزرگوں سے تلقین و ارشاد اور سند خلافت ملی ہوئی ہے۔ لیکن پیری مریدی کے بکھیڑے میں نہ پڑے، بلکہ اس سے دور ہی بھاگتے ہیں۔

میں ۱۱۱ ان کے پاس کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھا کرتا تھا میرے ساتھ نہایت ذہین اور مخلص شاگرد شریک درس رہا کرتے تھے اور سبق پڑھتے ہوئے بڑی الجھی ہوئی اور دقیق بحثیں کرتے تھے۔ میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ ان اونچی بحثوں اور گہرے نکات کے حل وافادہ میں انھیں کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ تمام علمی نظریے ان پر بخوبی روشن تھے اور گہرے نکات کے حل وافادہ میں انھیں کسی کتاب کا محتاج نہ ہونا پڑا، انھیں حل وتحقیق کا بڑا ملکہ حاصل تھا، خدا کی تائید وتوفیق بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس وقت ان کی عمر 40 سال ہے۔

شیخ جلال الدین قنوجی

ایک مجذوب اور سالک تھے۔ ان کے بزرگ ملتان سے آکر ہندستان کے قدیم شہر قنوج میں مقیم ہوگئے تھے۔ سلوک کا مرحلہ طے ہوا تو جذب کی حالت طاری ہوگئی مگر اس حال میں بھی اتباع شریعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

جب کبھی ان پر حال آجاتا تو وہ منھ کالا کر کے چار پائی کی رسی گردن میں ڈال کر بازاروں میں گھومنے لگتے اور بڑی درد انگیز آواز میں فریاد کرتے رہتے، اس قسم کی حرکتیں ان سے اکثر سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن مسجد حقی میں جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں[1361] ان کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اٹھ کر مسجد کے صحن میں اپنے بزرگوں کی قبروں کی طرف چلے گئے۔ ایک خادم ان کے ساتھ تھا۔ ہر قبر پر علیحدہ علیحدہ فاتحہ پڑھی اور خادم سے ہر ایک کا حال بیان کرتے رہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے فرائض میں سے ایک مسئلہ اس خادم سے پوچھا، اس نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص مرجائے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث چھوڑ جائے تو لڑکے کو میت کی چھوڑی جائداد میں سے 2 حصے اور لڑکی کو ایک حصہ ملے گا" مسئلہ بڑی توجہ سے سنا اور پھر کچھ کہے بغیر چلے گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس حدیث کے مطابق کہ: "قبروں پر علم فرائض کا کوئی مسئلہ کہا جائے اور ورثے کی تقسیم کا ذکر کیا جائے تو اس کی برکت سے تمام اہل قبور کی مغفرت ہو جاتی ہے"۔ حضرت کا یہ معمول رہتا تھا کہ وہ کسی جمعہ کو ترک نہیں کرتے تھے۔

شیخ کپور مجذوب گوالیاری

حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے سپاہ گری کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ اچانک نوکری چھوڑ کر سقہ گیری کا کام شروع کردیا۔ راتوں کو پردہ نشین بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو بغیر اجرت کے پانی دے دیتے تھے۔ اسی حال میں ان پر جذب طاری ہوگیا۔ کسی سے نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتے تھے:

می شدم دست بدیوار زضعف از کویت
آمدی جلوہ کنان صورت دیوار شدم

(میں اپنی کمزوری کے باعث تیری گلی میں دیواروں پر ہاتھ رکھ کر گزر رہا ہوں
جب تو نے اپنا جلوہ دکھایا تو میں دیوار کی طرح مبہوت و ساکت ہوگیا)

گوالیار کے بازار کے ایک سرے پر اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس جگہ ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں نظر آتے تھے۔ اگر حاضرین میں سے کسی کے دل میں کوئی بات کے پوچھنے کا خیال آجاتا تو بے کہے ہی وہ ہذیان کی صورت میں بڑبڑاتے ہوئے اس کا جواب دے دیتے اور اس کی مشکل حل ہو جاتی۔ غیب کی باتوں کی خبریں بیان کرتے رہتے۔ راتوں کو ہمیشہ قیام کی حالت میں رہتے، کبھی روتے اور کبھی ہنستے۔

میں '' نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ ایران سے ایک سید نے آکر ان سے سیادت کا ثبوت مانگا تھا۔ جواب میں آپ نے لکڑیاں جمع کر کے آگ بھڑکانے کا حکم دیا۔ پھر اس سید کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''آؤ ہم دونوں اس آگ میں داخل ہو جائیں تاکہ جھوٹ اور سچ ظاہر ہو جائے۔ سید تو سہم کر کھڑا رہ گیا اور وہ آگ میں جا کر صحیح سلامت نکل آئے''۔ ان کی ایسی بہت سی خوارق عادت مشہور ہیں۔

979ھ/1571ء کو ایک رات سانپ سانپ چلاتے ہوئے دوڑے اور دروازے سے نیچے گر پڑے اور اسی وقت جان بحق ہو گئے۔ شیخ فیضی نے تاریخ وفات ''کپور مجذوب'' سے نکالی ہے۔

شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری

دریائے گنگا کے کنارے سنبھل کے تحت گڑھ مکتیسر ایک قصبہ ہے۔ شیخ اللہ بخش اسی قصبہ میں 40 سال تک فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بڑے متوکل بزرگ تھے۔ ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔

70 سال کی عمر میں آپ سنبھل تشریف لے گئے تھے۔ شیخ بجو مرحوم سنبھلی کی ایک بوڑھی خادمہ جو بڑی عبادت گزار صائم الدہر اپنے وقت کی بی بی رابعہ تھی 35 سال سے شوہر کے بغیر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہمیشہ افطار دودھ سے کیا کرتی تھی غائبانہ طور پر شیخ ممدوح کی معتقد ہو گئی اور ان سے درخواست کی کہ: ''مجھے خدا کا راستہ دکھا دیجئے! آپ نے جواب بھجوایا کہ ''جب تک تم حضور اکرمؐ کی پیروی نہیں کرو گی اور کسی سے نکاح نہ کرو گی

اللہ کے راستے کی تلاش تمہارے لیے ایک وبال ہے''۔ وہ اس وقت پالکی میں بیٹھ کر حضرت کے پاس پہنچ گئی اور انہی سے ان کا نکاح ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دونوں آخرت کی منزل کے لیے کوچ کر گئے۔ میں[18] دہلی کے ایک معزز سید زادے سید قاسم کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں[18] نے انھیں نہایت خوش کلام اور خوش طبیعت پایا۔ جب ہاتھ دھونے کے لیے آفتابہ اور طشت آیا تو انھوں نے فرمایا ''ان سید صاحب سے ابتدا کی جائے کیونکہ ہاشمی کو اولیت حاصل ہے''۔

شیخ عارف حسینیؒ

یہ صاحب دعوت بزرگ شاہ اسمٰعیل صفوی کے پوتوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ جلی ہوئی جو کی روٹی اور کڑوی بیکی ترکاری سے افطار کر لیتے ہیں، ایسی غذا کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا۔

شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ شاہی دربار میں ابوالفضل کی بیٹھک کے بالکل ہی سامنے وہ بے جھجک پانچ وقت کی اذان کہتے ہیں ان کی بہت سی کرامتیں لوگوں میں مشہور ہیں وہ کاغذ کی گول کترنیں جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے ہیں اور اس میں سے سکہ لگی ہوئی اشرفیاں نکال کر جتنے بھی حاضرین مجلس ہوں انھیں دے دیتے ہیں۔ اگر انھیں کسی حجرے میں مقفل کر دیا جائے تو وہاں سے غیر محسوس طور پر نکل کر کسی اور جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔

جب گجرات سے لاہور آئے ہوئے تھے تو انھوں نے لوگوں کو جاڑے کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل جاڑوں میں دیے۔ اس کرامت پر پنجاب کے علماء خاص طور سے مخدوم الملک نے اعتراض کیا کہ یہ پھل ظاہر ہے لوگوں کے باغوں سے ہی ان کی اجازت کے بغیر حاصل کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا کھانا غیر شرعی اور حرام ہے۔ ان علماء کی وجہ سے جب لاہور میں ان کی نبھ نہ سکی تو وہ کشمیر چلے گئے۔

کشمیر کے حاکم علی خان کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی۔ اس نے اپنی لڑکی کا ان سے

نکاح کر دیا۔ جب دیکھا کہ وہ تنگ کر رہنے والے آدمی نہیں ہیں تو ان سے لڑکی کا مہر لے کر طلاق دلوادی اور شاہ عارف حسینی وہاں سے نکل کر تبت چلے گئے۔

تبت میں بھی ان کی کرامتیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک عجوبہ یہ تھا کہ وہ درخت کو پکڑ کر ہلاتے تھے تو اس سے درہم و دینار جھڑنے لگتے تھے۔ غرض گجرات، ہندستان، کشمیر اور تبت میں ان کے بڑے تصرفات اور اثرات رہے ہیں۔ مگر جہاں جاتے تھے لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے، اس لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نکل جاتے تھے۔

جس وقت اکبر بادشاہ کشمیر سے کابل کی طرف سفر کر رہا تھا، شاہ صاحب نے اسی سفر میں اکبر سے ملاقات کی تھی اکبر نے ان پر محافظ اور نگران کار مقرر کر دیے جب بھی وہ اکبر کی ملاقات کو آتے تھے تو ایک سونے کے پیالہ میں مشک کافور اور دوسری تمام خوشبویات ڈال کر بطور تحفہ لے کر آتے تھے۔ اکبر نے ان سے بہت کہا کہ: ''آپ ہم سے کچھ سونا یا کوئی جاگیر قبول فرمالیں''۔ وہ ہر بار یہی جواب دیتے کہ: ''روپیہ تم اپنے احدیوں کو دو کہ وہ بد حال ہیں، میں لے کر کیا کرونگا؟''

میں[۱۷۵]: ایک مرتبہ قلیچ خاں کے ساتھ ابو الفضل کی کچہری میں ملاقات کے لیے گیا۔ حضرت، ابو الفضل کی ہی نگرانی اور حراست میں تھے۔ اس وقت وہ ابو الفضل کے بالا خانہ میں تھے۔ منھ پر نقاب ڈالے بیٹھے کتابت کر رہے تھے۔ کہنے لگے: ''یہ جو قلیچ خاں ہے وہ کہہ رہا تھا میں قلیچ ہوں، تمہارا خادم اور غلام''۔

چہرہ چھپائے رکھنے کی عادت بہت پرانی تھی۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جائیں تو کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ میں نے ایک قابل اعتماد مقرب سے سنا ہے کہ کشمیر میں اکبر نے ایک دن شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح کو شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حسب الحکم ان سے پوچھا کہ: ''اگر آپ نقاب اٹھا لیں تو کیا حرج ہے میں آپ کا دیدار کرلونگا۔ انھوں نے قبول نہ کیا اور کہا ہم فقیر آدمی دنیا سے الگ تھلگ ہیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو، تکلیف نہ دو''۔ حکیم ابو الفتح بڑا شوخ اور بے باک آدمی تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر نقاب اتار لینا چاہا۔ شاہ صاحب نے اسے روک

دیا اور نہایت غصہ میں کہا: ”میں بدشکل اور بدنما آدمی نہیں ہوں، لو میرا چہرہ دیکھ لو“۔ یہ کہہ کر گریباں پھاڑ ڈالا اور چہرہ سے نقاب اتار کر زمین پر پھینک دی۔ اس کے بعد کہا: ”حکیم تو نے تو میرا چہرہ دیکھ لیا لیکن انشاء اللہ اس کا نتیجہ ایک دو ہفتے میں تیرے سامنے آجائے گا“۔ چنانچہ پندرہ دن پورے بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ حکیم ابوالفتح اسی سفر میں اسہال کے مرض میں فوت ہوگیا۔ ایسی کرامتیں شاہ صاحبؒ سے بے شمار ہوتی رہی ہیں۔

ایک دن اکبر نے کہا: ”شاہ یا تو آپ ہمارے جیسے ہو جائیں یا ہم کو اپنے جیسا بنالیں“۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم بدنصیب اپنے آپکو تمہارے جیسا کس طرح بنا سکتے ہیں، ہاں اگر تم چاہتے ہو تو ہمارے برابر آکر بیٹھ جاؤ تاکہ ہمارے جیسے بن جاؤ“۔

میر سید علاء الدین اودھیؒ

بڑے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اللہ کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ ان کی کرامتیں اور کمالات نہایت روشن اور واضح تھے۔ لوگ ان کے عجیب و غریب خوارق بیان کرتے ہیں۔

صاحب کلام اور باذوق آدمی تھے، حقائق و معارف کو کبھی کبھی نظم میں بھی ادا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلع تو بہت مشہور رہا ہے:

ندانم آن گل خودرو چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنی گفتگوی او دارد

ان کے ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے:

کہ بچشمان دل مبین جز دوست
ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

شیخ عرفی نے اسی زمین میں کہا ہے:

کہ جہان صورت است و معنی دوست
ور بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

کسی اور کا شعر ہے:

کہ جہان پرتویست از رخ دوست
جملہ کائنات سایۂ اوست

اسی موضوع پر میرا(40) بھی ایک شعر ہے:

اوست مغز جہان جہان ہمہ پوست
خود چہ مغز وچہ پوست چون ہمہ اوست

ان کی تربیت کے دامن سے بڑے بڑے مشائخ اٹھے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ میر سید ماہرو اپنے والد کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ ایک اور مرید میر سید علی سہری تھے، جو بڑے صاحب حال تھے۔ ہمیشہ روپوش رہتے تھے۔ ان کا فقر بھی ایک خاص شان رکھتا ہے۔ تصوف کے مضامین بڑی عجیب زبان میں ادا کرتے تھے۔ میں کانت وکولہ، جو کہ سنبھل کا ایک قصبہ ہے، میں حسین خان کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا تھا اور ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میر سید علی ہمیشہ یہ دعا کرتے کہ: ''یا اللہ ہمیں شہید اٹھانا''۔

ایک مرتبہ ان کے گھر میں ایک چور گھس آیا۔ جب شور مچا تو میر صاحب اس وقت 90 سال کے ضعیف ہونے کے باوجود ایک لوہا اٹھائے اللہ اللہ کہتے ہوئے اُس کا پیچھا کرنے لگے اور ایک دو کو مار گرایا اور زخمی کردیا آخر ایک ضرب ان کو لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ 998ھ/1580ء کا ہے۔ ان کی تاریخ وفات۔ ''چہ شد آن مرشد کامل'' سے نکالی گئی ہے۔

شیخ حمزہ لکھنوی

یہ ملک آدم کاکر کے پوتے ہیں جو سلطان سکندر اور ابراہیم لودی کے امرا میں سے تھا، ہمیشہ اپنے دادا کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے رہتے تھے۔ ملک آدم کی قبر دو عام قبروں کے برابر بلکہ اس سے کچھ اور لمبی تھی۔

شیخ حمزہ بلند، بالا، صاحب جذب اور بڑے شکوہ والے بزرگ تھے۔ جب بھی شہر میں آتے شیر کی طرح خراماں خراماں راستہ طے کرتے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے، انھیں وہ ہر طرف پھینکتے جاتے لیکن کمال یہ تھا کہ وہ پتھر کسی کو لگتے نہ تھے۔ ان کی گفتگو زندگی کے عمل کے واسطے پاکیزہ تھی۔ ہمیشہ کلام پاک کی تلاوت کرتے رہتے تھے جس کسی کو اہل جانتے تھے اس سے بات کرتے تھے، ان کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے۔ میں بھی ان کے پسندیدہ آدمیوں میں سے تھا۔ ان سے ملاقات کو میں اچھا شگون جانتا تھا۔ ورنہ اکثر لوگ تو ان کی حرکتوں کو دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور پاس نہیں پھٹکتے تھے کہ کہیں کوئی ضرر نہ پہنچ جائے۔

شیخ پیرکؒ

شیخ پیرکؒ بھی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ دریائے کودی (دریائے گومتی) (47) کے کنارے جنگل کے اندر ایک غار میں جہاں تک کسی شخص کا پہنچنا محال ہے، چھپے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز کے بعد افطار کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی جو خشک روٹی اور اس بیری کے بیر جسے اس نے خود بویا تھا ان کے کھانے کے لیے لے آتی تھی۔

اگر کوئی بڑی مشقتیں برداشت کر کے ان کی ملاقات کے واسطے جاتا تو وہ مقررہ وقت پر اپنے حجرے کے دروازہ پر آ کر بیٹھ جاتے مگر کوئی بات نہیں کرتے۔ جس زمانہ میں حسین خان لکھنؤ کا حاکم تھا میں (43) بھی اپنے ایک دوست عبدالرحمن نامی شخص کے ساتھ جو حسین خان کا خلیفہ تھا شیخ پیرک سے ملنے کے لیے گیا۔ اتنے ضعیف اور کمزور تھے کہ بس ہڈی چمڑہ نظر آ رہے تھے۔ اس غار کے اندر اور باہر بہت سے بڑے بڑے سانپ پھن نکالے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے ڈر کر سانپ کو لکڑی سے مارنا چاہا، انھوں نے اشارہ سے روک دیا اور کہا: ''ان سانپوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' معلوم ہوا کہ 30 سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا وہ اس غار میں رہتے ہیں اور یہ سانپ ہیں کہ ان سے مانوس ہو چکے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ جب ہم لوگ رخصت

ہونے لگے تو انھوں نے چند باسی روٹی کے ٹکڑوں اور خشک میوہ کی طرف جو ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اشارہ کیا کہ: ''یہ اٹھالو'' میرے[44] ساتھی نے سونے کا ایک ٹکڑا بطور تحفہ دینا چاہا، انھوں نے قبول نہ کیا۔ لکھنؤ کے یہ دونوں بزرگ شیخ حمزہ لکھنوی اور شیخ پیرک انہی دنوں انتقال فرما گئے تھے۔

شیخ محمد حسین سکندریؒ

سکندر دوآبہ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ محمد حسین بڑے صاحب ذوق بزرگ تھے، لوگوں سے دور عزلت نشین رہتے تھے۔ ملازمت ترک کرکے پورے پچاس سال تک عبادت و ریاضت میں گزارے تھے۔ اس دوران کسی کے دروازہ پر نہیں گئے۔ جب میں[45] 974ھ/1566ء میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے خواجہ حافظ کے اس شعر کے معنی پوچھے:

عفو خدا بیشتر از جرم ماست
نکتۂ سربستہ چہ گوئی خموش

میں[45] نے پوچھا اس میں آپکو کس جگہ پریشانی محسوس ہو رہی ہے؟ انھوں نے کہا: ''حافظ نے جب خود نکتۂ سربستہ کہہ دیا تو پھر خاموش رہنے کا حکم کیوں دے دیا؟'' میں[45] نے کہا: ''اس کی وضاحت آپ خود فرمائیں تو بہتر ہے''۔ انھوں نے کہا: ''میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ'' نکتۂ سربستہ'' غالباً یہ ہو کہ'' ہمارے سارے گناہ خدا ہی کے خلق کیے ہوئے ہیں''۔ یہ بات کہنا ہی حد ادب سے تجاوز کرنا ہے، اس لیے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں بھی جواب میں خاموش رہا۔

اسی طرح کی تاویل انھوں نے اس آیت میں بھی کی "واعبد ربک حتی الیقین" ان کا کہنا تھا کہ یہاں ''حتیٰ'' کا لفظ ''انتہائی غایت'' کے لیے آیا ہے اور ''انتہائی غایت'' کی یہاں پر گنجائش ہی نہیں۔ شاید یہ انتہائی کاف خطاب کے لحاظ سے ہو''۔ ان کی اس بات کا مطلب میں سمجھ نہ سکا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس سے اس کی کیا مراد تھی؟ ان سے وہ میری[46] آخری ملاقات تھی۔

شیخ عبدالواحد بلگرامیؒ

بلگرام قنوج کے ماتحت ایک قصبہ ہے۔ یہ بڑے صاحب فضل و کمال بزرگ تھے۔ ریاضت و عبادت بہت کیا کرتے تھے۔ ان کی ذات تمام اخلاق حمیدہ کی جامع تھی۔

ابتداء میں وہ ہندی راگ گایا کرتے تھے اور خود بخود حال میں آجاتے۔ کچھ عرصے سے راگ راگنی کا یہ مشغلہ چھوڑ دیا "نزھۃ الارواح" کی انھوں نے بڑی محققانہ شرح لکھی تھی۔ اسی طرح علم تصوف پر اور بھی کئی ایک رسالے لکھے، ان میں ایک "سنابل" نام کی کتاب بھی ہے اور بھی کئی دیگر عمدہ تصانیف ہیں۔

یہ اگرچہ کسی اور بزرگ کے مرید ہیں، لیکن شیخ حسین سکندرہ سے فیض و تربیت پائی ہے۔ ہر سال بلگرام سے حضرت شیخ کے عرس پر تشریف لاتے ہیں۔ اب بینائی کمزور ہو چکی ہے اس لیے اب آجا نہیں سکتے۔ قنوج میں انتقال ہوا۔

میں(47) 977ھ/1569ء میں لکھنو سے بلگرام گیا تھا وہ رات کو میری عیادت کے لیے تشریف لائے یہ میری(47) پہلی ملاقات تھی جو میرے لیے مرہم و شفاعت سے کم نہ ثابت ہوئی۔ کہنے لگے: "یہ سب عشق کے پھول اور پتے ہیں"۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی جگہ پر بدایوں سے مخدومی شیخ عبداللہ بدایونی بھی پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے لیے اگر کوئی رات شب قدر کے مانند ہے تو وہ یہی رات ہے۔

شیخ عبدالواحد کو نظم سے بھی مناسبت اور لگاؤ تھا۔ چنانچہ اپنے ایک ملیح و خوش ادا محبوب راجا نامی شخص کے لیے یہ شعر کہا تھا:

ای کردہ خیال تو بہ تخت دل ماجا
ہرگز نبود در دل ما غیر ترا جا

انھی کا ایک شعر یہ ہے:

مرد جنگ چو اول بہ صلح آمدۂ
دی بلطف نشین تاز خویش برخیزم

عہد اکبری کے علماء

صرف انھی علماء کا ذکر کیا گیا ہے جن سے میری(۱۴۷) ملاقات ہوئی یا جن کا میں(۱۴۷) شاگرد رہا ہوں یا ایسے علماء جن کا اس عہد میں نام و شہرہ رہا ہے۔ جو شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

میاں حاتم سنبھلی

یہ میاں عزیز اللہ طلنبی کے شاگرد ہیں۔ معقول و منقول میں ان کی طرح جامع عالم کوئی اور نہ تھا، خاص طور سے علم کلام، اصول فقہ اور عربیت میں بے نظیر تھے۔ مشہور ہے کہ شرح ''مفتاح اور''مطول'' انھوں نے اول سے آخر تک 40 مرتبہ پڑھائی تھی، دوسری متنی کتابیں اسی طرح پڑھاتے رہتے تھے۔

مخدوم الملک کے متعلق ان کی رائے تھی کہ وہ علم محاضرات(۱۴۸) میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ علوم دین کے مقابلے میں وہ معلوماتی علوم پر زیادہ قادر ہیں۔

ملا علاؤ الدین لاری شرح عقاید نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعوی سے لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ میاں صاحب نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات کیے کہ ملا علاؤالدین سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

میاں صاحب فقہ میں امام اعظم ثانی کے برابر تھے۔ ریاضت اور مجاہدہ بھی بہت

کرتے تھے۔ تقویٰ و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ لمبے عرصہ تک مقتدر حاکم بھی رہے۔

خان خاناں بیرم خان کے زمانہ میں ایک مرتبہ میں 5 سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی دوران شیخ مبارک کے یہاں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پہلے میاں صاحب اتنے لمبے عرصے تک ملاقات نہ ہونے کے احوال پوچھتے رہے۔ پھر انھوں نے دریافت کیا: ''شیخ مبارک کیسے مولوی ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''علمیت، تقویٰ، فقر و مجاہدہ، امر معروف و نہی منکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں''۔ اس زمانہ میں شیخ موصوف ان تمام باتوں کے بڑے پابند تھے۔ میاں حاتم نے کہا ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے لیکن مشہور ہے کہ وہ مہدوی ہیں۔ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں ان کی مہدویت کے قائل نہیں۔ اس پر میاں صاحب نے کہا: ''میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے''۔ اس مجلس میں میاں صاحب کے شاگرد میر سید محمد میر عدلی بھی موجود تھے، انھوں نے دریافت کیا: ''پھر ان کو یعنی ملا مبارک کو مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا: ''وہ چونکہ سب کو امر معروف اور نہی منکر کرتے رہتے ہیں اس لیے لوگ ان کو مہدوی سمجھتے ہیں'' انھوں نے کہا: ''ایک بار عبد الحی خراسانی جس کو چند دن کے لیے منصب صدارت برائے نام مل گیا تھا، خان خانان کے سامنے شیخ کی بڑی مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟'' میں نے کہا ''شیخ مبارک نے اس کو ایک خط لکھ کر نصیحتیں کی تھیں۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار معلوم ہوئی اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھتے ہیں'' یہ سن کر میر سید محمد عدلی نے کہا: ''عبد الحی خراسانی کا اپنے رفض پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں درست ہوگا جبکہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اترے کہ تو نماز باجماعت ادا نہیں کرتا اور جو کوئی باجماعت نماز نہ پڑھے رافضی ہے اس لیے تو رافضی ہوا، حالانکہ اس کلیہ کا کبریٰ ممنوع ہے۔ اس طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اترتی کہ شیخ امر معروف کرتے ہیں جو کوئی امر معروف کرے وہ مہدوی ہے۔

اس کے بعد میاں صاحب نے کہا میں اس استفتاء پر مہر لگا دوں گا لیکن میرے پاس ایک اور استفتاء آیا ہوا ہے جس پر تمام علماء کے دستخط ہیں۔ مجھے اس میں کچھ شبہات ہیں۔ تم اسے شیخ بہاؤالدین جو بڑے محقق مفتی ہیں، کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ سفر کی وجہ سے میرے ساتھ کتابیں نہیں ہیں۔ اگر آپ اس روایت کو بعینہٖ بھیج دیتے تو بہتر ہوتا جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتاء پر دستخط کیے ہیں۔ آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ لوگ مصیبت کے عالم میں اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت صرف ''ابراہیم شاہی'' میں ملتی ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ خود یہ ابراہیم شاہی علماء کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھی جاتی کہ فتویٰ دینے کے لیے سزاوار ہو۔ اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی موجود روایتوں میں سے کسی کو ترجیح دے سکتا ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالت اضطرار میں ابوین کو اولاد کی بیع جائز ہے ظاہر ہے ''ابوین'' کا لفظ باپ اور دادا دونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ کتاب نکاح میں جس کے ابوین مسلمان ہوں وہ اس کا کفو ہے جس کے آبا شرف اسلام سے مشرف ہوئے اس لیے یہاں بالاتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے نہ کہ ماں اور باپ۔ ہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو مل کر بطریق اجتماع اختیار حاصل ہے نہ کہ فرداً فرداً علیحدہ و انفرادی حیثیت کے لیے آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

میاں صاحب نے شیخ مبارک کا تو استفتا رکھ لیا اور مذکورہ استفتا مجھے دے دیا۔ یہ استفتا میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو اس نے میاں حاتم کی فقاہت کو بہت سراہا اور کہا: ''ان کو دعا کے بعد میری جانب سے کہنا ہم نے بھی اس وقت کی وجہ سے اس پر مہر نہیں لگائی ہے''۔ جب میں نے وہ شیخ بہاؤالدین کو دکھایا تو انھوں نے قول پر بھروسہ کیا اور زیادہ غور نہ کیا۔ بے شک مجھ سے سہو ہو گیا۔ یہ بھی شیخ بہاؤالدین کی حق بینی و حق پرستی، نیک نفسی اور انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و کمال کے انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی:

بر سر آن نامہ کہ آصف نوشت
قدم رحم اللہ من انصف نوشت

میاں حاتم سنبھلی 70 سال تک برابر لوگوں کو اپنے علم و اخلاق سے فائدہ پہنچاتے رہے۔ 968ھ/1560ء میں وہ بھی اپنے والد سے جا ملے۔ ان کے چند نالائق لڑکے وارث رہ گئے ہیں:

چند بناز پرورم مہر بتان سنگ دل
یاد پدر نمی کنند این پسران ناخلف

مولانا عبداللہ سلطان پوریؒ

قوم کے انصاری ہیں۔ ان کے آباؤاجداد نے سلطان پور میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ عبداللہ سلطان پوری اپنے زمانہ کا منفرد و یگانۂ روزگار عالم تھا۔ خاص طور سے عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور دوسرے تمام علوم نقلی میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ بڑی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے ''عصمت انبیاء'' اور ''شرح شمائل النبی ﷺ'' بہت مشہور ہیں۔ ہمایوں بادشاہ جنت مکانی نے مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلامی کا عہدہ دیا تھا۔ شریعت کو پھیلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔ نہایت متعصب سنی تھا۔ انھوں نے بہت سے ملحدوں اور رافضیوں کو قتل کرا دیا تھا۔

وہ نہایت اصرار سے کہتا تھا کہ ''روضۃ الاحباب'' کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا نہیں ہے، جس سال کہ گجرات فتح ہوا تھا اور وہ بادشاہی دیوان خانہ کا وکیل مختار تھا اور یہ زمانہ اس کے عین جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ میں(49) پنجاب کے سفر سے لوٹ کر آیا اور شیخ ابوالفضل جو اس وقت تک ملازم نہیں ہوا تھا اور حاجی سلطان تھانیسری کے ساتھ مخدوم الملک سے ملنے کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا وہ تیسرے دفتر کو سامنے کھولے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے: ''دیکھو ایرانی عالموں نے دین میں کیا خرابی پیدا کر دی''۔ پھر اس نے وہ شعر دکھایا جو حضرت علیؓ کی تعریف میں کہا تھا:

ہمیں بس بود حق نمائی او
کہ کردند شک در خدائی او

اور کہنے لگا: ''اس نے تو رفض سے آگے بڑھ کر حلول خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے جلا دوں''۔ میں(49) اس وقت نہایت گمنام اور غیر معروف تھا اور یہ اس سے پہلی ملاقات تھی، پھر بھی جرأت کر کے میں(49) نے کہا یہ شعر تو اس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعیؒ سے منسوب ہے:

لو ان المرتضیٰ ابدی محله　　لصار الناس طرا سجد اله
کفی فی فضل مولانا علی　　وقوع الشاب فیه انه الله

عبد اللہ سلطان پوری نے مجھے(50) گھور کر دیکھا اور کہا: ''یہ کس جگہ کی روایت ہے؟'' میں کہا ''شرح دیوان امیر کی!'' اس نے کہا: ''اس دیوان کا شارح قاضی میر حسین میبذی ہے اور وہ بھی رفض سے متہم ہے''۔ میں(51) نے کہا: ''یہ دوسری بات ہے''۔ شیخ ابو الفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر برابر مجھے(51) خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے رہے۔ پھر میں نے کہا کہ: ''بعض معتبر آدمیوں سے میں نے سنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لڑکے میرک شاہ یا کسی دوسرے کا ہے، اس لیے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں کی عبارت سے نہیں ملتی کیوں کہ اس کی عبارت شاعرانہ ہے اور دو دفتروں کی عبارت محدثانہ''۔ مخدوم الملک نے جواب دیا: ''ارے بابا! میں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو بدعت اور فاسد عقیدے پر صریحاً دلالت کرتی ہیں۔ میں(52) نے ان مقامات پر حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ طلحہؓ نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المومنین (علیؓ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا ''یدشلاء و بیعة شلا یعنی ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل''۔ غور کرو کہ جو ہاتھ اُحد کے دن حضور اکرم ﷺ کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر 11 زخم آئے تھے، اس کو حضرت علیؓ بُرا شگون کہیں جو شرعاً ممنوع ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا'' تفاؤل اور شگون میں تو بڑا فرق ہے''۔ اس وقت ابو الفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر رگڑ ڈالا اور روک دیا۔ مخدوم الملک نے کہا: ''ان کی تعریف کیا ہے''۔ ساتھیوں نے اس سے میرا(53) کچھ حال بیان کیا اور وہ ملاقات بخیر و خوبی ختم ہوگئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا بڑی خیر ہوگئی کہ انھوں نے کسی بات کا برا نہیں مانا، ورنہ ڈانٹ پھٹکار سننا پڑتی۔

شروع شروع میں جب مخدوم الملک نے شیخ ابوالفضل کو دیکھا تھا تو اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا: ''اس شخص سے دین میں جتنا بھی خلل پیدا ہو کم ہی ہے''

چو بطفیلش بدیدم مخدوم اہل دین را
کہ شود بلای جانہا بہ شما سپردم این را

مخدوم الملک نے 990ھ/1582ء میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں انتقال کیا۔ اس کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا گیا:

رفت مخدوم ملک و با خود برد   رحمۃ اللہ نشانی پیشانی
جستم از دل چو سال تاریخش   گفت بہ شمار مصرعۂ ثانی

اس کی اولاد میں چند نا خلف لڑکے رہ گئے جو لائق ذکر نہیں۔ اس بارے میں تمام اسلاف اخلاف سے شاکی ہی رہیں گے کیونکہ زمانہ کا ماحول ان کو اچھا رکھ سکتا ہے نہ اچھا ہی پیدا کرتا ہے:

خوبی اندر جہان نمی بینم   گویا روزگار عنین شد

یہ تو وہ کہانی ہوئی کہ ایک متعصب سنی بادشاہ نے سبزوار پر جو رافضیوں کا مسکن اور مرکز ہے، حملہ کیا۔ وہاں کے رئیس اور سردار حاضر ہوئے اور کہا: ''ہم تو مسلمان ہیں کس گناہ میں آپ نے ہم پر فوجی حملہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''اس جرم میں کہ تم لوگ رفض میں بہت حد سے گزر گئے ہو''۔ انھوں نے کہا: ''یہ تو ہم صریح کے کام کو انجام دے رہے ہیں'' بادشاہ نے کہا کہ: ''اگر تم سچے ہو تو اپنے شہر میں سے کسی ابوبکر نام کے شخص کو تو لا کر دکھاؤ تاکہ میں تم پر حملہ بند کروں''۔ لوگوں نے بڑی تلاش کے بعد ایک مفلوک الحال غیر معروف سے شخص کو پیش کیا کہ: ''یہ اس نام سے منسوب ہے جو تم نے لیا تھا''۔ بادشاہ نے جب اسکو پھٹے پرانے کپڑوں اور بری حالت میں دیکھا تو کہا: ''تم اس سے بہتر کسی آدمی کو

نہیں لا سکتے تھے"۔ ان لوگوں نے کہا: "بادشاہ سلامت تکلف برطرف، سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابوبکر پیدا نہیں کر سکتی"۔

مولوی رومی نے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سبزوار است این جہان بمدار
ما چو بو بکر یم دروی قار وزار

شیخ مبارک ناگوری

اپنے زمانے کے بڑے نامی گرامی علماء میں سے تھے۔ تقویٰ، توکل اور صلاح میں سب سے ممتاز تھے۔ پہلے پہل انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ امر معروف اور نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اگر ان کی محفل وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی، ریشم، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہن کر آجاتا تو اسی وقت ان چیزوں کے اتار دینے کا حکم دیتے۔ جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا، اسے پھاڑ دینے کی تاکید کرتے۔ اگر راستے میں کسی جگہ راگ نغمے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہاں سے قدم بڑھا کر تیزی سے نکل جاتے۔ مگر آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی راگ، گانا یا ساز سنے بغیر ان کو چین نہیں پڑتا تھا۔ ان کے مسلک اور طریقے ہمیشہ بدلتے رہے، طبیعت میں بڑا تلون تھا۔

پٹھانوں کے دور میں کچھ عرصہ تک وہ شیخ علائی کے ساتھ رہے۔ جب اکبر کے عہد میں نقشبندی صوفیوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو خود کو اس سلسلے سے وابستہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک ہمدانی مشائخین سے منسوب رہے، آخر میں جب عراقیوں نے دربار میں اپنا رنگ جما لیا تو انھی کے رنگ میں باتیں کرنے لگے: "**تكلموا الناس علي قد عقولهم**" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو!) پر ان کا عمل تھا۔

ہمیشہ علوم دینی کے درس دینے میں مشغول رہتے تھے۔ ہندستان کے علماء کے برخلاف انھوں نے شاعری، معمہ گوئی اور مختلف فنون میں بڑی دسترس حاصل کی تھی۔ تمام علوم پر ان کی نگاہ تھی۔ خاص طور سے تصوف پر بڑا عبور حاصل تھا۔ "شاطبی" تو پوری کی

پوری ان کو حفظ تھی۔ اس کے درس و دینے کا انھی کو حق پہنچتا تھا۔ قرآن کی سات قرأتوں کے حافظ اور قاری تھے۔

کبھی بادشاہوں کے گھر نہیں گئے۔ نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بزرگ تھے۔ ان کی بذلہ گوئی اور نقلیں بڑی مشہور ہیں۔ آخر عمر میں جب بینائی کمزور ہوگئی تو گوشہ نشین ہوگئے اور اس فرصت میں ایک تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کی طرح چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس میں بڑی اچھی معلومات و مضامین درج ہیں۔ انھوں نے اس کا نام ''العیون'' رکھا۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے ایسا مضمون لکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھیں اس صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ تھا، انھوں نے جو کچھ تجدید کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ اس تفسیر کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ قصیدہ فارضیہ جو 7 سو اشعار کا قصیدہ ہے، قصیدہ بردہ شریف، قصیدہ کعب بن زہیر اور دوسرے قصیدے جو ان کو یاد تھے، پڑھتے رہتے تھے۔ شیخ مبارک کا لاہور میں 1001ھ/ 1592ء میں انتقال ہوا۔ بلاشبہ ایسا جامع کمال عالم پھر نظر نہیں آیا۔ لیکن افسوس دنیا کی محبت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش نے کہیں کا نہ رکھا۔ لباس تو درویشی کا بنا رکھا تھا لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی محبت اور انسیت نہ تھی۔

میں[54] نے ابتدائے عمر میں آگرہ میں ان سے چند سبق پڑھے تھے۔ ان کی استادی کا مجھ پر بڑا حق ہے لیکن انھوں نے جس طرح کی دنیا داری اور بے دینی اختیار کر رکھی تھی۔ روپیہ کے لالچ میں جو مکروفریب اور زمانہ سازی کرتے رہتے تھے، دین و مذہب میں تحریف و تفسیخ کا جو جال بچھا رکھا تھا، اس سے میرا[55] دل ان کی طرف سے پھر گیا اور ان کی استادی و تعظیم کے سارے حق زائل ہوگئے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں بیٹے کی وجہ سے باپ پر بھی لعنت پڑتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں یزید اور اس کے باپ پر لعنت اسی طرح ان کا اور ان کے لڑکوں کا معاملہ ہے۔

میر سید محمد میر عدلی امروہی

امروہہ، سنبھل کے تحت قصبہ ہے۔ میر عدلی نہایت متقی اور صالح بزرگ تھے وہ اور

میرے(56) والد سنبھل اور بدایوں میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بدایوں میں انھوں نے میر سید جلال دانش مند سے جو حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے، پڑھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ آخر عمر میں بادشاہی مقربوں میں شامل ہو گئے۔ میر عدلی کا عہدہ انھیں عطا کیا گیا۔ اپنے فرائض منصبی وہ نہایت انصاف، سچائی اور دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاضی القضات بھی ان کے خوف سے اپنی خیانتوں اور خباثتوں سے باز آ گیا تھا۔

جب تک وہ دربار میں رہے کسی بدعتی اور ملحد کو دین میں دخل اندازی کی ہمت نہ ہو سکی۔ ان کے بعد میر عدلی کا عہدہ کسی کی ذات پر نہیں جچا۔ یہ خطاب بس برائے نام ہی رہ گئے۔

موروثی تعلقات اور قدیم روابط کی وجہ سے وہ مجھ(57) پر بڑے مہربان رہتے تھے۔ میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو اور صدور کی خوشامد، در آمد کی ذلت نہ اٹھاؤ۔ باقاعدہ ملازمت میں داخل ہو کر ''پادشاہی داغ'' کرالو، کیونکہ یہ حکام بڑے فرعون اور متکبر ہیں۔ میں(58) نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی تھی اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا کسی کو نہ دکھائے۔ 984ھ/1576ء میں میر سید محمد عدلی کو بھکر کی عملداری عطا کی گئی اور وہ 986ھ/1578ء میں اپنے رب سے جا ملے۔

شیخ گدائی دہلوی کنبوئی

یہ مشہور شاعر شیخ جمالی کے صاحبزادے ہیں۔ ظاہری علوم میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں دیکھی تھیں۔

بیرم خاں کے ساتھ محبت و دوستی کا تعلق تھا۔ چنانچہ خان خانان نے ہندستان کی صدارت کا عہدہ ان کے ذمہ دے رکھا تھا۔ چند سال تک ان کا مکان ہندستان، خراسان، ماوراء النہر اور عراق کے اکابر و افاضل کا مرکز و مرجع بنا رہا۔ شاعری کا بڑا اچھا ذوق تھا۔

ہندی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بیکانیر کے علاقے میں بیرم خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے۔ بیرم خاں کے قضیوں کے باوجود ان کے عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دہلی کے بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے دنوں میں ضرور تشریف لاتے تھے اور اپنی محفلیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کرتے تھے۔ 976ھ/1568ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی اولاد بھی نالائق ہی نکلی۔

شیخ گدائی کے کلام کا نمونہ:

غزل

گئی جان منزل غم شد گئی دل　　　غمت راہی بہ رم منزل بہ منزل
مشو غافل زحال درد مندی　　　کہ از حال تو یکدم نیست غافل
دل دیوانہ درزلف تو بستم　　　گرفتارم بآن مشکین سلاسل
بجان دادن اگر آسان شدی کار　　　نبودی عاشقان را کار مشکل
گدائی جان بنا کامی بر آمد　　　نشد کام ہم زلعل یار حاصل

میں[illegible] نے یہ اشعار تذکرۂ میر علاء الدولہ سے نقل کیے ہیں۔ یہ تذکرہ کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میرا[illegible] تو یہ خیال ہے کہ یہ اشعار شیخ گدائی کے نہیں۔

میاں جمال خان مفتی دہلی

اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بھائی میاں لادن کے شاگرد ہیں۔ کنبوہ برادری سے تعلق تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ علوم عقلی اور نقلی خاص طور سے فقہ و کلام، عربیت اور تفسیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ''مفتاح'' کی دونوں شرحوں پر بڑا اچھا محاکمہ کیا ہے ''عضدی'' جو درس کی مشکل کتابوں میں سے ہے، کہتے ہیں انھوں نے اس کا 40 بار اول سے آخر تک درس دیا تھا۔

ہمیشہ وہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ دینی علوم کا افادہ عام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کے گھر نہیں جاتے تھے۔ ہمیشہ حاکموں کی نگاہ میں وہ معزز و محترم رہے۔ ان کے اکثر شاگرد اچھے عالم اور مفکر ہوئے ہیں۔

90 سال کی عمر پائی اور 984ھ/1576ء میں انتقال فرمایا۔

قاضی جلال الدین ملتانی

ان کا تعلق بھکر کے قلعہ کے مضافات سے رہا ہے۔ نہایت متبحر، حق گو اور حق پرست عالم تھے۔ پہلے تجارت کیا کرتے تھے پھر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ چند سال تک آگرہ میں پڑھاتے رہے۔

جب بعض وجوہ سے قاضی یعقوب کو معزول کر دیا گیا تو انھیں قضاوت کا عہدہ دیا گیا۔ اپنی ذات میں وہ بلا شبہ نہایت متدین اور امین قاضی تھے لیکن ان کا لڑکا نہایت بد دیانت اور ناخلف تھا۔ محکمہ کے تمام وکیل بھی انتہائی بدنفس تھے۔ ان کی ناشائستہ حرکتوں کی لپیٹ میں وہ بھی آگئے، چونکہ اہل زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے بادشاہ نے ان کو دکن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ دکن والے ان کی حق گوئی اور دین حق پر ثابت قدمی کا ذکر سن چکے تھے، اس لیے انھوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر وہ وہاں سے کعبۃ اللہ حج کے لیے تشریف لے گیے اور اسی جگہ حق کو لبیک کہا۔

قاضی طوائیس

طوائیس خراسان کے علاقے میں ہے۔ یہ بہت دیانت دار قاضی تھے، لیکن بے علمی کی وجہ سے بعض احکام میں انھوں نے بڑی غلطیاں کیں۔ امراء کے ہاتھوں ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس لیے وہ ان امیروں سے ہمیشہ بدگمان رہتے تھے۔ مقدمات میں امیروں کے مقابلے میں غریبوں کی جانبداری کرتے تھے خواہ ان ہی کی طرف سے زیادتی کیوں نہ ہو۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس زمانہ میں ظالم ہی فریادی بن کر عدالت میں پہنچ جاتا

ہے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل کہا کرتا تھا اگر امام اعظم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو وہ ایک دوسرا ہی فقہ لکھتے۔

جب خان زمان کا قصہ پیش آیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا تھا۔ باغی کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ اس بات پر انھیں معزول کر کے قاضی یعقوب کو قاضی بنایا گیا اور وہ انھی دنوں فوت ہو گئے۔

قاضی یعقوب مانک پوری

یہ قاضی فضیلت کے داماد ہیں۔ علم فقہ اور اصول میں بڑے کامل تھے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے۔ چند سال تک وہ ہندوستان کے قاضی القضاۃ رہے۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں وہ قوت باہ کے معجون بہت کھایا کرتے تھے۔

ایک دن بادشاہی مجلس میں سرور انگیز چیزیں پینے کھانے کے لیے لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو بھی شرکت کے لیے کہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا: ”تم کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟“ ایک ہندستانی مصاحب نے برجستہ کہا: ”قاضی پارہ کھاتے ہیں“ ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگالہ کی قضاوت پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بھی اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے قوت باہ کے نسخے اور دوائیاں ظلم و تعدی کر کے حاصل کیے تھے۔ جب معصوم کابلی نے بغاوت کی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس جرم میں انھیں بلا کر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ گوالیار کے راستے ہی میں انتقال کیا اور میر معز الملک اور ملا احمد یزدی سے جا ملے۔

شیخ عبدالنبی صدر الصدور

یہ شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے ہیں۔ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حدیث کا علم حاصل کیا۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو اپنے بزرگوں کی روش پر سماع کے منکر

تھے۔ محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ تقویٰ، پاکبازی اور عبادت میں معروف رہتے تھے۔ جب انھیں صدارت کا عہدہ ملا تو انھوں نے لوگوں کو اتنی زمین مدد معاش میں دی اور اتنے وظیفے اور وقف قائم کیے کہ کسی بادشاہ کے زمانہ میں ایسا مقتدر صدر کوئی نہیں ہوا۔ جس قدر وظیفے اور اعانتیں انھوں نے جاری کیں۔ اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے نہ کیا ہوگا۔ اکبر کچھ عرصے تک تو ان کا ایسا معتقد رہا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھا کرتا تھا۔ آخر مخدوم الملک اور دوسرے بدنفس علماء کے جھگڑوں کی وجہ سے بادشاہ کی عقیدت ان سے ختم ہوگئی:

جاہلانند ہمہ جاہ طلب
خویش را علماء کردہ لقب

ان کے زوال کا بڑا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں بادشاہ بانسوالہ کے سفر سے لوٹ کر فتح پور آئے تھے، تو قاضی عبد الرحیم قاضی متھرا نے شیخ کے پاس ایک استغاثہ بھیجا کہ ہم ایک مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیے ہوئے تھے لیکن یہاں کے ایک سرکش مالدار برہمن نے ہمارا عمارتی ساز و سامان اٹھوالیا اور اس سے بت خانہ کی تعمیر شروع کرادی۔ میں نے جب اس کی تحقیق کا ارادہ کیا تو گواہ موجود ہیں، اس نے حضور اکرم ﷺ کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شیخ نے اس برہمن کو بلا بھیجا لیکن وہ نہ آیا۔ آخر بادشاہ نے بیربر اور شیخ ابو الفضل کو بھجوایا اور وہ اسے لے آئے۔ شیخ ابو الفضل نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بیان کیا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہوگئی ہے کہ اس نے گالی بکی تھی۔ اس کی سزا کے معاملہ میں علماء کے دو گروہ ہوگئے۔ ایک تو اسے قتل کرانا چاہتا تھا دوسرا اس کی تشہیر اور جرمانے پر زور دے رہا تھا۔ اس معاملہ میں بحث طول پکڑ گئی۔ شیخ نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بڑا اصرار کیا۔ بادشاہ نے صراحتاً اجازت نہ دی اور گول مول کہہ دیا کہ شرعی سزائیں تم سے تعلق رکھتی ہیں ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ وہ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ بادشاہی محل کی عورتیں اس کی رہائی کے لیے سفارشیں کرنے لگیں، لیکن بادشاہ کو شیخ کا بڑا لحاظ تھا اس لیے رہائی کا حکم نہ دیا۔ شیخ نے

اس کے قتل کے لیے جب اور زیادہ اصرار کیا تو بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم تو تم سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تم جو مناسب جانو کرو۔ شیخ نے مکان پر پہنچتے ہی اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب یہ بادشاہ کے کانوں میں پہنچی تو اسے سخت غصہ آگیا۔

ہندو رانیوں نے حرم میں اور ہندو مصاحبوں نے محفل میں کہا کہ ان ملاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں سے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب تو ان کی جرأت ہو گئی ہے کہ آپکی مرضی اور پسند کا بھی ان کو خیال نہیں رہا اور آپکے حکم کے بغیر ہی وہ اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ غرض اس طرح بدگویوں نے بادشاہ کے کان بھرے کہ مزید تحمل ممکن نہ رہا اور جو مادہ عرصہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا، پھوٹ کر بہہ نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ پیش کر کے اپنے دین کے نئے نئے مفتیوں سے اس مسئلہ پر رائے مانگی۔ کوئی کہتا تھا اس مقدمہ میں گواہوں پر اچھی طرح جرح اور تعدیل نہیں کی گئی۔ کوئی بول اٹھا شیخ عبد النبی تو خود کو امام اعظم کی اولاد کہتا ہے، حالانکہ امام اعظم کے مذہب میں اسلامی حکومت کے ماتحت کافر نبی علیہ السلام کے بارے میں بد زبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور برائی ذمہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحتاً موجود ہے۔ حیرت ہے کہ شیخ نے اپنے دادا سے کس طرح اختلاف کیا۔ اچانک دور سے بادشاہ کی نگاہ مجھ (62) پر پڑی۔ میری طرف متوجہ ہو کر نام لے کر آگے بلایا اور کہا" آگے آؤ، میں جب پہنچا تو پوچھا کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر 99 روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے؟" میں (63) نے کہا ہاں ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور فرماتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ "ان الحدود و العقوبات تندرئی بالشبہات" میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا۔ نہایت افسوس کے ساتھ پوچھا: "کیا شیخ عبد النبی اس مسئلہ سے واقف نہیں تھا، اس نے بے چارے برہمن کو قتل کرا دیا، آخر ایسا کیوں ہوا؟!" میں (64) نے کہا شیخ خود بڑے عالم ہیں وہ ضرور جانتے ہونگے۔ اس روایت کے ہوتے ہوئے انھوں نے حکم دیا تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ بادشاہ نے پوچھا: "کیا مصلحت ہو سکتی

ہے؟'' میں نے کہا: فتنہ و فساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سد باب۔ اس سلسلے میں قاضی عیاض کی ''شفا'' کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی بیان کی، لیکن بعض خبیثوں نے کہا قاضی عیاض مالکی ہیں، ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں بن سکتی۔ بادشاہ نے مجھ(65) سے پوچھا: ''تمہارے پاس کیا جواب ہے؟'' میں نے کہا وہ یقیناً مالکی ہے۔ لیکن اگر کوئی محقق، مفتی، سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کے فتویٰ پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔ اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث ہوگئی۔ شہنشاہ کے مونچھ کے بال لوگوں نے بخوبی دیکھا کہ شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہوگئے تھے اور لوگ مجھے پیچھے سے ٹھوکے دے دے کر بحث سے روک رہے تھے۔ اچانک بادشاہ سے جھلا کر کہا: ''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، نامعقول ہے''۔ میں اسی وقت تسلیمات بجا لایا اور واپس آ کر جرگہ میں کھڑا ہو گیا۔ اسی دن سے میں نے پیش قدمی اور سبقت چھوڑ دی اور بحث اور مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کرلی، کبھی کبھی کورنش بجالاتا تھا اور بس۔

اس واقعہ کے بعد سے شیخ عبدالنبی کا برابر زوال ہوتا گیا۔ اس کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا پڑ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کترانے لگے، یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل ہی بند کردیا۔

اسی زمانہ میں شیخ مبارک آگرہ سے فتح پور کو کسی معاملہ میں مبارک دینے کے لیے آیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے بھی یہ ماجرا بیان کیا اس نے کہا: ''تم خود اپنے زمانہ کے مجتہد اور امام زمان ہو، شرعی اور ملکی احکام کے اجراء میں ان ملاؤں کے محتاج کیوں بنتے ہو؟ جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے واقف نہیں ہیں''۔ بادشاہ نے کہا: ''تم ہمارے استاد ہو ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے، کسی طرح مجھے ان ملاؤں کے دباؤ سے نکال لو'' شیخ مبارک کو پرانی مخاصمت اور دشمنی کا سودا چکانے کا خوب موقع ملا۔ اس نے نہایت بدباطنی کے ساتھ: ''آپ اجتہاد کا دعویٰ کردیا اور اس دعویٰ پر ان عالموں سے محضر لکھوا لیا''۔

یہی وہ واقعہ تھا جس کی بنیاد پر شیخ مبارک نے بادشاہ کے اجتہاد اور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضر تیار کیا اور پاجیوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم

الملک کو زبردستی پکڑ کر لایا گیا کسی نے ان کی تعظیم نہ کی، بچارے جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے پھر ان کے ساتھ ایسی زبردستی کی گئی کہ انھوں نے اسی بے بسی میں اپنی گواہی لکھ دی جیسا کہ ہم تاریخ میں بیان کر آئے ہیں۔ دونوں کو بادشاہ نے حجاز کے سفر پر روانہ کروایا۔ شیخ عبدالنبی کی وفات 991ھ/1583ء میں ہوئی۔

شیخ احمدی فیاض انبیٹھی وال

یہ بڑے عالم، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بہت زیادہ معمر ہوگئے تھے، چنانچہ چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ اس بڑھاپے کے عالم میں سخت بیمار ہوگئے۔ بڑھاپے کی ان مصیبتوں کے باوجود انھوں نے ایک سال کے اندر پورا کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد پڑھتے ہوئے غلطی کرتا تو محض یادداشت سے اسے ٹوک دیتے۔

تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ شیخ میاں نظام الدین انبیٹھی وال کے ہم شہر اور ہمعصر تھے۔ میاں صاحب سے کہا کرتے تھے کہ وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں؟

میں(66) جس وقت ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ شرح کافیہ کا درس دے رہے تھے۔ ایک ہزلیہ قطعہ کوئی شاگرد، ان سے پڑھ رہا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

ابو بکر الولد المنتجب   اراد الخروج لاعجب
فقد قال انی عزمت الخروج   لکفتارۃ ھی لی ام اب

شک یہ پڑ گیا تھا کہ یہاں لفظ ''کفتارۃ'' ہے یا ''کفارۃ'' جو کافر کی تانیث میں مبالغہ کا صیغہ ہے، انھوں نے فرمایا معنی کے لحاظ سے ''کفارۃ'' ہوگا اور ''کفتار'' کا لفظ تو قاری ہے۔ میں(67) نے کہا ''بہر حال'' ''کفتارۃ'' ''کفارۃ'' سے کہیں زیادہ واضح ہے۔

قاضی صدرالدین جالندھری

بڑے عالم متبحر، اہل تصوف وسلوک کے بڑے معتقد، نہایت خوش مزاج اور مجلسی آدمی

تھے۔ اگرچہ یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کسی وقت شیخ عبداللہ مخدوم الملک سے پڑھا تھا، لیکن میں نے ان کی علمی تحقیقات کو مخدوم الملک سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا۔

اپنے مشرب میں ایک بے قید آدمی تھے۔ مزاج میں آزادہ روی بہت تھی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے متعلق بے دینی کا شبہ کرنے لگتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ وہ بڑا حسن ظن رکھتے تھے۔ جو شخص بھی تارک دنیا ہو جاتا ہے خواہ وہ بدعتی ہی کیوں نہ ہو بڑے اعتقاد سے اس کی خدمت میں جا پہنچتے اور ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ان کی باتوں کو حجت مان لیتے۔ مشہور ہے کہ ایک بدعتی مجذوب بنا پھرتا تھا، وہ ان کے سامنے سے گزرا، قاضی اپنی عادت کے مطابق ہاتھ باندھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ مکار کہنے لگا کہ: ''خضر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں''۔ قاضی اس کے پیروں پر گر گئے اور کہا ''ہم کو بھی خضر سے ملا دو''۔ اس مکار نے کہا فی الحال میں اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں سخت متفکر ہوں اور یہ شادی 700 تنکہ کے لیے رکی ہوئی ہے، اس کام سے جب میں(48) فارغ ہو جاؤں گا تو تجھے ضرور خضر سے ملا دونگا''۔ قاضی نے اسی وقت 700 تنکہ اسے دے دیا اور وہ شخص 2 دن بعد قاضی کے پاس آیا اور کہا آؤ میں تمہیں خضر سے ملاؤں۔ انھیں لے کر وہ دریا پر گیا۔ وہ شخص نہایت بلند قامت اور قاضی پست قد تھے۔ وہ پانی میں گردن تک جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا آؤ خضر یہاں ہے۔ قاضی نے کہا: ''میں تیرنا نہیں جانتا کس طرح آؤں؟'' اس نے کہا: ''میں نے تو تم کو خضر کا ٹھکانہ بتا دیا اب تم نہیں آتے تو میرا کیا قصور؟

لوگ ان کے متعلق ایسی ہی اور مضحکہ خیز حکایتیں بیان کرتے ہیں جن کا لکھنا سنجیدگی کے شایان شان نہیں۔ اس واقعہ سے قاضی کی سادہ لوحی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانہ میں بادشاہ نے لاہور کے امراء و اکابر کو مختلف علاقوں پر نامزد کر کے بھیجا تھا تو ہر ایک کو ایک شہر میں کسی ایک عہدے اور منصب پر مقرر کر دیا تھا۔ قاضی صدرالدین کو اس وقت گجرات میں بندر بھڑوچ کا قاضی بنایا گیا، وہ وہیں جا کر رہ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔

ان کا ایک لڑکا شیخ محمد نامی ہے جو عالم و قابل آدمی ہے اور اسی مقام پر اپنے باپ کا جانشین بنایا گیا۔

میاں الہداد لکھنوی

نہایت صاحب تصرف، مستعد، دانشور اور عالم تھے۔ طبعاً نہایت ذہین تھے۔ خاص طور سے فقہ اور اصول فقہ میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالہ کا نام ایک مقتدر حاکم کے نام پر ''قطبی'' رکھا تھا۔ میں نے میاں صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و نادر تھیں۔ پہلا تو ایک رسالہ تھا جس کا طول 14 سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی سطروں کا تھا، اس کے حاشیوں پر بھی مضمون لکھا تھا۔ اس رسالہ میں 14 علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا جو مقامات حریری کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کے 5 حصے تھے اس کا نام انھوں نے ''قیطون'' رکھا تھا ان کا کہنا تھا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔

ان کے چچا زاد بھائیوں کا بیان ہے یہ 14 علمی رسالے اور رسالہ قیطون اصل میں حکیم زبرقی کی تصانیف ہیں۔ جو جون پور میں آیا تھا اور قاضی شہاب الدین سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا، پھر زمانہ کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانہ میں جنھیں ثانی امام اعظم خطاب ملا ہوا تھا، پہنچا۔ ان کے بعد وہ میاں الہداد کے پاس مرتے دم تک رہا۔ میاں الہداد شیخ اعظم کے صاحبزادے تھے۔

میر سید جلال الدین قادری

آگرہ کے مشہور سید ہیں۔ توکل و زہد میں ایک امتیازی شان کے مالک تھے۔ شروع سے آخر تک گوشۂ تنہائی میں رہے۔ امراء کی صحبت سے دور ہی دور رہے۔ بڑے آزاد مشربی کے ساتھ زندگی گزاری۔ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کی طرف سے لوگوں کو مرید بناتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے میر سید داؤد اپنے باپ کے

قائم مقام ہوئے۔ وہ نہایت تنگدستی اور فقر کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب شیخ مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو ان بیچاروں کا خاندان بھی ادبار و زوال کا نشانہ بن گیا:

صد ہزاران طفل سر بریدہ شد
تا کلیم اللہ صاحب دیدہ شد

شیخ حسین اجمیریؒ

ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت قطب المشائخ سلطان الواصلین خواجہ معین الدین سجزی چشتیؒ کے پوتوں میں سے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں جب اکبر کو حضرت اجمیریؒ سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی تو شیخ حسین سے اس کا مزاج مکدر ہی رہا۔ بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر دشمنوں کی بن آئی اور انھوں نے فتح پور کے بعض مشائخین کے اشارے پر اس بات کی گواہیاں دیں کہ شیخ صاحب نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اس معاملہ میں صدر اور قاضیوں نے بھی زمانہ سازی کے بموجب محضر لکھ دیے۔ اس طرح اجمیر کی سالہا سال کی موروثی تولیت دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔ دراصل شیخ کا وہاں بڑا عمل دخل تھا اور وہ اس صوبہ میں ایک طرح سے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ اثر و رسوخ بادشاہ کو کھٹک گیا۔ پھر کچھ اور چھوٹے بڑے معاملات ایسے بھی پیش آئے کہ شاہانہ تکبر و غیرت بھڑک اٹھی۔ آخر اکبر نے شیخ حسین کو جلا وطن کر کے مکہ بھجوا دیا۔ جب بادشاہی لشکر بانسوالہ کے سفر میں تھا۔ شیخ حسین اجازت لے کر مکہ گیے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ جس وقت اکبر فتح پور سے آکر محمد حکیم مرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل جا رہا تھا، شیخ حجاز کے سفر سے واپس آئے اور دربار میں پہنچے۔ دربار میں نئے مذہب کے نو مسلم مریدوں اور نو دولیتے مصاحبوں نے تعظیم و تسلیمات کے نئے نئے آداب وضع کر رکھے تھے۔ شیخ نے یہ آداب و تسلیمات ادا نہیں کیے۔ بادشاہ نے جب ان کو مطیع و مخلص نہ پایا تو گرفتار کر کے بھکر کے قلعہ میں بھجوا دیا۔ چند سال تک شیخ حسین بھکر میں رہے۔

1002ھ/1593ء میں بعض مقربوں کی سعی و سفارش سے شیخ کو بھکر سے طلب کیا گیا۔ شیخ بھکر سے آئے تو ان کے ساتھ اور بھی قیدی تھے۔ جن میں شیخ کمال بیابانی قلاب جیسے لوگ اور فتح پور کے قاضی بھی تھے، جو شیخ ابراہیم چشتی کی کوششوں سے 14 سال سے وہاں قید تھے۔ ان باغیوں کے نام میرزا نظام الدین احمد کے ذریعہ طلبی کا فرمان جاری کیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ دربار میں آئے حسب قاعدہ کورنش بجالائے، بادشاہ کو سجدہ کیا، اکبر نے خوش ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن شیخ حسین جو اس وقت 70 سال کے بوڑھے ہو رہے تھے کبھی شاہانہ تسلیمات کے نئے آداب پر عمل نہیں کیا تھا، اس بار بھی انھوں نے قدیم وضع پر تعظیم کی اور بس اچٹتی ہوئی تسلیمات بجالائے۔ ان کے اس رویہ کو دیکھ کر اکبر دوبارہ ان سے خفا ہو گیا اور مرزا نظام الدین سے کہا کہ ان کی مدد معاش کے لیے 300 بیگھہ کی زمین بھکر ہی میں دی جائے اور انھیں دوبارہ اسی جگہ بھیج دیا۔ اکبر کی والدہ بیگم بادشاہ نے محل میں ان کی سفارش کرتے ہوئے کہا: ''یوتم (اکبر کا پیار کا نام) شیخ کی والدہ بہت ضعیف ہیں اور اجمیر میں رہتی ہیں۔ بیٹے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل کباب ہو رہا ہے اگر ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ وہ تو تم سے کسی مدد معاش کی خواستگار بھی نہیں ہیں''۔ اکبر نے ماں کا کہنا قبول نہ کیا اور کہا: ''آچہ جیو (ماں کو پکارنے کا نام) وہ وہاں جائے گا تو پھر اپنی دکان کھول کر بیٹھ جائے گا۔ لوگ اس کے لیے نذر نیاز اور ہدیے بہت لے کر آئیں گے اور وہاں لوگوں کو گمراہ کرنے لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی والدہ کو اجمیر سے یہاں بلا لے''۔ والدہ کو بلانے کی بات شیخ کے لیے بھکر جانے سے زیادہ ناقابل قبول اور دشوار گزار تھی۔

اجمیر کی تولیت کے معاملہ میں بادشاہ نے خود میرا(69) نام تجویز کیا تھا۔ ایک رات صدر جہاں نے اس سلسلہ میں مجھے(70) خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کا خیال بدل گیا اور اس تجویز کو جسے خود ہی پیش کیا تھا بدل دیا اور مجھے دربار ہی میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر صدر جہاں سے دریافت کیا وہ سادہ لوح بوڑھا (شیخ حسین) کہاں ہے؟ میں نے یاد دلایا ''لاہور میں ہے''۔ میں(71) نے صدر جہاں کو بڑے اصرار سے کہا کہ: ''اگر اس

سعادت کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم اسے، شیخ حسین کو کوشش کر کے متولی بنوادو تا کہ حق، حقدار کو پہنچ جائے۔ لیکن کیا کیا جائے ان ہندستانی امیروں کو اپنے آدمیوں کی ترقی و تربیت کا ڈھنگ نہیں آتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے صفائی اور خلوص سے نہیں رہتے۔ اس لیے صدر جہاں کی کوششوں کا مجھ[72] بے کس کے حق میں کوئی نتیجہ نہ نکلا اور نہ بیچارے شیخ حسین کے لیے کچھ ہو سکا۔ شیخ حسین شکستہ دل اور مضطرب گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، نہ تو کسی کے گھر جانے کی قوت ہے نہ کچھ وسائل کہ روزی پیدا کرے۔ بادشاہ کے پاس اب عرض و گزارش اور سفارش کی بھی کوئی راہ نہیں رہی ہے۔

بہر حال شیخ حسین کی ذات نہایت غنیمت اور اس زمانہ میں باعث برکت ہے۔ میری ان سے کوئی جان پہچان اور ربط و تعلق نہیں۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ حج کر کے پھر قید و بند کی زحمتیں برداشت کر کے آئے ہیں۔ مجھے[73] تو وہ ایک نورانی وجود اور فرشتہ صورت دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ میں مشغول رہتے ہیں۔ صائم الدہر اور قائم اللیل ہیں۔ ملنے جلنے میں کسی سے وہ دنیا کی بات نہیں کرتے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی اور کشائش عطا کرے گا۔ کیوں نہ ہو؟" امید ہے ان صاحب خدا بزرگ کے طفیل میں مجھ جیسے قیدی کو بھی رہائی مل جائے تا کہ میں اس دربار کی بے معنی پریشان گفتاری، ہرزہ گوئی، بیہودگی اور جھوٹ لکھنے سے نجات پا جاؤں اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہوں اور بقیہ عمر کسی مفید مشغلہ میں گزار دوں۔

بسر آنم کہ گر ز دست بر آید
دست بکاری زنم کہ غصہ سر آید

اسی وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، صبح صادق طلوع ہو رہی ہے اور نسیم سحر چلنے لگی ہے۔ اگر میری اس دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر جا لگے تو کرم خداوندی سے کیا بعید کہ وہ میری مشکل حل کر دے:

غالباً خواہد کشود از دولتم کاری کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبح صادق می دمید

اگرچہ کسی شکوہ شکایت کا محل نہیں لیکن کیا کروں ایسا مضطرب اور بے قرار ہو گیا ہوں کہ یہ ایک دو دردناک آہیں بے اختیار نوک قلم پر آ گئیں، خدا معاف کرے:

ہرگز چنین نبودم کز درد دل بنالم
این بار بر دل من غم میکند گرانی

شیخ عبدالقادر

اوچہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم شیخ حامد قادری کے صاحبزادے ہیں۔ جس وقت بیرم خان کے عہد میں حضرت مخدوم آگرہ میں تشریف رکھتے تھے، میں طالب علم تھا لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

بیرم خاں بعض اہل بغض حاسدوں، خاص طور سے شیخ گدائی کے بہکانے سے حضرت مخدوم کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آیا اور ان کو اوچہ سے طلب کر لیا۔ مخدوم کو اس سلوک سے بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے بیرم خاں کو بد دعا دی، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیرم خان کو جو بھگتنا تھا وہ بھگت کر چلا گیا۔ شیخ محمد غوث بیرم خان کے اس وبال کو اپنا اثر سمجھتے تھے۔ غرض جب حضرت مخدوم ملتان پہنچے تو ان کا وہاں انتقال ہو گیا اور ان کی لاش ملتان کے قریب موضع حامد پور میں امانتاً دفن کی گئی۔

ان کی وفات کے بعد شیخ عبدالقادر اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ کے درمیان سالہا سال تک سجادہ نشینی کا جھگڑا ہوتا رہا۔ شیخ موسیٰ اکثر لشکر میں رہا کرتے تھے اور شیخ عبدالقادر فتح پور میں۔ ایک رات اکبر نے شیخ عبدالقادر کو کوکنار پینے کے لیے کہا۔ شیخ نے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے بادشاہ کا مزاج مکدر ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں جماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنے لگے تو بادشاہ نے فرمایا: ”شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو“ شیخ نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا: ”بادشاہ سلامت یہ کوئی تمہاری ملکیت ہے کہ تمہارا حکم چلے“۔ اکبر نے رنجیدہ ہو کر کہا: ”یہ شیخ کس قدر جاہل ہے؟“ پھر انھوں نے حکم دیا: ”جب تم ہماری ہماری ملکیت تسلیم نہیں کرتے تو ہمارے ملک میں بھی نہ

رہو"۔ شیخ اسی وقت وہاں سے اٹھ آئے، مدد معاش کو چھوڑ کر چھوٹے بھائی سے جانشینی کا جو جھگڑا چل رہا تھا اس سے دستبردار ہوئے اور اوچہ میں اپنے آبائی مقبرہ میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ شیخ موسیٰ کے غائبانہ مخدوم شیخ حامد کی ہڈیاں بھی اوچہ لے جا کر اسی قبرستان میں دفن کر دیں اور اپنے اسلاف کی اتباع میں فقر و توکل کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کی عزیمت کی یہ برکت ہے کہ لوگ انھیں اتنا کچھ نذر و ہدیہ دیتے ہیں کہ کسی مدد معاش کے محتاج نہیں رہے۔

چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ برسوں کے زہد و عبادت و مشیخیت چھوڑ دربار میں پہنچے اور بادشاہ کے ساتھ ارادت و عقیدت کا اظہار کیا۔ سپاہ گری کا پیشہ قبول کر کے فوج میں ملازم ہو گئے۔ اکبر نے ان کو پانصدی امیروں کی صف میں جگہ دے دی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک شخص مسلمان ہوا تو دوسرے نے کہا بڑا اچھا کام کیا۔ مسلمانوں میں بس تیری ہی ایک کمی تھی۔ اس تبدیلی کے باوجود شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ عین دیوان خانہ خاص و عام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو کچھ کہے۔ جب ان کے منصب پانے کی خبر عبدالقادر کو ملی تو انھوں نے کہا "وہ تو ہزاری منصب کا اہل تھا، اس سے بڑا منصب کیوں حاصل نہیں کیا اور بے وجہ اب تک محروم پڑا رہا آخر شیخ کو ملتان میں جاگیر مل گئی"۔

شیخ عبدالقادر نے دنیا کو ٹھوکر ماری اور فقر و توکل کی بدولت وہ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ خلق خدا کو ہدایت و ارشاد سے مستفید کرتے رہے۔ ان کے اکثر اوقات عبادتوں، سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں گزرتے رہے۔ ان کی دینی سیادت کا سکہ سب کے دل پر نافذ ہے

ما تو بروی فقر و قناعت نمی بریم
با پادشہ بگوئی کہ روزی مقدر است

شیخ کبیر

یہ مخدوم شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کے سجادہ نشین ہیں۔ ملتان کے لوگ ان کو اپنے وقت کا ولی

کہتے ہیں۔ ملتان والے ان کے اس قدر معتقد ہیں کہ اگر وہ کہہ دیں تو ایک دن میں ہزار سوار بلکہ اس سے زیادہ جمع ہو جائیں۔

ذکر و شغل اس قدر کرتے تھے کہ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ انھوں نے نشہ پی رکھا ہے۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آنکھیں اکثر سرخ رہتی تھی۔ اس لیے لوگ مست سمجھا کرتے تھے:

از بسکہ خون خورم ہمہ شب بی خود افتم
مردم نہند تہمت می خوارگی مرا

شیخ موسیٰ قادری جن کا ذکر آ چکا ہے۔ شیخ کبیر کے متعلق نشہ اور مستی کا ہی گمان رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ پچھلے اولیا، جن کا کتابوں میں ذکر ہے کہیں ایسے نہ رہے ہوں جیسے ہمارے شیخ کبیر ہیں کہ دل بجے بیٹھے ہیں اور پہلے کے شاعر کہیں شیخ فیضی اور اس جیسے دوسرے شاعروں کی طرح نہ گزرے ہوں کہ ملک الشعرا بنا ہوا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ فتح پور میں شیخ کبیر سے حسین خاں کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ شکوہ بزرگی تو ان کے ظاہر سے عیاں تھا، باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، قطعہ:

ہر کرا جامہ پارسا بینی　　پارسا دان و نیک مرد انگار
ور تو احوال او ندانی چیست　　محتسب را درون خانہ چکار

ان کی وفات 995ھ/1587ء میں ہوئی۔ اپنے بزرگوں کے مقبروں میں دفن کیے گئے۔

میر سید علی لدھیانہ

یہ بزرگ جھنجھانہ کے شیخ عبد الرزاق کے خلیفہ ہیں۔ بڑے عالم صاحب کمال تھے۔ وجد و حال کی کیفیت بڑی غالب تھی۔ 80 برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔

جب سے انھوں نے اپنے مرشد سے تلقین و ارشاد کی اجازت حاصل کی، اس وقت سے ساری عمر گھر پر ہی گزاری، قدم باہر نہیں نکالا۔ ان کی محفل میں کیا امیر کیا فقیر ساری

مخلوق حاضر رہا کرتی تھی، ان کی بڑی کرامتیں مشہور ہیں۔ سب سے بڑی کرامت تو یہی تھی کہ جو بھی خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کی صحبت میں حاضر ہوتا وہ گنہ گاری اور دنیا داری چھوڑ کر اللہ کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا اور حقیقی منزل کو پالیتا۔

ان کے معتقدین میں میرزا نظام الدین احمد کا داماد محمد جعفر بھی تھا کہ یہ نہایت سلیم الطبع نوجوان تھا، لیکن فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا، پرگنہ شمس آباد اسے جاگیر میں ملا ہوا تھا۔ وہ لاہور سے اس پرگنہ کی فوجداری کے لیے رخصت ہوا تو اثنائے راہ میں لدھیانہ ٹھہرتا ہوا یہاں میر موصوف کی خدمت میں پہنچنے کی اسے توفیق ہوئی، بس ایسا اثر ہوا کہ بداعمالیوں سے توبہ کر لی۔ شہادت کا ایسا شوق اس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ بے جھجک اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیتا تھا اور جان کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ بارہا اس نے میر صاحب سے شہادت پانے کے لیے دعا کی التجا کی۔ انھوں نے اس پر پھونک ماردی۔ تین چار مہینے کے اندر وہ اس قدر صالح، عبادت گزار اور نیک بن گیا کہ بہت سے متقی اور پرہیزگار اس پر رشک کرنے لگے۔ اس کی خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ اس حکومت، شان و شوکت کے باوجود تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا، کسی خادم کو زحمت دیے بغیر وضو کا پانی خود لے آتا۔ میر صاحب نے شہادت کے لیے جو پھونک ماری تھی اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہو گیا اور میرزا جعفر شمس آباد کے ایک موضع میں حربی کافروں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔

اسی سال اس موقع پر جب کہ میں ''(24) میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رخصت لے کر وطن جا رہا تھا تو میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت جعفر کی شہادت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے فرمایا ''شہیدوں کو اس عالم میں بڑی فرحت و لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں بھی کہا گیا ہے:

''بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین''

(وہ اللہ کے پاس زندہ ہیں اور خوشی و مسرت ان کے لیے مہیا کی گئی ہے)

اسی سلسلۂ گفتگو میں انھوں نے ایک قصہ بھی بیان کیا کہ: ''ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس علاقے میں شہید ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں جمعہ کی راتوں

کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر گزارا کرتا تھا۔" یہ قصہ مجھے(75) معلوم تھا اس لیے میں نے عرض کیا کہ میں نے لوگوں سے یہ تک سنا ہے کہ ان میاں بیوی کے بچے بھی ہوئے ہیں۔

اسی طرح پیاور میں جو میرا(76) وطن ہے ایک اور قصہ مشہور ہے۔ وہاں اسحٰق نامی پٹھان شہید ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بھی ہر جمعہ کی رات اپنی نویلی دلہن کے پاس آیا کرتا تھا اور اس کو اس راز کے افشا سے اس نے منع کر دیا تھا۔ انھی دنوں اس کی بیوہ حاملہ ہو گئی اور لوگوں نے اس پر ناجائز کام کا الزام لگا دیا تو اس نے بڑا اصرار کرنے کے بعد اپنی ساس یعنی اسحٰق شہید کی ماں سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ مقررہ رات کو اس کی ساس نے جو اپنے بیٹے کو دیکھ لیا اور وہ اس کا نام لے کر آغوش میں لینے کے لیے دوڑی مگر وہ شکل اچانک غائب ہو گئی۔ اسی دن سے بس اسحٰق کی وہاں آمد و رفت بند ہو گئی اور وہاں ماں نے اپنے بیٹے کے نام ایک کنواں کھدوایا، جو اب تک موجود ہے۔ پیاور کا قصہ بھی میں(77) نے اس محفل میں بیان کر کے میر صاحب سے پوچھا: "کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ انھوں نے جواب دیا: "ممکن ہے عقلاً بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرزا نظام الدین نے کہا ہو سکتا ہے کوئی جن اس شہید کی صورت میں آتا ہو"۔ آپ نے فرمایا: "جنوں کو انبیاء، اولیاء، صلحاء اور شہید کی تمثیل اتارنے پر قدرت حاصل نہیں ہے"۔ میر سید علی کی وفات 1002ھ / 1593ء میں ہوئی۔ ایک علم نے "شیخ امام" ان کی تاریخ کہی ہے۔ اب ان کے جانشین میر سید محمود ہیں۔

شیخ معین

یہ مشہور واعظ "معراج النبوۃ" کے مصنف ملا معین کے پوتے ہیں۔ نہایت نیک نفس اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔ مدت تک لاہور میں قاضی رہے۔

ان کے متعلق مشہور ہے کہ اپنی قضاوت کے دوران ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی مقدمہ کے فیصلے پر اصرار کرتا تو وہ اسے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہتے تھے خدارا تم دونوں آپس میں صلح کر لو تاکہ میں تمہارے جھگڑے میں اللہ کے پاس پکڑا نہ جاؤں اور

مجھے آخرت میں شرمسار نہ ہونا پڑے۔ وہ فریقین سے کہا کرتے تھے کہ تم دونوں عقل مند ہو اور مجھ اکیلے نادان کو دو دانشمندوں سے سابقہ آپڑا ہے۔ خدا را تم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ نہ کرو۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے غائب رہنے کی بنا پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تا حد امکان اپنے پاس سے اس کا خرچ دے دیتے اور کہتے یہ رقم لے کر جا اور شوہر کا انتظار کرو اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔ اپنی مدد معاش کو جو کافی اچھی تھی، ساری کی ساری کاتبوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان کاتبوں سے وہ قیمتی اور عمدہ کتابیں لکھواتے۔ ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے، پھر جلد بندھوا کر طالب علموں کو مفت دے دیتے۔ ساری عمر ان کا یہی مشغلہ رہا اور انھوں نے لوگوں کو ہزاروں جلدیں بخش دیں۔ 1528/935ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کے دو لڑکے رہ گئے ہیں ایک تو پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور ہے۔ بادشاہ سلامت کے یہاں بھی ان کے فنوں کا ذکر آیا تو بادشاہ نے دونوں کو بلا کر ان کے کھیل تماشے دیکھے۔

میر عبداللطیف قزوینی

یہ سیفی حسینی سادات میں سے ہیں۔ علوم عقلی اور نقلی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے باپ اور دادا سے علم تاریخ گویا ان کے یہاں موروثی ہے۔ چنانچہ حیرتی شاعر نے قاضی یحییٰ کے والد کی تعریف میں کہا ہے:

قصہ تاریخ ازو باید شنید
کس دریں تاریخ مثل او ندید

انھوں نے یا ان کے کسی عزیز نے شاہ اسمٰعیل کے خروج کی تاریخ "مذہب نا حق" سے نکالی تھی۔ جب اس گستاخی پر پکڑے گئے اور مواخذہ ہوا تو کہہ دیا کہ ہم نے تو "مذہبنا حق" ہمارا مذہب حق ہے! تاریخ کہی تھی۔ بس یہ معنی خیز جواب دے کر چھوٹ گئے۔

سیفی سید سب کے سب بڑے پکے سُنی رہے ہیں، چنانچہ اسی جرم میں شاہ طہماسپ نے ان کی زمینیں جاگیریں چھین لی تھیں۔ ہندوستان میں میر عبد اللطیف کے آنے کا بھی یہی سبب تھا۔

میں(78) نے میرزا غیاث الدین آصف خاں کی زبانی سُنا ہے کہ جب بادشاہ میر عبداللطیف اور ان کے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا۔ میر علاؤ الدولہ نے جو تذکرہ کا مصنف ہے اور عبد اللطیف کا چھوٹا بھائی ہوتا ہے اور انہی سے تربیت پائی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کو ''حضرت آقا'' کہا کرتا تھا۔ کسی مصلحت کی وجہ سے اس نے اپنی خدمت میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔

لعنت کنم بہ یحییٰ و بر حضرت آقا

لوگوں نے اس سے کہا تو نے تو میر صاحب کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی ہے، پھر ان کی توہین کیوں کی؟ اس نے جواب دیا، دیکھتے نہیں ہو، اسی حق کی وجہ سے تو اس کو میں نے ''حضرت آقا'' کہا ہے اور اپنے باپ کا نام یحییٰ تو بغیر تعظیم ہی کے لیا ہے۔

جب فتنہ پردازوں نے شاہ طہماسپ کو میر یحییٰ کی طرف سے بدگمان کر دیا تو شاہ نے اپنے ایک نمائندے کو آذربائیجان فرمان دے کر بھیجا کہ میر یحییٰ اور ان کا لڑکا میر عبد اللطیف نہایت متعصب سنی ہیں اور انہی کی وجہ سے قزوین میں سنیوں کا زور بندھا ہوا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے اور اہل سنت کی جو کتابیں ان کے پاس ہیں، ضبط کر کے ہمارے پاس بھیج دی جائیں۔ ان کے اہل و عیال اور قبیلہ والوں کو اصفہان میں منتقل کر دیا جائے۔ میر علاؤ الدولہ کو بھی جو ان دنوں آذربائیجان میں تھا، ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ اسی طرح کا خط لکھ کر بھیجا۔

غرض حسب الحکم میر یحییٰ کو سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور وہ ڈیڑھ سال تک اصفہان میں قید رہے اور اسی قید میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میر عبد اللطیف وہاں سے فرار ہو کر عرصہ تک گیلان کے پہاڑوں میں رہے، پھر بادشاہ غفران پناہ (ہمایوں) کے وعدے پر

ہندستان چلے آئے۔

یہاں آنے کے بعد ان کا بڑا اعزاز و اکرام رکھا گیا اور بے اندازہ شاہانہ سرفرازیوں سے نوازے گئے۔ اکبر نے ان کے پاس دیوان حافظ کے چند سبق اور کچھ دوسری چیزیں بھی پڑھیں۔ میر عبداللطیف نے 5 رجب 981ھ/1573ء کو فتح پور میں انتقال فرمایا۔ قلعہ اجمیر پر میر سید حسین خنگ سوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ "فخر آل یسٰین" نکالی ہے۔

میر غیاث الدین علی

میر عبداللطیف قزوینی کا لڑکا ہے۔ اسے دربار سے نقیب خاں کا خطاب حاصل ہے۔ یہ نہایت فرشتہ خصلت اور صاحب علم و کمال شخص ہے۔ علم سیر، تاریخ اور اسماء الرجال میں تو عرب و عجم میں بھی اس جیسا ماہر فن اور کوئی نہ ہوگا۔

میرزا کے ساتھ میرا(79) بڑا دوستانہ رہا۔ وہ اور ہم(80) ساتھ ساتھ پڑھتے بھی تھے۔ اب وہ رات دن بادشاہ سلامت ہی کی خدمت میں رہتا ہے اور تقریباً 100 سال سے خلوت و جلوت میں تاریخی قصے، حکایات جو فارسی اور ہندی افسانے، جس کا اسی زمانہ میں ترجمہ ہوا ہے، بادشاہ کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔

اکبر کے ساتھ اس کا ایسا ملاپ ہے کہ وہ خاندان شاہانہ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اکبر ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی جدائی کو گوارا نہیں کرتا تھا۔

ان دنوں اسے ہلکا سا بخار ہو گیا ہے امید ہے کہ جلدی اسے شفا ہو جائے گی۔ بہر حال نیک لوگ ہر جگہ معزز رہتے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ بروں کی زندگی کی دعا کیوں کی جائے کہ وہ رہیں گے تو وہی اپنی برائی کرتے رہیں گے۔

خواجہ محمد یحیٰ

حضرت خواجہ احرار سے 3 واسطوں سے خاندانی رشتہ رکھتے ہیں۔ فن تحریر میں بڑا عبور حاصل

تھا۔ 7 طرح کے خطوط بڑی عمدگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس فن میں وہ ماہر استاد تھے۔

نہایت اچھے اخلاق و عادات کے مالک تھے۔ یہ خوبی تو ان کو موروثی ملی تھی، کم سخن تھے لیکن ہمیشہ ان کی محفل گرم رہتی تھی۔ سخی ایسے تھے کہ جو بھی جاگیر کی آمدنی ہوتی وہ ان کے دسترخوان پر صرف ہو جاتی تھی۔ لوگوں کے آڑے وقتوں میں ہمیشہ کام آتے تھے۔

جب دربار میں مفسدوں کا دخل حد سے زیادہ بڑھ گیا اور پرانی محفل درہم برہم ہو گئی تو انھوں نے بھی دربار سرکار سے کنارہ کشی کر لی اور حجاز جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ بادشاہ نے ان کو حجاج کے قافلے کا میرحاج مقرر کیا اور کافی خرچ دے کر انھیں رخصت کیا۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹ آئے۔

آگرہ میں ان کے اکثر اوقات عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے۔ اسی جگہ ان کا انتقال ہوا:

ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ درین دام گرچہ افتادہ است

شیخ حسین بدخشی

مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ تھے۔ ان پر سکر کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہر روز کبرویہ سلسلہ کے طریقہ پر کتاب مصباح کو جو شیخ رشید کی تصنیف ہے، ان کی محفل میں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب سنتے سنتے ان پر حال طاری ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے یہاں مثنوی مولوی معنوی بھی لازماً پڑھی جاتی تھی۔ شریعت پر ثابت قدم تھے۔ ان کی صحبت و گفتگو بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو کہتے: ”اپنے اوپر تم ہمارا بھی عکس دیکھتے ہو“۔

بدایوں میں چند ترک ان کے مرید تھے۔ ان سے ملنے وہ چند بار بدایوں تشریف لائے تھے اور بدایوں والے ان کی صحبت مبارک سے فیض یاب ہوئے۔ وہاں سے لوٹ کر جب وہ آگرہ میں مقیم تھے تو ان کا وصال ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر

اوچہ کہ شیخ عبدالقادر ثانیؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ بخش دونوں نے بڑے تقوی و پرہیز گاری کے ساتھ تربیت پائی۔ دونوں بڑے صاحب کمال رہے۔

کچھ عرصہ تک یہ دونوں فتح پور میں رہے۔ جس زمانہ میں سنئے مذہب کی باتیں شروع ہوئی تھیں اکبر نے شیخ اللہ بخش پر مہربان ہو کر گجرات میں صدر کے عہدہ پر فائز کیا تھا نیز شہباز خان کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ تقرری در حقیقت ان کی جلاوطنی تھی۔ جب گجرات میں بغاوت ہوئی تو انھوں نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں اور وہاں باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاع تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ بھجواتے رہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر 3 صدی کے منصب کے لیے فرمان صادر کر دیا۔ اسی زمانے میں ان کا وہاں انتقال ہو گیا۔

اکبر نے ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر کے لیے مکہ معظمہ کی طرف خارج کر دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ جس زمانہ میں خان خانان بیرم خان اور میرزا نظام الدین احمد گجرات کے نظم و نسق پر مامور تھے، وہ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ان کے لیے سامان سفر درست کیا گیا اور وہ حج و زیارت کی برکت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے۔ اب اپنے وطن لاہور میں عبادت الٰہی میں مشغول ہیں۔

شیخ ابوالمعالی

میاں شیخ داؤد کے بھتیجے، داماد اور جانشین ہیں۔ احوال و مقامات میں نہایت تیز رس اور بلند مقام رکھتے ہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز، بلکہ بزرگوں سے بھی آگے ہیں۔ اپنے پیر کی محبت میں انھوں نے خود کو بالکل ہی مٹا دیا اور ہمیشہ پیر کی اتباع میں مصروف رہے۔ خود ان کے اشعار ہیں:

مستم از جام محبت ہمہ دم والہ و مست　　این و آن راچہ شناسم کہ من داؤد پرست

دل افسردہ کسی باید بگفت ہر کسی گری
دم داؤدی باید کہ آہن را دہد نرمی

بہ تخت فقر بنشینم چو حاصل گشت مقصودم
سلیمانی کنم کز جان غلامِ شاہ داؤدم

رباعی

یارب نظری زمین مقصودم بخش　　　آزادگی زبود و نابودم بخش
ہر چندیم درخوراین دولت خاص　　　یک ذرہ زعشق شیخ داؤد بخش

ان کی زبان پر اکثر یہ جملے رہتے تھے۔

"یا ابا المعالی، کن عبد الرب المتعالی ولا تکن عبد الدراھم دلالی"

کہتے ہیں جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کو قطب الاقطاب حضرت میاں شیخ داؤد کے پاس لے کر گئے اور ان سے نام رکھنے کے لیے کہا گیا۔ حضرت میاں نے فرمایا: ''ان کا نام شاہ ابو المعالی رکھو''۔ اس زمانہ میں ایسے نام ہندستان میں نہیں ہوا کرتے تھے، کیونکہ یہ مغلوں کے نام کے مشابہ تھا۔ لوگوں نے اسے مغلوں کی آمد کے لیے فال نیک سمجھا' چنانچہ ایک برس بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ہمایوں ہندستان آ گیا اور اس نے اپنے محبوب ابوالمعالی کو پنجاب کی حکومت عنایت کی۔

ابوالمعالی کی پیدائش کی تاریخ ''ابو المعالی حق پرست'' سے نکلتی ہے۔ ان کے یہ شعر ان کی مستانہ وار محبت کے گواہ ہیں:

غربتی از حال میگوید سخن　　　با سخن این قیل وقال دیگر است
حالت عشقش بود گفتن محال　　　ورنی گویم مجال دیگر است

غربتی نقد جان فدا کیش کن
دولت وصل رائگان ندہند

سخن عشق بدل ورنہ ولب را بکشا
سر این شیشہ فرو بند کہ بادل نخورد

فرق حق بانگ انا الحق زن واز دار مترس   زانکہ معراج درین راہ رسن دار بود

آنچہ مازان جان جانہا دیدہ و دانستہ ایم
بہر گفتن نیست بہر دیدن و دانستن است

انھوں نے مجھے (81) لاہور میں یہ رقعہ بھجوایا تھا:

''عزیزی! اس ہنگامہ پرور زمانہ میں ہر آنے جانے والے سے ہم تمہاری خیر و خیرت کے طالب رہے کہ اچانک تمہارا محبت نامہ وصول ہوا۔ اس وقت حضرت قادری کے اشعار میری روح کو بے چین کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے مزید کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ سب کو ہماری طرف سے دُعا۔''

آن عزیزی کہ ہمہ شب بدل من گردد
خرم آن روز کہ در دیدۂ روشن گردد

سلام شوق! مولانا عبد الغفار اور شیخ عمر کا ایک ضروری کام ہے جو آپ کی ذرا سی توجہ سے پورا ہو جائے گا، اگر فرصت ہو تو ان کا کام کر دیجئے۔

مولانا جمال تلہ

لاہور میں ان کے نام سے ایک محلّہ بھی مشہور ہے۔ حاجی مہدی کے داماد ہیں۔ حاجی مہدی بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔ مولانا جمال اوچ کے مُلا اسمٰعیل کے شاگرد ہیں، لاہور میں مدرس ہیں، اپنے وقت کے بڑے عالم ہیں۔ تقریباً تمام علوم عقلی و نقلی کو انھوں نے حاصل کیا ہے۔ ذاتی طور پر نہایت ذہین، جدت طراز اور قابل جوہر ہیں۔

8 سال سے برابر درس و تدریس کا مشغلہ ہے، ان کی خوش بیانی اور تنقیح و توضیح کا بڑا شہرہ ہے۔ چنانچہ وہ معقول و منقول کسی بھی علم کی مشکل مسائل بآسانی شاگردوں کو سمجھا

دیتے ہیں۔ نہایت مہربان و شفیق استاد سمجھے جاتے ہیں۔ صلاح و تقویٰ سے آراستہ نہایت با اخلاق انسان ہیں اور قرآن کے حافظ بھی ہیں۔

شیخ فیضی کی تفسیر میں اکثر مقامات پر انھوں نے اصلاح دی ہے اور اس کی تحریر کو مربوط کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس(50)، ساٹھ(60)سال کے لگ بھگ ہے:

چیست بحث علم اگر تا فرق فرقد میرود
ذکر مولانا جمال الدین محمد میرود

مولانا عبد الشکور لاہوری

بڑے دانش و عالم ہیں۔ متانت فہم اور جدت طبع میں کافی مشہور ہیں۔ مشائخ سے گہری عقیدت اور حسن ظن رکھتے ہیں اور اپنے اکثر اوقات صوفیا کے اقوال کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ ہمیشہ عبادتوں، نوافل، وظائف، دعاؤں اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ سخی ایسے کہ جو کچھ پونجی ہوتی ہے وہ فقراء اور اہل ضرورت پر خرچ کر دیتے ہیں۔

جب علماء ابتلا و آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے، بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے جونپور کا قاضی بنا دیا تھا جب بادشاہ نے الہ آباد کا سفر کیا اور وہ دربار میں حاضر ہوئے تو وہاں کی قضاوت کا عہدہ قاضی زادہ رومی کو جو نہایت خوش مزاج اور باکمال عالم ہیں تفویض کر دیا گیا۔ اس وقت سے مولانا عبد الشکور معزول ہیں، تھوڑی سی آمدنی پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ اطمینان سے علمی افادے میں مشغول ہیں۔

شیخ کبیر ولد شیخ منور

اپنے والد کے قائم مقام ہیں۔ یہ ایک صالح نوجوان ہیں جو چھوٹی عمر میں ہی بلند مدارج تک پہنچ گئے اور ایسا کمال حاصل کیا کہ بوڑھے اساتذہ سے بھی آگے ہو گئے۔ اس آخری زمانہ میں لڑکا باپ سے بہتر نکلے تو اسے بس عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔

انھوں نے اکثر متداولہ علوم اپنے والد اور خسر میاں سعد اللہ بنی اسرائیل سے حاصل کیے اور ان بزرگوں سے آداب محفل اور دوستی کا سلیقہ خوب سیکھا ہے۔ بادشاہ کے مزاج

شناس ہیں۔ افیون کی بُری لت لگی ہے۔ اس کے علاوہ تکبر، جھوٹ اور شیخی کے بھی بیمار ہیں خدا ان بُری باتوں سے انھیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

جس زمانہ میں وہ بادشاہ کے حسب الحکم اپنے والد کے ہمراہ پرگنہ بجواڑہ اور شمالی پہاڑی کے دامن کی طرف گئے ہوئے تھے تو انھوں نے وہاں سے مجھے[82] یہ رقعہ لکھا تھا۔

رقعہ

"کان لی قلب اعیش بہ ضاع منی تقلبہ"

''امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہونگے۔ جناب من ہمارا دل عبادت کدۂ خلوص میں معتکف ہے اور یہ خاکی جسم کہ اس پر خاک ہی پڑے تو بہتر۔ اس بیابان کثرت میں درندوں اور وحشیوں کے ساتھ آوارہ نہیں بلکہ ایسے گروہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ وحشی جانور بھی ان کو دیکھ کر وحشت کھا جائیں۔ سبحان اللہ! خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو کر رہے گا۔ ذلیل نفس نے اب گوشۂ عافیت کی قدر جانی ہے۔

جب سے میں سن تمیز پر پہنچا اس وقت سے اب تک کہ میری عمر 40 سال ہوگئی ہے۔ میری ہمیشہ توجہ اسی جانب رہی کہ روحانی دردمندوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفسانی عیوب اور باطنی بیماریوں کا علاج کروں لیکن اللہ تعالی نے ایسی سخت بیماری میں مبتلا کر دیا کہ اب اس کا علاج خود اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ہونے کا۔

بہرحال اب نہ وہ صحبت روحانی حاصل ہے، نہ اطمینان قلب، وہ گوشۂ عافیت بھی اُجڑ کر رہ گیا۔

آپ براہ کرم نواب فیاضی علامی فہامی کو سلام اشکر یہ پہنچا دیں۔ دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیے۔ امید ہے میاں احمد صحت و سلامتی سے ہونگے مجھے اپنا مشتاق سمجھیں''۔

شیخ سعد اللہ نحوی

مشرقی ہند کے رہنے والے ہیں۔ بیانہ میں مقیم رہے اور بچپن ہی سے شیخ محمد غوث کی

خدمت سے مشرف رہے اور ان کے فیض سے دعوت اسماء کے عمل اور وظیفہ کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے ریاضتیں کیں۔

بیانہ میں انھوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی جو برسوں طالب علموں اور اہل سلوک کا ملجا و ماوا بنی رہی۔ وہ لوگوں کی تلقین و ہدایت میں برابر لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے علم نحو میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے زمانہ کے بے مثل نحوی تھے۔

70 سال تک سوائے دودھ اور جنگل کے پھل اور پھلہری کے اور چیز سے افطار نہیں کیا۔ سخاوت اور ایثار میں بھی بڑے دراز ہاتھ ہوئے ہیں۔

میں سلیم شاہ کے عہد میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے میں نے کافیہ کے چند سبق پڑھے ہیں۔

آخری دنوں میں وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ایک عالم حیرت میں ڈوبے رہتے اور ایک علیحدہ کمرے میں گوشہ نشین رہتے تھے۔ بچوں تک کو اپنے پاس نہیں بلاتے تھے۔ اسی عالم میں 989ھ/ 1581ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔

کہتے ہیں جس دن ان کا انتقال ہوا تھا ایک چڑیا ان کی میت پر اچانک آ کر گر پڑی۔ دیکھنے والے اس واقعہ پر نہایت حیران رہ گئے۔

شیخ نصیرالدین

ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ کیمیا گری میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمایوں بادشاہ کے سفر و حضر کے رفیق و مصاحب تھے۔

جوسے کی شکست کے بعد جب ہمایوں آگرہ پہنچا تو اس نے شیخ سے کہا کہ نئے لشکر کی تیاری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ شیخ نے تانبے کی تمام دیگیں، تھالی اور برتن جمع کرائے اور بادشاہ کے سامنے انھیں خالص سونا بنا کر دے دیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا اور دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی۔

میری(83) رشتہ داری بھی انہی کے خاندان میں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں، میں(84) نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ شیخ خود کیمیا کے نسخہ سے واقف نہ تھے انہیں کسی درویش نے کیمیا کے اجزاء سے بھری ہوئی ایک زنبیل دے دی تھی اس سے انھوں نے بہت سے تانبے کو سونا بنا لیا۔ جب وہ ختم ہوگئی تو سونا بنانا ان کے بس میں نہ رہا کیونکہ وہ اس علم سے واقف نہ تھے۔

میں(84) نے ان کو بیرم خان کے عہد میں میر سید رفیع الدین محدث کے بھتیجے سید شاہ میر کے مکان پر دیکھا تھا۔ بڑے با اخلاق نورانی چہرے والے بزرگ تھے۔ اسی زمانہ میں ان کا انتقال ہوگیا تھا اور ہندوستان ہی میں دفن کیے گئے۔

شیخ مبارک الوری

سلیم شاہ ان کو شاہ مبارک کہا کرتا تھا اور ان کی اس قدر تعظیم کرتا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ وہ غالباً سید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ پٹھانوں کے بیچ ان کی بڑی عزت تھی۔

جس زمانہ میں پٹھانوں کو زوال ہوا اور وہ مغلوں سے شکست کھا کر بھاگے، بعض پٹھانوں نے شیخ الاسلام فتح پوری کو اس شبہ میں کہ ان کے پاس بہت روپیہ ہے، گرفتار کرکے رنتھبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ اس خبر کو سن کر شیخ مبارک الور سے پیاور کے راستہ وہاں پہنچے اور شیخ سلیم کو چھڑا لیا۔

انھوں نے جب دوسری بار کعبۃ اللہ کی زیارت کی تھی تو میں(84) 16 سال کا تھا اور اس وقت اپنے والد کے ساتھ پیاور جاکر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بعد میں 987ھ/1589ء میں جب کہ اکبر نے اجمیر کی آخری زیارت کی تھی اور الور کے راستہ فتح پور لوٹ رہا تھا میں(84) نے دوبارہ حضرت سے ملاقات کی تھی۔

بلا شبہ وہ نہایت صاحب کمال شخص تھے۔ نہایت فیاض اور ایثار پسند آدمی تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں 90 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

شیخ چائین لدہ سوہنوی

قصبہ لدہ سوھنہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ قصبہ میوات میں دہلی سے 18 کوس کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ایک گرم چشمہ ہے جو گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔ اس کا پانی سبز رنگ کا ہے اور اس سے گندھک کی بو آتی ہے۔ جاڑوں میں بھی اتنا گرم رہتا ہے کہ جسم پر ڈالا نہیں جا سکتا۔ خارش کے مریض کے لیے اس چشمہ میں نہانا مفید ہے۔ اس کی بو اور پانی کا رنگ خود بڑا ثبوت ہے کہ یہ گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔

وہاں کا ایک اور عجوبہ ہے کہ گرمیوں کی راتوں میں اس قصبہ کے پہاڑوں میں کسی کے جلائے بغیر جگہ جگہ تھوڑی آگ جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شیخ چائین حضرت عبدالعزیز دہلوی کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔ فقر و قناعت ان کا مسلک ہے۔ خاص خاص شاگردوں کو تصوف کی کتابیں جیسے ''فصوص'' اور ''نقد فصوص'' وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ آخری عمر میں شہنشاہ اکبر ان کا نہایت معتقد ہو گیا تھا اور بعض مہموں میں ان سے دعا کرائی تھی۔ اپنے محل خاص کے قریب عبادت خانہ میں ان کی رہائش کا انتظام کرا دیا تھا۔ راتوں میں ان کے ساتھ خلوت میں باتیں ہوا کرتی تھیں، لیکن جب اکبر نے ان کو ''نماز معکوس'' پڑھتے دیکھا تو اس کی عقیدت و ارادت جاتی رہی۔

989ھ/1581ء میں جب بستر مرگ سے جا لگے تو شیخ عبدالعزیز کے لڑکے شیخ قطب عالم کو جو فوج میں ملازم تھا، دہلی سے بلوایا اور خرقہ، عصا اور مشیخت کا سارا سامان اس کے سامنے رکھ کر کہا یہ تمہارے والد کی امانت تھی اس کے لیے تم سے زیادہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ''حقیقت فقر'' سے نکلتی ہے۔

شیخ عبدالغنی بدایونی

یہ بھی شیخ عبدالعزیز کے خلیفہ ہیں۔ ترک تعلق میں اپنے وقت کے ادہم'' اور عالم تجرید میں اپنے زمانے کی شبلی'' ہیں۔

بدایوں میں وہ طالب علم ہی تھے کہ ان پر کیفیت و حال طاری ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا

ہوتا تھا کہ عین سبق پڑھنے کے دوران جب کہیں سے نغمہ کی آواز آجاتی تو پہروں بے ہوش ہو جاتے۔ جب ان کے ساتھی پوچھتے کہ تم نے کیا دیکھا جو یہ حالت ہوگئی؟ تو کہا کرتے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں۔

شادی شدہ ہونے کی وجہ سے روزی کی تلاش میں دہلی آئے اور وہاں کے حاکم تاتارخاں کی خدمت میں پہنچے۔ تاتارخاں تھا تو حاکم لیکن درحقیقت نہایت خدارسیدہ آدمی تھا۔ اس ملازمت کے دوران شیخ موصوف شیخ عبدالعزیز کے مرید ہو گئے اور تمام مروجہ مشہور کتابیں ان سے پڑھیں اور تحصیل علم کے بعد برسوں سبق پڑھایا۔ درس و تدریس کے مشغلہ کے دوران ہی جذبہ باطنی اچانک جوش میں آیا اور تمام مشاغل ترک کر کے شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں کچھ عرصہ تک عبادت گزار درویشوں میں شامل رہے۔ بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ جب کمال باطنی حاصل کر لیا تو آبادی سے باہر قدمگاہ حضور اکرمؐ کے قریب ایک مسجد میں جا کر جو خان جہاں کی مسجد مشہور ہے، مقیم ہو گئے۔ اگرچہ اہل و عیال اور خاندان کی بڑی ذمہ داریاں تھیں لیکن انھوں نے کل کا مسلک اختیار کر لیا اور تقریباً ایک قرن ہو چکا، اس گوشۂ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

1003ھ/1594ء میں خان خاناں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے نصیحت کرنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا: ''حضور اکرمؐ کی پیروی اختیار کرو''۔ اس تحریر کے قریبی زمانہ ہی میں احمد صوفی، حاجی بخاری جو اس آخری دور فتن کے سربرآوردہ اشخاص ہیں اور نئے دین الٰہی کے نومسلم ہیں:

حذر از صوفیان شہر و دیار　　ہمہ نا مردمند و مردم خوار
ہر چہ دادی بدست شان خوردند　　ہر چہ آمد ز دست شان کردند
کارشان غیر خواب و خوردن نہ　　ہیچ شان فکر روز مردن نہ

ان لوگوں نے اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے اور اپنے فسق کو چھپانے کے لیے یہ چاہا کہ شیخ عبدالغنی اور ایک دو اور بقیۃ السیف بزرگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے، چنانچہ ان لوگوں کو دہلی سے لاہور حاضر ہونے کے لیے فرمان جاری کر دیے گئے۔ شیخ نے میرے پاس ایک

خط بھیجا جس میں انھوں نے آنے سے بڑی معذوری ظاہر کی تھی۔ میں نے احمد صوفی کو کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی مجبوریاں سمجھائیں یہاں تک کہ اس نے ان بزرگوں کی حاضری کا خیال چھوڑ دیا اور معافی کا ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔ اس طرح یہ معاملہ بخیر و خوبی گزر گیا۔

شیخ بہلول دہلوی

علم حدیث کے بڑے اچھے عالم تھے۔ صاحبان فقر و فنا کی صحبت میں رہے۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ سے فقر و توکل کے راستہ پر نہایت ثابت قدمی سے قائم ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیشہ طالب علموں کو درس دینے اور علمی فیض پہنچانے میں مشغول رہتے ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی

آپ کا تخلص حقی تھا۔ علوم عقلی و نقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر و کمال کا مجموعہ تھے۔ تصوف میں بھی آپ کا بلند درجہ تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک تو ''تاریخ مدینہ سکینہ (جذب القلوب الی دیار المحبوب)'' کا ترجمہ اور ہندستان کے متاخر مشائخین کرام کے حالات کا ایک مجموعہ (اخبار الاخیار فی اسرار الابرار) ہے جس کی تاریخ تصنیف ''ذکر الاولیاء'' سے نکلتی ہے۔

عنفوان شباب سے ہی انھیں علوم و فنون سے بڑی دلچسپی تھی۔ شیخ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد سے قدیم روابط تھے۔ کچھ عرصے تک وہ ان لوگوں کے ساتھ فتح پور میں رہے۔ اس زمانہ میں میں(84) نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ جب دین بادشاہی کا قضیہ پیدا ہوا اور حالات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تو دوستی اور تعلقات میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ شیخ موصوف کے بھی بعض لوگوں سے تعلقات بگڑ گئے اور انھوں نے کعبۃ اللہ جانے کا عزم کر لیا۔

جلد ہی وہ دہلی سے اس طرح روانہ ہو گئے کہ کوئی سامان سفر ساتھ نہ تھا، غرض کسی نہ کسی طرح گجرات پہنچ گئے۔ وہاں مرزا نظام الدین احمد نے ان کے لیے سفر کا سامان مہیا کر

دیا اور ہر طرح سے مدد کر کے جہاز پر چڑھا دیا اور وہ حجاز پہنچ گئے۔ بعض قدرتی موانعات کی وجہ سے وہ مدینہ کی زیارت نہیں کر سکے۔ چند روز مکہ معظمہ میں رہے اور شیخ عبد الوہاب ہندی خادم شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی اجازت حاصل کر لی اور وطن واپس ہو گئے۔ یہ شیخ عبد الوہاب حاجی کے ساتھ حج سے جب آگرہ واپس آئے تھے تو میں(84) نے ان کے ہاتھ سے آب زمزم پیا تھا اور برکت کے لیے حدیث کا درس پڑھا تھا۔

شیخ عبد الحق اب اپنے حال و کیفیت کو چھپاتے ہوئے علوم رسمی پڑھانے میں مشغول ہیں۔ نہایت عالی ہمت آدمی ہیں، اس لیے وہ اپنے راستے پر استقامت و کامیابی سے بڑھتے رہیں گے۔

جن دنوں وہ مکہ شریف سے دہلی تشریف لائے تھے میں(84) حسب طلب بڑی تشویش و عجلت میں بدایوں سے بادشاہی لشکر کی طرف جا رہا تھا۔ ان سے بس ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جب میں(84) لاہور پہنچ گیا تو انھوں نے ایک خط بھیجا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"بندگی و نیاز کے بعد جس زمانہ میں آپ دہلی تشریف لائے تھے تو مجھے کچھ دیر کے لیے ملاقات سے نوازا تھا لیکن یہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ شوق و اشتیاق کی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھ گئی، بہت سی باتیں کہنے سننے سے رہ گئیں۔ آج اس دنیا میں دوستوں سے ملاقات و گفتگو کی مہلت ہی نہیں ملتی، اگر دوستی سچی ہے تو انشاء اللہ عالم مستقبل میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔

آج تو بس تعلقات کو درست رکھنے اور نیتوں کو پاک رکھنے کی سعی ہی کی جا سکتی ہے ہم نشینی بس کل کے روز ہی نصیب ہوگی جبکہ جدائی اور وصال کے سارے حجاب اٹھ جائیں گے۔ بہر حال آپ مجھے فراموش نہ کریں۔ میں تو ہمیشہ آپ ہی کے خیال میں رہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کے دل میں محبت و حقیقت پسندی جاگزیں ہے۔ اہل حرمین میں سے ایک بزرگ یہ دعا ہمیشہ پڑھا کرتے تھے "اللھم کما انعمت فزد کما زدت خادم کما ادمت تبارک" اللہ تعالیٰ محبت و دوستی کی نعمت کو بڑھائے، برقرار رکھے اور مبارک بنائے۔ اگر کبھی آپ اپنے عنایت نامہ سے نوازیں تو حضرت شیخ کلیم اللہ کے حالات سے ضرور مطلع فرمائیں۔ چند باتیں آپ سے عرض کی تھیں، اس سلسلہ میں بھی کچھ

نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن قلم نہیں چلا۔ اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب ان کا ذکر میرزا سے آیا تو اس نے اسی مطلب کے شعر کہے بلکہ صراحتاً لکھ دیا کہ یہ تکلف سے بعید ہے کہ اس خط کے پہنچانے کی ذمہ داری آپ بجا لائیں گے۔ والدعا۔"

شیخ فیضی دکن سے واپس آنے کے بعد حسب معمول احباب نوازی اور مجلس آرائی میں مصروف رہتا تھا اور دوستوں پر جان چھڑکتا رہتا تھا لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سخت پریشان اور رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے لاہور سے شیخ عبدالحق کو بلاوے کے چند خط لکھے لیکن ان کے دل میں فیضی کی طرف سے بڑا رنج تھا اس لیے وہ نہ آئے اور معذرت کے جواب لکھ دیے۔ شیخ فیضی نے اس سلسلہ میں انھیں جو رقعہ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

"آپ سے ملاقات کا شوق محض رسمی اور ظاہری نہیں ہے، نہ احاطۂ بیان میں آسکتا ہے۔ پہلے میں آپ کی مرضی و منشاء سے واقف نہ ہو سکا یہی گمان رہا کہ آپ بھی ملنے کے خواہش مند ہونگے۔ لیکن بعد میں یہ پتہ چلا کہ آپ نے دوستی کی یہ راہ ہی سرے سے بند کر رکھی ہے تو میں نے بھی آپ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دے دی۔ خدا کرے یہ صورت حال گوارا ہو جائے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے اپنے "خلوت کدہ تنگ" پر کسی ہنگامہ کو پسند نہیں فرمایا۔ آج سے دو تین دن پہلے نقاوۃ الاولیاء میاں شیخ موسیٰ میرے ویرانے پر تشریف لائے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بعید نہیں کہ جناب انھی دنوں آجائیں، ان سے میں نے اس کا سبب بہت کچھ دریافت کیا، لیکن گول مول جواب دے کر ٹال گئے۔ خدا کی قسم اس میں میری جانب سے کوئی اشارہ نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔

"وقت گویا چہ حاجت طومار!"

اگر وہاں رہیں تو بھی منظور ہے اگر آجائیں تو نور علیٰ نور۔ خدا کی قسم کہ میں نے اب یہ خواہش بالکل ہی دل سے نکال دی ہے، نہ اپنی یاد کا ذکر کیا ہے نہ اس کی طرف کوئی اشارہ اور نہ میں ایسا کرونگا، اس لیے اس بارے میں آپ زحمت نہ اٹھائیں، لیکن مجھے بال و پر ہوتے تو میں پرواز کر کے اس حجرہ کی چھت پر آبیٹھتا اور نکات محبت کی ریزہ چینی کرتا اور والہانہ گیت گاتا۔ اب اور کیا لکھوں؟ آپ کی طرف سے ہی ساری تاخیر اور رکاوٹ

ہے۔ خدارا مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ تو بند نہ کیجیے۔ واضح رہے اگر یہ راستہ اس طرف سے بند ہوگا بھی تو ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا، کھلا ہی رہے گا۔ اسکندر فقر میاں پھول کو نیاز مندی پہنچا دیجیے۔ انہی 2 دنوں میں کسی بہانہ یہ رباعی ہوگئی تھی:

رباعی

فیضی دم پیری ست قدم دیدہ بہ   ہر گام کہ می نہی بپسند دیدہ بہ
از عینک شیشہ ہیچ نکشاید ہیچ   نقشی بتراش از دل و بر دیدہ بہ"

خدا کی عجیب شان کہ آج وہ شیخ فیضی نہیں رہا۔ اب تو ان گزر جانے والوں کی صرف باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی کب تک، کیونکہ ہمارا(85) بھی کچھ ٹھکانہ نہیں کہ کب کوچ کر جائیں۔

عنقریب است کہ از ما اثری باقی نیست
شیشہ بشکستہ و می ریختہ و ساقی نیست

مولانا الہداد سلطان پوری

سندھ میں وہ قریہ ہنوہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم الملک کے شاگرد رہے۔ شرافت اور حسب و نسب میں نہایت ممتاز و اعلیٰ ہیں۔ ابتدا میں علم کی غرور اور جوانی کی ترنگ میں نہایت متکبر تھے لیکن اب جب کہ دنیا کا اچھا خاصا تجربہ ہو چکا ہے ان کا تکبر، فقر و انکسار میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کچھ عرصے تک پنجاب کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے، اب کافی عرصے سے الہ آباد کے نئے شہر کی تعمیر کے کاموں کے عہدے پر مقرر ہیں اور اسی پر قناعت کر لی ہے۔ دنیا والوں کے گھروں پر دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

مولانا عثمان سامانہ

عقلیات میں حکیم الملک کے شاگرد ہیں، نقلیات دوسرے اساتذہ سے حاصل کیے۔ مولانا

بڑے مستعد آدمی ہیں۔ کیف و حال سے خالی نہیں، بڑے سمجھ دار اور نیک عالم ہیں، اکثر اوقات عبادت ہی میں صرف کرتے ہیں۔ شاہی دربار کے خادموں میں شامل ہیں۔

چند سال تک وہ قلیچ خان کے وسیلہ سے دوآبہ میں پرگنوں کے انتظام و بندوبست پر مقرر کیے گئے تھے اب دربار میں بلا لیے گئے ہیں اور منصب داروں میں داخل کر لیے گئے ہیں۔

حاجی سلطان تھانیسری

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے فارغ ہو چکے ہیں۔ علوم نقلی میں بڑی مہارت پیدا کی ہے۔ عرصہ تک شاہی خدمات پر مقرر رہے۔ 4 سال تک مہابھارت کے ترجمہ میں جو "رزمنامہ" کے نام سے موسوم ہے تنہا بڑی مستقل مزاجی سے مصروف ہیں۔ اس کا آغاز نقیب خاں سے ہوا تھا اور تکمیل انھوں نے کیا۔

ان کے پرگنہ کے ہندوؤں نے چغلی کھائی کہ حاجی سلطان گاؤکشی کے جرم میں مبتلا ہیں۔ بس بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے بھکر کی طرف بھیج دیا۔ اس زمانہ میں صوبہ بھکر کا نظم و نسق خان خاناں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بڑی مہربانی اور شفقت سے کام لیا اور جلے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہاں کی فتوحات سے فارغ ہوا تو ان کو اپنے ساتھ دربار لایا اور معافی و رہائی کے لیے بادشاہ سے کہا جو قبول کر لی گئی اور حاجی کا معاملہ اللہ نے ٹھیک کر دیا۔ شیخ ابوالفضل کو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو تھانیسر و کرنال کا کروڑی بنا دیا جائے، اب بھی وہ اسی خدمت پر مقرر ہیں۔

جس زمانہ میں وہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے، کسی نے پوچھا یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا: "10ہزار سال پرانی خرافات کو مروجہ زبان کے پیکر میں اتار رہا ہوں"۔

سید شاہ میر سامانہ

صحیح النسب سید ہیں۔ فضائل علمی سے آراستہ اور تقویٰ و زہد سے آراستہ، نہایت متوکل و قانع عالم تھے۔ دریائے جمنا آگرہ کے اس پار طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہے

تھے۔ شیخ بہاء الدین مفتی مرحوم کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بہت سے عالم اور صوفی رہتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک خادم مولانا فرید نامی، کاتا تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی علم حاصل نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی بھی مشکل مسئلہ یا دقیق و گہری بحث کسی بھی بڑی سے بڑی کتاب میں سے دریافت کی جائے تو وہ گھڑی بھر میں دوات و قلم لے کر اس مسئلہ کو تحریری صورت میں حل کر کے رکھ دیتا تھا اور عجیب بات یہ ہے وہ جو کچھ لکھتا تھا خود اسے پڑھ نہیں سکتا تھا یا زبانی طور پر اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ ضیاء اللہ جن کا تعلق سلسلہ غوثیہ سے تھا اُن کے معتقد تھے تو پھر سید مشار الیہ کا کیا ذکر؟ اس کے متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ایک رات مشرق یا مغرب میں ہونے والے کسی واقعہ کی اطلاع سید شاہ کو دی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی جن اس نے مسخر کر رکھا ہے بعض کچھ اور کہتے تھے۔

جس سال بادشاہ نے شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ بلا کر عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا اور علماء و مشائخین کا کافی بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں(86) نے ایک رات خلوت میں شیخ سے فرید کاتب کے متعلق دریافت کیا اور اس کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ شیخ نے پہلے تو اپنے مفردات، مولفات اور فضائل و کمالات اور ذاتی حالات بیان کیے، پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ جو ساری نعمتیں عطا کر رکھی ہیں ان سب کے باوجود میں شیخ فرید کی خوشہ چینی کے بھی لائق نہیں ہوں اور جو کچھ تم نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ عشر عشیر بھی نہیں ہے اس کا درجہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ سب اس کو حضرت میر مشار الیہ کے آستانہ کی جاروب کشی کی بدولت نصیب ہوا ہے۔

اس واقعہ سے پہلے میں(86) نے سید شاہ میر کو بدایوں میں جہاں وہ مدد معاش کے سلسلہ میں آئے تھے، دیکھا تھا۔ کتاب "مشارق الانوار" سامنے رکھی ہوئی تھی اور علمی مذاکرہ گرم تھا۔ بلا شبہ وہ جدت پسند طبیعت اور ذہین شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن جس قدر کہ شیخ ضیاء اللہ اور دوسرے آدمی ان کی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے ان کو اس درجہ کا نہیں

پایا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، غالباً انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس چیز سے کسی کو محروم رکھا گیا ہو وہ کسی اور کو بھی نہ ملے۔

سید یٰسین

سید شاہ میر کے چچیرے بھائی ہیں۔ اکثر درسی کتابیں گجرات میں میاں وجیہ الدین سے پڑھی تھیں۔ علوم رسی کی تحصیل کے بعد میاں صاحب کے مرید ہو گئے اور حج کے لیے چلے گئے۔ وہاں حدیث کا علم حاصل کیا اور اجازت حاصل کر کے ہندستان واپس آئے۔ کچھ عرصہ تک لاہور میں امراء اور حکام کی صحبت میں رہے۔ پھر انھوں نے یہ تعلقات ترک کر دیے اور درویشی کا لباس پہن کر سرہند میں بقیہ عمر گزار دی۔ اپنے چند نیلے پوشاک والے خادموں کی بڑی اچھی تربیت کی، وہ پیشوائی میں صاحب اِدّعا تھے۔

ہمیشہ گجرات اور پھر وہاں سے حرمین شریفین جانے کی آرزو کرتے رہتے تھے۔ سرہند میں بھی زیادہ عرصہ ٹھہر نہ سکے اور بنگالہ چلے گئے۔ اب وہیں سیر و سیاحت میں لگے ہوئے ہیں نہ معلوم ان کا کیا انجام ہوتا ہے اور وہ کس سرزمین کا پیوند بننے والے ہیں؟

شیخ ضیاء اللہ

شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں جو انداز بیان ان کا ہے صوفیاء میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا۔ ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کی ہی باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ان کے باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آخر کون سا داعیہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھے؟

پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے والد کی مسند فقر و ارشاد پر جانشین ہو گئے ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کے بھی حافظ تھے اور اس کی تشریح و توضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

970ھ/1562ء میں ان سے ملاقات کے لیے میں[86] آگرہ گیا اور کسی واقف کار کو وسیلہ اور ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی اور سادگی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا سلام علیک کہہ کر مصافحہ کیا: کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیاوی تکلفات برتے جائیں تو یہ حصول مقصد میں آڑ بن جاتے ہیں۔ شیخ کی محفل میں بھی تعظیم وتکریم کے مراسم کا لحاظ رکھا جاتا تھا اس لیے ان کو میری[86] بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی۔ اہل محفل نے مجھ سے پوچھا: ”آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“ میں نے جواب دیا: ”سہسوان سے“۔ پھر پوچھا گیا: ”تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟“ میں نے جواب دیا: ”عرصہ پہلے ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی ہے“۔

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس وقت وہاں ان کے باپ کا مرید قلیچ چوگان بیگ جاگیردار تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز و استہزا کرنے لگے۔ ایک مسخرے کو اشارہ کیا کہ مجھے تنگ کر کے محفل سے اُٹھا دے۔ میں مشائخ کی ایسی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آئے تھے۔ میں[86] ان باتوں سے انجان بنا رہا۔

وہ مسخرہ ہزل کرنے لگا کہ: ”کہیں سے عطر کی مہک آرہی ہے جس سے میرا دماغ جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں تاکہ کسی کو میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے“۔ یہ کہتے ہوئے اپنے منھ سے کتے کی آواز نکالنے لگا۔ ان کے ایک صوفی نما مصاحب نے مجھ سے پوچھا: ”یہ عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟“ میں[86] نے کہا: ”ہاں لیکن بات کیا ہے؟“ اس نے کہا: ”یہ جو باؤلا شخص ہے اس کو کسی وقت کتے نے کاٹ کھایا تھا جس وقت بھی وہ خوشبو سونگھ لیتا ہے کتے کی آواز منھ سے نکالنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ آپ ذرا ہوشیار رہیے۔“ یہ سن کر حاضرین پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے ڈرانے کے لیے اس سے ڈرنے کا دکھاوا کرنے لگے۔ اور اس طرف ہٹ گئے جدھر نئی عمارت بن رہی تھی۔ اس طرح انھوں نے ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پر میں[86] نے کہا: ”بڑی حیرت ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ بڑی دور

دور سے اپنی ضرورت پوری کرانے آتے ہیں اور یہاں ایک کتّے کے کاٹے انسان کا علاج نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے کہا: "کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟" میں(86) نے کہا: "ہاں" "وہ کیا علاج ہے؟" میں نے کہا: "اس کے سر پر پتھر اور جوتے مارے جائیں تو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے:

سگ دیوانہ را دارو کلوخ است

(پاگل کتے کا علاج ڈھیلا ہے)

میری(86) بات سن کر سب فق سے ہو کر رہ گئے۔ پھر میں نے کہا: "ڈھیلا پتھر، ایک بوٹی کا نام بھی ہے جو کتے کاٹنے کی موثر دوا ہے"۔ شیخ نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا تو کہا: "آؤ اللہ رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں"۔ پھر انھوں نے کلام پاک کھولا اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی اور طرح طرح کی پیچ دار باتیں بیان کرنے لگے۔

شیخ جو بھی الٹی سیدھی بکواس کرتے جاہل شاگرد اس پر ہاں کہہ دیتے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے بھرا ہوا تھا اس لیے میں نے قصداً ٹوک دیا اور ان سے پوچھا: "یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں کسی اور تفسیر میں بھی ہے؟" کہنے لگے: "میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے"۔ میں نے کہا: "اچھا تو پھر یہ بتائیے یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی؟ انھوں نے جواب دیا "مجازی" میں(86) نے کہا ان دو حقیقی اور مجازی، مطلبوں میں کونسا علاقہ ہے؟ اس طرح میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں الجھا لیا۔ انھوں نے کچھ الٹی سیدھی باتیں کیں اور ہر طرف دوڑ لگانے لگے اور جب میں نے ان کو کس کر گھیرا تو بس اکھڑ گئے۔ قرآن کو پٹک کر کہنے لگے: "میں نے علم جدل نہیں پڑھا ہے"۔ میں نے کہا: "آپ قرآن کا ایک ایسا مطلب بیان کرتے ہیں جو کسی اور جگہ منقول نہیں ہے، لا محالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی رابطہ و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔" شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو بات کو ادھر اُدھر پھیر کر میرا حال احوال پوچھنے لگے۔ میں(86) نے انہی دنوں قصیدہ بردہ لکھی تھی، اس کا

ایک باب میں نے شیخ کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلہ میں جو نکتے میرے ذہن میں آئے تھے، بیان کیے، بڑی تعریف کی اور خود بھی اس بارے میں چند نکات بتائے۔ ان سے پہلی ملاقات کا تو یہ رنگ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ میں(۸۶) اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا اور شیخ حسب طلب حیران و پریشان تنہا عبادت خانہ شاہی میں آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جمعہ کا دن تھا کہ بادشاہ پہلے ایک دو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ میرزا غیاث الدین، علی آخوند، میرزا آخوند اور میرزا علی آصف خان کو کہہ رکھا تھا کہ شیخ کو بحث میں الجھا کر تصوف کا مطلب دریافت کرو، دیکھیں وہ کتنے پانی میں ہے؟ چنانچہ آصف خان نے گفتگو شروع کی اور "لوائح" کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گل گزرد گل باشی　　ور بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزئی و حق کل است اگر روزی چند　　اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا کہ: "اللہ تعالیٰ کو کل کس طرح کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ جز اور کل ہونے سے برتر و اعلیٰ ہے"۔

شیخ تباہ حالی کے بعد دربار میں آئے تھے، ان کا سارا غرور پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے، نہایت عاجز و شرمندہ تھے اس لیے انھوں نے ایسے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے جسارت کر کے کہا مولوی جامیؒ نے اگرچہ اس رباعی میں اللہ تعالیٰ پر "کل" ہونے ہی کا اتفاق کیا ہے، لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے:

این عشق کہ ھست جزو لاینفک ما　　حاشا کہ شود بہ عقل ادراک ما
خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین　　مارا برھاند از ظلام شک ما

لیکن اس کل ہونے اور جز ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل سب کچھ وہی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود حقیقت میں نہیں ہے۔ دراصل اس کی اصل حقیقت کو عبارت میں نہیں لایا جا سکتا اس لئے اس کی تعبیر کبھی کل سے کبھی جز سے کی

جاتی ہے۔ پھر میں(86) نے وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور چند مسائل جن پر میں(86) نے ان دنوں عبور حاصل کیا شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔ میری(86) اس تقریر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے۔

انہی دنوں شیخ کے سوتیلے بھائی شیخ اسمٰعیل نے جو فتح پور کے محلہ خواجہ جہان میں میری قیام گاہ سے قریب ہی رہتا تھا اور ہماری آپس میں جان پہچان اور ملاقات تھی اس نے عبادت خانہ میں تخلیہ کرا کے میری اس ملاقات کو یاد دلایا جو 11 سال پہلے شیخ سے ہوئی تھی اور جس کا ذکر اس نے میری زبانی سن لیا تھا۔ یہ سن کر شیخ حیران رہ گئے اور کہا "مجھے یاد نہیں کہ ایسا کبھی ہوا ہوگا"۔

شیخ اب آگرہ میں اپنے باپ کی طرح مشائخانہ وضع میں عیش و آرام سے بسر کر رہے ہیں۔ ان کی محفلوں میں مذہبی وکالتداری کا رنگ ہے، اپنی پرانی حالت پر قائم ہیں۔ ان کی عام فریب سادہ لوحی کے بڑے قصے مشہور ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

میر ابو الغیث بخاری کہا کرتے تھے وہ جیسا کچھ بھی ہوا کرے لیکن وہ درویشانہ لباس، فقیرانہ مجلس اور تصوف کی باتیں کرنے کا اہتمام کرتا ہے اور اپنی روش پر استقامت سے قائم ہے بس اس کی ان اداؤں پر ہم دل و جان سے نثار ہیں۔ جس سال کہ خان زمان کی مہم میں کامیابی حاصل ہوئی وہ لشکر کے ہمراہ انبیٹھی گئے تھے وہاں حضرت میاں شیخ نظام الدین سے ملاقات کی، وہ آیت کریمہ "وسیقول فیھا کاء ساً کان مزاجھا زنجبیلا عینا فیھا تسمی سلسبیلاً" کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ شیخ نے اپنی حیثیت ظاہر کی اور مداخلت کرکے کہا۔ "اس آیت میں اور ایک دوسری آیت فرق ہے"۔ حضرت نے فرمایا: "سبحان اللہ باپ تو وہاں غوطے کھا رکھا ہے، شفاعت کاملہ کا محتاج ہے اور بیٹا یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں تناقض ثابت کر رہا ہے"۔

"دری ہنوز بر آنچہ در سینہ بود"

میر ابو الغیث بخاریؒ

یہ بڑے پاک مشرب، عالی ہمت بزرگ تھے۔ انکے اخلاق، فرشتوں کے اخلاق کے مانند

تھے۔ غنا کے پردے میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے بہت سے علماء و مشائخین سے استفادہ کیا تھا۔ سخاوت، بخشش، آزادہ روی، حسن معاشرت، صدق معاملت اور میل ملاپ میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور صوفیاے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کیا کرتے تھے۔ سنت اور نماز با جماعت سے ایسا شغف تھا کہ جب وہ موت کے قریب تھے اس وقت بھی تکبیر تحریمہ ان سے چھوٹنے نہ پائی۔ ان کی مجلس کبھی اللہ اور رسول ﷺ کے ذکر نیز بزرگوں کی باتوں سے خالی نہیں رہی۔

ان کی تاریخ وفات "میر ستودہ سیر" ہے۔

میاں کمال الدین حسین شیرازی

احباب کے تذکرے نے میرے دل کو کھول دیا ہے۔ ان کے ذکر میں اگر طوالت ہو تو عزیز قارئین تنگ دل نہ ہوں۔

میاں کمال الدین حسین مولانا حسن شیرازی کے لڑکے ہیں۔ جس وقت شاہ اسمٰعیل نے نکال باہر کیا تھا تو وہ شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے پھر وہاں سے گجرات پہنچے اور سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں سید رفیع الدین محدث اور میاں ابو الفتح خراسانی کے قافلہ کے ساتھ آگرہ آئے اور اس جگہ بس گئے۔ شیخ زین الدین خوافی مشہور شاعر نے مولانا حسن کی شان میں کہا ہے:

ہست شعر من زعقل و نقل خواہم بشنود
جامع المعقول والمنقول مولانا حسن

مولانا حسن کے صاحبزادے میاں کمال الدین حسین نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کا ذکر تحریر و تقریر سے بالاتر ہے۔ اکبر ان کی بزرگی اور بڑائی کے پیش نظر اس بات کا خواہاں تھا کہ وہ بادشاہی ملازمت میں رہیں۔ لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور دنیاوی اعزازت سے منھ پھیر کر مختصر سی مدد معاش کی زمین پر صبر کر لیا۔ فقر و ایمان کو اپنا سرمایہ بنا لیا۔ وہ ہمیشہ عبادت و اطاعت میں معروف رہتے تھے

اور بڑے اطمینان و بے فکری کے ساتھ کبھی دلی میں اور کبھی آگرہ میں رہا کرتے تھے۔

لڑکپن سے بڑھاپے تک عبادت،، ذکر الٰہی، تلاوت کلام پاک برابر ان کا معمول رہا، کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ ان فضائل و کمالات کے علاوہ علمی استعداد بھی بہت اچھی تھی۔ شاعری، خوش خطی، حسن املاء اور انشاء پردازی میں بھی باکمال تھے۔ ابتدائی عمر میں جب میں بیرم خاں کے عہد میں آگرہ آیا تھا تو میرا سب سے پہلا قیام مسجد فیض بخش میں انہی کے مکان پر رہا تھا۔ اس دوران میں نے ان کے آستانے سے بڑی سعادتیں حاصل کیں اس وقت سے اب تک کہ میں(85) یہ سطریں لکھ رہا ہوں پورے 40 سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں انھوں نے تعارف و آشنائی کی ہمیشہ رعایت برتی اور میرے ساتھ برابر مہربانی اور دلسوزی سے پیش آتے رہے۔ ان کی اتنی مہربانی ہے کہ اب مزید اضافہ کی گنجائش ہی نہیں رہی:

بس عشق کہ آن کم شد وبس حسن کہ آن کاست
عشق من و حسن تو ہمان بلکہ فزون ہم

انھوں نے مجھے لکھا تھا:

''ان دنوں جب کہ بندوں کی خدائی کا دور دورہ ہے، محبت و دوستی اٹھ چکی ہے، میں تنہائی اور جدائی کے غم میں مضطرب و بے چین رہا۔ بے قراری میں کبھی دلی چلا جاتا اور وہاں کے مزاروں کی زیارت میں لگا رہتا۔ کبھی اپنے بے سہارا بچوں کو دیکھنے کے لیے آگرہ چلا آتا۔ اسی افراتفری میں تھا کہ تمہارے متعدد خط یکے بعد دیگرے پہنچے۔ خدا گواہ ہے کہ تمہارے خطوط سے بڑی تسلی اور تسکین حاصل ہوئی۔ چند دن تک ان خطوط کو بار بار پڑھتا رہا اور صبح و شام تمہارے لیے دعائیں کیں:

الٰہی تا قیامت زندہ باشی

مکرم و محترم میرزا نظام الدین احمد کی رحلت کی خبر سن کر نہایت ملال اور رنج ہوا۔ ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' مرحوم خوبیوں کا مجموعہ اور نادر روزگار تھے۔ بس کیا کہا جا سکتا ہے یہ جو صدمے مسلسل اور متواتر پہنچ رہے ہیں ان کا ذکر ہم آخر کس سے کریں۔ اب ہم

اپنی موت کے منتظر بیٹھے ہیں کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں۔ ہمیشہ یہ دعا زبان پر رہتی تھی۔

"اللّٰہم ارحمنا اذا عرق الجبین و کثر الانین ونیس منا الطبیب وبکی علینا الحبیب

اللّٰہم ارحمنا اذا اداونا التراب و ودعنا الاحباب و فارق النعیم وانقطع عنا النسیم"

امید ہے کہ آخرت اچھی ہوگی اور دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں گے۔ خط کی روانگی میں عجلت تھی اس لیے میں نے رات بڑی جلدی میں یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ تمہارے ساتھ جو دلی اشتیاق ہے وہ بہر حال حد بیان سے باہر ہے بس اس کو تم اپنے دل ہی سے محسوس کر سکتے ہو الفاظ سے اسے محسوس نہیں کرایا جا سکتا۔"

شیخ ابوالفتح تھانیسری

اپنے زمانہ کے بڑے متبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید رفیع الدین محدث سے حاصل کیا تھا۔ میر صاحب ہی کے محلہ میں، آگرہ میں تقریباً 50 سال تک عقلی و نقلی علوم کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس کی بدولت بڑے ہی ذہین اور صاحب علم پیدا ہوئے ہیں۔ میں(86) اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگوار کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔

ان کا لڑکا شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدے پر مقرر ہے۔

مولانا عثمان بنگالی

پرانے بزرگوں میں سے تھے، سنبھل میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ میاں حاتم سنبھلی نے بھی ان سے پڑھا ہے۔ کبھی کبھی وہ مولانا عثمان کی خدمت میں جا کر ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔

میں(86) بھی لڑکپن میں میاں مرحوم کے ساتھ مولانا مذکور کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت اندوز ہوا کرتا تھا۔ بڑے خدا ترس بزرگ تھے۔

شیخ حسین بڑھری

بڑے درجہ کے عالم تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندستان میں جو علوم نقلی مروج و مشہور ہیں ان میں ان کے مقابلہ کا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے ممتاز و سربرآوردہ تھے ساتھ ہی نہایت با اخلاق آدمی تھے، علم و اخلاق کے سارے محاسن ان کی شخصیت میں جمع تھے۔

مولانا اسمعیل عرب

شیخ حسین کے ہم عصر اور ان کے ہم پلہ عالم تھے۔ خاص طور سے علم ہیئت، حکمت اور طب میں تو ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ شیخ حسین کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے فیوض سے طالب علم پوری طرح استفادہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا کافی مالدار آدمی تھے۔ شہر کے بعض شریر لوگوں کے اشارہ پر چوروں نے ان کے گھر ڈاکہ ڈالا اور انھیں شہید کر دیا۔

قاضی مبارک گوپاموی

علم کے اونچے مدارج پر ان کا مقام تھا۔ قضاوت کے عہدہ میں بڑی دیانتداری اور نکتہ رسی سے کام لیتے تھے۔ علوم کی تحصیل اور اخلاقی تربیت میاں شیخ نظام الدین امیٹھی وال کی خدمت میں حاصل کی تھی۔ میاں صاحب نے انھیں اپنی نگرانی میں رکھ کر تربیت دی تھی۔

جب کبھی قاضی مبارک میاں صاحب سے کہتے کہ: ''اگر مسلک ولایت میں سے بھی کچھ برکتیں مجھے عنایت ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟'' میاں صاحب ان کو جواب دیتے: ''قاضی مبارک! تجھے تو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی!''

قاضی مبارک آخر عمر تک بڑی عزت و تکریم کے ساتھ بسر کرتے رہے اور دنیا سے محترم و معزز ہی اٹھے۔ قاضی مبارک سے استفادہ کے لیے دور دراز سے لوگ گوپامئو آتے تھے، بہت سے لوگوں نے تو اسی جگہ زندگی بسر کرنا شروع کر دیا تھا اور ان کے فیض

سے درجۂ کمال تک پہنچے تھے۔ ان کے دامن تربیت سے فیض یاب ہونے والوں میں مخدوم بدھ بھی ہیں جو اکثر درسی کتابوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے معلم سید محی الدین بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کا یہ قافلہ اپنے ٹھکانے پہنچ چکا ہے۔ اب ان کا کوئی قائم مقام نہیں رہا۔

علم کا میدان تو اب روز بروز شیروں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور ان کی جگہ روباہ (لومڑی) صفت لوگوں نے لے لی ہے۔ ''مشارق الانوار'' کے مصنف نے بھی یہ فریاد اپنے زمانہ میں کی تھی کہ ''لولا تخلي الغاب عن رسامة ذي الشبين لما صبح بها ثقالة ابو لحصين''۔

ہمیں ناقہ ماند مسکین حسن را
ازاں روز ترسم کہ این ہم نماند

مولانا ویس گوالیاری

بڑے دانشور اور مناظرہ و مجادلہ کرنے والے عالم تھے۔ اصول و فروع کے مباحث میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بحث مباحثہ کے وقت جب کسی عبارت کو نقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو کتاب کے صفحوں کے صفحے زبانی پڑھتے چلے جاتے اور کہتے یہ عبارت فلاں کتاب میں ہے کھول کر دیکھ لو۔ اس کے بعد وہ اپنے حریف کے سر ہو جاتے اور اسے الزامات کی زد پر رکھ لیتے، لیکن اکثر ایسا ہوا کہ جب کتابوں میں حوالے کی کھوج کی گئی تو وہ عبارت کہیں نہیں ملی۔ اسی طرح انھوں نے ایک دن بادشاہ کے سامنے مولانا الیاس منجم کو بھی جو ہمایوں بادشاہ کے استاد اور رصد و نجوم کے ماہر تھے۔ الزام لگا لگا کر نیچا دکھا دیا۔ مولانا الیاس کو اس بات کا اتنا رنج ہوا کہ لکھنؤ کی سرکار میں سویان کے قصبہ میں ان کی جاگیر تھی، اس جاگیر کو چھوڑ دیا۔ سپاہ گری پر دو حرف بھیجے اور کوچ پر کوچ کر کے گجرات چلے گئے اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچے۔ جب وہ عراق، آذربائجان، اردبیل کے سفر میں پہنچے جہاں ان کا وطن بھی تھا تو شاہ اسمٰعیل ثانی کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو

بہت مشہور ہے۔ مولانا الیاس جب اردبیل پہنچے تو اس وقت شاہ طہماسپ نے اسمٰعیل کو قہقہہ کے قلعہ میں قید کر رکھا تھا۔ مولانا نے اس کے نام ایک رقعہ لکھا کہ سیاروں کے حساب سے مجھے اس کا علم ہوا ہے کہ تمھیں فلاں مہینے رہائی مل جائے گی اور اس چاہ ندامت سے نکل کر مسند عزت پر قدم رکھو گے اور تخت سلطنت پر جلوس کرو گے۔ جیسا انھوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد شاہ طہماسپ کو زہر دے کر مار ڈالا گیا اور عراق میں بڑا انقلاب رونما ہو گیا۔ امیروں اور وزیروں نے شاہ اسمٰعیل کو قید خانہ سے نکال کر اردبیل کے راستے تخت نشینی کے لیے لے گئے۔ مولوی الیاس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جب تم قہقہہ سے اردبیل پہنچو تو مجھ سے لازماً ملنا تاکہ بالمشافہ بعض ضروری امور طے کر لیے جائیں اور اسمائے عظمیہ کا عمل رو برو انجام دیا جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شاہ اسمٰعیل کو وہاں سے عجلت میں گزرنا پڑا اور وہ مولوی موصوف کے گھر پر نہ جا سکا۔ اردبیل سے روانہ ہونے کے بعد وہ لوٹ کر آیا اور مولوی الیاس سے ملنا چاہا لیکن انھوں نے مکان کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بادشاہ نے مجبوراً دروازہ توڑ دیا اور زبردستی ان کے حجرہ میں گھس کر ملاقات کی۔ بادشاہ کے آنے پر انھوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور دیوار کی طرف رُخ کر کے کہا وہ مقررہ گھڑی گزر گئی اور تو نہیں آیا، اب میں تیرا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ شاہ اسمٰعیل مایوس لوٹ آیا۔ اگرچہ سلطنت اس کی جم جما گئی لیکن ایک ہی سال بعد امیروں نے متفق ہو کر اس کی بہن پری جان خانم کو اس کے قتل پر مقرر کیا، اسے بھی اس کا پتہ چل گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی تدبیر کرتا پری جان خانم نے اس کو بیہوش کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

شیخ محمد شامی

نسلاً عرب ہیں اور شیعوں کے بڑے مجتہد شیخ زین الدین جبل عاملی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ شیخ زین الدین کو خلیفہ روم نے بڑے حیلہ و تدبر سے مکہ معظمہ میں گرفتار کرا کے استنبول بلوایا اور قتل کرا دیا تھا۔

شیخ محمد منصب داروں میں شامل ہیں۔ بہادر اور شجیع آدمی ہیں، عربوں کی روایتی سخاوت بھی ان میں موجود ہے۔ نہایت متواضع اور با اخلاق بزرگ ہیں۔ عربی اور ادبی علوم میں ان کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ شاید ہی کسی کو ہو۔

شیخ حسن علی موصلی

یہ شاہ فتح اللہ کے شاگرد ہیں، لیکن نہایت مخلص سنی۔ جس سال کابل فتح ہوا یہ صاحب شاہی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ انھیں بڑے شاہزادہ کی تعلیم پر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ شاہزادہ کو فارسی کے رسالے اور علم حکمت کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک شیخ ابو الفضل نے بھی خفیہ طور پر ان سے ریاضی اور طبعیات اور حکمت کے فنون کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم کے نکات و رموز سیکھے۔ اس استادی کے حق کے باوجود وہ کبھی ان کی تعظیم نہیں کرتا تھا۔ خود تو اوپر بیٹھتا تھا اور استاد زمین پر۔ اس جیسے لوگوں کے طور طریق ان کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے چنانچہ وہ ایسے بیزار ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک مرزا نظام الدین احمد کی صحبت میں رہے۔ مرزا اور ان کے لڑکے محمد شریف نے عقلی علوم میں ان سے استفادہ کیا اور بڑی دسترس و کمال حاصل کر لیا۔

شاہ فتح اللہ کے انتقال پر ابوالفضل اور دوسرے مصاحبوں نے دربار میں شیخ حسن علی کے علم و فضل کا ذکر کر کے بادشاہ کو بخوبی سمجھا دیا کہ آج شاہ فتح اللہ کے جانشین صرف وہی ہیں۔ چنانچہ ان کے بلانے کے لیے شاہی فرمان جاری کیا گیا اور وہ حسب الطلب لاہور آئے۔ کورنش کے موقع پر نظام الدین احمد نے ان کو زبردستی سجدہ کرایا۔ اس بات کا انھیں سخت صدمہ ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی ماں سے ملنے کا بہانہ کر کے وطن جانے کی رخصت حاصل کر لی اور 998ھ/1589ء میں خان خاناں کے دور حکومت میں سیہون پہنچے اور خدا کے بھروسے پر اپنے ملک کی سمت چل پڑے جب ہرمز پہنچے تو وہاں سے اکبر کے درباریوں کو پیغام بھیجا۔

”الحمد للہ میں نے منافق دوستوں سے چھٹکارا پا لیا، انشاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا“۔

قاضی نور اللہ شوستری

شیعہ مذہب کے پیرو کار تھے اور نہایت منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیادار متقی تھے۔ شرفاء کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ علم و فن، جدت طبع، تیزی فہم اور ذہانت و ذکاوت جیسی تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں۔ شیخ فیضی کی مہمل بے نقط تفسیر پر انھوں نے "سرنامہ" لکھا جو حد تعریف سے ماورا ہے۔ شعر گوئی کا طبعی ملکہ ہے، نہایت دلکش اشعار کہتے ہیں۔ شیخ ابو الفتح کے توسط سے بادشاہ کی بارگاہ میں رسائی ہوئی تھی۔

جس زمانہ میں شاہی لشکر لاہور پہنچا تھا تو شیخ معین قاضی لاہور حاضری کے لیے آئے۔ بڑھاپے کے ضعف اور کمزوری کے سبب دربار میں بیہوش ہو گئے۔ بادشاہ کو ان کے بڑھاپے پر بڑا ترس آیا اور فرمایا: "شیخ اب کام کے قابل نہیں رہے اس لیے ان کی جگہ قاضی نور اللہ کو مقرر کر دیا جائے"۔

انھوں نے لاہور کے شر پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، سیدھا کر دیا اور رشوت کے دروازے بخوبی بند کر دیے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی کہ اس سے بڑھ کر ان کا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے:

توئی آن کس کہ نکردی ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ ز کس جز کہ شہادت ز گواہ

ایک مرتبہ شیخ فیضی کے مکان پر محفل جمی ہوئی تھی اور قاضی موصوف تفسیر نیشا پوری سامنے رکھے آیت کریمہ "اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا" کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ اس آیت کریمہ کے متعلق سبھی نے اتفاق کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے: "اگر یہاں صحبت لغوی مراد ہے تو یہ کوئی مدح کی بات نہیں اور اگر اصطلاحی ہے جیسا کہ اہل حدیث کا مسلک ہے تو ہم کو یہ تسلیم نہیں" میں[86] نے کہا: "اگر ایک بچے سے بھی جو عربی زبان جانتا ہو پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا یہ آیت مدح پر

صریحاً دلالت کرتی ہے، ذمّ کا کوئی پہلو نہیں۔ اسی طرح کوئی کافر، حبشی، یہودی اور ہندستانی جو عربی زبان جانتا ہو یہی کہے گا"۔

غرض قاضی سے اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث رہی اور شیخ فیضی نے اپنی عادت کے مطابق قاضی کا ساتھ دیا، حالانکہ وہ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے دونوں جانب سے بے تعلق سا تھا۔ اتفاق کی بات کہ نیشاپوری کی تفسیر سے بھی میری[186] تائید ہوگئی بلکہ یہ اضافہ بھی تھا کہ "اگر اس وقت حضور اکرم داعیِ حق سے جا ملتے تو ان کے وصایا کے لیے صدیق اکبرؓ ہی نمائندہ ہوتے کوئی اور نہیں"۔

حاجی ابراہیم محدث

آگرہ میں زہد وتقویٰ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ علوم دینی خاص طور پر درس حدیث ان کا مشغلہ تھا۔ شریعت کی پابندی پر سختی کی وجہ سے لوگ ان سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کیونکہ وہ امر معروف اور نہی عن المنکر سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ جب حسب طلب عبادت خانہ شاہی میں آئے تو شاہی مراسم اور تکلفات کی پابندی نہیں کی اور بے خوف وعظ ونصیحت کرنے لگے۔ خواجہ عبد الصمد شیرازی جو قدیم آرائشی سامان کرایہ پر چلانے کی وجہ سے خواجہ عبد اللہ کے نام سے مشہور تھے اور نماز، روزہ اور عبادتوں میں بہت مشغول رہتے تھے، حاجی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے

"خواجہ جب تک دل میں خلفائے راشدین کی محبت نہ ہو یہ نماز اور روزہ کچھ فائدہ نہیں دیتا"۔

شیخ جلال واصل کالپی والے

یہ شیخ محمد غوث کے خلفاء میں سے ہیں۔ پہلے جو علوم حاصل کیے تھے بعد میں وہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ سماع وجد و حال ہی کا ذوق اور مشغلہ تھا، بادشاہ سلامت ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

شیخ غوث کے خلفاء میں شیخ سلیم کے خلفاء کی نسبت تصنع اور بناوٹ بہت کم تھی۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے، بعد میں چل کر تو وہی معاملہ پیش آیا کہ جب حضرت علیؓ کے سامنے آیت کریمہ۔ "وقالت الیہود لیست النصاری علی شیء و قالت النصاری لیست الیہود علی شیء"۔ پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا صدقا و الحمد للہ کہ اب ان دونوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا"۔

ملک محمود پیارو

عربی، علوم تفسیر، حدیث اور فارسی نظم و نثر کے اچھے عالم تھے۔ نہایت صالح مزاج اور ذوق وحال سے مناسبت رکھتے تھے۔ نسلاً وہ سلاطین گجرات کے خاندان سے ہیں۔ والد کا نام ملک پیارو تھا۔

ملک محمود نہایت فصیح زبان دانشور اور مدبر تھے۔ چنانچہ بادشاہی محفلوں میں اکبر کی میزبانی کا انھیں شرف حاصل تھا۔ اولیاء اللہ سے بڑا اعتقاد تھا اس لیے اکبر نے انھیں چند روز کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضہ مبارک کا متولی بنا دیا تھا۔

ملک محمود کو مخدوم جہانیاں بخاری کے جانشین مخدوم شاہ عالم بخاری سے ایسی عقیدت ہوگئی تھی کہ انھوں نے بادشاہ سے اس درگاہ کی مجاورت کی درخواست کی جو بڑے پس و پیش اور ردو بدل کے بعد قبول کر لی گئی اور وہ احمد آباد جا کر اس آستانہ کے مجاور بن بیٹھے۔

توکل و قناعت کا گوشہ اختیار کر لیا اور اسی مجاورت میں انتقال ہوا۔ میں[196] نے اجمیر اور فتح پور دونوں جگہوں پر ان سے ملاقات کی تھی۔ شعر سے بھی ان کو بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ یہ مطلع انہی کا ہے:

دارم دلی گردان کہ من قبلہ نمای خوانمش
روسوی ابرویش کند ہر چندی گردانمش

صدر جہاں پہانی

پہانی، قنوج کے ماتحت ایک گاؤں ہے۔ صدر جہاں سید اور خوش مزاج عالم ہیں ان کی

ساری عمر لشکر ہی میں گزری۔ علوم و کمالات شیخ عبد النبی سے حاصل کیے اور شیخ موصوف ہی کی سعی و کوشش سے اتنے سال تک ممالک محروسہ کے مفتی رہے۔

جب ہندستان کے ائمہ پر زوال آیا تو انھوں نے اپنی خدمات، زمانہ سازی اور دنیا داری کی بدولت بہت جلد اپنی عزت و احترام کو بحال کر لیا۔

جب وہ حکیم ہمام کے ساتھ حاکم توران کے پاس سفارت پر گیے، پھر وہاں سے واپس آئے تو ان کو صدارت کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ جن دنوں لاہور میں بچے کچھے علماء کو مکہ معظمہ بھجوا دینے کی افواہیں گرم تھیں اور ایک طویل فہرست مرتب کی گئی تھی، ایک دن صدر جہاں کہنے لگے: ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس فہرست میں میرا بھی نام درج نہ کرا دیا گیا ہو'' میرزا نظام الدین احمد، جنھوں نے اس فہرست کو ترتیب دیا تھا کہا: ''تم کو بادشاہ کیوں بھیجنے لگے؟'' صدر جہاں نے کہا: ''آخر کیوں نہیں''۔ میرزا نے جواب دیا: ''تمہاری زبان سے کبھی کلمہ حق نکلا نہیں جو تیرے اخراج کا سبب بنتا''۔

طبیعت شاعرانہ ہے اور شعر و سخن سے بڑی اچھی مناسبت ہے، لیکن وہ شعر گوئی سے الگ ہی ہیں۔ یہ مطلع انھی کا ہے:

هر تار زلف یار خدایا بلا شود
وانگہ بہر بلا دل ما مبتلا شود

جس طرح شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے، توقع ہے بے مزہ بحثوں، ریاکاری، خود نمائی خود پسندی، بیہودہ گوئی اور جھوٹ بولنے سے بھی توبہ کی توفیق انھیں نصیب ہو جائے۔

شیخ یعقوب کشمیری

صرفی تخلص کرتے تھے۔ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ شیخ ابن حجر سے حدیث کا درس حاصل کیا تھا۔ درویشی کے لباس میں بڑے بڑے سفر کیے اور بڑی دنیا دیکھی اور عرب و عجم کے اکثر شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ ہندستان اور

کشمیر میں ان کے مرید بکثرت ہیں۔

شیخ یعقوب بڑی اچھی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنا خمسہ پورا کر لیا ہے۔ متعدد رسالے فن معما پر لکھے ہیں۔ صوفیانہ رنگ میں رباعیات کہی ہیں اور ان کی شرح بھی لکھی ہے۔ انھیں صوفیاء کی حالت ذوق سے لگاؤ نہیں ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ تمام عربی علوم، تفسیر، حدیث اور تصوف میں قابل اعتماد مستند عالم ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل وہ تفسیر لکھ رہے تھے جو ان کے کمالات علم وفضل کا واضح ثبوت ہے۔

ہمایوں بادشاہ اور خود شہنشاہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو اور مصاحبت کا اعزاز حاصل تھا، وہ بادشاہ کے منظور نظر اور بڑے مکرم ومحترم تھے۔ طبعاً نہایت فیاض اور صاحب ایثار تھے۔

ان کے مرتبہ کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔ یہ چند شعر ان کے ہیں:

در ہر چہ بنگرم آن رخ نیکوست جلوہ گر	در صد ہزار آئینہ یکروست جلوہ گر
خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست	وین طرفہ ترکہ دوست بہر سوست جلوہ گر

* * *

خالت از مکر بران گوشۂ ابرو بنشست
ہر کجا گوشہ نشینی است در و مکری ہست

* * *

مشکن ای غمز دل ما او مشکن کان دل کیست
دل ما ہست ولی بین کہ درو منزل کیست

* * *

گر بکوئیش گذری پائی زسر باید کرد
قصہ کوتہ زسر خویش گذر باید کرد

اسم شیدا پر یہ معما انھی کا ہے:

ماہ من از رخ نقاب انداختہ
دہ کہ عمداً روز را شب ساختہ

جس زمانہ میں لاہور سے اسے اپنے وطن جانے کی اجازت ملی تھی، انھوں نے راوی کے اس پار سے یہ خط میرے نام لکھا تھا:

"قادری! مخلصانہ دعا و نیاز

سفر کے وقت مشایعت سنت ہے۔ آپ جیسے مخلص حقیقی سے یہ سنت محض مجبوریوں کی وجہ سے ہی ترک ہوئی ہوگی۔ امید ہے جناب فراموش نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو مسودات کے لیے کشمیری کاغذ کی ضرورت ہو تو مطلع فرمائیے تاکہ میں کشمیر سے اپنی تفسیر کے مسودات بھیج دوں۔ اگر آپ کاغذ کو دھوویں تو اس کی تحریر اس طرح اڑ جاتی ہے کہ سیاہی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا، جیسا کہ آپ نے بھی تجربہ کیا ہوگا۔ والسلام"

جب وہ کشمیر گئے تو ایک اور رقعہ وہاں سے بھیجا جو بس آخری خط تھا۔ مولانا شیخ عبدالقادر کے نام

قطعہ

از دوائی بداؤنی پیشک   درفنون فضیلت است فزون
پس دلیل زیادت معیشش   کہ بنامش بصورت ست فزون

"آپ کے خطوط وصول ہوئے، کوتاہی لیاقت کی وجہ سے ان کے جواب سے قلم قاصر تھا، لیکن خلوص و بندگی کے جذبات بے اختیار زبان قلم پر آگئے۔ امید ہے کہ جس وقت آپ نواب فیاض کے غسل خانہ میں دوپہر کے وقت کشمیر کی ہواؤں سے زیادہ سرد چٹائی پر بیٹھے برفاب کے گھونٹ مزے مزے سے لیتے ہوئے دلچسپ گفتگو میں مشغول ہوں گے، ہم اسیران غم محروموں کو بھی ضرور یاد کریں گے۔

ای بہ بزم وصل حاضر غائبان را دستگیر
زانکہ دست حاضران از غائبان کوتاہ نیست

شیخ محی الدین محمد آپکی خدمت میں نیاز مندی عرض کرتا ہے قبول فرمائیے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ میران سید قطب الدین نے میرے نیاز نامہ کا جواب نہیں دینا چاہا اور غالباً آپ حق ہمسائگی کی وجہ سے اس بات کا یقین کرلیں گے لیکن حق بات کہیے کہ یہ حق اس حق پر ترجیح رکھتا ہے یا نہیں؟

آپ جناب میران کے اظہار محبت و دوستی پر قطعاً بھروسہ نہ کریں کیونکہ وہ پائیدار نہیں ہے۔

''اظہار مضمر'' پر جدید آصف خانی طرز پر میں نے جو اشعار کہے تھے، ان کا مسودہ میرے پاس سے گم ہوگیا ہے۔ غالباً آپ نے اس مسودہ کی ایک نقل اتارلی تھی، براہ کرم اپنے نسخہ میں سے اس کی نقل بھیج دیجیے۔

جواب

''آپ کی تعریف کیا کروں، کیونکہ عبد القادر کے الفاظ کوزہ ہیں اور آپکی تعریف سمندر۔ آپکے لئے دعا کیا کروں:

بسوئی سدرہ زمن مرغ طاقتی نپرد
کہ نامۂ برد از دعات در منقار

اپنے شوق و اشتیاق کا کیسے اظہار کروں:

یا ممن بایادن بدہ طوقنی   من صحة الزمان قد عوقنی
الاقدر ان لکتب شوقی لکم   ما اشوقنی الیک ما اشوقنی

اس وقت سے جب سے کہ آپ اس طرف گئے ہیں نوروز سے پہلے اور اس کے چند دن بعد آپ کے دو خط پہنچے:

مروی در از نیکو در شہر خویش امروز
با خواستہ نشستہ از بخت خویش فیروز

جن میں سے ایک خط میں لکھا ہوا تھا:

(از دوانی جداؤنی پیشک)

اس کے جواب میں عرض ہے:

مثنوی

ای زبانت کلید نامۂ غیب　　　دل پاکت گنجینۂ لاریب
داده اعجاز کلک تو بیرون　　　گنجہائی نہان کن فیکون
گفتی از منطق گہر پرور　　　کز دوانی بداونی خوشتر
گر دوانی دگر بداونی چند　　　ہمہ از گنج فضل تو پیوند
دلم آئینۂ جمال تو شد　　　مظہر فیض لایزال تو شد
چہ عجب گر زروی حق بینی　　　خویشتن را درو ہمی بینی

اگر خود نمائی کا تقاضا ہے تو بس اتنا ہی کافی ہے، ورنہ پھیکا پھیکا جواب لکھنے سے فائدہ! لیکن مخلصانہ خطوط کے لکھنے میں کوتاہی خواص کا طریقہ نہیں، اس لیے معذرت خواہی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اس رقعہ کو سابقہ جرموں کا کفارہ تصور فرمایئے اور وہ جو آپ نے ہوائی تہخانہ اور برفاب کے متعلق لکھا:

از عمر برف ست و آفتاب تموز

کافی دن ہوئے کہ میں اس ٹھنڈی آب و ہوا سے محروم ہی ہو گیا ہوں:

گرگ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ

والا مضمون ہے۔

بادشاہ سلامت نے اجمیر کی تولیت کے سلسلے میں میرا نام لیا تھا لیکن ابھی تک اس کی منظوری نہیں ہوئی۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ یہ معاملہ جلد طے پا جائے، تاکہ مجھے ملک کی آب و ہوا سے نجات ملے اور دل کو یقین کی ٹھنڈک نصیب ہو۔ اس دنیا کا خس خانہ تو بس برف کی طرح گھل جانے والا ہے:

ای عجب دلستان گرفت و نشد جانستان طول
زین ہوا ھائی عفن زین آب ھائی ناگوار

آپ بھی اس معاملہ میں ممکنہ سعی فرمایئے۔ انشاء اللہ اجمیر جانے کے بعد اجمیر اور کشمیر کو ہم قافیہ سمجھتے ہوئے ''جہالرہ'' کا پانی پیوں گا جس طرح آپ وہاں ''برفتن'' کا پانی نوش جان فرماتے ہیں۔

یہ رمضان کا مہینہ 1003ھ/1594ء ہے۔ بندہ زادہ بداؤں چلا گیا ہے اور دعا میں مشغول ہے''۔

یہ غزل بھی شیخ یعقوب کشمیری کی ہے جو انھوں نے کسی سفر میں لکھ کر میرے پاس بھیجی تھی:

وردی کین نامہ میکردم رقم　　　　کان یجری الدمع لزوجا بدم
ہر رقم کز خامہ ام ظاہر شدی　　　　کار بمحوا معنی ذرک الرقم
محو حرف اشتیاق از لوح دل　　　　لیس فی وسعی وقد جف القلم
در بلائی ہجر حکمت ہا بود　　　　لیتنی کوشفت عن تلک الحکم
صرفی از دریای اشکم نہ محیط　　　　لیس الامثل اشف من دیم

مختصر یہ کہ شیخ یعقوب کشمیری کی تعریف وتوصیف میری عاجز زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ان کے اوصاف وکمالات کی نشانیاں ان کے حالات سے بخوبی نمایاں ہیں۔

شیخ نے 12 ذی قعدہ 1003ھ/1594ء کو انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ امم بود'' کہی گئی ہے:

سلام علی الدنیا و طیب نعیمہا　　　　کان لم یکن یعقوب فیہا بجالس
درین خرابہ مجورہ بسوئی گنج مراد　　　　کہ جای محنت ورنج ست این خراب آباد

مولانا میرزا سمرقندی

مولانا انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کر آئے تھے۔ بیرم خان خانان کے عہد میں آگرہ میں مقیم تھے۔ ایک ایک مخلوق ان سے فیضیاب ہوئی تھی۔ منطق میں ''شرح شمسیہ'' امیر سید محمد کی تصنیف ہے۔ جن کے والد امیر سید علی ہمدانی تھے۔ یہ وہی

بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی تھی۔ میں (86) نے "شرح شمسیہ" کا کچھ حصہ اور پوری کی پوری "مختصرات" مولانا میرزا کے پاس پڑھی تھی۔ حضور اکرمؐ کی یہ مستند حدیث۔ "قال النبی ﷺ من تری غیره ثم قتله ومه هدر"۔ ان کی زبان سے سنی اور اس کی روایت کی اجازت حاصل کی جو 6 واسطوں سے حضور اکرمؐ تک پہنچی ہے اور اس حدیث کی سند کا قصہ "نجات الرشید" میں تفصیل سے درج ہے۔ مولانا خان زمان کی بغاوت کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی آ گئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے۔

قاضی ابو المعالی

عزیز بخاری کے داماد، شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ عزیز بخاری کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر تمام حنفی فقہ کی کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ ازسرنو ان سب کو لکھوا دیتے۔

انھوں نے عبد اللہ خان بادشاہ توران کو فن منطق اور علم جدل کو ملیامیٹ کرنے پر آمادہ کیا، ماوراء النہر سے ملا عصام الدین اسفرائنی اور اس کے خبیث طالب علم ان کی ہی وجہ سے شہربدر کیے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارا اور سمرقند میں پھیلا تو خبیث اور شریر لونڈے جہاں بھی کسی حلیم الطبع صالح آدمی کو دیکھتے، کہنے لگتے "یہ گدھا ہے" کیونکہ "لا حیوان" اس سے منسوب ہے۔ چونکہ "انتفائی عام" مستلزم انتفائی خاص ہے۔ اس لیے انسانیت کا سلب ہونا لازم آتا ہے۔ اس قسم کے منطقی مغالطے جب بکثرت پھیل گئے تو قاضی نے عبد اللہ خاں کو اس کے سد باب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کو نکال باہر کرا دیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی۔

ایک روایت یہ بھی نکالی کہ اگر اس کاغذ سے جس پر منطق لکھی ہوئی ہو، استنجا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ قاضی ہمیشہ ہر نماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے اور مرید بناتے تھے 969ھ/1561ء میں آگرہ میں آئے۔ میں (86) نے "شرح وقایہ" سے پہلے کے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلاشبہ وہ اس فن میں بحر بے پایاں تھے۔

مولانا میر کلاں

ملا خواجہ کے پوتے ہیں۔ خراسان کے بڑے مشائخین میں سے تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات سے آراستہ، نہایت متبحر دانشور اور عالم تھے، خاص طور سے علم حدیث میں تو اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔ حدیث کی اجازت انھوں نے سید میرک شاہ سے لی تھی اور مولانا زین الدین محمود کمان گر بہرائی کے منظور نظر تھے اور نیکی ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ہمیشہ دینی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے۔

عقیدت و مریدی کا تعلق شیخ جلال ہروی سے تھا جو سربرآوردہ مشائخین اور مشاہیر میں سے ہیں۔ مولانا میر کلاں بلاشبہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنیٰ کی مظہر تھی۔ 80 سال کی عمر پائی۔ ان کی والدہ سیدہ تھیں اور زندہ تھیں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں انکی بیوی ان کی والدہ کی نافرمان نہ نکلے۔ انھوں نے شادی ہی نہیں کی اور والدہ کی زندگی ہی میں انتقال فرما گئے۔ جس وقت مولانا کا انتقال ہوا ان کی والدہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں جب انھیں ایسے عزیز و سعادت مند بیٹے کی وفات کی اطلاع دی گئی اور لوگ ان سے تجہیز و تکفین کی اجازت مانگنے لگے تو اس نیک بی بی نے "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا، اجازت دی اور پھر تلاوت میں مشغول ہوگئیں اور اس سیدہ نے کسی طرح کی بے قراری اور صدمے کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا میر کلاں کی وفات 981ھ/ 1573 میں آگرہ میں ہوئی اور آگرہ ہی میں دفن کیے گئے۔ ان کے ایک سال بعد ہی ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔

میں(86) ان بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں، لیکن ان سے کوئی استفادہ نہیں کر سکا۔

مولانا سعید ترکستانی

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ملا احمد جنید سے انھوں نے پڑھا ہے۔ ملا محمد سرخ

سے بھی کچھ استفادہ کیا اور کچھ عرصہ تک ملا عصام الدین ابراہیم کے بھی شاگرد رہے۔

ہندستان آنے کے بعد اکبر سے ملاقات ہوئی تو اکبر کو ان کی مصاحبت نہایت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا بڑا غلبہ تھا لیکن وہ نہایت خوش مزاج اور ذہین تھے۔ چنانچہ عہد حاضر میں ان جیسے فہم اور علمیت والا عالم شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ گفتگو اور بیان نہایت فصیح اور دلکش ہوتا تھا۔ شاگردوں پر نہایت مہربان رہتے تھے۔

ہندستان سے کابل لوٹ کر گئے اور 970ھ/ 1562ء میں وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

حافظ کوکی

حافظ تاشقندی کے نام سے مشہور ہیں۔ نہایت متبحر عالم تھے، خاص طور سے عربی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مولانا عصام الدین کے شاگرد ہیں۔ تمام علوم بخوبی جانتے تھے اور لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ ماوراء النہر میں تمام علماء ان کو اپنا بڑا مانتے تھے۔ بظاہر وہ فوجی وضع قطع میں رہتے تھے، ہمیشہ ترکوں کی طرح ترکش کمر سے باندھے ہوئے سوار رہا کرتے تھے۔ 977ھ/1569ء میں ہندستان تشریف لائے۔ اکبر سے ملاقات کی اور بھاری انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ پھر براہ گجرات حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے روم گئے اور شاہ روم سے ملاقات کی۔ ہندستان سے 10 گنا زیادہ وہاں ان کی تعظیم وتکریم کی گئی یہاں تک کہ وزارت کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا اور ماوراء النہر لوٹ آئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ میں[illegible] ان سے اور مولانا سعید ترکستانی سے نہیں مل سکا۔

قاضی نظام بدخشی

قاضی خاں لقب تھا، بدخشاں کے رہنے والے ہیں ان کا مقام اس پہاڑ سے قریب تھا جس میں لعل کی کان ہے۔ نصابی علوم میں مولانا عصام الدین ابراہیم کے شاگرد ہیں۔ ملا سعید سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تصوف سے بڑی وابستگی تھی۔ چنانچہ علم تصوف پر بھی پورا عبور

حاصل تھا۔ طریقت میں شیخ حسین خوارزمی کے مرید تھے۔ خدا والوں کی صحبت کے طفیل دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ بدخشاں میں امرائے شاہی میں داخل تھے۔ ہندوستان آئے تو اکبر بادشاہ نے اندازہ سے بڑھ کر پذیرائی کی۔ پہلے تو قاضی خاں کا پھر غازی خاں کا خطاب ملا۔

قاضی نظام نہایت فصیح زبان اور خوش بیان عالم تھے۔ معتبر تصانیف کے مصنف ہیں۔ ایک رسالہ کلام و بیان، ایمان تحقیق و تصدیق کے موضوعات پر لکھا۔ شرح عقائد پر حاشیہ لکھا ہے۔ تصوف میں بھی بہت سے رسالے تصنیف کئے ہیں۔ اودھ میں بعمر 70 سال 992ھ/1584ء میں انتقال فرمایا۔ فتح پور میں پہلا وہ شخص جس نے فتح پور میں بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی رسم ایجاد کی وہ قاضی نظام بدخشی تھے۔ ملا عالم کابلی بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے افسوس اس کی ابتداء واختراع میرے ہاتھوں نہیں ہوئی۔

مولانا الہداد لنگر خانی

لنگر خان لاہور کا ایک محلہ ہے۔ مولانا اکثر علوم متداولہ میں ماہر اور متبحر عالم ہیں۔ شریعت کے بڑے پابند، نہایت متقی اور پرہیز کار بزرگ ہیں۔ اب بھی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ بے مروت دنیاداروں کے گھر کبھی نہیں جاتے۔ بادشاہوں اور امیروں سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سرکاری مدد معاش بھی قبول نہیں کی۔ اب ان کی عمر 80 سال ہے۔

مولانا محمد مفتی

لاہور کے معتبر اساتذہ میں سے ہیں۔ بڑے صاحب کمال عالم ہیں، مفتی کے عہدہ پہ فائز ہیں۔ صحیح بخاری اور مشکوۃ کا جب بھی ختم ہوتا ہے تو وہ ایک بڑی محفل منعقد کرتے ہیں جس میں بغرا(87) اور حلوؤں سے ضیافت کی جاتی ہے۔

ان کا گھر علماء و فضلاء کا مرکز ہے۔ اس زمانہ میں ان کی عمر 90 سال کی ہو چکی ہے

اور نہایت کمزور و ضعیف ہو گئے ہیں اس لیے درس دینا چھوڑ دیا ہے۔ چار پانچ لڑکے ہیں جو سب کے سب علم و کمال میں اپنے باپ کا نمونہ اور جانشین ہیں۔

میر فتح اللہ شیرازی

شیراز کے سیدزادے اور اپنے زمانہ کے بے مثل عالم تھے، مدتوں فارس کے حکام و اکابر کے مشیر و راہنما رہے۔ تمام علوم عقلی جیسے حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل، حساب، طلسمات و جرثقیل وغیرہ کے عالم و ماہر تھے۔ اس فن میں ایسی مہارت و دسترس تھی کہ اگر بادشاہ تیار ہو جاتا تو وہ رصد گاہ تیار کر دیتے۔ علوم عقلی کی طرح عربی علوم، حدیث، تفسیر اور کلام میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی بڑی اچھی تصانیف ہیں۔ لیکن بلحاظ علم و تصنیف وہ میرزا جان شیرازی کی برابری نہیں کر سکے جو ماوراء النہر کے یگانۂ روزگار عالم گزرے ہیں۔

میر فتح اللہ مجلسوں میں نہایت با اخلاق، منکسر المزاج اور نیک نفس تھے۔ لیکن خدا کی پناہ جس وقت وہ پڑھانے بیٹھتے تو اپنے شاگردوں کو گالیوں اور فحش الفاظ سے نوازتے رہتے۔ اسی وجہ سے ان کے درس میں زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے اور کوئی اچھا شاگرد ان کے حلقہ سے نہیں نکلا۔

چند سال وہ دکن میں رہے۔ وہاں کے حاکم عادل خاں کو میر سے بڑی عقیدت تھی۔ جب اکبر کی خدمت میں آئے تو عضد الملک کا خطاب پایا۔ کشمیر میں 997ھ/1588ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس مقام پر جو تخت سلیمان کے نام سے مشہور ہے، مدفون ہیں۔

ان کی تاریخ وفات ''فرشتہ بود'' سے نکلتی ہے۔

شیخ منصور لاہوری

شیخ اسحاق کاکوی کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن زیادہ تر علم انھوں نے مولانا سعد اللہ سے حاصل کیا ہے اور وہ ان کے داماد بھی تھے۔ ہندستان میں جتنے عقلی علوم رائج ہیں ان سب میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نہایت خوش طبع، سمجھدار اور چھا جانے والے آدمی

ہیں۔ امراء و سلاطین سے تعلقات رکھنے کا خوب ملکہ آتا ہے۔

کچھ عرصہ تک تو مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ جس زمانہ میں لاہور میں اکبر کا قیام تھا مالوہ سے اکثر حاضر ہوئے اور اسی تاریخ سے پرگنہ بجوارہ اور پہاڑی سرحدوں کے نظم و نسق پر مامور ہیں۔ ان کے لڑکے ملا علاء الدین مشہور دانشمند اور مدرس ہیں۔ عرصہ تک خان خاناں کی صحبت میں عزت و اکرام سے رہے۔ جب بادشاہ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو وہاں بھی بڑی عزت پائی۔ بادشاہ نے فوجی ملازمت کی پیش کش کی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور درس و تدریس میں معروف رہے۔ جو کچھ انھیں جاگیر سے ملا کرتا تھا وہ طلباء پر صرف کر دیتے تھے۔ ہندستان کے عالموں میں پیر محمد خان کے بعد ان جیسا اور ملا نور محمد خان جیسا کوئی اور شخص سخی، فیاض اور ایثار پیشہ نہیں گزرا۔

انھوں نے شرح عقائد پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ بہت مشہور ہے۔ حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

ملا پیر محمد شیروانی

نہایت عقل مند، خوش اخلاق اور میٹھی باتیں کرنے والے عالم تھے، لیکن طبیعت میں سنگ دلی اور بے رحمی بہت تھی۔ شریعت کی پابندی بھی نہیں کیا کرتے۔ شیروانی جب قندھار پہنچا اور بیرم خان خان خاناں کے یہاں ملازمت کر لی اور بہت جلد ترقی کے مدارج طے کیے۔ ہندوستان فتح ہو گیا تو اسے خان کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الملک کا خطاب ملا اور تین چار سال اس نے نہایت شان و شوکت سے بسر کیے۔ لیکن ظالم کو بھی فروغ نہیں ہوتا چنانچہ وہ بھی کچھ ہی عرصہ بعد مالوہ ندی میں ڈوب کر مر گیا اور فرعون اور نیل ندی کی یاد تازہ کر دی۔

میں نے بس اسے دور ہی سے دیکھا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس کی مجلس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میرزا مفلس اوزبک

ملا احمد جند کے شاگرد ہیں۔ مناظرہ و مجادلہ کے فن میں نہایت تیز تھے۔ لیکن ان کی تقریر فصیح نہیں ہوتی تھی۔ درس دیتے ہوئے بڑی مضحکہ خیز حرکتیں کرتے تھے۔ شکل و صورت بھی اچھی نہ تھی، لیکن نہایت نیک اور متقی آدمی تھے۔

ماوراء النہر سے ہندستان آئے تو 4 سال تک آگرہ میں جامعہ خواجہ معین الدین فرنخودی میں سبق دیتے رہے۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت کی اور مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا اس وقت ان کی عمر 70 سال تھی۔

مولانا نورالدین محمد ترخان

تمام علوم، حکمت و کلام پر مستند عالم تھے۔ علوم عالیہ کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لگاؤ تھا، چنانچہ نہایت خوش طبع شاعر سمجھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی تھی اور حضرت غفران پناہ ہمایوں بادشاہ کے روضہ کے متولی بنا دیئے گئے تھے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا الہداد امروہہ

نہایت خوش طبع، آزاد مزاج، محقق عالم، شیریں کلام، خوش باش اور ندیم پیشہ شخص تھے۔ مزاح و ظرافت کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ غرض اہل مجلس کے لیے "مایۂ حضور اور مایۂ سرور" سمجھے جاتے تھے۔

شاہی فوجی ملازمت میں انھوں نے کچھ روپیہ بچا رکھا تھا اور اسی پر ان کی گزر بسر کا دارو مدار تھا۔ ساری عمر میرے ساتھ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے رہے۔

990ھ/1582ء میں جب کہ لشکر سیالکوٹ کے علاقے میں اٹک گنگ کی طرف جا رہا تھا، ان کا انتقال ہو گیا۔ لاش امروہہ میں ایک مقام پر جہاں انھوں نے آخری ٹھکانے کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی لے جا کر دفن کی گئی۔ اس عہد کے جو مشائخ اور علماء تھے ان کا

ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ میں نے ان میں سے اکثر کی صحبت پائی ہے اور ان کے دیدار سے فیضیاب ہوا ہوں!

ان تمام بزرگوں میں سے جن کا ذکر کیا گیا اس قحط الرجال کے دور میں بس چند رہ گئے ہیں۔ بعض لوگوں کی نظروں سے اوجھل گوشہ نشین ہو گئے، ذہنوں سے ان کی یاد بھی جاتی رہی ہے۔ باقی بچے کھچے لوگ اپنی آخری سانس گنتے ہوئے بے کلی سے اس کوچ کا انتظار کر رہے ہیں جس کے بعد لوٹنا نہیں ہوتا۔ ان کے کانوں میں برابر الرحیل الرحیل کی صدا گونج رہی ہے۔ جانے کب اس آواز پر اٹھ کر چلے جائیں۔

تاریخ جہان کہ قصۂ خرد و کلان　　درج ست درو چہ شیر مردان یلان
در ہر ورقش بخوان کہ فی عام کذا　　قد مات فلان ابن فلان ابن فلان

تمام ممالک محروسہ ہندستان کے طول و عرض میں علماء و مشائخ اتنے ہیں کہ ان کا شمار خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو شرارت، باطنی خباثت، دین فروشی، کجروی اور رذالت، بے راہ روی اور بے اعتدالی میں مشہور و معروف ہیں کچھ کم نہیں۔ ہم نے ایسے پس ہمت لوگوں کے تذکرے میں اپنے قلم کو الجھانا مناسب نہیں جانا، کیوں کہ ایک بڑا کام پیش نظر ہے اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

میرا اپنا حال اس نیشاپور کے برف فروش سے کچھ مختلف نہیں جو گرم ہوا میں برف بیچ رہا تھا۔ جب سورج نکلا تو کہنے لگا اے مسلمانوں خدا را! رحم کی نگاہ سے مجھ نقصان کے مارے کو دیکھو کہ اس کی پونجی پگھل پگھل کر اس کے ہاتھوں سے بہتی جا رہی ہے۔

عمر برف است و آفتاب تموز
اندکی ماند و خواجہ غرہ ہنوز

اور میں یہ جو مرنے والوں کی تاریخ وفات لکھتا رہتا ہوں، اس کی مثال اس درزی کی ہے جو قبرستان کے دروازے پر اپنی دکان لگائے ہوئے تھا اور ایک کوزے کو کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ جب بھی کوئی جنازہ شہر سے نکلتا وہ اس کوزہ میں ایک کنکر ڈال دیتا اور ہر مہینہ ان کنکریوں کو گن کر حساب لگا لیتا کہ کتنے جنازے اٹھائے گئے۔ پھر وہ کوزہ خالی کر

کے دوبارہ اسے ٹانک دیتا اور اسی طرح کنکریاں ڈالتا رہتا۔ یہاں تک کہ دوسرا مہینہ آجاتا۔ کافی عرصہ تک وہ اسی طرح کرتا رہا۔ اتفاق سے ایک درزی مرگیا۔ ایک شخص جسے اس کی وفات کی خبر نہ تھی اس سے ملنے آیا۔ دکان بند پاکر اس نے ہمسایہ سے دریافت کیا کہ "درزی کہاں ہے؟"

ہمسایہ نے کہا" وہ اسی کوزہ میں گر پڑا ہے":

بنگر کہ بدیگری کشاید
گزوی چو گزشت بر تو آید

سبحان اللہ ہماری زندگی بھی کیا زندگی؟ بس ایک عذاب ہے حلق میں جا کر پھنس گئے ہیں کہ جلنے اور تڑپنے کی بھی مجال نہیں چھٹکارنے کی امید کہاں؟

قطعہ

چو غنچہ خون خوردودل تنگ باش و لب بکشا   کہ نیست غنچۂ این باغ را امید کشاد
نشان ز سرو قدی ی دہد کہ خاک شدہ است   بہر زمین کہ فتادہ است سایۂ شمشاد
چو ہر نفس ز چمن میرود بیاد گلی   مدام جامہ کبود است سوسن آزاد

غرض میں نے ان 2 محترم گروہوں یعنی صوفیاؤ علماء کا تذکرہ تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر درج کردیا ہے۔ سخن شناس قارئین اعتراض نہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ انتخاب نہایت پریشان حالی میں بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ نیز میرے پاس یادداشت بھی نہیں تھی کیونکہ بیاض رکھنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔

میں تو وہ بخیہ گرہوں جس کی سوئی ہر وقت کھو جاتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا: "مجھے کیا سمجھتے ہو، اگر میرا وقت سوئی کے ڈھونڈنے میں ضائع نہ ہوتا تو ہر روز میں ڈھیروں کام کرکے رکھ دیتا"۔ میں نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض تو اس قبیل کے ہیں کہ میری خواہش کے مطابق تو ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا، کیونکہ بہت سے ایسے صدیق ہیں جو بعد میں زندیق ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان تمام میں سے کوئی ایک شخصیت بھی

ایسی ہو جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو تو بس میری نجات اور شفاعت کے لیے وہی ایک شخص کافی ہوگا۔ ویسے یہ سارا گروہ ولایت کے اعزاز سے موصوف ہے اور ان میں سے اکثر میں ولایت خاصہ جلوہ گر رہی ہے۔

میں نے بے دینوں اور دنیاداروں کا ذکر ان کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے۔ اس معاملہ میں میں نے عارف بسطامیؒ کے قول پر عمل کیا ہے۔ وہ اپنے ایک معتقد کو نصیحت کر رہے تھے کہ اگر تم اس زمانہ میں کسی ایسے شخص کو دیکھو جو مشائخین کی باتوں پر ایمان رکھتا ہو تو میرے لیے اور خود کے لیے اس سے دعا کرانا، کیونکہ وہ شخص یقیناً خدا کے نزدیک مقبول ہے:

الٰہی نمی برم و چارہ نمی دانم
بجز محبت مردان مستقیم الاحوال

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ ان صاحب دل اہل اللہ حضرات کی تعداد 111 ہے۔ اسی لفظ سے ''قطب'' کے بھی اعداد نکلتے ہیں اور لفظ ''الف'' کے بھی کہ اس مسودہ کو لکھتے وقت ہزارواں عی سن چل رہا ہے۔

ان بدبختوں کی طرف سے جنھوں نے دین اسلام پر صریحا طعنہ زنی کی ہے جو نہایت بے حیا اور بے دین ہیں، جن کی وجہ سے ملک و ملت میں فتنہ و فساد برپا ہوگیا ہے اور ان کو بجا طور پر ''فتنۂ آخر زمان'' کہا جاتا ہے، میرا دل سخت نالاں ہے، پھر بھی حکماء کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے چند کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

عہد اکبری کے حکماء

ان حکیموں میں سے بعض حکمت علمی و عملی میں ایسے طاق تھے جیسے ان کے ہاتھوں میں ید بیضائے موسوی آ گیا ہو۔ اپنی مہارت فنی کے لحاظ سے اعجاز مسیحی کی یاد دلاتے تھے۔ بعض کی اہمیت بس اس حد تک ہے کہ انھوں نے طب کو ایک شریف فن سمجھ کر حاصل کر لیا اور اپنی مشق سے اس کو پیشہ بنا لیا ہے۔ یہ ہوں یا وہ ہوں ایک بات سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ''دنیا پرستی اور اقتدار پرستی''۔

حکیم الملک گیلانی

اس کا اصل نام شمس الدین ہے۔ حکمت و طب میں جالینوس زماں اور مسیح دوراں تھا۔ طب کے علاوہ دوسرے مروجہ نقلی علوم میں بھی سب سے نمایاں و ممتاز تھا۔ مجھے اس سے کبھی کوئی ربط نہیں رہا۔ جب میں نیا نیا شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا تو ''نامہ خرد افزا'' کو پیش کرتے وقت اس نے بلا کسی سبب کے میرے ساتھ کچھ اچھا رویہ نہیں رکھا۔ جب بادشاہ نے مذکورہ کتاب کے متعلق اس سے پوچھا کہ فلاں کی تحریر و انشا کیسی ہے؟ تو اس نے کہا اس کی عبارت فصیح تو ہے لیکن پڑھنے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی۔

میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ خدا کے بندے کا نہایت خیر خواہ اور لوگوں کے کام بنانے والا بامروت اور آشنا پرور شخص تھا۔ دین و عقیدہ

میں بھی نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ رہا۔ ہمیشہ طالب علموں کو سبق پڑھانے میں مصروف رہتا۔ ان طالب علموں کے اخراجات کی کفالت اور ان کی سرپرستی بھی وہی کرتا تھا۔ کسی وقت بھی ان کو لیے بغیر دسترخوان پر نہیں بیٹھتا تھا اور محض انہی شاگردوں کے خیال سے لوگوں کے گھروں پر دعوتوں میں بہت کم شرکت کرتا تھا۔

ایک دن شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نصاب اور فقیہوں کا حال اور حکماء کے طریقہ کی تعریف و توصیف اور شیخ بوعلی سینا کی خوبیاں گنا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی بڑائی جتانے کے لیے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں نیا نیا گیا تھا کسی کو پہچانتا نہ تھا، اصل بحث کیا تھی، اس کا بھی علم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس وقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے یہ شعر پڑھ دیے:

وکم قلت للقوم انتم علی   شفا حضرة من کتاب الشفاء
فلما استها تو بتو بیخنا   فرغنا الی الله حسبی کفا
فما تو علی دین اسطاطلیس   رغنا علی ملة المصطفا

مزید تائید کے لیے میں نے مولانا جامی کا یہ شعر ''تحفۃ الاحرار'' سے سنایا:

نور دل از سینہ سینا مجوی
روشنی از چشم نابینا مجوی

میرے شعر سنانے پر حکیم بری طرح بگڑ گیا۔ شیخ سلیم نے کہا: ''ان لوگوں میں پہلے ہی سے آگ لگی ہوئی تھی، تو نے آ کر اسے اور بھی بھڑکا دیا''۔

مشائخین اور علماء کا جب تختہ الٹ گیا تو حکیم دین کے مخالفوں اور مرتدوں کی بے حد امکان خوب خبر لیتا رہتا تھا۔ آخر جب حالات بہت بگڑ گئے تو اس نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور 988 یا 989ھ/1585ء میں حج پر چلا گیا، اور وہیں وفات پائی۔

حکیم سیف الملوک دماوندی

ایک طرف تو بڑا عالم و حکیم تھا، دوسری طرف شعر گوئی اور ہجو نویسی بھی کرتا رہتا تھا۔ اپنا

تخلص شہابی رکھے ہوئے تھا۔ اتفاق کے بھی عجیب کرشمے ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حکیم جیسے ہی کسی بیمار کے سرہانے پہنچا، بیمار ملک الموت کا ہاتھ تھام کر رخصت ہو گیا۔ مسخروں نے اس کا نام ہی ''سیف الحکماء'' مشہور کر دیا تھا۔

حضرت شیخ جامی محمد خبوشانی کے ایک پوتے تھے جو مخدوم زادے کے لقب سے مشہور تھے۔ حکیم نے ان کا علاج کیا اور بیچارے کا بیڑہ اس پار پہنچا دیا۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخ کے لیے دلچسپ فقرہ تراش لیا۔ ''سیف الحکماء کشت'' (سیف الحکماء نے مار ڈالا) ایک جلال طبیب تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے یہ قطعہ کہا تھا جو حکیم سیف الملوک پر پوری طرح ٹھیک بیٹھتا ہے:

ملک الموت از جلال طبیب　　شکوہ برد واش پیش خدا
بندۂ عاجز شدم ز دست طبیب　　میکشم من یکی و او صدہا
یا ورا عزل کن ازین منصب　　یا مرا خدمت دگر فرما

ہندستان میں چند سال تک وہ بیرم خاں کی سرکار میں نہایت معزز و مکرم رہا، لیکن جیسی خواہش تھی ایسی ترقی نہ ملی تو ناراض ہو کر ایران چلا گیا اور وہاں سے ایک ہجو لکھ کر بھیج دی کہ اس عہد میں شیرینی اور مزاح کے ساتھ شاید ہی کسی نے ایسی عمدہ واقعہ نگاری کی ہوگی۔ اس ہجو کے چند شعر جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، تفریح طبع کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

صالح بز غالۂ بی وقت برای بربری　　گاہی او را گربہ گاہی موش بیران گفتہ ام
برہمنی بی قشقہ و زنار یعنی شیخ ہند　　تا مسلمانم اگر او را مسلمان گفتہ ام
ای شفیع الدین محمد بسکہ می جاوی سخن　　آن سخن جاوت را نشخوار انسان گفتہ ام
ای فریدون در تعرض روی بی شرم ترا　　فی بھواری کہ در تختی چو سندان گفتہ ام

میر فریدون نے اس کے جواب میں کہا:

اشک حکمت باف لاف ای شک آقائی اجل
آنکہ او را در معیشت خانہ دربان گفتہ ام

جس زمانہ میں میر معز الملک سپاہ گری کو چھوڑ کر دہلی میں روپوش ہو گیا تھا، اس نے کہا تھا:

شاہ درویشان معز الملک از من در ہم است
بندہ او را کی ز درویشی پشیمان گفتہ ام

حکیم زنگل شیرازی

علم و دانش میں ممتاز حکیم تھا اور بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل تھا۔

حکیم عین الملک شیرازی

اپنا تخلص دوائی کرتا تھا۔ علم و کمال میں نہایت بلند مرتبہ تھا۔ اچھے اخلاق و عادات کا مالک تھا۔ بندیہ نامی شہر میں انتقال فرمایا۔

یہ اشعار اسی کے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد مرحوم کے باغ سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بطور یادگار مجھے دیے تھے۔ وداع ہونے کے بعد وہ لاہور سے راجہ علی خان حکمران برہانپور کے پاس سفیر بن کر چلا گیا۔ بس یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں

چنان از عشق بر گشتم کہ در دنیا نمی گنجم   ہمہ جا پر عشقم گشت و من در جائی گنجم
اگر با غیر عشق الفت نمی گیرم عجب نبود   مثال عصمتم میدان کہ در صہبا نمی گنجم
نشان از من چہ می پرسی کہ من خود ہم نمیدانم   ہمانا سر توحیدم کہ در آنجا نمی گنجم

ہیچ ویرانی نشد پیدا کہ تعمیری نداشت   درد دل درمان عشق است ایک تدبیری نداشت
صید آہوی شدم کز ہر طرف کردم نگاہ   غیر جانی پاک در فتراک نخچیری نداشت

حکیم مسیح الملک شیرازی

حکیم نجم الدین عبد اللہ بن شرف الدین حسن کا تربیت یافتہ تھا۔ نہایت درویش صفت پاک

اعتقاد آدمی تھا۔ فن طبابت میں اسے ید بیضا حاصل تھا۔ دکن سے ہندستان آیا، پھر شہزادہ سلطان مراد کے ہمراہ گجرات اور دکن کی مہم پر متعین کیا گیا۔ لیکن مالوہ ہی میں فرشتہ اجل نے آگھیرا۔

حکیم مصری

طب میں نظری اور عملی طور پر نہایت دور رس اور ماہر شخص تھا۔ علوم نقلی پر بھی اچھا عبور حاصل تھا۔ عجب عجب علوم سیکھ رکھے تھے۔ جیسے دعوت اسما، علم حروف اور علم تکسیر وغیرہ۔

ہمیشہ مسکراتا نظر آتا، خندہ پیشانی سے ملتا اور گفتگو کرتا، لوگ اسے مبارک قدم کہا کرتے تھے۔ شیخ فیضی کے علاج میں اس نے بڑی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بھی کہا کرتا کہ موت کے معاملہ میں تو سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر علم طب سے عمر میں اضافہ ہوتا تو حکیم لوگ دنیا سے جاتے ہی نہیں۔

وہ کبھی کبھی مزاحیہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ یہ اسی کا شعر ہے کہ خواجہ شمس الدین دیوان خوافی کے متعلق کہا تھا:

خواجہ شمس الدین چہ قلی کند
در طبابت باش دفلی می کند

ایک دن اس نے کیکر کے پھول جس کو عربی میں دفلی کہتے ہیں کو دیکھ کر فی الفور کہا:

چو آتش جست کاکل از سر دفلی

بادشاہ نے لاہور میں بادشاہی محل کے صحن میں ایک چبوترہ بنوایا اور حکم دیا کہ ہر شخص اس جگہ ہمارے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔

اس موقع پر حکیم مصری نے شعر کہا:

شاہ ما کرد مسجدی بنیاد   ایہا المومنین مبارک باد
اندرین نیز مصلحت دارد   تا نماز ان گذار بشمارد

حکیم مصری نہایت سادہ لوح، بے غرض آدمی تھا۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ برہانپور، خاندیش میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔

حکیم علی

حکیم الملک کا بھانجہ اور حکمت میں اپنے ماموں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ شیخ عبد النبی سے علوم نقلی کی تحصیل کی ہے۔ علوم شرعی پر اس کی اچھی نگاہ ہے لیکن اس کے باوجود "زیدیہ" مذہب کا کٹر معتقد اور اس زمانہ کے بیشتر حکماء کی طرح متعصب شیعہ ہے۔

اکتسابی فنون خاص طور سے علم طب میں اچھی مہارت ہے۔ مریضوں کا علاج بھی کرتا رہتا ہے، لیکن نوجوان اور خود پسند ہے۔ ابھی عملی تجربہ بھی کچھ زیادہ نہیں، اس لیے اکثر بیمار اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنے دکھوں سے رہائی پا جاتے ہیں۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے، لیکن جب شاہ صاحب بیمار ہوئے تو حکیم علی نے تپ محرقہ میں "ہریسہ" کھانے کے لیے تجویز کیا جس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔

"مرگ ہوش است شربت بہ او"

حکیم ابوالفتح گیلانی

بادشاہ کا چہیتا مصاحب تھا۔ اس نے مزاج شاہانہ پر ایسا قابو پالیا تھا کہ دوسرے تمام درباری اس سے حسد کرتے تھے۔ نہایت ہوشیار، ذہین اور تمام ہنروں میں یکتا تھا۔ نظم و نثر میں بھی باکمال ادیب تھا۔ اسی طرح بے دینی اور تمام بداخلاقیوں میں بھی اس کی شخصیت ضرب المثل تھی۔

میں نے ان دنوں جبکہ حکیم نیا نیا آیا تھا خود اس سے سنا، کہتا تھا: "خسرو کیا ہے بس 12 شعر کا شاعر، انوری کو خوشامدی انوری کہا کرتا تھا اور اس کو میر بادنجان سے تشبیہ دیتا تھا جو ایک مسخرا تھا۔ خاقانی کے متعلق کہتا تھا اگر اس زمانہ میں ہوتا تو بڑی ترقی کرتا۔ اس طرح کہ جب وہ، خاقانی میرے گھر آتا تو میں تھپڑ مار کر اس کی سستی اور کاہلی کو دور کر دیتا

اور یہاں سے ابوالفضل کے گھر جاتا وہ اسے طمانچہ لگاتا۔ اس طرح ہم اس کے اشعار میں اصلاح کرتے رہتے''۔

حکیم حسن گیلانی

طبیب حاذق تھا۔ معالجہ میں اچھی شہرت تھی۔ عالم تو اتنا بڑا نہیں تھا، لیکن نہایت با اخلاق اور خوش کردار آدمی تھا۔

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح کا چھوٹا بھائی، اخلاق میں اپنے بھائی سے بہتر تھا۔ اگرچہ نیک نہیں تھا لیکن عملاً شر پسند بھی نہیں تھا۔

حکیم حسن، شیخ فیضی، کمالائی صدر اور حکیم ہمام حسب ترتیب ایک مہینہ کے اندر اندر فوت ہو گئے۔ ان کا مدتوں سے جمع کیا ہوا مال واندوختہ ایک ہی گھڑی میں کہاں سے کہاں نکل گیا اور یہ حسرت ومحرومی لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے:

جان بجانان دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود بدہ انصاف جان من کہ این یا آن نکوست

حکیم ہمام کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس کی لاش بعد میں حسن ابدال لاکر اس کے بھائی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

حکیم احمد ٹھٹھوی

عالم تو بہت اچھا تھا، طب نہیں جانتا تھا، بس حکیم بنا ہوا تھا، ویسے تمام علوم کا جامع تھا۔ عرب اور عجم کی سیاحت کی تھی۔ نہایت خوش مزاج آدمی تھا لیکن بہت سے فضول خبط لگے ہوئے تھے۔ طبیعت کا لالچی بھی تھا۔ اہل بیت ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ میں نے اس سے اکثر کہا کہ تجھ میں یہ استعداد نہیں کہ تو اہل بیت میں سے ہونے کا دعوے کرے کیونکہ

ہندوستان میں ایسے دعوے نہیں چل سکتے۔ اگر تو واقعی دیندار ہے تو دین اسلام کی دعوت دے کہ اس زمانہ میں اسلام کا بس نام ہی رہ گیا ہے، لیکن میرے۔ کہنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر اس نے اپنے اعمال کو بھگت لیا اور مرزا فولاد نے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔

مرنے پر میں نے اسے دیکھا دوسروں نے بھی دیکھا تھا۔ خدا کی قسم اس کی خدائی بے شک و لاریب ہے وہ عین سور کی شکل کا نظر آرہا تھا چنانچہ لوگوں نے اس کی تاریخ نکالی "خوک سقری" شیخ فیضی نے اس کی تاریخ "بیست و پنج ماہ صفر" نکالی ہے۔

میں نے حدیقہ کے اس شعر میں تھوڑا سا تغیر کر کے قاتل اور مقتول دونوں کی مناسبت سے دو تاریخیں نکالی ہیں:

فرضینا بقرآن صادق
وخسنا بوصف وی لایق

دوسری تاریخ ہے "زہی خنجر فولاد"۔

حکیم لطف اللہ گیلانی

بڑا حاذق طبیب تھا۔ وہ اچھے علم کا مالک تھا۔

حکیم مظفر اردستانی

کم عمری ہی میں شاہ طہماسپ کے طبیبوں میں شامل تھا۔ ہندستان آیا تو بڑی ترقی کی۔ بڑا باصلاحیت نوجوان ہے۔ اخلاق نہایت عمدہ اور کردار پاکیزہ ہے۔ بیماروں کو اس کی آمد بڑی بابرکت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بلحاظ علم اتنا اونچا نہیں لیکن اس کا تجربہ بلاشبہ بہت اچھا ہے۔

حکیم فتح اللہ گیلانی

طب کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ علم ہیئت سے بھی بخوبی واقف ہے "قانون" پر فارسی میں ایک شرح لکھی ہے۔ ان دنوں کابل میں قلیج خاں کے علاج کے لیے گیا ہوا ہے۔

شیخ بینا

یہ سرہند کے شیخ حسن طبیب کا لڑکا ہے۔ جراحی میں بڑا ماہر ہے۔ ہاتھیوں کے علاج میں تو اسے مہارت حاصل ہے۔ آج کل بے قید اور بے حیا ہو گیا ہے۔

اب تک ہم نے جتنے حکیموں کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے مسلمان اور ہندو حکیم ہیں، لیکن ان جاہلوں اور ملعونوں کے تذکرہ پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔

عہد اکبری کے شعراء

پیش نظر انتخاب میں جن شاعروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں، ان کا ماخذ میر علاء الدولہ کا مشہور تذکرہ "نفایس الاثر" ہے ان میں سے بعض صاحب دیوان شاعر ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کے ساتھ ملاقات کی ہے، بعض کو دور یا نزدیک سے دیکھا ہے یا ان کی شہرت کی وجہ سے ان کا ذکر کیا ہے۔

غزالی مشہدی

ملحدانہ خیالات اور بے راہ روی کی وجہ سے جب عراق میں اسے لوگوں نے قتل کر دینا چاہا تو وہ وہاں سے بھاگ کر دکن چلا گیا۔ پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ خان زمان نے اس کو خرچ کے لیے ایک ہزار روپیہ بھجوایا تھا۔ اس نے جونپور سے یہ قطعہ بطور لطیفہ کے لکھ کر بھیجا تھا۔ اس میں صفت معما بھی موجود ہے:

قطعہ

ای غزالی بحق شاہ نجف　　کہ سوی بندگان بی چون آن
چونکہ بی قدر بودۂ آن جا　　سرخود را بگیرد بیرون آن

چند سال خان زمان کے پاس رہا، بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ دربار میں اسے ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ اس کے اشعار کے چند دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ کہتے ہیں اس نے چالیس پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ مگر اس کا کلام کچھ زیادہ بلند نہیں، لیکن کمیت و کیفیت کے لحاظ سے اس کے اشعار اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ ہیں، تصوف کی زبان پر بھی بڑا عبور حاصل ہے۔

اس کی وفات جمعہ کی شب 27 رجب 980ھ/1572ء احمد آباد میں اچانک اور دفعتاً ہوئی اور اکبر کے حکم سے اس کو "سرخج" (سرکھیج) میں جہاں بڑے بڑے مشائخین اور سلاطین دفن ہیں، دفنایا گیا۔

قاسم ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ تاریخ کہی:

قطعہ

دوش غزالی آن سگ ملعون   مست جنت شد بسوی جہنم
کاہی سال وفاتش بنوشت   ملحد دونی رفت زعالم

دیگر

بود گنجی غزالی از معنی   مدفنش خاک پاک سرخج است
بعد یک سال تاریخش   احمد آباد و خاک سرخج است

یہ مطلع اسی کے نام سے مشہور ہے لیکن میں نے غزالی کے دیوان میں اسے نہیں پایا:

شوری شد واز خواب عدم دیده کشودیم
دیدم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

غزالی کے کلام کا نمونہ:

در کعبہ اگر دل سوی غیر است ترا   طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر است ترا

در دل بحق است و ساکن میکدۂ   می نوش کہ عاقبت بخیر است ترا

ما ز گرگ خود نمی ترسیم اما این بلا است
کز تماشای بتان محروم می باید شدن

خفتگان خاک یکسر کشتۂ تیغ تواند
ہیچ دلی نیست شمشیر اجل را در میان

چون فانوس خیال و عالمی حیران درو
مردمان چون صورت فانوس سرگردان درو

شدہ زہ بر کمان قامت زاہد ردائی او
ولی زندان نمی ترسند از تیر دعائی او

رباعی

بحر یست ضمیر من کہ گوہر دارد   تیغی است زبان من کہ جوہر دارد
صور قلم نغمۂ محشر دارد   مرغ ملکوتم تخم پہ دارد

اس نے ایک قصیدہ میں صنعت ''سیاق العدد'' ایک تا سو کے اعداد میں بیان کی ہے جس کا مطلع ہے:

بہ یک سخن ز دو لعلت بہ فیض یافت مسیحا
حیات باقی و نطق و نشاۃ احیا

غزالی کا ایک شعر ہے:

ما بادہ ایم و گرد گریبان ما خم ست
داریم نشاۃ کہ دو عالم درو گم است

قاسم کاہی

اصل نام میاں کالی کابلی ہے۔ اس کے اشعار میں پختگی نہیں۔ ان کا سارا مضمون دوسروں سے لیا ہوا ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی کوئی شخص اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ علم تفسیر، ہیئت، کلام اور تصوف پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی اس کی ایک کتاب ہے۔ تصوف، معما گوئی، تاریخ اور حسن ادا میں وہ اپنے زمانہ کا بے مثل شخص تھا۔

اگر چہ اس نے متقدمین اور معاصرین اکثر مشائخ کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے اور مولوی جامی اور دوسرے بزرگوں کا زمانہ دیکھا ہے لیکن ساری عمر وہ الحاد و زندقہ میں مبتلا رہا۔ آزادی، سخاوت، ایثار پسندی اس میں بہت زیادہ تھی۔ ہمیشہ اس کے پاس قلندروں، آوارہ لڑکوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کتوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ غالباً کتے ملک الشعرائی کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

ایک قطعہ میں اس نے لڑکیوں کے ساتھ شیفتگی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

قطعہ

این نصیحت بشنواز سیفی   تا ہمہ عمر ترا بس باشد
شعر خوب و پسر زیبارا   معتقد باش زہر کس باشد

ہم کو اس کے مذہب و مسلک سے کیا کام اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

چون سایہ ہمرا ہم بہر سو روان شوی   باشد کہ رفتہ رفتہ بما مہربان شوی

ای پیر عشق صحبت یوسف رخی طلب   نبود عجب کہ ہمچو زلیخا جوان شوی

چون تار عنکبوت زہجر تو شد تنم
در گوشۂ خرابہ ازان ہست مسکنم

اس کی دو غزلیں صوفیانہ لحاظ سے بہت عمدہ ہیں اور کافی مشہور ہوئی ہیں۔ انھیں مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور بادشاہوں و صوفیوں کی محفلوں میں بڑی پسند کی جاتی ہیں:

مطلع

مرغ تا برفرق مجنون پرزدن انگیز کرد
آتش سودای لیلی بر سر او تیز کرد

چون زعکس عارضش آئینہ پرگل شود
گرد زان آئینہ طوطی بگرد بلبل شود

اسم اللہ پر اس کا معمہ ہے:

نیست از ہستیش کسی آگہ

ابدا کان لا نہا منہا یتہ لہ

اسم نبی ﷺ کا معمہ:

تازہ شرح را شگافتہ ام

از محمد نبی شگافتہ ام

اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ بوستان کے جواب میں قافیہ بہ قافیہ "گل افشان" نامی مثنوی لکھی ہے، جس کا مطلع ہے:

جہان آفریدہ بجان آفرین
بجان آفرین صد جہان آفرین

اس کے چند شعر:

بنا زکشت جہانی بت ستمگر من

ہنوز بر سر ناز است ناز پرور من

ریخت باران بلا برتن غم پرور ما
چہ بلاہا کہ نیا ورد فلک بر ما

نہ نرگس ست عیان بر سر مزار مرا
سفید شد برہت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کے لڑکے کے متعلق کہا:

آتشین رویت زخاکستر چو نیلوفر شدہ
یا نقاب از آتش روی تو خاکستر شدہ

کاہی کے اس مطلع کا مضمون ملا وصفی کابلی کے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ وصفی کا مطلع ہے:

از تپ ہجران تہ خاکستر مرا بستر شدہ
بستر از سوز من بیمار خاکستر شدہ

لوگوں نے جب ملا قاسم سے کہا کہ تمہارے اکثر اشعار میں دوسرے شاعروں کا مضمون ملتا ہے۔ اس نے جواب دیا: ''اس معاملہ میں میں نے کوئی خاص التزام نہیں کیا اگر تمہیں پسند نہیں ہیں تو قلم تراش لو اور ایسے اشعار میرے دیوان سے نکال دو''۔ اس نے ''اصطرلاب'' کے متعلق ایک بڑا اچھا قصیدہ کہا ہے۔ جس میں ہمایوں بادشاہ کی مدح ہے۔ بلا شبہ اس قصیدہ میں کمال کر دکھایا ہے۔

جب خواجہ معظم خاں پاؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود خیر آباد سے ملا قاسم کاہی کی عیادت کے لیے آیا تو اس نے فی البدیہہ یہ غزل اور اس کا ترنم بھی بنا دیا:

ماندی قدم زنانہ بر دل نیاز من   درون مباد پای ترا سرو ناز من
ہر چند وصف وصل تو کردم شب فراق   کوتہ نگشت قصۂ درد دراز من

ایک دن ملا بادشاہی باغ میں نہر کے کنارے سیر کر رہا تھا، صبوحی شاعر وہاں آنکلا اور

کہا: ''استاد آپ نے سنا ایک پرانا موسن عراق میں مر گیا''۔ ملا کاہی نے کہا: ''خدا تم کو بحفاظت زندہ رکھے''۔

گجرات کے پہلے سفر میں ملا غزالی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس وقت وہاں ملا قاسم کاہی کے فوت ہو جانے کی خبر اڑ گئی تھی۔ غزالی نے اس وقت یہ تاریخ کہی تھی۔ قاسم کاہی تو مرے نہیں لیکن یہ قطع تاریخ خوب ہو گیا۔

قطعہ

رفت بی چارہ کاہی از دنیا   سال تاریخ او اگر خواہی
چون ہما چار رفت شد نا چار   از جہان رفت قاسم کاہی

اس سے پہلے کہ اس افواہ کا جھوٹ سچ ظاہر ہو جاتا، ملا قاسم کاہی نے غزالی کی وفات کی ایک تاریخ اور پھر اس کی تلافی میں دوسری تاریخ کہی تھی۔

بہر حال جھوٹ جھوٹ نے کے آگے آ کر ہی رہتا ہے، اس شعر کے مطابق کہ۔

شاعران دیدم زروئی تجربت
بی تعاقب بی عقب بی عاقبت

اس زمانہ کے سارے ہی چھوٹے بڑے شاعر بجز تین چار معمر قدما کے حیدر مشرب بے قید اور آزاد ہیں۔ یہ دونوں غزالی اور کاہی تو ان آوارہ مشرب شاعروں کے پیشوا اور مقتدا تھے کہ انھوں نے اپنی خباثتوں کو اپنے شاگردوں اور ماننے والوں میں خوب جی کھول کر تقسیم کیا۔ میں جب ان شاعروں کو دیکھتا ہوں تو اس فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں شعرائے متقدمین ایسے ہی نہ گزرے ہوں۔

خواجہ حسین مروی

یہ حضرت شیخ ربانی رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کے فرزند ہیں۔ معقولات کا علم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے حاصل کیا اور شرعی علوم میں خاتم العلماء محدثین شیخ ابن حجر مکیؒ

کی شاگردی کی۔

شعر گوئی، انشاء پردازی، صنائع بدائع، حسن بیان، فصاحت و بلاغت، مزاح و لطافت میں بے نظیر شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے شعر اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ نمونہ کلام:

ای از مژہ بی تو آب رفتہ   وز دیدہ خیال و خواب رفتہ

خود را بما چنان کہ بودی نمودۂ
افسوس آن چنان کہ نمودی نبودۂ

اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے:

گوییم نکو زاہل و فائیم نہ ایم   و اندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چنان   افسوس کہ آنچہ می نمائیم نہ ایم

یہ اسی کے اشعار ہیں:

با ما گرہ چو غنچہ در ابرو فگندۂ
با غیر لب چو پستہ خندان گشودۂ

محبتی کہ مرا با تو ہست می خواہم
ہمین تو دانی و من دانم و خداوند

اکبر بادشاہ نے کتاب "سنگھ سن بتیسی" کا ترجمہ کرنے کا اسے حکم دیا تھا جسے وہ پورا نہیں کر سکا۔ اس ترجمہ پر اس نے جو نعت لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں:

خوش الحان عندلیب باغ ابلاغ   گل نرگس از گل مازاغ
کشیدہ در زبور تیغ بی قیل   قلم بر نسخۂ توریت و انجیل
نبوت را بدر گاہش حوالہ   امام الانبیاء ختم الرسالہ

رباعی

آنم کہ ممالک سخن ملک من است   صراف خرد صیرفئ سلک من است
دیباچۂ کن از دفتر من ورقیست   اسرار دوکون بر سر کلک من است

979ھ/1571ء میں اس نے ہندوستان سے وطن واپس جانے کی رخصت حاصل کی۔ شیخ فیضی نے جو اس کا تربیت یافتہ تھا اس کی تاریخ ''وام ظلہ'' نکالی وہ کابل چلا گیا۔ میرزا محمد حکیم نے اس کی عزت و تکریم کی۔ میرزا کو اس نے ہندوستان کے نفیس کپڑے اور قیمتی سامان کی پیشکش کی۔ دربار میں ایک محرر ان تحفوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ خواجہ حسین نے جلد بازی کر کے وہ کاغذ محرر کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہر کپڑے کی قسم اور نام تفصیل و وضاحت سے لکھنے لگا اور خود ہی اس کی قیمت بھی مقرر کر دی میرزا کو یہ جلد بازی اور اوچھاپن اچھا نہ لگا اور وہ مکدر ہو کر محفل سے اٹھ گیا، اٹھتے ہوئے کہہ گیا کہ یہ سارے تحفے لوگ لوٹ لیں ہم کو نہیں چاہئیں۔ خواجہ حسن کا جلد ہی کابل میں انتقال ہو گیا۔

قاسم ارسلان

اس کا باپ اپنے آپ کو ارسلان جاذب کی نسل سے بتاتا تھا۔ یہ ارسلان سلطان محمود غزنوی کا ایک مشہور امیر گزرا ہے۔ قاسم نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص ارسلان رکھا تھا۔ اس کا اصلی وطن طوس ہے۔ ماوراء النہر میں نشو و نما ہوئی۔ قاسم ارسلان صاحب دیوان، شیریں کلام شاعر اور اچھا خطاط تھا۔ خوش طبع اور خاص و عام میں ہر دلعزیز تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور بے تکلف آدمی تھا۔ تاریخ گوئی میں تو اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

خواہم کہ سر بر آرم در حشر از زمینی
کانجا بناز گیرہ پا ماندہ تاز تیغی

ای نیم جان آمدہ بر لب ترا چہ قدر
جائی کہ یک نگاہ بصد جان برابر است

مجھے یاد ہے کہ یہ آخری مصرع ایک اور غزل میں اس طرح ہے جس کے کہنے والے نامعلوم نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

تا تنگ بست خلوت وصل تو بی رقیب
شرم تو با ہزار رقیبان برابرست

اسی کا شعر ہے:

لفظ و معنی مجال من گرچہ
بی تو چون روی در نقاب کشم

گریان چو بسر منزل احباب گذشتیم
صد مرتبہ در ہر قدم از آب گذشتیم

اس نے اجمیر کے پہاڑ کی تعریف میں جو حضرت خواجہ اجمیری کے مزار کے پاس ہے، مثنوی کہی ہے:

زہی کوہ اجمیر خیر سرشت   مقام سر مقتدایان چشت
چہ کوہی کہ چون سود براوج سر   محیط سپہرش بود تا کمر
نماید جرم مہ و آفتاب   براہ کوہ مانند چشم عقاب
چو خورشید در روی عیان چشمہا   کواکب بود رنگ آن چشمہا
بی نسر طائر گردون شتافت   کہ بر قلہ اش راہ باید نیافت
شود گر ازان قلعہ تنگی رہا   بزیر فلک راز ہم قلعہ ہا
نہ برقست ہر سو درخشان زتیغ   کہ آن کوہ را سود بر چرخ تیغ
ز بالای آن قلعہ گاہ نگاہ   فلک چشمہ و چشم ماہی است ماہ
بہ وصل آن قلعہ چہ شکوہ   ہزاران چو الوند و البرز کوہ
چو برخیزد از دامن آن عقاب   فتد سایہ اش بر مہ و آفتاب
چنین ارسلان رفعت پایہ اش   کہ جا کردہ خورشید در سایہ اش

ملا نے اس سال جب کہ بادشاہ نے اٹک سے آکر لاہور میں قیام کیا تھا، 995ھ/1587ء میں وفات پائی۔

یہاں تک میں نے بلا ترتیب ان چار شاعروں کا اس لیے تذکرہ کر دیا کہ یہ شاعری میں بڑے مشہور اور نامور ہیں۔ اس کے بعد میں جن شاعروں کا تذکرہ کر رہا ہوں ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کرونگا۔

آتشی قندھاری

بابر بادشاہ کے ساتھ ہندستان آیا تھا۔ لشکر میں واقعہ نویس تھا، ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں بھی وہ اچھے عہدوں پر فائز رہا۔ 973ھ/1565ء میں لاہور میں فوت ہوا۔

نمونہ کلام:

سرشکم رفتہ رفتہ بی تو دریا شد تماشا کن
بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن

اسی کا شعر ہے:

خنجر بمیان تیغ بکف چین بہ جبین باش
خونریز و جفا پیشہ کن و بر سر کین باش
از لعل وفا بی خبری را چکند کس   مائل بہ جفا ستمگری را چکند کس
در شفق گشت شب عید نمایان مہ نو
تا کلیم از پی جام می گلگون تک و دو

ہمایوں بادشاہ کی محفل میں ظفر کے قلعہ میں اس نے یہ رباعی کہی تھی۔

رباعی

صد شکر کہ شاہ از غم بیماری است   برخاست و بر مسند اقبال نشست

از صحت زاتش خبری می گفتند المنة لله که به صحت پیوست

اشرف خان میر منشی

مشہد مقدس کے حسینی سیدوں میں سے ہے۔ خوش نویسی میں بڑا ماہر اور 7 قلم کا استاد تھا۔ بادشاہ کے امیروں میں شامل تھا۔ شعر کہتا تھا لیکن شاعری تو اس کے لیے بس ایک تہمت ہی تھی۔ بس طبیعت موزوں تھی۔ چند شعر یہ ہیں:

تارسیدہ زلف ساقی دوران جای
میرسد سنگ ملامت بسبویم چکنم

مائیم بعالم که دل شاد نداریم تا شاد دلی چون دل خود یاد نداریم

رباعی

یارب تو مرا باتش قهر مسوز در خانهٔ دل چراغ ایمان افروز
این خلعت زندگی که شد پاره بجرم از راه کرم برشتهٔ عفو بدوز

رباعی

بیغش نمود چون زر خالص عیار عشق آن به که نقد عمر کنم صرف کار عشق
تا صفحهٔ جمال تو گل گل شگفته است بلبل صفت مراست بدل خار خار عشق

امیر قاضی اسیری

صاحب فضل وکمال شاعر، حکیم الملک کا ممتاز و پسندیدہ شاگرد تھا۔ اپنے زمانہ کا خوش کلام شاعر گزرا ہے۔ چونکہ ہندستان کی آب وہوا اس کے موافق نہ تھی اور بادشاہ کی محفل میں شناسائی کے باوجود کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکا تھا اس لیے ولایت چلا گیا اور اپنے آبائی وطن رَی میں انتقال کر گیا۔ یہ اشعار اس کی بلاغت فکر کا نمونہ ہیں:

قاصد رقیب بوده و من غافل از فریب
بی درد مدعائی خود اندر میانه ساخت

دلی که بر حال من دل شده خندیدن درشت
اضطراب من و خندیدن او دیدن درشت

امروز اضطراب دل من زیاده است   گویا شده بگلشن من گرم خوئی تو

دل خسته ام ز نازک طفلی که روزگار
در دست او نداده بیازی کمال هنوز

امید وصل تو نگذاشت تا دہم جان را   وگر نہ روز فراق تو مردن آسان بود

از غیر کنم شکوه چون آن سیم تن آید
شاید بہوا داری او در سخن آید

ہرگز نرود از دل من ذوق وصالی   کز ناز بمن در سخن و چشم براه داشت

میر امانی بجویہ

یہ کابل کے سید ہیں 981ھ/1573ء میں گھوڑے سے گر کر جونپور میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک نازک اندام محبوب چغتائی سلطان کے مرنے پر ایک تاریخ کہی ہے جو بہت مشہور ہوئی:

سلطان چغتا بود گل گلشن خوبی   لیکن سوی رضوان اجلش راهنمون شد

در موسم گل عزم سفر کرد ازین باغ   دلها ز غمش تہ بہ تہ آغشتہ بخون شد
تاریخ ولی از بلبل ماتم زدہ جستم   در نالہ شد و گفت گل از باغ برون شد

یہ شعر بھی میر امامی کے ہیں:

وصف قدت بالف چون کنم ای نخل حیات   کہ الف ساکن و قد تو بود در حرکات

-- --

دل بہ فکر آن دہان در تنگنائی حیرت است
حیرتش رو دادہ از جائی کہ جای حیرت است

……

غافل از یاد تو ای شیرین شمائل نیستم   گر تو از من غافلی من از تو غافل نیستم

رباعی

اثبات وجود را چہ حاجت بہ بیان   چون خود ہمہ اوست آشکار و نہان
گویند نہ کی غیر بکشائی زبان   نفی چہ کنم کجاست از غیر نشان

رباعی

سجادہ نشین مشعبد چرخ کبود   سیمائی صلاح صبح از رخ نمود
شد بہر قیام راست در نیمۂ روز   چشمین بہ رکوع رفت و دیگر بسجود

میر شرف امان اصفہانی

نہایت با سلیقہ شاعر تھا۔ بیس سال تک ہندستان میں درویشانہ حال میں رہا۔

نمونۂ کلام:

رو بہ سیل سرشکم بسوئی خانہ او
کہ گرد غیر بشوید ز آستانہ او

لعلت کہ آب زندگی ازوی نشان دہد
کو خضر تابہ بیند واز ذوق جان دہد

تابہ تیغت چو امانی سر خود در بازم
جان سپر ساختہ در وصف سپاہ آمدہ ام

بزم وصل تو زان غیر اضطراب ندارم
کہ سوی غیر نظری کنی و تاب ندارم

قاضی احمد غفاری قزوینی

قاضی احمد امام نجم الدین عبد الغفار کی اولاد میں سے ہیں۔ امام موصوف شافعی مذہب کی کتاب ''حاوی'' کے مصنف تھے۔ قاضی احمد بڑے صاحب علم انشاء پرداز مورخ اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ان کی ایک کتاب ''نگارستان'' مشہور ہے، جس میں نہایت عجیب و غریب حالات لکھے ہیں۔ بلا شبہ ایسا دلکش و نادر مجموعہ اس دور میں کسی اور نے پیش نہیں کیا۔ تاریخ پر ان کی تصنیف ''نسخ جہان آراء'' ہے جس میں حضرت آدم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک کے حالات اجمالاً بیان کیے ہیں۔

آخر عمر میں سلاطین عراق کی وزارت سے استعفیٰ دے کر بیت الحرام کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور حج کی سعادت حاصل کر کے بندرگاہ داتل سے ہندستان آنا چاہتے تھے کہ اجل نے گریباں پکڑ لیا۔ 975ھ/1567ء میں فوت ہوئے۔

یہ شعر ان کا ہے:

پس از عمری نشیند گرد می در چشم آن بدخو
تپد دل در برم ترسم کہ ناگہ زود برخیزد

میر اشکی قمی

اس کے اشعار میں خیال آفرینی نہایت بلند ہے۔ آصفی کی پیروی کرتا ہے۔ آگرہ میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:

از بس کہ سنگ بر سر زد بی تو سینہ چاکی
آن سنگ در کف او گردید مشت خاکی

بی سنگ تہمت بر سر من دل تنگ خواہم زد   اگر دستم رود از کار بر سنگ خواہم زد

شمعت تقصیر وار شبا بندہ می شود
صد بار اگر سرش ببری زندہ می شود

مستانہ کشتگان تو ہر سو فتادہ اند   تیغ ترا مگر کہ بہ می آب دادہ اند

بسکہ تن بگداخت بی روز آتش سودا مرا
گرہی زنجیر بر گردن فتد در پا مرا

کہتے ہیں جب مندرجہ بالا مطلع کو میر اشکی نے قندھار میں مولانا صادق کے سامنے پڑھا تو انھوں نے کہا: "تم نے یہ مضمون امیر خسرو سے اڑایا ہے"۔

خسرو نے کہا ہے:

بسکہ بگداخت ز ہجرت تن پرور سودائم
گرہی طوق بگردن فتد اندر پایم

اشکی کا ایک اور شعر ہے

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بدارم قدم
زہر مو بر تن آید سنگ و تلخہ اندر یارم قدم

اس نے "سنگ" پر اتنے مضمون باندھے ہیں کہ کسی اور کے لیے گنجائش نہیں رہی

از غم میان سگان بین بجوی خود
وین ایک بسوی خود نشد آن یک بسوی خود

موی ژولیدہ کہ آید ز سر من تا پا   زان میان موئی سفید نیست تن کن پیدا

یول قلی انیسی

شاملو ترکمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خان خاناں کے یہاں ملازم ہے۔ نہایت نرم و ملائم اشعار کہتا ہے۔ ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے

آتش کدہ است دل ز خیال تو در برو
داغ تو ہندوی کہ نگہبان آتش است

……

چو بینی شعلہ را مضطرب آتش پرستی دان   کہ روحش رفتہ و جسمش در آتش خانہ می رقصد

……

عشق و مقناطیس یک جنس اند کز دل تا وکش
تا برون می شد محبت جذب پیکان کردہ بود

ملا غنی امنی

نو رسیدہ جوان ہے۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پہلے خوفی تخلص رکھا تھا۔ خواجہ مرحوم نے بدل کر "امنی" رکھوا دیا۔ اب بڑے شاہزادے کی خدمت میں رہتا ہے۔

نہایت خوش طبع شاعر ہے۔ یہ رباعی اسی کی ہے

منم کہ غیر غم اندوختن نمی دانم
تمام اشکم و واسوختن نمی دانم
ہنوز خاطر اگر روشناس خورشیدم
چراغ بخت خود افروختن نمی دانم

اختری بدخشی

اسم بامسمّٰی ہے "فتوحات" اور "فصوص الحکم" کی چند گمراہ کن باتیں یاد کرلی ہیں۔ چونکہ فرعون کے ایمان کے بارے میں ہر ایک سے بحث کیا کرتا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو "وکیل فرعون" کا خطاب دے دیا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

گفتی وفا کنیم باحباب یا جفا
ای شوخ بندۂ سخن اولیم ما

الفتی قلیج خان

"جان قربانی" نامی گروہ سے متعلق ہے۔ علمی اور عملی ہنر سے آراستہ ہے۔ اس وقت پنج ہزاری امیر ہے۔ دین کے بارے میں اس کا اعتقاد درست ہے۔ کچھ عرصہ تک "عمدۃ الملک" کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ ان دنوں کابل کی حکومت پر مقرر ہے۔ طبیعت میں شعر و نظم کا اچھا سلیقہ اور ملکہ ہے۔

نمونۂ کلام:

تازہ عارض آفتاب من نقاب انداختہ
ذرہ سان خورشید را در اضطراب انداختہ

کشتۂ آن نرگس مستم کہ در عین خمار

عالی را کشتہ و خود را بخواب انداختہ

دو نرگس مست تو آشوب عقل و دین ہستند
کمان کشیدہ ز ہر گوشہ در کمین ہستند

نیست در دل غنچۂ پیکان آن قاتل مرا   بی لبش خونی کہ خوردم شد گرہ در دل مرا

الفتی یزدی

علوم ریاضی میں بڑا ماہر تھا۔ خان زمان کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ انکی ہنگاموں میں گرفتار ہوا۔ اگر چہ قتل ہونے سے بچ گیا لیکن موت سے جان نہ بچا سکا۔

اس کا ایک مطلع ہے۔

تا گرد صفت دامن یاری نگرفتیم
از پا نہ نشستیم و قراری نگرفتیم

اس مطلع پر خان زمان نے ایک ہزار روپیہ بطور انعام کے دیا تھا۔

مشت خاشاکیم و داریم آتشی ہمرہ خویش
دور نبود گر بسوزیم از شرارہ آہ خویش

الفتی عراقی

کچھ عرصہ تو وہ کشمیر میں میرزا یوسف خان کے پاس رہا، وہاں اس نے ایک "شہر آشوب" کہا تھا جس کا شعر یہ ہے۔

سر موی موشک پر ان درخت شعراست
قد جوزا و بروت سرطان را عشق است

اس شہر آشوب میں میرزا یوسف خان کے ایک محبوب کے متعلق کہا تھا:

مرزا یوسف خاقان زمان را عشق مست
عشق پاک تو وخطا دگران را عشق مست

بیرم خاں خان خاناں

بیرم خاں مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں سے ہے۔ دانائی، سخاوت، خلوص، حسن اخلاق، نیازمندی و انکساری میں کوئی اس کی مثال نہ تھا۔ ابتدا میں وہ بابر بادشاہ کے ساتھ رہا۔ پھر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں ترقی کی اور خان خاناں کا خطاب پایا۔ اکبر بادشاہ نے اس کے القاب میں ''بابا ام'' کا اضافہ کر دیا۔

بیرم خاں فقرا اور درویشوں کا معتقد، خود صاحب حال اور خوش خیال آدمی تھا۔ یہ اس کی کوشش، بہادری اور حسن تدبیر تھی کہ ہندستان دوسری بار مغلوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور ایک مضبوط سلطنت قائم ہو سکی۔

اس کی فیاضی کا ایسا شہرہ تھا کہ دور دراز سے اہل علم و فضل آتے تھے اور اس کی بارگاہ سے مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ ایک دنیا اس کی شخصیت پر ناز کرتی تھی۔ آخر زمانہ میں دشمنوں نے اکبر کو اس سے بدظن کر دیا۔ پھر اس کا جو حشر ہوا وہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

نمونہ کلام:

رباعی

ارباب فنا بلند و پست ایشا نند — وز جام بقا مدام مست ایشا نند
ای کوی تو کعبہ سعادت ما را — روی روئی تو قبلہ ارادت ما را
خوش آنکہ بجذبۂ عنایت سازی — وارستہ ز قید رسم و عادت ما را

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:

شہی کہ بگذرد از نہ سپہر افسراو — اگر غلام علی نیست خاک بر سر او
محبت شہ مردان مجو ز بی پدری — کہ دست غیر گرفت است پای مادر او

ایک اور قصیدہ اضطراب کے بارے میں کہا ہے:

آن چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار   آن بدر کز میانہ شہا بش کند گزار
با آنکہ می کند بہ مہ و خور برابری   آمد بجان زحلقہ بگوشان شہر یار
نادر بہ چشم کوکب آفتاب را   چون مہچہ لوای شہنشاہ تامدار
پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست   ہمچون نگین خاتم شاہ جم اقتدار
بر کف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی   تا بر قدوم اشرف شاہان کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایون کہ از شرف   بر درگہش سپہر نہد روی افتقار

کہتے ہیں ایک رات ہمایوں بیرم خان سے گفتگو کر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے بیرم خان پر غنودگی طاری ہوگئی۔ بادشاہ نے ہوشیار کرنے کے لیے "او بیرم میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہا"۔ بیرم چونک اٹھا اور کہا: "ہاں بادشاہ سلامت میں حاضر ہوں"۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے آنکھوں کی، درویشوں کے سامنے دل کی اور عالموں کے سامنے زبان کی حفاظت و احتیاط رکھنی چاہیے، میں اس فکر میں گم تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی اور عالم بھی۔ میں آخر کن کن چیزوں کی حفاظت کروں۔ ہمایوں کو اس کا یہ جواب بہت پسند آیا اور بڑی تعریف کی۔

بیرم خان 968ھ/1550ء میں پٹن، گجرات میں شہید ہوگیا۔ اس کی ہڈیاں، وصیت کے مطابق مشہد میں لے جا کر دفن کی گئیں۔

بیکسی غزنوی

نہایت فاضل و کامل شخص تھا۔ حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر ہندستان آیا۔ عرب میں حدیث کی بعض کتابیں "مشکوٰۃ" وغیرہ پڑھیں اور میر مرتضیٰ شریفی سے سیرت و شمائل نبیؐ کا درس لیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے وطن لوٹ آیا لیکن بمقام پشاور 973ھ/1565ء کو انتقال ہوگیا۔

نمونۂ کلام:

در دیر و کعبہ جز بتو مائل نبودہ ام　　　ہر جا کہ بودہ ام ز تو غافل نبودہ ام
فلک با رسم بی مہری نہ در دوران ما بودہ　　　کہ دوران فلک تا بودہ بی مہر و وفا بودہ

قطعہ

بی کسی گر شنود طعنۂ دشمن صد بار　　　نا کسی آنست کہ آشفتہ و در ہم نشود
زآنکہ این بیت کمال است بعالم مشہور　　　این چنین بیت چرا شہرہ عالم نشود
سنگ بد گوہر اگر کاسۂ زرین شکند　　　قیمت سنگ نی فزاید و زر کم نشود

رباعی

ای دل تو عنان بہ غصہ و غم ندہی　　　یک لحظہ خوشی بہ مملکت جم ندہی
یاری اگرت بدست افتد زنہار　　　خاک قدمش بہر دو عالم ندہی

مولانا بیکسی نے لکھا ہے کہ " ایک دن غفران پناہ ہمایوں بادشاہ نے دار الخلافہ دہلی میں ایک محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے خاص خط میں لکھا تھا:

شنیدہ ام کہ برین طارم زر اندود است
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است

اتفاق کہ ہمایوں کا کچھ ہی دن بعد انتقال ہو گیا اور اسے اسی محل میں دفن کیا گیا۔ یہ ہمایوں کی کرامت ہی کہی جا سکتی ہے۔

مولانا بیکسی پر کسی نے یہ واقعہ لکھ کر حسب ذیل قطعہ بھی درج کر دیا جو لکھتے ہوئے موزوں ہو گیا تھا۔

قطعہ

درین کہ شاہ ہمایون بوقت رحلت خویش　　　نوشت بر در سر منزلی کہ ساکن بود
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است　　　بحسن کہ عاقبت خود اشارتی فرمود

چو شد بحکم قضا مدفنش ہمان منزل   کہ بود قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود
بناء بدین پی تاریخ رحلتش گفتم
بنای منزل سلطان عاقبت محمود

باقی کولابی

شاعرانہ طبیعت رکھتا تھا۔ یہ اشعار اسی کے ہیں:

زفرقت تو گرفتار صد الم شده ام
تو شاد باش کہ من جلای غم شده ام

خوبان اگر ندانند امروز قدر ما را   دانند قدر ما را فردا کہ ما نباشیم

بچشم گاه خون دل گہی خون جگر بست
من غم دیده راہی روی او راو نظر بست
نگردد ہیچ سرو آزاد در باغ جہان ہرگز
چو نرگس ہر کہ او چشم طمع در سیم وزر بستہ

باقی کافی عرصہ تک ہندستان میں رہا۔ معصوم کابلی کی بغاوت میں مارا گیا

بیاضی

یہ آگرہ میں ایک آزاد مشرب وارفتہ شخص تھا۔ اس کا مطلع ہے:

ہر کہ بر از وصل آن سرو سمن بر خورد
از خوشی طالعست طالع خوش بر خورد

اس نے ایک رباعی میں کاہی اور غزالی کا محاکمہ کیا ہے:

کاہی و غزالی آن دو لا یعقل مست   در غیبت جامی و نوائی زده دست
در دہر کسی بے مثل ایشان نگذشت   کاہی چہ کس است وہم غزالی چہ سگ است

پیروی

خواجہ آصفی کا پیرو ہے۔ مصوری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ صورت سے حقیقت کی طرف کھینچ لے جانا اس کا فن ہے۔ اس نے ایک رسالہ ''صورت و معنی'' بھی لکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

خداوند از معنی تنگ و ستم بہ بخشای کہ بس صورت پرستم
ز لطف خویشتن ای ایزد پاک چنان سازی بصورت خانۂ خاک
کہ ہر صورت مرا کز دیدہ آید بسوی معظم روی نماید

پیروی کے اور شعر یہ ہیں:

بی درد را شراب محبت کجا دہند
کیفیتی است عشق بتان تا کرا دہند

خواب دیدم یار قہرش در دل افتاد اضطراب مردہ بودم دید اگر بیداری گشتم ز خواب
نظر چون افگنم وقت تماشا بر مہ رویش عتاب آلودہ بیند سوی من تا بنگرم سویش
دزدیدہ چون نگاہ بان تا زمین کنم چون بنگرد ز شرم نظر بر زمین کنم
طفل اشکم برہ یار سر خویش نہاد خوش چہ پیمانہ درین رہ قدمی پیش نہاد
ناز پرودہ چو تاب ستم عشق نداشت یار را نام جفا پیشہ و بد کیش نہاد
رفتم در اضطراب چو از من جدا شود کان سے صیاد باد گری آشنا شود

اس کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ہندستان میں فوت ہوا۔

بقائی

ولایت، ایران سے نیا نیا آیا ہوا ہے۔ دکن میں ملک قمی شاعر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں سے گجرات پہنچا اور میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہنے لگا۔ پہلے اس کا تخلص مشغولی تھا، مرزا نے بدل کر بقائی رکھ دیا۔

اس کے اشعار میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے حالات با وضع و متوازن ہیں:

تا عشق ز مژگان بتان نیشتر آورد   خون از رگ و از ریشۂ من جوش بر آورد
فریاد کہ تا چشم زدن تیر خیالش   در دیدہ فرو رفت و سر از دل بر آورد

بجای اشک از چشم دل افگاری بارد
ہمہ خون جگر زین ابر آتش باری بارد

مرغ دل تا صید چشم او شکار انداز بود   ہر سر مو بر سرم چون مرغ در پرواز بود

اس نے اب خان خاناں کی ملازمت ترک کر دی ہے۔ کہتے ہیں آگرہ آیا ہوا ہے اور لاہور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ملا نورالدین محمد ترخان

پہلے نوری تخلص کرتا تھا۔ چند سال تک سرہند کے علاقے میں سفیدون نامی پرگنہ کا جاگیر دار رہا اس لیے سفیدونی کے نام سے مشہور ہوا۔

علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور حکمت میں بڑا ماہر و ممتاز تھا۔ ہمایوں کا ہم راز اور ہم سخن مصاحب تھا۔ اسی دربار سے اسے ترخان کا خطاب ملا۔ سخاوت و فیاضی اور مجلس آرائی میں بے مثل آدمی تھا۔ شعر کہنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

ایک دن فتح پور میں چوگان بازی کے میدان میں ایک ہاتھی نے اسے زخمی کر دیا۔ کہا کرتا تھا: ''گواہ رہو کہ میں نے اس اذیت و پریشانی میں بعض باتوں سے توبہ کر لی ہے''۔ لوگوں نے بہت کچھ معلوم کرنا چاہا کہ آخر کن باتوں سے توبہ کی؟ لیکن کسی خاص بات کا ذکر نہ کیا۔ اس وقت میں نے کہا: ''پہلی وہ چیز جس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ شعر ہی ہے مگر اس کو یہ پتہ نہیں میرا فقرہ پسند آیا یا نہیں لیکن دوسرے بہت خوش ہوئے۔

اس نے اپنے عہد حکومت میں جمنا سے ایک نہر کھدوائی تھی جو پچاس کوس تک کرنال بلکہ اس سے بھی آگے تک جاتی تھی۔ اس نہر سے اس علاقہ میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوش حال ہوگئی۔ یہ نہر اس نے شہزادہ سلیم کے نام پر بنائی تھی۔ اس نہر سے اس علاقے میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوشحال ہوگئی۔

بعد میں اس کے حالات بہت ابتر ہو گئے اور اس نے بڑی مصیبتیں اور غم برداشت کیے۔ جس وقت اکبر بادشاہ 994ھ/1586ء میں اٹک تشریف لے گئے تھے تو اسے دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کا متولی بنا دیا تھا۔ اسی جگہ اس نے انتقال کیا۔

نمونۂ کلام:

دل تنگ دور ازان لب خندان نشستہ ام
مانند غنچہ سر بگریبان نشستہ ام

……

زروی مکرمت وز راہ احسان   بہ ترخاں داد خانی شاہ عادل
ازین خانی ہمین نامیست بروی   ازین نام شگرف او را چہ حاصل
زتر خانی ہم او را شکوہ ہست   بہ نزد خسرو دانای کامل
کہ غیر از خان خشکی می نماند   ز ترخانی تری گردد چو زائل

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے حکیم مرزا پر لشکر کشی کی تھی خان مذکور حکم عدولی کر کے 989ھ/1581ء میں پنجاب سے لوٹ کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ بس یہ بات بادشاہ کی بد گمانی کا سبب بن گئی۔ جب اکبر اس سفر سے واپس آیا تو فتح پور میں شاہی عتاب میں رہا اور حساب کتاب کے سلسلہ میں چند سال تک سزائیں بھگتتا رہا۔

واقف کار لوگ اس کے زوال کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ تاتار خان جو دہلی کے حاکم تھے، سے ان کی مخالفت تھی۔ اس نے تاتار خان پر ایک ہجو کی اس ہجو میں دہلی کے بزرگوں کی شان میں بھی بے ادبی کر گیا۔ بس اسی بے ادبی کی وبا اس پر پڑی تھی۔

اس نے یہ ہجو قاسم کاہی کے نام سے منسوب کر کے مشہور کرا دی تھی۔ جس کے شعر یہ ہیں:

مفتی دہلی ست میان خان جہان ‎ مفت نداده است فتاوات
حاکم شہرست ز تاتار خان ‎ خادم او چہرہ حارات

اسی ہجو کا مطلع:

آہ ز دہلی و مزارات ‎ دادہ ز خرابی عمارات

اسی ہجو میں 250 شعر ہیں۔ دہلی کے ایک فاضل بزرگ جن کا نام شیخ محمد کنبو تھا ان تمام شعروں کا جواب بس ایک ہی شعر میں دے دیا۔

قطعہ

نورالدین لادہ پدر او ازین
زادہ چنین لادہ زلاوات
چک زدہ آن ابلہ بیہودہ گوی
لیس جواب بخرافات

اسی زمین میں مولوی نور الدین عبد الرحمن جامی کا قطعہ ہے:

آہ من العشق و حالات
احرق قلبي بحرارات
ما نظر العين الی غیر کم
اقسم باللہ و آیات

کہاں مولانا نورالدین جامی اور یہ نورالدین جو اپنے آپ کو جامی سمجھنے لگا تھا:

گرچہ ہمکار بانیان زہم تالی چہ سود
یک مسیح ابرای اکمہ کرد و دیگر اعور است

بہرحال آدمی لائق تھا، ممکن ہے اپنے کیے پر پشیمان ہوا ہو اور اللہ تعالی اس کی ان مصیبتوں اور دکھوں کو اس کی غلطیوں کا کفارہ بنا دے۔

جب نورالدین اپنے عہدہ سے معزول ہو کر آگرہ آیا ہوا تھا۔ ایک دن میں بازار جا رہا تھا کہ وہ اچانک سامنے سے نمودار ہوا۔ میرے ساتھیوں میں سے میاں کمال الدین حسین شیرازی نے جو نہایت خوش مزاج ظریف آدمی تھا اور آگرہ کے ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، نور الدین سے کہا: ''نواب خان دہلی کے بزرگوں کا نام تو آپ نے لے لیا، اب اگر آگرہ کے بزرگوں پر بھی جناب مہربانی فرمائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگرہ کے بزرگوں میں کوئی قابلیت نہیں پاتے کہ ان کا تذکرہ کریں'' میری بات پر وہ ہنس دیا اور کہا: '' وہ ایک بہتان ہے جو مجھ پر باندھا گیا ہے''۔

تروی اودھ

ماوراءالنہر کا رہنے والا ہے۔ لطیف الطبع آدمی ہے۔ پہلے الغ میرزا کے مصاحبوں میں تھا۔ جس زمانہ میں ان میرزاؤں نے بھڑوچ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا اس نے یہ رباعی کہی تھی۔

اولاد عمر کہ در شجاعت فردند
شد فتح بہر کجا کہ رو آوردند
کردند چو فتح بھڑوچ از روی ستیز
تاریخ شد این کہ فتح بھڑوچ کردند

توسنی

اس کا نام منوہر ہے۔ سانبھر کے راجہ لون کرن کا بیٹا ہے۔ سانبھر کا نمک زار مشہور ہے توسنی کے کلام میں بھی بڑی ملاحت پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کا سارا نمک بس اسی کے کلام میں بس گیا ہے۔

توسنی نہایت خوب صورت لور ذہین شاعر ہے۔ پہلے اس کا نام محمد منوہر تھا بعد میں بادشاہ نے اسے میرزا منوہر کا خطاب دیا لیکن اس کا باپ باوجود ہندو ہونے کے اسی نام محمد منوہر پر فخر کرتا تھا۔ اگرچہ ''محمد'' جیسے ناموں سے نسبت اکبر کو پسند نہ تھی۔ توسنی نہایت

موزوں طبع تھا جس کا اندازہ اس کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے:

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

رباعی

ای عشق تو در جگر لبالب نار است　　ای درد تو در سرم سراسر خار است
بت خانہ و کعبہ ہر دو نزدم کفر است　　مارا بہ یگانگی ایزد کار است

جس وقت بادشاہ نے اس کا تخلص رکھا تھا اس نے چند شعر کہے تھے:

شربت آشنا مامیا در بزم ما دردی نشان
کز جگر در کف کباب و خون دل در ساغر است
ننگ مردان است حرف از جان و دل گفتن بعشق
دل چو خون سخت بستہ جان چو باد صرصر است
توسنی سردہ سمند شوق در میدان عشق
کی رسی ایمن بمقصد رہبرت چون اکبر است

ایک ہندو سے یہ جودت طبع اور کمال شعر کا ظاہر ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے

قدروی اکبری

مولانا نرگس کا بھانجہ ہے۔ لطافت طبع اور ذہانت میں ممتاز تھا۔ بیرم خان کے عہد اقتدار میں روم سے ہندستان آیا اور اسی کے یہاں تربیت و ترقی پائی۔ ایک پہاڑی لڑائی میں اتکہ خان نے اسے قید کرلیا اور اکبر خان کے ساز و سامان و ساتویں امام علی رضا کے جھنڈے کے ساتھ اسے بھی مال غنیمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو اس کا کلام نہایت ہی پسند آیا۔

اس نے "حسن و یوسف" کے نام سے ایک رسالہ اتکہ خان کے لڑکے یوسف محمد

خان کے نام پر لکھا تھا جس کا مطلع ہے:

بنام آنکہ روی دشمن و دوست
بہر جانب کہ باشد جانب اوست

محبوب کے حسن کی تعریف اس مثنوی میں اس طرح سے کی ہے:

رخش آئینہ گردون است عاج پری رویان بان آئینہ محتاج
کفش چون آفتاب آئینہ نور شعاع آفتاب انگشت آن حور

اس نے عماد کے "دہ نامہ" کا بھی جواب کہا تھا، جس کے چند شعر ہیں:

از حسرت لعل آبدارت وز فرقت زلف تابدارت
موئی شدہ جسم ناتوانش در جسم نماند و جای جانش

صبح کی تعریف میں لکھتا ہے:

خاکستر صبح رفت بر باد
در چہرۂ صبح آتش افتاد

چند اور شعر:

سر بزانو چو نہم در ہجر آن پیمان گسل
تودۂ خاکستری گردد تنم از سوز دل

بادشاہ کے حکم سے اس نے ہاتھی کی تعریف کی تھی:

زخاک رہ شاہ گردون سریر پی عطر بر خود فشاند عبیر
عقاب فلک بر سرش بی گزاف بود پشۂ قلعۂ کوہ قاف

975ھ/1567ء میں چوروں نے اسے تلوار مار کر شہید کر دیا اور آگرہ میں دفن ہوا۔

تشبیہی کاشی

دو تین مرتبہ ہندوستان آ کر چلا گیا۔ اس زمانے میں آیا ہوا ہے اور بے دینی کو بڑھاوا دینے میں معروف ہے۔ یہی خانی مسلک کا داعی ہے۔ اپنے آپ کو شیخ ابوالفضل سے بڑا مجتہد

سمجھتا ہے۔ توسل و سفارش سے دربار میں باریابی حاصل کر لی ہے اور اکبر کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا ہے جس میں بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یک سو ہو کر تقلید پرستوں کو بالکل ختم کر دو تا کہ حق اپنے مرکز پر پوری طرح استوار ہو جائے اور خاص توحید فروغ پائے۔ اس نے ایک رسالہ شیخ ابو الفضل کے نام سے منسوب کیا ہے جو حروف و نقطوں کی کرتب بازی کا نمونہ ہے اور اس میں عددی مناسبتیں پیدا کی ہیں۔

حکیم عین الملک نے اس کے تخلص "تشبیہی" کے اعداد لفظ تزریقی، کے مطابق نکالے ہیں جو اس کے مکر و زرق سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کی بکواس کا نمونہ یہ ہے:

بگی بر خود ببال آن خاک گورستان زشادابی
کہ چون من کشتۂ زان دست و خنجر در لحد داری
تو ہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش
کہ من آن جلوہ قدی شناسم

در دست این جہان و آن جہان پوچ
کہ چہ در دست تست این پوچ و آن پوچ

اس نے شیخ ابو الفضل کی محفل میں محمود بسی خوانی کا رسالہ مجھے دیا تھا، جس کا دیباچہ یہ تھا:

"یا اللہ المحمود فی کل مقالہ استعین بنفسک الذی لا الہ الا ھو الحمد للہ الذی وجد نعمہ بوجود کلیاتہ و اظہر رجود الکلیات من نفسہ سہوبہم کلیا و ھو یعلم نفسہ ولا نعلم نفوسنا د لاھو وھو کون لایکن الایہ و مکان لا بغیرہ وھو ارحم الراحمین"۔

سوال: یہ جو "خلق" کہا جاتا ہے وہ کون ہے؟

جواب: یہ جو "خلق" کہا جاتا ہے وہ اللہ ہے۔

اس کے منہ میں خاک دیکھو کیسی بکواس کی ہے۔ اس کے مذہبی جعل کا چار لفظوں پر

انحصار ہے، جنھیں اس نے رسالہ کے آخر میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ ''کتب مکرالکرار بجانب عجمی مجتہدی طبارع ای کرب لست ش ب ی، ی انوی اخروی صاحب مقام'' بقیہ رسالہ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

تقی الدین شوستری

ابھی ابھی شاہی دربار میں شامل ہوا ہے۔ علوم عقلی و نقلی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ شعر بھی اچھے کہہ لیتا ہے۔ طبیعت موزوں اور شاعرانہ ہے۔

نمونۂ کلام:

گر دست مدہدم کہ بردیم نظر کنم
باری دہان بیادلبت پر شکر کنم
با آنکہ ہیچو سبزہ بجائم نشاندۂ
دست و دلی کجاست کہ خاکی بسر کنم

ان دنوں وہ بادشاہ کے حکم سے شاہنامہ کو نثر کا جامہ پہنا رہا ہے، گویا مخمل کو ٹاٹ میں بدلنے میں مصروف ہے۔

ثانی خان ہروی

بڑے قدیم امیروں میں سے ہے۔ دانائی، تدبر اور حسن ذوق میں مشہور ہیں۔ اس کے پاس جب کسی شخص کے علم و فضل کی تعریف کر کے پیش کیا جاتا ہے تو وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہتا تھا کہ: ''ہمارے ساتھ دوستی اور محبت کی شرط یہ ہے کہ ہمارے متعلق کمینوں اور اوباشوں کی کہی ہوئی باتوں پر کان نہ دھرو، کیونکہ یہ لوگ خلوص کے دشمن اور نفاق کے بانی ہوتے ہیں، تاہم اس نے اپنا دیوان مکمل کر لیا ہے''۔

نمونہ کلام یہ ہے:

ای رسم تو آزار من و قاعدہ بیداد
بیداد ازین رسم و ازین قاعدہ فریاد

بگذر ز نا خوش کہ درین دیر دیر
نیکی ندید ہر کہ بدی کرد با فقیر

رباعی

دیدم ز فراق آنکہ یعقوب ندید
در عشق کشیدم آنچہ مجنون نکشید
این واقعہ کز ہجر تو آمدہ بسرم
فرہاد گمان بزد و وامق نشنید

ثانی خان کا اصل نام علی اکبر ہے، شاید یہی نام کی مناسبت ہے کہ اس نے بھی الحاد و بے دینی کی تائید میں رسالے لکھے ہیں اور فن نقط کی مناسبتیں پیدا کر کے بادشاہ کو اور شاید خود کو وہ شخصیت سمجھتا ہے جو لفظ ”شخص“ کے اعداد کے مطابق 990ھ/ 1582ء میں آنے والی ہے۔ محمود پسی خوانی کے عقائد بھی ان رسالوں میں بیان کیے ہیں، انھوں نے تصوف پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ یہ مزاحیہ مصرع ای کا ہے:

احسر جم بحر جم اجر تجاما مصدر

غالباً آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی۔

ثنائی مشہدی

اس کا نام خواجہ حسین ہے۔ ابھی وہ ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی، چنانچہ یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو مصرع طرح بنا کر محفل سخن منعقد کیا کرتے

تھے اور ہر مشاعرہ میں اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ بلا اختلاف سب اس کی استادی کے قائل تھے، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد کی آگ نے عقیدت کو جھلسا کر رکھ دیا اور وہ بے چارہ گمنامی کے ایک گوشے میں لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بنا رہا۔

اس کا دیوان مشہور ہے۔ ایک بہت اچھی مثنوی بھی لکھی ہے۔ کوئی بڑا عالم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی نثر اس کے قصیدوں کی طرح شاندار نہیں، شاعرانہ ذوق نہایت بلند ہے۔ بجز توحید و منقبت کے تمام اصناف سخن میں بڑی مہارت حاصل ہے، اسی کا شعر ہے:

چنان ناز بارد زپا تا سرش
کہ رفتن تواں ناز از بسترش

مگر اس کے استاد کے اس شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے:

عشوہ دم انداز زمین ناز فشاند از ہوا
طرز خرام کردن و پا بزمین نہادنش

نمونہ کلام:

گر مثل جا کند در پیش آئینہ شخص   بیند تمثال خویش تافتہ رو بر قفا
بسکہ از خانہ غم بروں ریزم   تنگی خانہ از بروں در است

جدائی

نام میر سید علی ہے، یہ مصور بھی ہے اور کئی حیثیتوں کا مالک ہے۔ اس کی ہر تصویر شاہکار ہے۔ ہندستان میں وہ اپنے دور کا مانی ہے۔ داستان امیر حمزہ جو مصور 16 جلدوں میں ہے اس کے سرپرستی میں مکمل ہوئی۔ اس کی ہر جلد ایک گنجینہ اور ہر ورق ایک مرقع اور صفحہ منقش ہے۔

شاعری میں اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

صبح دم خاردم از حسدی گل میزد   ناخنی در دل صد پارۂ بلبل میزد

حسن بتان کعبہ ایست عشق بیابان او   سرزنش ناکسان خار مغیلان او

جذبی

نام بادشاہ قلی ہے۔ شاہ قلی خان نارنجی کا بیٹا ہے۔ موزوں طبع شاعر ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

این چاشنی کہ حسن ازل با بتان دھد
جائی رسید عشق کہ بی درد جان دھد

اس کے باپ شاہ قلی خان کی رباعی ہے:

گاہ توبہ و گاہ کوزہ می شکنم
یکبار دوبارنی پیاپی شکنم
یارب زھد آموزی نفسم برہان
تاچندکنم توبہ و تاکی شکنم

پٹنہ کے سفر سے واپسی پر ایک دن راستہ میں جذبی، قاضی شمس الدین قزوینی اور بعض نے نئے شاعر حسین ثنائی کہ اس شعر پر:

گر بشکل جائی در پس آئینہ شخص
بیند تمثال خویش تافتہ روبر قفا

بحث کر رہے تھے، میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے اس شعر کا جس پر اختلاف تھا مجھ سے مطلب دریافت کیا۔ میں نے کہا ''اب تو یہ معاملہ ہوگیا ہے کہ یار لوگ شعر اور 'ستجال' میں فرق نہیں کر پاتے''۔

یہ ستجال، سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں ایک مسخرہ تھا جو بڑا باتونی اور زبان دراز تھا۔ عالموں کا لباس پہن کر یعنی عبا اور عمامہ پہن کر علما کی محفلوں اور مدرسوں میں طالب علموں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جاتا اور پہلے نہایت معقول عالمانہ انداز میں مناظرہ اور مباحثہ شروع کر دیتا۔ جب لوگ اس کی تقریر سے متاثر ہوتے، پھر وہ بحث میں مہمل اور بیہودہ باتیں خلط کر دیتا جس سے عالم اور شبہ میں پڑ جاتے۔

جمیلی کالپی وال

اس کے والد شیخ جلال واصل تھے جو شیخ محمد غوث کے خلیفہ ہیں اور سرود وسماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ جمیلی کو اپنے باپ کی یہ کیفیت وحال تو نصیب نہ ہوا لیکن وہ حصول علم اور ذوق شعر سے محروم نہ رہا۔ اگرچہ اس کے اکثر اشعار مضحکہ خیز ہیں یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

گر شادیِ وصل تو مرا دست نداد
باری بہ غمت خاطر خود شاد کنم

اس نے حاکم کالپی قاسم علی خان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بود نسبت تو بہ خیل خواتین
بسی نا ملایم بسی نامناسب

اس کا بڑا بھائی شیخ فضیل ہے جسے عربی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اس نے عربی میں بڑے فصیح شعر بھی کہے ہیں۔ اس نے معین الدین طنطرانی کے جواب میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:

یا جمیل الوجه وجهی عن قدیم الحال حال
راح روحی بالنوی والدمع کالسلسال سال

ایک دن اس نے یہ مطلع پڑھ کر سنایا۔ چونکہ یہ دونوں بھائی ہمنام ہیں، میں نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے اس مطلع میں اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا ہے" اس جملہ پر وہ بہت ہنسا۔

طنطرانی کے قصیدہ کا مطلع ہے:

یا خلی البال قد بلبلت بالبلبال بال
بالنوی زلزلت قلبی فهو بالزلزال زال

شیخ فضیل نے شیخ فیضی کی تفسیر پر عربی نثر ونظم میں جو "توقیع" لکھی ہے وہ اس کے علم وکمال کا واضح ثبوت ہے۔ ان دنوں دونوں بھائی لاہور سے اپنے وطن کے لیے رخصت ہوگئے ہیں۔

چشتی

شیخ حسین صوفی نام ہے، وطن دہلی ہے۔ چونکہ وہ شیخ سلیم چشتی کا مرید تھا، اس لیے یہ تخلص رکھا تھا۔ فتح پور عرف سیکری کی خانقاہ کے صوفیوں میں شامل تھا۔ اس کا ایک دیوان ہے اور چند دوسری تصانیف بھی ہیں۔ جن میں ایک کتاب "دل و جان" کے نام سے نظم میں لکھی ہے۔ مگر اس میں ہندستانی رنگ ہے اور مضمون بھی اس کا اپنا نہیں بلکہ تقاضی استاد میر علی کی کتاب "حسن و دل" سے لیا ہوا ہے جس میں تقاضی نے خوب داد سخن دی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے چشتی کی "حسن و دل" مزید ذکر بے فائدہ ہے۔ اس کے کئی ہزار اشعار ہیں، اگر کوئی شعر قابل ذکر ہے تو بس یہ مطلع ہے:

چنین کہ با پر طاؤس قیس را محملی است
مگر کہ از اثر پائی ناقہ لیلی است

جعفر

ہرات کے سیدوں میں سے ہیں۔ شعر اور فن معمہ گوئی میں خاصا سلیقہ رکھتا ہے۔ اتکہ خان کا میر بخشی تھا۔ اس نے میرزا عزیز کے نام پر ایک غزل معمہ میں لکھی ہے۔

نمونہ کلام:

شانہ برہم زدہ آن سلسلۂ مشکین را
آہ اگر باد بگوش تو رساند این را

غبار مشک نخواہم بر آن عذار نشیند
ازین مباد کہ با خاطرت غبار نشیند

سبزہ را در باغ باشد جای زیر پای گل
باغ جنت را فتادہ سبزہ بر بالای گل

جعفر بیگ

آصف خان قزوینی کے لقب سے مشہور ہے۔ سابق میر بخشی آصف خان میرزا غیاث الدین علی کا بھتیجا ہوتا ہے۔ اب وہ دربار کے اعلیٰ مرتبہ کے بخشیوں میں شامل ہے۔ اس کو اپنے چچا سے بڑی شکایت تھی کیونکہ اس نے اپنے عہد میں اسے ترقی کا موقع نہیں دیا۔ اب بھی وہ اپنے مرحوم چچا کے خلاف بغض و عناد ظاہر کرتا رہتا ہے۔

اپنے ہم عصروں میں اس کی شعری صلاحیتیں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن عیش و آرام اور گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے شعر گوئی کی مشق کچھ زیادہ نہیں علم سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اگر وہ صرف شاعری کی طرف متوجہ رہتا تو زمانے کو اپنا مداح بنا لیتا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:

کارم امروز بہ بیداد گری افتادہ است
کہ بہر جا کہ نہم پائی سری افتادہ است

گر گرد شمع سرگشت چون پروانہ ام   آخر بہ کشتن میدہم پرواز گستاخانہ ام

گل ہر کس بتاراج خزان رفت
مرا ہم گلچین و ہم گلستان رفت

بآتش کارت افتادہ ست جعفر
دو صد بلبل بایں جا یک سمندر

حیدری تبریزی

یہ حاجی تھا، لسانی کا شاگرد ہے۔ شریف تبریزی بھی اس کا استاد تھا، جس نے لسانی کی

تعریف کرتے ہوئے اسے "لسان الغیب" کہا ہے۔ حیدری ہندستان میں عرصہ تک رہا۔ ایک بار جا کر پھر واپس آ گیا۔ دوسری مرتبہ جو گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کا دیوان 14 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس میں اچھے شعر بہت کم ہیں۔

وہ شاہی ہاتھیوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

نمود پشت ہای ریگ روان   فیلہایش کہ در صحیجا جست
کز پی غرق کردن اعدا   ہر طرف موجہای بحر بلا ست

حزنی

یہ عراق کے عالموں میں سے تھا۔ جب عراق میں شورشیں برپا ہوئیں تو وہ وہاں کے خطرات سے بچ کر ہندستان چلا آیا، لیکن یہاں بھی وہ محروم و مجبور رہا اور انتقال کر گیا۔

ان کے کلام کا نمونہ:

مرا بر سادہ لوحیہای حزنی خندہ می آید   کہ عاشق گشتہ و چشم وفا از یار ہم دارد
زنادانی بہر اوکرد ہمدم کار من ضائع   عجب تر اینکہ بر من منت بسیار ہم دارد

خرقہ بر آتش نہم تا بوی ایمان بشنوی
از کہن دلقی کز و یکتازبی زنار نیست

حیاتی گیلانی

بڑا دردمند اور مخلص دوست ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ حکیم ابوالفتح کے وسیلے سے بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا اور ترقی کی وہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے کلام میں اکابر شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں مگر ذکاوت و ذہانت فطری ہے۔

کلام کا نمونہ:

بہ ہر سخن کہ کنی خویش را نگہبان باش   زگفتن کہ دل نشگفتہ پشیمان باش
چہ بال مرغ کہ گر شغل روزگار این است   ز مور ہم قدمی دام کن گریزان باش

خدا بہ شکوہ زبان من آشنا نکند
من و شکایت، و انگہ ز تو خدا نکند

رباعی

دایم تو ستم نمودۂ معذوری   تا کی ز وفا شنودہ معذوری
گفتی کہ بمن جفا بجانان است   خود را تو نیازمودۂ معذوری

حیاتی

یہ گجرات میں میرزا نظام الدین کے ساتھ تھا۔
ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

پیغام دوست داغ جگر تازہ می کند
درد و داغ و رنج سفر تازہ می کند

رباعی

عاشق رخ خویش بردرت سود و برفت
وان مہر کہ با تو داشت بنمود و برفت
یکشب بہ ہزار حیلہ در بزم وصال
پروانہ بہ شمع دیدہ بکشود و برفت

حالتی

اس کا اصل نام یادگار ہے۔ خود سلطان سنجر ماضی کی اولاد بتاتا ہے لیکن میرزا احمد نے تاریخ نظامی میں اسے چغتائی نسل کا بتایا ہے۔ بڑا نیک اور خوش عقیدہ آدمی ہے اور صاحب دیوان شاعر ہے۔

ان کے کلام کا نمونہ:

نماند آنقدر از گریہ آب در جگرم
کہ مرغ تیر تو منقار تر تواند کرد

ہر صفحۂ عذار تو آن خط مشک شود
مضمون تازہ ایست کہ از غیب رونمود

حالتی کے باپ کا تخلص والہی تھا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

ماہ عید ابرو نمود و خاطرم ارشاد کرد
شکر للہ کز غم سی روزہ ام آزاد کرد

حالتی کے لڑکے کا تخلص بقائی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بادشاہ کے حکم سے اسے کشمیر سے لاہور لایا گیا اور یہاں کوتوال نے قصاص میں قتل کرا دیا۔ وہ بھی موزوں طبع تھا اس کا شعر ہے:

تا غمزۂ خون ریز تو غارت گر جان ست
چشم اجل از دور بحسرت نگران ست

خان اعظم

اصل خطاب اتکہ خان ہے۔ جس وقت چوسہ پر ہمایوں کو شکست ہوئی تو وہ گنگا پار کر کے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن دریا میں غوطے کھانے لگا، اس وقت خان اعظم نے سہارا دیا اور مدد

دے کر کنارے پر لے آیا۔ یہ خدمت اس کی آئندہ ترقیوں کا ذریعہ ہوگئی۔ اس کا مرتبہ شعر وشاعری کے مقام سے بالاتر ہے لیکن وہ نہایت موزوں طبیعت کا مالک تھا۔

ان کے کلام کا نمونہ:

مرو ای طفل اشک از خانۂ چشم قدم بیرون
کہ می آید مردم زادہا از خانہ کم بیرون

گر بخورشید رفت لاف زند بدر منیر
آخر از گنبد فیروزہ نگون خواہد شد

خنجر بیگ

چغتائی امیروں میں سے ہے۔ تردی بیگ خان کا داماد ہے۔ اس نے اپنے حالات اور بادشاہ کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے جس میں 300 شعر ہیں۔ وہ مختلف صلاحیتوں کا مالک ہے۔ سپاہ گری، خوش خطی، شعر ومعمہ، اصطرلاب ونجوم اور تطابق اعداد، غرض تمام علوم وفنون کا جامع ہے۔ صاحب تصنیف ہے۔ اپنی مثنوی میں اس نے اپنے ان تمام اوصاف کو گنایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فارسی اور ہندی راگ، راگنیوں میں بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کو ایسے راگوں کا علم تھا جو بجز بلند مرتبہ سلاطین و امراء کے کسی کی محفل میں سننے میں نہیں آئی اور اس زمانہ میں تو ان کا نام ونشان بھی نہیں رہا۔ موسیقی میں اس کا مقابل کوئی نہیں تھا۔

اس نے بادشاہ کی نصیحت کے لیے جو مثنوی کہی تھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

شہر یارا جہان عجب جائی است　　ہر زمان اندرو تماشائی است
چرخ نیرنگ ساز شعبدہ باز　　ہر زمان بازئی کند آغاز
پیش ازین بودہ اند در عالم　　تاجداران با سپاہ و حشم
زان دلیران پر ہوا و ہوس　　ماند تاریخ ہائی کہنہ و بس

خنجر بیگ نے جب یہ مثنوی بادشاہ کے سامنے پڑھی تو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

اس کا ایک مکمل دیوان بھی ہے جس کے شعر بہت مشہور ہیں۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

آہم از دل چند درکویش نہان آید برون
بعد ازان چندان کنم افغان کہ جان آید برون

آہم گزشت از سرو پا باد رفت جان
تن خاک گشت و آتش دل شعلہ زن ہنوز

جس زمانہ میں خان زمان اور بہادر خان نے سرکشی و بغاوت کی تھی۔ خنجر بیگ بھی ان کے ساتھ ہوگیا تھا اور بنگالہ چلا گیا تھا۔ غالباً اسی فتنے میں وہ ہلاک ہوگیا!

خسروی

یہ مرزا قاسم جنابدی کا بھانجہ ہے۔ حجاز کے سفر کے بعد ہندستان آیا اور بڑے شاہزادہ کے یہاں ملازم ہوگیا۔ یہ بھی بہر حال قابل ذکر شخص ہے:

ز نور عشق باشد خسروی را دل چنان روشن
کہ شمع مرقد او میتوان کرد استخوانش را

میر دوری

ان کا نام سلطان بایزید اور خطاب کاتب الملک ہے۔ ہندستان میں خط نستعلیق کو اس سے بہتر کوئی لکھ نہیں سکا۔ شعر گوئی میں بھی خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ آخری عمر میں حج سے بھی بہرہ مند ہوا۔

ان کے کلام کا نمونہ ہے:

گہ در درون جانی گہ در دل حزینی
از شوخی کہ داری یک جا نمی نشینی

رباعی

تا از نظر آن یار پسندیده برفت
خون دلم از دیدهٔ غمدیده برفت
رفت از نظر و ز دل نرفت این غلط است
کز دل برود ہر آنچہ از دیده برفت

خوش خطی میں میر موصوف کا ایک شاگرد خواجہ ابراہیم حسین احدی میرا ہم سبق تھا۔ یہ شہر بلوط کے بزرگوں کی اولاد میں سے اور شیخ عبدالرحمن لاہوری بلوطی کے قریبی لوگوں میں سے ہے۔ بزرگی اور ولایت میں اپنے زمانہ کا شہرہ آفاق شخص تھا۔ عین جوانی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ایک ہی سال میں تھوڑے سے فرق سے مجھے اس کی اور میرزا نظام الدین احمد کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ دل کے داغ ہرے ہو گئے اور قدیم دوستوں کا غم روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے:

دریغا درد را مرہم ندیدم
امید وصل بود آن ہم ندیدم

اب تو افسوس کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ افسوس بھی کیا کریں، ہم سب ایک گنبد کے نیچے سر دھن رہے ہیں اور جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہی ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملے گا۔ میں نے خواجہ ابراہیم کی تاریخ وفات کہی ہے:

بہ موجب حکم بادشاہ کونین
در ماہ صفر خواجہ ابراہیم حسین
چون کرد سفر ز عالم پر شر و شین
تاریخ شدش خواجہ ابراہیم حسین

وہ اسی قریبی زمانہ میں عراق سے آ کر احدیوں میں شامل ہوا تھا۔ ابھی وہ کسی عہدے پر فائز نہیں ہوا تھا کہ اس نے شریف سرمدی چوکی نویس کے لیے جو احدیوں کا داروغہ تھا اور اس کی پلی ہوئی مونچھیں تھیں یہ رباعی کہی تھی:

این سادہ دل آخر احدی خواہد شد   محتاج کلاہ غولی خواہد شد
از غایت اضطرار روزی صد بار   قربان بردت سردی خواہد شد

دانھی

دانہ خیشا پور کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں وہ کھیتی باڑی میں توکل وقناعت سے بسر کیا کرتا تھا۔ دل میں سیاحت کی سمائی اور ہندوستان کا رخ کیا۔

اس کے اکثر اشعار اسی دہقانی زبان میں ہیں لیکن فصیح زبان میں اس نے بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کا دہقانی کلام پڑھنے لکھنے میں دشوار تھا اس لیے وہ زبان زد نہ ہو سکا:

الغتی بسکہ شعر بد می گفت
نیک زو باطن لو ندانش
چرخ چوگانی از قضا بشکست
پست بنی بجائی دندانش

دوائی

یہ حکیم عین الملک کا تخلص ہے۔ ماں کی طرف سے علامہ جلال الدین دوانی کی اولاد میں سے ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک اور ممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ آنکھ کے علاج میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ترا ہر غم نہ ژالہ بر من دل تنگ می بارد   ز تاثیر حوادث بر سر من سنگ می بارد
چنان تندرست با نالہ دل آن شوخ جفا پیشہ   کہ گاہ آشتی از غمزۂ او جنگ می بارد
دوائی از در احسان او کفر است نومیدی   کہ ابر فیض او فرسنگ در فرسنگ می بارد

اسد ہر شب بگردون نالہ ام با آہ و زاری ہا
سیہ روزی چو من یا رب چہ سازد با چنین شب ہا

رفیعی

اصل نام میر حیدر معمائی اور ان کا وطن کاشان ہے۔ نہایت سمجھ دار، ذہین اور ہنر مند آدمی ہے۔ خاص طور سے فن معمہ اور تاریخ کہنے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ ان دو فنوں کے سوا وہ کسی اور فن کو اہمیت نہیں دیتا۔ ایک دن شیخ فیضی نے اس سے کہا کہ ہندوستان میں معمہ متروک ہوگیا ہے اور اب اسے عیب سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا: "میں نے ولایت میں برسوں اسی معمہ گوئی میں اپنی جان کھپائی ہے۔ اب جب کہ اس فن میں بوڑھا ہوگیا ہوں اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟"

خواجہ حبیب اللہ کے ساتھ گجرات سے لاہور آگیا۔ شاہی سرکار اور دوسرے عہدہ داروں سے تھوڑی بہت رقم لے کر وطن کے لیے رخصت ہوا لیکن ہرمز پہنچنے، پہ چند دن مکران کے قریب اس کا جہاز ٹوٹ گیا اور اس کی ساری پونجی دریا میں بہہ گئی۔ اس کے سامان میں شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر کے چند جزو بھی تھے جو علماء کی توقیعات سے آراستہ تھے۔ یہ جزو اور فیضی کا دیوان جو اس نے ولایت میں شہرت کی خاطر روانہ کیا تھا، سب طوفان کی نذر ہوگیا۔

رفیعی کے اشعار کا نمونہ:

تا ترک وطن ز شوق طلا جم چہ توان کرد
من عاشق معشوق مزاجم چہ توان کرد
من جنابوت رفیعی اشکبا بردم کہ تو
عمر هش گریان ترا از اہل عزای آیہ

رہائی

یہ شیخ زین الدین خوافی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہے۔
اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

کردی امید وارم از لطف خویش یارا
بر تافتی زہر سو روی امید مارا

سفر کردم کہ شاید خاطرم از غم بیاساید چہ دانستم کہ صد کوہ غم در راہ پیش آید

روغنی

یہ ایک مسخرہ تھا، بے حیائی اسکا پیشہ تھا۔ اس کی بے شمار ہزلیات ہیں۔ برسوں بادشاہی ملازمت میں رہا۔ اس کے دیوان میں تقریبا 3 ہزار شعر ہیں۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

حیات جاودان دارد شہید تیغ بیدادش
مگر در آبگیری آب حیوان دادہ استادش

* * *

از جفای او نمی نالم می ترسم کہ رقیب
یا بد از تاثیر فریادم کہ از بیداد کیست

اس نے 980ھ/1572ء میں جبکہ شاہی لشکر گجرات جارہا تھا، آبوگڑھ کے قلعے کے قریب اُس کا انتقال ہوگیا اور اسی جگہ دفن بھی ہوا۔ قاسم ارسلان نے اس کی تاریخ وفات کہی ہے۔

”دادہ چونگی بکافرستان جان“

زینؔ خان کوکہ

ہندی ساز اور دف کے بجانے اور موسیقی کی تمام قسموں میں بے مثل ماہر اور یکتائے روزگار ہے۔ خوش خطی کے سوا دوسری اور خوبیاں نہیں رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔ اس کا شعر ہے:

آرام من نمی دہد این چرخ کج خرام
تا رشتۂ مراد بسوزن در آورم

سلطان سپلکی

سپلک قندھار کا ایک گاؤں ہے۔ ہندوستان کے لوگ اسے سپلکی کہتے تھے۔ سپلک ایک گھناؤنا جانور ہے۔ وہ بڑا تنگ ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ عجیب مصیبت ہے لوگ مجھے ایسے گندے جانور کے نام سے پکارتے ہیں۔

نہایت آزاد خیال قلندر آدمی تھا۔ ایک دن ملا قاسم کاہی سے اس نے پوچھا آپ کی عمر کیا ہے؟ انھوں نے کہا" خدا سے 2 سال چھوٹا ہوں" سلطان نے کہا: "محترم ہم تو سمجھتے تھے آپ 2 سال بڑے ہیں آپ اپنی عمر گھٹا کر بتا رہے ہیں" مولانا قاسم ہنس پڑے اور کہا تم ہماری صحبت کے قابل ہو۔ واضح رہے کہ ملا قاسم کاہی دوسروں کی باتیں نقل کرنے کے عادی تھے۔ یہ بات بھی شیخ بایزید بسطامی کی تھی جو اس موقع پر جڑ دی۔ شیخ نے کہا تھا "انا اقل من ربی سنتین" اور یہ بس ایک صوفیانہ ترنگ تھی۔ ان کے اس قول کی عارفوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خدا سے دو سال کم ہونے کا مطلب دو صفتوں میں کم ہونا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی تمام صفات کا مظہر بن سکتا ہے بجز وجوب و قدرت کے۔ ظاہر ہے بندہ حدوث و عجز سے بچ نہیں سکتا۔ بہر حال خدا اس قسم کی صوفیانہ حشویات اور شطحیات سے بچائے رکھے۔

سلطان نہایت موزوں طبع آدمی تھا۔ خان زمان کا تخلص بھی سلطان تھا۔ جب سلطان نے اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور پیش کیا تو خان زمان نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت بطور صلہ اس کے پاس بھجوایا اور اس سے درخواست کی کہ اپنا تخلص ہماری خاطر بدل لو۔ اس نے صلہ واپس کر دیا اور کہا میرا نام سلطان محمد باپ کا رکھا ہوا ہے۔ اسے میں کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ نیز میں تم سے کئی سال پہلے اس تخلص پر شعر کہتا رہا ہوں اور اسی تخلص سے مشہور بھی ہوں۔ خان زمان کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا اگر تم یہ تخلص نہیں چھوڑو گے تو میں ہاتھی کے پیر سے بندھوا دونگا نہ صرف یہ بلکہ وہ اس غرض کے لیے ہاتھی کو لے آیا۔ سلطان نے کہا: "میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ میں شہادت کا درجہ پاؤں"۔ خان زمان نے

بہت ڈرایا دھمکایا۔ آخر مولانا علاؤالدین لاری خان زمان کے استاد نے کہا کہ جامی کی کوئی غزل محفل میں پڑھی جائے۔ اگر سلطان فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہہ دے تو پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے ورنہ تم جو چاہتے ہو اس طرح سے سلوک کرو۔ چنانچہ جامی کی یہ غزل پیش کی گئی:

دل خلقت را رقم صنع الٰہی دانست
بر سر ساد رخان حجت شاہی دانست

سلطان محمد نے فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہی جس کا مطلع ہے:

ہر کہ دل را صدف سر الٰہی دانست
قیمت گوہر خود را بکماہی دانست

اگر چہ یہ غزل اتنی زیادہ اچھی نہ تھی، لیکن خان زمان سن کر پھڑک اٹھا۔ بڑی تعریف وتوصیف کی اور بہت سارے تحفہ وتحائف دے کر رخصت کیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکا اور خان زمان سے اجازت لیے بغیر بدایوں چلا گیا۔ اس کے بعد جگہ جگہ کی سیر کرتا رہا اور آخر دکن چلا گیا۔

جس سال دکن کے چاروں حکمرانوں نے متحد ہو کر بیجانگر پر چڑھائی کی تھی اور ایک سخت لڑائی کے بعد اسے فتح کر لیا تھا اور اس قدیم اور مشہور بت کدے کو ڈھا دیا تھا۔ اسی سال سلطان دکن میں تھا اور اس لشکر کے ہمراہ جنگ میں شریک تھا چنانچہ اسے بڑا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا تھا۔ اس کے بعد پھر اس کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا، کیا ہوا؟۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے بڑی بے مروتی کا ثبوت دیا تھا کہ خان زمان جیسے قدردان آدمی کی درخواست ٹھکرادی اور بزرگوں کے منہ آنے کی کوشش کی۔

ان کی غزل کا مطلع ہے:

زاہدا عرفان بدلق و سبحہ و مسواک نیست
عشق پیدا کن کہ معنا داخل ادراک نیست

سلطان

یہ خان زمان کا تخلص ہے۔ اس کے حالات ہم نے اس منتخب میں تفصیل سے بیان کیے ہیں، بلکہ ہندوستان کی ساری تاریخوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اس کا شعر یہ ہے:

باریک چو موئیست میانی کہ تو داری
گویا سران موست دہانی کہ تو داری

اس کا بھائی بہادر بھی شعر کہتا تھا۔ ملا آصفی کی مدح میں اس نے اچھے شعر کہے ہیں۔

ملّا آصفی کا مطلع ہے۔

بر ما شب غم کار بسی تنگ گرفتہ　　　کو صبح کہ آئینہ ما زنگ گرفتہ

بہادر خاں نے کہا ہے:

آن شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ　　　گویا بمن خستہ رہ جنگ گرفتہ

سیری

قاضی اور فقیہ ہونے کے باوجود خوش طبع شاعر تھا۔ علم عروض، قافیہ اور معمہ میں بے مثل مہارت رکھتا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد حج کے لیے چلا گیا۔

رباعی

سیری بحریم جان و دل منزل کن
قطع نظر از صورت آب و گل کن

جز معرفت خدائی ہیچ است ہمہ
بگذر ز ہمہ معرفتی حاصل کن

سپہری

خواجہ بیبا کے بھتیجے میرزا بیگ کا تخلص ہے، یہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ اشعار اس کی روشنی طبع کا نمونہ ہیں:

از تبسم دفع زہر چشم خشم آلود کن
کز نمک سازند شیریں چون بود بادام تلخ

سیاہی

یہ بیرم خان کے یہاں ملازم تھا۔ بیرم خان نے اس کے ذریعہ حضرت امام رضا کے آستانہ کے لیے 7 ہزار روپیہ کی نذر بھجوائی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم خرچ کر دی۔ جس کے لیے شاہ طہماسپ نے اسے قید کر دیا۔ 974ھ/1566ء میں وہ قید سے رہا ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

رخسار زردم چو در آئینہ عیان شد
آئینہ زعکس رخ من برگ خزان شد

تیری

اس کا باپ تیر ساز تھا۔ اس پیشہ کی مناسبت سے اس نے یہ تخلص رکھا تھا۔ مرزا عزیز کوکہ کی خدمت میں تربیت پائی تھی۔ 12 سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی مشق بڑی اچھی تھی اور جلدی ہی انھوں نے شہرت پائی۔

ای تو سلطان ملک زیبائی
ما گدا پیشگان تماشائی

لشکر خان میر بخشی نے جو خراسانی اور کٹر رافضی تھا اور اپنا رفض چھپائے رہتا تھا، اس

سے پوچھا "ملا کیا سنی ناپاک بھی ہوتا ہے"؟ میرزا عزیز کوکا نے ترکی بہ ترکی کہا "ہاں، جیسے تم!"

قاسم ارسلان نے مہمی کے بارے میں کہا ہے:

مہمی و ظریفی و فریدون وزند
چون گربہ و چون شغال دیمون وزند

سقا

شیخ جامی کے مریدوں میں سے ہے۔ یہ ایک فانی مشرب درویش تھے۔ جذب و حال طاری رہتا تھا۔ آگرہ کے گلی کوچوں میں چند شاگردوں کے ساتھ لیے لوگوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ان کے اشعار بھی پانی کی طرح رواں دواں تھے۔

ان کے ایک پیرزادہ ہندوستان آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے پیرزادہ کی نذر کر دیا اور خود سراندیپ[87] کی طرف چلے گئے۔ سیلون[88] کے راستہ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں اس کفرستان میں ایک شخص نے جسے حضور اکرم ﷺ نے خواب میں اشارہ کیا تھا غیب سے ظاہر ہوا اور سقا کی تجہیز و تکفین کی۔

انھوں نے اپنے کلام کے چند دیوان مرتب کر لیے تھے، لیکن جب بھی ان پر جذب طاری ہوتا تھا اپنے دیوان کو دھو ڈالتے تھے۔ جو کلام بچ رہا وہ بھی اچھا خاصہ دیوان ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بجمال عارضش در ہر نظر حیرانی دارم
بدور نقطہ چون پرکار سرگردانی دارم

سپاہی

خواجہ کلاں بیگ کا پوتا ہے۔ یہ رباعی اس کی ہے:

افسوس کہ وقت گل بزودی بگذشت
فریاد کہ تا چشم گشودی بگذشت
بی چشم و ظلمت بنفشہ نرگس را
ایام بکوری و کبودی بگذشت

978ھ/1570ء میں آگرہ میں ان کا انتقال ہوا۔

سرمدی اصفہانی

کچھ عرصہ تک شاہی چوکی نویس رہا، اب شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں مقرر ہے۔ پہلے فیضی تخلص کرتا تھا جب بادشاہ کی مجلس میں شیخ فیضی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا اس نے اپنا تخلص سرمدی رکھ لیا۔ موزوں طبع آدمی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

تا تیغ ناز آن بت مغرور شد بلند   صد گردن نظارگی از دور شد بلند
می در سر و گل در بغل آئی چو در کاشانہ ام
بہر تماشا بشگفد خاشاک محنت خانہ ام

ساقی جزائری

یہ عرب ہے۔ اس کا باپ شیخ ابراہیم بڑا فاضل فقیہ تھا۔ شیعہ اس کو اپنے مسلک کا مجتہد سمجھتے تھے۔ مشہد کا رہنے والا تھا۔ ساقی بھی مشہد میں پیدا ہوا۔ کچھ علم حاصل کرنے کے بعد دکن پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ اب وہ بنگالہ میں رہتا ہے۔ نہایت خوش طبع اور شیریں کلام شاعر ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

ز جانم گاہ گریہ آہ درد آلود می خیزد
بلی چون آب بر آتش فشانی دود می خیزد

سیدی

اس کا اصل نام سید شاہی ہے، جس کا تذکرہ ہم(۱۸۷) کر چکے ہیں۔ یہ گرمسیر کے سیدوں میں سے ہے۔ جو کالپی میں متوطن ہو گئے تھے۔ سیدی خوش کلام شاعر ہے، تصوف سے بھی بہرہ مند ہے اور شیخ اسلام چشتی کا مرید ہے۔ کچھ عرصے تک بادشاہی ملازمت میں رہا۔ مختلف امراء کے ساتھ بسر کرتا رہا۔ اب کابل میں قلیج محمد خان کے پاس ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے۔

اول سر گری عشقت و دل در اضطراب
ہمچو طفلی کہ تپد ہنگام بیداری ز خواب

گل حمائل کرد تا سرو کشا بالای من　　　من زگل در رشک وگل در غیرت از پیراہنش

نیافت از دل گم گشتہ ام نشان کہ چہ شد
نسیم اگر چہ دو زلف تو تار تار کشاد

شاہ ابو المعالی

ان کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ یہ بھی نہایت خوش طبع شاعر تھے اور شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

جان من ہم محبت اغیار بودن نیک نیست　　　جز من بیکس بہر یک یا بودن نیک نیست
خوش بود آزردن عاشق گہی کہ لطف تیز　　　دائما بر مسند آزار بودن نیک نیست
بر امید وصل خوش می باش در کنج فراق　　　تا امید از دولت بیدار بودن نیک نیست

جدا ز وصل توای دلبر یگانہ شدم
اسیر بند فراقت بہر بہانہ شدم

شیری

پنجاب کے ایک گاؤں کوکووالا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ ایک بہت بڑے اور مشہور قبیلے ماجیانؔ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ماں کے متعلق کہا کرتا تھا کہ سیدزادی ہے۔ شیری نے فطرت عالی اور طبع رسا پائی ہے اور وضع کا پابند ہے۔ اس کے باپ مولاناؔ کی کی تربیت سے بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے والد کا مطلع ہے:

ہست ازباران لطف الہی کریم کارساز
در دل دانا ہر یک قطرہ صد دریائی راز

شیری کو شعر کہنے پر پوری قدرت حاصل تھی، چنانچہ اس کا دعوی تھا کہ اس نے ایک رات میں 3 غزلیں کہی ہیں۔ ایک دن وہ محفل میں اپنے دیوان کا ایک قطعہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ مصرع بھی تھا:

"چار دفتر در آب چناب انداختم"

شیری نہایت خوددار، دردمند اور فقیر منش آدمی تھا۔ اس بات کی طرف اس نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے:

صاحب خوان فقیرم و ہرگز
ہمت من نخواہد از جانان
قرض ہندو بشرط دہ پنجاہ
بہ کہ انعام این مسلمانان

خاص طور سے "شکوہ و شکایت" کا مضمون اس سے بہتر کسی ہم عصر نے نہیں باندھا۔

گذشتگان ہمہ عشرت کنید کا سودید
ازان کہ عیش بر افتاد از میانۂ ما
ایا کسان کہ چون از ما رسید فاتحۂ
بشکر آنکہ نبودید در زمانۂ ما

بلا شبہ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں وہ اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گیا ہے۔ دوسروں کی فصاحت اس کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس کے کلام نے سب کے لبوں پر مہر لگا دی۔ جیسا کہ خود اس نے اس قطعہ میں کہا ہے:

اگر از شعر شیریم پرسی   گویم از درمیانہ انصاف است
نہ ہمہ شعر شاعری سرہ است   نہ ہمہ بادہ کسان صاف است

اس کا دیوان بہت مشہور ہے۔ جس زمانہ میں وہ مہابھارت کے ترجمہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا تو کہا کرتا تھا کہ یہ فرسودہ داستانیں بخار میں مبتلا مریض کے خواب ہیں۔ ملا شیری نے 994ھ/1586ء میں یوسف زئی کی پہاڑی میں وفات پائی۔

شکیبی اصفہانی

وہ حال ہی میں ہندستان آیا ہے۔ بیرم خان کے لڑکے خان خانان کے ساتھ رہتا ہے۔ سلیقۂ شعر سے بہرہ مند ہے:

ھنوز نالہ شب ھای من اثر دارد   کمان شکستۂ من تیر کارگر دارد
دلم بہ ہجر در آویخت رحمتی ای بخت   کہ دست عربدہ باکوہ در کمر دارد
توکل بدامن یاران فشان کہ خستۂ ہجر   بنوک ہر مژہ صد پارۂ جگر دارد

اے خدا بخش مرا از غیب بازاری بدہ
ی فروشم دل بدیداری خریداری بدہ

شجاعی

یہ سیف الملک حکیم کا تخلص ہے۔ وہ میر سید محمد جامہ باف کا علاج کر رہا تھا۔ میر نے اس کے بارے میں کہا تھا:

سیف قاطع بندگان مولوی سیف الملوک   آنکہ طرح تو بحکمت در عمل آوردہ بود

دی اجل میگفت بہر بران جان مریض   ہر کجا رفتیم پیش از ماعلاجی کردہ بود

یہ اشعار مولانا شجاعی کے کلام کا نمونہ ہیں:

زسودائی بتان داری سری باموئی ژولیدہ
مسرت گردم کہ باعاشق سری داری وسودائی
تا زلف افتادہ بر رخسار جانان من است
یا مگر بر روی آتش رشتۂ جان من است

شعوری ترقی

یہ ایک طالب علم ہے:

اس کے مشق سخن کا نمونہ یہ شعر ہیں:

ای کہ زبیم ہجر او در سکرات مردنی   مژدہ کہ آن مسیح دم مہر سدو رسیدہ است
مراز خانہ بردن ہر دم آرزوی تو آرد   گرفتہ شوق گریبان من بسوی تو آرد

ملا صادق حلوائی سمرقندی

نہایت بلند مرتبہ عالم تھا۔ نہایت خوش کلام اور صاحب فضل، ان کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ اس کا ذکر شاعروں کے ذیل میں کیا جائے۔ لیکن افسوس ہم پر اور اس پر بھی کہ ایسا کرنا پڑا۔

سنتے ہیں وہ بڑی کوششوں سے ہندستان آیا، پھر یہاں سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے گیا۔ وہاں سے 978ھ/ 1571ء میں لوٹ کر آیا اور اپنے وطن چلا گیا۔ مرزا محمد حکیم نے اس سے کابل میں ٹھہرنے کی فرمائش کی تھی اور اس سے درس لینے لگا تھا۔ ان دنوں وہ ماوراء النہر میں درس و تدریس میں مصروف ہے۔ شعر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، اس کا ذوق نہایت بلند ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

دل گم شد و نی وعدم کس نشان ازو
در خنده است لعل تو دارم گمان ازو

جز درت جای دل آوارہ را منزل نشد   از درت گفتم شوم آوارہ اما دل نشد

گچو خورشید از سفرای ماه سیما آمدی
خوب رفتی جان من بسیار زیبا آمدی

صبوحی

چغتائی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نہایت بے قید اور لا ابالی شخص تھا، شعر خوب کہہ لیتا تھا۔

دلم که مهر تو دارد همین تو میدانی
نگفته ام بکس این راز خدا داناست

اس نے آگرہ میں 973ھ/1565 میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ''صبوحی میخوار'' سے نکلتی ہے۔

صالحی

ہرات کا رہنے والا ہے، شعر و انشاء میں بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ علم سے بھی بے بہرہ نہیں، اچھا خوش نویس ہے۔ عرصے تک منشیوں کا کام کرتا رہا، پھر اپنے وطن واپس چلا گیا۔
اس کے کلام کا نمونہ ہے:

شب فراق تو در خانهای دیده مرا
نشست خون جگر آن چنان که خواب در آید

صادقؔ

قندھار میں پیدا ہوا، اصل تعلق ہرات سے ہے۔ کچھ عرصے تک ہندستان میں رہا، پھر واپس وطن چلا گیا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

مرا از بسکہ از تیغ تو در تن چاک می افتد
بہر پہلو کہ می رقصم دلم بر خاک می افتد

صرفیؔ

یہ شیخ یعقوب کشمیری کا تخلص ہے۔ اس کا ہم کچھ حد تک ذکر کر آئے ہیں۔ شیخ بہت سی خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ تھے۔ اس نے تصوف اور دوسرے علوم وفنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی طبیعت بڑی شاعرانہ تھی۔

بر رخ فگند چاشت گر آن مہ نقاب را
پیش از زوال شام رسید آفتاب را

آخری عمر میں اس نے تفسیر کبیر کی طرح ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تھا، کچھ لکھ بھی لیا تھا، لیکن اپنے وطن میں انتقال کر گیا۔

صرفیؔ ساوجی

کچھ عرصہ گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پھر لاہور چلا آیا اور درویشانہ وضع میں رہتا تھا۔ جس زمانہ میں شیخ فیضی دکن میں مقرر ہو کر چلا گیا تھا تو یہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دکن ہی میں فوت ہو گیا۔ مگر یادگار ایک دیوان چھوڑ گیا۔ قصیدہ وغزل میں خاص رنگ اور طرز کا مالک تھا۔

ز راہ کعبہ مشوئم وگرنہ منتظر ستادم
کف پای بزحمت چینی خار مغیلانش

صبوری ہمدانی

خان زمان کے قتل کے دن یہ قید ہوا تھا۔ قتل ہونے سے تو بچ گیا مگر موت سے جان نہ بچا سکا۔ اس کے اشعار اوسط درجہ کے ہیں۔

سپردم جان من بی صبر و دل از داغ ہجرانش   چہ دردست این کہ غیر از جان سپردن نیست درمانش
چو سوز آشکارا پیش او ظاہر نمی گردد   جہان آگاہ سازم از جراحتہای پنہانش
چو در شبگون لباس آن مہ بسیر شب برون آید   فروغ صبح ظاہر گردد از چاک گریبانش
کاش از خنجر من سینۂ او چاک شود
تا ببیند دل پاکم دل او چاک شود

صالح دیوانہ

تھا تو دیوانہ لیکن دربار سے عاقل کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ جب تک خضر علیہ السلام کے نام پر کھانے کے 5 تھال کسی دریا یا چشمہ پر نہیں بھجوا دیتا، کھانا نہیں کھاتا تھا۔ یہ کام قاسم ہندی کے سپرد تھا جو ایک مہاوت کا لڑکا ہے۔ یہ بھی شاعر ہے لیکن نہایت کمینہ آدمی ہے۔ قاسم ہندی یہ تھال اٹھوا کر باہر لاتا اور شہدوں اور قلندروں سے کہتا، کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ صالح دیوانہ اس سے پوچھتا تھا۔ "تم نے خواجہ خضر کو بھی کھانے پر دیکھا؟" وہ بے حیا جواب دیتا: "ہاں ہاں حضرت خواجہ نے تو بڑے شوق سے کھانا تناول کیا"۔ اسی طرح اور بھی جھوٹی سچی باتیں لگا دیتا۔ دیوانہ ان باتوں پر یقین کر لیتا۔

بہر حال دیوانہ موزوں طبع آدمی تھا، بس وہی مثل تھی کہ:

شعر رنگا رنگ از طبع کج حیدر کلچ
گلستان سر میزند کز تودۂ انبار گل

دیوانہ کا شعر ہے:

چو سودای سر زلفش بپا افگندہ زنجیرم

درین سودا بغیر از جان سپردن نیست تدبیرم

کچھ عرصے تک تو وہ بارگاہ شاہی میں مقرب و معزز رہا، پھر معتوب ہو کر کابل چلا گیا۔ دوبارہ ہندستان آیا۔ حضرت سلطان المشائخؒ کا متولی بنایا گیا، لیکن اس نے اس منصب کو قبول نہ کیا اور اجازت لے کر کابل لوٹ گیا۔

طارمی

نام ملا علی محدث ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ملا صادق کا بھائی ہے۔ اس نے عرب میں حدیث کا علم حاصل کیا تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ہندستان دو مرتبہ آیا تھا۔ 981ھ/1573ء میں وفات پائی۔ ملا عالم کابلی نے تاریخ وفات کہی:

دریغا کہ ناگاہ ملا علی را   ربود از میان دستبرد حوادث
پی سال تاریخ او سال دیگر   بگو مردہ ملا علی محدث

شعر کہنے کا سلیقہ تھا، کبھی کبھی اس کی شوخ طبعی اشعار کا جامہ پہن لیتی تھی۔

تن خاکی چنان افسردہ شد از داغ ہجرانم
رود بیرون چو گرد از جامہ گر دامن برافشانم

طریقی ساوجی

بڑا کھوسٹ اور مسخرہ تھا۔ اپنی بے حیائی کی وجہ سے دربار میں سارے شاعروں کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ آخر حج کی توفیق ہوئی۔ گیا اور وہیں پیوند خاک ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

عشق بازی را بغیر از جان سپردی پیشہ چیست
من کہ از مردن نیندیشم دگر اندیشہ چیست

کسی را جان ز دست محنت هجران نمی ماند   اگر این است هجران هیچ کس را جان نمی ماند

درین دیار بخون خوارۂ کہ دل بستم
بدام زلف پری چہرۂ کہ افتادم

طالب اصفہانی

8 سال سے کشمیر میں مقیم ہے۔ پہلے ایک قلندر نما آدمی تھا، آخر میں ملازمت کر لی اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اکبر نے اسے کشمیر سے چھوٹا تبت کے حاکم علی رائے کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، وہاں سے لوٹ کر آیا تو وہاں کے حیرت انگیز حالات اور نوادرات کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور شیخ ابو الفضل کو دیا۔ اس نے رسالہ کو اکبر نامہ میں شامل کر لیا۔

نہایت دردمند اور غم گسار آدمی ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا ملکہ رکھتا ہے۔

رباعی

زمحروم بفراق خود پشیمانی کہ چہ شد
خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد
ای غافل از آنکہ تیغ ہجر تو چہ کرد
خاکم بغبار تا بدانی کہ چہ شد

طالعی یزدی

خوش خط نستعلیق نویس ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ آگرہ میں جلد سازی کا کام کرتا تھا۔

ساقیان چند تو ان خورد غم عالم را
بادۂ پیش از کہ بیرون کنم از دل را

طفلی

ملا درویش فتح پوری کا لڑکا ہے۔ اس کا چچا ملا صالح اب خانقاہ فتح پور میں مدرس ہے۔ طفلی 13 سال کی عمر میں ہی ''شرح شمسیہ'' پڑھنے لگا تھا۔ نہایت فیاض طبع آدمی ہے۔ شعر کا ذوق بھی بڑی حد تک مناسب و عمدہ ہے۔ بڑے شاہزادے کی ملازمت میں رہتا ہے یہ تخلص اسی کے دربار سے اسے ملا ہے۔ بڑے شاہزادے کی ملازمت میں جو قصیدہ ان کی تعریف میں کہا ہے اس کے چند شعر یہ ہیں:

ایا شہی کہ جہان را ز رہزنان خلل   بدور معدلت تست پاسبان آمد
امید لطف تو ہست آنچنانکہ عاصی را   گناہ از آتش دوزخ نگاہبان آمد
تو ئی کہ مرکب عزم ترا بروز وغا   ظفر علم کش و اقبال ہم عنان آمد
رساند نامۂ اقبال دوش مرغ شرف   کہ صیت شہرتش از اوج لا مکان آمد
نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کان را   امید ترجمۂ و شوق ترجمان آمد

اس عمر میں فارسی کہنا اور سمجھنا ہی بڑی بات ہے۔ کہاں شعر گوئی اور وہ بھی اس قدر عمدہ، آثار تو یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے بڑے بوڑھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔

ظہوری

دکن میں رہتا تھا۔ نہایت آزاد خیال اور بے قید لیکن درد مند آدمی تھا۔ امیروں کے گھر پر کم ہی آیا جایا کرتا تھا۔ شیخ فیضی اس کی اور ملک قمی کی جو ملک الکلام کے لقب سے مشہور تھا، بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ یہ دونوں فیضی کے ساتھ پایۂ تخت لاہور آنا چاہتے تھے لیکن برہان الملک راضی نہ ہوا۔ ان دنوں سننے میں آیا کہ دکن میں غدر ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مولانا ظہوری صاحب طرز اور صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ یہ شعر اس کی یادگار ہے:

ظہوری شکوہ ات از یار بی جاست
تو بی طالع فتادی جرم او چیست

عالم کابلی

عارف تخلص تھا۔ نہایت دلچسپ، خوش مزاج، خوش اطوار مُلّا تھا۔ بحث کے دوران اور دوسرے مواقع پر ایسی باتیں کہہ جاتا تھا کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اپنی بیاض میں ''شرح مقاصد'' کی بحث پر ایک مضمون لکھ رکھا تھا۔ جگہ جگہ اشعار بھی دیے تھے۔ لکھا تھا کہ یہ عبارت میری کتاب ''قصد'' سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اس نے ''شرح تجرید'' کے جواب میں ''تجرید'' کے نام سے اور ''مطول'' پر بھی ایک دو حاشیے لکھ رکھے تھے کہ عبارت کتاب ''طول'' سے لئے گئے ہیں جو ''مطول'' اور ''اطول'' کے مقابلے کی کتاب ہے۔ اس نے ہندستان کے مشائخین کے حالات میں بھی ایک تذکرہ لکھا تھا۔ اس میں جس مجاور اور فقیر سے بھی کوئی بات سنی درج کر لی اور کچھ تو بس اندازہ پر اضافہ کر دیا۔ اس کا نام رکھا ''وفتح الولایہ'' لوگوں نے کہا: ''بھائی اس واؤ عطف کا معطوف کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''معطوف معطوف علیہ میں چھپا ہوا ہے جس کا نکالنا ممکن نہیں۔ اگر تم ''ولایہ'' کے واؤ کو زبر سے پڑھو تو پتہ چلے گا''۔ مُلّا ہمیشہ قاضی خان بدخشی پر اس وجہ سے رشک کیا کرتا تھا کہ سجدۂ تعظیمی ایجاد کرنے کا سہرا اس کے سر بندھ گیا تھا۔

ایک دن فتح پور میں مجھے(90) اور نظام الدین احمد کو صبح صبح بڑا اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ اشتہا بڑھانے والے معجون اور اپنی کتابوں کا بستہ لے کر بیٹھ گیا۔ ہم صبح سے دوپہر تک بھوکے بیٹھے رہے، کہنے سننے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ آخر میرزا سے رہا نہیں گیا اور وہ بول اٹھے: ''کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میں تو اس خیال میں تھا کہ تم لوگ کھانا کھا کر آئے ہو۔ میرے پاس ایک بکری کا بچہ ہے اگر فرمائیں تو ابھی ذبح کر دوں''۔ ناچار ہم(91) اٹھ کر اپنے گھر چلے آئے۔ اس کی ان حرکتوں پر آخر اسے کیا سمجھا جائے؟

اس نے جب دیکھا کہ شیخ ابوالفضل اور قاضی خان اور دوسرے اس کے برابر کے لوگ ملاگیری سے امارت کے منصب پر پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی ہر وقت بادشاہ سے یہ عرض

کرنے کی فکر میں رہتا تھا کہ اسے بھی فوج میں داخل کر لیا جائے۔ جب اس کی درخواست قبول نہ ہوئی تو ایک دن شام کو چوکی کی سلامی کے موقع پر مانگی ہوئی ایک تلوار کمر سے باندھے فوجی وضع بنائے نہایت مضحکہ خیز حالت میں صف سے باہر نکل کر بادشاہ سلامت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور خلاف قاعدہ کسی واسطے کے بغیر براہ راست اکبر سے پوچھنے لگا، ہمیں کس منصب دار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور ہم کس جگہ سے تسلیمات بجالائیں”؟ بادشاہ اس کا مطلب بھانپ گئے اور کہا: ”تم جس جگہ ہو وہیں سے تسلیمات بجالاؤ“۔ جب یہ تدبیر بھی بے نتیجہ رہی تو ایک دن اپنی شان دکھانے کے لیے، تاکہ فوجیوں میں داخلہ مل جائے۔ عین دوپہر کے وقت گرمی میں روئی کا لبادہ جو میل سے بھرا تھا کسی کا بخشا ہوا یا مانگے کا تھا۔ پہن کر دربار میں آیا۔ مرزا کوکہ نے اس لبادہ پر بڑی پر مذاق باتیں کیں وہ بھی ان کا اسی طرح جواب دیتا رہا۔

اس کی جائے پیدائش کابل کے علاقہ میں گل بہار نامی ایک گاؤں تھا۔ اسی مناسبت سے عرصہ تک اپنا تخلصؔ بہاریؔ رکھے ہوئے تھا۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ تخلصؔ کنیزوں کے نام جیسا ہے تو بدل کر رتبیؔ رکھ لیا۔ اپنی مہر کے لیے اسی کا سجع بھی بنوا لیا۔ بہر حال عالم کابلی موزوں طبع شاعر تھا۔ یہ چند شعر اس کے یادگار ہیں:

می پرو چشمی کہ می گشتم از و ہر لحظہ شاد
قالبا کاش زدیوارش برو خواہم نہاد

چند شعر اس نے ”سلسلۃ الذہب“ کی زمین میں بھی کہے تھے اور اپنے اس مہمل مجموعہ کا نام ”سلسلۃ الجرس“ رکھا تھا۔ اس میں اُس نے اپنی بہت سی ان تصانیف کے نام دیے ہیں جو ابھی اس کے ذہن ہی میں مستور ہیں اور خارج میں نمودار نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے نام بھی بڑے عجیب گنائے ہیں، مثلاً:

دیدہ باشی بہ نسخۂ تجدید — کہ مجدد رسید فیض جدید
کاندرو صد موافق است نہاد — واز بیانش مقاصد است عیان

اس مسخرے پن سے قطع نظر، ملا عالم بڑا اچھا دوست تھا۔ لائق فاضل، ہمدرد، بے غرض انسان تھا۔ ہزل گو، مگر دلچسپ اور ہر دلعزیز آدمی تھا۔ امید ہے اللہ تعالٰی اسے اپنے فضل وکرم سے بہشت جاودانی عطا فرمائے گا۔

میر عبدالحی مشہدی

یہ کچھ عرصے تک ہمایوں کے زمانے میں صدر کے عہدے پر رہے۔ ان کا بھائی میر عبداللہ قانونی خاص مصاحبوں میں سے تھا۔ یہ دونوں بھائی نہایت متقی و پرہیزگار تھے۔ میر عبدالحی خط بابری سے بھی واقف تھے۔ یہ خط بابر بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس خط میں قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر مکہ معظمہ بھی بھجوایا تھا، اب اس خط کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

میر علاء الدولہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر مذکور بہت سی حیثیتوں کے مالک تھے۔ خط بابری جو نہایت مشکل خط ہے ان کے سوا کسی اور نے اس قدر جلدی اور خوبی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا۔ اس کے حاشیہ پر میرزا عزیز کوکہ نے لکھا ہے: ''میر کسی علم سے واقف نہیں تھا بس ایک ہنر جانتا تھا بس ایک خط بابری اچھا لکھ لیتا تھا، عجب سادہ لوح ہے کہ ایسی بے سر و پا حکایتیں جنھیں کوئی بچہ بھی باور نہیں کرے گا، بے سوچے سمجھے، بے موقع مجلسوں میں بیان کرنے لگتا ہے''۔ چونکہ میرزا اس سے بہت پہلے سے واقف تھا اس لیے اس کی رائے زیادہ صحیح اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میر علاء الدولہ کے تذکرہ میں بڑی شتر گربگی پائی جاتی ہے۔

میر عبدالحی شعر سے پوری مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اس موضوع پر رباعی کا جواب بھی کہا تھا جسے کسی فاضل شاعر نے میرزا ہندال کے نام مربع کی طرز میں کہا تھا۔ یہ رباعی بہت مشہور ہے۔ بچے بھی پہلی جو چیز یاد کرتے ہیں وہ یہی رباعی ہے۔

رباعی

ای تاج بدرگاہ تو صدر حشم زمال
مداح تو باشند ہمہ اہل کمال

ہند از قدمت مسخر بر تو
القاب تو شد شاہ محمد عندال

میر عبدالحی کے مزاج میں بھی بچکانہ پن تھا۔ اس نے اس کے جواب میں رباعی لکھی۔

ای تاج درت عزار ہمچو قیصر
مدح تو بود ورد زبان شام و سحر
القاب جہان تمام شد یارب
در حکم شاہ جہان محمد اکبر

عتابی

سید محمد نجفی نام تھا۔ دکن میں نہایت معتبر و معزز تھا۔ ہندستان آیا تو الہ آباد میں بادشاہ کے حضور رسائی ہوئی۔ وہ اکبر کو نہایت ہی لا اُبالی، بے باک اور اکھڑا اکھڑا سا آدمی نظر آیا۔ یہ بھی بات عرض میں پہنچی کہ اس نے دکن میں شاہ فتح اللہ کی ہجو کی تھی۔ جب بادشاہ نے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا: ''وہاں دکن میں شاہ جیسے لوگوں کو کہاں لائق توجہ سمجھتا تھا''۔ یہ بات اکبر کی بدگمانی کو اور بڑھا گئی اور اس نے اسے قید کروا دیا۔ فتح پور پہنچنے پر حکم دیا گیا کہ اس کے مسودات کی تلاشی لیں اور دیکھیں کہ اس نے اس عرصے میں کس کس کی ہجو کہی ہے۔ بعض چیزیں برآمد ہوئیں اور وہ 10 سال تک گوالیار کے قلعے میں قید رہا۔ آخر بڑے شاہزادے اور دوسرے مقربوں کی سفارش پر اس کو معافی دی گئی اور اسے لاہور بلا لیا گیا۔ رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گیا تھا۔ وہی بدمزاجی اب بھی موجود تھی۔

ایک دن قاضی حسن قزوینی جس کو خان کا خطاب حاصل تھا اس سے ملنے گیا، دربان نے اسے روک دیا، دربان سے لڑ بھڑ کر قاضی کی محفل میں جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا پہنچ گیا اور قاضی حسن سے کہنے لگا کہ: ''اچھا تو یہ کھانا ہے جس کی وجہ سے اہل علم کو دروازہ پر روکا جاتا ہے''۔ صاحب خانہ اور حاضرین نے بہت معذرت کی کہ

دربان نے آپ کو پہچانا نہیں لیکن عتابی نے مان کر بھی نہ مانا اور کھانے میں شرکت نہ کی۔ عربی فارسی شعر کہنے میں اچھی مہارت رکھتا ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ ہے:

در گلخن ہوا دل فرزانہ سوختم
قندیل کعبہ بہر در بت خانہ سوختم

رباعی کے بعد بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپیہ نقد دے کر قلیچ خان کے حوالے کر دیا کہ اسے سورت سے جہاز روانہ کر دیا جائے، لیکن وہ راستہ سے بھاگ کر دکن چلا گیا اور وہاں کے حکام کے پاس پہلے کی طرح اعزاز و اکرام سے رہنے لگا۔

عبیدی

نو رسیدہ جوان ہے، اس کا شعر ہے:

متاع دل کہ بہ سیدتم نمی ارزد
کرشمہ کہ بہ پرسیدنش نمی ارزم

اس کے اس شعر نے لاہور میں ہلچل مچا دی اور اسی لیے حکیم ابو الفتح نے بڑی تعریف کر کے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے جب اس سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اس شعر کے بجائے ایک اور شعر جس میں زمانہ کی شکایت بیان کی گئی پڑھا، جو بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شعر کے اثر کی طرح ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

عشقی خان

یہ ترک میرزادوں میں سے ہے۔ ''علم سیاق'' سے واقف ہے۔ کچھ عرصے تک سرکار اعلیٰ میں میر بخشی بھی رہا۔ قصیدوں اور غزلوں کا ایک دیوان جمع کیا ہے۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں حضور میں کلیات پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت ایک نیا قصیدہ اور غزل سنانے لگ گیا۔ اس کے مضحکہ انگیز شعر جیسے بھی ہوتے تھے سب کو معلوم تھا۔ اس

لیے بادشاہ نے اسے روک دیا اور کہا ابھی رہنے دو جس وقت تم اپنی کلیات پیش کرنا ان اشعار کو بھی اس میں شامل کر لینا ہم سب کچھ ایک ہی بار سن لیں گے۔ خنجر بیگ کی مثنوی کی طرح طویل مثنوی بھی کہی ہے:

خوارو بی اعتبار و زشتم من
چہ بلا مردک یاشتم من

علمی

اس کا لقب میر مرتضیٰ ہے۔ دوغلباد کے سیدوں میں سے ہے۔ خان زمان کا معتبر امیر رہا ہے۔ ایک وقت بدایوں اس کے ماتحت تھا۔ صاحب علم و فضل اور نہایت خوش طبع آدمی تھا۔ بدایوں کے اکابرین میں سے جھجھار خان نامی ایک شخص نے جس کا تخلص زاہد تھا، اپنی مثنوی کا ایک شعر جو بسم اللہ کی تعریف میں تھا اس کے سامنے پڑھا:

کنگرۂ سین چو خندان شدہ
خندۂ او از پی دندان شدہ

میر کا شعر ہے:

ای دل ہمہ آن سگ کو خواب ندارد
از نالہ و فریاد و فغان کہ تو داری

میر عزیز اللہ

قزوین کے سیفی سیدوں میں سے ہے۔ فن سیاق اور منشی گری میں بہت ماہر تھا۔ دوسرے علوم سے بھی واقف تھا۔ کچھ عرصہ تک شاہی دیوان بھی رہا۔ جب ہندستان میں کروڑیوں کا تقرر ہوا تو وہ 5 کروڑ کی تحصیل پر سنبھل میں مقرر کیا گیا تھا اور اس صوبہ کا نظم و نسق اور مالیات کا انتظام کرتا رہا، آخر دنوں میں بادشاہی دفتر کے محاسبہ کی زد میں آ گیا جو کچھ پونجی جمع کی تھی وہ سب سرکاری خزانہ میں جمع کرنی پڑی اور اسی مصیبت میں فوت ہو گیا۔ اس

کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ایک نظم ''شہر آشوب'' اور ایک ''منظوم نامہ'' اور ایک ''گل و مل'' کے نام سے رسالہ ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

سبزہ خط رستہ زلعلش بسی با آب و تاب
زانکہ دایم می خورد از چشمۂ خورشید آب

چنین کا فتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم
نسیم ولطف واحسانت مگر بر دارد از خاکم

میرزا عزیز کوکہ

اعظم خان کے لقب سے مشہور ہے۔ نہایت با اخلاق، نیک، صاحب علم و فضل ہے۔ امرائے شاہی میں اس جیسا سمجھ دار اور مدبر کوئی اور نہیں ہے۔ وہ پہلے کبھی شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ ان صفحات کو ہم اس کے کلام سے خالی نہیں رکھنا چاہتے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

چون نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازین خواہم زدن بر شیشۂ ناموس سنگ

ای زلف چلیپائی تو زنجیر دل من
وی عشق تو آمیختہ با آب و گل من

آگرہ میں ایک باغ ''جہاں آرا'' کے نام سے بنوایا تھا اور اس باغ میں ایک مکان نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ کتبہ پر یہ رباعی لکھوائی تھی:

یارب بہ صفائی دل ارباب تمیز   کان نزد تو ہست خوب تر از ہمہ چیز
چون گشت بتوفیق تو این خانہ تمام   از راہ کرم فرست مہمان عزیز

اس کے جو کارنامے ہیں وہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے ان میں سب سے بڑا تو

اس کا وہ دلیرانہ حج پر جانا ہے لیکن آہ اس کا وہ لوٹ کر آنا۔

عہدی شیرازی

قصیدہ اور غزل ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا۔ جب دہلی آیا تو قاضی محمد کی معزولی کے بعد جو ایک کٹر شیعہ اور بد معاش آدمی تھا حکیم عین الملک مرحوم نے لاہور میں اس عہدے پر مقرر کرانے کی بڑی کوشش کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا بس شیخ چلی کا خواب دیکھ کر رہ گیا اور حکیم کے ساتھ دکن چلا گیا۔ حکیم کے مرنے کے بعد اس کے حالات کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا اور اس کا کیا ہوا؟

از خون لب شکوہ ام اگر تری شد   از روزن دیدۂ دوردل بری شد
اشکم ہمہ شعلہ ریز آتش می ریخت   آہم ہمہ تاب دادہ اخگری شد

حکیم عین الملک جس وقت لاہور سے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا حکیم سنائی کی یہ رباعی محفل میں پڑھی گئی:

می زن نفس کہ ہم نفس نزدیکست   وین مرغ مراد از قفس نزدیکست
تا کی گوئی کہ دورم از دلبر خویش   در خود بنگر کہ یار بس نزدیکست

عہدی کے اشعار ہیں:

آزادیٔ این مرغ قفس نزدیکست   وین شعلہ بکار خاروخس نزدیکست
از من بنواد بال و پر بگریزد   گر غم داند کہ باچہ کس نزدیکست

عنایت اللہ کاتب

شیراز کا رہنے والا ہے۔ ان دنوں شاہی کتب خانہ میں منتظم ہے۔ نہایت خوش طبع اور ذہین ہے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے:

رباعی

افتادہ چو مرغ بی نوا در قفسم
بی ساز صدا چو دل شکستہ جرسم
با آنکہ حقیر تر ز مور و مگسم
بگرفت زتنگی دو عالم نفسم

وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

گر پویہ اعضا از بس شتاب
بہم در رود ہمچو اجزای آب

عرفی شیرازی

بلند فطرت، صاحب فہم نوجوان تھا۔ ہر طرح کے شعر بہت اچھے کہے ہیں، لیکن کچھ اتنا متکبر اور مغرور تھا کہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ بڑھاپے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔

جب ولایت سے فتح پور آیا تو سب سے پہلے شیخ فیضی سے اس کی دوستی ہوئی۔ شیخ نے بھی اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس آخری سفر میں اٹک کے قریب فیضی کے مکان پر ہی رہتا تھا اور اس کی ضروریات شیخ کے گھر سے پوری ہوتی تھیں لیکن جیسا کہ فیضی کی عادت تھی وہ ہر شخص کے ساتھ بس ہفتہ دو ہفتہ کی دوستی کرتا تھا پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا تھا۔ دونوں میں رنجش پیدا ہو گئی اور عرفی نے حکیم ابوالفتح سے دوستی کر لی اور اس کی سفارش سے خان خاناں کی خدمت میں چلا گیا اور وہاں اپنے فن و ہنر کے جوہر کھلائے۔ روز بروز اس کی شعر گوئی اور مراتب میں ترقی ہونے لگی۔

ایک دن شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا، فیضی ایک کتے کے پلّے سے کھیل رہا تھا۔ عرفی نے پوچھا "اس صاحبزادہ کا کیا نام ہے"؟ فیضی نے کہا: "عرفی" اس نے برجستہ جواب دیا "مبارک ہو" اس چوٹ سے فیضی تلملا اٹھا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، چپ رہا۔ عرفی اور

حسین ثنائی نے شاعری میں بڑا نصیب پایا ہے۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جس میں کتب فروش ان دونوں کے دیوان کو لیے ہوئے کھڑے نظر نہ آئیں۔ ان کے دیوان عراق اور ہندستان میں سب تبرکاً خریدتے ہیں اس کے برعکس شیخ فیضی اپنی کتابوں کو لکھوانے، ان کو سونے چاندی کی نقاشی سے سجانے اور سنوارنے میں بے انتہا پیسے خرچ کرتے ہیں۔ لیکن کوئی اس کی کتاب کو چھونے منھ تک نہیں پوچھتا ہے۔ سوائے اس مسودے کہ جو وہ خود ادھر ادھر بطور ہدیہ روانہ کرتا رہتا ہے:

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

عرفی کے اشعار کا ایک دیوان ہے "مخزن اسرار" کی بحر میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

رباعی

فردا کہ معاملان ہر فن طلبند
حسن عمل از شیخ و برہمن طلبند
آنہا کہ درودۂ جوئی نستانند
و آنہا کہ کشتۂ بخرمن طلبند

غزنوی

یہ میر محمد خان کلال کا تخلص ہے جو بڑا عالی مرتبہ اور مشہور امیر تھا۔ اس کی محفل کبھی اہل علم اور شعرا سے خالی نہ رہتی تھی۔ سرکاری مصروفیات کے باوجود وہ شعر کہنے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ اس نے ایک بڑا دیوان مرتب کرلیا تھا اور بادشاہ سے کہتا تھا کہ تمہارے عہد کی بڑائی یہی ہے کہ مجھ جیسا آدمی اس عہد میں موجود ہے:

درجوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت
آنچہ باقی بود آن ہم درپشیمانی گذشت
ای جوان جز تخم نومیدی نکشتی درجہان
موسم پیری رسید و وقت دہقانی گذشت

جس زمانے میں وہ سنبھل کا حاکم تھا اس نے شیخ سعدی کی اس غزل کو طبع آزمائی کے لیے پیش کیا:

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

اور خود اس نے اس پر یہ شعر کہا:

دلی کہ چہرۂ ساقی زیادہ گلرنگ است
بجوش بادہ بر آواز نی کہ دل تنگ است

میر لماتی اور دوسرے شاعروں نے اپنے اپنے قرینے اور سلیقے و ہنر کے مطابق اور اس زمانہ کی زبان کے مطابق جواب دیے۔ جمال خان مرحوم بدایونی، خان موصوف کے مقرب و مصاحب تھے اور بڑے لطیف طبع آدمی تھے۔ انھوں نے جو غزل کہی تھی اس کا مطلع ہے:

ترا رخ از پی عشرت مدام گل رنگ است
مرا بہ فکر و دعانت چو غنچۂ دل تنگ است

اس زمانہ میں میں(92) کانت و گولہ میں حسین خان کی خدمت میں تھا کہ رات کے وقت یہ غزل میاں جمال خان کے خط کے ہمراہ موصول ہوئی۔ دوسری صبح کو ہی خبر ملی کہ وہ سنبھل کی عیدگاہ میں عید قربان کے دن بیہوش ہو گیا اور عین جوانی میں محبوب حقیقی سے جا ملا۔ اس کی لاش بدایوں بھیجی گئی۔ اس کی تاریخ وفات ''آہ جمال خان بمرد'' نکالی گئی:

گردون در آفتاب سلامت گرانشاند
کو را چو صبح روشن اندک بقا نکرد

غباری

یہ قاسم علی ولد حیدر بقال کا تخلص ہے جو بڑا بد مزاج، مغرور اور متکبر مشہور تھا۔ اپنے آپ کو قریشی جتلاتا تھا لیکن یہ بات طے شدہ تھی کہ جس کا نسب اونچا نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو قریشی سے منسوب کر دیتا ہے۔ اس کی محفل میں اگر اس کا باپ چلا آتا تو اسے بڑی شرم معلوم ہوتی تھی اور بگڑنے لگتا تھا اس کا باپ اس سے کہا کرتا تھا تو چاہے کتنی شیخی کر لے، میں تو اپنے آگرہ والی دکان پر بیٹھتا ہوں پھل اور معجون وغیرہ بیچتا ہوں اور ہر آنے والے سے چاہے وہ پوچھے یا نہ پوچھے میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ قاسم علی خان میرا حقیقی بیٹا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟ کہنے لگے 8 اور ان کی تفصیل یہ ہے:

دو از من است و دو بی بی و دو از ہر دو
دوئی دگر کہ نہ از بی بی است و نی از من

قاسم پہلے بڑا حسین جوان تھا اور مجلس شاہی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔ پھر ترقی کر کے بادشاہ کا نائب بن گیا اور خان کا خطاب و منصب پایا۔ وہی مثل ہے کہ ایک نے دوسرے سے کہا تو نے سنا فلاں کو خان بنا دیا گیا ہے۔ اس نے جواب میں کہا اچھا ہوا وہ کمینہ اسی قابل تھا۔

میں[92] اسے 21 سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ہمیشہ "متوسط" کا سبق پڑھتا رہتا ہے اور اپنے استادوں سے زبردستی تسلیمات کراتا ہے۔ اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو پھر اس کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی مار ہے کہ اس کا سبق کبھی تک "وضع لفظ منفرد" کے قاعدہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اب کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ اس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

ما سوای آب مائل و حمام جائی ماست
حمام خانہ ایست کہ خاص از برای ماست

1000ھ/1591ء میں ہزار حسرت اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی تاریخ "قاسم خاں ابلہ" سے نکلتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی وفات 1001ھ/1592ء ہے۔ اس کے مطابق بجائے "ابلہ" کے جاہل کا لفظ پورا اترتا ہے۔

غرتی حصاری

صاحب دیوان شاعر ہے، کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ کہا کرتا تھا کہ "میں ایک دن ماوراالنہر میں سلطان الاولیاء شیخ حسین خوارزمی کی محفل سماع میں حاضر تھا اور قوال یہ رباعی گا رہے تھے۔

عمریست کہ من زپوست پوستان تو اَم در دائرہ حلقہ بگوشان تو اَم
گر بنوازی من از خروشان تو اَم در ننوازی من از خموشان تو اَم

حضرت شیخ آخری بیت پر سر دھن رہے تھے۔ اس وقت اچانک ان کی صحبت کی برکت سے مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ میں اپنے ہوش میں نہ رہا اور میری زبان سے یہ شعر نکل گیا:

گر بنوازی مرا و گر ننوازی در دائرہ حلقہ بگوشان تو اَم

یہ سن کر حضرت شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی وجد میں گھمانے لگے۔ اس وقت جو لذت نصیب ہوئی وہ میرے دل سے جاتی نہیں۔ 966ھ/1558ء میں آگرہ میں شیخ فرید کے مدرسے کے قریب انتقال ہوا۔ اس کا یہ مطلع مشہور ہے:

دھان یار با من دوش رمزی گفت پنہانی
کہ من سر چشمۂ آب حیاتم ہیچ می دانی

غیرتی شیرازی

عرصہ تک ہندستان میں رہا، پھر شیراز چلا گیا۔

بقتل غیر راضی نیم زیرا کہ می دانم
اجل زہر ہلاک از تیغ جلاد من بردہ

فارغی شیرازی

یہ شاہ فتح اللہ کا بھائی ہے جس کا ذکر آ چکا ہے۔ ایک مرتبہ ہندستان آیا تھا۔ بیرم خان خانان نے اس سے درخواست کی کہ: "فارغی شیخ ابو الواجد خوانی کا تخلص ہے اور مجھے ان سے بڑی عقیدت ہے، اس لیے تم اپنا تخلص فایقی رکھ لو"۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے فایقی ہی تخلص رکھا لیکن جب عراق گیا تو اپنا پہلا تخلص اختیار کر لیا۔ دوسری بار ہندستان آیا اور یہیں پیوندخاک ہو گیا۔ اس کا لڑکا میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کا قائم مقام تھا۔ میں[92] نے اصطرلاب کے 20 باب اسے پیش کیے تھے۔ نہایت بلند فطرت اور باہمت آدمی تھا۔ اس کا بھائی میر شریف بھی بڑا عالم و فاضل تھا۔ میر تقی کہا کرتا تھا میرے خاندان میں ہم دو بھائی اور شاہ فتح اللہ سنی مذہب کے پیروکار ہیں۔ باقی سب کٹر شیعہ ہیں۔

یہ شعر میر فارغی کے ہیں

خوش آن کز وعدہ ات خوش حال در محنت سرای خود
نشینم منتظر ساعت بہ ساعت سوی در بینم

بجای میر ساند عشق آخر آشنائی ھا   کہ عاشق خویش را بیگانہ باید از جدائی ھا
برتن خاکی مجنون نبود داغ عیان   کزپی قافلہ لیلی است برد ماندہ نشان

فہمی طہرانی

بڑا جہان نورد سیاح تھا۔ ہندستان آنے کے بعد ولایت چلا گیا۔ موزوں طبع آدمی تھا۔

زعشق آن شعلہ خواہم در تن غم پرور افتد
کہ تا گریم ز سوزش آب در خاکسترم افتد

دل را با خیال پیاش و ہم قرار　　　ہر چند این محال میسر نمی شود

فہمی سمرقندی

یہ خوش طبع سخن گو شاعر نادری سمرقندی کا بیٹا ہے۔ ہندوستان آیا تھا لیکن واپس چلا گیا۔

تا خاصیت می کن پیر مغان گفت
از تو بہ پشیمان نہ چنانم کہ توان گفت

فکری

انکا اصل نام سید محمد جامہ باف ہے اور میر رباعی کے نام سے مشہور ہے۔ رباعیات میں وہ اپنے زمانہ کا خیام تھا۔ جونپور کے سفر میں 973ھ/1565ء میں فوت ہوا۔ اس کی تاریخ ”میر رباعی سفر نمود“ سے نکالی گئی ہے:

رباعی

دارد فکری سری کہ سامانش نیست　　　دردیست بدل نہان کہ درمانش نیست
عمریست کہ پا کردہ ز سر حد رہ عشق　　　سر کردہ رہی کہ ہیچ پایانش نیست

فکی

چغتائی کنیز زادہ ہے۔ بہت زیادہ سفر کیے ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ لڑائی میں بہادری کی وجہ سے خان کا خطاب حاصل کیا ہے بعض وجوہ کی بنا پر اس منصب سے معزول کردیا گیا۔ کہتا تھا 3 شین یعنی شمشیر، شعر اور شطرنج کوئی مجھ سے جیت کر نہ جا سکا ہے۔ اس کی بات پر اکبر نے برجستہ کہا: ”شیطنت کا شین بھی“۔ کچھ عرصہ تک قید میں رہا۔ رہائی پائی تو دیوانہ ہوگیا اور جنگلوں کی طرف نکل گیا پھر اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کا ایک دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس کے شعر بھی بگڑے ہوئے چغتائی امیر زادوں کے رنگ میں ہیں۔

رسد ہر کس بمقصودی زیارب یارب شبہا
چرا مقصود من حاصل نشد یارب زیارب ہا

اس کا ایک مطلع مجھے[93] پچاس سال سے برابر یاد ہے۔ یہ تاریخ نظامی میں بھی لکھا ہوا ہے:

گویم بہر تشریف قدومت خانہ دارم
غرضم خاکسارم گوشہ ویرانہ دارم

تا گل روی تو از بادۂ گلفام شگفت
بادہ از عکس گل روئی تو در جام شگفت

فسونی یزدی

سید اور قصہ گو ہے۔ شعر سے مناسبت رکھتا ہے۔ ٹھٹھہ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا ہے:

بی جہت از پیش ما جنسی گذر کردن چہ بود
گر گذر افتادہ سوئی او نظر کردن چہ بود
در سخن بودی بغیر از دور چون دیدی مرا
گر حجاب از من نہ کردی مختصر کردن چہ بود

فیروزہ کابلی

میرزا محمد حکیم کا خانہ زاد ہے۔ اس کا تعلق سنگا قبیلے سے ہے، غالباً ہندستان کے جنگلوں میں فوج کے ہاتھ آگیا اور ہمایوں بادشاہ کی ملازمت میں رہا اور میرزا محمد حکیم کے ساتھ پرورش پائی۔ نہ تو پڑھا لکھا ہے اور نہ اس کا خط ہی اچھا ہے، البتہ موسیقی میں دخل رکھتا ہے اور طنبورہ کو ایک خاص انداز میں بجاتا ہے۔ پٹنہ کے سفر سے واپسی کے وقت قاضی خان بدخشی کے ہمراہ جونپور سے آکر شاہی ملازمت اختیار کی۔ علم تو اسے نصیب نہ ہوا لیکن اس کے اشعار اثر و شوخی سے خالی نہیں ہیں۔

غیر منظور نظر ساختہ یعنی چہ؟
بندہ را از نظر انداختہ یعنی چہ؟
کس ندیدیم بدور تو باین حسن و جمال
قیمت حسن بر انداختہ یعنی چہ؟

سنا ہے کہ اب وہ اکثر متقدمین و متاخرین کے دیوان کے جواب کہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

فہمی استرآبادی

بڑا مستعد آدمی تھا، دہلی میں فوت ہوا۔

رباعی

ای روی تو در عرق گل آب زدہ   زلف تو ورو بنفشۂ تاب زدہ
چشمان تو چون دوست در یک بالین   سر بہ سر ہم نہادۂ و خواب زدہ

ملک الشعراء شیخ فیضی

مختلف فنون شعر، معمہ گوئی، عروض و قافیہ، تاریخ، لغت، طب اور انشاء میں بے مثل شخص گزرا ہے۔ پہلے پہل اس نے اپنا تخلص مشہور رکھا تھا۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی کو علامی کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے اسی وزن پر فیاضی تخلص رکھ لیا، لیکن یہ تخلص سازگار نہ ہوا۔ ایک دو ماہ بعد ہی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ فیضی بڑا جدت پسند ھزل گو، متکبر اور مغرور تھا۔ نفاق، خباثت، ریاکاری، حسب جاہ اور رعونت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مسلمانوں سے تو اسے دلی عناد تھا۔ اصول دین کی اہانت کرتا رہتا تھا۔ صحابہ کرام متقدمین اور متاخرین اہل علم اور مشائخین زندہ یا مرحوم ہر ایک کی مذمت اور بے ادبی کرنے میں اسے باک نہیں ہوتا تھا۔ تمام علما، صلحا اور فضلا کی رات دن توہین کرتا رہتا تھا۔ اس سے تو یہودی، نصرانی ہندو اور مجوسی لاکھ درجہ بہتر تھے۔ ایسا بدعقیدہ تھا کہ تمام حرام باتوں کو شریعت کی ضد میں حلال اور فرائض کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے جو بے نقط تفسیر لکھی تھی وہ بھی بس اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے تھی۔ کم بخت نے تفسیر بھی مستی اور ناپاکی کی حالت ہی میں لکھی۔ اس کے پالے ہوئے کتے بھی اس کے مسودوں کو

ناپاک کرتے رہے۔ اس کا عجب وغرور، ہٹ دھرمی اور بے دینی دھری کی دھری رہ گئی اور اسے اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہونا پڑا کہ خدا نہ کسی کو دکھائے نہ سنوائے۔

جس وقت بادشاہ اس کے آخری دم پر پہنچے تو ان کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگا۔ یہ بات خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھی ہے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ سوج گیا تھا اور لب سیاہ پڑ گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا: ''اس کے لبوں پر اس قدر سیاہی کیوں ہے؟ کیا شیخ نے اپنے ہونٹوں پر مسی لگائی ہوئی ہے؟'' ابوالفضل نے کہا: ''نہیں یہ خون جم گیا ہے جو قے میں نکلا تھا''۔ ناپاک، بدبخت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعنے کرنے والے کا ایسا حشر ہونا چاہئے تھا اور یہ بھی کم تھا۔ اس کی مذمت میں لوگوں نے بہت سی تاریخیں کہی ہیں۔

فیضی بی دین چو مرد سال وفاتش   گفت سگی از جہان رفت بحال قبیح

ایک اور تاریخ ہے:

سال تاریخ فیضی مردار   شد مقرر بچار مذہب نار

کسی اور نے کہا:

فیضی نجس دشمن نبویؑ   رفت وبا خویش داغ لعنت برد
سگکی بود و دوزخی زان شد   سال فوتش چہ سگ پرستی مرد

پورے 40 سال تک شعر کہتا رہا لیکن اس کے سب شعر بس عجیب ہی ہیں۔ ہذیان خوب جمع کیں مگر مغز کسی میں نہیں ملتا۔ سارے شعر بے مزہ ہیں، البتہ مہمل باتوں کے بیان کرنے، فخر و شان دکھانے اور کفر بکنے میں سب سے آگے تھا۔ اس کے کلام میں نہ ذوق عشق کا پتہ چلتا ہے، نہ معرفت ملتی ہے اور نہ درد کی لذت، حالانکہ اس کے دیوان اور مثنویوں میں 20 ہزار سے زاید ہی شعر ہوں گے۔ اس کے کسی شعر نے کبھی کسی کی افسردہ دلی دور نہیں کی اور یہ بدبختی کہ اس کا کوئی شعر کسی نے خواہش سے پڑھا نہ یاد کیا۔ اس سے تو معمولی اور ادنیٰ شاعر زیادہ خوش نصیب رہے:

شعری کہ بود زنکتہ سادہ
مانند صحیفہ عمر یک سوادہ

لطف یہ کہ اپنی جاگیر کا سارا روپیہ اپنے جھوٹے خیالات کی تشہیر میں صرف کرتا رہتا تھا۔ اشعار اور تحریریں لکھوا لکھوا کر دور و نزدیک کے شناساؤں کو بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن کوئی شخص دوبارہ ان کو چھونے کا بھی روادار نہیں ہوتا تھا

شعر تو مگر ز حرمت ستر آموخت
کز گوشۂ خانہ میل بیرون کند

اس کے خود منتخب کردہ شعر جو بطور یادگار اس نے لکھ کر میرزا نظام الدین وغیرہ کو دیئے تھے ان میں سے چند شعر یہ ہیں

مژگان مبند چون قدم از دیدہ میکنی   مردان رہ برہنہ نہاوند پائی را
چہ دست می بری ای تیغ عشق اگر داداست   ببر زبان ملامت گر زلیخا را

نظر فیض چو برخاک نشینان فگنیم   مور را مغز سلیمان رسد از قسمت ما

مشکل کہ سیل دیدہ بگردش در آورد   طوفان نوح می طلبد آسیائی تو

لطفی مجم

بادشاہ کا مصاحب تھا مگر بڑا نیک دل انسان تھا۔ اسے اساتذہ کے شعر بہت یاد تھے۔ کسی بھی موضوع پر وہ رات بھر میں ایک ہزار شعر سنا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہا اور ان کی مدد سے زاد راہ حاصل کر کے سفر پر چلا گیا۔

گلگل از تاب شراب آن روی چون گلنار شد
گلفروشان مژدہ تان بادا کہ گل بسیار شد

دلم گر شعلۂ آتش شود افسردگی دارد   گل بختم گر از جنت رود پژمردگی دارد

ہر آہ کہ در حسرت بالای تو کردم
نخل چمن آرای پشیمانی من شد

میر مرتضیٰ شریفی شیرازی

یہ میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں۔ ریاضی، حکمت، منطق، کلام اور دوسرے علوم میں تمام علمائے زمانہ سے لائق و فائق تھے۔ شیراز سے مکہ معظمہ جا کر ابن حجر سے علم حدیث کا درس لیا تھا اور تدریس کی اجازت حاصل کی تھی۔ وہاں سے دکن اور دکن سے آگرہ آئے اور قدیم وجدید بیشتر علماء سے آگے بڑھ گئے۔ پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ 974ھ/1566ء میں انتقال کیا۔ انھیں امیر خسروؒ کے قریب دفن کیا گیا۔ میر محسن رضوی نے یہ تاریخ لکھی ہے۔

رفت تا میر مرتضیٰ از دہر   علم گویا ز نسل آدم رفت
بہر تاریخ رفتنش محسن   گفت علامۂ زعالم رفت

یہ شعر ان کی یادگار ہے:

خاطر جمع ز اسباب میسر نشد
تخم جمعیت دل تفرقۂ اسباب است

محوی

یہ میر محمود منشی کا تخلص ہے جو تقریباً 25 سال ممالک محروسہ ہندستان کا منشی رہا۔ نقیب خان اس کا داماد ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا۔ منشیانہ اشعار کہتا تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے جو بیرم خان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہوئی ہے:

از کون و مکان نخست آثار نبود   کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود   شد مطلع دیباچہ دیوان شہود

منشی نے یہ رباعی ہمایوں بادشاہ کے عطا کئے ہوئے گھوڑے کی تعریف میں کہی تھی:

ای خسرو جم سپاہ عالی مقدار   دارم اسپی کہ ہست بس لاغر و زار
بروی چو شوم سوار در ہر روسہ گام   افتد کہ تو ہم یک دوسہ گامی بردار

اس انتخاب کی تصنیف کے دنوں میں فیضی نے ایک دن میرے (94) ہاتھ میں علاء الدولہ کا تذکرہ دیکھ کر لے لیا اور اس ورق کو جس میں اس کا ذکر تھا لے کر پھاڑ ڈالا تھا۔

میر محسن رضوی

کبھی کبھی شعر کہتا ہے۔ میر محمود منشی کے انداز کا آدمی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہے:

آن مہ کہ بدیدہ جایگاہش نیکوست
منظور نظررفی چو ماہش نیکوست
بحسن سر خود نہادہ بر پایش
چون مر صفت عارض ماہش نیکوست

موجی

یہ قاسم خان بدخشی کا تخلص ہے جو ہمایوں کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اصناف شعر کو بخوبی جانتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا۔ یوسف زلیخا کے طرز میں ایک مثنوی بھی کہی ہے جس میں 6 ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں محبوب کی تعریف یوں کرتا ہے:

مرصع موئی بندی بی بہائیش   .زبی قدری فتادہ در تفائیش
نکرد از لعل ناب آویزۂ گوش   کہ بود آویختہ دلہای مدہوش

آخر عمر میں سپاہ گری کا پیشہ ترک کر کے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شاعری سے بھی استعفیٰ دے دیتا۔ اس کی وفات آگرہ میں 979ھ/1571ء میں ہوئی۔

میرزادہ علی خان

محترم بیگ کا لڑکا جو ہمایوں کا مشہور امیر تھا۔ میرزادہ نہایت با اخلاق اور موزوں طبع آدمی

تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا:

شام چو از چہرہ فگندی نقاب
تاب نیاورد و نشست آفتاب

996ھ/1588ء میں کشمیر میں جب کہ یعقوب ولد یوسف خان کشمیری نے محمد قاسم خان میر بحر پر رات میں چھپ کر حملہ کیا تو یہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

معزی ہروی

طباطبائی سیدوں میں سے ہے۔ بچپن میں کامران مرزا کا ہم سبق تھا۔ ہندوستان میں 50 سال تک رہا 982ھ/1574ء میں اسی جگہ فوت ہوا۔ یہ دو شعر اسی کے ہیں:

چند داری ای فلک چون ذرہ سرگردان مرا
تا بکی داری بغربت بی سرو سامان مرا

گفتم بآہ درد دل خود برون کنم
دردم بآہ کم نشود آہ چون کنم

مرادی استرآبادی

استرآباد کے سیدوں میں سے تھا۔ 979ھ/1571ء میں فوت ہوا۔ اس کے اشعار مشہور رہے ہیں۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بنمود رخ ز پردہ کہ صبح صفاست این   یعنی کمال قدرت صنع خداست این
طالع نشد شبی ز رخت کوکب مراد   بی طالعی و تیرگی بخت ماست این

کفر زلفش کہ بود مایۂ ایمانم ازو
تا مسلمانم اگر روی بگردانم ازو

مشفقی بخاری

مرو کا رہنے والا ہے۔ بعض تو اسے قصیدہ میں اپنے زمانہ کا سلیمان سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ وہ ماوراء النہری رنگ میں شعر کہہ لیتا تھا اس کا کلام سرد اور بے سوز تھا۔ دو مرتبہ ہندستان آکر واپس چلا گیا:

چون نقد ہستی مجنون غم نگاری بود
خدا بہ نقد بیامرزدش کہ یاری بود

اس کی ہجو نہایت رکیک زبان میں ہے۔ اس کی ہجو ملیح اس قطعہ سے نمایاں ہے جو اس نے آخری بار ہندستان آنے پر کہا تھا۔

کشور ہند شکرستانی است
طوطیانش شکر فردوس ہمہ
ہند وان سیاہ چو مگسان
چہرہ بندوکوچہ پوش ہمہ

میلی ہروی

نام میرزا قلی تھا۔ صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس کی شعر گوئی کا ملکہ اس درجہ پر تھا کہ اگر وہ اس زمانہ تک زندہ ہوتا تو اس زمانہ کے اکثر خام کار شعر گوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ متاخرین میں سے کوئی اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ برسوں نورنگ خان کی خدمت میں رہا اور اس کی مدح میں بڑے عمدہ قصیدہ کہے ہیں۔ کہتے ہیں نورنگ خان نے بدگمانی کی وجہ سے اسے زہر دے کر مروا ڈالا تھا۔ اس کی وفات مالوہ میں ہوئی تھی۔

دانستۂ کہ مہر تو با جہان نمیرود
کز خاک کشتگان گذری سرگردان ہنوز

نہ آشنا و نہ بیگانہ می دانم   کہ اختلاط چنین را کسی چہ نام کند

بی قرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق
دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد
امتحان نام نہد دل ستمی کز تو کشد
خویش را چند باین حیلہ شکیبا دارد

ملک قمی

اسے ملک الکلام بھی کہتے ہیں۔ درویشانہ وضع قطع تھی۔ دکن میں رہتا تھا۔ نہایت دردمند آدمی تھا۔ ہمیشہ اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ اہل دکن نے ایک فساد میں اسے ملک عدم پہنچا دیا تھا

آب شمشیر شہادت شست گرد اختلاف
گبر و ترسا و مسلمان کشتۂ یک خنجر اند

سازند لخت لخت درون فسردگان   وانگاہ بر جراحت دلہا نمک زنند

تو مرہم دل ریشی بخندۂ نمکین
ولی بان مژہ تیغ نشتر جگری
بقدر حوصلہ عشق نیست بادہ عشق
تو شیر بیشۂ ما نیستی کہ باخبری

سحاب چشم کہ دادہ است نرگست در آب   کہ از نگاہ تو بوئی ستم نمی آید

مداحی بدخشی

شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ میرزا عزیز کوکہ کے یہاں ملازم تھا۔

اس کا شعر ہے:

دلا صد فتنہ بر بازان قد و بالا ست می گوئی
ازان بالا بلا بسیار دیدم راست می گوئی

اس زمین میں بہتوں نے طبع آزمائی کی اور ایک دوسرے کے مضمون کو پامال کرتے رہے جس کی وجہ سے یہ زمین بالکل ہی بے جان ہوگئی۔ انہی میں سے یہ شعر بھی ہیں:

بلا و فتنہ در عالم ز قدم خاست می گوئی
بلی می آید از بالا بلا با راست می گوئی
بہ شہر از قامتم ہر سو قیامت خاست می گوئی
قیامت قامتی داری مہ من راست می گوئی

ملا مقصود قزوینی

اپنے زمانہ کا نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے:

در عالم و قاسمک کوئی تو رام ماست
اقبال رام گشتہ و عالم بکام ماست
عشاق را تمام نظر بر جمال تست
ای شاہ حسن روئی تو ماہ تمام ماست

اس نے یہ قصیدہ نقیب خان کے داماد قاضی یحییٰ قزوینی کے نام پر کہا ہے اور خواجہ سلمان مذیل کے رنگ میں:

دگر ز سردی دی رفت آسمان در تاب   ز تاب صاعقہ خورشید ماند زیر نقاب
نہنگ بحر ز بیم سہام صرصر دی   نہاد بر سر خود خود آہنین ز حباب
دگر ز کثرت برف در شدت سرما   زمین بلرزہ در آمد چو قلزم سیماب
سفید گشت سواد زمین ز لشکر برف   سیاہی از دل آفاق شد چنان نایاب

ملا مقصود نے 977ھ/1569ء میں آگرہ میں وفات پائی۔ اس کا باپ ملا فضل اللہ بھی بڑا نیک اور معزز شخص تھا۔ یہ قطعہ اسی کا ہے:

فضلی چو غنچہ خلعت ہستی بخود مپیچ بر چہرہ چین می فگن و دامن بخون مکش
چون گل شگفتہ باش و چو سرو از غم جہان آزاد باش و منت این چرخ دون مکش

محتی حصاری

کچھ پڑھا لکھا تھا، دینی مدرسے میں رہتا تھا، بعد میں حسب الحکم اسے سرہند کی قضاوت پر مقرر کیا گیا تھا۔ اسے شاہی دربار سے محتی کا تخلص عطا ہوا تھا۔ اس نے سرہند میں وفات پائی۔

یافتم در تنگی جائی کف پایش را چون تمام رخ خود یافتہ ام جایش را

بفکر موئی میانت دل کسان گم شد
دل شکستہ ما ہم در ان میان گم شد

موسوی مشہدی

اس کی نسبت اس کے تخلص سے ظاہر ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا

ترا پنہان نظر سوئی من راز است میدانم
تغافل کردنت از بیم اغیار است میدانم

خواجہ معظم

یہ اکبر کا ماموں اور حضرت شیخ جام کی اولاد میں سے تھا۔ خبطی اور پاگل سا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کو بے وجہ قتل کر دیا اور قصاص میں 971ھ/ 156 ء قتل کیا گیا۔

خواجہ اعظم معظم نام کہ از و بود دہر را زیور

زن خود را بکشت و کشت اورا   از غضب شه جلال الدین اکبر

موزوں

شیخ پیر آگرہ کا لڑکا ہے۔ سات طریقوں پر خوش نویسی کرتا تھا۔ میں (1) نے اسے سلیم شاہ کے عہد میں پشاور میں دیکھا تھا۔ اس کا لڑکا بھی نوجوان اور قابل تھا۔ معما اور خوش خطی میں ماہر تھا۔ چھوٹی بڑی شطرنج خوب کھیلتا تھا۔ یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

مرا چه سود ز گلهای رنگ رنگ بهار   چو نیست بی تو دلم را به هیچ رنگ قرار

گواه درد من محو شد   سرشک سرخ و رخ زرد و دیدهٔ بیدار

ای یافته ز عارض تو ماهتاب تاب   دلی سوخته ز رشک جمال تو آفتاب

هر ناوک تو ای مه ابرو کمان ما
چون مغز جا گرفته بهر استخوان ما

ایک ہندستانی سے اس سے زیادہ موزوں طبعی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

محمد یوسف

بڑا حسین نوجوان تھا۔ کابل میں پیدا ہوا اور ہندستان میں نشو و نما پائی۔ خوش خطی میں اشرف خان کا شاگرد تھا۔ عین عالم شباب میں 980ھ/1582ء میں سورت کے قلعہ کے محاصرے میں گجرات میں فوت ہوا۔ اشرف خان نے اس کے لیے مصرع تاریخ کہا اور اس پر میر علاء الدولہ نے قطعہ مکمل کیا:

محمد یوسف آن مصر ملاحت   برفت از دهر اشک از دیده ریزان
پی تاریخ او گفتا عزیزی   کجا شد یوسف مصرای عزیزان

یہ غزل بھی محمد یوسف کی ہے:

خوش وقت آنکه جای به میخانه ساخته   در پای خم به ساغر و پیمانه ساخته

آن کس کہ دادہ شیوۂ مستی بچشم یار　　　مستم ازان دو نرگس مستانہ ساختہ

منظری سمرقندی

خوش کلام شاعر تھا۔ آگرہ میں بیرم خاں کی سرکار میں ملازم تھا۔ ایک شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ چند داستانیں بھی لکھ لی تھیں۔ جن میں ایک قصہ سکندر سور کی داستان سے متعلق تھا اور اس میں محمد حسین خان کی بہادری کا ذکر کیا تھا نیز پٹیالی میں اس نے یہ نظم پیش کی۔ حسین خان نے اس سے اس واقعہ کو شروع سے آخر تک بیان کیا۔ اس نے رات بھر بیٹھ کر 304 شعروں کی خاطر خواہ تصحیح و اصلاح کی اور صبح صبح مجلس میں آکر نظم سنائی۔ خان نے بڑا اچھا صلہ دیا۔ اس نظم کا ایک شعر ہے:

زفر نفیرش فلک گشت کر
ملک شد سراسیمہ زان کر و فر

یہ آخری شعر ہی اس کے اپنے خاص رنگ میں ہے، بقیہ کا مضمون پامال اور کافی سنا ہوا ہے۔

ہمیشہ ما ز فراق تو بی سر و پاییم　　　ترا کسی کہ بخاطر نمی رسد ماییم
خط گرد ماہ عارض آن سیم بر نگر　　　بر دو نشان فتنہ دور قمر نگر
بر روی ماہ سلسلہ عنبرین ببین　　　جعد بنفشہ بر رخ گلبرگ تر نگر
بین چشم رہزن و مژدہ ناوک افگنش　　　در رہگذار عشق خطر در خطر نگر

ہدائی ہمدانی

ہندستان میں حیدری کے نام سے مشہور تھا۔ میر محمد خان کلاں کی تعریف میں بڑے اچھے قصیدے لکھے ہیں۔ بد مزاج ایسا تھا کہ ہر ایک سے جھگڑا کر لیتا تھا، ہمیشہ اپنی اسی عادت سے مصیبتوں میں مبتلا رہا:

نمی دانست مجنون عاشقی رسوائی عالم شد
منم رسوائی عشق و عاشقی بر من مسلم شد

مقیمی سبزواری

خان اعظم کے سلسلہ کا شاعر تھا۔ خوش طبع آدمی تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد اپنے وطن واپس چلا گیا۔

خوش آنکہ چون شمار سگ خویشتن کند
ہر چند در شمار نیم یاد من کند

اس کا لڑکا قاضی ابو المعالی ایک شکستہ دل، فانی مشرب نوجوان ہے۔ اپنے باپ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ بواسیر کے عارضہ میں لاہور میں فوت ہو گیا۔ شیخ سعدی کا مطلع ہے

کافران از بت بی جان چہ تمتع دارد
یاری آن بت پرستید کہ جانی دارد

اس نے اسی زمین میں کہا ہے

مردہ حسرت برد آن دم کہ بری دست بہ تیغ
کین عطا روزی آنست کہ جانی دارد

محوی

حال ہی میں ہندستان آیا ہے۔ خان خاناں بیرم خاں کی ملازمت میں تھا۔ اب مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے چلا گیا ہے رباعی کہنے میں بے مثل تھا۔

تا زلف برون ہم چو مہ خواہد بود
تا خط شہ حسن را سپہ خواہد بود
گر خانہ ز خشت آفتابم سازد
روز من بی چارہ سیہ خواہد بود

مظہری کشمیری

صاحب دیوان شاعر ہے۔ اپنے وطن میں سرکاری خدمت پر مقرر ہے۔ یہ شعر اس کے

ذوق شعری کا پتہ دیتا ہے:

اقبال حسن کار ترا پیش می برد
ورنہ صلاح کار ندانستہ کہ چیست

شیخ محمد دہلوی

کیا حسب نسب، کیا علم و فضل ہر لحاظ سے یگانۂ روزگار تھا۔ مدتوں کی شناسائی کے بعد اس سال جبکہ شاہی لشکر چتوڑ کے قلعہ کی فتح کے لیے جا رہا تھا، اتفاقاً باری کے قصبہ کے قریب میری(96) اس سے ملاقات ہوگئی، لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ وہ محفل گھڑی بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ ایک طرف اور میں(97) دوسری طرف رخصت ہوگئے۔ اس پہلی ملاقات ہی میں اس کے قابل قدر احوال کا اندازہ ہوگیا۔ اس کا ذکر شاعروں کے طور پر کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی کبھی کبھی شعر کہتا تھا اس لیے اس کی یاد میں یہ مطلع نقل کیا جاتا ہے:

اگر بروز غمت صبر اختیار کنم
چو اختیار نماند بگو چہ کار کنم

نویدی ترتی

صاحب دیوان شاعر ہے۔ بیرم خان کے بخشی کچک بیگ کی ہجو میں اس نے ایک ترجیع بند کہا ہے جو رہتی دنیا تک لوح زمانہ سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں:

ای بدوران شریف تو مباہی ایام   خان بن خان سرو سرخیل سلاطین بیرام
عاجز از وادی فہم سمند ادراک   قاصر از قصر جلال تو کمند اوہام
تحفی ہست مرا شرح کنم بر نواب   مشکلی ہست مرا عرض کنم بر خدام

اس کی ہجو میں اس کا ایک جملہ بھی مشہور ہے۔ خود اس کا بیان ہے کہ "ایک دن کچک بیگ کچہری میں ایک پرانی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا"۔ مجھ سے کہنے لگا: "اے کتے میرے

سامنے تو پاخانہ کھاتا ہے"۔ میں نے اسے جواب دیا: "کون کتا ہے جو تمہارے سامنے پاخانہ کھا سکے؟"

نویدی کانا تھا۔ اصل تذکرہ کے مصنف میر علاء الدولہ نے چشم پوشی سے کام نہیں لیا اور قصہ لکھ دیا ہے۔

نشاؔنی

مولانا علی احمد کا تخلص ہے۔ مولانا حسین نقشی مہرکن کے لڑکے ہیں۔ بڑے عالم، فاضل، ولی مشرب آدمی تھے۔ بڑے شاہزادہ کے استاد تھے۔ باپ بیٹے دونوں نے مہرکنی کے فن کو بڑا فروغ دیا۔ خاص طور سے مولانا مذکور کے نگینہ پر نقش سازی میں ان کے کارنامے بے مثل ہیں۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر تک ان کے نقش و سکہ کو تبرکاً لے جاتے ہیں۔

علم و کمال میں بھی ان کا بڑا اونچا مقام ہے لیکن نقش سازی کے فن نے ان کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اسی لیے سپاہ گری اور ملازمت میں جیسا کہ چاہیے تھا ترقی نہیں پا سکے، پھر بھی قابل عزت عہدہ پر فائز ہوئے۔ امرائے نامدار سے ان کا مرتبہ کسی طرح کم نہیں رہا۔

علم ہیئت اور طبعیات کے ماہر ہیں۔ علم کے مدارج اعلیٰ تک رسائی ہے، ہر طرز کی خوش نویسی جانتے ہیں۔ املاء اور انشاء میں بے مثل آدمی ہیں۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتے تو بلاشبہ ان کے شعر صفحہ یادداشت پر یادگار رہتے۔ شعر بس کبھی کبھی کہتے ہیں تخلص اپنے پیشہ کے مطابق رکھا ہے۔

عین عنفوان شباب سے اس منتخب کے لکھنے کے وقت تک کہ میرے بڑھاپے کا زمانہ ہے، ان کے دوستوں میں رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میرے(98) گہرے مراسم رہے ہیں۔

ان کے کلام کا نمونہ ہے:

ترا تا سبزۂ خط بر لب جان بخش پیدا شد
مسیحا بود تنہا خضر ہمراہ مسیحا شد

محتسب ولی خم شکست و آب آتشناک ریخت
خاک من برباد داد و خون من بر خاک ریخت

باد از یار خبر بر دل ناشاد آورد
اعتمادی نتوان بر سخن باد آورد

جس زمانہ میں گجرات فتح ہوا، انھوں نے بادشاہ کے نام کا سکہ کندہ کر کے پیش کیا اور تاریخ میں یہ شعر پیش کیے:

خسروا سکۂ گجرات بنام تو زدند ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا
ای خوش آن دم کہ چو تاریخ ولی زمن پری گو بیت سکۂ گجرات مبارک بادا

جس زمانہ میں شاہی لشکر پہلی مرتبہ کشمیر کی طرف گیا تھا میں[۱۹۸] اجازت لے کر پیاور کو جو میری جائے ولادت ہے، چلا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیر سے یہ اشعار لکھ کر میرے پاس بھجوائے تھے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھی اسی شوق و محبت میں اشعار لکھے ہونگے لیکن ان اشعار سے اپنی نسبت کو خاص سمجھتا ہوں تا کہ دوسرا دعوی نہ کرے۔

مرا دور از تو ای ماہ دل افروز نہ شب خوابست ونی آرام در روز
چکیدہ اشک گلگونم بر خسار شگفتہ لالہ اندر زعفران زار

جس زمانہ میں میں[۱۹۹] یہ تذکرہ لکھ رہا تھا، ان کے چند شعر میں نے منگوائے تھے۔ جواب میں انھوں نے یہ رقعہ لکھا تھا:

''وقت یہ آن پڑا ہے کہ اپنی متفرق خرافات کو جمع کروں۔ بہر حال آپ کے احسان پر آفریں ہے۔ 2 جزو لکھے ہیں، ایک نثر ہے اور دوسری مثنوی، جو ادھوری رہ گئی ہے۔ انشاء اللہ کل یا پرسوں تک اکٹھا دے دونگا، فی الحال مثنوی کے چند شعر'' سامریم سامریم سامری'' روانہ کر رہا ہوں اصلاح فرمادیں اور جو کچھ لکھنے کے قابل ہوں علیحدہ کرلیں''۔

ایک اور رقعہ میں اولگون بادشاہ اور اکبر کے بزرگوں کے سکے صاحب قران تک لکھ کر میرے(100) پاس بھیجے تھے۔

ناجی

یہ جمال خان ولد میاں منگن بدایونی کا تخلص ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ نہایت قابل، بااخلاق نوجوان تھا۔ اس کی محبت تھی کہ میں نے بدایوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ شعرگوئی کے عمدہ نمونے چھوڑ گیا۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو علم و فضل میں بڑی ترقی کر لیتا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بشنو این نکتہ سنجیدہ ز پر دردۂ عشق
کہ بہ از زندۂ بی عشق بود مردۂ عشق

ترک من زخم بہ ہنگام سواری زدۂ
لذتی دارم ازین عشق کہ کاری زدۂ

ملا نویدی

تازہ تازہ خان خاناں کی خدمت میں شامل ہوا تھا:

قضا کہ نامۂ جرم شراب خوارہ نوشت
نوید عفو خداوند بر کنارہ نوشت

نہائی

یہ آگرہ میں ایک بوڑھی شاعرہ تھی۔ غالباً ہرات کی رہنے والی تھی۔ یہ اس کا مطلع ہے:

روز غم شب درد بی آرام پیدا کردہ ام
دردمندیہا درین ایام پیدا کردہ ام

بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں شعر کہے لیکن کوئی اس کے برابر کا نہیں:

چہ مردی بود کز زنی کم بود

اس کا لڑکا جعفر اب کشمیر میں احدی ہے۔ یہ ایک قابل نوجوان ہے اور میر بحر معین کی سرکار میں ملازم ہے۔

نجاتی گیلانی

ہندستان آنے کے بعد فوت ہو گیا۔ شعر و معمہ خوب کہتا تھا:

ای دلم دور از تو در آتش دو دیدہ خون فشان
بی تو ام در آب و آتش آشکارا و نہان

حل نشد از دل تو مشکل ما
از دلت دو کہ آب شد دل ما

نوعی خبوشانی

اپنے آپ کو شیخ جامی محمد خبوشانی کا پوتا بتاتا تھا۔ لیکن اس کے اعمال ایسے تھے جو اس کے دعویٰ کو جھٹلاتے تھے۔ نہایت شوخ طبع آدمی تھا۔ اب چھوٹے شاہزادہ کی ملازمت میں ہے:

نوعی سبو کش ہمہ وجد مردم
خورشید وار آبلہ ام جوش می زند

غم نوعی نہ ز بسیاری درد و الم است   غم از آنست کہ در حوصلہ گنجائی نیست

نیازی

بخارا کا رہنے والا ہے۔ نہایت بدمست اور بے حیا آدمی ہے، لیکن صحیح معنوں میں شاعر تھا۔

شعر، عروض، معمہ، تاریخ اور دوسری تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر اس کی تصانیف ہیں۔

جب ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجلس میں اس نے بایاں پیر آگے بڑھا دیا۔ ہمایوں ادب و آداب کا نہایت پابند تھا، اس لیے کہا مُلّا یہ بایاں پیر ہے۔ پھر حکم دیا کہ اس کو باہر لے جاکر دوبارہ مجلس میں لاؤ۔ جب اسے بیٹھنے کا حکم ملا تو اس نے بیہودہ باتیں شروع کردیں۔ بیکسی سے بحث کرنے لگا اور میر عبدالحی صدر سے جو بیکسی کی تائید کر رہا تھا کہا بیکسی کے چہرہ سے ظاہر ہے کہ ہم بھی بےکس بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت خواجہ حسین مروی نے جو منفعل مزاج آدمی تھا، میر عبدالحی کی تائید میں کچھ کہا تو اس نے ان سے کہا:
”خواجہ تم کیوں پشتی لے کر آگئے“۔

ہمایوں کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناگوار گزریں اور وہ محفل سے اٹھ گیا، اسے سزا ملتی لیکن ہمایوں کی بردباری اور حلم ایسا تھا کہ کچھ نہ کہا۔ ماوراء النہر کو چھوڑنے کا سبب اس کی غزل کا یہ مقطع تھا:

بر فلک نیست شفق بادۂ گلفام من است

رند دردی کشم و طاس فلک جام من است

تا نیازی شدہ در ملک سخن خسرو عہد

نامی جامی شدہ منسوخ کنون نام من است

کہتے ہیں مشہد میں ایک دن وہ اپنی یہ غزل سنا رہا تھا۔ مولانا جامی کا دیوان بھی موجود تھا۔ جب اسے کھولا گیا تو اس کے حسب حال یہ شعر نکل آیا:

چرخ را جام نگون دان کز پی عشرت تہی است
بادہ از جام نگون جستن نشان ابلہی است

نامی

یہ میر محمد معصوم صفوی ولد میر سید صفائی کا تخلص ہے جو بھکر کے اکابر سادات میں سے ہے۔

میر محمد شاہی امرا میں شامل ہے اور کسی خدمت پر سندھ اور قندھار کے علاقے میں مقرر ہے۔ نہایت درویش مزاج، با اخلاق، دیانت دار، بہادر اور سخی ہے۔ تقویٰ، پرہیز گاری، نماز اور تلاوت کا بڑا پابند ہے۔

کسی نے اس سے کہا اس راستہ میں رہنمائی کے بغیر کام نہیں چلتا، کسی مرشد سے تلقین حاصل کرو۔ اس نے جواب دیا کہ فی الحال دو تین مرشد ہیں اب کسی اور کی کیا حاجت میں جس وقت وطن سے دار الخلافہ میں پہنچا تو ہوا و ہوس کا یہ زور تھا کہ ہزاری دو ہزاری منصب نظروں میں نہیں جچتا تھا لیکن جب دربار میں پہنچ کر چوبداروں اور دربانوں کے ڈنڈے کھائے اور خوب ذلتیں اٹھائیں تو اپنی حیثیت معلوم ہوئی۔ پھر بڑے انتظار کے بعد بیستی کا عہدہ نصیب ہوا اور جوانی کے وہ سارے دعوے ہوا بن کر اڑ گئے، ناچار راضی برضا تسلیم کی خو پیدا کرلی اور مطمئن ہوکر بیٹھ رہے۔ مثال اس طرح سے ہے کہ "میں نے کچھ بن جانا چاہا کچھ بھی نہ رہا اپنے آپ کو چھوڑ دیا تو سب کچھ بن گیا"۔

غمم ملول کہ کارم تمو نشد بہ شد
شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

اگر کوئی مرشد بھی ہوتا تو وہ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم دیتا۔

ہمارا دوسرا مرشد میر ابو الغیث بخاری ہے۔ جو عہد سے اور مرتبے میں ہم سے کئی درجے بڑا تھا۔ جب تک اس سے شناسائی نہیں ہوئی تھی ہمارا یہ حال تھا کہ اگر کسی دن ہمارے گھوڑوں کو دانہ چارہ نہیں ملتا تھا تو غم و غصہ کے مارے کسی سے بولتے نہیں تھے، لیکن جب میر کی صحبت نصیب ہوئی تو ہم نے ان کا یہ رویہ دیکھا کہ کبھی کبھی دو چار روز اچھے گزر جاتے تھے ورنہ ان کے طویلہ میں گھانس کا ایک تنکہ رہتا تھا نہ مطبخ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ خوش اور ہنستے بولتے رہتے تھے کہ کسی پر ان کی تنگ دستی کا حال نہیں کھلتا تھا، نہ وہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ بولتے تھے اور نہ سنتے تھے۔

ان کے نزدیک خوشحالی اور بدحالی دونوں بس ایک جیسے ہی تھے:

از حادثات در صف آن صوفیان گریز
گر بود غم کنند وز نا بود شادمان

اس وقت ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ جب ایسے بڑے آدمی پر بھی یہ وقت گزرتے رہتے ہیں اور وہ حالات کی ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا تو ہمارے لیے تو بے فکر رہنا کہیں زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہم اس کے دولت و مرتبہ کا دسواں حصہ بھی نہیں رکھتے۔

ہماری تیسری مرشد ایک کنیز ہے جو بادشاہ سلامت نے عطا فرمائی تھی جس وقت بھی شیطان بہکاتا ہے اور ہوا و ہوس زور کرتے ہیں اور طبیعت نظر بازی اور شہوت پرستی کی طرف جھکنے لگتی ہے تو ہم فوراً جاکر اس کی صحبت میں آسودگی حاصل کر لیتے ہیں اور پاک و صاف ہوکر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مرشد کا کام اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ وہ ناشائستہ کاموں سے بچالے۔

میر طلب علم میں بھی بڑے کوشاں رہے۔ شعر گوئی اور معمہ کہنے میں بڑا اچھا ذوق ملا ہے۔ نہایت بلند فطرت آدمی ہے۔ یوسف زلیخا کی بحر میں ایک مثنوی کہی ہے۔ ایک دیوان بھی ان کا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

چہ خوش است آنکہ از خود روم و تو حال پرسی
بتو شرح حال گویم بزبان بی زبانی

چون گریہ من دید نہان کرد تبسم
پیدا ست کہ این گریہ من بی اثری نیست
در عشق نشہ ایست کہ عشاق خستہ را
ذوقی ست در فراق کہ اندر وصال نیست

نظیری نیشاپوری

شعراء کے سلسلہ میں شامل ہے۔

نظیری کا قصیدہ ہے:

زعفر بہ خود تجم چو بہ خم می مغانی   بدرد لباس برتن چو بجو شدم معانی

بہ فسانہ ام مزن رہ کہ ز آتش عزیمت   بدماغ و دیدہ خواہم ہمہ شب کند و خانی

نوائی

میر محمد شریف نام تھا۔ میر قدری کربلائی اس کا بھائی ہے، جس کا یہ شعر مشہور ہے:

گرزوق خری نہ شناسم عجب مدان   قدری بہ عمر خویش چو خرم نبودہ ام

نوائی ہندستان میں بادشاہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

منم نشستہ بکنجی زبی و فائی تو   قرار دادہ بخود محنت جدائی تو
بجرم خویت از جانمی روم چکنم   کہ اعتماد ندارم بر آشنائی تو
تو در طریقہ مہر و فانہ آن شمعی   کہ نور دیدہ فروزد ز روشنائی تو
بہ ہیچ جا نرسیدم بہ ہیچ رہ نگذشتم
کہ در دلم نگذشتی بہ خاطرم نرسیدی

نویدی نیشاپوری

خاصا پڑھا لکھا تھا۔ شعر گوئی میں صاحب مرتبہ شاعر ہے۔ اس کا انتقال 973ھ/1565ء میں حج کو جاتے ہوئے مالوہ، اجین میں ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ۔

اگرم ز اشک گلگون شدہ لالہ گون زمینہا
نتوان شدن پریشان گل عاشقیت لینہا

نقشی تبریزی

جوہر شناس شاعر تھا۔ طبیعت شعر میں خوب لڑتی تھی۔ ایک دیوان مرتب کر چکا تھا، جو بہت مشہور ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

شوخی کہ بولب بہ فنون آلودہ
اہل نظر ند ازو جنون آلودہ
بر بستہ بسر چہرۂ سرخ است اورا
یا رشتہ جان ماست خون آلودہ

وثوقی نیشاپوری

شہاب الدین احمد خان کا داماد ہے۔ اس کا نام محمد شریف ہے لیکن اعمال ایسے کثیف ہیں کہ اس کے نام کی مٹی پلید ہوگئی۔ بے دینی اور الحاد میں وہ ہر ملحد بدنام سے آگے ہیں۔

اعتقاد میں نہ تو پسی خانی تھا نہ صباحی بلکہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ ادوار و تناسخ کا قائل بلکہ اس عقیدہ کا پکا پیرو تھا۔

ایک دن بھمبر میں جو کشمیر کا سرحدی شہر ہے، وہ میرے پاس کشمیر جانے کے لیے کچھ ہمراہیوں کی تلاش میں آیا وہاں پتھر کی بھاری بھاری سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ کہنے لگا: ''آہ یہ بیچارے انسانی قالب میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں''۔

اس بد اعتقادی کے باوجود اس نے ائمہ علیہ السلام کی شان میں منقبت بھی کہی ہے شاید اس کے ابتدائی زمانہ کی چیز ہو۔ خوش نویسی اور انشا پردازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ علم تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن عربی تاریخیں پڑھنے کی مہارت از خود پیدا کر لی تھی۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

نالہ تا از تو جدا فاش نسازد رازم
بر نیاید شب غم کاش ز ضعف آوازم

امام حسینؑ کی منقبت میں کہتا ہے:

ہر گہ از طغیانی سوز عشق در گیرم چو شمع   شعلہ خود را ہر زمان بر من زند پروانہ سان
گر ز فیض خاطرت گردد طبیعت بہرہ ور   میتوان پرداختن در یک سخن صد داستان

شاہدان بکر معنی چو شود فکرم بلند   عرض حسین خود کنند از غرفہای آسمان

گر جور آید از تو دلم تن وران دہد   شاید ترا خدائی دل مہربان دہد
وارد ہلاک غیرت اینم کہ عشق تو   در وی بجان ہر کہ دہد جاودان دہد
شبہا کہ بر فروزم از اندیشۂ تو دل   سوز دلم چراغ بہ ہفت آسمان دہد

یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں جو حضرت خاتون جنت بی بی زہرا کی منقبت میں کہے ہیں۔ لیکن یہ طرز مجھے بے ادبانہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میں(۱۹۱) نے مدح کے شعر درج نہیں کیے۔

شریف وقوعی نے 1003ھ/1594ء میں انتقال کیا۔ اس کے ترکہ میں نفیس کتابیں تھیں جو شاہی کتب خانہ کے پیٹ میں سما گئیں۔

وداعی ہروی

تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے۔ ہندستان میں آنے کے بعد انتقال ہوا:

سواد ہند کہ پر ظلمت ست چون شب ہجران
کسی کہ آمدہ این جا بہ حسرت ست و ندامت
ز ملک ہند وداعی بجو غنیمت و بگذر
غنیمت است اگر جان بروی ز ہند سلامت

اس مطلع کے رنگ میں:

خوش آن زمان کہ برویت نظر کنان روم از خود
زمان زمان بخود آیم زمان زمان روم از خود

اس نے کہا ہے:

نہ از شراب بہ بزم تو ہر زمان روم از خود   پیالہ لعل تو بوسد ز رشک آن روم از خود

واقعی ہروی

ابن علی نام تھا۔ بادشاہی ملازمت میں تھا:

نہ بر جبین تو از روئی ناز چین پیدا ست   کہ بحر حسن تو ز موج واین چنین پیداست
ہنوزت از می ناز است نشئہ در سر   ز سر گرانیت ای ترک نازنین پیدا ست
چو شمع سوز دل خود چہ آورم بہ زبان   کہ سوز را اثر از آہ آتشین پیدا ست
چہ احتیاج بہ ماہ نو است در شب عید   ترا کہ ماہ نو از چاک آستین پیداست

در لعل او ہم دارند آب زندگانی را
بلی جان درمیان باشد ہم یاران جانی را

وصفی

میر عبداللہ نام ہے۔ بڑا اچھا خوش نویس ہے۔ 7 قلم میں خوش نویسی کرتا ہے، شاہ غیاث اور مولانا راقی کا شاگرد ہے۔ احدیوں کے زمرہ میں داخل ہے۔ اپنی والدہ کی طرف سے میر نظام الدین احمد کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا ہے۔

کنون کہ لذت اندوہ عشق دانستم
ہزار رنگ بہر خندہ گریہا دارم

وصلی

بڑا زبان آور، خوش طبع شاعر ہے۔ عراق سے حجاز گیا، پھر وہاں سے بحری سفر کرتا ہوا ہندستان آیا۔ جہاز والے طوفان میں بہہ گئے۔ وہ بھی بہتا بہتا قطب شاہ دکن کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور اس کے دربار میں آ گیا۔

ایک موقع پر اس نے ایک پہلوان کو کشتی میں پچھاڑ دیا تھا۔ پہلوان نے حسد کے مارے اس زہر دلوادیا اور وہ 977ھ/1569ء میں فوت ہو گیا۔ یہ اشعار اس کی یادگار ہے:

دل فریبانہ بدہ میرود دمی ترسم
کہ مبادا بودش دل نگرانی از پی

وقوعی ہروی

میر واعظ کے نام سے مشہور ہے۔ بدخشاں اس کا وطن ہے۔ اس کی وعظ کی مجلس میں بڑی رونق رہتی تھی۔

گر سرم خاک رہت گردد و برباد رود
نیست ممکن کہ خیال رخت از یاد رود

چون سر زلف تو گردید پریشان دل من
یک سر مو نکشادی گرہ از مشکل من

وفائی اصفہانی

کچھ عرصہ تک کشمیر میں رہا پھر لاہور آ کر زین خان کوکہ کے یہاں رہنے لگا۔

در دل نیم شبان کوب کہ چون روز شود
ہمہ در ہا بگشایند و درش بر بندند

قحط و فاست اینکہ نکویان روزگار
خوانی نہند و خون دل میہمان خورند

ہمدمی

یہ میرزا برخوردار خان عالم ولد ہمدم بیگ کا تخلص ہے جو ہمایوں بادشاہ کا مشہور امیر تھا۔ بہادری اور نیکی میں اس کی بہت شہرت رہی ہے۔ یہ اس کے اشعار ہیں:

دل من چمن و ہر سو تازہ داغی از جنون دروی
محیط محنت است و ہر طرف گرداب خون دروی

ہجری

یہ شیخ جامی کی اولاد میں سے ہیں۔ نہایت متقی اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ان کا ایک دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے:

رباعی

ای گل کہ نسیم سد بدامان تو دست
بر نام تو عاشقیم و بر بوئی تو مست
این طرفہ کہ حاضری و غایب زمیان
پنہانی و ظاہر از تو ہر چیز کہ ہست

خوش است موسم ولی خاصہ در بہار شباب
گل نشاط اگر بشگفد ز جام شراب

ہاشم

محمد ہاشم کا ذکر بیرم خان خانان کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ یہ مولانا شاہ محمد انسی کا بھتیجا ہے۔ کبھی سمائی اور کبھی وائی تخلص کرتا تھا۔ آخر اسی تخلص پر وفات پائی۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا ملکہ تھا:

قمری بباغ ہر چہ فریاد می کنی
گویا ز سرو قامت او یاد می کنی
گنجشک وار بستۂ دام تو گشتہ ام
نی میکشی مرا و نہ آزادی کنی

رباعی

ای زلف تو زنجیر دل شیدایم
شیدائی آن دو زلف عنبر سایم

گفتی کہ ہلاک شو بسودائی غم
عمریست کہ من ہلاک این سودایم

ہم(102) بیان کر آئے ہیں کہ اس کی ایک غزل خان خانان بیرم خاں نے ایک لاکھ تنکہ میں خریدی تھی۔ اس غزل کا مطلع ہے:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ
وز دست دل براو غم از پا فتادۂ

اس کا انتقال لاہور میں 972ھ/1564ء میں ہوا۔

خاتمہ

یہ ان چند شاعروں کا تذکرہ تھا جن میں سے اکثر مؤلف کے ہم عصر ہیں اور ان کے اشعار و دیوان مشہور اور زبان زد عام ہیں۔

جن شاعروں کا ذکر اس انتخاب میں نہیں آیا ان کے تذکرہ کی ذمہ داری بعد میں آنے والوں پر ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ بہت طویل ہے اور کسی ایک زمانہ میں اس کا احاطہ کرلینا محال ہے

در جستم جگر کرد روزی کباب　　کہ می گفت گوچدۂ بار باب
بہ تیر ودی ماو و اردی بہشت　　بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
کسا نیکہ از ما غیب اندر اند　　بیایند و بر خاک ما بگذرند

میرے (103) اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کردیا۔ نہ معلوم میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خواندۂ و می ترسم
کہ باتو روز قیامت ہمین عتاب رود

لیکن مجھے (104) توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرح مبین کی حمایت اور دین متین کی طرفداری میں ہے۔ میرا حال اس شخص کے بالکل مشابہ ہے کہ ایک گنوار آدمی ایک محفل میں پہنچا وہاں دسترخوان بچھا ہوا

دیکھا تو بے ساختہ ٹوٹ پڑا اور کھانے لگا۔ سارے تھال اپنے سامنے سمیٹ کر رکھ لیے۔ کسی نے پوچھا: ''بابا تم کون ہو اور اس زیادتی کا کیا مطلب؟'' کہنے لگا: ''میں ترک ہوں اور داروغہ کا نوکر اور بھوکا ہوں'' اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ، میں تو ان لوگوں پر فدا ہو جاؤں جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کر دیں ورنہ وہ شرم سے اپنے گریبان میں اپنا منھ چھپا لیں۔

اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز تیز منقار قلم تو قیامت کے ''دابۃ الارض'' کی طرح ہے جو اس آخری زمانہ کے لوگوں کی پیشانی پر یہ مسلم وہ کافر کا نشان لگاتا گیا اور کسی کو رحمت سے کسی کو لعنت سے سرفراز کرتا رہا۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے۔ صاحب ''مرصا العباد'' نے 400 سال پہلے ہی بڑے درد سے کہا تھا:

شاہان جہان بجملگی بشتابید
تا بو کہ بقیۂ ز دین دریابید
اسلام ز دست رفت وبس بی خبرید
بگرفت جہان کفر وشما در خوابید

ارباب تصنیف و تالیف کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں اور کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف کو منسوب کر کے اپنے اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روایت کے خلاف کسی لالچ کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک تحفہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں اس سے استفادہ کر سکیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشان بر خاک
ازان گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانے میں احکام دین میں

جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے اس کی ان ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر وہ املا و انشاء کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کے باعث باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات و حسنات جتلانے میں باک نہیں رکھتا۔

یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے میں ان معاملات سے بخوبی واقف بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، یہ ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقایق ہیں ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، قلمبند کر دوں:

شنیدہ کی بود مانند دیدہ

تاکہ میری سابقہ بیہودہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے:

مگر صاحب دلی روزی برحمت
کند در کار این مسکین دعائی

مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چند معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ اس لیے اس پر تصنیف یا تالیف جیسے بھاری نام کو تھوپا نہیں جا سکتا۔ لاف و گزاف شرفا کی سیرت کے معارض ہے، مجھے تو اپنی نگارش پر شرم آ رہی ہے۔ فخر و مباہات کا کیا موقع اور اگر میں بلند پروازی سے بھی کام لیتا تو کیا ہوتا؟ یہ کھوٹی اور بے قیمت متاع میرے دعوے کے جھٹلانے کے لیے کافی ہے:

روبہی گفت با شتر کہ ہو   از کجا میرسی تو راست بگو
میرسم گفت اینکہ از حمام   شستہ ام ز آب گرم و سرد اندام
گفت آری کہ شاہد اینست   بس بود دست و پای چرکینت

مناجات

اب بس دعا اور مناجات کا موقع ہے اور بس:

ہرچہ بخشی بہ بندہ دینی بخشی
با رضای خودش قرینی بخشی

— — —

سراپا ز عصیان مرا پیش بین   مبین جرم ما رحمت خویش بین

نگہدار از محن بہ روزگار   زہر بہ کہ باشد مرا درد دار

— — — —

خدای جہان را ہزاران سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

میرے(۱۰۶) پیش نظر تھا کہ اس شیرازہ میں کشمیر کی تاریخ، سلاطین گجرات، بنگالہ اور سندھ کے حالات اور ہندستان کے عجائب و غرائب کا ذکر بھی شامل کر دیتا لیکن کہاں وہ تذکرے اور کہاں یہ مجموعہ؟ دونوں میں کوئی نسبت نہیں جیسے "قالین میں ٹاٹ کا پیوند" ریشم میں ریشم ہی کا بخیہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بروز جمعہ 23 ماہ جمادی الثانی 1004ھ/ 1595ء کو اپنے رہوار قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھ گیا اس پر اکتفا کرلیا۔ بطور تعمیہ یہ قطعۂ تاریخ کہا گیا ہے

شکر اللہ کہ با تمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم، گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی

ترجمہ اردو:

خدا کا شکر ہے کہ یہ کام اپنے اختتام کو پہنچا۔ خدا کے کرم سے یہ انتخاب (منتخب) ہوا۔ جب میں نے اپنے دل سے اس کی سال تاریخ ڈھونڈی تو دل نے یہ کہا۔ یہ وہ انتخاب ہے کہ جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

حواشی

1۔ میں، سے مراد یہاں صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

2۔ میں، ہم، میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

3۔ ہم سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی اور مہر علی سلدوزی ہیں۔

4۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

5۔ مجھ، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں

6۔ میں، یہ سب الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

7۔ مجھ، ملا عبدالقادر کے لیے آیا ہے۔

8۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

9۔ میں، سے مراد مؤلف تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

10۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

11۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

12۔ میں، مجھے، میری، میں، ہم، مجھ، الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی خود اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔

13۔ کاکری کا موجودہ نام کاکوری ہے۔

14۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

15۔ ولایتی سے مراد ایران و عرب کے طالب علم ہیں۔

16۔ ان کا ذکر ''نجات الرشید'' میں آیا ہے۔

17۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

18۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

19۔ والد مرحوم، یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے والد۔

20۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی۔

21۔ میں، میرا اور مجھے، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہے۔

22۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

23۔ میں در اصل اس غیبی آدمی کے لیے آیا ہے جس سے ملا عبدالقادر بدایونی نے کرتا خریدا تھا۔

24۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

25۔ میں، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہیں۔

26۔ میری، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

27۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

28۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

29۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

30۔ ہم سے مراد یہاں ملا عبدالقادر بدایونی اور مولانا عبداللہ قندھاری ہیں۔

31۔ میں، یعنی مؤلف منتخب التواریخ۔

32۔ میں یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

33۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

34۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

35۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

36۔ بھی میں ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

37۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

38۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

39۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی

40۔ میرا سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہیں۔

41۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

42۔ دریائے کوری متن میں آیا ہے اصلی نام دریائے گومتی ہے۔

43۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

44۔ میرے ساتھی سے مراد عبدالرحمن ہے۔

45۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

46۔ میری، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہیں۔

47۔ میں اور میری، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

48۔ محاضرات یعنی یادداشت بجن موافق حال، تذکرہ سلف، حکایات، تاریخ اور معلومات وغیرہ۔

49۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

50۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

51۔ میں اور مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے

52۔ میں، سے مراد یہاں مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری ہے۔

53۔ میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

54۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں

55۔ میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

56۔ [illegible] سے مقصود ملا عبدالقادر بدایونی [illegible] ہیں۔

57۔ ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

58۔ مجھ، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

59۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

60۔ میرے، سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

61۔ مجھ، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

62۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

63۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

64۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

65۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

67۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

68۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

69۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

70۔ یہاں میں وہی مکار شخص ہے جس نے قاضی صدرالدین سے کہا تھا کہ ہمیشہ خضر میرے ساتھ رہتے ہیں۔

71۔ میرا یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کا نام۔

72۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کو۔

73۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

74۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

75۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

77۔ میں، عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

78۔ مجھے، عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

79۔ میرا وطن، یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کا وطن۔

80۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

81۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

82۔ میرا یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

83۔ ہم یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

84۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

85۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

86۔ میری، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

87۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

88۔ ہمارا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

89۔ میں اور میری سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

90۔ بغرا: ایک طرح کی غذا ہے جس کو ہندوستان میں بغرا خان نے ایجاد کیا تھا۔ آئین اکبری میں ملتا ہے کہ یہ ایک قسم کا پلاؤ ہے جو چنے کے میدے، نمک، چاول اور گوشت سے تیار کیا جاتا ہے۔

91۔ سراندیپ: موجودہ سری لنکا ہے۔

92۔ سیلون، پہلے یہ سراندیپ اور سیلون سری لنکا کے دو حصے تھے۔ بعد میں سری لنکا کو سیلون کے نام سے پکارا جانے لگا۔ یعنی موجودہ نام سے قبل یہ ملک اس نام سے جانا جاتا تھا۔

93۔ ہم: صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی کے کہنے کا مفہوم ہے کہ منتخب کے گزرے ابواب میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

94۔ مجھے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

95۔ ہم، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

96۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

97۔ مجھے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

98۔ میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

99۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

100۔ میری، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

101۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

102۔ ہم سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

103۔ میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

104۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

105۔ میرے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔